بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات)

میاں وقار الاسلام

بیسٹ لائف نوٹس

(زریں ملفوظاتِ حیات)

BEST LIFE NOTES

BY: MIAN WAQAR UL ISLAM

FOUNDER

WAQAR-E-PAKISTAN

WWW.WAQARPK.COM

PRINCIPAL CONSULTANT

MARVEL SYSTEM

WWW.MARVELSYSTEM.COM

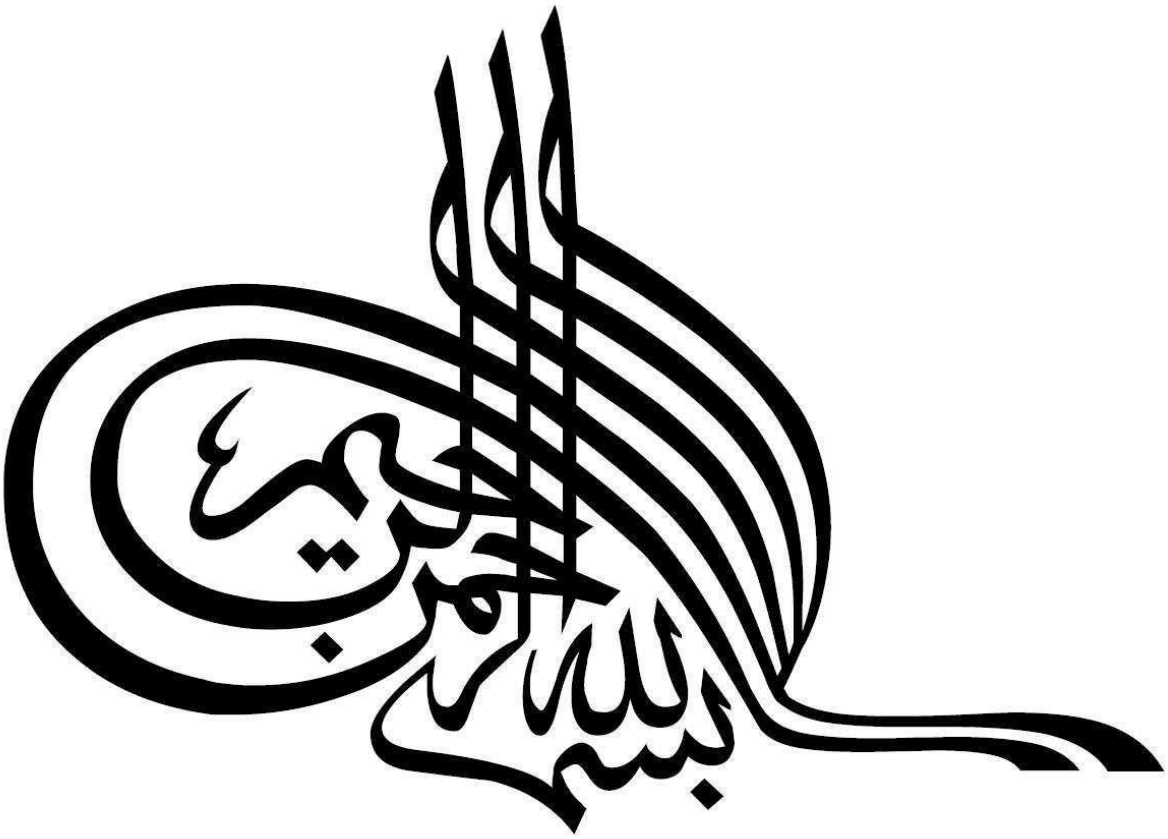

In the name of Allah,
the Most Beneficent,
the Most Merciful

انتساب

"وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ کے تمام ہم سفر دوستوں، استادوں، شاعروں، قلمکاروں اور معاونین کے نام جنہوں نے گوادر نیوز بکس سیریز، وقارِ سخن سیریز، بیسٹ لائف نوٹس سیریز اور ایم ایس نالج سیریز میں نہ صرف اپنا حصہ ڈالا، بلکہ ان سیریز کو مکمل کرنے میں رہنمائی بھی فرمائی اور اس ادبی سفر کو جاری رکھنے میں ہر ممکن تعاون بھی کرتے رہے۔"

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب کا نام	بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات)
مصنف	میاں وقار الاسلام
کمپوزنگ	مارول سسٹم
ابواب	10
برقی اشاعت	2021
ناشر	وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ

WAQAR-E-PAKISTAN

WWW.WAQARPK.COM

مختصر تعارف : میاں وقارالاسلام

مصنف : بیسٹ لائف نوٹس

میرا ابائی شہر:

میرا ابائی شہر میلسی ہے، جو کہ ملتان کا ایک قدیم شہر ہے اور ضلع وہاڑی کی تحصیل ہے۔ میلسی زراعت کے حوالے سے اپنی بہترین پہچان رکھتا ہے، یہ علاقہ مہندی، گندم، کپاس، چاول، گنا، مکئی، آم، مالٹا، فالسہ، جامن، کھجور جیسی بہت سی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ میلسی شہر میں سڑکوں، نہروں، اور ریلوے کا وسیع نیٹ ورک موجود ہے، دریائے ستلج اور سائفن بھی شہر کی اہمیت کو دوبالا کرتے ہیں، پبلک پرائیویٹ ٹرانسپورٹ، میلسی بار کونسل، پبلک پرائیویٹ ہسپتال، طلبہ اور طالبات کیلئے بہترین سرکاری اور نجی ادارے، کمیٹی باغ اور سپورٹس کمپلیس بھی موجود ہیں۔ زراعت کے ساتھ ساتھ پولٹری، فیشری اور لائیو سٹاک فارمنگ بھی علاقے کی معشیت میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ میرا تعلق یہاں کی آرائیں فیملی سے ہے، جو کہ اس علاقے میں پندرویں صدی سے آباد ہیں۔ حکیم میاں جلالادین لاہوری نے اہم مغلیہ منصب کو خیر باد کہہ کر اس علاقے میں رہائش اختیار کی۔

مختصر تعارف:

نام: میاں وقارالاسلام، شاعر، ادیب، کارپوریٹ ٹرینر، بزنس کنسلٹینٹ

پرنسپل کنسلٹینٹ، ماروِل سسٹم، فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم

ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ آف کمپنیز، سی ای او، سوشوآن اردو سوشل نیٹ ورک

ایڈوائزر: ادب سرائے انٹرنیشنل، کنسلٹینٹ: ایکوکیئر کنسلٹینسی سروسز

تعلیم: بی کام، ایم بی اے، سرٹیفکیشنز: مائیکروسافٹ، سیسکو اینڈ کاروِیٹ سسٹم

ایوارڈز اینڈ ایچیومنٹس:

لائف ٹائم ایچیومنٹ ایوارڈز سال 2016 اینڈ 2017

نیازی گروپ آف کمپنیز، ادب سرائے انٹرنیشنل

بزنس ایکسی لینس ایوارڈز سال 2018 اینڈ 2019

ایکو کیئر کنسلٹینسی سرویسز (پاکستان)، ٹی ایس وائین (برطانیہ)

ایجوکیشنل اینڈ لیٹریری ایوارڈز سال 2019 اینڈ 2020

سائی سینس (سعودی عرب)، ہیرا فاؤنڈیشن (امریکہ)

ادبی مسافت:

تعارف: شارٹ بائیو گرافی (اردو)، شارٹ بائیو گرافی (انگریزی)

مضامین: بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ دوئم (کیریئر، موٹیویشن اینڈ لاجکس)

شاعری: من کٹھرا، شہرِ داغدار،، سوزِ محشر، دل آج بھی مقروض ہے

ریسرچ پبلیکیشنز: مثلِ کلیات، فکرِ سلطان، عہدِ شہناز

ریسرچ پبلیکیشن سیریز: وقارِ سخن سیریز، بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ اول

گوادر ریسرچ پبلیکیشنز: گوادار نیوز بکس سیریز، گوادر ہینڈ بک

ایم نالج سیریز: شارٹ انٹرویوز، شارٹ بائیو گرافیز، پورٹ فولیوز

نیوز، اپ ڈیٹس، ریویوز: فلیپز، کوور سٹوریز اینڈ رپورٹس

پروفیشنل جرنی:

پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم، فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم

ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ آف کمپنیز، سی ای او، سوشوآن اردو سوشل نیٹ ورک

ایڈوائزر: ادب سرائے انٹرنیشنل، کنسلٹینٹ: ایکوکیئر کنسلٹینسی سرویسز

الدوسر گروپ، انٹرنیشنل مارکیٹنگ مینیجر (جدہ، سعودی عرب)

کنسلٹینٹ: آئیڈیل سٹینڈرڈ کارپوریشن اینڈ شاہین گروپ (جدہ سعودی عرب)

سولو سمارٹ، ڈائیریکٹر آپریشنز (لاہور، پاکستان)

سدا بھروسہ فاؤنڈیشن، پراجیکٹ مینیجر (لاہور، پاکستان)

ساؤتھ ایشن الائنس آف میڈیکل ایکسپرٹس (ملتان، پاکستان)

کوئیک فیکس گروپ، پراجیکٹ کوآرڈینیٹر (لاہور، یو اے ای)

سولوسائین، اسسٹنٹ ڈائیریکٹر آپریشنز (لاہور پاکستان)

ٹاک ٹیل، اسسٹنٹ جرنل مینیجر (لاہور، ملتان، پاکستان)

نمائندہ ویب سائیٹس:

PROFESSIONAL: WWW.MARVELSYSTEM.COM

LITERARY: WWW.WAQARPK.COM

NIAZI GROUP: WWW.NIAZIGROUP.COM

ADAB SARAAE: WWW.ADABSARAAE.COM

UNIQUE SCHOOL: WWW.UNIQUESCHOOL.EDU.PK

ECOCARE: WWW.ECOCARE.PK

SOCIOON: WWW.SOCIOON.COM

بیسٹ لائف نوٹس (زریں ملفوظاتِ حیات)

دیباچہ : میاں وقار لاسلام

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو ایک کامل علم والی ذات نے بڑی حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ نہ انسان جیسا کوئی شیطان ہو سکتا ہے اور نہ ہی انسان جیسا کوئی فرشتہ ہو سکتا ہے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو جو شرف حاصل ہے وہ پوری کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ صاحبِ ایمان ہو کر مرے یا پھر شرک کرتے کرتے اپنی جان دے دے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہدایت کے راستے پر سیدھا چلے یا پھر راہِ ہدایت سے دور اوندھے منہ جا گرے۔ ربِ کائنات نے انسان کو علم حاصل کرنے کی صلاحیت دی، پھر علم حاصل کرنے کی ہدایت دی پھر اسے قدرت دی کہ وہ اس کے رازوں کو جان سکے اور یہ بھی قدرت دی کہ چاہے تو لاعلم رہے۔

بہت سے علوم کا مرکز انسان کی اپنی ذات بھی ہوتی ہے۔ مگر بہت سے لوگ علم نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ قرانِ مجید میں بار بار انسان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ساخت کو دیکھے اور سمجھے کہ اُسے کیسے بنایا گیا ہے۔ پھر قران اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ انسان تحقیق کرے اور دیکھے کہ اس کے ارد گرد کی چیزیں کیسے بنائی گئی ہیں، آسمان کیسے اُٹھا کھڑے کئے گئے ہیں، زمین کیسے بچھائی گئی ہے، پہاڑ کیسے میخوں کی طرح مضبوطی کے ساتھ گاڑھے گئے ہیں۔ چاند اور ستاروں سے آسمان کو کیسے سجایا گیا ہے، سورج کو کیسے کام پر لگایا ہوا ہے، بادل کیسے ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں، بارش کیسے برسائی جاتی ہے، پرندوں کو کون تھامے رکھتا ہے۔ موسموں کا بدلنا، دن اور رات کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا، یہ منظر یہ نظارے، ایک سے بڑھ کر ایک چیز ہے جو انسان کو حیرت میں ڈالے رکھتی ہے۔

بچوں کے پیدا ہوتے ہی ان کے دلوں میں ماں باپ کی محبت رکھ دی جاتی ہے، اور یہی محبت کی گود انسان کی پہلی درس گاہ بنتی ہے، انسان سیکھنا شروع کرتا ہے، انسان اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے رشتوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ارد گرد کے حالات اور واقعات سے سیکھتا چلا جاتا ہے۔ پھر دنیا جہان کے علوم حاصل کرنے کے بعد بھی انسان یہی سوچتا ہے کہ اسے جو علم دیا گیا ہے وہ انتہائی کم علم ہے۔ دنیا نے بہت کچھ مسخر کر لیا ہے، اتنا کچھ کہ انسانوں کی ایک جماعت کے لیے اتنا علم اُٹھانا مشکل ہے۔ بڑے بڑے کمپیوٹرز بنا لیے گئے، ٹیکنالوجی کا خوب سہارا لیا گیا، دنیا جہان کی معلومات کمپوٹرز میں محفوظ کر لی گئیں، مگر ابھی سب کچھ مسخر نہیں ہوا، ابھی بہت کچھ تبدیل ہونا ہے، ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے ابھی بہت کچھ جاننا ہے۔ انسان کا یہ سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

بیسٹ لائف نوٹس بھی شاید ایسے ہی ایک نہ ختم ہونے والے سفر کا آغاز تھا، جو علم کے حصول کی خاطر اور علم کو بانٹنے کی خواہش سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے اساتذہ، اپنے دوستوں اور اپنے محسنوں سے جو کچھ سیکھا، اسے ایک جگہ محفوظ کیا اور پھر جو کچھ مجھے مختلف کتابوں سے یا انٹرنیٹ سے بھی حاصل ہوا اسے بھی بیسٹ لائف نوٹس میں شامل کر لیا۔ کاروباری، تعلیمی، ادبی، سماجی سفر میں بہت سے ہمسفر دوستوں سے رابطہ رہا جنہوں نے نہ صرف بیسٹ لائف نوٹس کو سراہا بلکہ اس سیریز میں میں اپنا حصہ بھی ڈالا اور اپنی زندگی کے بہترین تجربات سے آگاہ بھی کیا۔ اس طرح کم و بیش تین سالوں میں بیسٹ لائف نوٹس کی پہلی 10 جلدیں مکمل ہوئیں اور ڈیجیٹل بک کی شکل میں ویب سائٹ پر محفوظ کر لی گئیں۔ جن دوستوں نے بیسٹ لائف نوٹس میں اپنا حصہ ڈالا، انہیں علمی اور ادبی کنٹریبیوشن کے سرٹیفکیٹ بھی جاری کئے گئے۔

بیسٹ لائف نوٹس کی پہلی سیریز میں میرا بنیادی کردار ایک مرتب کا تھا، نہ کہ ایک قلمکار کا۔ جبکہ بیسٹ لائف نوٹس کی دوسری سیریز میں میرا کردار ایک قلمکار کا ہے نہ کہ ایک مرتب کا۔ بیسٹ لائف نوٹس کی دوسری سیریز کا سلسلہ بھی پہلی سیریز کے ساتھ شروع ہو چکا تھا، دوسری سیریز میں وہ مضامین شامل تھے جو میں نے خود لکھے اور انہیں مختلف اخبارات، رسائل اور بلاگز میں شائع بھی کروایا۔

بیسٹ لائف نوٹس جس کا اردو "نام زریں ملفوظاتِ حیات" بھی ہے، اس کے درج ذیل 10 ابواب ہیں۔

1) تعارفی اور اعزازی
2) اسلامی اور مذہبی
3) ثقافتی اور سماجی
4) تجارتی اور معاشی
5) علمی اور تربیتی
6) ادبی اور لسانی
7) سیاسی اور حکومتی
8) غیر ملکی اور بین القوامی
9) ذہنی اور نفسیاتی
10) اصلاحی اور تنقیدی

"بیسٹ لائف نوٹس" یا "زریں ملفوظاتِ حیات" میں وہ مضامین بھی شامل ہیں، جنہیں ریڈیو اور ویب ٹی وی پر پڑھا اور نشر کیا جاتا رہا ہے۔ بیسٹ لائف نوٹس کے تمام مضامین کی تعداد 300 سے قریب ہے۔ تقریباً 1000 صفحات کی اس سیریز کا مسودہ کتابی شکل میں مکمل چکا ہے اور اس پر نظر ثانی کر مرحلہ جاری ہے۔ ہمسفر دوستوں کی قیمتی رائے کو بھی ضرور شامل کیا جائے گا۔

آپ کی قیمتی رائے کا منتظر:

میاں وقار الاسلام
پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم
فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ

www.marvelsystem.com | www.waqarpk.com

بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات)

اظہارِ خیال: ڈاکٹر شہناز مزمل

بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات) دیکھنے میں ایک ایسا نام جس میں اپنے اور دوسروں کے تجربات شامل نظر آتے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پہلے جو کچھ بیسٹ لائف نوٹس سیریز میں تحریر کیا گیا یا اس سیریز میں شمولیت کے لیے طلب کیا گیا وہ لوگوں کی زندگی کی بہترین یاداشتیں تھیں جو ایک جگہ جمع کی گئیں، اور لوگوں نے بیسٹ لائف نوٹس سیریز کے آغاز سے لے کر آخر تک اس سفر میں بہت تعاون کیا۔

یہ خوبصورت ادبی سفر جو شاید کچھ ارادی اور کچھ غیر ارادی طور پر شروع ہوا، اور یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی منزل کون سی ہے، اور کہاں پہنچنا ہے، کیا کرنا ہے، کس طرح کرنا ہے، لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، اور یہ سفر اتنی تیزی سے طے ہوا کہ وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو سکا، ویسے تو تقریباً تین سال کا عرصہ پہلی 10 جلدوں کے آنے میں لگا، لیکن کیوں کہ کام جب ہو رہا ہو تو وقت کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وقت کتنی تیزی سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

میاں وقار الاسلام کی یہ خوبی ہے کہ ان میں ارادے کی پختگی اور مستقل مزاجی ہے، جس کام کا بیڑا اُٹھا لیتے ہیں اس کے لیے تن من اور دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اور اُسے کوئی خوبصورت شکل دے کر انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور یہی خوبی بسٹ لائف نوٹس سیریز کی بھی ہے، شروع میں تو میاں وقار الاسلام، بیسٹ لائف نوٹس سیریز میں بطور مرتب سامنے آئے اور لوگوں کے نوٹس جمع کر کے اس ادبی سفر میں شامل کرتے چلے گئے۔ پھر اس طرح سے جب بیسٹ لائف نوٹس کی 10 جلدیں مرتب ہو گئیں اور ساتھ ساتھ ان کا زندگی کے مختلف پہلوں پر لکھنے ،پڑھنے اور سمجھنے کا تجربہ بھی ہو گیا تو انہوں نے خود مضامین لکھنا شروع کر دیے۔

یہ سفر یونہی چلتا رہا اور بیسٹ لائف نوٹس کی دوسری سیریز میں میاں وقار الاسلام بطور قلم کار کے سامنے آئے۔ ان کے مضامین اخبارات، رسائل اور بلاگس وغیرہ میں بھی شائع ہوتے اور اور ویب ٹی وی اور ریڈیوز پر بھی نشر ہوتے رہے۔ انسان جب کسی کام کا تعین کر لیتا ہے، تو مشکلیں آسان ہوتی چلی جاتی ہیں اور منزل خود بخود سامنے آ جاتی ہے۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے اس مستقل مزاج شخص کی مدد اور رہنمائی فرمائی۔ اور یوں یہ سلسلہ چلتے چلے آج اپنی منزل کے بہت قریب ہے۔

آج میاں وقارالاسلام کے اپنے تحریر شدہ تقریباً300 مضامین مکمل ہو چکے ہیں، جنہیں 10 مختلف جلدوں میں محفوظ کیا جا چکا ہے۔ بیسٹ لائف نوٹس سیریز، حصہ دوئم کے مضامین کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے 10 ابواب میں تقسیم گیا ہے جن میں 1۔ تعارفی اور اعزازی، 2۔ اسلامی اور مذہبی، 3۔ ثقافتی اور سماجی، 4۔ تجارتی اور معاشی، 5۔ علمی اور تربیتی، 6۔ ادبی اور لسانی، 7۔ سیاسی اور حکومتی، 8۔ غیر ملکی اور بین القوامی، 9۔ ذہنی اور نفسیاتی، 10۔ اصلاحی اور تنقیدی ابواب شامل ہیں۔

مجھے ہمیشہ بہت خوشی ہوتی ہے، جب یہ کوئی نئی ادبی کاوش کرتے ہیں، انہیں مشورہ دینا بھی اچھا لگتا ہے، ان کے ساتھ کام کرنا بھی اچھا لگتا ہے، ان کا کام دیکھ کر بھی اچھا لگتا ہے، اور میں ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہوں کیوں کہ یہ واقعی اسی قابل ہیں کہ انہیں خوب آگے بڑھنے پر مائل کیا جائے اور یہ اسی محنت اور لگن سے اپنے کام کو آگے بڑھاتے رہیں۔ تو میں ان کے اس کام سے بہت خوش ہوں اور چاہتی ہوں کہ یہ اسی طرح کام کرتے رہیں، اسی طرح آگے بڑھتے رہیں اور اسی طرح منزلیں ان کے راستے میں آ کر ٹھہرتی رہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات) کے لیے بہت سی دعائیں اور نیک خواہشات۔

مادرِ دبستانِ لاہور، ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن، ادب سرائے انٹرنیشنل
فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ

www.shahnazmuzammil.com،www.adabsaraae.com

بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات)

اظہارِ تشکر: میاں وقار الاسلام

مادرِ دبستانِ لاہور، ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن، ادب سرائے انٹرنیشنل، اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کیا جائے۔ نہ صرف بیسٹ لائف نوٹس سیریز (زریں ملفوظاتِ حیات) کے حصہ اول اور حصہ دوئم کی تکمیل ان کی رہنمائی کے بغیر ناممکن تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی میرا جتنا ادبی کام ہے وہ ان کے ساتھ اور ہر قدم پر ان کی رہنمائی کے بغیر ناممکن تھا۔

ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی وجہ سے ہی میری پہلی شاعری کی کتاب من کٹہرا منظرِ عام پر آئی اور اس کے بعد شاعری کی باقی 4 کتابیں بھی مکمل ہوئیں، ان کی وجہ سے میں نے گوادر نیوز بکس سیریز کو کتابی شکل دی، اور ان کی ہی وجہ سے میں نے اپنی اردو اور انگریزی کی بائیو گرافیز مکمل کیں۔

انہیں کی وجہ سے وقارِ سخن، مثل کلیات اور فکر سلطان مکمل ہوئیں۔ اور انہیں کی وجہ سے ایم ایس نالج سیریز کے انٹرویوز اور شارٹ بائیو گرافیز مکمل ہوئیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی وجہ سے ادب سرائے اور وقارِ پاکستان کے پورٹ فولیوز ترتیب دیے گئے اور ان کی وجہ سے ہی وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاوڈ کا قیام ممکن ہوا۔

خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں ڈاکٹر شہناز مزمل جیسے انمول رشتے، قیمتی ساتھی، بے لوث رفیق، بے مثال رہبر اور قابل فخر راہنما نصیب ہوتے ہیں۔ سنا تھا کہ باادب بانصیب ہوتا ہے، مگر اتنا خوش نصیب ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے نہیں تھا۔

میرا ادبی سفر ہمیشہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی بے پناہ محبتوں اور خلوص کا مقروض رہے گا۔

اللہ آپ کو صحت، تندرستی اور نعمتوں بھری لمبی زندگی عطا کرے۔ ادب کے حوالے سے آپ کی خدمات بے مثال ہیں، آپ نے بہت سے دلوں کو علم کی روشنیوں سے مالامال کیا ہے اور میں عہدِ شہناز کو اپنے اور بہت سے ادب دوست لوگوں کے لیے پھر پور روشنیوں کا مرکز دیکھتا ہوں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی ان تھک محنتوں، بے لوث محبتوں اور شاندار کاوشوں کا بھرپور صلہ عطا کرے۔ امین۔

میاں وقار الاسلام
پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم
فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاؤڈ

www.marvelsystem.com | www.waqarpk.com

فہرست ابواب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
i.	تعارفی اور اعزازی	016
ii.	اسلامی اور مذہبی	175
iii.	ثقافتی اور سماجی	258
iv.	تجارتی اور معاشی	330
v.	علمی اور تربیتی	386
vi.	ادبی اور لسانی	443
vii.	سیاسی اور حکومتی	555
viii.	غیر ملکی اور بین القوامی	612
ix.	ذہنی اور نفسیاتی	667
x.	اصلاحی اور تنقیدی	779

فہرست مضامین

	تعارفی اور اعزازی	
1	میاں وقار الاسلام، انٹرویو، ریختہ اردو	18
2	میاں وقار الاسلام، انٹرویو، دعا آن لائن میگزین	74
3	سوزِ محشر، میاں وقار الاسلام، (اردو شاعری)	92
4	ایم ایس انٹرویو سیریز، میاں وقار الاسلام (وقارِ پاکستان، کمیونیٹی انٹرویوز)	93
5	شارٹ بائیو گرافی، میاں وقار الاسلام (انگریزی، اردو شارٹ بائیو گرافیز)	94
6	دل آج بھی مقروض، میاں وقار الاسلام (اردو شاعری)	95
7	وقارِ سخن سیریز، میاں وقار الاسلام (دورِ حاضر کے شعراء اور شاعرات کا مختصر تعارف اور منتخب کلام، سیریز کی 10 جلدیں)	97
8	بیسٹ لائف نوٹس سیریز ، میاں وقار الاسلام (600 مضامین کی 20 جلدیں) (پہلا حصہ، 300 مضامین، مرتب میاں وقار الاسلام، دوسرا حصہ 300 مضامین، مصنف میاں وقار الاسلام)	100
9	گوادر نیوز بکس سیریز، میاں وقار الاسلام (گوادر نیوز اینڈ اپ ڈیٹس پر مشتمل 10 جلدیں)	102
10	مثل کلیات، میاں وقار الاسلام (شاعری: ڈاکٹر شہناز مزمل)	103
11	فکرِ سلطان، میاں وقار الاسلام (مضامین : ڈاکٹر سلطان محمود)	112
12	شہرِ داغدار، میاں وقار الاسلام (اردو شاعری)	114
13	من کٹھرا، میاں وقار الاسلام (اردو شاعری)	115
14	نورِ فرقان: قرآنِ پاک کا منظوم مفہوم، ڈاکٹر شہناز مزمل	119
15	منتہائے عشق، ڈاکٹر شہناز مزمل	122
16	غذا اور غذائیت، ڈاکٹر سلطان محمود	125
17	خوابوں میں لپٹی کہانیاں، روبینہ فیصل	126
18	وہ عشق ہی کیا جو قلندر نہ کر دے، جناب سلمان جاذب صاحب	130
19	نیلمیت کا جہاں، محترمہ نیلم ملک	137
20	آئینہء خودی، محترمہ اربیہ فاطمہ	147
21	جذبہء دل، نسرین نگہت	149

22	وہ اک تارا محبت کا، محترمہ صفیہ سلطانہ	152
23	جینے کا یہی طریقہ ہے، فاخرہ پروین	160
24	کُرلاٹ، نرگس نور	162
25	دستکِ درِ مقفل، کنیز بتول کھوکھر	167
26	مفتی جی اور میں، فرحین چودھری	169
27	دستورِ زبان بلوچی، ہوت شفیع محمد حاجی مراد	173

میاں وقار الاسلام، انٹرویو، ریختہ اردو

انٹرویو ریختہءِ اردو 2020

سوال نامہ : لبنیٰ مقبول غنیمؔ

1. آپ کا نام اور آپ کا قلمی نام؟
2. کہاں اور کب پیدا ہوئے؟
3. تعلیمی قابلیت؟
4. ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟
5. اعلیٰ تعلیم کہاں سے حاصل کی؟
6. پیشہ؟
7. اہم سنگ میل
8. آپ کے لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی کب سے ہوئی؟
9. کیا آپ کے خاندان میں کوئی شاعر یا ادیب ہے؟
10. کتنی زبانوں پہ عبور حاصل ہے؟
11. آپ کی اب تک کتنی کتابیں پبلش ہو چکی ہیں؟
12. اخبارات یا رسائل سے وابستگی؟
13. پسندیدہ شاعر کون ہے کس سے متاثر ہوئے؟
14. زندگی کا فلسفہ بتائیں آپکی کی نظر میں؟
15. معاشرہ کسے کہتے ہیں؟
16. آج کے دور میں شعراء بھی ہیں ادیب بھی ہیں کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں لیکن تہذیب کم ہوتی جا رہی ہے کیوں؟
17. آج کل کے ملکی حالات پر آپ کیا کہنے چاہیں گے؟
18. دورِ عروج کے ادب اور زوال یافتہ معاشرے کے ادب میں کیا فرق ہے؟
19. آپ کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے کیا ضروری ہے؟
20. آپ کے خیال میں اچھا ادب کیا ہے؟
21. اگر آپ کو سیر سپاٹے کے لئے کہیں بھی کھلی چھٹی ہو تو آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟
22. پسندیدہ کتاب یا ناول کونسا ہے؟
23. اردو زبان کا مستقبل آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

24. فیس بک کی شاعری کو آپ کیسا دیکھتے ہیں اور فیس بُک کی وجہ سے کیا نقصان پہنچا ہے ادب کو اور کیا فائدہ ہے؟
25. محبت کیا ہے آپ کی نظر میں ؟
26. شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے شاعری کیا ہوتی ہے ؟
27. کوئی ایسے لمحات یا دور جس کے آنے کی خواہش ہو ؟
28. آپ کی نظر میں تخلیق کسے کہتے ہیں؟
29. ایسی کونسی عادت جو اپنانا چاہتے ہوں اور ایسی کون سی عادت گھر والے بھی بیزار ہوتے ہیں ؟
30. اُردو ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے کوئی پیغام؟
31. منتخب شاعری یا تحریر؟
32. آخر میں نوجوان نسل کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں ؟

جواب نامہ

1. آپ کا نام اور آپ کا قلمی نام؟

میرا نام میاں وقار الاسلام ہے اور میں نے اپنا ادبی یا قلمی نام تبدیل نہیں کیا اس لیے میرا قلمی نام بھی یہی ہے۔

2. کہاں اور کب پیدا ہوئے؟

17 جنوری سال 1978 کو میری پیدائش ایک ایسی فیملی میں جہاں اقدار اور اصولوں کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی تھی جس کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اپنی فیملی کا تعارف کرواتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے۔ میرا تعلق تحصیل میلسی، ضلع وہاڑی کی ایک سرائیکی آرائیں فیملی سے ہے۔ ہمارے اکثر رشتہ دار بنیادی طور پر زراعت کے پیشہ سے منسلک ہیں۔ ہماری زیادہ تر زمینیں اپنے آبائی علاقہ جلہ جیم میں ہیں۔

3. تعلیمی قابلیت؟

ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن، گریجوایشن بی کام

4. ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ابتدائی تعلیم اپنے مقامی شہر میلسی کے گورنمنٹ پرائمری سکول میلسی سے حاصل کی، اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول میلسی سے ہی میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد سی کام اور ڈی کام گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سے مکمل کیا۔ ریگولر ایجوکیشن کی مکمل تفصیل نیچے دی گئی ہے۔

5. اعلیٰ تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

انٹر نیشنل سکول آف مینجمنٹ سائنسز (آئی ایس ایم ایس)، نیو پورٹ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، یو ایس اے (لاہور کیمپس، پاکستان) سے 1999/12-1998/3 میں ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن (مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم) کی ڈگری حاصل کی۔ 98-3 کے بیچ میں 4.0/3.52 جی پی اے کے ساتھ اور فائنل ٹرم، ایم آئی ایس میں 4.0/3.89 جی پی اے کے ساتھ نمایاں پوزیشن حاصل کی۔

بہاؤدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، کامرس ملتان پاکستان گورنمنٹ کالج سے 1998/3-1996/3 میں بیچلر آف کامرس (مارکیٹنگ) کی ڈگری حاصل کی۔ (مارکیٹنگ اور سیلز پروموشن میں گروپ پوزیشن ہولڈر رہا)

کیریئر سرٹیفکیشنز: 10/2001 مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل (ایم سی پی) ونڈوز 2000 ایڈوانس سرور کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

سال 2000 اگست، میں انٹرنیٹ سروسس پروواٹڈرز (آئی ایس پی) سیٹ اپ میں لینکس ریڈ ہیٹ کے ساتھ (کاروٹ سسٹم، لاہور کیمپس سے پروفیشنل سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

سال 2000 جون، میں سسکو سرٹیفائیڈ نیٹ ورک ایسوسی ایٹ (سی سی این اے)، سیکنڈ اور تھرڈ لیئر سسکو ڈیوائسس پر ہینڈز آن پریکٹس کے ساتھ سسکو کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

سال 1999 اگست، میں انگلش لینگویج سرٹیفکیٹ (جو برٹش کونسل اور نیو پورٹ یونیورسٹی کے زیر اہتمام تھا) حاصل کیا۔

6. پیشہ؟

میں ایک پروفیشنل مینجمنٹ کنسلٹنٹ ہوں اور گذشتہ کئی برس سے مختلف سیکٹرز میں اپنی خدمات سرانجام دے چکا ہوں جن میں پبلک پے فون سسٹم، پبلک ایڈریس سسٹم، پبلک سرویلنس سسٹم، پاور ڈائیگنوسٹک سسٹم، برڈر پریلنٹ سسٹم، ٹرانزٹ میڈیا سسٹم، پبلک ڈسپلے

سسٹم، ملٹی پرپز ایلیویٹرز اینڈ لفٹرز، ملٹی پرپز سیکورٹی ڈورز، بیریرز اینڈ ٹرنسٹائلز، مارکیٹ سروے، مارکیٹ ریسرچ، کارپوریٹ ٹریننگ اینڈ ایچ آر ڈیولپمنٹ، وومن ایمپاورمنٹ، چائلڈ لیبر، مائیکرو فنانس، لارج فارمیٹ پرنٹنگ، فارمیسی، ریئل اسٹیٹ، ٹرانسپورٹیشن اینڈ لاجسٹکس وغیرہ اہم ہیں۔ بڑے کاروباری اداروں میں نئی ٹیکنالوجیز متعارف کراونے کا ایک کامیاب ٹریک ریکارڈ ہے، جن میں کئی ملٹی ملین ڈالرز پراجیکٹس شامل ہیں۔

دنیا بھر کی متعدد معروف کمپنیوں کی جدید ایجادات پر ریسرچ بھی کی ہے۔ پاکستان کے لیے بہت سی بین القوامی کمپنیوں کی نمائندگی بھی حاصل کی اور پاکستان میں ان کے پراڈکٹس اور ٹیکنالوجیز کو متعارف بھی کروایا۔ بہت سی ایگزیبیشنز میں بھی حصہ لیا جن میں، گوادر فرسٹ انٹرنیشنل ایگزیبیشن 2018، جدہ کیریئر ایگزیبیشنز، صنعتی ایگزیبیشنز، پاور اینڈ انرجی ایگزیبیشنز، پراپرٹی ایگزیبیشنز، ایجوکیشنل ایگزیبیشنز، پاک چین ایگزیبیشنز، پاک بھارت ایگزیبیشنز، اور آرٹ اینڈ کلچرل ایگزیبیشنز وغیرہ شامل ہیں۔ انٹرنیشنل ایگزیبیشنز میں شرکت کے لیے کمپنیز کو باقاعدہ کنسلٹنسی بھی فراہم کی۔

گوادر، مری لاہور، اسلام آباد، ملتان اور دیگر علاقوں کے رئیل اسٹیٹ پراجیکٹس کو پاکستان کے علاوہ متحدہ عرب امارات اور یورپ اور دیگر ممالک میں انٹرنیشنل مارکیٹنگ نیٹ ورک کے ذریعے متعارف بھی کروایا اور پاکستان میں کئی ملین ڈالرز کی انوسٹمنٹ کروائی۔ کئی کاروباری سیمینارز، ورکشاپس، نیو پراڈکٹ لانچ، سی ای او فورمز وغیرہ کا بھی اہتمام کیا۔ پریس ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے لئے کور سٹوریز، میڈیا رپورٹس، انٹرویوز اور سکرپٹ وغیرہ بھی لکھے۔

7. اہم سنگ میل

وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ پروگرام 2019ITRP

سٹیم سیلز ٹیکنالوجی ریسرچ پروگرام 2018ITRP

انڈسٹریل ٹیکنالوجی ریسرچ پروگرام 2017ITRP

پاک چائنہ اکنامک کوریڈور ریسرچ پروگرام 2016 CPEC

سولر اینڈ ونڈ انرجی ریسرچ پروگرام 2015 SWRP

ہوم لینڈ سیکوریٹی ریسرچ پروگرام 2014 HMRP

ہولو گرافیکس ٹیکنالوجی ریسرچ پروگرام 2013 HTRP

سیکوریٹی پرنٹنگ ریسرچ پروگرام 2013 SPRP

ایگریکلچرل اینڈ لائیو سٹاک ریسرچ پروگرام 2012 ALSP

کیمونیٹی سکیلز ریسرچ پروگرام 2011 CSRP

سی فوڈ ریسرچ پروگرام 2010 SFRP

الٹرنیٹ انرجی ریسرچ پروگرام 2010 AERP

پری فیبرک سٹیل سٹرکچرز ریسرچ پروگرام 2009 FFRP

میڈیا سٹی ریسرچ پروگرام 2008 MCRP

ٹرانزیٹ میڈیا ریسرچ پروگرام 2007 TMRP

گوادر پورٹ ریسرچ پروگرام 2007 GPRP

ہیومن ریسورس روبوٹکس ریسرچ پروگرام 2006 HRRP

پبلک سرویلینس ریسرچ پروگرام 2005 PSRP

مائیکرو فنانس ریسرچ پروگرام 2005 MSRP

سوشل ڈیویلوپمنٹ ریسرچ پروگرام 2004 SDRP

گرافکس ٹیکنالوجیز ریسرچ پروگرام 2004 GTRP

سائبر لاء ریسرچ پروگرام 2003 CLRP

انٹرنیشنل فرنچائزنگ منیجمنٹ سسٹم 2003 IFMS

وائرلیس ٹیکنالوجی ریسرچ پروگرام 2003 WTRP

ایڈوانس سرور ریسرچ کے پروگرام 2002 ASRP

یونیورسلی سسٹین ایبل کمپیوٹر سویٹ 2001 USCS

میئرمنٹ آف ایڈجسٹ ایبل پرسنیلیٹی 2000 MAP

پبلک پے فون مینجمنٹ سسٹم 1999 PPMS

8. آپ کے لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی کب سے ہوئی؟

میری گُم نام شاعری کا آغاز تو شاید میرے ہوش سنبھالتے ہی میرے لاشعور کے کسی کونے میں ہو چکا تھا۔ یہ سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ جواں ہوتے احساسات اور جذبات میں رنگتا گیا۔ 1993 سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا، اُس وقت میری عمر تقریباً 16 سال کے لگ بھگ تھی اور میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔

9. کیا آپ کے خاندان میں کوئی شاعر یا ادیب ہے؟

میرے دادا حکیم حاجی میاں قمرالزمان سکلیینی مرحوم سرائیکی زبان کے شاعر تھے اور زیادہ تر حمد اور نعت لکھتے تھے۔ ان کے علاوہ میرے نانا نمبردار حاجی میاں محمد رمضان اردو زبان میں افسانہ لکھتے تھے "ملک الموت کے کارنامے" ان کا مشہور افسانہ تھا جو تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔

10. کتنی زبانوں پہ عبور حاصل ہے؟

سرائیکی، پنجابی، اردو، انگلش پر کافی حد تک عبور حاصل ہے اس کے علاوہ عربی اور چینی زبان سیکھنے کی تھوڑی بہت کوشش ضرور کی تھی مگر زیادہ وقت نہیں دے سکا۔

11. آپ کی اب تک کتنی کتابیں پبلش ہو چکی ہیں؟

میری پہلی کتاب کا نام "من کٹھرا" تھا جو سال 2009 میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کی رونمائی ہوٹل سن فورٹ لاہور میں ہوئی اور پروگرام کی صدارت ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ نے کی۔ میری دوسری کتاب کا نام "شہرِ داغدار" ہے جو کہ 2016 میں مکمل ہوئی ہے۔ میری شاعری کی تیسری کتاب جس کا نام "سوزِ محشر" ہے، جو 2021 میں مکمل ہوئی۔

میری تین کتابیں: 1۔ "من کٹھرا" 2۔ "شہرِ داغدار" اور 3۔ "سوزِ محشر" تینوں مل کر ایک عظیم تصور "اسلامک وے آف لائف" کو بیان کرتی ہیں۔ "من کٹھرا" ہمارے خود کو سمجھنے کے بارے میں ہے کہ ہم کس طرح بنائے گئے ہیں۔ "شہرِ داغدار" ہماری کائنات کے بارے میں ہے کہ کس طرح کائنات تخلیق ہوئی ہے۔ "سوزِ محشر" قیامت کے دن کے بارے میں ہے کہ زندگی کے بعد کیا ہوگا۔ مزید یہ کہ یہ تینوں کتابوں بالترتیب "نفسِ امارہ"، "نفسِ لوامہ" اور نفس متمعئنہ پر بھی بات کرتی ہیں۔

ان تین کتابوں کے علاوہ میری ایک نظموں کی کتاب بھی ہے جو 2017 میں مکمل ہوئی جسے محمد علی احمد صاحب نے "دل آج بھی مقروض ہے" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ شاعری کی کتابوں کے علاوہ میری مضامین کی بھی ایک کتاب مکمل ہے جس کا نام ہے "مائی لائف نوٹس" اور یہ 2018 میں مکمل ہوئی۔ 2019 میں ایم ایس نالج سیریز کے تحت میں شارٹ بائیو گرافی بھی مکمل ہوئی۔ 2021 میں "بیسٹ لائف نوٹس" کے نام سے میری 300 مضامین اور 10 جلدوں پر مبنی ایک اور سیریز بھی مکمل ہو چکی ہے۔

ان پبلیکیشنز کے علاوہ میری ریسرچ پبلیکیشن سیریز بھی ہیں جو درج ذیل ہیں

مثلِ کلیات ریسرچ پبلیکیشن " محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی 30 کتابوں سے شاعری کا ایک مجموعہ ہے۔ "مثلِ کلیات" میں ڈاکٹر شہناز " مزمل کی شاعری کے علاوہ ان کے ساتھ اور ادب سرائے انٹر نیشنل (دنیا میں معروف اردو ادبی فورم) کے ساتھ میرا 15 سالہ ادبی سفر نامہ بھی ہے۔ یہ کتاب سال 2014 میں مکمل ہوئی۔

فکرِ سلطان ریسرچ پبلیکیشن میں ڈاکٹر سلطان محمود صاحب، مینیجنگ ڈائیریکٹر ایکو کیئر کنسلٹینسی سروسز کی 12 سے زیادہ پبلیکیشنز میں سے اہم کالمز کو شامل کیا گیا ہے ان کالمز میں ماحولیات، غذایات، صحت اور حالاتِ حاضر سے متعلق کالمز کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سال 2015 میں مکمل ہوئی۔

وقارِ سخن ریسرچ پبلیکیشن سیریز

وقارِ سخن نے نام سے میری ایک ریسرچ پبلیکیشن سیریز ہے جس میں 500 سے زیادہ شعراء اور شاعرات کے سخن پارے اور مختصر تعارف شامل ہے اس سیریز کی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔

نثری تصانیف کی تعداد اور نام؟

الف: بیسٹ لائف نوٹس۔ ریسرچ پبلیکیشن سیریز

اردو کی شاعری کی کتابوں کو علاوہ میری ایک اردو کتابوں سیریز بھی ہے جس کا نام ہے "بیسٹ لائف نوٹس ریسرچ پبلیکیشن سیریز۔ بیسٹ لائف نوٹس اپنی نوعیت کا ایک منفرد کتابی سلسلہ ہے۔ ان کتابوں میں میری زندگی کے بہترین نوٹس کی کولیکشن ہے۔ کچھ نوٹس قرانِ مجید کے بارے میں ہیں یعنی جب میں قران پہلی دفعہ پڑھا تو کیا محسوس کیا اور بار بار پڑھنے کے بعد کس نتیجے پر پہنچا۔ پھر کچھ نوٹس حضرت محمدؐ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے ہیں، کچھ انؐ کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر اور کچھ انؐ کے آخری خطبہ کے بارے میں۔

اسی طرح قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کے کچھ اہم واقعات پر کچھ نوٹس میں اور کچھ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے حالات و واقعات پر شامل کیا ہے۔ پھر کچھ مولانا رومی کی حکایتیں اور کچھ دیگر مثالیں وغیرہ جن سے زندگی کے رہنما اصول ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک واقعہ مرحوم اشفاق احمد صاحب کی کتاب زاویہ سے بھی لیا گیا ہے۔

کچھ نوٹس میرے پروفیشن اور بزنس کے حوالے سے ہیں، جو میں نے مختلف شخصیات کے ساتھ کام کرنے اور سیکھنے کے دوران قلم بند کئے تاکہ انہیں مزید لوگوں کی رہنمائی کے لئے سامنے لایا جا سکے۔ اسی طرح کچھ نوٹس کا تعلق میرے ادبی اور تعلیمی سفر سے ہے، جو آج بھی میری رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

کچھ نوٹس کا تعلق پاکستان کے تاریخی، معاشی اور سیاسی پس منظر سے ہے۔ جن میں گوادر سی پورٹ، پاک چین اکنامک کوریڈور، پاک چین سیاسی، عسکری اور معاشی تعلقات اور پاکستان کے موجودہ اور مستقبل کے اہم ترقیاتی منصوبوں وغیرہ کی تفصیل شامل ہے۔ان میں سے اکثر نوٹس، میری گوادر سے متعلقہ اہم پبلیکیشنز سے ہے۔

بیسٹ لائف نوٹس میں 100 سے زیادہ لوگ اپنا کم یا زیادہ حصہ ڈالا ہے۔بیسٹ لائف نوٹس کی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ اول میں میں نے 300 مضامین مرتب کئے تھے، جبکہ بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ دوئم میں میرے اپنے 300 مضامین شامل ہیں اور اس کی بھی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔

ب: گوادر سے متعلقہ پبلیکیشنز

اردو کی کتابوں کے علاوہ میری 10 دیگر کتابیں ہیں، جن میں 9 گوادر "نیوز بکس" شامل ہیں اور ایک گوادر "ہینڈ بک" شامل ہے۔ یہ کتابیں 150 سے زیادہ نیشنل اور انٹر نیشنل نیوز پیپرز سے نیوز کا تحقیقی مجموعہ ہے۔ نیوز کو لیکشن کا تعلق براہ راست گوادر کے تمام میگا پراجیکٹس اور گوادر ڈیپ سی پورٹ سے ہے۔علاوہ ازیں چین پاکستان اقتصادی راہداری سے متعلق بھی بہت سی نیوز شامل ہیں۔ " گوادر ہینڈ بک" میں ضلع گوادر کی اہم معلومات گوادر پورٹ کی تفصیلات، اہم پراجیکٹس، گوادر کا تصویری سفر، اہم نقشاجات، اہم اقدامات، اہم بیانات اور گوادر میں مستقبل کے منصوبوں کا احاطہ وغیرہ سب شامل ہے۔

پ: ایم ایس نالج سیریز

ایم نالج سیریز میں شارٹ بائیو گرافیز اور شارٹ انٹرویوز شامل ہیں، اس میں 100 سے زیادہ لوگوں کے تعارف اور 5 سے زیادہ لوگوں کی شارٹ بائیو گرافیز پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ایم ایس نالج سیریز میں شامل ادبی، کاروباری اور سماجی شخصیات اور ان کے ادارے اور فورمز شامل ہیں جن کی کورر سٹوریز کو بھی اس سیریز میں شامل کیا گیا ہے۔

12. اخبارات یا رسائل سے وابستگی؟

ماہانہ و سالانہ لیٹریری و کمرشل میڈیا رپورٹس، لیٹریری و کمرشل ایونٹ نیوز، لیٹریری و کمرشل انٹرویوز، سپلیمنٹس، ایڈوٹائزنگ، آرٹیکلز، شاعری، ٹی وی، ریڈیو زاینڈ نیوز پیپر سکریپٹس کی اشاعت اور براڈکاسٹنگ کے حوالے سے 150 سے زیادہ لوکل اور انٹرنیشل میڈیا چینلز سے رابطہ رہا جن میں ریڈیو، نیوز پیپرز، ٹی وی، میگزینز اور مختلف آن لائن نیوز ویب سائٹس بھی شامل ہیں۔

13. پسندیدہ شاعر کون ہے کس سے متاثر ہوئے؟

ادب کی دنیا بہت وسیع ہے، ادب کے آسمان پر ان گنت ستارے ہیں، ہر ستارہ اپنی آب و تاب سے چمک رہا ہے، جسے دیکھیں اس کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ اٹھارویں صدی سے شروع کریں تو میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا اسد اللہ خاں غالب، محمد ابراہیم خان، ذوق اور بہادر شاہ ظفر جیسے بڑے نام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انیسویں صدی میں جھانکیں تو امیر مینائی، داغ دہلوی، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی جیسے نام نظر آتے ہیں۔ آگے چلتے ہیں تو فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، استاد دامن، حبیب جالب، ناصر کاظمی، منیر نیازی، مصطفیٰ زیدی، احمد فراز، کشور ناہید، غلام محمد قاصر، پروین شاکر، ثمینہ راجہ، نوشی گیلانی اور ڈاکٹر شہناز مزمل جیسے کئی نمایاں نام نظر آتے ہیں، کس کا نام رکھیں اور کس کا چھوڑ دیں، ادب کے آسمان میں سب کا اپنا اپنا مقام ہے۔ نئے لکھنے والے ادب کے نئے افق تلاش کر رہے ہیں۔

14. زندگی کا فلسفہ بتائیں آپکی کی نظر میں؟

: فلسفہء حیات : روح وہ چیز ہے جو زندگی کا سبب بنتی ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہوتا ہے

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

" تمہارا پروردگار (اس سے) خوب واقف ہے) اور (اے رسول) تم سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تم (ان کے جواب میں) کہدو کہ روح (بھی) میرے پروردگار کے حکم سے (پیدا ہوئی ہے) اور تم کو بہت ھی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے"۔

آیت نمبر1 : سورۃزمر آیت زمر 42

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَالَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا ۚ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَیُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ

اللہ ہی سب کی روحیں قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور ان کی بھی جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا ہوتا ان کی نیند (کی حالت) میں پھر ان جانوں کو تو وہ روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہوتا ہے اور دوسری جانوں کو وہ چھوڑ دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک بلاشبہ اس میں بڑی بھاری نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

بطور مسلمان ہمارا دوباہ جی اٹھنے پر یقین ہے اس طرح زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک اس دنیا کی عارضی زندگی اور دوسری اگلی دنیا کی آخری زندگی۔ دونوں جہانوں کی کامیاب زندگی کے لیے ہمارا بنیادی فلسفہ ء ایمان ہی ہمارا فلسفہ ء حیات ہے۔

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ : ترجمہ : نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اگر ہم ایمان پر قائم نہیں تو ہمارا فلسفہ ء حیات بھی قائم نہیں۔ اور اگر ہم اس ایمان پر قائم ہیں تو ہم ایک عظیم فلسفہ ء حیات پر کھڑے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا، اور ہمارے ہاتھوں میں بہترین فلسفہ ء حیات دیا۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں اس فلسفہ ء حیات پر قائم رکھے اور ہمارے قدم مضبوط کرے اور ہمارا خاتمہ بھی ایمان پر ہو اور یہ بھی دعا ہے کہ آخرت میں ہماری روح بھی کامل اطمینان پانے والی ہو جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

آیت نمبر3 : سورۃفجر آیت 27-30

یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ۝27 ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ۚ ۝28 فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ۙ ۝29 وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ۝30

ارشاد ہوگا) اے اطمینان والی روح۔ اپنے رب کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو۔ اور میری جنت میں داخل ہو۔ آمین

15. معاشرہ کسے کہتے ہیں؟

ایک خطّے میں بسنے والے کچھ دائمی رشتے بنا لیتے ہیں۔ ان دائمی رشتوں کو چلانے کی بنیاد مشترکہ افکار اور احساسات ہوتے ہیں جن کو لوگ قبول کرتے ہیں۔ مزید، ان افکار کا تحفظ ایک نظام کرتا ہے اور ان سے جو اتفاق نہیں رکھتا اس کو وہ سزا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر عورت اور مرد کے رشتے کو درست طور سے قائم کرنے کا ذریعہ شادی ہی ہے۔ اگر ایک انسان شادی کے طریقے سے رشتہ قائم کرتا ہے تو لوگ خوشی ظاہر کرتے ہیں اور نظام اس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسری جانب شادی کی تنظیم کے باہر اگر کوئی مرد کسی عورت سے رشتہ قائم کرتا ہے تو سماج اس رشتے کو غصّے کی نظر سے دیکھتا ہے اور نظام اس کو اس کو سزا دیتا ہے۔ مختلف افکار، جذبات اور نظام کی بنیاد پر انسانی معاشرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر ہم اسلامی معاشرے کی بات کرتے ہیں تو اسلام ہمیں ایک مکمل ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے۔ جس کی مدد سے مسلمان اپنے معاشرے کو باآسانی امن کا گہوارا بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم مسلم ممالک پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کہ باشندے تو اکثریت میں مسلمان تو ہیں مگر اسلامی ضابطہ حیات کو جزوی طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔ جب اسلامی ضابطہ حیات کی بنیادوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جاتا ہے تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں اسلامی ممالک میں افکار، جذبات اور نظام میں باہمی اختلاف نظر آتا ہے۔ اس لیے، بطور دین وہ اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور قران میں تلاوت بھی کرتے ہیں کہ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے" (آل عمران: 19) مگر ساتھ ہی ساتھ وہ مغربی طرز و تہذیب کی دعوت دیتے ہیں۔ جب کہ وہ تلاوت کرتے ہیں کہ: "نہیں، تمہارے رب کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔ (النساء 65)

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ایک اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ہماری مدد و فرمائے، آمین

16. آج کے دور میں شعراء بھی ہیں ادیب بھی ہیں کتابیں بھی لکھی جارہی ہیں لیکن تہذیب کم ہوتی جارہی ہے کیوں ؟

مہذب قومیں کی تہذیب انہیں یہ نہیں سکھاتی کر ہر ظالم اور سر کش کی جی حضوری کی جائے، بلکہ مہذب قوموں کے باشعور افراد مظلوم کی آواز کو اُٹھاتے ہیں، ظلم کے خلاف لکھتے ہیں اور ایک عام آدمی کے درد سمجھتے ہیں اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ بے حس قوموں کی طرح سب اچھا ہے کا راگ نہیں الاپتے۔ نہ ہی مفلوج قوموں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ اللہ سب دیکھ رہا ہے اللہ خود ہی سب ٹھیک کر دے گا۔ ہم بات کریں گے تو کسی مصیبت میں آ جائیں گے۔ اور لوگ کیا کہیں گے۔ یہ ظالم پہلے والے سے کم ظالم ہے، یہ کرپٹ پہلے والے سے بہتر ہے۔ یعنی بڑا فرعون ہونا ظلم اور چھوٹا فرعون ہونا باعث رحمت، ایسے پڑھے لکھے جاہل اور مصلحت کے ذریعے ہر طرح کے مافیے کو سپیس دیتے دیتے پوری قوم کو اس آگ کی لپیٹ میں لے آتے ہیں۔

چور چھوٹا ہو یا بڑا چور چور ہوتا ہے اور اسے پکڑے جانے کا ڈر ہر وقت ہونا چاہیے، اگر عدالتیں نااہل ہوں چور کو یقین ہو کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا تو وہ کبھی چوری نہیں چھوڑے گا بلکہ چوری کرنے کے ایک سے ایک مہذب رستے ڈھونڈے گا۔ اور عوام ایک طرف تو پستی جائے گی اور دوسری طرف واہ واہ کرتی جائے گی

ایک عام آدمی حق پر بھی ہو تو بھی کرپٹ اداروں سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اس کی لپیٹ میں نہ آ جائے، ہمارے ملک میں واپڈا، پی ٹی سی ایل، پولیس، ٹیکسیشن ریلوے خواہ کوئی بھی محکمہ ہو ہمیں سارے افسر جلاد نظر آتے ہیں، اور ہم ہر جگہ ہی ان سے ڈر ڈر کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں واسطہ نہ پڑ جائے، حق پر چلنے والے ان افسروں سے ڈر ڈر کر گذرتے ہیں جب کہ چور اور لٹیرے ان کی اوقات سے واقف ہوتے ہیں کہ کس کی کتنی قیمت ہے اور جہاں سے چاہتے ہیں باآسانی گذر جاتے ہیں۔

اگر ہم نے یہ مہذب معاشرہ بنایا ہے تو مجھے افسوس ہے ایسی سوچ پر جو اسے مہذب معاشرہ کہتی ہے جس کے پور پور میں کرپشن کا کینسر بھرا ہوا ہے اور اس سے زیادہ افسوس مجھے ان پڑھے لکھے جوانوں پر ہے جن کی آنکھوں پر مصلحت کے پردے ہیں اور وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ ظلم کے خلاف بولنا غیر مہذب نہیں ہے بلکہ ظالم کے خلاف نہ بولنا غیر مہذب ہے۔

17. آج کل کے ملکی حالات پر آپ کیا کہنے چاہیں گے ؟

یہی کہ پاکستان ہر گز مایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے۔ ہمیں کبھی بھی اچھی لیڈر شپ نہیں ملی، ہمارے ادارے کمزور سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں، عوام میں بھی شعور کا فقدان ہے اور بھی بہت سے مسائل پاکستان کو درپیش ہیں۔ ہم سارا دن پاکستان کی سیاسی پر اور پاکستانی اداروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں یہ سب ہم پاکستان کی محبت میں کر رہے ہوتے ہیں تاکہ پاکستان کو ہر چیز نمبر 1 ملے۔ آئیڈل ازم دنیا میں کہیں نہیں ہے، خود امیریکہ بھی اپنی تاریخ کی بدترین لیڈر شپ کے شکنجے میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے سب ختم ہو گیا۔

پاکستان ہر گز ہر گز مایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے۔ شاید پاکستان جتنا مضبوط آج ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ آج ہماری ملٹری طاقت کا موازنہ تاریخ کی کسی بھی دور سے نہیں کیا جا سکتا، معاشی لحاظ سے بھی پاکستان جس طرح کے معاہدے چین سے کر چکا ہے اس طرح کے اور اس سطح کے معاشی معاہدے کبھی امریکہ سے بھی نہیں ہوئے۔ 500 بلین ڈالر کی انوسٹمنٹ پاکستان میں 2045 تک ہر حال میں آنی ہے جس کے لیے چائنز کمپنیز گزشتہ 2 دہائیوں سے بھی زائید عرصے سے پاکستان میں دن رات کام کرنے میں مصروف ہیں، دنیا کر سب سے بڑا سولر پلانٹ لگ چکا ہے، سی پیک کو دنیا کے سب سے بڑے روڈ، ریل اور کمیونیکیشن کوریڈور سے ملا جا رہا ہے جن پر 24 گھنٹے کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بجلی کے منصوبے جتنے زیادہ اور جتنے بڑے لیول پر آج ہو رہے ہیں کبھی نہیں ہوئے۔ ان منصوبوں کا فائدہ مشرف بھی لینا چاہتا ہے، زرداری بھی لینا چاہتا ہے اور نواز شریف بھی لینا چاہتا ہے اور آرمی بھی لینا چاہتی ہے۔

مگر یقین مانیے ان سارے منصوبوں کے پیچھے سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں جس نے دنیا کے نقشوں کو تبدیل کرنا شروع کیا، چین معاشی طور پر اتنا مضبوط ہوا کہ اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ایشیا کے 60 سے زیادہ ملکوں میں اپنی انوسٹمنٹس کا ایک وسیع نیٹ ورک بنانے کے قابل ہو گیا۔ چائنہ 60 سے زیادہ ملکوں میں ایک ہی وقت میں کام کر رہا ہے، اور چائنہ کر ترقی میں ان 60 سے زیادہ ملکوں کی اپنی ترقی بھی شامل ہے اور اس عظیم کام کے لیے چائنہ کے اندازے کے مطابق 4 سے 8 ٹرلین ڈالر کی انوسٹمنٹ کی جائے گی اور اس میں ولڈ بنک، ایشن ڈویلپمنٹ بنک اور آئی ایم ایف پہلے سے شامل ہیں۔

یہ 60 سے زیادہ ممالک دنیا کی آبادی کا 60 فیصد سے زیادہ ہیں، دنیا کے تیل کے وسائل کا 70 فیصد ہیں جب کہ دنیا کی آمدنی کا صرف 30 فیصد ہیں۔ اسی لیے ان میں انوسٹمنٹ پر آمدنی کی شرع بھی ترقی یافتہ ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔

ایشا دنیا کی سازشوں کا گھڑا اسی لیے بنا ہوئے ہے کیوں کہ جو ایشیا میں ڈومنیٹ کرے گا وہی دنیا کی اگلی معاشی طاقت ہو گا۔ اور جو ایشیا کی معیشت کا حصہ نہیں بن سکے گا ایسے ترقی یافتہ ملک اگلے دور کے ترقی پذیر ملک ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف غریب ملک اپنے بہتر مستقبل کی جن لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف ترقی یافتہ ملک اپنی ڈوبتی ہوئی معیشت کو بچانے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

پاکستان میں چائینہ نے تب تک یہ معاہدے نہیں کئے جب تک سب سیاسی جماعتوں اور آرمی سب کو ایک پیج پر لا کر دستخط نہیں کروا لیے۔ اس کا فائیدہ یہ ہوا ہے کہ یہ آپس میں جتنا بھی لڑیں س پیک کے حوالے سے کبھی نہیں لڑیں گے۔ ہمارے سیاسی حکمران اتنے سیانے نہیں ہیں کہ اس طرح کی صورت حال کو خود جنم دے لیتے جن کی سوچ ہمیشہ سے بانجھ پن کا شکار رہی ہے۔ اللہ نے ہمیں ایک ایسی لوکیشن دی ہے جو پوری دنیا میں اپنی اہمیت کا لوہا منواتی آ رہی ہے جس کی وجہ سے پہلے ہمیں امیریکہ بیٹھا کر کھلاتا رہا اور اب چائینہ بیٹھا کر کھلا رہا ہے۔

انڈیا نے بھوٹان میں اپنی فوج داخل کی جس کی وجہ سے چائنہ اور انڈیا کا ایشو گذشتہ دنوں سے کافی شدت اختیار کر گیا تھا کیوں کہ چائینہ نے انڈیا پر واضع کر دیا کہ وہ یہاں سے نکل جائے ساتھ یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر پاکستان اشارہ کرے تو سوڈان میں انڈین آرمی کی طرح کشمیر میں چائینہ کی آرمی بھی داخل ہو سکتی ہے اور یہ ایک دن ضرور ہونا ہے۔ امریکہ سے تو ہم اخلاقی تعاون کی بھی امید نہیں کر سکتے کیوں کہ امیریکہ کا اندھا پن اس بات سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسے دہشت گرد اور حریت پسند کا فرق ہی نہیں معلوم۔

یہ ہماری قوم کے مسلسل صبر کا پھل اور ہماری تمام تر آزمائشوں کا اچھا بہترین بدل ہے۔ اب جو بھی پاکستان اور چائینہ کی دوستی کے خلاف بات کرتا ہے وہ یقینا پاکستان کے روشن مستقبل کے خلاف بات کرتا ہے اور یہ بات آرمی نے تمام سیاسی کارکنوں کو اچھی طرح سے سمجھا دی ہے۔ پاکستان زندہ بعد

18. دورِ عروج کے ادب اور زوال یافتہ معاشرے کے ادب میں کیا فرق ہے؟

ہمارے ہاں ایک کلچر پایا جاتا چھوٹے میں خود کو بڑے میاں سمجھتے ہیں اور بڑے میاں اپنے بڑے ہونے کا ثبوت نہیں دیتے۔ پھر ہوتا یوں کہ نہ چھوٹے کی عزت بچتی اور نہ بڑوں کا بھرم بچتا دونوں ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ایک مچھلی منڈی کا ساماں بندھ جاتا ہے۔ وکیل کا سب سے بڑا دشمن وکیل، استاد کا سب سے بڑا دشمن استاد، جج کا سب سے بڑا دشمن جج، سیاست دان کا سب سے بڑا دشمن سیاست دان، شاعر کا سب سے بڑا دشمن شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا دشمن خود ادیب، ڈاکٹر کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر اور جرنلیسٹ کا سب سے بڑا دشمن جرنلیسٹ۔ یہ اگر کہیں اپنی کوئی یونین یا گروپ بھی بناتے ہیں تو بڑے میاں ایک طرف اور چھوٹے میاں ایک طرف اور

دونوں طبقے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے نظر آتے ہیں اور لوگوں کو یہ نظر آتا ہے کہ آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے۔ ان سب میں ایک بات یکساں پائی جاتی ہے کہ ایک تو سسٹم ٹھیک نہیں اور دوسرا کہ گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ کبھی کسی طبقے کا کسی بھی بات پر تسلی کا جواب موصول نہیں ہوتا۔

ہماری تربیت سکولوں سے کی جاتی ہے جہاں سینئر طلبہ نئے آنے والوں کا بے عزتی سے بھرپور ویلکم کرتے ہیں، مختلف ملازمتوں میں نئے ملازموں سے ہتک آمیز کام لیئے جاتے ہیں جس سے ان کی عزت نفس مر جائے اور پرانے ملازموں کی تسکین پوری ہو جائے کیوں کہ جب یہ میدان میں آئے تھے تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس کلچر کو ختم کرنے کے لیئے ریگولیشن کی ضرورت ہوتی ہے جس سے سیلف ریسپیکٹ کو پروٹیکٹ کیا جاتا اور ہتک آمیز رویوں کو کرائم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ کچھ ملکوں میں اوے کہنا یا انگلی سے اشارہ کرنے کی بھی باقاعدہ سزا ہے۔ ہمارے بزرگوں سے ہمیں کچھ مثالیں ملتی ہیں کہ بچے ماں باپ کے برابر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ نیچے یا پاوں کی طرف بیٹھتے تھے لڑکوں کی نظریں نیچی ہوتی تھیں اور لڑکیوں میں بغیر دوپٹے کے سامنے آنے کا رواج نہیں۔ اساتذہ کی عزت بھی بڑے بزرگوں کی طرح کی جاتی تھی۔ پھر کیا ہوا بڑے میاں اور چھوٹے میاں سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔

اللہ فرماتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے اچھی ہو۔ مگر ہم اپنے آپ کو اونچا ثابت کرنے کے لیئے دوسرے کو نیچا دیکھانا فرض سمجھتے سو سب کی عزت جاتی رہتی ہیں۔

ہمارے لیئے ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ جب بیٹھے ہوتے تھے یا پیدل یا سوار آ رہے ہوتے تھے تو فرق محسوس نہیں ہوتا تھا کہ مالک کون نوکر کون۔ مقام دل میں اتنا کہ ایک دوسرے پہ جان چھڑکی جائے۔ پیٹھ پیچھے بھی کسی کی بے عزتی کرنے کی مثال نہیں مگر اب تو منہ پر بے عزتی کر دی جائے تو سر فخر سے تن جاتا ہے کہ بازی مار لی گئی۔ بڑے میاں اور چھوٹے میاں جب تک آپس میں ایک دوسرے کی حرمت کا تعین نہیں کریں گے رسوائی پوری جماعت پر ہر طرف سے حملے کرتی رہے گی۔ عزت کروانے کے لیے عزت دینی پڑتی ہے اور بڑوں کے عزت کیے بغیر جو مقام ملتے ہیں وہ بھی کھوکھلے ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں ایک دوسرے کی عزت کرنے اور ایک دوسرے کا بھرم قائم رکھنے کی توفیق دے آمین

19. آپ کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے کیا ضروری ہے؟

اگر سوچ چھوٹی ہو تو کبھی بھی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جب مالی درخت لگاتا ہے، تو پودے بڑے ہوتے ہوتے اس کے قد سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا جب اس کے لگائے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے اسے ڈھیروں پھل دینے لگتے ہیں۔

آپ بھی اپنے ارد گرد اپنے ماتحت لوگوں کے لیئے مالی بنیں، اس بات سے نہ ڈریں کہ اگر ان کا قد آپ سے بڑا ہو جائے گا تو آپ چھوٹے پڑ جائیں گے۔ مالی کا کام ایک بڑا کام ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ آپ پانی دیں بیج ڈالیں نگہداشت کریں اللہ سے ان کے بڑھنے اور بلند ہونے کی دعا کریں اور ادبات کا خوف جانے دیں کہ آپ کا قد چھوٹا ہو گا۔

آپ کا ہر پودا جب تک آپ سے بڑا نہیں ہو گا آپ کے لیئے پھل نہیں لائے گا۔ دل کو بڑا کریں سوچ کو کشادہ کریں، اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کاٹ دیں گے تو نقصان کے سوا آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں آئے گا۔

20. آپ کے خیال میں اچھا ادب کیا ہے؟

اچھا ادب دکھی عوام کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے، عوامی مسائل کے حل وضع کرتا ہے، اچھی روایات کا تحفظ کرتا ہے، قومی ویلوز مضبوط کرتا ہے، باہمی ربط اور ہم آہنگی بڑھاتا ہے، معاشی و معاشرتی تناؤ کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ سماجی گراوٹ کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ادب کے اثرات بچوں سے لے کر بڑوں تک سب میں نظر آتے ہیں، پڑھنے کو اچھا ملتا ہے، سننے کو اچھا ملتا ہے، دیکھنے کو اچھا ملتا ہے، جس سے لوگوں کے ذہنی تناؤ بھی کم ہوتے ہیں اور عوام میں شعور بھی بڑھتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ قوم ایک باشعور قوم بن کر سامنے آتی ہے۔

21. اگر آپ کو سیر سپاٹے کے لئے کہیں بھی کھلی چھٹی ہو تو آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟

مکہ اور مدینہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ہیں۔ دونوں ہی مقام بچپن سے ہر مسلمان کے ذہن میں تخیل کی جنت بنائے رکھتے ہیں۔ اور ان مقامات کو دیکھنے کی خواہش وقت سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ان مقامات کر طرف روانہ ہو رہا ہو یا وہاں سے واپس

آیا ہو، اس سے بھی ملنے کا تجسّس بڑھ جاتا ہے، کہ اس نے جب پہلی نگاہ ڈالی ہو گی تو کیسا محسوس کیا ہوگا، جس جس مقام سے گزرا ہوگا تو اس کی کیفیت کیا ہو گئی اور جب وہاں سے واپس ہوا ہوگا تو کیا ہوا ہوگا۔ انہیں محبتوں سے بھرے ہوئے دل جب مقامِ مکہ یا مقامِ مدینہ پر پہنچتے ہیں تو طرح طرح کی کیفیات سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ لوگ اپنے تجربات بتاتے بتاتے نہیں تھکتے اور سننے والے ان تجربات کو سنتے سنتے نہیں تھکتے۔ اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

ہر مسلمان کی طرح مجھے بھی حسرت تھی کہ دونوں مقامات پر حاضری کی سعادت نصیب ہو جائے۔ مگر سعادت تو تبھی نصیب ہوتی ہے جب حکم آتا ہے۔ سو مجھے بھی حکم ہوا اور راستے کھول دیے گئے مشکلیں ہٹا دی گئی، اور مجھے اپنے تخیل کی جنت میں اُتار دیا گیا۔ دونوں مقامات کی زیارت کے بعد مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے میری تخیل کی جنت میں ایک باغ ہے، جس کا ایک حصہ مکہ ہے اور دوسرا حصہ مدینہ ہے۔ مکہ کی زیارت کے بعد جب میں مدینہ گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ اب سفر مکمل ہوا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ مکہ زیادہ اچھا لگا یا مدینہ زیادہ اچھا لگا، میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے دونوں ہی بہت اچھے لگے۔ دونوں کا اپنی اپنی اہمیت اور اپنا اپنا مقام ہے جو اللہ نے رکھ دیا ہے۔ دونوں مقامات کی اپنی ہی کشش ہے۔ جتنا دل مکہ جانے کا کرتا ہے اتنا ہی دل مدینہ جانے کا کرتا ہے، جتنا دل مکہ نا چھوڑنے کا کرتا تھا، اتنا ہی دل مدینہ نہ چھوڑنے کرتا تھا، اور جتنا دل پھر سے مکہ جانے کا کرتا ہے اتنا ہی دل مدینہ دوبارہ جانے کا کرتا ہے۔

جس طرح مکہ میں لوگوں کو اللہ کی یاد میں تڑپتے اور روتے ہوئے محسوس کیا، اسی طرح مدینے میں بھی لوگوں کو صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں تڑپتے اور روتے ہوئے دیکھا۔ اور خود کو بھی اسی طرح کی کیفیت سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دنوں ہی مقامات عشقِ الٰہی اور عشقِ نبوی منزلیں ہیں جو ظاہری طور پر تو الگ الگ ہیں مگر روحانی طور پر آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ دونوں مقامات کی زیارت کے بعد ہی بے چین دل کے احساس کی تکمیل ہوتی ہے۔ روحانیت کا سفر مکہ سے شروع ہوتا ہے تو مدینہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی ایسے مقامات ہیں جن پر ہزار بار حاضری دے کر بھی دل نہیں بھرتا بلکہ تشنگی اور بڑھتی جاتی ہے۔

22. پسندیدہ کتاب یا ناول کونسا ہے؟

جب میں نے پہلی دفعہ قران ترجمے کے ساتھ پڑھا، تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہی قران تھا جسے پڑھ کر صحابہ روتے جاتے تھے، پھر یہ سوچا کہ مجھ پہ تو ایسی کیفیت آئی ہی نہیں، پھر یہی سوچ کر قران دوبارہ پڑھنا شروع کیا، پھر وہ پہلی آیت آ ہی گئی جس پر انتہا کی رقعت قائم ہوئی اور 45 منٹ تک میں اس آیت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

پارہ نمبر 4، آیت نمبر 188، سورت ال عمران

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۱۸۸

آپ ہر گز خیال نہ کریں کہ جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں اور اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کئے ان پر ان کی تعریف کی جائے ان کے بارے میں آپ ہر گز یہ خیال نہ کریں کہ وہ عذاب سے چھوٹ گئے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ الفاظ میرے کانوں سے گزرتے اور میرے ماضی اور حال کے حالات میرے سامنے گھومنے لگتے، اگر مجھے کبھی کسی نے دھوکہ دیا، تو اس کے پیچھے جھوٹی تعریفیں ہی نظر آئیں، اور پروفیشنل لائف میں بہتر سے بہتر پراگرس کے لیے ہمیں یا اپنی کمپنی یا اپنے پراڈکٹس یا اپنی سروس کی خاطر خواہ تعریف کرنی یا کروانی پڑتی۔ میری زندگی کی فلاسفی کو بدلنے کے لیے یہ ایک آیت کافی تھی۔

میں اپنے آپ کو اسی دن سے مسلمان سمجھتا ہوں، اسلام کی روح کیا ہوتی ہے، اللہ کو یاد کیسے کیا جاتا ہے اس کے لیے رویا اور تڑپا کیسے جاتا ہے، میری ذات اس طرح کی کسی بھی کیفیت سے سطحی طور پر بھی ناواقف تھی۔

قران پڑھیئے، دنیا میں ہماری ذات کو جھنجوڑنے کے لیے اس سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اتاری گئی اسی لئے اسے مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے۔ ایک اور جگہ اللہ فرماتا ہے، کیا تمہیں پوری زندگی میں اتنا وقت نہیں ملا تھا، کہ ایک دفعہ قران پڑھ لیتے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو قران پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے، اور اپنی ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رہنے کی طاقت بھی دے، امین۔

23. اردو زبان کا مستقبل آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

کسی بھی عمارت کو کھڑا کرنے سے پہلے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا جاتا ہے تاکہ اس پر ایک بڑی عمارت کھڑی ہو سکے۔ اگر بنیادیں کمزور اور کھوکھلی ہوں تو اس پر کچھ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آج ہمیں ہر ادارے اور محکمے میں بڑے بڑے مسائل نظر آتے ہیں جن کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیادیں مضبوط نہیں۔ صحافت کی بنیاد انفارمیشن پھیلانا ہے مگر صحافت ہمیں سوائے ڈس انفارمیشن کے اور کچھ کچھ پھیلاتے نظر نہیں آتی، غیر حتمی ذرائع سے پورا ہفتہ چلنے والی خبر حتمی نہیں نکلتی تو پھر ایک ہفتہ عوام کا سر کھانے والے میڈیا کا سر کھولنا بنتا ہے یا نہیں۔

ہماری ادبی صورتِ حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں، ایسا نہیں ہے کہ اردو ادب فروغ نہیں پا رہا، اردو ادب جس تیزی سے پھیل رہا ہے اس کا معیار اتنی ہی تیزی سے گر رہا ہے کیوں کہ اردو کو فروغ دینے والے ادارے اپنا کردار ادا نہیں کر رہے۔ من پسند لوگوں کو بڑی آسانی سے اوپر لایا جا سکتا ہے اور معیاری کام ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔

جہاں تک لوگوں کا اپنی ذاتی حیثیت میں کام کرنے کا معاملہ ہے، بہت سے لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں اور اردو ادب کے حقیقی فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اردو ادب کی بے لوث خدمت بھی کی جا رہی ہے مگر ادب کی خدمت کرنے والوں کی کوئی خدمت نہیں کرتا بلکہ ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ جیسے حقیقی ادب لاوارث ویسے ہی حقیقی ادیب لاوارث۔

اردو کے فروغ کے لیے ہمیں چاہیئے کہ جن لوگوں نے اردو ادب میں اپنی زندگی صرف کر دی ان کے کام کو ایک جگہ اکھٹا کیا جائے اور اسے اگلی نسل تک پہنچایا جائے تاکہ ہماری نئی نسل اپنے کام کا آغاز وہی سے کرے جہاں سے موجودہ نسل اپنے کام کا اختتام کرے۔ نہ کے نئی نسل کو اپنا کام پھر سے صفر سے ہی شروع کرنا پڑے۔

24. فیس بک کی شاعری کو آپ کیسا دیکھتے ہیں اور فیس بک کی وجہ سے کیا نقصان پہنچا ہے ادب کو اور کیا فائدہ ہے؟

فیس بک خود شاعری نہیں کرتی بلکہ ایک پلیٹ فارم فراہم کرتی ہے جس پر ہم جس طرح کے ادب کو چاہیں متعارف کروا سکتے ہیں۔ فیس بک اپنے آپ میں ایک دنیا ہے جس میں ہر طرح کے لوگ پوری دنیا سے شامل ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا ایک الگ کلچر ہے جو کہ بہت سی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس دنیا کے اندر آپ اپنی ایک الگ دنیا بناتے ہیں جس میں آپ کے جاننے والے اور ناواقف لوگ شامل ہوتے ہیں۔ پھر آپ ان لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے بھی ہیں اور ان کے پیغام کو پڑھتے بھی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی نے فیس بک میں آپ کو بہت سی سہولیات فراہم کر دی ہیں جس میں آپ اردو ادب کی تحریر، آواز اور ویڈیو تک شئیر کر سکتے ہیں مذید یہ کہ آپ براہ راست ٹیکسٹ، آڈیو اور ویڈیو پیغام کا تبادلہ بھی کر سکتے ہیں۔

اگر آپ فیس بک کے کمرشل استعمال کی طرف جاتے ہیں تو آپ اپنی ادبی تخلیق کو بہت سے لوگوں تک رسائی دینے کے لیے اس کی باقاعدہ ایڈورٹائزنگ بھی کر سکتے ہیں اور آپ کا پیغام ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، بلکہ کڑوڑوں لوگوں تک بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے آپ کو اپنے گھر یا دفتر سے کہیں اور جانے کی ضرورت بھی نہیں۔

ٹیکنالوجی کے ذریعے ادب کو جو سہولیات ملی ہیں وہ شائید ہمیں اپنی حقیقی دنیا میں بھی کبھی نہ مل پاتیں۔ یہ وہ سہولتیں ہیں جن کے بارے میں شاید صرف 25 سال پہلے کے شعراء نے بھی کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دن رات ان سہولیات میں تیزی سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ لاکھوں ادیب اپنی ادبی سرگرمیاں فیس بک پر ڈالتے رہتے ہیں اور اپنی کیمونٹی کو اپ ڈیٹ کرتے رہتے ہیں۔ اب تو یوں تصور کیا جاتا ہے کہ ادیب فیس بک پر نہیں وہ سرے ہے موجود ہی نہیں۔ ٹیکنالوجی وقت کی ضرورت ہے اور اسے ضرورت کے مطابق استعمال کر لیا جائے تو اس میں کوئی ہرج بھی نہیں۔

اب اس کا دوسرا رُخ بھی دیکھتے ہیں، فیس بک جتنی بڑی دوکان ہے اس کا پکوان اتنا ہی پھیکا ہے۔ سو آپ کا بہت سارا وقت بے ذائقہ گزر جاتا ہے اور بعض دفعہ تو انتہائی بد ذائقہ بھی گزرتا ہے۔ جتنی تیزی سے معیاری کام لوگوں تک پہنچتا ہے اس سے دوگنی رفتار سے غیر معیاری کام بھی لوگوں تک پہنچتا ہے۔ جتنی تیزی سے آپ لوگوں کی نظر میں آتے ہیں اس سے دوگنی رفتار سے آپ لوگوں کی نظر سے گر بھی سکتے ہیں۔ جتنی زیادہ سہولتیں اتنی ہی زیادہ احتیاط۔ پھر فیس بک 9 سے 5 بجے تک بھی نہیں، کیونکہ یہ 24 گھنٹے چلتی ہے اس لیے یہ آپ کی ذاتی زندگی میں گھس کر آپ کی پرائیویسی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے۔ بہت سے لوگ اذیت ناک تجربات کی وجہ سے ورچیول سوسائیڈ بھی کر چکے ہیں۔

25. محبت کیا ہے آپ کی نظر میں ؟

میری نظر میں محبت ایک قرض ہے اور اس قرض کی پوری قدر کرنی چاہیے۔ جہاں سے محبت نصیب ہو وہاں اسے کم از کم اس کی قدر کے مطابق واپس بھی لوٹانا چاہیے، حالانکہ محبتوں کے قرض پوری طرح اتارے نہیں جا سکتے۔ انسان کے پیدا ہونے سے پہلے محبت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ جس جوڑے سے محبت کرتا ہے اُسے اُن کی محبت کا اور اپنی محبت کا عظیم تحفہ عطا کرتا ہے۔ بچے دنیا میں آنے سے پہلے ہی ماں باپ کی آنکھوں کے تارے بن جاتے ہیں اور جانے کیا کیا خواب والدین ان بچوں کے لیے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر وہ ان خوابوں کی تکمیل کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں کون ہے جو رب کا احسان اتار سکے اور اپنے ماں باپ کا قرض اتار سکے۔ اسی طرح ہمارے اساتذہ اور ہمارے دوستوں کی محبت کا بھی ہم پر قرض رہتا ہے جو ہماری زندگی کو خوبصورت بھی بناتے ہیں اور با مقصد بھی۔ محبت کا قرض محبت سے ہی اتارا جا سکتا ہے، جیسی ہمیں جس جس سے محبت ملی ویسی ہی محبت ہمیں ان سب کو واپس بھی دینی چاہیے اور جو محبت معاشرے نے ہمیں دی وہی محبت ہمیں واپس اسی معاشرے کو بھی دینی چاہیے۔ اور اگر اللہ کا فضل ہمارے ساتھ نہ ہو تو ہمیں کچھ بھی نصیب نہ ہو، اللہ اپنے بندوں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے تو ہم سب سے زیادہ مقروض اس ہستی کے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا سو ہمیں اپنے خالق کی محبت کا قرض اس سے اور اس کے لوگوں سے محبت کر کے اتارنا چاہیے۔

26. شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے شاعری کیا ہوتی ہے؟

شاعری میری نظر میں ایک خوبصورت احساس ہے، ایسا ہی احساس جیسا ایک مصور کو اپنی تصویر سے ہوتا ہے، ایک باغبان کو اپنے باغ سے ہوتا ہے، ایک فن کار کو اپنے فن سے ہوتا ہے یا پھر ایک تخلیق کار کو اپنی تخلیق سے ہوتا ہے۔

شاعری میرا سب سے آخری شوق ہے، جب میرے پاس کچھ بھی اور کرنے کے لیے نہیں ہوتا تو میں شاعری کر لیتا ہوں، اسی لیے میں اپنے آپ کو کبھی بھی باقاعدہ شاعر نہیں کہتا۔

اتنے کم لگاؤ کے باوجود بھی شاعری میرے لیے بہت کچھ رہی ہے۔ جیسے کہ شاعری میری تنہائیوں اور رتجگوں کی ہمسفر رہی ہے۔ خوشیوں میں عید کے احساس کی طرح رہی ہے، اور غموں میں میری غمگسار بھی رہی ہے۔ میرے احساس کی عکاس بھی رہی ہے اور میرے جذبات کی زبان بھی رہی ہے۔ میں جب بھی تھک کر ہارا یا پھر ٹوٹ کر بکھرا شاعری نے ہمیشہ مجھے سمیٹا اور میری بھرپوری حوصلہ افزائی کی۔

جب میں نے قران کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا تو شاعری کی وسعت نے ایک معلم کا کردار ادا کیا۔ بہت سی آئیتیں جو میرے دل میں گھر کر گئیں وہ شاعری کی بحروں میں بھی سموتی چلی گئیں اور زندگی کے نشیب و فراز میں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں میرے سینے میں ٹھہریں اور میری زبان سے رواں ہوتی رہیں۔

27. کوئی ایسے لمحات یا دور جس کے آنے کی خواہش ہو؟

ویسے تو زندگی کے آسمان پر بہت خوبصورت لمحات کے ستارے جھلملاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مگر کچھ لمحات ایسے ہیں جن کو مول ادا نہیں کیا جا سکتا۔ سعادت سے بھرے ہوئے جو لمحات خانہ کعبہ کو پہلی نظر میں دیکھتے، خانہ کعبہ کا طواف کرتے، صفا اور مروا کے چکر لگاتے، خانہ کعبہ کے غلاف کو چھوتے، اور ہجرہ اسود کو چومتے ہوئے گزر گئے یقینا ان سے قیمتی اور کچھ بھی نہیں۔ وہ لمحات بھی بہت قیمتی ہیں جو مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں روضہء رسول کے پاس گزرے یا پھر جنت البقی کے قریب گزرے۔ ایسے سعادت بھرے لمحات جن کا شکرانہ آج بھی پاک اشکوں سے ادا کیا جاتا ہو ایسے لمحات کو بار بار پا لینے کی خواہش کون نہیں کرتا ہوگا۔ دعا ہے اللہ کسی کو اس سعادت سے محروم نہ کرے اور جسے یہ سعادت نصیب ہو اسے بار بار نصیب ہو۔۔۔ آمین

28. آپ کی نظر میں تخلیق کسے کہتے ہیں؟

خالق نے اپنے حکم سے ہر چیز تخلیق کر دی ہے اور ہم اُس کی بادشاہی میں اپنے حصے کی وہ گھڑیاں گزارتے ہیں جن کا تعین اس نے پہلے سے ہی کیا ہوا ہے۔ انسان کو جوڑ توڑ کا محدود سا علم دیا گیا ہے، میرے خیال کے مطابق انسان کچھ تخلیق نہیں کرتا بلکہ اللہ کے دیے ہوئے علم سے کچھ چیزیں مرتب کرتا ہے اور پھر خود کو ان کا خالق بنالیتا ہے۔ جبکہ خالق تو صرف اللہ کی ہی ذات ہے۔ ایک خوبصورت آیت ہے کہ

ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو بمقدار مناسب اُتارتے رہتے ہیں۔ الحجر، 20،21

سو اللہ جسے چاہتا ہے اپنے وسیع علم میں سے محدود علم عطا کرتا ہے ہمیں اپنے علم یا اپنی تخلیق پر اترانے کی بجائے اُس رب کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے ہمیں اپنے علم میں سے حصہ دیا۔

29. ایسی کونسی عادت جو اپنانا چاہتے ہوں اور ایسی کون سی عادت گھر والے بھی بیزار ہوتے ہیں؟

ایک مثال ہے:

فرض کریں اک انسان کے ہاتھ میں کامن پن یا سوئی ہے اور وہ اس کو دوسرے انسان کے جسم پر مارتا ہے یا چبھو دیتا ہے۔ تو جو تکلیف متاثرہ انسان کو ہوتی ہے، تکلیف دینے والا انسان اُس کی کیفیت یا اُس کے احساس کو پوری زندگی سمجھنے کی کوشش بھی کرتا رہے تو اُسے سمجھ نہیں سکتا، جب تک کہ وہ سوئی یا کامن پن واپس اسی انسان کو آ کر نہ لگے۔ ایک انسان کے ہاتھ سے کسی دوسرے انسان کو پہنچنے والی تکلیف کے احساس کو سمجھنے کی اس سے اچھی مثال مجھے پوری زندگی میں کوئی اور نہیں ملی۔

اس مثال نے مجھے کافی حد تک مجھے اپنا آپ تبدیل کرنے میں مدد کی ہے

میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ میرے ہاتھوں سے کسی کو تکلیف نہ ہو، اور میری خواہش ہے کہ میں اپنی اس عادت کو اور مضبوط کروں۔ اسی طرح اس عادت کا دوسرا پہلو جس میں انجانے میں کسی کو تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف دینے والے کو اس کا نہ ہی احساس ہوتا ہے اور نہ ہی خبر

اس معاملے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ اور زبان کی حفاظت کرے تاکہ میرے ہاتھوں سے کسی کو تکلیف نہ ہو اور نہ ہی میری زبان سے کسی کو رنج پہنچے امین۔

30. اُردو ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے کوئی پیغام؟

اردو ادب سے وابستہ لوگوں سے سوال بھی ہے اور ایک پیغام بھی، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ عوامی شاعر کہاں گئے

جب ایوب خان کا دور آیا

تیرا پاکستان ہے نہ میرا پاکستان ہے

یہ اس کا پاکستان ہے جو صدرِ پاکستان ہے

اقتدار ایوب خان سے جنرل یحییٰ خان کو منتقل ہوا تو حبیب جالب نے اُن کو بھی اسی لب و لہجے سے مخاطب کیا کہ

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا

اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

"حبیب جالب کا بھٹو کو "خراج تحسین

میں قائد عوام ہوں

جتنے میرے وزیر ہیں سارے ہی بے ضمیر ہیں

میں انکا بھی امام ہوں میں قائد عوام ہوں

جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو حبیب جالب نے نئے آمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا

آمریت کے بعد جب پیپلز پارٹی کا پہلا دور حکومت آیا اور عوام کے حالات کچھ نہ بدلے تو جالب صاحب کو کہنا پڑا

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھریں ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

بے نظیر کے بعد نواز شریف کا دور شروع ہوا اور اُنہوں نے عوام کے لئے اپنے بلند بانگ دعوے شروع کئے تو عوامی شاعر بیماریوں کی پوٹ بن گئے تھے مگر اُن سے رہا نہ گیا۔ میاں نواز شریف نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں عوام کے لئے اپنی جان قربان کرنے کا مشہور بیان دیا تھا جس پر جالب نے کہا کہ

نہ جاں دے دو، نہ دل دے دو
بس اپنی ایک مل دے دو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا
تم اس کا بل دے دو

حبیب جالب

ظلم کے خلاف لکھنے کی روایات کم ہوتی جارہی ہیں، سسکیاں لیتی ہوئی عوام کا کوئی پرسانِ حال نہیں، اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

31. منتخب شاعری یا تحریر؟

الف: منتخب تحریر

قرانِ مجید کا بہترین شاہکار

میری ناقص عقل جس چیز کو قرانِ مجید کا بہترین شاہکار سمجھنے پر آمادہ ہے, میں اسے دوستوں سے ضرور شئیر کرنا چاہوں گا۔ قرانِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر طرح طرح کے مناظرے کئے ہیں، خاص طور پر جب محشر کے دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کرکے میدانِ محشر کر طرف لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قران میں ہر جماعت کے معاملات بیان کئے ہیں، ان جماعتوں میں ایک گناہ گار جماعت شامل ہے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، ایک دوسری جماعت جو پرہزگاروں کی ہو گی جن کے چہرے روشن ہوں گے اور ایک تیسری جماعت جو سب سے آگے بڑھ جانے والی جماعت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان جماعتوں کے آپس میں بحث و تکرار کو بھی قلم بند کیا ہے۔ یہ بحث و مباحثہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

اور جب وہ دوزخ کو اپنے سامنے دیکھ لیں گے اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ اس میں ڈالے جانے والے ہیں تو ہر گناہ گار جماعت طرح طرح کے عذر پیش کرے گی تاکہ کسی نہ کسی طرح دوزخ کے عذاب سے بچ جائے۔ ایک جماعت کہے گی کہ یا اللہ یہ ہمارے بڑے، ہمارے عالم، ہمارے حکمران، ہمارے آباؤاجداد، دوست احباب خواہ کوئی بھی جماعت جس نے ان کو بہکایا ہوگا وہ اس کے بارے میں کہیں گے کہ انہیں دوگنا عذاب دیا جائے کیوں کہ انہوں نے ان کی زندگی اور آخرت تباہ کر دی۔ اللہ فرمائے گا کہ ان کو بھی دگنا عذاب اور تم کو بھی دگنا عذاب تم عقل نہیں رکھتے تھے۔ یوں ہر جماعت اس طرح کے عذر قبول نہیں کئے جائیں گے۔

ایک اور جماعت کہے گی کہ یا اللہ ہم سے ہماری زمینیں، جائیدادیں، جاگیریں، سونا و چاندی، کاروبار، بال، بچے اور اہل خانہ خواہ جو کچھ بھی ان کی ملکیت ہو وہ سب لے لیا جائے اور کسی طرح ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ اس دن صرف اعمال کے سودے ہوں گے اور کسی سے ان کی ملکیت کا کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ ایک اور جماعت یہ کہے گی کہ یا اللہ اگر ہمیں دوبارہ دنیا میں جانا نصیب ہو تو ہم بھی نیک اعمال کریں اور گمراہوں میں نہ ہوں۔ تو ان کی یہ درخواست بھی رد کر دی جائے گی۔ ایک اور جماعت یہ کہے گی کہ یا اللہ ہمیں تو شیطان نے گمراہ کر دیا تھا،

تو شیطان جواب دے گا کہ یا اللہ مجھ میں طاقت نہ تھی کہ ان سے کوئی گناہ کرواسکتا میں انہیں دور سے بلاتا تھا اور یہ خود ہی دوڑے چلے آتے تھے۔ تو اس جماعت کا یہ عذر بھی جاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہر گناہ گار جماعت کے ہر طرح کے عذر ان کو واپس کر دیے جائیں گے اور گناہ گار انسان یا جماعت کے ہاتھ میں صرف مایوسی اور بے بسی ہی رہ جائے گی۔

اب گناہ گار انسان یا جماعت کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اب سارے عذر ختم ہو گئے ہیں اور بچنے کی کوئی تدبیر باقی نہیں رہی اور اب اس کا ٹھکانہ صرف دوزخ ہے۔ اور جب دوزخ کے داروغہ انہیں دوزخ کی طرف ہانکتے ہوئے لے جا رہے ہوں گے، اور ان کے چہروں پر رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا، اور ان کے دل اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے پھر ہم کلام ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس وقت تمہاری ذات جس قدر بیزار ہو رہی ہے کہ دوزخ میں ڈالی جائے گی، اللہ کی ذات اس سے کئی گناہ زیادہ بیزار ہوتی تھی جب تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کی راہ اختیار کیا کرتے تھے۔

ب: منتخب حمد و ثنا

حمد باری تعالی

پھیلا ہوا ہے چار سُو یہ رَب کا نور ہے
میں کیا ہوں مجھ کو کس لیئے خود پر غرور ہے

مجھ بے خبر کو آج تک اپنی خبر نہیں
میرے لہو میں دوڑتا رَب کا شعور ہے

حیراں ہے عقل اُس کی عطاؤں پہ ہر گھڑی
یوں نعمتوں میں بھر دیا رَب نے سرور ہے

رُوشن کتاب خیر و بقاء کی نوید ہے
بے علم اِس کی رحمتوں سے کتنا دور ہے

بدکار، گناہگار پہ اپنا فضل کیا
توبہ کے در پہ ہوں کھڑا کہ وہ غفور ہے

شاعر: میاں وقار الاسلام

حمد باری تعالی

زباں ذکرِ الٰہی سے کبھی خالی نہیں ہوتی
ہوں جیسے بھی مرے حالات بدحالی نہیں ہوتی

یہاں زندہ دلوں پر ہی تو خوشیاں راج کرتی ہیں
اگر چھائی ہو مایوسی تو خوشحالی نہیں ہوتی

کبھی مردہ دلوں کی حسرتیں پوری نہیں ہوتیں
مگر ایمانِ کامل سے بداعمالی نہیں ہوتی

اگر منزل ہی باطل ہو ڈگر سیدھی نہیں ہوتی
مسافت راہِ حق پر ہو تو پامالی نہیں ہوتی

یہاں نظرِ جہاں دیدہ بہت مسرور ہوتی ہے
بدل ڈالے اگر دل سمت ہریالی نہیں ہوتی

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : شہرِ داغدار

حمد باری تعالی

شاید عمل یہ میرا پسندیدہ نہیں ہے
مایوسیوں سے آنکھ یہ نم دیدہ نہیں ہے

میں کیسے بڑھوں آگے نظر کچھ نہیں آتا
اندھی ہے عقل کیونکہ جہاں دیدہ نہیں ہے

نظریں چرا کے یاں سے چاہوں گا میں گزرنا
رب سے یہ جانو کچھ بھی تو پوشیدہ نہیں ہے

عاصی نے بھی اپنے پر ہیں ظلم بہت ڈھائے
اور اپنے کیے پر بھی رنجیدہ نہیں ہے

توبہ تو کر لی ڈر کر رب سے وقار تو نے
لگتا ہے تیرا دل تو سنجیدہ نہیں ہے

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : شہرِ داغدار

حمد باری تعالی

چاہا ہم نے سورج کو بھی
چاند سے ہم نے الفت کی ہے

عکس خدا کا ہر ذرے میں
ذروں نے بھی عبادت کی ہے

حیا پروئی ہے نظروں میں
ہر انسان کی عزت کی ہے

اہل وفا سے دنیا بھر کے
ہر باسی نے شرارت کی ہے

رب سے پیار کیا ہے جس نے
اس نے سب سے محبت کی ہے

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوزِ محشر

حمد باری تعالی (نظم)

اپنے فضل سے کر عطا مولا

میرے شکر پہ نہ جا مولا

میرا شکر ہے ہی کیا مولا

اپنے فضل سے کر عطا مولا

میرے صبر پہ نہ جا مولا

میرا صبر ہے ہی کیا مولا

اپنے فضل سے کر عطا مولا

میرے ذکر پہ نہ جا مولا

میرا ذکر ہے ہی کیا مولا

اپنے فضل سے کر عطا مولا

میری نذر پہ نہ جا مولا

میری نذر ہے ہی کیا مولا

اپنے فضل سے کر عطا مولا

میری فکر پہ نہ جا مولا

میری فکر ہے ہی کیا مولا

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : شہرِ داغدار

ب : پہچان غزلیں

اُبھرتے سورج کا سلام تیرے نام کر دیتا
دن کے سارے تام جھام تیرے نام کر دیتا

سردیوں کی دھوپ ساری گرمیوں کی چھاؤں بھی
موسموں کی سرد شام تیرے نام کر دیتا

اختیار ہوتا گر اس بہار پر میرا
رنگ و بو کے انتظام تیرے نام کر دیتا

دل کی کیفیت کو میں جب بیان کر سکتا
حسرتوں کے سب کلام تیرے نام کر دیتا

قید میں جو کر سکتا ان حسین لمحوں کو
آنے والے سب ایام تیرے نام کر دیتا

شاعر : میاں وقار الاسلام

سُنا ہے آج کی رات چاند نظر نہیں آیا
شاید مجھ سے رُوٹھا تھا جو اِدھر نہیں آیا

دل کی بازی میں تم سے ہار بیٹھا تھا
باز تو پھر بھی اے بازی گر نہیں آیا

دیارِ بے خبر سے ناداں کو میرا تجسّس تھا
پر اِدھر بھولے سے بھی وہ بے خبر نہیں آیا

اُسے گلہ ہے میں نے بھلا دیا اُس کو
کیسے اُسے بتاؤں کب اُس کا ذِکر نہیں آیا
تیرے بغیر در بدر کتنا چلیں گے اب وقار
ہم پہ ٹوٹا قہر جو تجھ کو نظر نہیں آیا

شاعر: میاں وقار الاسلام

یہ جدائی تو بہت مشکل ہے
میرے ہمدم ترے وصال کے بعد

سال گذرا ہے سال گذرے گا
تم تو آؤ گے ایک سال کے بعد

میری آنکھیں تو بھیگ جاتی ہیں
پھر سے تیرے حسیں خیال کے بعد

دوستی کی مثال کیسے دوں
میرے ہمدم تری مثال کے بعد

میرے سارے جواب ہار گئے
ترے اک لاجواب سوال کے بعد

شاعر: میاں وقار الاسلام

کیسی زمیں کیسا آسماں یارب
عجب حیرت کا مکاں یارب

کوئی تو ہے فرشتہ یہاں
اور کوئی ہے شیطاں یارب

دل اسی بات کو سمجھ نہ سکا
کسے کہتے ہیں انساں یارب

یوں تو انسان نے ترقی کی
اور ہوتا گیا حیواں یارب

مجھے وہ قوتِ گویائی دے
جو ہو تیری بھی ترجماں یارب

شاعر: میاں وقار الاسلام

اُس کی آنکھوں پہ کیا کہا جائے
اُس کے ہونٹوں پہ کیا لکھا جائے

وہ تو ہے زندہ غزل کی صورت
اُس کے بارے میں کیا کہا جائے

اور کبھی بیٹھ کر اکیلے میں
اُس کی آواز کو سنا جائے

وہ اچھوتا خیال ہے اُس کو
خواب طرح سے بُنا جائے

یا کبھی دستِ دعا پھیلا کر کر
واسطے اپنے ہی مانگا جائے

شاعر: میاں وقار الاسلام

آسماں سر پہ کھڑا ہو جیسے
شہر ویران پڑا ہو جیسے

سرنگوں اس طرح ہے سارا نگر
کوئی احسان گڑا ہو جیسے

زندگی ایسا اک نگینہ ہے
دل مفلس میں جڑا ہو جیسے

اس طرح تجھ کو ہے محسوس کیا
تو میرے ساتھ کھڑا ہو جیسے

ایسا احساس دلاتا ہے بشر
سب فرشتوں سے بڑا ہو جیسے

شاعر: میاں وقار الاسلام

چند روز اپنی تم سے جو قربت نہیں رہی
تم سمجھے یہ کہ مجھ کو محبت نہیں رہی

گہرا ہے رگ و جان سے رشتہ تجھ سے
سوچا بھی کیسے تم نے کہ اُلفت نہیں رہی

اِس گردشِ دوراں نے چکرا دیا مجھے
اور مجھ میں سنبھل جانے کی طاقت نہیں رہی

کیا شام ڈھل گئی کسی سائے کی طرح سے
یا دوستوں کو میری ضرورت نہیں رہی

دھاگوں سے زیادہ نازک رشتے ہیں اپنے دل کے
اُلجھے تو اِن کی پہلی سی صورت نہیں رہی

شاعر: میاں وقار الاسلام

تم میری محبت ہو میری سزا نہیں ہو
اک بار کہہ دو مجھ سے کہ تم خفا نہیں ہو

تیرا خیال میری راتوں کا ہمسفر ہے
ان رت جگوں سے پوچھو کہ تم تنہا نہیں ہو

میں تیرے بعد کتنا بے آسرا ہوا ہوں
اپنے ہی دل سے پوچھو تم بے آسرا نہیں ہو

اس بے رخی پہ میری تم بھی تو روٹھتے ہو
پرواہ نہیں جو مجھ کو تم بے پرواہ نہیں ہو

مانا خطائیں میری بے حد شمار ہوں گی
میں بھی نہیں فرشتہ تم بھی خدا نہیں ہو

شاعر: میاں وقار الاسلام

بتائیں یہ کیسے کہ جذبات کیا ہیں
زباں پہ یہ اٹکی ہوئی اک صدا ہیں

یہ قطرے جو پلکوں پہ ٹھہرے ہوئے ہیں
مسلسل مرے ضبط کی انتہا ہیں

مجھے مثلِ شمع جلاتی ہیں شامیں
یہ دن ہجر کے بھی صبر آزما ہیں

جھکائیں جو پلکیں تو میں نے یہ دیکھا
کوئی بھی نہیں آپ جلوہ نما ہیں

مری شعر گوئی ہے ذکرِ مسلسل
نمازیں مری تیرے حق میں دعا ہیں

شاعر: میاں وقار الاسلام

ذہنوں کو نئی سوچ نرالے خیال دے
یہ شہر داغ دار ہے اِس کو اُجال دے

کیوں قوم بھول بیٹھی ہے اپنی اَساس کو
فرعونیت کو سب کے دلوں سے نکال دے

اِس نے بھلا دیے سبھی افکار اور ہنر
یہ قوم لازوال ہے اِس کو کمال دے

کامل تھا تیرا دین ہے گیا عاملوں کے ہاتھ
بوجہل کو ہمارے سروں سے تو ٹال دے

جانے کیوں لے اُڑی ہے خزاں موسمِ بہار
پھولوں سے خوشبیوں سے چمن کو جمال دے

شاعر: میاں وقار الاسلام

شام و سحر پہ میرے حصے لکھے ہوئے ہیں
ڈھلتے لمحوں پہ میرے قصے لکھے ہوئے ہیں

میرا حال و ماضی میں نے لکھا ہے
باقی افسانوں کے عرصے لکھے ہوئے ہیں

میری غزلیں میرے من کے قصے ہیں
غم جو بھلائے پھر سے لکھے ہوئے ہیں

مردہ دلوں کی آنکھ میں آنسو کب آتے ہیں
سوکھا میرا دامن برسے لکھے ہوئے ہیں

میری زمین بھی مجھ کو کتنا کھا پائے گی
سارے بدن پہ میرے ورثے لکھے ہوئے ہیں

شاعر: میاں وقار الاسلام

ت: منتخب نظمیں

بس اتنی دعا ہے میری

سینے میں غم برابر نہیں
چشمِ پُرنم برابر نہیں
بس اتنی دعا ہے میری
جب اشک پیمانے کھلیں
تم پہ صبر دھانے کھلیں
تم آنسوؤں کو پی سکو
تم غموں میں جی سکو
کون غموں سے ابتر نہیں
زندگی پھولوں کا بستر نہیں
پھر سے جینے کا راستہ دے
خدایا باقی سفر آراستہ دے

بس اتنی دعا ہے میری

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: شہر داغدار

دل آج بھی مقروض ہے

ریت کے گھروندوں کا
ٹوٹے ہوئے کھلونوں کا
کاغذ کے بیڑوں کا
بارش کے ریلوں کا

دل آج بھی مقروض ہے

چمکتے ہوئے جگنوؤں کا
رنگ برنگی تتلیوں کا
کمسن کھلتی کلیوں کا
نِت نئی بہاروں کا

دل آج بھی مقروض ہے

کچے پکے خوابوں کا
بھولی بسری یادوں کا
کھٹی میٹھی باتوں کا
بے نام رشتوں کا

دل آج بھی مقروض ہے

بن مانگی دعاؤں کا
تسلسل سے عطاؤں کا
بے بہا رحمتوں کا
بے شمار نعمتوں کا

دل آج بھی مقروض ہے

آنکھوں کے سمندر کا
اُمنڈتے قیمتی اشکوں کا
چھلکتے انمول موتیوں کا
بھیگتے کانپتے ہونٹوں کا

دل آج بھی مقروض ہے

ماں کی محبت کا
باپ کی شفقت کا
بے پناہ اُلفت کا
دونوں کی عظمت کا

دل آج بھی مقروض ہے

ہر روز کی خطاؤں کا
چھوٹی موٹی سزاؤں کا
ہلکی پھلکی آہوں کا
محفوظ پناہوں کا

دل آج بھی مقروض ہے

اُلٹے پھلٹے لفظوں کا
ٹوٹے پھوٹے شعروں کا
ٹیری میٹری باتوں کا
بے عنوان تحریروں کا

دل آج بھی مقروض ہے

کاغذ میں لپٹے خیالوں کا
پل میں گزرے سالوں کا
سوزِ عشق کے احوالوں کا
دل میں پھوٹے چھالوں کا

دل آج بھی مقروض ہے

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: شہر داغدار

تم شاعری سمجھتے ہو

اپنے احساسات کو

تحریر کیا ہے

میں نے جذبوں کو

الفاظ پہنائے ہیں

تم شاعری سمجھتے ہو

میں خوشبو کی طرح

بکھرا بھی ہوں

میں نے پھولوں سے

رنگ چرائے ہیں

تم شاعری سمجھتے ہو

ساون کی طرح

برسا بھی ہوں

ویران آنکھوں میں

آنسو سجائے ہیں

تم شاعری سمجھتے ہو

شمع کی طرح

دل جلایا ہے

پروانوں کی طرح

پر جلائے ہیں

تم شاعری سمجھتے ہو

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: شہر داغدار

چشمِ آوارہ

اے چشمِ آوارہ
تو چشمِ تَر میں
ڈُوب جائے گی
تو کہاں جائے گی
دل کے رِشتوں کی
اَگر مگر میں
ڈوب جائے گی
تو کہاں جائے گی

یہ زیرِ جوبن
پڑی مدھوشیاں
یہ اَدا میں اُمنڈتی شوخیاں
یہ مغرور سی طبیعت
لڑکھڑاتے ڈگمگاتے
بے سہارا
جذبوں کی لہر میں
ڈوب جائے گی
تو کہاں جائے گی

یونہی چلتے پھرتے

کسی دن

شام کے وقت

سوچ کی وادیوں میں

کہیں

مجھے دیکھ کے

چونکے گی

پچھلے پہر میں

ڈوب جائے گی

تو کہاں جائے گی

اے حسرتِ دلِ ناداں

تجھے بَر آنا ہے

تو اُٹھ جا

حالات سے لڑنا سیکھ

یہ داستان عشق بھی

رواج کے بھنور میں

ڈوب جائے گی

تو کہاں جائے گی

ہاں اور ناں کی

زنجیر سے تم

باندھے رکھنا خیالوں کو

زندگی اسی کشمکش

کی زیر و زبر میں

ڈوب جائے گی

تو کہاں جائے گی

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : من کٹھرا

محور تم ہو

جام ساغرِ حیات کی

سبھی لہروں بحروں کا

محور تم ہو

نشیب سے فراز تلک تم

رواں جھرنوں کا

محور تم ہو

مانندِ مہتابِ شبِ روشن تم

اور تیرا وصالِ جاں نثار

من کے سمندر میں

اُمنڈتے ہوئے طوفانوں کا

محور تم ہو

چنچل سی کہکشائیں

جب پھیلاتی ہیں

فلک پہ عروسی آنچل

گھٹا کے چلمن سے جھانکتے

انگنت ستاروں کا

محور تم ہو

مانندِ شمعِ فروزاں تیرا طلسم

اور محفلِ شبِ غارت

جلتے ہوئے پروانوں کی

پتھرائی ہوئی آنکھوں کا

محور تم ہو

دل کی دھڑکنیں چلتی ہیں

جن مداروں پہ

تھم تھم کر

اُن اُونچے نیچے

ٹیڑھے میڑھے

راستوں کا

محور تم ہو

شاعر: میاں وقارالاسلام

تصنیف: من کٹھرا

32. آخر میں نوجوان نسل کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں؟

مسکراہٹ اور آنسو دونوں کا تعلق انسان کے احساسات سے ہوتا ہے۔ میٹھی زبان احساسات میں رس گھول سکتی ہے۔ تلخ زبان احساسات کو زخمی کر سکتی ہے۔ نوجوان نسل کے لیے پیغام ہے کہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم کسی کے آنسو کی وجہ نہ بنیں۔ ساتھ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کسی کی مسکراہٹ کی وجہ بن سکیں۔ خاص کر کے ہمیں اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ ہماری وجہ سے کسی کی مسکراہٹ نہ دب جائے یا کوئی ہماری وجہ سے اپنے آنسو پی جائے اور ہمیں محسوس بھی نہ ہو۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

فاؤنڈر

وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم

www.waqarpk.com

میڈیا ایڈوائزر

ادب سرائے انٹرنیشنل

www.adabsaraae.com

پرنسپل کنسلٹینٹ

مارول سسٹم

www.marvelsystem.com

ڈائیرکٹر آپریشن

نیازی گروپ آف کمپنیز

www.niazigroup.com

میاں وقارالاسلام، انٹرویو، دعاآن لائن میگزین

انٹرویو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔اگست، ماہِ آزادی، سال 2020

انٹرویور: محترمہ حفضہ فریال بلوچ، شاعرہ/مصنفہ/کہانی نویس

نائب مدیرہ باب دعاآن لائن رسالہ

میاں وقارالاسلام، پرنسپل کنسلٹینٹ مارول سسٹم، فاؤنڈر وقارِ پاکستان، ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ

پرنسپل ایڈوائزر اینڈ کنسلٹینٹ: ادب سرائے انٹرنیشنل، ایکوکیئر کنسلٹینسی سرویز

www.marvelsystem.com | www.waqarpk.com | www.niazigroup.com

www.adabsaraae.com | www.ecocare.pk

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔آپ کا نام۔اور قلمی نام۔

میرا نام میاں وقارالاسلام ہے اور میں نے اپنا ادبی یا قلمی نام تبدیل نہیں کیا اس لیے میرا قلمی نام بھی یہی ہے۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔ لکھنے کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟۔

میری گُم نام شاعری کا آغاز تو شاید میرے ہوش سنبھالتے ہی میرے لاشعور کے کسی کونے میں ہو چکا تھا۔ یہ سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ جواں ہوتے احساسات اور جذبات میں رنگتا گیا۔ 1993 سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا، اُس وقت میری عمر تقریباً 16 سال کے لگ بھگ تھی اور میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ادب سے وابستہ مشاغل ؟۔

ماہانہ وسالانہ لیٹریری و کمرشل میڈیا رپورٹس، لیٹریری و کمرشل ایونٹ نیوز، لیٹریری و کمرشل انٹرویوز، سپلیمنٹس، ایڈوٹائزنگ، آرٹیکلز، شاعری، ٹی وی، ریڈیوز اینڈ نیوز پیپر سکریپٹس کی اشاعت اور براڈکاسٹنگ کے حوالے سے 150 سے زیادہ لوکل اور انٹرنیشل میڈیا چینلز سے رابطہ رہا جن میں ریڈیو، نیوز پیپرز، ٹی وی، میگزینز اور مختلف آن لائن نیوز ویب سائٹس بھی شامل ہیں۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ کے خیال میں اچھا ادب کیا ہے ؟۔

اچھا ادب دکھی عوام کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے، عوامی مسائل کے حل وضع کرتا ہے، اچھی روایات کا تحفظ کرتا ہے، قومی ویلوز مضبوط کرتا ہے، باہمی ربط اور ہم آہنگی بڑھاتا ہے، معاشی و معاشرتی تناؤ کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ سماجی گراوٹ کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ادب کے اثرات بچوں سے لے کر بڑوں تک سب میں نظر آتے ہیں، پڑھنے کو اچھا ملتا ہے، سننے کو اچھا ملتا ہے، دیکھنے کو اچھا ملتا ہے، جس سے لوگوں کے ذہنی تناؤ بھی کم ہوتے ہیں اور عوام میں شعور بھی بڑھتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ قوم ایک باشعور قوم بن کر سامنے آتی ہے۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اردو زبان کا مستقبل کیسے دیکھتے ہیں ؟۔

کسی بھی عمارت کو کھڑا کرنے سے پہلے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا جاتا ہے تاکہ اس پر ایک بڑی عمارت کھڑی ہو سکے۔ اگر بنیادیں کمزور اور کھوکھلی ہوں تو اس پر کچھ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آج ہمیں ہر ادارے اور محکمے میں بڑے بڑے مسائل نظر آتے ہیں جن کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیادیں مضبوط نہیں۔ صحافت کی بنیاد انفارمیشن پھیلانا ہے مگر صحافت ہمیں سوائے ڈس انفارمیشن کے اور کچھ کچھ پھیلاتے نظر نہیں آتی، غیر حتمی ذرائع سے پورا ہفتہ چلنے والی خبر حتمی نہیں نکلتی تو پھر ایک ہفتہ عوام کا سر کھانے والے میڈیا کا سر کھولنا بنتا ہے یا نہیں۔

ہماری ادبی صورتِ حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں، ایسا نہیں ہے کہ اردو ادب فروغ نہیں پا رہا، اردو ادب جس تیزی سے پھیل رہا ہے اس کا معیار اتنی ہی تیزی سے گر رہا ہے کیوں کہ اردو کو فروغ دینے والے ادارے اپنا کردار ادا نہیں کر رہے۔ من پسند لوگوں کو بڑی آسانی سے اوپر لایا جا سکتا ہے اور معیاری کام ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔

جہاں تک لوگوں کا اپنی ذاتی حیثیت میں کام کرنے کا معاملہ ہے، بہت سے لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں اور اردو ادب کے حقیقی فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اردو ادب کی بے لوث خدمت بھی کی جا رہی ہے مگر ادب کی خدمت کرنے والوں کی کوئی خدمت نہیں کرتا بلکہ ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ جیسے حقیقی ادب لاوارث ویسے ہی حقیقی ادیب لاوارث۔

اردو کے فروغ کے لیے ہمیں چاہیئے کہ جن لوگوں نے اردو ادب میں اپنی زندگی صرف کر دی ان کے کام کو ایک جگہ اکھٹا کیا جائے اور اسے اگلی نسل تک پہنچایا جائے تاکہ ہماری نئی نسل اپنے کام کا آغاز وہی سے کرے جہاں سے موجودہ نسل اپنے کام کا اختتام کرے۔ نہ کے نئی نسل کو اپنا کام پھر سے صفر سے ہی شروع کرنا پڑے

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاعری کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے شاعری کیا ہوتی ہے ؟

شاعری میری نظر میں ایک خوبصورت احساس ہے، ایسا ہی احساس جیسا ایک مصور کو اپنی تصویر سے ہوتا ہے، ایک باغبان کو اپنے باغ سے ہوتا ہے، ایک فن کار کو اپنے فن سے ہوتا ہے یا پھر ایک تخلیق کار کو اپنی تخلیق سے ہوتا ہے۔

شاعری میرا سب سے آخری شوق ہے، جب میرے پاس کچھ بھی اور کرنے کے لیے نہیں ہوتا تو میں شاعری کر لیتا ہوں، اسی لیے میں اپنے آپ کو کبھی بھی باقاعدہ شاعر نہیں کہتا۔

اتنے کم لگاؤ کے باوجود بھی شاعری میرے لیے بہت کچھ رہی ہے۔ جیسے کہ شاعری میری تنہائیوں اور رتجگوں کی ہمسفر رہی ہے۔ خوشیوں میں عید کے احساس کی طرح رہی ہے، اور غموں میں میری غمگسار بھی رہی ہے۔ میرے احساس کی عکاس بھی رہی ہے اور میرے جذبات کی زبان بھی رہی ہے۔ میں جب بھی تھک کر ہارا یا پھر ٹوٹ کر بکھرا شاعری نے ہمیشہ مجھے سمیٹا اور میری بھرپوری حوصلہ افزائی کی۔

جب میں نے قران کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا تو شاعری کی وسعت نے ایک معلم کا کردار ادا کیا۔ بہت سی آئیتیں جو میرے دل میں گھر کر گئیں وہ شاعری کی بہروں میں بھی سموتی چلی گئیں اور زندگی کے نشیب و فراز میں میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں میرے سینے میں ٹھہریں اور میری زبان سے رواں ہوتی رہیں۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ کی نظر میں تخلیق کسے کہتے ہیں؟

خالق نے اپنے حکم سے ہر چیز تخلیق کر دی ہے اور ہم اُس کی بادشاہی میں اپنے حصے کی وہ گھڑیاں گزارتے ہیں جن کا تعین اس نے پہلے سے ہی کیا ہوا ہے۔ انسان کو جوڑ توڑ کا محدود سا علم دیا گیا ہے، میرے خیال کے مطابق انسان کچھ تخلیق نہیں کرتا بلکہ اللہ کے دیے ہوئے علم سے کچھ چیزیں مرتب کرتا ہے اور پھر خود کو ان کا خالق بنالیتا ہے۔ جبکہ خالق تو صرف اللہ کی ہی ذات ہے۔ ایک خوبصورت آیت ہے کہ

ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو بمقدار مناسب اُتارتے رہتے ہیں۔ الحجر، 21،20

سو اللہ جسے چاہتا ہے اپنے وسیع علم میں سے محدود علم عطا کرتا ہے ہمیں اپنے علم یا اپنی تخلیق پر اترانے کی بجائے اُس رب کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے ہمیں اپنے علم میں سے حصہ دیا۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب تک کتنے افسانے، نظمیں یا غزلیں/کتابیں لکھ چکے ہیں اندازاً؟

میری پہلی کتاب کا نام "من کٹھرا" تھا جو سال 2009 میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کی رونمائی ہوٹل سن فورٹ لاہور میں ہوئی اور پروگرام کی صدارت ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ نے کی۔ میری دوسری کتاب کا نام "شہرِ داغدار" ہے جو کہ 2016 میں مکمل ہوئی ہے۔ میری شاعری کی تیسری کتاب جس کا نام "سوزِ محشر" ہے، جو 2021 میں مکمل ہوئی۔

میری تین کتابیں: 1۔ "من کٹھرا" 2۔ "شہرِ داغدار" اور 3۔ "سوزِ محشر" تینوں مل کر ایک عظیم تصور "اسلامک وے آف لائف" کو بیان کرتی ہیں۔ "من کٹھرا" ہمارے خود کو سمجھنے کے بارے میں ہے کہ ہم کس طرح بنائے گئے ہیں۔ "شہرِ داغدار" ہماری کائنات کے بارے میں ہے کہ کس طرح کائنات تخلیق ہوئی ہے۔ "سوزِ محشر" قیامت کے دن کے بارے میں ہے کہ زندگی کے بعد کیا ہوگا۔ مزید یہ کہ یہ تینوں کتابوں بالترتیب "نفسِ امارہ"، "نفسِ لوامہ" اور نفس متمعئنہ پر بھی بات کرتی ہیں۔

ان تین کتابوں کے علاوہ میری ایک نظموں کی کتاب بھی ہے جو 2017 میں مکمل ہوئی جسے محمد علی احمد صاحب نے "دل آج بھی مقروض ہے" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ شاعری کی کتابوں کے علاوہ میری مضامین کی بھی ایک کتاب مکمل ہے جس کا نام ہے "مائی لائف نوٹس" اور یہ 2018 میں مکمل ہوئی۔ 2019 میں ایم ایس نالج سیریز کے تحت میں شارٹ بائیو گرافی بھی مکمل ہوئی۔ 2021 میں "بیسٹ لائف نوٹس" کے نام سے میری 300 مضامین اور 10 جلدوں پر مبنی ایک اور سیریز بھی مکمل ہو چکی ہے۔

ان پبلیکیشنز کے علاوہ میری ریسرچ پبلیکیشن سیریز بھی ہیں جو درج ذیل ہیں:

مثلِ کلیات ریسرچ پبلیکیشن " محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی 30 کتابوں سے شاعری کا ایک مجموعہ ہے۔ " مثلِ کلیات " میں ڈاکٹر شہناز " مزمل کی شاعری کے علاوہ ان کے ساتھ اور ادب سرائے انٹر نیشنل (دنیا میں معروف اردو ادبی فورم) کے ساتھ میرا 15 سالہ ادبی سفر نامہ بھی ہے۔ یہ کتاب سال 2014 میں مکمل ہوئی۔

فکرِ سلطان ریسرچ پبلیکیشن میں ڈاکٹر سلطان محمود صاحب، مینیجنگ ڈائیریکٹر ایکو کیئر کنسلٹینسی سروسز کی 12 سے زیادہ پبلیکیشنز میں سے اہم کالمز کو شامل کیا گیا ہے ان کالمز میں ماحولیات، غذایات، صحت اور حالاتِ حاضر سے متعلق کالمز کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سال 2015 میں مکمل ہوئی۔

وقارِ سخن ریسرچ پبلیکیشن سیریز

وقارِ سخن نے نام سے میری ایک ریسرچ پبلیکیشن سیریز ہے جس میں 500 سے زیادہ شعراء اور شاعرات کے سخن پارے اور مختصر تعارف شامل ہے اس سیریز کی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔

۔نثری تصانیف کی تعداد اور نام؟

الف: بیسٹ لائف نوٹس۔ ریسرچ پبلیکیشن سیریز

اردو کی شاعری کی کتابوں کو علاوہ میری ایک اردو کتابوں سیریز بھی ہے جس کا نام ہے "بیسٹ لائف نوٹس ریسرچ پبلیکیشن سیریز۔ بیسٹ لائف نوٹس اپنی نوعیت کا ایک منفرد کتابی سلسلہ ہے۔ان کتابوں میں میری زندگی کے بہترین نوٹس کی کولیکشن ہے۔ کچھ نوٹس قرانِ مجید کے بارے میں ہیں یعنی جب میں قران پہلی دفعہ پڑھا تو کیا محسوس کیا اور بار بار پڑھنے کے بعد کس نتیجے پر پہنچا۔ پھر کچھ نوٹس حضرت محمدؐ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے ہیں، کچھ انؐ کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر اور کچھ انؐ کے آخری خطبہ کے بارے میں۔

اسی طرح قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کے کچھ اہم واقعات پر کچھ نوٹس میں اور کچھ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے حالات و واقعات پر شامل کیا ہے۔ پھر کچھ مولانا رومی کی حکایتیں اور کچھ دیگر مثالیں وغیرہ جن سے زندگی کے رہنما اصول ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک واقعہ مرحوم اشفاق احمد صاحب کی کتاب زاویہ سے بھی لیا گیا ہے۔

کچھ نوٹس میرے پروفیشن اور بزنس کے حوالے سے ہیں، جو میں نے مختلف شخصیات کے ساتھ کام کرنے اور سیکھنے کے دوران قلم بند کئے تاکہ انہیں مزید لوگوں کی رہنمائی کے لئے سامنے لایا جا سکے۔ اسی طرح کچھ نوٹس کا تعلق میرے ادبی اور تعلیمی سفر سے ہے، جو آج بھی میری رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

کچھ نوٹس کا تعلق پاکستان کے تاریخی، معاشی اور سیاسی پس منظر سے ہے۔ جن میں گوادر سی پورٹ، پاک چین اکنامک کوریڈور، پاک چین سیاسی، عسکری اور معاشی تعلقات اور پاکستان کے موجودہ اور مستقبل کے اہم ترقیاتی منصوبوں وغیرہ کی تفصیل شامل ہے۔ ان میں سے اکثر نوٹس، میری گوادر سے متعلقہ اہم پبلیکیشنز سے ہے۔

بیسٹ لائف نوٹس میں 100 سے زیادہ لوگ اپنا کم یا زیادہ حصہ ڈالا ہے۔ بیسٹ لائف نوٹس کی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ اول میں میں نے 300 مضامین مرتب کئے تھے، جبکہ بیسٹ لائف نوٹس سیریز حصہ دوئم میں میرے اپنے 300 مضامین شامل ہیں اور اس کی بھی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔

ب: گوادر سے متعلقہ پبلیکیشنز

اردو کی کتابوں کے علاوہ میری 10 دیگر کتابیں ہیں، جن میں 9 گوادر "نیوز بکس" شامل ہیں اور ایک گوادر "ہینڈ بک" شامل ہے۔ یہ کتابیں 150 سے زیادہ نیشنل اور انٹر نیشنل نیوز پیپرز سے نیوز کا تحقیقی مجموعہ ہے۔ نیوز کو لیکشن کا تعلق براہ راست گوادر کے تمام میگا پراجیکٹس اور گوادر ڈیپ سی پورٹ سے ہے۔ علاوہ ازیں چین پاکستان اقتصادی راہداری سے متعلق بھی بہت سی نیوز شامل ہیں۔ "گوادر ہینڈ بک" میں ضلع گوادر کی اہم معلومات گوادر پورٹ کی تفصیلات، اہم پراجیکٹس، گوادر کا تصویری سفر، اہم نقشاجات، اہم اقدامات، اہم بیانات اور گوادر میں مستقبل کے منصوبوں کا احاطہ وغیرہ سب شامل ہے۔

پ: ایم ایس نالج سیریز

ایم نالج سیریز میں شارٹ بائیو گرافیز اور شارٹ انٹرویوز شامل ہیں، اس میں 100 سے زیادہ لوگوں کے تعارف اور 5 سے زیادہ لوگوں کی شارٹ بائیو گرافیز پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ ایم ایس نالج سیریز میں شامل ادبی، کاروباری اور سماجی شخصیات اور ان کے ادارے اور فورمز شامل ہیں جن کی کورر سٹوریز کو بھی اس سیریز میں شامل کیا گیا ہے۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کسی ادبی گروہ سے وابستگی ؟

درجنوں ادبی گروپوں کے ساتھ وابستگی ہے، خاص طور پر ادب سرائے انٹر نیشنل اور وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم، سوشوآن، دریچہء ادب، اردو سخن، لاہور ادبی فورم، تعلیمی بیٹھک، انسان دوست فورم، راستی، بزمِ خالد نصر اور دیگر کے ساتھ پرانی وابستگی ہے۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ادب تخلیق ہو رہی مگر تہذیب ختم اس کی کوئی وجہ آپ کے خیال میں۔ ؟

ہمارے ہاں ایک کلچر پایا جاتا چھوٹے میں خود کو بڑے میاں سمجھتے ہیں اور بڑے میاں اپنے بڑے ہونے کا ثبوت نہیں دیتے۔ پھر ہوتا یوں کہ نہ چھوٹے کی عزت بچتی اور نہ بڑوں کا بھرم بچتا دونوں ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ایک مچھلی منڈی کا ساماں بندھ جاتا ہے۔ وکیل کا سب سے بڑا دشمن وکیل، استاد کا سب سے بڑا دشمن استاد، جج کا سب سے بڑا دشمن جج، سیاست دان کا سب سے بڑا دشمن سیاست دان، شاعر کا سب سے بڑا دشمن شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا دشمن خود ادیب، ڈاکٹر کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر اور جرنلیسٹ کا سب سے بڑا دشمن جرنلیسٹ۔ یہ اگر کہیں اپنی کوئی یونین یا گروپ بھی بناتے ہیں تو بڑے میاں ایک طرف اور چھوٹے میاں ایک طرف اور دونوں طبقے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے نظر آتے ہیں اور لوگوں کو یہ نظر آتا ہے کہ آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے۔ ان سب میں ایک بات یکساں پائی جاتی ہے کہ ایک تو سسٹم ٹھیک نہیں اور دوسرا کہ گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ کبھی کسی طبقے کا کسی بھی بات پر تسلی کا جواب موصول نہیں ہوتا۔

ہماری تربیت سکولوں سے کی جاتی ہے جہاں سینئر طلبہ نئے آنے والوں کا بے عزتی سے بھرپور ویلکم کرتے ہیں، مختلف ملازمتوں میں نئے ملازموں سے ہتک آمیز کام لیئے جاتے ہیں جس سے ان کی عزت نفس مر جائے اور پرانے ملازموں کی تسکین پوری ہو جائے کیوں کہ جب یہ میدان میں آئے تھے تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس کلچر کو ختم کرنے کے لیئے ریگولیشن کی ضرورت ہوتی ہے جس سے سیلف ریسپیکٹ کو پروٹیکٹ کیا جاتا اور ہتک آمیز رویوں کو کرائم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ کچھ ملکوں میں اوے کہنا یا انگلی سے اشارہ کرنے کی بھی باقاعدہ سزا ہے۔ ہمارے بزرگوں سے ہمیں کچھ مثالیں ملتی ہیں کہ بچے ماں باپ کے برابر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ نیچے یا پاؤں کی طرف بیٹھتے تھے لڑکوں کی نظریں نیچی ہوتی تھیں اور لڑکیوں میں بغیر دوپٹے کے سامنے آنے کا رواج نہیں۔ اساتذہ کی عزت بھی بڑے بزرگوں کی طرح کی جاتی تھی۔ پھر کیا ہوا بڑے میاں اور چھوٹے میاں سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔

اللہ فرماتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے اچھی ہو۔ مگر ہم اپنے آپ کو اونچا ثابت کرنے کے لیئے دوسرے کو نیچا دیکھانا فرض سمجھتے سو سب کی عزت جاتی رہتی ہیں۔

ہمارے لیئے ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ جب بیٹھے ہوتے تھے یا پیدل یا سوار آ رہے ہوتے تھے تو فرق محسوس نہیں ہوتا تھا کہ مالک کون نوکر کون۔ مقام دل میں اتنا کہ ایک دوسرے پہ جان چھڑکی جائے۔ پیٹھ پیچھے بھی کسی کی بے عزتی کرنے کی مثال نہیں مگر اب تو منہ پر بے عزتی کر دی جائے تو سر فخر سے تن جاتا ہے کہ بازی مار لی گئی۔ بڑے میاں اور چھوٹے میاں جب تک آپس میں ایک دوسرے کی حرمت کا تعین نہیں کریں گے رسوائی پوری جماعت پر ہر طرف سے حملے کرتی رہے گی۔ عزت کروانے کے لیے عزت دینی پڑتی ہے اور بڑوں کے عزت کیے بغیر جو مقام ملتے ہیں وہ بھی کھوکھلے ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں ایک دوسرے کی عزت کرنے اور ایک دوسرے کا بھرم قائم رکھنے کی توفیق دے آمین

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔آپ کی نظر میں اک صاحبِ قلم کا نظریہ کیا ہونا چاہیے ؟۔

اگر سوچ چھوٹی ہو تو کبھی بھی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جب مالی درخت لگاتا ہے، تو پودے بڑے ہوتے ہوتے اس کے قد سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا جب اس کے لگائے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے اسے ڈھیروں پھل دینے لگتے ہیں۔

آپ بھی اپنے ارد گرد اپنے ماتحت لوگوں کے لیئے مالی بنیں، اس بات سے نہ ڈریں کہ اگر ان کا قد آپ سے بڑا ہو جائے گا تو آپ چھوٹے پڑ جائیں گے۔ مالی کا کام ایک بڑا کام ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ آپ پانی دیں بیج ڈالیں نگہداشت کریں اللہ سے ان کے بڑھنے اور بلند ہونے کی دعا کریں اور ادبات کا خوف جانے دیں کہ آپ کا قد چھوٹا ہو گا۔

آپ کا ہر پودا جب تک آپ سے بڑا نہیں ہو گا آپ کے لیئے پھل نہیں لائے گا۔ دل کو بڑا کریں سوچ کو کشادہ کریں، اپنے ہی لگائے ہوئے درخت کاٹ دیں گے تو نقصان کے سوا آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں آئے گا۔

بابِ دعا۔۔۔۔۔۔۔۔نوجوان نسل کے لیے کوئی پیغام۔

یہی کہ پاکستان ہر گزمایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے۔ ہمیں کبھی بھی اچھی لیڈر شپ نہیں ملی، ہمارے ادارے کمزور سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں، عوام میں بھی شعور کا فقدان ہے اور بھی بہت سے مسائل پاکستان کو درپیش ہیں۔ ہم سارا دن پاکستان کی سیاسی پر اور پاکستانی اداروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں یہ سب ہم پاکستان کی محبت میں کر رہے ہوتے ہیں تاکہ پاکستان کو ہر چیز نمبر 1 ملے۔ آئیڈل ازم دنیا میں کہیں نہیں ہے، خود امیریکہ بھی اپنی تاریخ کی بدترین لیڈر شپ کے شکنجے میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے سب ختم ہو گیا۔

پاکستان ہر گز ہر گزمایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے۔ شاید پاکستان جتنا مضبوط آج ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ آج ہماری ملٹری طاقت کا موازنہ تاریخ کی کسی بھی دور سے نہیں کیا جاسکتا، معاشی لحاظ سے بھی پاکستان جس طرح کے معاہدے چین سے کر چکا ہے اس طرح کے اور اس سطح کے معاشی معاہدے کبھی امریکہ سے بھی نہیں ہوئے۔ 500 بلین ڈالر کی انوسٹمنٹ پاکستان میں 2045 تک ہر حال میں آنی ہے جس کے لیے چائنز کمپنیز گزشتہ 2 دہائیوں سے بھی زائید عرصے سے پاکستان میں دن رات کام کرنے میں مصروف ہیں، دنیا کر سب سے بڑا سولر پلانٹ لگ چکا ہے، سی پیک کو دنیا کے سب سے بڑے روڈ، ریل اور کمیونیکیشن کوریڈور سے ملا جا رہا ہے جن پر 24 گھنٹے کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بجلی کے منصوبے جتنے زیادہ اور جتنے بڑے لیول پر آج ہو رہے ہیں کبھی نہیں ہوئے۔ ان منصوبوں کا فائدہ مشرف بھی لینا چاہتا ہے، زرداری بھی لینا چاہتا ہے اور نواز شریف بھی لینا چاہتا ہے اور آرمی بھی لینا چاہتی ہے۔

مگر یقین مانیے ان سارے منصوبوں کے پیچھے سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں جس نے دنیا کے نقشوں کو تبدیل کرنا شروع کیا، چین معاشی طور پر اتنا مضبوط ہوا کہ اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ایشیا کے 60 سے زیادہ ملکوں میں اپنی انوسٹمنٹس کا ایک وسیع نیٹ ورک بنانے کے قابل ہو گیا۔ چائنہ 60 سے زیادہ ملکوں میں ایک ہی وقت میں کام کر رہا ہے، اور چائنہ کر ترقی میں ان 60 سے زیادہ ملکوں کی اپنی ترقی بھی شامل ہے اور اس عظیم کام کے لیے چائنہ کے اندازے کے مطابق 4 سے 8 ٹرلین ڈالر کی انوسٹمنٹ کی جائے گی اور اس میں ولڈ بنک، ایشن ڈویلپمنٹ بنک اور آئی ایم ایف پہلے سے شامل ہیں۔

یہ 60 سے زیادہ ممالک دنیا کی آبادی کا 60 فیصد سے زیادہ ہیں، دنیا کے تیل کے وسائل کا 70 فیصد ہیں جب کہ دنیا کی آمدنی کا صرف 30 فیصد ہیں۔ اسی لیے ان میں انوسٹمنٹ پر آمدنی کی شرع بھی ترقی یافتہ ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔

ایشا دنیا کی سازشوں کا گھڑا ایسے لیے بنا ہوئے ہے کیوں کہ جو ایشیا میں ڈومنیٹ کرے گا وہی دنیا کی اگلی معاشی طاقت ہو گا۔ اور جو ایشیا کی معشیت کا حصہ نہیں بن سکے گا ایسے ترقی یافتہ ملک اگلے دور کے ترقی پذیر ملک ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف غریب ملک اپنے بہتر مستقبل کی جن لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف ترقی یافتہ ملک اپنی ڈوبتی ہوئی معشت کو بچانے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

پاکستان میں چائینہ نے تب تک یہ معاہدے نہیں کئے جب تک سب سیاسی جماعتوں اور آرمی سب کو ایک پیج پر لا کر دستخط نہیں کروا لیے۔اس کا فائیدہ یہ ہوا ہے کہ یہ آپس میں جتنا بھی لڑیں س پیک کے حوالے سے کبھی نہیں لڑیں گے۔ ہمارے سیاسی حکمران اتنے سیانے نہیں ہیں کہ اس طرح کی صورت حال کو خود جنم دے لیتے جن کی سوچ ہمیشہ سے بانجھ پن کا شکار رہی ہے۔اللہ نے ہمیں ایک ایسی لوکیشن دی ہے جو پوری دنیا میں اپنی اہمیت کا لوہا منواتی آ رہی ہے جس کی وجہ سے پہلے ہمیں امیریکہ بیٹھا کر کھلاتا رہا اور اب چائینہ بیٹھا کر کھلا رہا ہے۔

انڈیا نے بھوٹان میں اپنی فوج داخل کی جس کی وجہ سے چائنہ اور انڈیا کا ایشو کافی شدت اختیار کر گیا تھا کیوں کہ چائینہ نے انڈیا پر واضع کر دیا کہ وہ یہاں سے نکل جائے ساتھ یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر پاکستان اشارہ کرے تو سوڈان میں انڈین آرمی کی طرح کمشیر میں چائینہ کی آرمی بھی داخل ہو سکتی ہے اور یہ ایک دن ضرور ہونا ہے۔امریکہ سے تو ہم اخلاقی تعاون کی بھی امید نہیں کر سکتے کیوں کہ امیریکہ کا اندھا پن اس بات سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسے دہشت گرد اور حریت پسند کا فرق ہی نہیں معلوم۔

یہ ہماری قوم کے مسلسل صبر کا پھل اور ہماری تمام تر آزمائشوں کا اچھا بہترین بدل ہے۔اب جو بھی پاکستان اور چائینہ کی دوستی کے خلاف بات کرتا ہے وہ یقینا پاکستان کے روشن مستقبل کے خلاف بات کرتا ہے اور یہ بات آرمی نے تمام سیاسی کارکنوں کو اچھی طرح سے سمجھا دی ہے۔

پاکستان زندہ بعد

میاں وقارالاسلام، منتخب اشعار 2020

01

زباں ذکرِ الٰہی سے کبھی خالی نہیں ہوتی

ہوں جیسے بھی مرے حالات بدحالی نہیں ہوتی

شاعر: میاں وقارالاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

02

مجھ بے خبر کو آج تک اپنی خبر نہیں

میرے لہو میں دوڑتا رَب کا شعور ہے

شاعر: میاں وقارالاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

03

پھیلا ہوا ہے چار سُو یہ رَب کا نور ہے

میں کیا ہوں مجھ کو کس لیئے خود پر غرور ہے

شاعر: میاں وقارالاسلام

تصنیف: سوز محشر

04

مانا خطائیں میری بے حد شمار ہوں گی

میں بھی نہیں فرشتہ تم بھی خدا نہیں ہو

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

05

میری زمین بھی مجھے کھا پائے گی کتنا

سارے بدن پہ میرے ورثے لکھے ہوئے ہیں

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

06

اے دوست مجھ میں کوئی فرشتہ نہ کر تلاش

انساں کی دسترس میں فرشتہ نہیں آتا

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

07

لفظ وہ تخلیق کی دہلیز پر جب دھر گئے

شعر دو اُترے مگر وہ بات ساری کر گئے

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

08

مہانے زخم کے ایسے کبھی سل ہی نہیں سکتے

سنو وحشت کے مارے پھول تو کِھل ہی نہیں سکتے

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

09

نیا شاعر ہوں میں آداب محفل سے نہیں واقف

مرے اشعار تیری بحر سے مل ہی نہیں سکتے

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

10

جب عشق کی حدت سے یہ جھلسا تھا مرا دل

ہونٹوں کی شرارت نے مجھے آگ لگا دی

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

11

پت جھڑ کے تھپیڑوں نے تھے خاشاک سمیٹے

جذبوں کی حرارت نے مجھے آگ لگا دی

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

12

بھولا نہیں تجھے میں بس یہ بتا رہا ہوں

میں دل جلا نہیں ہوں میں دل جلا رہا ہوں

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

13

تم میری محبت ہو میری سزا نہیں ہو

اک بار کہہ دو مجھ سے کہ تم خفا نہیں ہو

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

14

اک اندھی محبت میں مارے گئے ہیں

ہمیں جنتوں کی بشارت سنا دو

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

15

گونج سناٹے کی ہے کانوں میں

تیری آواز جو نہیں آئی

شاعر : میاں وقار الاسلام

تصنیف : سوز محشر

.....

16

ہم نے بھی ٹوٹ کر محبت کی

پر ہمیں راس وہ نہیں آئی

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

17

خواب پلکوں پہ آ کے بیٹھ گئے

نیند آنکھوں میں گو نہیں آئی

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

18

اُبھرتے سورج کا سلام تیرے نام کر دیتا

دن کے سارے تام جھام تیرے نام کر دیتا

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

19

اختیار ہوتا گر اس بہار پر میرا

رنگ و بو کے انتظام تیرے نام کر دیتا

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

.....

20

قید میں جو کر سکتا ان حسین لمحوں کو

آنے والے سب ایام تیرے نام کر دیتا

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

سوزِ محشر

تحریر: میاں وقار الاسلام

سوزِ محشر ایک سفر ہے جو قلم کے ذریعے شروع ہوا، جب میں نے پہلی بار اپنا سوکھا قلم روشنائی کی چھوٹی شیشی میں ڈالا تو مجھے خبر نہیں تھی کہ روشنائی کی چھوٹی سی شیشی سمندر سے بھی زیادہ گہری اور وسیع ہو سکتی ہے۔اور میں اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ قلم کی چھوٹی سی نوک میلوں کا سفر طے کر پائے گی۔

ان استادوں کو سلام جنہوں نے مجھے ایک ایسے قلم کی پہچان دی کہ جس قلم نے چلتے چلتے میری پہچان ہی بدل دی۔اس قلم کو سلام جس قلم نے نہ صرف مجھے اپنے آپ سے روشناس کیا بلکہ اس کائنات سے بھی آگاہ کیا اور اس کائنات کے مالک سے بھی متعارف کروایا۔

اس کائنات کے مالک کا بھی شکریہ جس نے انسان کو یہ شرف بخشا کہ وہ قلم کے ذریعے آگے بڑھ سکتا ہے اور اس کے رازوں سے پردہ اُٹھا سکتا ہے۔اُن تمام رازوں سے جنہیں اہل علم کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔

سوزِ محشر بھی اللہ کے رازوں میں سے ایک بڑا اہم راز ہے جس سے اہل علم ہر گز لاعلم نہیں۔اہل علم اور لاعلم سب اللہ کا ہی مال ہیں اور سب کو اپنے مالک کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

دعا گو ہوں کہ جب ہم لوٹ کر جائیں تو ہمارا وقار مجرح نہ ہو امین

ایم ایس انٹرویو سیریز

مرتب : میاں وقار الاسلام

ایم ایس نالج سیریز میں شارٹ بائیو گرافیز اور شارٹ انٹرویوز شامل ہیں، اس میں 100 سے زیادہ لوگوں کے تعارف اور 5 سے زیادہ لوگوں کی شارٹ بائیو گرافیز پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ ایم ایس نالج سیریز میں شامل ادبی، کاروباری اور سماجی شخصیات اور ان کے ادارے اور فورمز شامل ہیں جن کی کورر سٹوریز کو بھی اس سیریز میں شامل کیا گیا ہے۔

بنیادی سوال نامہ درج ذیل تھا:

1. Welcome Message
2. Personal & Family Background
3. School & College Experience
4. Regular Education & Technical Skills
5. Articles & Publications
6. Career & Professional Background
7. Company Overview & History
8. Motivation & Inspiration
9. Scope of Business & Practice Areas
10. Management & Leadership Style
11. Products & Services
12. Previous & Current Projects
13. New Opportunities & Future Plans
14. Local & Global Affiliations
15. Success & Achievements
16. Social & Cultural Activities
17. Government Policies & Procedures
18. Suggestion to Government & Policy Makers
19. Message to Stakeholders & Others
20. Closing Message

شارٹ بائیو گرافی

اردو/انگریزی

Mian Waqar ul Islam is Founder and Principal Consultant at Marvel System. Since the inspection of Marvel System (in year 1995), it has grown into multi-divisional and multi-disciplinary organization with its international partners and innovative solutions providers. Key areas of Marvel System are including Company Registration, Patents & Trademarks, Curriculum Development, Graphics Designing, Branding & Packaging, Staffing & HR Development, Marketing Research, Business Promotion, Corporate Financing, Local and Int'l Franchising, Licensing Programs, Professional Training, Research & Development, Corporate Digitizing, Re-Engineering and Globalizing. Mian Waqar ul Islam is Group Consultant and Advisor as well as former Director Operations at Niazi Group of Companies (Pvt) Ltd., in the year 2016-17, he was also awarded "A Lifetime Achievement Award" against his 15 years dedicated services, longest & full-time committed affiliation with group. Mian Waqar ul Islam is Consultant & Advisor as well as Executive Member at Adab Saraae International, in the year 2018-19, he was also awarded "A Lifetime Achievement Award" against his 15 years dedicated literary services, longest & full-time committed affiliation with globally renowned Urdu literary forum. He is Life Time Member of 10 CEO Forums and presiding 10 Specialized Business Alliances under Marvel System Investment Federation. He is the Author & Compiler of 5 Research Publications Series. His research work contains 40 plus books and covers over 10,000 white papers. He is regular writer of different articles and his articles are also converted into his publications.

دل آج بھی مقروض ہے

(ڈاکٹر شہناز مزمل، مادرِ دبستانِ لاہور)

میاں وقار الاسلام نے اس وادیء سخن میں آبلہ پائی کی ٹھان لی اور وہ اس میں پا بجولاں نکل آئے اور چلتے چلتے وہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں بہت سے اور آبلہ پا سخنور، دشتنوردی میں مصروف تھے اور یہ ایسی دشتنوردی ہے جو رکنے نہیں دیتی۔ آبلہ پائی کے باوجود اس صحرا کے مسافر چلتے چلے جاتے ہیں۔ آبلے پھٹتے رہتے ہیں، لفظوں کے تازیانے بھی برستے رہتے ہیں۔ اور تشنگی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سفر کی خواہش ختم نہیں ہوتی اور یہ سفر جاری رہتا ہے۔ یہ سفر جس کا آغاز میاں وقار الاسلام نے ادب سرائے سے شروع کیا تھا اور آج تک ادب سرائے کے سائیبان تلے ان کا یہ سفر جاری ہے۔ اور واقعی یہ بات سہی ہے کہ ہمارا رواں رواں مقروض ہے اس کائنات کا، ربِ کائنات کا، دنیا کا، والدین کا، اساتذہ کا، اقرباء کا، دوستوں کا، کس چیز کا مقروض ہے ان کی محبتوں کا مقروض ہے، ہمارا بال بال ان کے قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ جس کو اتارنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے کیوں کہ جو پیار ہمیں ہمارے رب کی طرف سے ملتا ہے ہمیں اپنے نبی کریم سے محبت کرنے سے ملتا ہے۔ قرانِ پاک کی تلاوت سے ملتا ہے، جو پیام ہمیں وہاں سے ملتا ہے وہ رب کا پیغام ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہمارے والدین ہمارے لیے کرتے ہیں وہ ہر شخص جانتا ہے۔

مگر کچھ لوگ اپنی آنکھیں موند لیتے ہیں، اور بڑے ہو کر بھول جاتے ہیں کہ ماں باپ نے کیا کیا جتن ہمارے لیے کئے۔ اور آج ہم جس مقام پر ہیں یہ انہیں کی وجہ سے ہے۔ ماں باپ، اساتذہ، آپ کے بہن بھائی، آپ کے پیارے دوست اور دوست بھی سچے اور پکے دوست جو واقعی آپ کے دوست ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ کہتا ہے کہ میں ولی ہوں، میں دوست ہوں، اسی طرح اس نے دنیا میں بھی اپنے دوست بنائے ہیں، اور وہ دوست قدم قدم پر ہمارے راستے کے کانٹے چن چن کر ہمارے لیے راہ گذر بنا دیتے ہیں۔ پہلے ماں باپ راہ گذر بناتے ہیں، پھر اساتذہ بناتے ہیں، پھر دوست بناتے ہیں اور پھر یہ راہ گذر ہمیں ایک معطر اور پھولوں سے لدے ہوئے باغ کی طرف لے جاتی ہے جو ہماری محبتوں کا ثمر ہوتا ہے۔

لیکن جب محبتوں کا ثمر ہمیں مل جاتا ہے تو ہمیں ان کو نہیں بھولنا چاہیے جو ہمیں اس ثمر آور مقام تک پہنچانے میں ہمارے ساتھ ساتھ شریکِ سفر رہے۔ اور پھر اس کے بعد ہمیں چاہیے کہ اگر اللہ ہماری نسلوں کو آگے چلاتا ہے تو یہ قرض جو والدین کا تھا یا دوستوں کا تھا یہ ہم اپنی نسلوں تک بھی منتقل کریں، وہ بے لوث پیار دیں، وہ بے لوث قدر دانی دیں، وہ بے لوث رہنمائی دیں کہ زندگی کے ہر میدان میں ان کے لیے ترقیاں ہوں، کامیابیاں ہوں، کہ وہ ملک اور ملت کے معمار ہوں، صادق اور امین ہوں۔ ہر ماں بات کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچے کو یہ تعلیم ضرور دیں کہ وہ اپنے وطن سے بھی، قوم سے بھی اسی طرح محبت کرے جس طرح وہ اپنے والدین، اپنے اساتذہ یا اپنے دوست سے کرتے ہیں۔

ہم اس وطن کے بھی مقروض ہیں کہ اگر یہ دھرتی ہمیں آزادی نہ دیتی ہمیں موقع فراہم نہ کرتی، درس گائیں ہمیں نہ ملتیں، اساتذہ ہمیں نہ ملتے، اور اگر ہمارے والدین کو بھی آزادی نہ ملتی کہ وہ ہماری پرورش اپنی سوچ اور اپنے خیال کے مطابق جو وہ بہتر سمجھتے ہیں کر سکتے تو یقیناً آج جس مقام پر ہیں وہاں کبھی بھی نہ پہنچ سکتے۔ یہ سب کچھ یہ آزاد فضا جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور یہ خوبصورت وطن پاکستان جس کا چپہ چپہ جنت ہے ہم اس کے بھی مقروض ہیں، ہم اس دھرتی پہ چلتے ہیں، سانس لیتے ہیں، بلندیاں حاصل کرتے ہیں، پرواز کرتے ہیں، ترقیاں حاصل کرتے ہیں تو پھر اس کی قدر بھی بہت زیادہ ہے۔ اور اگر ہم اس کی قدر نہیں کریں گے تو ہم اس کا بھی قرض نہیں اتار سکیں گے۔ تو ہم اس دھرتی ماں کے بھی مقروض ہیں ہمارا رواں رواں مقروض ہے۔ تو ہماری سوچ ہمارا جذبہ، ہماری تعمیری فکر ایسی ہی ہونی چاہیے جو ہمارے ملک کو رہتی دنیا تک آباد رکھے کیوں کہ ہم مقروض ہیں اس قرض کو اتارنے کے جو ہم نے اس دھرتی ماں کے لیے دینا ہے۔ ہمیں ہمارا سب کچھ جان، مال اس ملک پر قربان کرنے لے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہم اپنی سوچ کو مثبت کرکے اس معاشرے کو امن کا گہوارا بنا کر اس قرض کو کسی حد تک اتار سکتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ایک پُرامن معاشرے کو جنم دیں۔ محبتیں بانٹیں، محبت دعا ہے نفرت بد دعا ہے۔ نفرت کی دیوار گرادیں، پارٹی بازی کی دیوار گرادیں، فرقہ بازی کی دیوار گرادیں، محبت سے دلوں کو فتح کریں، کیوں کے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو بڑی سے بڑی دیوار کو گرا سکتا ہے۔ نفرت کی دیوار ہو، کتنی ہی نفرت ہو، لگاتار اور بے لوث محبت ساری دیواریں گرادیتی ہے۔ اور اللہ کے نور سے ایک روشن میدان کام کرنے کے لیے ہمارے سامنے کھل جاتا ہے۔ تو ہم آج بھی مقروض ہیں اور ہم یہ قرض اتار سکتے ہیں اگر ہم محبت کے پیغام کو لے کر معاشرے میں ہر طرف پھیل جائیں۔ ادیب اور شاعر ہونے کے ناتے ہماری یہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔

میاں وقار الاسلام کے لے بہت مبارکباد کہ وہ اس قرض کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور اسے اتارنا بھی چاہتے ہیں۔ مجھے میاں وقار الاسلام کے ادبی استاد ہونے پر فخر ہے اور میں ان کے ادبی سفر کی کامیابی پر ان کو دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ انشاء اللہ ہم سب مل کر اس قرض کو اتاریں گے ،اپنا پیغام محبت کا لے کر آگے بڑھیں گے ، ہمارا پیغام محبت، محبت ، محبت ۔

ہم اپنی ذات کی کچھ اس طرح تفہیم کرتے ہیں

محبت بانٹتے ہیں چاہتیں تقسیم کرتے ہیں

مادرِ دبستانِ لاہور، ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن، ادب سرائے انٹرنیشنل

www.shahnazmuzammil.com،www.adabsaraae.com

وقارِ سخن

شاعر، مصنف اور مرتب

میاں وقار الاسلام

مادرِ دبستانِ لاہور محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ چیئرپرسن ادب سرائے انٹرنیشنل اس بات کی مستحق ہیں کہ میں اپنی ادبی کاوش کا ذکر کرنے سے پہلے ان کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے میرے ہر ادبی قدم پر میری رہنمائی کی اور میرے ہر ادبی کام کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتی چلی آ رہی ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کے ساتھ 15 سال سے زیادہ ادبی مسافت ہو چکی ہے اور یہ سفر ابھی جاری ہے۔ ادب سرائے انٹرنیشنل کے پلیٹ فارم پر ان کے ساتھ سینکڑوں مشاعروں میں شرکت کرنے کا موقع ملا اور ہزاروں لکھنے والوں سے ملنے ملانے اور سننے سنانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یقیناً یہ ایک بڑا کارواں تھا جس میں بہت سے باقار اور نامور سخنوروں نے شمولیت اختیار کی اور اس سفر کو بڑھاتے گئے۔ بہت سے باکمال سخنور ایسے ہیں جن کے کام کو دیکھ کر یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ وقارِ سخن سے کم نہیں۔

پھر یہ کوشش کی کہ کیوں نہ وقارِ سخن کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے اور ان کے سخن پاروں کو اکٹھا کر کے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جائے اور یقیناً اپنے علم بھی اضافہ کیا جائے اور پڑھنے والوں کے علم میں بھی اضافہ کیا جائے۔ مذید یہ کہ اچھا لکھنے والوں کی خاطر خواہ یا پھر جہاں تک ممکن ہو سکے حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس طرح سے وقارِ سخن نے اپنا سفر شروع کیا جن لوگوں تک آسانی سے رسائی حاصل ہو سکتی، یا جو سخنور دورِ حاضر کی ٹیکنالوجی میں کمال رکھتے تھے انہوں نے باآسانی اپنا اپنا کام جو کہ ٹاپ آف دی لائن 20 اشعار کی سلیکشن پر مشتمل تھا فراہم کر دیا اور اس سفر کو ایک خوشگوار آغاز بھی مہیا کر دیا۔ جو لوگ ٹیکنالوجی میں قدرے کم کمال رکھتے تھے انہوں نے اپنی اپنی کتابوں میں سے ایج فائلز شئیر کر دیں اور جو لوگ ٹیکنالوجی میں بالکل بھی قدرت نہیں رکھتے تھے انہوں نے اپنے ہاتھ سے سخن پارے مرتب کئے اور پیپر پر لکھ کر بھیج دیے یا پھر فون پر لکھوا دیئے۔ یوں مرحلہ وار ریکارڈ مرتب ہوتا گیا اور ساتھ ساتھ ری ویو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آہستہ آہستہ اتنا ریکارڈ بن گیا۔

دورِ حاضر کے نمایاں شعراء، بالترتیب: سلسلہ ایک شام ایک شاعر

جناب محمد سلیم طاہر، جناب اقبال طارق، جناب احمد حماد، جناب ڈاکٹر فخر عباس، جناب عرفان صادق، جناب شہزاد نیر، منفعت عباس رضوی، جناب آغا جی، جناب اعجاز فروز اعجاز، محترم سلیم کاوش، جناب نسیم سحر، جناب ایاز الغنی، جناب حسن عباسی، جناب شاہین بھٹی، جناب اختر شمار، جناب ایاز محمود ایاز، جناب زاہد شمسی، جناب باقی احمد پوری، جناب احمد سبحانی آکاش، جناب وسیم عباس، جناب وَردبزمی، محترم حماد نیازی، جناب رحمان فارس، جناب ندیم بھابھہ، جناب امین کنجاہی، جناب خالد نقاش، محترم ریاض احمد احسان، جناب سہیل رضا ڈوڈھی، جناب منصور آفاق، میاں وقار الاسلام، جناب ابرار احمد، جناب امجد غزالی، جناب صفدر صدیق رضی، جناب اعجاز توکل، جناب فرحت عباس شاہ، جناب صابر ظفر، جناب پروفیسر انور مسعود، جناب حسن عسکری کاظمی، جناب کامران نذیر، جناب وصی شاہ، جناب ڈاکٹر انعام الحق، جناب قمبر ریاض، جناب افتخار شوکت، جناب افتخار عارف، جناب ڈاکٹر خالد جاوید جان، جناب عارف فرہاد، جناب واجد امیر، جناب توصیف تر نل، جناب سلیم فگار، جناب بشیر احمد قادری، جناب خواجہ اشرف، جناب فیصل صاحب، جناب رفیق سندیلوی، جناب جمیل ناز، جناب کنول فیروز، جناب فرخ مشتاق، جناب اکرم خاور اور دیگر

دورِ حاضر کی نمایاں شاعرات، بالترتیب: سلسلہ ایک شام ایک شاعرہ

محترمہ صفیہ سلطانہ مغل، محترمہ رخشندہ نوید، محترمہ ثمینہ سید، محترمہ سیما نقوی، محترمہ عنبرین حسیب عنبر، محترمہ ناز بٹ، محترمہ فرحت پروین، محترمہ تسنیم کوثر، محترمہ فاخرہ انجم، محترمہ سمن شاہ، محترمہ ندا فاطمہ، محترمہ سفینہ سلیم، محترمہ ڈاکٹر عارفہ صبح خان، محترمہ فرحت زاہد، محترمہ فرحین چوہدری، محترمہ گلناز کوثر، محترمہ نسرین سید، محترمہ عمرانہ مشتاق، محترمہ ماہ جبیں غزل انصاری، محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، محترمہ ردا فاطمہ، محترمہ رقیہ غزل، محترمہ شاہدہ دلاور شاہ، محترمہ عذرا ناز، محترمہ شگفتہ شفیق، محترمہ لبنیٰ صفدر، محترمہ نفیسہ اختر، محترمہ فاطمہ زہرا جبین، محترمہ عینی راز، محترمہ صائمہ اسحاق، محترمہ بینا گوئندی، محترمہ شہلا شہناز، محترمہ ناہید ورک، محترمہ نوشی گیلانی، محترمہ مونا شہاب، محترمہ پریا تابیتا، محترمہ شاہدہ حسن، محترمہ ریحانہ قمر، محترمہ شیبہ طراز، محترمہ مقصودہ اکبر، محترمہ مَہ جبیں ملک، محترمہ دلشاد نسیم، محترمہ آسناتھ کنول، محترمہ حجاب عباسی، محترمہ محمودہ غازیہ، محترمہ انجم عثمان، محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل، محترمہ نیلما ناہید دُرانی، محترمہ فاطمہ رضوی، محترمہ شگفتہ ناز، محترمہ ڈاکٹر نزہت عباسی، محترمہ صغریٰ صدف، محترمہ فہمیدہ ریاض، محترمہ صبیحہ صبا، محترمہ سعدیہ حریم، محترمہ نسیم سید، محترمہ قندیل جعفری، محترمہ افروز رضوی، محترمہ شاہدہ مجید، محترمہ گلزیب زیبا، محترمہ یاسمین بخاری، محترمہ عائشہ مسعود ملک، محترمہ تبسم انوار، محترمہ تسنیم عابدی، محترمہ عنبرین صلاح الدین، محترمہ حمیدہ شاہین، محترمہ ثبین سیف، محترمہ سامی اعجاز، محترمہ سعدیہ سراج، محترمہ کشور ناہید، محترمہ نینی مظفر، محترمہ نوشی عقیل، محترمہ زیب اُنساز یبی، محترمہ آرین فرحت، محترمہ فریحہ نقوی، محترمہ شیریں گل رانا، محترمہ شمسہ نجم، محترمہ ہما خان، محترمہ سیدہ صائمہ کامران، محترمہ سمیرہ عزیز، محترمہ ناز

فاطمہ، محترمہ ثمینہ رحمت، محترمہ عشرت معین سیما، محترمہ ناصرہ زبیری، محترمہ حُسن بانو، محترمہ نیلم ملک، محترمہ کنول ملک، محترمہ صبیحہ خان، محترمہ نیل احمد اور دیگر

وقارِ سخن سیریز کی 10 جلدیں مکمل ہو چکی ہیں اور تمام جلدیں وقارِ پاکستان اور ادب سرائے کی ویب سائیٹس پر موجود ہیں، جن لوگوں نے "وقارِ سخن" کے سفر میں ہمارا ساتھ دیا ان کے ہم تہہ دل سے مشکور ہیں اور ان کے کام اور تعاون کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بیسٹ لائف نوٹس سریز (حصہ اول)

اظہارِ خیال: ڈاکٹر شہناز مزمل

کئی واقعات اتفاقات کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور ان سے مختلف کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ معاشرے میں جو کچھ رونما ہو رہا ہوتا ہے اس کے پس پردہ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے جو انسان کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن ہر واقعہ سے ہر شخص متاثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر کہانی سے بھی ہر شخص متاثر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ جو کچھ معاشرے کا حصہ ہے سب لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے دیکھتے ہیں اور اپنے مزاج کے مطابق وہ اس کو سمجھتے ہیں اور اس پر غور کرتے ہیں۔ اور پھر اسی کے مطابق وہ اس کے نتائج بھی اخذ کرتے ہیں اور وہ اس کو اسی تناظر میں دیکھتے بھی ہیں جیسے انہوں نے اس کو سمجھا ہوتا ہے۔ مگر بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں چاہیے کہانی ہو، واقع ہو، سانحہ ہو جس سے وہ متاثر ہوتا ہے وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ میں اس سے ایسے ہی نہ گزر جاؤں بلکہ اسے اپنی یاداشتوں میں محفوظ کرلوں، کہیں لکھ لوں، یا کہیں اس کا ریکارڈ رکھ دوں تاکہ جب بھی میرا دل چاہے میں اسے دیکھ سکوں اور پڑھ سکوں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ڈائری لکھتے ہیں اور اس میں اپنی یاداشتوں کا ریکارڈ رکھتے ہیں اور بعض دفعہ ان یاداشتوں کا ریکارڈ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کتاب بن جاتی ہے اور کوئی دماغ پھر ایسا ہوتا ہے کہ ان یاداشتوں کو سب سے اکٹھا کرکے کتابی شکل دے دیتا ہے۔ اور یہ مرتب کا کام ہے اور مرتب بھی وہ جس کا دماغ، ذہن اور سوچ تخلیقی سوچ ہو جس سے وہ کوئی نہ کوئی نتیجہ اخذ کر رہا ہو۔ کہ اس واقعے کے پیچھے کیا کارفرما ہے اور مستقبل میں سے کیا نتائج ہوں گے، اس طرح کہانیاں آگے سفر کرتی رہتی ہیں۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرے بہت ہی ہونہار ادبی طالب علم میاں وقار الاسلام ہمیشہ چیزوں کو اکٹھا کرکے انہیں ایک نیا رنگ اور آہنگ دیتے ہیں۔ اور اسے ایک نئے انداز سے ترتیب دیتے ہیں۔ جیسا کہ بیسٹ لائف نوٹس سب کی نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ روزانہ سوشل میڈیا پر ایسے میسج نظر سے گزرتے ہیں جو ہمیں متاثر کرتے ہیں اور ہم انہیں اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس طرح وقار نے بیسٹ لائف نوٹس کے نام سے ایک سلسلہ بنایا اور اس میں بہت سے لوگوں کو دعوت دی کہ آپ کے پاس اگر کچھ اچھی یاداشتیں ہیں تو آپ انہیں بیسٹ لائف نوٹس میں شامل کر دیں۔

اس طرح سب نے اپنی اپنی یاداشیں جمع کروانا شروع کر دیں اور آپ کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ اس کے 10 جلدیں ترتیب پا گئی ہیں۔ اور اس میں کچھ تھوڑا سا حصہ میرا بھی ہے۔ اور یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک بہترین اور نئی چیز سامنے آئی ہے۔ کہ آپ کو ایک جگہ یہ بیسٹ لائف

نوٹس مل جاتے ہیں۔ ورنہ ذہن میں یہ واقعات آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ لیکن اب اگر ہم انہیں دیکھنا چاہیں گے تو ہم ان کو بیسٹ لائف نوٹس میں دیکھ لیں گے۔

وقار ایک بہت اچھا مرتب ہے اور وہ اس نوعیت کے مختلف کام کرتا رہتا ہے چاہے وہ بیسٹ لائف نوٹس ہوں، یا وقارِ سخن کے نام سے شعری کولیکشن ہو یا پھر گوادر کے حوالے سے نیوز بکس ہوں یا جن کارپوریٹ سیکٹرز میں وہ کام کر رہا ہے ان کی ریسرچ پروفائلز یا پورٹ فولیوز وغیرہ ہوں، اس کے پاس جو نالج ہے جسے لوگ نہیں جانتے وہ انہیں مختلف اشکال میں لوگوں تک پہنچاتا رہتا ہے۔

تو یقینا بہت اچھی کاوش ہے، اور ماشااللہ وہ اپنے اس کام میں کافی کامیاب بھی ہے اور میں اسے مبارکباد دیتی ہوں کہ اس نے یہ بہت اچھا سلسلہ شروع کیا ہے اور مجھے ہمیشہ اس کی رہنمائی کرکے بہت خوشی ہوتی ہے اور میں اپنے تجربے کے مطابق جو کچھ ممکن ہوتا ہے اس کو بتاتی رہتی ہوں اور یہ اس کی بہت سعادت مندی ہے کہ وہ تہہ دل کے ساتھ اس کو پسند کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہے جو کچھ ہم اس کو بتاتے رہتے ہیں۔ وہی بچے یا طالب علم اچھے ہوتے ہیں جو جتنا بھی آگے بڑھ جائیں اپنے والدین اور اپنے اساتذہ کو یاد رکھتے ہیں اور ان کی عزت احترام اور قدر کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ عزت احترام اور تابعداری وقار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے تو ہماری نیک تمنائیں اور دعائیں ہمیشہ اس کے ساتھ ہیں اللہ اسے اپنے تمام نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور یہ اسی طرح آگے، آگے ،آگے بڑھتا چلا جائے اور زندگی کے اس عمل میں جو بھی مثبت کردار وہ ادا کر سکتا ہے وہ اس کے لیے صدقہ ء جاریہ بن جائے۔ بہت سی دعائیں۔

مادرِ دبستانِ لاہور

ڈاکٹر شہناز مزمل

چیئرپرسن ادب سرائے

گوادر نیوز بکس

مرتب : میاں وقار الاسلام

سال 2004 میں گوادر پرو موشن الائنس کی بنیاد رکھی گئی، جس میں مرکزی کردار ابرار جناب خان نیازی صاحب کا تھا اور بنیادی معاونین میں جناب عبدالرشید اعوان صاحب، جناب محمد طارق صاحب اور میاں وقار الاسلام شامل تھے۔

گوادر پرو موشن الائنس کی فارمیشن کے بعد اس میں گوادر کے تمام نمایاں سٹیک ہولڈرز کو شمولت کی دعوت دی گئی جن میں اکثریت گوادر پرو موشن الائنس کا حصہ ہے۔ گوادر پرو موشن الائنس کے بعد گوادر بلڈرز اینڈ ڈیویلپرز ایسوسی ایشن قیام پزید ہوئی جو اس وقت گوادر کے تمام بلڈرز اینڈ ڈیویلپرز کی سب سے مضبوط آواز ہے۔

گوادر پرو موشن الائنس ،النور کار گوسٹی گوادر، اور گوادر انٹر نیشنل کے تعاون سے گوادر نیوز اینڈ اپ ڈیٹس کے نیوز لیٹرز تیار کئے گئے۔ سال 2006 سے سال 2017 تک کی تمام نیوز اینڈ اپ ڈیٹس کو ایک جگہ جمع کیا گیا اور انہیں کتابی شکل دے دی گئی۔

اس طرح دیگر کتابوں کے ساتھ میری یہ 10 گوادر نیوز بکس بھی ہیں، جن میں 9 گوادر "نیوز بکس" شامل ہیں اور ایک گوادر "ہینڈ بک" بھی شامل ہے۔ یہ کتابیں 150 سے زیادہ نیشنل اور انٹر نیشنل نیوز پیپرز سے نیوز کا تحقیقی مجموعہ ہے۔

نیوز کو لیکشن کا تعلق براہ راست گوادر کے تمام میگا پراجیکٹس اور گوادر ڈیپ سی پورٹ سے ہے۔ علاوہ ازیں چین پاکستان اقتصادی راہداری سے متعلق بھی بہت سی نیوز شامل ہیں۔

" گوادر ہینڈ بک" میں ضلع گوادر کی اہم معلومات گوادر پورٹ کی تفصیلات، اہم پراجیکٹس، گوادر کا تصویری سفر، اہم نقشاجات، اہم اقدامات، اہم بیانات اور گوادر میں مستقبل کے منصوبوں کا احاطہ وغیرہ سب شامل ہے۔

مثل کلیات

شاعرہ: ڈاکٹر شہناز مزمل

تصنیف: مثل کلیات

تحریر: میاں وقار الاسلام

بِسمِ اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

شروع اُس ذاتِ کریم کے نام سے جس کا علم تمام جہانوں کے علوم کا احاطہ کئے رہتا ہے اور سوچنے والوں کی سوچ کے دائرے پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔ وہی جو اپنے علم سے علم کے خزانے ہماری راہِ حیات میں وقتاً فوقتاً بکھیرتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہی جو ہمارے علم کی آخری حد کو بھی لا محدود کئے دیتا ہے۔

وہی جو تمام لاعلموں کو علم دیتا ہے اور اہل علم کو عالم ہونے کا احساس بھی دلاتا ہے۔ اور جو خود کو عالم فاضل سمجھ بیٹھے اُس کے علم کو زائل بھی کر دیتا ہے۔ کائنات میں اس کی قدرت کی بہت سی نشانیاں بکھری پڑی ہیں۔ یہ کائنات خود بھی اُسی کی قدرت کی ایک عظیم الشان نشانی ہے اور صرف اُس اکیلی ذات کو ہی اپنی کائنات پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ جو بھی چیزیں ہمارے زیر فرمان کر دی گئی ہیں دراصل وہ سب فرمان الٰہی کی ہی تکمیل کر رہی ہیں۔

انتساب

مثل کلیات منتسب ہے تمام لکھنے اور لکھوانے والوں کے نام، تمام پڑھنے اور پڑھانے والوں کے نام، تمام سیکھنے اور سیکھانے والوں کے نام، تمام سننے اور سنانے والوں کے نام، جن ہستیوں کا قلم سے رشتہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ گہرا ہے، جن کی نسل در نسل انتھک کاوشوں سے ہی نسلِ انسانی نے کائنات کے اَن گنت پوشیدہ رازوں پر نظر ڈالی اور غور کیا۔ اہلِ علم نے جہاں بھی دیکھا اپنے ربّ کی نشانیوں کی تسخیر و تفسیر کی، اس کے ذکر کو بلند کیا اور اس کے حکم کی تکمیل کرتے گئے۔

ادب سرائے کا ذکر

سال 2004 کے آغاز میں جب ہم نے مارول سسٹم کے پلیٹ فارم سے پاکستان میں پہلی مرتبہ وائرلیس ٹیکنالوجی (Wireless Technology) پر ایک جوائنٹ ریسرچ پروگرام متعارف کروایا، تو اس باقاعدہ آغاز سیج ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (Sage Research Institute)

ماڈل ٹاؤن، لاہور سے کیا۔ کالج کی ادبی سرگرمیوں میں تھوڑی بہت شاعری بھی پڑھی اور اسی دوران ادب سرائے کا بھی ذکر سننے کو ملا، جو کہ ہمارے کیمپس سے کچھ ہی فاصلہ پر واقع تھا۔ دوستوں کے اصرار پر پہلا شعری مجموعہ "پہلی منزل" جو کہ باقاعدہ کتاب کی شکل میں نہیں تھا متعارف کروایا۔ تقریباً ایک سال ادب اور ادب سرائے کے قریب رہنے کے باوجود ادب سرائے جانے کا اتفاق نہیں ہو سکا مگر اس کا نام ہمارے مختصر سے ادبی حلقہء احباب کے ذہنوں میں ضرور نقش ہو گیا۔

ملاقات کا شرف

کے سیکیورٹی (Solo Group) وائرلیس ٹیکنالوجی جوائنٹ ریسرچ پروگرام مکمل ہونے کے بعد ہم گلبرگ منتقل ہو گئے جہاں پر سولو گروپ (Week-End) اینڈ سرویلنس کے متعلقہ بہت سے پراجیکٹس کی لانچنگ اور ریسرچ میں گم ہو گئے ادب کا ذکر تو صرف ویک اینڈ سیشنز میں کبھی کبھار ہوتا تھا۔ (Sessions

دو سال مزید گزر گئے اور اب ہماری کمپنی اپنے سیکٹر میں ڈومینیٹ کر چکی تھی۔ اب ہمارا زیادہ تر فوکس صرف فرنچائزنگ اور لائسنزنگ تھیں اور ساتھ ہی ساتھ (Key Players) پروگرامز پر تھا۔ محمد طارق سہیل اور عبدالرشید اعوان دونوں شخصیات اس حوالے سے کی پلیئرز میری شاعری کو بہت زیادہ پسند کرنے والے بھی تھے جنہوں نے ادب کا چراغ میرے دل میں کبھی بجھنے تو کیا ٹمٹمانے بھی نہیں دیا۔ شاید ان تھی جس نے ایک دفعہ تو مجھے ادب سرائے کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ تاحال میں نے شہناز مزمل صاحبہ کا (Motivation) ہی کی موٹیویشن صرف نام ہی سنا تھا، ان سے باقاعدہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔

میں ادب سرائے کے ماہانہ ادبی پروگرام میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کمرے میں ابھی تین چار لوگ ہی موجود تھے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ 2007 ان میں ڈاکٹر شہناز مزمل کون ہیں، میں نے جن محترمہ سے پہلا سوال کیا کہ "کیا آپ بھی شاعری کرتی ہیں۔ وہ ڈاکٹر شہناز مزمل ہی تھیں۔

انہوں نے مسکرا کر جواب دیا جی بیٹا میں شاعری کرتی ہوں اور میری 25 کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور میں گذشتہ 20 سال سے ادب سرائے چلا رہی ہوں اور اس کی تاحیات چیئر پرسن بھی ہوں۔

یہ مختصر سا تعارف تھا جس کے بعد انہوں نے مجھے ہی سب سے پہلے اپنا کلام پڑھنے کی دعوت دے دی۔ اور پھر میری ٹیڑھی میڑھی شاعری کو بڑے اطمینان سنا گیا یا پھر یوں کہیے کہ بہت ہی صبر سے برداشت کیا گیا، قابل ذکر بات یہ کہ کسی نے بھی مجھے اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ مجھے ادبی محفل میں شاعری پڑھنے سے پہلے اصلاح ضرور کروانی چاہیے تھی۔ یہی بات ادب سرائے کا خاصہ تھی کہ یہاں نئے لکھنے والوں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب بھی کہیں بھی کچھ بھی پڑھا وہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی نظر سے گزارنے اور اصلاح کروانے کے بعد ہی پڑھا۔ اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

یہ تھی ادبی دنیا میں پہلا قدم رکھنے کی بات جو شاید چاند پر قدم رکھنے کے مترادف تھی مگر ڈاکٹر شہناز مزمل کی وجہ سے یہ سفر انتہائی آسان ہو گیا۔ کئی نئے لکھنے والے آئے اور چلے گئے ڈاکٹر شہناز مزمل جس کھلے دل کا مظاہرہ روزِ اوّل سے کرتی چلی آ رہی تھیں اسی بڑے پن کا مظاہر آج بھی ان کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہمسائیگی

مجھے اس بات کا کچھ علم نہیں تھا کہ جب میری ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ سے دوسری ملاقات ہو گی تب تک میرا آفس پھر ماڈل ٹاؤن میں ادب سرائے سے چند ہی قدم کے فاصلے پر منتقل ہو چکا ہو گا۔

نیازی گروپ کے ایک پراجیکٹ النور کارگو سٹی گوادر کے حوالے سے ابرار خان نیازی صاحب سے ہماری بہت سی ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور ہم پارٹ ٹائم گوادر کے ایشوز اور ریسرچ کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ابرار خان نیازی صاحب نے ادب سرائے کے قریب ایک بلڈنگ لی اور آفس کیلئے فرنش بھی کروالی۔

اگلی ہی شام مجھ سے تمام معاملات طے کئے اور اس سے اگلے دن آفس میرے حوالے کر دیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے ہی ہو چکا تھا۔ یوں ڈاکٹر شہناز مزمل سے ہمسائیگی نصیب ہو گئی۔

ملاقاتوں کا سلسلہ

جلد ہی ڈاکٹر شہناز مزمل سے باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی ادب سرائے آفس اور کبھی نیازی گروپ آفس، ادب اور ادب سرائے کو دنیا میں اک الگ انداز میں متعارف کروانے کے حوالے سے بہت سے سیشنز ہوتے رہے، ملکی اور بیرونِ ملک اردو ادب سے متعلقہ معروف شخصیات سے مستقل رابطے ہونے لگے۔ زیادہ تر شخصیات سے ڈاکٹر شہناز مزمل کا ذاتی طور پر تعلق تھا مگر انٹرنیٹ کی وجہ سے ادبی فاصلے کم سے کم کرنے کی کوشش شروع ہو گئی۔ یوں ہمارا مختصر سا ادبی حلقہ ادب سرائے کی وسیع دنیا میں گم ہو گیا۔

دورِ حاضر کے نئے ٹرینڈز

ڈاکٹر شہناز مزمل کی اپنی ویب سائیٹ ہو، ادب سرائے کا ادبی ویب پورٹل ہو، یا پھر ڈاکٹر شہناز کی تمام کتابوں کا ڈیجیٹل فارمیٹ میں ویب آڈیو بکس ہوں یا پھر ماہانہ و (MP3) پر متعارف کروانا ہو، ساتھ ساتھ ایم پی تھری (DVDs) یا ڈی وی ڈیز (CDs) سائٹ پر اور سی ڈیز سالانہ پروگرامز کی تصویریں اور وڈیوز ہوں غرض یہ کہ جدید دور سے ہم آہنگ بہت سے کام شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر شہناز مزمل جو بھی نیا ٹرینڈ دیکھتیں اسے ادب کی خدمت کے لئے منظرِ عام پر لانے میں ذرا بھی دیر نہ کرتیں۔ ان کی ادب کے حوالے سے اپنے کام کی لگن یقیناً حیران کن تھی۔ آج بھی وہ اس ادبی لگن میں مگن ہیں اور وہ جو کچھ بھی نیا کرتی ہیں وہ ادبی دنیا کا ٹرینڈ بن جاتا ہے۔ اگر انہیں دورِ حاضر کا ادبی ٹرینڈ سیٹر کہا جائے تو اس میں ذرا سی بھی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔

"پہلی باقاعدہ کتاب" من کٹھرا

ڈاکٹر شہناز مزمل ویسے تو مجھے کئی بار اہل کتاب ہونے کے فوائد بتا چکی تھیں، جن میں ایک یہ کہ اہل کتاب کبھی مرتا نہیں اور دوسرا یہ کہ اس کے وسیع تر مفادات تب معلوم ہوں گے جب آپ کی کتاب آ جائے گی۔ انہی کی کاوشوں سے 2009 میں میری پہلی باقاعدہ کتاب "من کٹھرا" بھی منظرِ عام پر آ گئی جس کی پرنٹنگ سے لے کر پروموشن تک کا سارا کام نیازی گروپ نے اپنے ذمہ لے لیا اور جو کسر رہ گئی وہ ڈاکٹر شہناز مزمل نے پوری کر دی۔

من کٹھرا کی باقاعدہ تقریبِ رونمائی کا اہتمام بروز ہفتہ 11 جولائی 2009 کو ہوٹل سن فورٹ، لاہور میں کیا گیا۔ تقریب کے معاونین میں نیازی گروپ، ماروِل سسٹم اور ادب سرائے شامل تھے۔ تقریب کی صدارت محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ نے کی۔

محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ نے "من کٹہرا" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا وقار محبت کا شاعر ہے، یہ محبت اس نے اپنے خدا سے مذہب سے اپنی مٹی سے اپنے فن سے اور اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں سے کی ہے۔ اور اس محبت نے اس کو جو کچھ دیا ہے وہ لے کر من کٹہرے میں آن کھڑا ہوا ہے۔

میری کتاب سے متعلقہ کسی بھی کام کو انہوں نے کبھی ایکسٹرا کے طور پر نہیں لیا، وہ میرا تعارف یوں کرواتی تھیں کہ دیکھیں میری 25 کتابوں میں سے کوئی سپانسر نہیں ہوئی اور ان کی پہلی کتاب سپانسر ہو گئی۔ حقیقت یہ تھی کہ نیازی گروپ نے شاعری کی وجہ سے نہیں میرے ذاتی تعلق اور ریسرچ ورک میں بے پناہ لگن کو دیکھتے ہوئے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔

ابرار خان نیازی کا ادبی تعاون

ڈاکٹر شہناز مزمل کی اپنی شخصیت ایسی تھی کہ میرے آفس کا ہر فرد ان کی دل سے عزت کرتا تھا۔ یہاں میں ابرار خان نیازی صاحب کا ذکر نہ کروں تو یہ یقیناً زیادتی ہو گی جنہوں نے ادب سرائے کے لیے ہمیشہ ایک بھرپور تعاون کی فضا قائم رکھی۔ یقیناً کوئی بھی باس یہ نہیں چاہتا کہ اس کے اپنے وسیع تر مفادات میں کسی بھی طرح کے اور کسی کام کی باقاعدہ مداخلت ہوتی رہے، آفرین ہے ابرار خان نیازی صاحب پر جنہوں نے ادب سرائے کے تمام مہمانوں کی ہمیشہ خاطر خواہ مہمان نوازی بھی جاری رکھی اور اپنے ہی آفس میں ادب سرائے سے متعلقہ کسی بھی سرگرمی پر کبھی بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

کا اظہار ہوتا تو یہ تعاون کی فضا کبھی بھی ہموار نہ ہوتی۔ ابرار خان نیازی صاحب (Reservation) اگر ان کی طرف سے کسی قسم کی ریزرویشن نے نہ صرف ہمیشہ ادب سرائے کے ساتھ بھرپور تعاون کیا بلکہ اپنے انتہائی مفید مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔

پروفیشنل ازم

دوسری طرف ڈاکٹر شہناز مزمل نے بھی ادب میں پروفیشنل ازم کا شاید ہی کوئی تقاضہ ہو جو پورا کرنے کی بھرپور کوشش نہ کی ہو۔ نہ انہوں نے اپنا کوئی کام رُکنے دیا اور نہ ہی میرے کسی کام پر ہرج آنے دیا، بلکہ ہر طرح سے بہت ہی سپورٹیو رہیں۔ ادب سرائے کے حوالے سے اگر ان کے پروفیشنل ازم کا جائزہ لیا جائے تو وہ ایک تجربہ کار خاتون ہیں، اپنے ہر کام میں انتہائی کمٹمنٹ کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ٹائم اور ٹائم لائنز کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ گنے چُنے سنجیدہ لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

چوبیس میں سے اڑھتالیس گھنٹے

ادب سرائے آفس کو خوبصورت لائبریری میں تبدیل کرنا ہو، آفس کی دیواروں کو ادبی پروگرامز کی اہم تصاویر اور ایوارڈز سے سجانا ہو، ساتھ ساتھ آنے والے پروگرامز کی تیاری ہو، ملکی اور بیرونِ ملک تسلسل سے رابطے ہوں، یا کہ نئے لکھنے والوں کی تواتر کے ساتھ رہنمائی ہو یا پھر کسی بھی قسم کا ادبی ریسرچ کا کام ہو شہناز مزمل چوبیس میں سے اڑھتالیس گھنٹے کیسے نکال لیتیں تھیں یہ بات میرے لیئے آج تک کسی معمّے سے کم نہیں۔

صدیوں کا کام

جو کام ہم اپنے آفس میں پوری ٹیم اور مناسب فنانشل سپورٹ کے ساتھ بھی بڑی مشکل سے سرانجام دیتے تھے، وہ تنِ تنہا یہ سب کچھ بڑے آرام سے چہرے پر تھکاوٹ کے کسی شکن کے ظاہر کئے بغیر خوش و خرم کرتی چلی جارہی تھیں۔ جیسے ابھی صدیوں کا کام باقی ہو، جیسے وہ ادب کو اپنے ساتھ لے کر آسمان کے حدوں سے نکلنا چاہتی ہوں، جیسے ادب کی خدمت انہوں نے اپنی اکیلی جان پر فرض کی ہوئی ہو۔ میرا کئی دفعہ ان سے اصرار رہتا کہ وہ اپنی انرجی ضرور سیو کیا کریں۔ مگر ان کے جنوں میں کبھی کمی نہیں آئی۔

ادبی کارِ خیر

ویسے میرا ادب سے کوئی خاص تعلق تو نہیں تھا، مگر ڈاکٹر شہناز مزمل کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے کچھ آگہی ضرور ہوئی، اس بات کا فخر محسوس ہوتا ہے مجھے ان کے ساتھ ادبی کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کا موقعہ ملتا رہا۔

ڈاکٹر شہناز مزمل اپنے ادبی اور کام کو روز بروز پھیلاتی جارہی تھیں جب کہ میں اکثر ان سے اصرار کرتا رہتا کہ اپنے کام سمیٹ کر کوزے میں بند کریں تاکہ ان تعارف کروانے اور ان کی وسیع تر خدمات کا جائزہ لینے میں کچھ آسانی ہوسکے۔ مگر یہ بھی ان کی وسیع تر مصروفیات میں ایک اور مصروفیت بڑھانے کے مترادف تھی۔

تمام تر ادبی سرمایہ

میری ایک سطحی بات کو انہوں نے بہت سنجیدگی سے لیا اور چند ماہ کے عرصے میں اپنا بیس یا پچیس سالوں کا تمام تر ادبی سرمایہ، جانے کہاں کہاں سے اور کس طرح سے اکھٹا کر لیا، کئی اخباروں میں ان کے کالم، اور انٹرویوز آ چکے تھے، بہت سے ٹی وی، اور ریڈیوز پروگرامز بھی ہو چکے تھے، بہت سے طلباء نے ان پر ریسرچ ورک کر رکھا تھا، ان کے بہت سے بین القوامی ادبی دورے بھی ہو چکے تھے، بہت سے اعزاز اور ایوارڈز وغیرہ سے بھی نوازا جا چکا تھا جن کی اخباری، تصویری اور ویڈیو کوریج انہوں نے اکھٹا کر لیں اور اس کوشش کو مزید بھی جاری رکھا۔

ادبی خدمات کا مختصر جائزہ

میری حیرانی اور تجسّس کا ایک دریا تھا جو اب ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر شہناز نے ادب کی دنیا میں کیا تاریخ رقم کر دی تھی شاید انہوں نے اس پر کبھی اس انداز سے سوچا بھی نہ تھا۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ، سیکڑوں بین القوامی ادبی اداروں سے روابط، 600 سے زیادہ ماہانہ ادبی پروگرامز کا انعقاد، ہزاروں ملکی ادبی پروگرامز میں شرکت، سینکڑوں غیر ملکی ادبی پروگرامز میں شرکت، سینکڑوں بین القوامی معروف ادبی شخصیات کو اپنے ماہانہ پروگرامز میں مہمانِ خصوصی کے طور پر شرکت کی دعوت، 300 سے زیادہ سپیشل ڈے پروگرامز، سینکڑوں نئی کتابوں کی تقریب رونمائی، 5000 سے زیادہ اردو کی کتابوں اور پبلیکیشنز کے ریویوز، ہزاروں نئے لکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کی اصلاح اور تربیت، 5000 سے زیادہ پرنٹ اور ڈیجیٹل میڈیا نیوز کٹنگز اور کلپنگز، 3000 سے زیادہ ای میلز اور میل سرکلیشن، 5000 سے زیادہ لوگوں کا آن لائن فالو آپ اور اس کے علاوہ بہت کچھ۔

خوبصورت پورٹ فولیو

ڈاکٹر شہناز مزمل کی ادبی خدمات پر ایک خوبصورت پورٹ فولیو ترتیب دیا گیا ہے جو اکثر ان کے ہاتھوں کی زینت ہوتا ہے اور اب وہ جس محفل میں بھی جاتی ہیں یہ اُس محفل کی بھی زینت ہوتا ہے۔ اس خوبصورت پورٹ فولیو میں ان کی 28 سالہ تمام تر ادبی خدمات کے تفصیلی حوالے ایک خاص انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ پورٹ فولیو ملکی اور غیر ملکی تمام قابلِ ذکر ادبی شخصیات اور ادبی اداروں تک پہنچ چکا ہے اور اس کی ریڈرشپ میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ پنجابی کمپلس لاہور نے ان کے اعزاز میں ایک شارٹ ڈاکومنٹری بھی مرتب کی ہے۔

ادب سرائے کے ممبران کی تعداد میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، جن کی نظر سے ان کی خدمات گزرتی ہیں ان کا ادب سرائے اور ڈاکٹر شہناز سے ملنے کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔

ادب سرائے کی سالانہ رپورٹ بھی پورٹ فولیو کا حصہ بنتی ہے جس کی وجہ سے ہزاروں ملکی اور سینکڑوں غیر ملکی ادبی شخصیات نہ صرف ادب سرائے سے منسلک ہو چکی ہیں بلکہ ادب سرائے کی طرف سے انہیں ایک خاص سرٹیفکٹ بھی جاری کیا جاتا اور ایک خاص انداز سے ان کا تعارف بھی کروایا جاتا ہے اور ان کے کام کی خاطر خواہ پزیرائی بھی کی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ سالانہ ادبی ایوارڈز کا سلسلہ بھی جاری ہے اور سالانہ خصوصی پروگرام کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

ادب سرائے کی لائبریری

ادب سرائے کی لائبریری جس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں دورِ حاضر اور گذشتہ دور کے تمام قابل ذکر شعراء اور ادیبوں کی کتابیں محفوظ ہیں اور یہ نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے، مزید یہ کہ ڈاکٹر شہناز مزل بھی ان کی رہنمائی کے لیے بذات خود موجود ہوتی ہیں۔ فروغِ ادب کے لیے ان کے ماہانہ تربیتی پروگرام کا اجراء ان کی دیگر خدمات میں ایک اور اضافہ ہے۔

کلیاتِ شہناز

ڈاکٹر شہناز مزمل کی 25 سے زائد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور مزید کتابوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے، ان کی کلیات جس کا نام متاعِ عشق ہے اس پر بھی تقریباً 95 فیصد کام مکمل ہو چکا ہے اور ان کا بے مثال کام جب میری نظروں سے گزرا تو میں نے ان کے سارے کلام سے مثل ایک مثلِ کلیات مرتب کر دی جو کہ ان کی اصل کلیات کو خوش آمدید کہنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

مثلِ کلیات ایک منفرد کتاب

مثلِ کلیات اپنے طرز کی ایک منفرد کتاب ہے جس میں ڈاکٹر شہناز مزمل کی انتہائی عام فہم شاعری شامل کی گئی ہے۔ اس میں وہ شاعری شامل ہے جسے وہ اکثر اپنی ادبی نشستوں میں پڑھتی آئی ہیں یا پھر ان سے بار بار پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ اس میں وہ کلام بھی

شامل ہے جو اکثر ادبی رسائل وغیرہ میں تشہیر ہوتا رہا، اور وہ نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں جن کی سوشل میڈیا میں بھی بھرپور حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ میں نے ان کا سارا کلام بہت زیادہ گہرائی سے تو نہیں پڑھا، بہر حال ان کی بہت سی تخلیق ایسی ہے جو سطحی لحاظ سے بھی نظر سے گزرے تو بھلائی نہیں جا سکتی، ان کے تمام اچھوتے خیال جو کہ اَن مٹ نشان چھوڑ جاتے ہیں مثل کلیات کا خاصہ ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل بحثیتِ انسان

ڈاکٹر شہناز مزمل نہایت خوش اخلاق، بے حد مہمان نواز اور بڑی باکردار ادبی اور سماجی شخصیت ہیں۔ بین القوامی شہرت کے باوجود بھی ان میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں، طرز زندگی انتہائی سادہ، دین اسلام سے بے پناہ لگاؤ، ادب سے بے پناہ محبت، اردو ادب سے جنوں کی حد تک لگاؤ، رشتوں کا تقدس اور احترام، دل میں بھرپور جذبہء انسانیت اور جذبہء حب الوطنی اِن کا خاصہ ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ انسان ان سے ملنے کے بعد کبھی انہیں بھول پائے۔ اِن سے ہر طرح کا اختلاف رکھنے والے بھی ان کی عظمت پر سلام پیش کرتے ہیں جو کہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ جتنا انہوں نے اپنے آپ کو ادب میں منوایا ہے اتنا ہی بحثیتِ انسان بھی اپنا نام منوانے میں کامیاب رہی ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل ایک پُر اسرار شخصیت

اتنا سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود ابھی بھی اِس پُر اسرار شخصیت کے بہت سے راز ہیں جو ابھی تک معلوم نہیں۔ ظاہر ہے سمندر کے گہرائی کا اندازہ سمندر میں اترنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔ میرے نقش پا تو ابھی سمندر کے ساحل پر پڑے ہیں اور نظریں چند ساحلی نظاروں اور موجوں پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ نہ میں باقاعدہ شاعر ہوں، نہ میں باقاعدہ مصنف ہوں، نہ مجھ میں ڈوبنے کا حوصلہ ہے نہ مجھ میں تیرنے کا ہنر ہے۔ میں بس ایک ادھورا سا بے نام مصور ہوں جس نے آپ کے لئے ایک آدھی ادھوری سی تصویر چھوڑ دی ہے۔

میاں وقار الاسلام

فکرِ سلطان

ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کے بہترین فکری مضامین

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایکو کیئر کنسلٹینسی سروسز اور ماروِل سسٹم کی ایک دھائی سے زیادہ پیشہ ورانہ اور ادبی رفاقت کا سفر

ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کا غائبانہ تعارف کافی پہلے سے تھا جب وہ فیض گھر میں غذا، صحت اور غذائی تحفظ سے متعلقہ مختلف موضوعات پر تعلیمی اور تحقیقی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا باقاعدہ تعارف ڈاکٹر شہناز مزمل چیئر پرسن ادب سرائے انٹرنیشل، نے کروایا جو ان دنوں فیض گھر میں ماہانہ ادبی مشاعروں کا انعقاد کیا کرتی تھیں اور باقاعدگی سے ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں بھی شریک ھوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کی دو ذاتی کمپنیاں ہیں، ایکو کیئر کنسلٹینسی سروسز اور ڈائیٹ کیئر۔ اس کے علاوہ وہ حکومت پنجاب کے باقاعدہ اعلی عہدیدار بھی رہ چکے ھیں، یورپی یونیورسٹی میں تدریس و تحقیقی فرائض ادا کر چکے ھیں نیز لاتعداد غیر حکومتی اداروں (این جی اوز) اور نیم خود مختار یونیورسٹیز تھی جس کے بعد وہ اپنی کمپنی ECSP وغیرہ میں بھی کام کرتے رہے ھیں۔ انکی آخری ملازمت حکومت پنجاب کی ایک انجینئرنگ مشاورتی کمپنی کے سربراہ ھیں۔ آپ۔ سماجی خدمات میں بھی پیش پیش رہتے ھیں۔ (ECCS) ایکو کیئر

ماروِل سسٹم کی طرف سے ڈاکٹر سلطان صاحب سے کاروباری مشاورت کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کی شخصیت صرف ان تین کمپنیوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ تب تک وہ اپنے آپ کو بہت سے دیگر میدانوں میں بھی منوا چکے تھے۔ مثلا" ڈاکٹر صاحب تین دہائیوں سے سیاسی اور سماجی موضوعات پر طنزیہ مضامین لکھتے چلے آ رہے ھیں اور ان کے ساتھ ساتھ ماحولیات، انسانی و حیوانی غذا کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحقیقی مضامین لکھتے چلے آ رھے ھیں۔ انکی اردو ادب سے گہرے لگاؤ کی وجہ سے انہیں مزید جاننے کی خواہش ہوئی تو ان کے مختلف آرٹیکلز کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

شاعری کی دنیا میں اگر میرا کوئی استاد ہے تو وہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ ہیں اور اگر مضامین کے حوالے سے میں نے ادب میں کوئی حصہ ڈالا ہے تو اس کا بہت بڑا اعزاز ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کے بعد ڈاکٹر سلطان محمود ادب کی دنیا میں میری دوسری بہترین متاثر کن شخصیت ہیں۔ میں گوادر اور سی پیک پر تو پہلے سے لکھ رہا تھا مگر میرے اس کام کو بھی اگلی سطح پر لے جانے میں ڈاکٹر سلطان محمود کا کردار ہمیشہ کلیدی نوعیت کا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں مزید جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔

گزشتہ دس سالوں سے ڈاکٹر سلطان صاحب ہمارے ہر پیشہ ورانہ سفر میں ساتھی رہے ہیں، مری سے گوادر تک جہاں جہاں بھی ہماری پیشہ ورانہ سرگرمیاں رہیں، ڈاکٹر سلطان محمود براہ راست ہمارے ساتھ منسلک رہے اور ہم ان سے مستفید ہوتے رہے۔ ڈاکٹر سلطان محمود ان ساتھیوں میں سے ہیں جن پر ہمیشہ فخر کیا جاسکتا ہے۔

فکرِ سلطان اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف ہے جس میں ڈاکٹر سلطان محمود کے نمائندہ مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلطان محمود کے بے شمار شائع شدہ مضامین کتابی شکل میں ڈھل کر دس سے زائد کتب میں سامنے آ چکے ھیں۔ جن کی ابتدائی فہرست درج ذیل ہے، ا۔ اسینشل آف ہیومن نیوٹیشن (انگریزی)، ۲۔ غذائی علاج حصہ اول، ۳۔ غذائی علاج حصہ دوم، ۴۔ سلطانی گواہ، ۵۔ میٹھا سچ، ۶۔ شوگر کوٹ، ۷۔ ماحولیات، ۸۔ اینمل اپیکٹ (انگریزی)، ۹۔ فوڈ سیکوریٹی (انگریزی)۔ ۱۰۔ سیکس المانا (اردو جنسی خزائین)۔ ان دس کتابوں کے علاوہ ان کے دیگر مضامین ملکی جرائد میں تسلسل کے ساتھ چھپ رہے ھیں جن کو سابقہ طرز پر کتابی شکل دینے کا عمل جاری و ساری ہے۔ ادبی و سائنسی تحقیق پر مبنی مضامین کے علاوہ ڈاکٹر سلطان محمود صاحب شاعری سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی ایک غیر شائع شدہ کتاب 'سائنسدان کی شاعری' کے نام سے بھی مکمل ہے۔

اُمید کرتا ہوں کہ آپ کو ڈاکٹر سلطان محمود کے مضامین میں سے ہمارا انتخاب پسند آئے گا اور آپ اپنی قیمتی رائے کا اظہار بھی کرتے رہیں گے۔

دعا گو

میاں وقار الاسلام

شہرِ داغدار کا مسافر

من کٹہرے میں عاجزی سے ہاتھ باندھے کھڑا شاعر میاں وقار الاسلام خود احتسابی کے بعد اب شہرِ داغدار کی جانب آ نکلا ہے۔ اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے دعا کرتے کرتے وہ اِس شہرِ داغدار میں بستے لوگوں کے لئے بھی معافی مانگنے کو تیار ہے۔ لیکن ہر طرف پھیلے ہوئے کُرب و بلا کے سلسلے مکر و فریب کے جال، بے ضمیری اور بے حسی کی چالیں، خون بہاتے گلے کاٹتے لوگ، آرزؤں اور خوابوں کو پامال کرنے والے ہاتھ، جگہ جگہ اپنے ہی اندر اپنے آپ کو ڈستے لوگ اور ان کے جسموں سے کھیلتی سڑانڈ اور تعفن نے وقار کے دل کو مزید آزردہ کر دیا ہے۔ وہ عاد و ثمود اور دورِ گزشتہ میں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہو جانے والی قوموں کی مثال دے کر اِن کو سمجھانا چاہتا ہے۔ اس کا شیشے جیسا نازک اور شفاف دل ان تمام چیزوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تو وہ قلم اُٹھا لیتا ہے۔ اِس سے کیسی شاعری جنم لیتی ہے، کبھی نثر، کبھی وہ نئی ٹیکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا کا سہارا لیتے ہوئے اپنا ماضی الضمیر لوگوں تک پہچانا چاہتا ہے۔ اس کا محبت بھرا دل اس پیغام کو کہاں تک عام کر رہا ہے اس کا اندازہ آپ کو شہرِ داغدار پڑھ کر اور وقار کے نثری طور پر قلم بند ہوئے خیالات کو پڑھ کر ہو گا۔ اے کاش اس کا دنیا کو جنت بنانے کا خواب پورا ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو بھی طمانیت اور سکون حاصل ہو۔ وقار کے پُر مضر خیالات پر ہم ان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ ان کا شہرِ داغدار کا سفر بخوبی اور آسانی سے طے ہو سکے۔

دعا گو

مادرِ دبستان لاہور

ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن ادب سرائے

ایف ماڈل ٹاؤن، لاہور 125

www.adabsaraae.com

www.shahnazmuzammil.com

من کٹہرا۔ پیش لفظ

ڈاکٹر شہناز مزمل

من کٹہرے میں خود احتسابی کے لیے کھڑے ہوئے مجرم شاعر میاں وقار الاسلام کا شعری مجموعہ میرے سامنے ہے۔ ذہن میں بہت سے سوال جنم لے رہے ہیں۔ یہ کون ہے؟ کس لیے من کٹہرے میں کھڑا ہے؟ کیا احساسات وجذبات کی سنگینی اِسے یہاں تک لائی ہے۔ یا اعترافِ جرم کے لیے اِس نے من کٹہرے کا انتخاب کیا ہے؟ من کٹہرے میں کھڑا یہ شاعر عجز کے ساتھ ساتھ تذبذب کا بھی شکار نظر آتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اِس کی کتاب پر بنے ہوئے ٹائٹل میں نمایاں ہے۔ اور اس کی اندرونی کیفیات کی عکاسی کر رہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں بات کا آغاز کس طرح کروں۔ مجھے شاعری کے بارے میں شیلے کی کوٹیشن یاد آ رہی ہے۔

شاعری ہماری باطن کی نظر کے سامنے سے وہ پردہ ہٹا دیتی ہے۔

جو ہمارے وجود کے عجائب کو ہم سے چھپائے رکھتا ہے۔

اور جب وہ پردہ ہٹ جائے تو کیا ہوتا ہے۔ روح میں چھپے حقائق الفاظ کا جامہ پہن کر قطار در قطار صفحہ قرطاس پر بکھرتے ہی جاتے ہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ شاعری عطیہء خداوندی ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام کا جائزہ لینے سے قبل ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کیا یہ شاعر فطرتی طور پر ایک شاعر ہے یا اس نے مشاہدے کی آنکھ سے جو کچھ دیکھا اور جذبات میں جو اُتھل پتھل ہوئی اس کو اشعار میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ وقار محبت کا شاعر ہے، یہ محبت اس نے اپنے خدا سے مذہب سے اپنی مٹی سے اپنے فن سے اور اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں سے کی ہے۔ اور اس محبت نے اس کو جو کچھ دیا ہے وہ لے کر من کٹہرے میں آن کھڑا ہوا ہے۔

نثری نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اسے ایک خیال ایسے بے چین کر دیتا ہے کہ میں گنہگار ہوں خطاوار ہوں لیکن ایک انسان ہوں

اس لیے اس کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا امتزاج نظر آتی ہے۔

میں ایسا بھی ہو سکتا ہوں
میں ویسا بھی ہو سکتا ہوں

پھر وہ خدا کو رحیم اور کریم ہونے کے ناطے سے پکارتا ہے۔

یا اللہ رحیم تو ہی ہے
یا اللہ کریم تو ہی ہے

انسان روز ازل سے ہی اپنی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

کیا ڈھونڈوں میں تیرے سوا
کوئی راستہ کوئی در کھلا

میری چاہتیں ہیں بلاوجہ
یہ مسافتیں ہیں بلاوجہ

اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتا بھی نظر آتا ہے

مجھ نا سمجھ سے شاید یہ ہی خطا ہوئی ہے

اور پھر یہ بھی کہتا نظر آتا ہے

شاید مجھے ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا

عشقِ حقیقی میں گرفتار و قار ہونے نہ ہونے کے تذبذب میں مبتلا ہے جس میں ہر وہ بندہ جو تصوف کے راستے پر گامزن ہے الجھتا رہتا ہے۔

و قار کے مجموعے میں شامل غزلیں بھی اِس کی اِن ہی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں

سُن تو سہی وہ کیا کہتا ہے
خود میں کیوں ڈوبا رہتا ہے

آگ چھپی ہے اُس کے اندر
آنکھوں سے دریا بہتا ہے

عشقِ مجازی کی کیفیت ملاحظہ ہو

راستوں کا جنگل ہے انتظار کرتا ہے
شخص ہے وہ پھولوں سا پھر بھی خوار کرتا ہے

اختیار ہوتا گر اِس بہار پر میرا
رنگ و بُو کے انتظام تیرے نام کر دیتا

آ جاؤ تم پھر سے محفل میں

ویراں دل کو آس ہی دے دو

عشقِ حقیقی اور عشق مجازی دونوں رنگ وقار کی شاعری میں موجود ہیں۔ من کٹھرے میں کھڑا مجرم معترف ہے۔

حال دل بیاں کرتا ہوں راز دل عیاں کرتا ہوں

اہل دل شاعر کہتے ہیں شاعری کہاں کرتا ہوں

وقار کے پاس اچھوتا خیال بھی ہے اور الفاظ کا ذخیرہ بھی۔ وہ الفاظ کے چناؤ اور بُنت کا ہنر بھی جانتا ہے۔ عروض پر گرفت قدرے کم ہے۔ اور وہ بتدریج اس کمی کو پورا کرنے کی کاوش کر رہا ہے۔ اس کے اندر موجود شاعر اس کو ہمہ وقت شاعری پر اُکسائے رکھتا ہے۔ اس کے دوست احباب اکثر فرمائش کر کے اس کی شاعری سنتے ہیں اور اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کر کے آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔ مستقبل میں انشااللہ وقار شاعری کے رموز و فن پر بھی قدرت حاصل کر لے گا اور ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے سے ادبی دنیا میں ایک مقام بھی حاصل کر لے گا۔

وادیء شعر و سخن ایک وادیء پُرخار ہے جس میں وقار نے ہمارے ساتھ آبلہ پائی کا آغاز کیا ہے۔ دیکھیں کتنے آبلے پھوٹتے ہیں اور کتنے کانٹوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔

میں اس کو ادبی دنیا میں پہلا قدم رکھنے پر مبارکباد دیتی ہوں اور اس کے مستقبل کے لیے دعا گو ہوں۔

مادرِ دبستان لاہور، ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن ادب سرائے

الیف ماڈل ٹاؤن، لاہور 125

www.adabsaraae.com

www.shahnazmuzammil.com

نورِ فرقان : قرآنِ پاک کا منظوم مفہوم

تصنیف : نورِ فرقان

شاعرہ : ڈاکٹر شہناز مزمل

تحریر : میاں وقار الاسلام

نورِ فرقان، قرآنِ پاک کا منظوم مفہوم ڈاکٹر شہناز مزمل کی انتہائی منفرد کاوش ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآنِ مجید کو آسان شعری طرز پر بیان کیا ہے۔ اس طرح کا کام عصرِ حاضر میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجھے یاد ہے، کچھ سال پہلے جب ڈاکٹر شہناز مزمل کی طبعیت کچھ ناسار رہنا شروع ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنی انرجی سیو کیا کریں ادبی کام اور ادبی پروگرام میں شرکت کو تھورا مختصر کر لیں۔

مذید یہ کہ اپنی شاعری کو کلیات کی شکل میں لائیں اور اس کو مکمل کریں بجائے نئی کتابیں لکھنے کے۔ کیونکہ انہوں نے جو کام کیا تھا وہی بہت زیادہ تھا۔ اور اسے دوبارہ سے مرتب کرنے کے لیے بھی خاصی انرجی درکار تھی۔ مگر شائید ڈاکٹر شہناز مزمل ایک ایسی شخصیت ہیں جنہیں روکنا ناممکن ہے۔ شوگر اور بلڈ پریشر کی وقتاً فوقتاً شکایات کے باوجود، بھی انہیوں نے خاموشی سے اور لگن سے اپنا کام جاری رکھا اور ایک بہترین تخلیق، ایک بہترین فن پارے کو منظر عام پر لانے میں کامیاب بھی ہو گئیں۔

قرآنِ مجید پر دنیا میں بہت کام ہوا ہے، لکھنے والوں نے اسے سونے کی تاروں سے بھی لکھا دیا، پڑھنے والوں نے ایسا پڑھا کہ لوگ سنتے ہی رہ گئے، تفسیر کرنے والوں نے ایسی تفسیریں کی کہ صدیاں کے حوالے سمیٹ دیے، تحقیق کرنے والے آسمانوں کی بلندیوں میں، اور سمندروں کی گہرائیوں میں کھو گئے۔ ملک کے ملک بدل گئے نسلوں کی نسلیں سنور گئی۔ لوگ قرآن کو پڑھتے، اور پڑھاتے چلے گئے، اور دیے سے دیے جلتے گئے، بے نور چہرے منور ہو گئے، دل سکون پا گئے، مگر علم کی تڑپ بڑھتی ہی چلی گئی۔ اللہ خود فرماتا ہے کہ اگر سمندر سیاہی ہو جائیں اور درخت قلم بن جائیں تو بھی تمہارے رب کی تعریفیں کم نہ ہوں۔ حالانکہ تم اتنے ہی اور لے آؤ۔

اللہ تعالی لوگوں کے اپنے کام کے لئے چُنتا ہے اور ان سے اپنی مرضی کے کام لے لیتا ہے۔ یقیناً ڈاکٹر شہناز مزمل کو اللہ تعالی نے جس کام کے لئے چنُا ہے وہ بہت بڑا کام ہے، جس کی جتنی بھی تعریف کیا جائے کم ہے۔ ڈاکٹر شہناز مزمل ادبی دنیا میں کسی بھی لیول پر کسی بھی طرح کے تعارف کی محتاج نہیں، تمام ادبی حلقوں میں ان کی الگ ہی پہچان ہے، اور انہیں بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کلیاتِ شہناز اپنے آپ

میں ایک وسیع کام تھا، اپنی ہی 30 کتابوں کے دوبارہ سے ترتیب دینا، پروف ریڈ کرنا اور فائنل پبلیکیشن کے طور پر سامنے لانا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اتنا بڑا کام کہ پورے قرآن مجید کا منظّم مفہوم بھی منظرِ عام پر لے آنا، واقعی ایک قابل تحسین امر ہے۔

انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہوتا، انسان کی بس نیت اور کوشش ہوتی ہے، اللہ فضل کر دے تو بڑے بڑے کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں ڈاکٹر شہناز مزمل کی طبعیت سے باخوبی آگاہ ہوں کیوں کہ ہماری تقریباً روز ہی بات ہوتی رہتی ہے۔ انرجی لیول کم ہونے کے باوجود اللہ نے جس طرح ان سے اتنا بڑا کام لیا ہے، وہ اللہ کے فضل سے ہی ممکن تھا۔ کیوں کہ جب اللہ تقویت بخشتا ہے تو انسان ایسے کام کر جاتا ہے جن کا اسے خود بھی یقین نہیں ہوتا۔

میرے لیے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ مجھے ان کے کام میں حصہ ڈالنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے، میں اس امر کے لیے ڈاکٹر شہناز مزمل کا دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں۔

نورِ فرقان، قرآنِ پاک کا منظوم مفہوم ڈاکٹر شہناز مزمل کی دونوں ویب سائٹس کی زینت بن چکا ہے۔

www.adabsaraae.com

اس ویب سائٹ پر یہ کتاب پی ڈی ایف فارمیٹ میں موجود ہے، جسے ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کو اس کی ویب سائٹ کے بکس کے آپشن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

www.shahnazmuzammil.com

اس ویب سائٹ پر کہ کتاب آڈیو اور فلیش فارمیٹ میں موجود ہے جسے سنا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو بھی اس کی ویب سائٹ کے بکس کے آپشن میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کو مکمل کرنے کے لیے جن مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑھا ہے اس کا اندازہ تو آپ کو کتاب پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا۔ آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ انہوں نے اپنا کام کتنی ذمہ داری اور مخلصانہ کاوشوں سے مکمل کیا ہے۔ مجھے اس بات کا تو یقین ہے کہ یہ کتاب دنیا میں انہیں ایک الگ پہچان دینے میں ضرور کامیاب ہوگی، اس کے علاوہ میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس عظیم کام کے بدلے انہیں آخرت کی بھی کامیابی نصیب فرمائے (امین)

دعا گو۔

میاں وقار الاسلام، شاعر، ادیب، کالم نگار، مرتب، کارپوریٹ ٹرینر، بزنس کنسلٹنٹ

پرنسپل کنسلٹینٹ، ماروِل سسٹم، ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ

فاونڈر، وقار پاکستان، ایڈوائزر ادب سرائے انٹرنیشنل

منتہائے عشق تک کی مسافت

تصنیف : منتہائے عشق

شاعرہ : محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل

تحریر : میاں وقار الاسلام

ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کی ادبی زندگی کا سنہرا دور جو ان کی 30 سے زیادہ کتابوں پر مشتمل ہے جن میں ان کا حمدیہ اور نعتیہ کلام بھی شامل ہے، سفر نامہ اور کالمز بھی شامل ہیں نظم اور غزلیں بھی شامل ہیں، ریسرچ پبلیکیشن بھی شامل ہیں، ان کی بائیو گرافی بھی شامل ہے اور ان سب سے بڑھ کر ان کی کلیات بھی حال ہی میں شامل چکی ہیں جن کا ایک حصہ منتہائے عشق کے نام سے غزلیات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ ندائے عشق کے نام سے ہے۔

گو سفر ابھی ختم نہیں ہوا اوپر والا تمام کام اپنی جگہ اہم ہے مگر جو کام نور فرقان کے نام سے قران کے منظوم مفہوم ترجمہ کی صورت میں سامنے لائی ہیں اس کی مثال دور حاضر میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ بغیر عشق اور جنون کے اس طرح کے تحفے کسی پر عنائیت نہیں ہو سکتے۔

اگر ان کی زندگی کے گذشتہ 15 سالوں پر نظر ڈالی جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شہناز مزمل نہ تھکتی ہیں، نہ رکتی ہیں اور نہ ہی اپنے مصروف کا اظہار کرتی ہیں اپنے کام کے علاوہ یہ ادبی اور سماجی طور پر بھی اسی طرح محرک ہیں جیسے وہ اس سے پہلے محرک تھیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم اکثر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں مگر وہ نہ خود تھکتی ہیں اور نہ ہمیں پیچھے رہنے دیتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر پھر ہمت بندھ جاتی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی سے ہم پھر چلنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل ایک شخصیت نہیں ایک کارواں کا نام ہے اور اس کارواں کی آبیاری میں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی پوری زندگی کی مسلسل محنت اور بے لوث محبت سے کی ہے۔ ڈاکٹر شہناز مزمل اپنے اس ادبی کارواں کی تا حیات روح رواں ہیں اور ان کے کارواں کا ہر فرد اپنے سینے میں ایک ایسا دل لیئے پھرتا ہے جس میں ادب کے تمام پودے ڈاکٹر شہناز مزمل کے لگائے ہوئے ہیں۔ رشتوں میں اگر خلوص نہ ہو تو خون کے رشتے بھی پانی ہو جاتے ہیں اور اگر رشتوں میں خلوص ہو تو وہ خون کے رشتوں سے بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل نے جو رشتے اپنے خلوص سے گہرے کیئے ہیں ایسے گہرے رشتے تو آج خون کے رشتوں میں بھی کم نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کی مثال ایک ایسی شمع کی مانند ہے جو خود جلتی بھی رہی اور پگھلتی بھی رہی مگر اپنی روشنی سے اپنے اطراف کو ہمیشہ منور رکھا اور جہاں گئیں روشنیاں بکھیرتی گئیں۔ اور ان کے پروانے جہاں بھی ہوں جس حال میں بھی ہوں ان کی نظریں انہیں کی طرف جمی رہتی ہیں اور ان سے مزید روشنیاں سمیٹنے کی خواہاں بھی رہتی ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کو اللہ نے جو مقام عطا کیا ہے وہ بہت کم لوگوں کو عطا ہوتا ہے۔ اللہ انہیں مزید کامیابیوں سے ہم کنار کرے اور انہیں روشنیوں پر روشنیاں بکھیرنے کے لیئے مزید ہمت، طاقت اور صحت عطا کرے۔

منتہائے عشق اور ندائے عشق کی رونمائی اور تقسیم

وقارِ پاکستان کے ایگزیکٹیوز، کارپوریٹ فورمز اور لیٹریری فورمز کے طرف سے ڈاکٹر شہناز مزمل کی تازہ ترین ادبی تخلیقات جن میں منتہائے عشق، حصہ غزلیات، ندائے عشق، حصہ نظمیں اور نورِ فرقان، قرانِ مجید کا منظوم مفہوم شامل ہیں پر زبردست خراج تحسین۔

وقارِ پاکستان کی طرف سے ڈاکٹر شہناز مزمل کی پبلکیشن کی ڈیجیٹل پریزینٹیشن، مارننگ شوز، ویڈیو تبصرے اور ری ویوز، ڈیسکشن پینلز کا اہتمام، رونمائی کے خصوصی پروگرامز، تعلیمی، ادبی، سماجی، سیاسی حلقوں میں اعزازی کاپیز کی تقسیم اور تعارفی سیشنز، ہائی آفیشلز بالخصوص جناب صدرِ پاکستان عارف علوی صاحب کی خدمت میں کتابوں کے سیٹ کا نذرانہ۔

کارپوریٹ فورمز میں نیازی گروپ آف کمپنیز، ایکو کیئر، گیٹ گروپ، گوادر انٹرنیشنل، اربن وسٹا، مارول سسٹم، اظہر گروپ آف کمپنیز، شاہین گروپ آف کمپنیز، النور کارگوسٹی، سرائے نور، تعلیمی بیٹھک، سکائی ریچ، ڈائیٹ کیئر، پنجند گروپ، اور بہت سے دیگر کارپوریٹ فورمز شامل ہیں۔

لیٹریری فورمز میں آگہی، دریچہ ادب، اردو سخن، دبستانِ خالد نصر، ہیرا فاؤنڈیشن اور دیگر شامل ہیں۔

وقارِ پاکستان، قدم قدم پر ادب سرائے انٹرنیشل اور ڈاکٹر شہناز مزمل کی سرپرستی اور رہنمائی پر مشکور اور ممنون ہے۔ وقارِ پاکستان کی طرف سے ادب سرائے انٹرنیشنل اور ادارے کی چیئر پرسن ڈاکٹر شہناز مزمل کے لیے ڈھیروں دعائیں اور نیک خواہشات، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید کامیابیاں اور کامرانیاں سمیٹنے کی توفیق دے اور ہم ان کی علمی و ادبی خدمات سے فیض یاب ہوتے رہیں، آمین۔

میاں وقارالاسلام

فاؤنڈنگ ممبر وقارِ پاکستان

پرنسپل کنسلٹینٹ، ماروِل سسٹم

ڈئیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ آف کمپنیز

غذااور غذایت

تحریر: میاں وقارالاسلام

اچھی غذانہ صرف انسان کو بیمار نہیں ہونے دیتی بلکہ اس کے دفاعی نظام کو بھی بہتر بناتی ہے جس سے اس کے بیمار ہونے کی شرع کم ہو جاتی ہے۔اور اگر انسان بیمار ہو جائے تو بھی اچھی غذااسے صحت یاب کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔دوسری طرف آج کل کی وہ غذائیں ہیں جن میں غذائیت نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ انسان کے بار بار بیمار ہونے کی شرع بھی بڑھ جاتی ہے اور اس بات کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے کہ انسان کینسر، شوگر، ہارٹ، جگر اور گردوں کی خرابی جیسی مختلف بیماریوں کا شکار نہ ہو جائے۔اگر بچپن سے ہی غذاوں کا استعمال صحیح طریقے سے کیا جائے تو انسان کی نشو نما کافی حد تک بہت ہو سکتی ہے اور وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ ایک بھرپور صحت مند زندگی گزار سکے۔پھر ہم نے ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے جو سلوک اعلیٰ ترین نعمتوں کے ساتھ کیا ہے وہ بھی ایک خوفناک کھیل ہے۔اگر ہم پانی کے نام پر فصلوں کو زہر دیں گے تو وہ کیسے اس بات کی ضامن ہو سکتیں ہیں کہ ہمیں ایک صحت مند زندگی فراہم کریں۔اور اگر ہم صحت کے نام سے زہر آلودہ غذائیں کھائیں گے تو وہ اس بات کی ضامن کیسے ہیں کہ ہمیں صحت سے بھرپور زندگی فراہم کر سکیں۔ایک انگریز ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہم بیمار نہیں ہیں ہم پیاسے ہیں ہمیں ادویات نہیں چاہیءں ہمیں صاف پانی چاہیے۔صاف پانی نہ ملنے کی وجہ سے ایک تو ہماری نشو نما بہتر نہیں ہوتی اور دوسرا ہم بہت سی بیماریوں کا بھی شکار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان محمود اپنے کام میں نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ اپنے کام کا وسیع تجربہ بھی رکھتے ہیں۔وہ اپنے شعبے کے مختلف پہلوں پر نہ صرف ٹیکنیل خدمات ادا کر رہے ہیں بلکہ مختلف ریڈیو اور ٹی وی پروگرامز میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔اسی طرح ان کے بہت سے مضامین بھی مقامی اور بینلاقوامی اخبارات اور مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔اپنی زندگی کے اسی نچوڑ اور کل حاصل کو انہوں نے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔میں نے چند پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ان کے کام کی اہمیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ اس طرح کی سینکڑوں اہم معلومات آپ کو اس کتاب میں ملیں گی۔مجھے یقین ہے کہ ان کی کتاب بہت سے لوگوں کے لیے رہنما دوست کا کردار ادا کرے گی۔صحت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے اپنی صحت کا خیال رکھیں اور اپنے عزیز واقارب کا بھی خیال رکھیں۔صحت دوست علم کو شئیر کریں تاکہ ہمارے ارد گرد ایک صحت مند معاشرہ قائم ہو سکے جس کی ہمیں ایمرجنسی بنیادوں پر ضرورت ہے۔مزید تفصیل کے لیے آپ کو کتاب پڑھنا ہو گی۔

دعا گو، میاں وقارالاسلام، پرنسپل کنسلٹینٹ

(ماروِل سسٹم)

خوابوں میں لپٹی کہانیاں

مصنفہ : محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ

تصنیف : خوابوں میں لپٹی کہانیاں

تحریر : میاں وقار الاسلام

محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ کو جاننے والے بہت، ماننے والے لاتعداد، پڑھنے والے اَن گنت اور اِن پر لکھنے والے بھی بہت، اِن کی باصلاحیت اور ملٹی ٹیلنٹڈ شخصیت کی وسعت اتنی ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لکھا جارہا ہے اور مزید لکھا جاسکتا ہے، خواہ شاعری ہو، کالم کاری ہو، افسانہ نگاری ہو، فکشن رائٹنگ ہو، اِن کے مختلف ٹیلی ویژن پروگرامز ہوں، اِن کی پروفیشنل، پرسنل، سوشل یا لٹریری پروفائیلز ہوں۔ اِن کی شخصیت کا مکمل جائزہ لینا ہے تو پھر اِن کے تمام پہلوؤں پر بات کرنا بھی ضروری ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ جب کسی کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، تو ہم خوب مزے لے کر پڑھتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں، لوگوں سے بڑھ بڑھ کر شئیر بھی کرتے ہیں، ہمارا خون ڈبل ہو جاتا ہے، جانے ہماری ذات کون سی تسکین پاتی ہے کہ ہماری روح تک سکون میں آ جاتی ہے، دراصل ہم اپنی شیطانی ہوس کو پورا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے اور محنت کرنے والوں کے حوصلوں کی دھجیاں اُڑاتے چلے ہیں اور اِس پر خوش بھی ہوتے ہیں۔ یقین کریں میری تحریر آپ کو اس طرح کا کوئی بھی مزہ نہیں دینے والی۔

تو پھر محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ پر بات کرتے ہیں، ایک بہترین شاعرہ پر بات کرتے ہیں، باصلاحیت مصنفہ اور کالم کار پر بات کرتے ہیں، افسانہ نگار اور فکشن رائیٹر پر بات کرتے ہیں، پاکستان کی بہادر بیٹی پر بات کرتے ہیں، مثالی بہن پر بات کرتے ہیں، وفادار بیوی پر بات کرتے ہیں، ذمہ دار ماں پر بات کرتے ہیں، کمیٹڈ سوشل ایکٹویسٹ پر بات کرتے ہیں، پروفیشنل کنسلٹینٹ پر بات کرتے ہیں، ملٹی ڈسیپلنری پروگرامز ہوسٹ پر بات کرتے ہیں، اِن کی ہمت اور ان کے حوصلے پر بات کرتے ہیں، اِن کی کاوشوں اور اَن تھک محنت پر بات کرتے ہیں۔

اُن سالوں پر بات کرتے ہیں جو اِنہوں نے ادب کے نام پر وقف کر دیئے، اَن گنت راتوں پر بات کرتے ہیں جو اِنہوں نے جاگ کر گزار دیں تاکہ لوگوں کو گہری نیند سے جگایا جاسکے۔ اُن مشکلوں پر بات کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے ادبی سفر میں بار بار کاٹیں، اُن رکاوٹوں پر بات کرتے ہیں جنہیں وہ کاٹتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ اُن کامیابیوں پر بات کرتے ہیں جو اِنہوں نے تواتر کے ساتھ حاصل کیں، اُن خوابوں پر بات کرتے ہیں جن کی تعبیر وہ اپنے ہاتھوں میں لئے پھرتی ہیں۔

محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ دورِ حاضر کی ایک ایسی مصنفہ ہیں جو لمحوں کو قید کر لیتی ہیں، لفظوں میں جان بھر دیتی ہیں، اِن کی کتابیں خود بولتی ہیں اور جب وہ خود بولتی ہیں تو سحر طاری کر دیتی ہیں۔ وقت اِن کی تحریر میں ٹھہر جاتا ہے اور موسم بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب شاعری کرتی ہیں تو وہ گانے لگتی ہے، جب کالم لکھتی ہیں تو وہ حالات کی بے بسی چیخنے اور پکارنے لگتے ہیں۔ درد کی آواز بن جاتی ہیں، کھلے دل کی ہیں، صاف لکھتی ہیں، نڈر ہیں، بے خوف لکھتی ہیں، قلم سے خوشبو بکھیرنے کا فن بھی اِنہیں آتا ہے، محبتیں بانٹی ہیں، تکلیفیں چنتی ہیں، قلم کو تلوار کی طرح چلانے کی بھی ماہر ہیں، ظلم پہ لکھتی ہیں، ظالم کو للکارتی ہیں، پڑھنے والوں کی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتی ہیں، بہرے کانوں تک اپنی آواز پہنچاتی ہیں، سلے ہوئے لبوں کی آزاد کرتی ہیں، جھوٹ کے بُت توڑ دیتی ہیں، اِن کی سچائی اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے، اِن کی حساسیت محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔

محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ کا تعلق پاکستان کے ایک خوبصورت، تاریخی و صنعتی شہر فیصل آباد سے ہے، وہ پنجابی سپیکنگ قریشی فیملی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم فیصل آباد کے مقامی سکول سے حاصل کی، فیملی بنیادی طور پر ایجوکیشن سے منسلک تھی، والد اور والدہ دونوں ذاتی تعلیمی اداروں سے منسلک تھے۔ روبینہ فیصل کو بچپن سے ہی اپنے گھر میں بھرپور تعلیمی ماحول ملا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور کا رُخ کیا، ہیلے کالج سے کامرس میں گریجوایشن کی، ایف سی کالج سے ایم اے انگلش کی ڈگری مکمل کی، ساتھ ہی پنجاب بنک آف پاکستان سے اپنی پروفیشنل لائف کا آغاز بھی کیا۔

شاعری، کالم کاری اور افسانہ نگاری کا شوق کالج کے زمانے سے ساتھ ساتھ رہا، کالج اور یونیورسٹی لیول پر اپنی ادبی صلاحیتوں کو منواتی آ رہی تھیں۔ پروفیشنل لائف کے ساتھ اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز بھی کر دیا۔ ایک اور زندگی کا آغاز ابھی باقی تھا وہ بھی ان کی محترم فیصل محمود صاحب سے شادی کے ساتھ ہی شروع ہو گیا، محترم فیصل محمود صاحب کا تعلق بھی فنانشل سیکٹر سے تھا اور وہ گذشتہ دو دہایوں سے فنانس کے شعبہ سے بطور سی پی اے منسلک تھے۔ خدا نے محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ اور محترم فیصل محمود صاحب کی زندگی میں دو نئے پھولوں کا اضافہ بھی کر دیا، پہلے ہادی اور پھر علینہ، جنہوں نے میاں بیوی کے گلشن کو مکمل کر دیا۔ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے کینیڈا کے صوبے آنٹیریو کے مرکزی شہر میسی ساگا میں شفٹ ہو گئے۔

کینیڈا سے محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، پروفیشنل لائف کا آغاز بطور پروفیشنل کنسلٹینٹ ہوا، اور لٹریری دور کا آغاز ہفتہ اور ماہانہ وار نیوز پیپرز، میگزینز اور بہت سے ویب پورٹلز سے ہوا۔ محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ کا ایک نیا روپ سوشل ایکٹیوسٹ کے طور پر بھی سامنے آیا، جس میں وہ کینیڈا میں مقیم پاکستانیوں اور نئے آنے والے ہم وطنوں کے بہت سے مسائل پر کام کرتی نظر آتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے وقار اور تشخص پر بھی کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

دہشت گردی کی لہر کی وجہ سے پاکستان پر بہت سے اعتراضات کئے جارہے تھے، بیرونِ ملک بین القوامی سطح پر پاکستان کے حق میں آواز اُٹھانا یقیناایک غیر معمولی امر تھا۔جذبہء حب الوطنی کیا ہوتا ہے، اس کا مظاہرہ روبینہ فیصل نے عملی طور پر کرکے دیکھادیا۔

ان کی نیک نیتی، جذبہء حب الوطنی، ان تھک محنت اور لگن کی وجہ سے ہی خدانے کامیابیوں کاایک سلسلہ ان کے ساتھ ہمسفر کر دیا۔ محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ نے درجنوں موضوعات پر لکھا، ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ سینکڑوں پیپرز کی زینت بنے، لاکھوں لوگوں کی نظر سے گزرے، ہزاروں زندگیوں کے لیے مشل راہ بنے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

بے مثال ہنر کو کب تک چھُپایا جاسکتاہے، محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ باقاعدہ طور پر میڈیا پروگرامز میں نظر آنے لگیں، راول ٹی وی کینیڈا پر "دستک" کے نام سے ان کا باقاعدہ ہفتہ وار پروگرام نشر ہوتا ہے۔

وی ٹی وی آج وہ درجنوں لوگوں کے ساتھ سیکڑوں پروگرامز کر چکی ہیں، جن موضوعات پر وہ لکھتی چلی آرہی تھیں انہیں موضوعات پر آج کل وہ تواتر کے ساتھ اپنے پروگرامز ٹیلی کاسٹ کر رہی ہیں۔ جیسے انہوں نے لاکھوں پڑھنے والوں کے دلوں کو جیتا، ویسے ہی اب وہ لاکھوں دیکھنے والوں کی آنکھوں کا محور ہیں۔

محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ کس حد تک سیلف آگنائیزڈ ہیں اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے اپنی کوئی بھی تحریر ضائع نہیں ہونے دی بلکہ امانت کے طور پر اپنی کتابوں میں محفوظ کر دی ہے، سال 2011 میں "روٹی کھاتی مورتیاں" کے نام سے ان کی پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی جس میں انہوں نے اپنے تمام دلچسپ کالمز کا مجموعہ عوام کی نظر میں پیش کیا۔ ان کی دوسری کتاب "خوابوں میں لپٹی کہانیاں" کے نام سے حال ہی میں منظرِ عام پر آچکی ہے جس کی رونمائی کی تقریبات اپنے اختتامی مراحل میں ہیں۔خوابوں میں لپٹی کہانیاں، شارٹ سٹوریز پر مبنی ایک منفرد کتاب ہے، جس کی انفرادیت کا اندازہ اسے پڑھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔

میں نے محترمہ روبینہ فیصل صاحبہ پر ایک چھوٹی سی تمہید باندھنے کی کوشش کی ہے، ان کے مکمل تعارف کے لئے شاید ایک کتاب بھی کم پڑ جائے، مگر دیکھنے والی آنکھ کے لئے اتنی منظر کشی بھی بہت ہے۔ لکھنا پڑھنا ہم پر فرض ہے اور علم ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ایمان بذاتِ خود ایک علم ہے۔ اور اسی علم پر دنیا قائم ہے۔ اللہ فرماتا ہے ہے کہ ہر چیز چاہتے ہوئے یا نا چاہتے ہوئے تمہارے رب کی بندگی کر رہی ہے۔ یہ خدا کا علم ہے اور جو بھی اُس کے علم طرف لپکتا ہے اس کے اندر ایک مقناطیسیت پیدا ہو جاتی ہے اور لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ ہم دو جہاں

کے علم رکھنے والے کو مانتے ہیں، اور جو اُس کے علم سے سیکھتے ہیں ان کی قدر بھی ہم پہ واجب ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے علم میں اتنا اضافہ ضرور کرے کہ ہم اپنی آخرت سنوار سکیں۔

میاں وقار الاسلام

پروفیشنل آیوارڈ: نیازی گروپ آف کمپنیز، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2016

انٹر نیشنل مارکیٹنگ مینیجر

ال دوسرا انٹر نیشنل کمپنی لمٹیڈ

موبائل: 0563862924

ای میل: mianwaqarpk@yahoo.com

ویب سائٹ: www.waqarpk.com

وہ عشق ہی کیا جو قلندر نہ کر دے

تصنیف : عشق قلندر کر دیتا ہے

شاعر : جناب سلمان جاذب صاحب

تحریر : میاں وقار الاسلام

عشق قلندر کر دیتا ہے" جناب سلمان جاذب صاحب کی یہ خوبصورت تخلیق ان کے جذبات کی عکاس ہے، وہ خوبصورت جذبات جو وہ اپنے " چاہنے والوں کے بارے میں رکھتے ہیں، اور وہ خوبصورت جذبات جو وہ اپنے پیدا کرنے والے کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو انہیں خوبصورت جذبات کی جنت میں رکھنا چاہتے ہیں جن کی طرف وہ اشارہ کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کوئی بچھڑ کر لوٹ آیا ہے

زمانے بھر کے افسانے بھی اپنے ساتھ لایا ہے

موضوع کی گہرائی میں جانے سے پہلے جناب سلمان جاذب صاحب کا مختصر تعارف شامل کر لیتے ہیں۔ تاکہ موضوعِ بحث شخصیت کا تعارف بھی کھل کر سامنے آ جائے۔ جناب سلمان جاذب صاحب آج کل عرب امارات میں مقیم ہیں جب کہ ان کا تعلق پاکستان سے ہے اور ان کا ابائی شہر سرگودہ ہے۔ شعبہ صحافت سے منسلک ہیں، اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ بطور بانی و صدر مُسفرہ انٹرنیشنل (ادبی و ثقافتی تنظیم)، ایونٹ سیکرٹری پاکستان جرنلسٹ فورم یو اے ای (صحافتی تنظیم)، میڈیا سیکرٹری گلف اردو کونسل (آدبی تنظیم) اپنی گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پاکستان ایسیوسی ایشن دبئی اور پاکستان سوشل سینٹر شارجہ کے باقاعدہ ممبر ہیں۔ علاوہ ازیں بطور ایڈیٹر ہفت روزہ اردو اخبار یو اے ای اور مدیرِ اعلیٰ آن لائن اردو ڈاٹ کام ادبی سائٹ، سی ای او مرچ مسالہ انٹرٹینمنٹ ای ٹی وی اینڈ فیشن میگزین کے بھی اپنی خدمات سرانجام دیتے چلے آ رہے ہیں۔

[www.onlineurdu.com] & [www.mirchmasala.tv]

ان کی پانچ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں تیری خوشبو (شاعری)، سورج ڈوبا نہیں کرتے (فن و شخصیت)، قتلِ گل (تحقیق)، عشق قلندر کر دیتا ہے (شاعری) اور تتلی دل پر اُترے گی (نظمیں) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب جو کہ زیرِ طبع ہے، اس کا نام ہے،

"Glittering Journey"

جناب سلمان جاذب صاحب کو پچاس سے زیادہ قومی اور بین القوامی اعزازات سے نواز جا چکا ہے جن میں سرٹیفکیٹس، گولڈ میڈز اور شیلڈز وغیرہ شامل ہیں، اہم اعزازات میں شارجہ بک اتھارٹی، گلوبل ویلیج دبئی، ایمبیسی آف پاکستان یو اے ای، ایمبیسی آف پاکستان اومان اور چیمبر آف کامرس اسلام آباد سے ملنے والے اعزازات شامل ہیں۔اس کے علاوہ جناب سلمان جاذب صاحب کی وسیع تر ادبی خدمات بہت کچھ شامل ہے جیسے کہ، ٹی وی اور فلم انڈسٹری کے روشن ستاروں کے انٹرویوز، معروف ادبی شخصیات کے ساتھ پروگرامز، اور کاروباری اور سماجی سرکل کی اہم شخصیات کے ساتھ سیشنز اور انٹرویوز۔ان کی خدمات کو ملک اور بین القوامی سطح پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔تعارف میں ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے ان کا یہ مختصر تعارف یہاں شامل کیا گیا ہے۔

فطری محبت انسان کی پہچان ہے، انسان کے وجود سے اگر محبت نکال دی جائے تو انسانیت بھی نکل جاتی ہے، اور جب انسانیت کی بات آتی ہے تو محبت اس کا لازمی جذو سمجھی جاتی ہے۔ کسی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا، کسی کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھنا، اور دوسرے کی خوشی میں خوش ہونا یہی انسانیت ہے۔

اس ہنسنے ہنسانے سے نہیں جائے گا کچھ بھی

اس میں تو نہیں کوئی بھی نقصان میری جان

حیوانیت ایسا لفظ ہے جسے انسانیت کے متضاد لفظ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، کسی سے نفرت کرنا، کسی کو تکلیف میں دیکھ کر خوش ہونا، کسی کو خوش دیکھ کر حسد کرنا یہ ساری باتیں انسانیت کے خلاف ہیں اور حیوانیت کے دائرے میں آتی ہیں۔

رہتے ہیں وہ مرجھائے ہوئے موسمِ گل میں

جو لوگ کبھی ہنستے ہنساتے نہیں جاناں

فطری طور پر انسان محبت کا پیکر ہے، مگر انسان پر حیوانیت کا رنگ بھی چڑھتا ہے جب وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک انسان ہے اور مادہ پرستی اس کے دل میں گھر کرنے لگتی ہے، خود غرضی اس کی حیوانیت کو بڑھاتی رہتی ہے اور پھر اسے دوسرے کی خوشی میں غم محسوس ہوتا ہے اور دوسرے کے غم میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔

گرچہ لگتا ہے کم بدلتی ہے
زندگی دم بہ دم بدلتی ہے

انا پرستی اور اپنے آپ سے اندھی محبت انسان کو یہ بھی بھلا دیتی ہے کہ کبھی وہ ایک انسان تھا۔ اور اگر انسان اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہی چلا جائے تو پھر ایک دن ایسا بھی آ جاتا ہے کہ ایسے جانوروں سے بھی گئی گزری مخلوق سمجھا جاتا ہے۔

آئینے کو بنانے والا بھی
آئینہ دیکھتے ہی ڈر گیا ہوگا

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے، گویا گدھے ہیں بدک جاتے ہیں یا پھر یہ بھی کہ گویا کتے ہیں کہ زبان نکالے رکھتے ہیں، اب تم انہیں کچھ دے دو تو بھی زبان نکالے رکھیں اور کچھ نہ بھی دو تو بھی زبان نکالے رکھیں۔ ایسے ہی لوگ فرعون بنتے ہیں اور شیاطین کی پیروی کرتے ہیں اور پھر نشانِ عبرت بنا کر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

عکس مسمار کرتا جاتا ہوں
روز اک آئینہ بناتا جاتا ہوں

وہ محبت ہی کیا جو بے لوث نہ ہو، وہ محبت ہی کیا جو کسی کی خوشی میں خوش نہ ہو، اور وہ محبت ہی کیا جو کسی کے غم میں غمگیں نہ ہو۔ اور کبھی ایسا ہونے لگے تو پھر وہ محبت نہیں رہتی وہ ایک خود غرض جذبے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یوں تو گھوما ہوں ایک دنیا میں
اپنی جانب نہیں چلا اب تک

محبت ایک فطری عمل ہے، ہر انسان اپنے ماں اور باپ سے محبت کرتا ہے اور ساتھ ہی ہر شخص اپنی ذات کا نفع نقصان اور عزت نفس بھی دیکھتا ہے۔ اسی لیے انسان کو جب محبت ملتی ہے تو وہ فطری طور پر محبت کرتا ہے اور جب نفرت ملتی ہے تو فطری طور پر نفرت بھی کر بیٹھتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے خود پر قابو پانے کی تلقین کرتا ہے۔

ترے الفاظ تیرے ہیں تو ہوں گے

ترا لہجہ ترا لہجہ نہیں ہے

ہم سب اپنے ماں باپ سے فطری محبت کرتے ہیں، مگر جب ہم قران پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات ہماری نظر سے گزرتے ہیں تو یہ محبت صرف فطری محبت نہیں رہتی بلکہ یہ احکامِ الہیٰ کی پابند ہو جاتی ہے۔

فطری محبت میں ہم سے غلطی اور کوتاہی ہو سکتی ہے، یعنی اگر کبھی ماں باپ ہم پر سختی کریں تو شاید ہم بھی اگے سے فطری عمل دے بیٹھیں جو کہ اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر جب ہم احکاماتِ الٰہی کے پابند ہوتے ہیں تو ہم کسی صورت میں بھی اُف تک نہیں کرتے کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کی نافرمانی سے رب ناراض ہو سکتا ہے۔

یقیناً خوشنما ہے دیکھنے میں

تمہارا شہر گھر جیسا نہیں ہے

اس لیے نہ ہم صرف ماں باپ کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ یہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے کسی عمل سے رب ناراض نہ ہو جائے۔

نظروں سے کسی کو بھی گراتے نہیں جاناں

ہر بات رقیبوں کو بتاتے نہیں جاناں

محبت کی انتہائی کیفیت عشق کی طرف لے جاتی ہے، اور باعمل عاشق اپنے آپ کو قلندر کر لیتا ہے۔ یعنی ایک کامل عاشق اپنی ذات کی خود غرضیوں سے پاک ہوتا ہے، اس کی ذاتی خواہش اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس ذات کے لیے ہوتی ہے جس سے وہ اپنے آپ کو منسوب کر لیتا ہے۔ یعنی کامل عاشق کی مکمل خوشی اسی ذات کی خوشی سے منسوب ہوتی ہے جس سے وہ عشق کرتا ہے۔ اور اگر اس کی ذاتی خواہشات اس پر حاوی ہونے لگیں تو پھر وہ قلندر نہیں رہتا۔

اسے تم مٹانے کی کوشش نہ کرنا

جو لکھا ہے دل پر وہ نام آخری ہے

جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں تو یہ بھی ایک عہد ہے ایک وعدہ ہے اپنے رب سے کہ ہم اسی پر ایمان لائیں گے اور اس کے حکم کے خلاف نہیں کریں گے۔ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت ایسے کریں گے جیسے اس کی اطاعت کرنے کا حق ہے۔ اسی طرح ایک کامل مسلمان تب تک کامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کا عشق اس کی ذات کی تمام خود غرضیوں سے پاک نہ ہو۔

مجھے عشق کرتے ہوئے لگ رہا ہے

مری زندگی کا یہ کام آخری ہے

جو شخص احسان کرنے والوں کے احسانات کو یاد رکھتا ہے، وہ ہمیشہ ثابت قدم رہتا ہے، چاہے وہ احسانات اس کے ماں باپ کے ہوں، اس کے بہن بھائیوں کے ہوں اس کے دوست احباب کے ہوں یا پھر سب سے بڑھ کر اس کے پیدا کرنے والے کے احسانات ہوں۔ جو انسان اپنے رب کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو یاد رکھتا ہے وہ کبھی نافرمان ہو ہی نہیں سکتا، نافرمانی تو ہوتی ہی تبھی ہے جب انسان خود غرض ہو جائے اور صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچے۔

چاند سے یاری اپنی

اور تارے ہمسائے ہیں

کامل عشق بھی ایک ایسی چیز ہے، ایک ایسا جذبہ ہے، ایک ایسا مقام ہے جب انسان اپنے بارے میں سوچنے سے زیادہ اس بات پر غور کرتا ہے کہ جس سے وہ عشق کرتا ہے وہ ذات اس کے عمل سے خوش ہو گی یا پھر ناراض۔ عاشق جب اپنے دل اپنی تمام خود غرضیوں سے پاک کر لیتا ہے تو پھر اس کی ایک ہی غرض باقی رہ جاتی ہے کہ جس سے وہ عشق کرتا ہے اسے کس طرح راضی کرے۔

جاذب توڑا آئینہ

عکس کو چکنا چور کیا

محبت میں بے وفائی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی عشق میں نافرمانی ہو سکتی ہے، در حقیقت ہم محبت اور عشق کا اقرار تو بے دھڑک کر دیتے ہیں مگر محبت اور عشق کے جذبات کو سمجھنا، اور اپنے آپ کو ان پاک جذبات کے لیے تیار کرنا یہ ایک بہت بڑا مقام ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔

ہمیں ڈر نا نہیں آتا جاذبؔ

ہمیں پھر بھی ڈرایا جا رہا ہے

عشق کرنے والا تو اپنی جان تک قربان کر جاتا ہے اور جھوٹے اقرار کرنے والا تو اپنی خواہشوں پر بھی قابو نہیں پا سکتا اور تھوڑی سی آزمائش اس کی جھوٹی محبت اور اس کے جھوٹے عشق کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

جب بھی اُس کی مثال دیتی ہو

جان میری نکال دیتی ہو

پہلے سنتی ہو غور سے باتیں

پھر سلیقے سے ٹال دیتی ہو

کندن بننے کے لیے وجود انتہائی حرارت پر پگھلائے جاتے ہیں۔ عشق اور محبت کے مقام صرف زبان ہلانے سے نہیں ملتے۔ جو اپنے نفس پر قابو رکھتے ہیں، اور جو اپنے خواہشوں کے غلام نہیں ہوتے صرف انہیں ہی محبت کی پہچان ہو سکتی ہے اور صرف وہی عشق کے اعلیٰ مقامات تک پہنچ پاتے ہیں۔

کوئی ملتا نہیں گریبان چاک

اس کا مطلب ہے قیس مر گیا ہے

ڈھیروں دعاؤں اور بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ ان کی کامیابیوں کا منتظر۔

میاں وقار الاسلام، شاعر، ادیب، کالم نگار، مرتب، کارپوریٹ ٹرینر، بزنس کنسلٹنٹ

پرنسپل کنسلٹینٹ، ماروِل سسٹم، ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ

فاونڈر، وقار پاکستان، ایڈوائزر ادب سرائے انٹرنیشنل

نیلمیت کا جہاں

تصنیف : نیلی آنچ

شاعرہ : محترمہ نیلم ملک

تحریر : میاں وقار الاسلام

نیلمیت کی کھوج " سے ایک دلچسپ آغاز " یہ " نیلی آنچ " ہے یا " نیلم پری " ہے، اسے مزید کھوجتے ہیں۔ بات کا آغاز شاعرہ کے ایک شعر سے " کرتے ہیں، جس میں وہ اپنا تعارف نیلی آنچ اور نیلم پری کے نام سے کرواتی ہیں۔

یہ نیلی آنچ یا نیلم پری ہے

ہَوا کی تان پر جو جھومتی ہے

ان کے ہاں نیلمیت کا جو تصور پایا جاتا ہے اسے ان کی لفاظی سے محسوس کیا جا سکتا ہے، ایک باہر کی دنیا ہے جو ہمارے مشاہدے میں ہے اور ایک ہمارے اندر نیلمیت کا جہاں ہے جسے وہ اپنے مشاہدے میں لانا چاہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ان شعروں سے ان کی اندرونی کیفیت جو کہ نیلی آنچ پر بیٹھی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میرے جیسا شعر کہنے کے لئے

میرے جیسی بے کسی ہے لازمی

ایک سائل کو ضرورت ہے مرے دل کی مگر

ہائے گھر والے سخاوت نہیں کرنے دیتے

ہم مقابل نہ آ سکے خود کے

تیرے پیچھے چھپا لیا خود کو

شاعرہ اپنے اندر چھپے نیلمیت کے جہاں اور باہر کی وسعتوں کو سمجھتی ہیں، کبھی کبھی وہ اپنے اندر ڈوبتی چلی جاتی ہیں اور نیلمیت ان کے لہو میں دوڑنے لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو کیسے دیکھتی ہیں، سنیئے

مرا کمرا مثالِ دشتِ وحشت
جہاں رَم خُوردہ ہرنی کھو گئی ہے

جب بھی سخن بساط بچھے
ہر شاطر کو مات کرو

لوگ اس کا خود پہاڑ بنا کر دکھائیں گے
لوگوں میں بیٹھ کر ذرا رائی پہ بات کر

اور پھر کبھی کبھی ان کی سوچ کائنات کی وسعتوں میں پرواز کرتے کرتے کھو جاتی ہے۔ ان کی سوچ نیلمیت کے سمندر سے اٹھتی ہے تو نیلے آسمانوں میں کھو جاتی ہے۔ ان کی سوچ کی پرواز کا ایک خوبصورت انداز دیکھیے۔

اُڑتا پھرتا ہے پنچھی کینوس پر
مصوّر کی عجب صورت گَری ہے

سوچ کی ڈور سلجھی بھی کیا
اس کا اگلا سِرا ہی نہیں

باہر سے جب کھولتے ہیں تو کھلتا ہے بس دروازہ
اندر سے کھل جائے اگر تو سارا گھر کھل جاتا ہے

وسعت ہو یا پھر گہرائی دونوں ہی ہمیشہ سے انسان کی کمزوری رہی ہیں۔ وسعت آسمانوں کی بھی ہو سکتی ہے اور جذبات کی بھی، گہرائی سمندر کی بھی ہو سکتی ہے اور دل کی بھی۔ دکھ بھی گہرے ہوتے ہیں اور احساسات بھی، انسان گہری سوچ میں ڈوبتا بھی ہے اور سوچ وسیع بھی ہوتی ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات کو وہ کس طرح بیان کرتی ہیں، ان کا انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کبھی کبھی تو ہند سے ہانپنے لگتے تھے
ایسے سانسیں گن گن عمر گزاری ہے

مجھ پہ سایا نہ ڈالیے اپنا
مجھ کو رہنا ہے سائباں سے پرے

یہ اللہ تعالی کی ہی بادشاہی جس میں انسان جتنا سوچتا چلا جاتا ہے اس جہان کی وسعتیں اور گہرائیاں مزید بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ دن گزرتے گئے سال گزرتے گئے صدیاں گزرتی گئیں زمانے گزرتے گئے ہزاروں نسل آباد ہوئیں پھر برباد بھی ہوئیں اور ان کی جگہ نئی نسلیں بھی لیتی ہی چلیں گئیں۔ اور یوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ دن رات کے آگے پیچھے آنے جانے میں اللہ کی نشانیاں ہیں شاعرہ قدرت کی ان نشانیوں کو کیسے دیکھتی ہیں۔

جہاں پر دھوپ "دن" لکھ کر گئی تھی
وہاں اب رات نے کالک ملی ہے

سوکھے جھیل تو ایک مکان بنانا ہے
پربت ہٹے تو اک دروازہ کھولوں میں

چشمِ تر لے کے اگر گھر سے نکل جاؤں میں

سب بدل جائے جو منظر سے نکل جاؤں میں

بہت بڑے بڑے عالم فاضل لوگ جنہوں نے اپنے علم سے جانے کیا کیا ایجاد کیا اور جانے کیا کیا تحقیق کر ڈالا اور پھر تحقیق کرتے کرتے ان کی کہانی بھی مٹ گئی، نہ ان کا اپنا وجود رہا، نہ ان کا نام رہا اور نہ ہی ذکر کرنے والوں میں ان کے ذکر باقی رہے، یہاں تک کہ ان کے زمانے بھی کہیں دفنا دیئے گئے۔ یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کا تسلسل ہے، اسی تسلسل کو انہوں نے کچھ اس طرح قلم بند کیا ہے۔

گزارا اِس پہ بھی کر تو رہے ہیں

مگر تو ہی بتا یہ زندگی ہے

تیری کھیتی پہ میرا گزارا نہیں, بھوک مٹتی نہیں

جی میں آتا ہے اب بیچ کھاؤں تجھے مختصر زندگی

صرف وہ باقی رہا جسے اللہ نے چاہا کہ باقی رہے اور نشان بھی باقی رکھے تو عبرت کے نشان اور اپنی حکمت کی علامتیں۔ جسے مٹانا چاہا مٹا دیا اور جسے ٹھہرانا چاہا ٹھہرا دیا اور اور بات کو بدل کر نئی بات لانی چاہی تو وہ بھی کیا، دنوں کے آگے پیچھے آنے جانے میں فکر کرنے والوں کے لیئے نشانیوں پر نشانیاں رکھ دی گئیں تاکہ انسان سوچے اور سمجھے تاکہ ہدایت حاصل کرے۔ ذرا دیکھیں کہ قدرت کی ان نشانیوں کو انہیں نے کس طرح سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

طلب میں قطرہء نیساں کی 'بے دَم

سرِ ساحل کوئی سیپی پڑی ہے

والعصر زمانہ مرے مطلب کا نہیں ہے

یہ آئینہ خانہ مرے مطلب کا نہیں ہے

آج کا انسان جب کل کے انسان کو کھوجتا ہے تو اسے ایک سے ایک چیز اس کے مشاہدے میں آتی ہے اور اسے حیران کیئے جاتی ہے۔ جو علم حاصل کر کے کھو دیا گیا صرف اسی کو سمیٹنا ممکن نہیں۔ انہوں نے سخن کی وادی میں میسر پھولوں سے کس طرح سے خوشبو سمیٹی ہے اور اپنے شعروں کو کس طرح سے مہکایا ہے، وہ ان کی غزل کاری ٹھیک ٹھیک بیان کر رہی ہے۔

میسّر ہے سخُن دانوں کی صُحبت
تبھی اچھی غزل کاری ہوئی ہے

ہم تو چلتے رہے رہگزر کی طرح
سنگِ رہ کی طرح زندگی تھم گئی

اور جو علم کے خزانے ابھی تک چھوئے بھی نہیں گئے وہ بھی بے شمار ہیں۔ اللہ کی بادشاہی ہے کہ اس کی بادشاہت کا ذرہ ذرہ اس کی طاقت میں محدود ہے اور یہ بھی اللہ کی بادشاہت ہے کہ اس نے انسان کے مشاہدے کے ہے بہت سی چیزوں کو لامحدود کر دیا تاکہ انسان فکر کرے۔ ان کے ہاں کس طرح کی فکر اور سوچ پائی جاتی ہے ذرا دیکھیے۔

اوّل اوّل خود بنیاد میں ہوتی ہوں
پوری جب تعمیر کروں تُو بنتا ہے

کھل گیا رات کا در، ذات کا باقی ہے ابھی
کچھ سفر اور بھی ظلمات کا باقی ہے

اللہ قران میں فرماتا ہے کہ آسمانوں کی طرف نظر دوڑاو کیا تم اس میں کوئی شگاف دیکھتے ہو، پھر اللہ فرماتا ہے کہ ہر بار تمہاری نظر تھک کر واپس آ جائے گی۔ پھر اللہ فرماتا ہے سیاروں کی منزلوں کی قسم اور یہ سب سے بڑی قسم ہے اگر تم سمجھو انسان کتنا بے بس ہے اس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

اک شکستہ حویلی کی دیوار پر

وقت چلتا رہا اور گھڑی تھم گئی

بہت سی آیات ہیں جو انسان کی نظر میں ایک لامحدود بادشاہت کی عکاس ہیں مزید یہ آیات یہ بھی بتاتی ہیں کہ کس طرح اتنی بڑی کائنات کو اللہ تعالی سنبھالے رکھتے اور طرح ایک ہلکی سے جنبش سے یہ پوری کائنات تباہ ہو سکتی ہے۔ تو ایک توازن ہے ایک اندازہ ہے جس کے مطابق ہر چیز اپنا اپنا کام کر رہی ہے۔ وہ اللہ کے مقرر کیئے ہے اندازوں کو سمجھتی ہیں زندگی اور موت کی کشمکش ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔

عجب سا اک خواب دیکھ کر آنکھ کھل گئی ہے

ہم اپنے مرنے پہ روئے, لیکن مرے نہیں تھے

اللہ اتنی بڑی بادشاہت کا مالک کی جس کی بادشاہی میں ہمارا وجود ریت کے ان گنت چھوٹے چھوٹے ذروں سے بھی چھوٹا ہے اسی ذرے کو اللہ نے یہ شرف بھی بخشا کہ اور اس کائنات کے بہت سے رازوں کو مسخر کر سکتا ہے اور اسی ذرے کو اتنا کمزور بھی بنایا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتا۔ زندگی کتنی مختصر ہے اور کتنی تیزی سے گزر جاتی ہے اس کیفیت کو دیکھیے۔

چار دن کی ہے مہماں مرے پاس تو مجھ سے روٹھا نہ کر

ناز تیرے اٹھاؤں، مناؤں تجھے مختصر زندگی

انسان کی پیدائش بھی ایسے ہی ہے ایک حکم سے انسان کے وجود میں روح پھونک دی جاتی اور پھر جلد دوسرا حکم ہوتا ہے اور جسم سے روح کو الگ کر دیا جاتا ہے اور پھر ایک دن آئے گا جب روحیں اپنے جسموں کو لوٹا دی جائیں گی۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے تو انسان کی حقیقت بس اتنی سی ہے۔ جیسے کہ وہ کہتی ہیں۔

مستقبل تالاب ہے جس کے پانی میں

اندیشوں کے کالے ہنس نہاتے ہیں

انسان کو شرف ہی اسی چیز کا بخشا گیا ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے، غور کر سکتا ہے، فکر کر سکتا ہے، انسانوں کی شکلیں مختلف ہیں، رنگ اور نسل مختلف ہے زبانیں مختلف ہیں، دل مختلف ہیں دماغ مختلف ہیں مزاج اور انداز بھی مختلف ہیں اور یہ سب اس لیئے ہیں کہ انسان سوچے سمجھے۔ قدرت کے یہی پہلوان کی سوچ اور فکر میں نظر آتے ہیں۔

ہے اِس میں طولِ شامِ غم کا قِصّہ

جو یہ بالشت بھر کی ڈائری ہے

جاننے اور پہچاننے کا یہ سفر روز اول سے جاری ہے انسان نے بہت کچھ جانا ہے مگر پھر بھی بہت ادھورا ہے اسی ادھورے پن کو پورا کرنے کے لیے کوئی تصویروں میں رنگ بھرتا ہے، کوئی کہانیوں میں کرداروں کی تشکیل کرتا ہے کوئی نظموں اور غزلوں میں اپنے احساسات بیان کرتا ہے، کوئی تجزے کرتا ہے کوئی تجربے کرتا ہے، کوئی سمندر کی تہہ میں اترنا چاہتا ہے کوئی آسمانوں کی بلندیوں میں جانا چاہتا ہے۔ عورت ہوتے ہوئے وہ عورتوں کے مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں اسے کھل کر بیان بھی کرتی ہیں جیسے کہ

بغاوت کو جنم لیتے ہی زندہ گاڑ دیں صاحب

یہ لڑکی بول اٹھی اک بار تو ہر بار بولے گی

چپ رہنے میں ہے نادانی بول پڑیں

وقت نے اور ہم نے اب ٹھانی بول پڑیں

دوسری طرف کوئی ستاروں پر کمند ڈالنا چاہتا ہے کوئی بیماریوں کی تشخیص کرتا ہے کوئی بیماریوں کے علاج دریافت کرتا ہے کوئی تیز ترین گاڑیاں اور جہاز بناتا ہے کوئی بلند و بالا عمارتیں بناتا ہے اور کوئی طرح طرح کے پھل اور ترکاری پیدا کرتا ہے جو جانوروں کی نسل بڑھاتا ہے اور یوں اس کی اپنی نسل ختم ہوتی ہے اور اس کا اختیار اگلے منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک نسل کے اختیار کو اگلی نسل میں منتقل ہونے کو وہ کیسے دیکھتی ہیں سنیئے۔

وہاں تھا آج گل کھلنے کا امکاں

جہاں کل رات ہی بجلی گری ہے

پھر نئی نسل اپنا آغاز اپنے انداز سے کرتی ہے، باوجود اس کے کہ پچھلی نسل نے اس کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہوتا ہے مگر نئی نسل جانتی ہے کہ اس کے آگے جہان اور بھی ہیں۔ نئی نسل کو درپیش مسائل کا اظہار وہ کچھ اس طرح کرتی ہیں

یہ کوئی عشق تو نہیں حضور

جاب ہے، مسئلے تو ہوں گے ہی

شاعرہ محترمہ نیلم ملک بھی نئی نسل کی ترجمان ہیں۔ اور قلم کے ذریعے اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے، وہ جانتی ہیں کہ ابھی اس کے آگے جہان اور بھی ہیں۔ اور اسی بات کا اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو کس حد تک جاننے کی خواہش رکھتیں ہیں اور وہ اپنے عزم میں کتنی ثابت قدم نظر آتی ہیں۔

ہو جسے چست اسے مفت, سو لے جا پیارے

میرے پیروں میں تو پوری نہیں آئی دنیا

شاعرہ محترمہ نیلم ملک نے اپنی تخلیق " نیلی آنچ " کے ذریعے " نیلمیت کا جہاں " ڈھونڈنے کا آغاز کیا ہے نیلی آنچ کی شدت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ یہ ایک مضبوط آغاز ہے۔ مجھے امید ہے کہ " نیلمیت کا جہاں " روشنیوں کا ایک جہاں ہے جو ان کا منتظر ہے۔ اور یہ روشنی ان کے قلم سے

ضرور پھیلے گی کیوں کہ وہ لوگوں کے اندر چھپے ہوئے خوف کو سمجھتی ہیں اور اپنے قلم کے ذریعے لوگوں میں ان کے اس ڈر کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔

اپنے اندر کے کسی خوف میں جکڑے ہوئے لوگ

دوسروں کو بھی بغاوت نہیں کرنے دیتے

انہیں وقت کے صحراؤں سے اٹھتی ریت کی تپیش کا بھی اندازہ ہے اور وہ پھولوں کی نزاکت کو بھی سمجھتی ہیں۔

صحراؤں کی ریت سی تپتی پوریں اس صحرائی کی

اس کے چھو جانے سے نازک پھول کا زرد کھل جاتا ہے

کہنے کو ابھی بہت کچھ ہے، لکھنے کو ابھی بہت کچھ ہے، یہاں ہر چیز لا محدود ہے مگر وہیں انسان کی بہت سی حدیں ہیں انسان جتنی بھی رکاوٹیں عبور کرتا جائے جتنی بھی حدوں سے نکل جائے رہتا اسی دائرے میں جو دائرہ جو دائرہ اس کے رب نے اس کے لیئے مقرر کر دیا ہے۔

اب سی دائرے میں کون کتنی محنت کرتا ہے کس طرح سے اپنے آپ کو منواتا ہے اور کس طرح سے جو شرف اللہ تعالی نے اسے عطا کیئے ہیں ان کا استعمال کرتا ہے اور کس قدر اپنے لیئے اپنے ارد گرد کے لوگوں کے لیئے راہیں ہموار کرتا ہے قدرت نے اس بات کی قدرت ہر انسان کو دی ہے۔ان کی محنت اور لگن یہی بتاتی ہے کہ جو صلاحیتیں قدرت نے انہیں عطا کی ہیں وہ ان کا بھرپور استعمال کریں گی

فصیلِ اُفق سے پرے جائیں گے ہم

ہمیں روکنا مت، ارے جائیں گے ہم

محترمہ نیلم ملک صاحبہ کی اپنے کام سے لگن، اپنے آپ کو، اسی کائنات کو اور اپنے رب کو جاننے میں دلچسپی، حالات اور واقعات پر گہری نظر، پسے ہوئے طبقوں فکر، مجبور لوگوں سے ہمدردی، ظلم اور جبر کے خلاف آواز اور خاص کرکے ان کی دیوانگی اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہو جائیں گی اور انہیں ان کے کام کی وجہ سے ایک منفرد پہچان مل جائے گی۔

مجھے انکار اُس کی شاعری سے

جو شاعر ہو کے دیوانہ نہیں ہے

ڈھیروں دعاؤں اور بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ ان کی کامیابیوں کا منتظر۔

میاں وقار الاسلام، شاعر، ادیب، کالم نگار، مرتب، کارپوریٹ ٹرینر، بزنس کنسلٹنٹ

پرنسپل کنسلٹینٹ، ماروِل سسٹم، ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ

فاونڈر، وقار پاکستان، ایڈوائزر ادب سرائے انٹرنیشنل

عنوان : آئینہء خودی

تصنیف : کامیابی کر طرف

مصنفہ : محترمہ اربیہ فاطمہ

تحریر : میاں وقار الاسلام

خودی ایک ایسا آئینہ ہے جو انسان کے بناوٹی چہرے کو اُتار پھینکتا ہے۔ وہی بناوٹی چہرہ جو انسان کے ہر جھوٹ کو سہارا دیتا ہے اور اس کے غلط کو صحیح کر کے دیکھاتا رہتا ہے۔ معاشرے کے باطل پہلوؤں میں جینے کے لیے ہمیں ایسے ہی بناوٹی چہرے کی کمزور بیساکھیاں اُٹھانی پڑتی ہیں تاکہ ہم بھی انہیں معذور اور لاغر لوگوں میں شامل ہو جائیں جنہوں نے اپنی اپنی معذوریاں اکھٹی کر کے ایک کمزور اور ناتواں معاشرہ تشکیل دیا ہے۔ ایسے معاشرے چاہیے سینکڑوں کی تعداد میں ہوں یا پھر لاکھوں کی تعداد میں ان کی حیثیت دھول مٹی کی طرح ہی ہوتی ہے۔ ایسے کمزور معاشروں کی نہ تو کوئی طاقت ہوتی ہے اور نہ ہی کہیں کوئی وقعت۔ گردشِ دوراں کے کی سی ہوا انہیں اُڑا کر ساتھ لے جاتی ہے یا پھر ہلکی سی بارش بھی ان کا وجود دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ باظاہر جھوٹا انسان بڑا مضبوط اور طاقت ور نظر آتا ہے مگر اس میں ایسی سکت کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ حق اور سچ کے سامنے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

آئینہء خودی میں جب انسان اپنا عکس دیکھتا ہے تو اس پر اُس کا اصل ظاہر ہونے لگتا ہے نہ صرف وہ اپنی کمزوریوں کا احاطہ کرنے لگتا ہے بلکہ اپنے مضبوط پہلوؤں کا بھی خوب جائزہ لیتا ہے۔ آئینہء خودی انسان پر نہ صرف اس کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا چلا جاتا ہے بلکہ اسے اپنے بنانے والے کی طاقت اور اس کی کاریگری کے راز بھی کھولتا چلا جاتا ہے۔ جوں جوں انسان اپنی تسخیر کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس میں دنیا کو مسخر کرنے کی طاقت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حق جب انسان کے اندر سرائیت کر جاتا ہے تو پھر اسے کسی جھوٹے بناوٹی چہرے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان کا عمل، انسان کی محنت اور اس کی تحقیق اس کا اپنا آپ منوانے لگتی ہے۔ غاروں میں رہنے والا انسان بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگتا ہے، گھوڑوں اور اُنٹوں پر سفر کرنے والا انسان بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنے لگتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ انسان زمین اور سمندر کے راز پانے کے ساتھ ساتھ دوسرے سیاروں کو مسخر نے کی صلاحیت بھی پالیتا ہے۔

آج اللہ کی یہ ادنا سی تخلیق پوری کائنات میں اپنے آپ کو منواتی آ رہی ہے اور لا ممکنات کا سفر بھی ممکنات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے آج کا انسان بہت سی ایسی چیزیں وجود میں لا چکا ہے جن کے بارے میں کل کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف تو یہ انسان ہے جس نے ترقی کا سفر جاری رکھا اور اپنے رب کے پوشیدہ رازوں کے قریب پہنچ گیا اور مزید راز پانے کی جستجو میں آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ یہ مضبوط اور طاقت ور انسان ہے جس کی حقیقت اس کے اپنے آپ کو خود منوا رہی ہے۔ اور دوسری طرف وہ انسان ہے جو اپنے لیے صرف دھوکے کا

سامان پیدا کر رہا ہے۔ اسے ابھی پتا ہی نہیں کے اللہ نے اس کے اندر کتنے گہرے راز محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ تمام عمری جھوٹی اور مصنوعی زندگی گزارتے ہیں اور آخر کار ناامیدی کی موت مر جاتے ہیں۔ ان کے نہ تو جینے سے کسی کو کچھ فائیدہ ہوا اور نہ ہی ان کے مرنے سے کسی کو کوئی فرق پڑے گا۔ کیوں کہ انہوں کبھی اپنا آپ دیکھا ہی نہیں اور اگر کچھ دیکھا ہے تو وہ ہے صرف ناامیدی۔

جب تک اپنا آپ نہ بدلا جائے اور اپنے آپ کو اپنی بناوٹی ذات سے باہر نہ لایا جائے کسی قسم کی تبدلی ممکن نہیں۔ اپنا آپ بدلنے کے لیے انسان کو اپنے اندر جھانکنا پڑتا ہے اپن ذات میں اترنا پڑتا ہے اور اس ذات کو پہچاننا پڑتا ہے جس نے اُسے اشرف المخلوقات بنایا اور اسے ہر تخلیق پر فوقیت دی۔ انسان چاہے تو آئینہ خودی میں وہ تمام شرف ڈھونڈ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیے ہیں۔

عرفانِ خودی انسان کے اندر اس کی سوئی ہوئی شخصیت کو جگانے کے لیے ایک بہترین کاوش ہے جسے چھوٹے چھوٹے موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ ہر قسم کے انسان اسے آسانی سے سمجھ سکیں اور اپنا آپ پہچان سکیں۔ جس طرح زمین کے اللہ کے بے شمار خزانے ہیں اسی طرح انسان کے اپنے اندر بھی اللہ کے بے شمار خزانے ہیں۔ جنہیں مسخر کر کے انسان اپنی بہترین پہچان بنا سکتا ہے اور اپنا لوہا بھی منوا سکتا ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ ہیں جو اپنے رازوں سے نہ صرف ناواقف تھے بلکہ اسی طرح کی لاعلمی اپنے ساتھ لیے ہوئے اس دنیا سے چلے گئے۔ اپنی زندگی کو لوگوں کے لیے مثال بنائیں اپنے آپ کو پہچانے اور اس راز کو بھی پہچاننے کی کوشش کریں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا اور ہم پر اپنی نعمتیں پوری کیں۔

اللہ اپنے نظام کو چلا رہا ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں اگر ہم کچھ نہیں بھی کرتے تو وہ ہمارے جگہ اور لوگ لے آتا ہے جو پھر ہماری طرح کے نہیں ہوتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں اور اپنے آپ کو ان کاموں کے لیے تیار کریں جو کام اللہ تعالیٰ ہم سے لینا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جاننے کا سفر خودی سے شروع ہوتا ہے اور جیسے جیسے انسان اپنے سفر میں آگے بڑھتا ہے اللہ کے راز اس پر کھولتے چلے جاتے ہیں۔ عرفانِ خودی سے محترمہ اربیہ فاطمہ نے تو اپنے خودی کے سفر کو جاری کر دیا ہے اور آپ تک یہ پیغام بھی پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ اس نے تو عرفانِ خودی سے اپنی پہچان بنالی ہے۔ اب آپ نے سوچنا ہے کہ آپ خود کو کیسے جانیں کے اور اپنی پہچان کیسے بنائیں گے جس دن آپ کو اس کا جواب مل جائے گا عرفانِ خودی کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے علم میں اضافہ کرے اور ہمیں حق اور باطل کی پہچان دے تاکہ ہم اپنے لیے اسی راستے کا انتخاب کریں جس راستے کا انتخاب وہ ہم سے چاہتا ہے اور ہم انہیں مقاصد کو پورا کریں جن کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

جذبہء دل (تصنیف محترمہ نکہت نسرین، انڈیا)

تحریر: میاں وقار الاسلام (پاکستان)

دل کو انسان کے جسم میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ دل ہی پورے جسم میں خون کو رواں رکھتا ہے۔

کسی بھی ملک کے سب سے بہترین شہر کو اس ملک کا دل کہا جاتا ہے جیسے لاہور پاکستان کا دل ہے۔

محبت میں انسان کا جس سے سب سے لگاو ہوتا ہے اسے بھی دل کہا جاتا ہے۔ محبت کا آغاز بھی دلوں کے تبادلے سے ہوتا ہے۔

کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جس میں لوگوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں، اور دل کو دل سے راہ بھی ہوتی ہے۔

ایک دل اداس ہو تو دوسرے کا دل بھی خراب ہوتا ہے، کسی کس دل مسکرائے تو کسی کا دن بدلتا ہے۔

دل حساس بھی ہوتے ہیں، دل موم بھی ہوتے ہیں دل کی طرح پگھلتے بھی ہیں۔

دل پتھر بھی ہوتے ہیں یا پھر ان سے بھی سخت۔ اور پتھر گر بھی پڑتے ہیں اور ان میں چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

دل منکر بھی ہوتے ہیں، دل گونگے اور بہرے بھی ہوتے ہیں دل اندھے بھی ہوتے ہیں۔ دل احساس سے خالی بھی ہوتے ہیں۔

دل بولتے اور سنتے بھی ہیں دل دیکھتے اور محسوس بھی کرتے ہیں دل رجوع کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔

اللہ دلوں کے احوال جانتا ہے، اللہ کے ذکر سے دل شفا پاتے ہیں اللہ کے ذکر سے دل مضبوط ہوتے ہیں۔

ایمان تب تک کامل نہیں ہوتا جب تک ایمان دلوں میں داخل نہ ہو جائے۔

ایمان جب دلوں میں داخل ہوتا ہے تو پھر انسانوں کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے اور یوں ایمان کا رنگ انسان کے وجود کی پہچان بن جاتا ہے۔

محترمہ نسرین نکہت سچے جذبوں کی شاعرہ ہیں انہوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیئے اپنی پہلی تخلیق کا نام جذبہء دل رکھا ہے۔

ان کا دل کیا سوچتا ہے، کیا محسوس کرتا ہے اور اپنی محبت کے احساسات کو کسی طرح لفظوں میں پروتا ہے وہ اپنی سچی داستان کو جذبہء دل میں پیش کرتی نظر آتی ہیں۔

ان کی پوری کہانی تو ان کی مکمل کتاب پڑھنے کے بعد ہی پڑھنے والوں پر عیاں ہو سکتی ہے مگر ان کے فسانے کی چند جھلکیاں یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

نمونہء کلام

ان قہقہوں کی گونج میں نکہت ہے ایک راز
موجود ہوں میں جس میں وہ محفل اداس ہے

اور اسکے سوا اس کو کیا چاہیئے
عشقِ حق کی جسے عاشقی مل گئی

جو ذکرِ الٰہی میں رہا کرتے ہیں ہر وقت
نکہت انہیں بہکاتا ہے شیطان بہت کم

یہ سچ ہے کہ میرا کوئی ہمسر نہیں ہوتا
آئینہ اگر میرے برابر نہیں ہوتا

ہر شخص کو حاتم کی سخاوت نہیں ملتی
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

مختصر تعارف

محترمہ نسرین نکہت صاحبہ آڑیسہ کے شہر رواکیلا سے تعلق رکھتی ہیں ان کی پیدائش آڑیسہ کے ایک علمی خاندان میں ہوئی، آپ نے اپنے والد ماجد عبدلرشید خان صاحب مرحوم کی زیر نگرانی تعلمی منازل طے کیں۔ موصوفہ گورنمنٹ اردو اسکول کی معلّمہ کی حیثیت سے برسرکار ہیں۔

آپ کو کم عمری ہی سے شعر وادب سے دلچسپی رہی ہے۔ بطور خاص شعر گوئی سے۔ آج آپ کی شعری کاوشات نے نہ صرف اندورن ملک میں بلکہ بیرونی ممالک کے اخبارات، میگزین اور ویب سائیٹس میں بھی نمایاں جگہ پائی ہے۔ محترمہ نے قلیل عرصہ میں اردو دنیا میں شہرت اور عزت حاصل کی ہے۔ محترمہ نسرین نکہت کو اترپردیش اور راجستھان کی سرکاروں کی جانب سے "غزل رتن" اور "سمراٹ" وساہتہ جیسے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محترمہ 2005 میں ای ٹی وی اردو پروگرام "کل اور آئیں" میں حصہ لے چکی ہیں۔ جھارکھنڈ، بہار اور آڑیسہ کے شعراء کے طرعہ مقابلے میں شاعرات کے درمیان اول مقام حاصل کیا ہے۔

محترمہ نسرین نکہت صاحبہ کے لیے دعائیں اور نیک خواہشات، اللہ انہیں مذید کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار کرے اور انہیں ادب کی دنیا میں نمایاں مقام عطا کرے۔ آمین

دعا گو، میاں وقارالاسلام، پرنسپل کنسلٹینٹ ماروِل سسٹم
فاونڈر وقار پاکستان لیٹریری ریسرچ کلاوڈ
ڈائریکٹر آپریشن نیازی گروپ آف کمپنیز

شاعرہ: محترمہ صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ

تصنیف: وہ اک تارا محبت کا

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ تعالی نے حضرتِ انسان (چاہے مرد ہو یا عورت) کو بہت ساری خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے، محسوس کرنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر زندہ اور جاندار تخلیق کو عطا کی ہے، مگر احساسات کو کھل کر بیان کرنے کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیتیں حضرتِ انسان کو عطا کی ہیں وہ اپنی کسی بھی دوسری تخلیق کو عطا نہیں کیں۔ انسان چاہے مرد ہو یا عورت اس میں شدتِ جذبات بھی انتہا کی پائی جاتی ہے اور شدتِ اظہار کی بھی کسی میں کمی نہیں ہوتی۔ جہاں ایک طرف بہت سے لوگ اپنے احساسات کو ان کی پوری شدت کے باوجود پی جاتے ہیں اور ظاہری طور پر بے حسی کی تصویر بنے رہتے ہیں وہیں دوسری طرف بہت سے لوگ اپنے احساسات کو مختلف انداز سے منظرِ عام پر لے آتے ہیں، نہ صرف وہ اپنے احساسات اور جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ بہت سی بے حس اور خاموش تصویروں میں بھی جان ڈال دیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنی خوبیوں کو پہچانتے ہیں بلکہ انہیں منوانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ بے حسی کی تصویر بنے رہتے ہیں ان میں بھی صلاحتوں کی کمی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچان نہیں پاتے اسی لیے نہ انہیں کبھی اپنی پہچان ہو پاتی ہے اور نہ ہی حقیقی معانی میں وہ اپنے رب کو جان پاتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم چاہو تو آسمان کی حدوں سے دور نکل جاؤ اور زور کے سوا تو تم نکل نہیں سکتے۔ سو جو لوگ طاقت رکھتے ہیں وہ بے حسی کے تصویر سے باہر نکل آتے ہیں وہ نہ صرف اپنے جذبات اور احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ وہ ان لوگوں کے احساسات کو بھی بیان کرتے ہیں جو اپنی خوبیوں کو خود استعمال کرنے کی صلاحت نہیں رکھتے۔ انسان کی سب سے بڑی صلاحیت اپنی مخفی صلاحیتوں کو آشکار کرنے کی ہے جو کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔

قلم اُٹھانے سے پہلے انسان کا ٹکراؤ سب سے پہلے اپنے آپ سے ہوتا ہے اگر انسان اپنے آپ سے ہار جائے تو کبھی لکھ نہیں پاتا اور اگر وہ خود سے جیت جائے تو اسے کوئی لکھنے سے روک نہیں سکتا۔ دوسرے مرحلے میں انسان اپنے ارد گرد کے لوگوں سے ٹکراتا ہے اور اگر وہ معاشرے کو رسم و رواج اور طور طریقوں سے ہار جائے تو اس کے لکھنے کی تمام صلاحتیں وہیں دم توڑ جاتی ہیں اور اگر وہ ہمت نہ ہارے اور لکھتا رہے تو وہ اپنے معاشرے کا ترجمان بن جاتا ہے۔ یوں اس کا زورِ قلم بڑھتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے اُسے وہ اپنے قلم سے رواں کرتا چلا جاتا ہے۔ اور دبے ہوئے حالات واقعات کی سیاہی سفید کاغذوں پر پھیل جاتی ہے اور قلم سوز و غم کا ترجمان بن جاتا ہے۔

ایک ایسی ہی قلم کار، جذبوں کی ترجمان شاعرہ محترمہ صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ کی نئی کتاب "میرا درد کیسے غزل ہوا" جو کہ اپنے تکمیلی مراحل میں ہے، اس کا مسودہ میرے سامنے ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں ہیں جو بے حسی اور خاموشی کی تصویر بنے رہتے ہیں۔

ان کی شاعری پر روشنی ڈالنے سے پہلے اگر ان کا مختصر تعارف شامل نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ محترمہ صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ کا تعلق جیکب آباد سندھ سے ہے، یہی ان آبائی شہر ہے، اور وہ آج بھی ہیں مقیم ہیں۔ ان کی مادری زبان اردو ہے اور انہوں نے اردو میں ہی ماسٹر اور ایم فل بھی کیا ہے۔ گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج میں بطور نگران شعبہ اردو اپنی خدمات بھی سرانجام دے رہی ہیں۔

ان کے ادبی سفر کا آغاز بچپن سے ہی ہو گیا ہے، انہوں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ پہلے سے ہی علمی اور ادبی ماحول سے آراستہ تھا۔ ان کے والد محترم احمد نور ثاقب صاحب اور چچا محترم عجائب نور مغل صاحب بھی شاعر تھے۔

کلاس پنجم میں پہلی کہانی، کہانیوں کے مقابلے بہ اہتمام "رسالہ نور" کے لیے "فاصلہ" لکھی جس پر پہلا انعام ملا۔ بعد ازاں خواتین کا اسلامی، اصلاحی اور ادبی پرچہ "بتول" کے لیے نظمیں اور افسانے لکھے۔ ابتدا میں پروفیسر فروغ احمد صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ابتدائی شاعری کی اصلاح فروغ احمد صاحب نے کی۔ بعد ازاں محسن بھوپالی اور پھر معین اختر نقوی صاحب نے اصلاح کی۔ شعوری منزل طے ہونے کے بعد پاکستان کے معروف شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی صاحب کے ادبی مجلّہ "فنون" سے اسی قلمی سفر کا آغاز ہوا۔ جن رسائل نے ان کی تحریروں کے لیے درِ دل کشادہ کیا یہ ہیں: نور، بتول، شمع، سیپ، فنون، چٹان، دائرہ، اخبارِ جہاں، جنگ، خواتین کا ادبی صفحہ، حریت، جسارت، مڈویک میگزین، آداب عرض، عورت ڈائجسٹ، سرگزشت، کرن، ریڈیو کا رسالہ آہنگ، سچی کہانیاں، دوشیزہ وغیرہ۔ انہیں شاعری، افسانہ نگاری، تیلی پیتھی، تحریر شناسی، پیناٹزم، مسمریزم اور دست شناسی جیسے علوم سے شغف رہا۔ انہوں نے بطور کہانی کار، شاعرہ، افسانہ نگار، تمثیل نگار، (اسٹیج، ریڈیو، ٹیلی ویژن) ناول نگار، محقق، کالم نگار، سفر نگار، کمنٹریٹر (ہاکی، کرکٹ) صداکار، براڈکاسٹر، کمپیئر، سکرپٹ رائٹر، (ریڈیو حیدرآباد، خیرپور، کراچی) ادبی و فنی خدمات سرانجام دیں۔

:ان کی اردو ادبی تخلیقات و پبلکیشنز کی فہرست کچھ یوں ہے

۔ وہ ایک تارا محبت کا (شعر مجموعہ)، 2۔ میرا درد کیسے غزل ہوا (شعری مجموعہ)، 3۔ مُشتِ خاک کا سفر (کہانیاں اور افسانے)، 4۔ میرے 1 ساتھ سوئے حرم چلو (سفر نامہ)، 5۔ کہانیاں افسانے۔۔۔۔۔۔ (142)، 6۔ ناول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (02)، 7۔ ناولٹ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(05)،8۔ ریڈیو ڈرامے۔۔۔۔۔۔03۔۔۔۔۔۔(2اردو۔ایک سندھی)،9-ٹی وی ڈرامے۔۔۔۔۔۔انڈس ویژن، دیپک، 10۔ اسٹیج ڈرامے۔۔۔۔۔(02)،11۔ سکرپٹ/مزاحیہ خاکے۔۔05۔

:ان کے ادبی و فنی اعزازات کی فہرست کچھ یوں ہے

۔16 سال کی ادبی عمر میں پہلی ناول نگار کا اعزاز "کشتیاں سب جلاڈالیں"، 2۔ جیکب آباد کی پہلی صاحبِ کتاب شاعرہ 3۔ بیسٹ ڈائیٹر 1 ایوارڈ، ٹیلنٹ کلب، لاہور، 4۔ بیسٹ سندھی ڈرامہ کمپیئرنگ، صداکار، ریڈیو پاکستان خیرپور، 5۔ شعری مجموعہ "ایک تارہ محبت کا" پر اعلانِ سحر اسلام آباد کی جانب سے بہترین شاعرہ کا اعزاز، 6۔ مہرِادب کوئٹہ کی جانب سے سالِ رواں کا بہترین شعری مجموعہ، 7۔ شعاعِ ادب آزاد کشمیر کی ادبی تنظیم کی جانب سے سانحہ زلزلہ اکتوبر 2008 کی منظومات پر اہل قلم ایوارڈ، شریف اکیڈمی جرمنی 2013، 8۔ قلم قافلہ ایبٹ آباد کی جانب سے توصیفی سند، 9۔ جیکب آباد لٹریسی سوسائیٹی کی جانب سے توصیفی سند، 10۔ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ بدست وزیرِ تعلیم پیر مظہر الحق صاحب، ورلڈ ٹیچر ڈے 05 اکتوبر 2011 اعزازی ڈگری ازاں خیرپور یونیورسٹی، سندھ۔

ان کا ادبی سفر اس بات کا عکاس ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی دیکھا اور محسوس کیا، اُس احساس کو کبھی مرنے نہیں دیا اور اُن جذبات کی ہمیشہ ترجمانی کرتی رہیں چاہے وہ اسے غزلوں اور نظموں کی زینت بناتی رہیں یا پھر سفر ناموں اور افسانوں کی شکل دیتی رہیں، انہوں نے اپنے ہر دور اور ہر پہلو کی باخوبی ترجمانی کی ہے اور اس کا سفر ابھی جاری ہے۔

ان کے ادبی سفر کا ایک پڑاؤ کیوں کہ " میرا درد کیسے غزل ہوا" بھی ہے تو اس پڑاؤ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس کا آغاز وہ ان حمدیہ اور نعتیہ الفاظ سے کرتی ہیں، کچھ حمدیہ کلمات پیش خدمت ہیں

کہاں تابِ قلم
کر سکوں میں رقم
تیری حمد و ثنا
اے مرے کبریا

کچھ نعتیہ اشعار پیش خدمت ہیں

نصاب دو جہاں کا ہمیں وہ پڑھا دیا
جس کی ہر ایک بات نے رب کا پتہ دیا

یہ ہے بجا کہ آپ ہی اُمی تھے اور نبی
عالم تمام لوگوں کا اُن کو بنا دیا

: شدتِ جذبات سے بھرپور کچھ اشعار دیکھئے

میرے اشکوں سے اب یارو
سمندر بھر گیا ہوگا

تمہارے پیار سے صفیہ
دل اس کا بھر گیا ہوگا

ایک اور انداز دیکھئے

اچانک تیرگی چھائی
دیا وہ بجھ گیا شاید

تمہارے پیار کا جذبہ
ٹھٹھر کر مر گیا شاید

جذب کے اظہار کا ایک اور منفرد انداز دیکھئے

رت جگے پلنے لگے ہیں آنکھوں میں
خواب ڈھلنے لگے ہیں آنکھوں میں

خوبصورت

اس کی طلب میں اب تلک
پھر رہی ہوں کو بہ کو

بہت خوب

کس شرط پہ میں اُس سے بھلا بازی لگاتی
وہ شخص کسی ہارے جواری کی طرح تھا

کیا کہنے

حکیم جی سے یہی گزارش ہے

دردِ دل کی کوئی دوا لکھنا

عمدہ

حاکمِ وقت کتنا جابر ہو

تم حقیقت کو برملا لکھنا

کیا بات ہے

کیا کہا؟ وہ ملنے کو نہیں آئیں گے

یعنی، جذبات نہیں بدلیں گے

:لاجواب

اب نہ رہنا انہی خیالوں میں

چاندنی آ گئی ہے بالوں میں

کیوں کہ ان کی اس کتاب کا ایک حصہ نظموں پر مبنی ہے اس لیے ان کی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی نظموں کے چند منفرد
: ناموں پر ایک نظر جو ان کے سچے جذب کے عکاس نظر آتے ہیں، جیسا کہ

میری پکار سنو، تمہارے لیے، لمحہء وصل، بھلا کیسے بھلاؤ گے، ہوئیں بین کرتی ہیں، سہمی ہوئی چڑیا، مجبوریاں، کربِ ہجر، قصہء الم ان کی کیفیات کی کھل کر ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

:ان کی نظموں کے کچھ دل کو چھو جانے والے الفاظ دیکھئے

لمحہءِ وصل

تمہارے بازو کے تکیے پر

تمہاری یادوں کے بستر پر

تمہارے خواب کی چادر اوڑھ کر

سونے لگتی ہوں

سہمی ہوئی چڑیا

سنو

کسی طوفان کی زد پر

میرا یہ آشیانہ ہے

کہ جس کو چھوڑ دے ساجن

کہاں اُس کا ٹھکانہ ہے

کہ میں سہمی ہوئی چڑیا

ہوئیں بین کرتی رہیں

کسی بستی میں کوئی آفت جب چپکے سے آ جائے
کسی مسجد میں کوئی اسلحہ جب باندھ کر آئے
ہوائیں بین کرتی ہیں

لکھنے کو مذید بہت کچھ ہے مگر کتاب سے براہ راست پڑھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اُمید ہے آپ کو یہ کتاب پڑھ کر بے حد خوشی محسوس ہو گی۔ اور شاعرہ کا عمدہ اور منفرد کلام آپ کو بہت پسند آئے گا

میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ادبی سفر کو خوبصورت منازل سے آراستہ کرے اور ان کی ترجمانی ان کے زیرِ اثر لوگوں کی اور خود ان کی فلاح کا سبب بنے اور انہیں دنیا اور آخرت کی کامیابیاں عطا کرے امین۔

دعا گو، میاں وقار الاسلام
ایڈوائزر، ادب سرائے انٹرنیشنل، کنسلٹنٹ، ماروِل سسٹم
انٹرنیشنل مارکیٹنگ مینجر، ال دوسرا انٹرنیشنل کمپنی لمیٹیڈ
جدہ، سعودی عرب

مضمون : پختہ رنگوں کی کہانیاں

تحریر : میاں وقار الاسلام

محترمہ فاخرہ پروین صاحب کی مضامین پر مبنی کتاب " جینے کا یہی طریقہ ہے" سے انتساب

زندگی چاہے کئی سو سال کی ہو، سو سال کی ہو، ستر سال کی ہو ساٹھ سال کی ہو یا پھر اس سے کم لگتا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے پل بھر میں گزر گئی۔

انسان اپنی زندگی پر مختصر لکھنے بیٹھے تو چند ہی لائنوں میں قصہ تمام کیا جا سکتا ہے اور اگر تفصیل سے لکھنے بیٹھے تو بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی نظر میں اتنا لمبا افسانہ بن جاتے ہے کہ ختم کرتے کرتے عمر کم پڑ جاتی ہے۔

انسان ماں کی محبت میں لکھتا ہے تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، باپ کی محبت میں لکھتا ہے تو الفاظ ہی نہیں ملتے جو ایسی بے پناہ محبتوں کے عکاس بن سکیں مگر پھر بھی لکھا جاتا ہے اور بہت لکھا جاتا ہے اور جتنا بھی لکھا جاتا ہے کم پڑ جاتا ہے۔

اسی طرح دوستوں اور رشتہ داروں اور قرابت والوں پر لکھا جاتا ہے، استادوں پر لکھا جاتا ہے، نئی اور پرانی نسلوں پر لکھا جاتا ہے۔ اور یہ سفر بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اگر نظر دوڑائے تو پرندوں کی کہانیاں ختم نہیں ہوتیں جانوروں کے قصے ختم نہیں ہوتے، کیا جھیل کیا وادیاں، کیا دریا کیا سمندر کیا قدرتی نظارے، کیا زمین اور کیا آسمان نظر جہاں جہاں پڑھتی ہے کچھ نہ کچھ نکال لاتی ہے۔

اور اگر نظر کہیں نا بھی پڑے تو تخیل کی ایک وسیع دنیا پڑی ہے۔ انسان سوچوں میں کھو جائے تو اتنا دور نکلا جاتا ہے کہ پھر کسی کی آواز بھی اس تک نہیں پہنچی۔ سوچ ہی سوچ میں انسان آسمانوں کی حدوں سے نکل جاتا ہے، سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور قلم کار ایسی ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ اگر ان کی باتیں سونے کے قلم سے بھی لکھی جائیں تو بھی ان کی قیمت کا تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ انسان کا نہیں بلکہ رحمٰن کا ہی کمال ہے جس نے ایک ذرے کو اتنی اہمیت دے دی کہ وہ اشرف المخلوقات ہے گیا۔ خالق نے اس مخلوق کو ایسا بنایا ہے کہ یہ بہت کچھ تخلیق کرنے کی صلاحیوں سے مالا مال ہے۔

مگر یہ صلاحیوں سے مالا مال انسان اپنی وقت تب کھو دیتا ہے جب یہ اپنی ٹھیک ٹھیک پہچان نہیں کر پاتا، اتنی سی پہچان نہیں کر پاتا کہ اسے پیدا کیوں کیا گیا، اور اسے کس نے پیدا کیا، اس نے کرنا کیا ہے اور اس کا ہونا کیا ہے۔ دنیا سے جو زادِ راہ اکھٹا ہوگا اس کا کیا معاملہ ہوگا اور یہ کہ آخر کار اسے اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہونا ہے۔

کہانی ایک ہو یا ہزاروں، انجام اچھا ہو یا برا، لوگ تعریف کریں یا نہ کریں شاید فرق صرف ایک ہی چیز سے پڑھے گا کہ ہزاروں کہانیاں رکھنے والا یہ انسان اپنی زندگی کے اصلی کہانی کیسے لکھ کر آیا ہے۔ کیا اس کی زندگی کی اصلی کہانی اتنی دلچسپ اور حسین ہے کہ اس کی مغفرت کروا سکے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں جو رنگ بھرتے ہیں، ان رنگوں کی حقیقت اللہ کے ہاں کیا حیثیت رکھتی ہے ایسا نہ ہو کہ بے بہا رنگوں سے سجی سجائی زندگی جب اپنا حساب دینے پر آئے تو اس کے سارے رنگ ہی اُڑ جائیں۔

اپنی زندگی کو خوبصورت بنائیں، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی مگر اسے پختہ رنگوں سے سجائیں تاکہ ان کا نکھار دنیا میں بھی رہے، آپ کے دنیا سے جانے کے بعد بھی رہے اور آپ ان رنگوں کے حساب کے دن بھی دیکھ کر خوش ہوتے رہیں۔

اللہ ہمیں توفیق دے، ہم اللہ کی دی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو سکیں اور اپنی زندگیوں کی کہانیاں ایسے پختہ رنگوں سے لکھیں کہ یہ ہمارے لیے زادِ راہ اور آخرت میں مغفرت کا سامان پیدا کر سکیں۔

محترمہ فاخرہ پروین صاحبہ نے اپنے مضامین کے ذریعے پختہ رنگوں کی بہار لانے کا خواب دیکھا ہے، اور قلم کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ فاخرہ پروین اپنے مضامین کے ذریعے اپنے احساسات اور جذبات کو کس قدر کھل کر سامنے لانے میں کامیاب ہوئی ہیں یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ان کی کتاب کو پڑھنے کے بعد ہی کر پائیں گے۔ محترمہ فاخرہ پروین صاحبہ کے ادبی سفر کے لیے بھرپور دعائیں اور نیک خواہشات، ان کا ادبی شوق، لگن، جذبہ، محنت اور محبت اس بات کی طرف واضع اشارہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنا، اپنے والدین کا اور اپنے ملک کا نام روشن کرنے والی ہیں۔ دعا گو میاں وقار الاسلام، پرنسپل کنسلٹینٹ مارول سسٹم، فاؤنڈر وقارِ پاکستان

نرگسی کرلاٹ

تحریر: میاں وقارالاسلام

نرگس ایک پھول کا نام ہے جو باہر سے سفید اور اندر سے زرد ہوتا ہے جس طرح چاند باہر سے سفید اور اندر سے سیاہ داغ چھپائے نظر آتا ہے۔ اسی طرح کرلاٹ بھی انسان کے اندر کی درد بھری آواز ہے جو باہر سے اس طرح نظر نہیں آتی مگر انسان کے وجود کے اندر اپنے موجود ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

میں نے نرگسی کرلاٹ کی عکاس پنجابی کی ایک غزل سنی، ایک عجیب سی پر اسرار آواز تھی، یوں لگا جیسے دور کہیں گہرے بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے ایک روشن چمکتے چاند کے سینے میں کہیں کرلاٹ دھڑک رہی ہے۔ جیسے ایک عجیب سی درد بھری خاموشی جو چاند کے سینے سے بار بار پکار رہی ہو۔ میں بہت دیکھ تک انتظار میں رہا کہ کب بادل چھٹیں گے اور چاند اپنی آب و تاب کے ساتھ باہر آئے گا۔

آخر کار چاندنی مسکرانے لگی چاند نظر آنے لگا اور بادل چھٹ گئے۔ اب میں تھا، چاندنی تھی، چاند تھا اور اس کے سینے پر کرلاٹ کی مہر تھی۔ لفظ موتیوں کی طرح جڑے تھے اور اپنی سچائی کی گوائی دیتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ بات اتنی خوبصورت انفرادیت سے شروع ہوئی کہ توجہ ہٹانا مشکل ہو گیا۔۔۔ سنیئے

میں ہوراں توں ہٹ کے لکھنا چاہنی آں

ساریاں گلاں ڈٹ کے لکھنا چاہنی آں

دکھاں دی پنڈ سٹ کے کدھرے چلے وچ

سکھ دی پونی وٹ کے لکھنا چاہنی آں

اندر جمڑا ہڑھ چڑھیا کرلاٹاں دا

اکھراں نال اوہ چٹ کے لکھنا چاہنی آں

میں نئیں چاہندی ادھ وچکارے ڈب جاواں
عشق دا پہاڑ ارٹ کے لکھنا چاہنی آں

میں لوکاں دی بیجی ہوئی کیوں وڈھاں
اپنا حصہ کھٹ کے لکھنا چاہنی آں

وصل دے پھل نوں ساہنواں دی خوشبو دے کے
ہجر دی ویل نوں کٹ کے لکھنا چاہنی آں

محترمہ نرگس نور

میری نظریں چاند کے اندر موجود سیاہی پر جمی ہوئی تھیں اور سیاہی میں ڈوب کر اس میں چھپی ہوئی کرلاٹ کو باہر لانا چاہتی تھیں۔ بہت دیر تک نظریں جمی رہیں، درد کے إحساس کی سیاہی میری آنکھوں میں پھیلتی جا رہی تھی، درد کے کئی منظر بنتے اور بکھرتے جا رہے تھے اور میں ان مناظر کو نقل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک طرف محترمہ نرگس نور صاحبہ کی نرگسیت ہے دوسری طرف ان کے کلام کی کرلاٹ ہے جو ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔ گویا روپ پر روپ چڑھا ہوا ہے۔ جیسے جیسے ان کے اشعار پڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کے تجربات اور مشاہدات کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں۔

کرلاٹ سے میں نے چند اشعار نقل کیے ہیں جو اپنی کہانی اپنی زبانی سناتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔۔۔ تو سنئے

نہ میں ہیر تے نہ توں رانجھا
ایویں کھیڈ رچائی گئی اے

میں امبراں تے اڈی اڈی جانی آں
اوہدے ولوں جدوں اشارے ہندے نے

آپاں دونوں کدوں ملے سی
چوٹھی خبر اڈائی گئی اے

پت جمے تے متھے چمن
دھی جمے تے قہر وے سائیاں

صدقے وچ جو واری گئی آں
اس لئی میں اتاری گئی آں

میں نفرت دی کھرلی اتے
ڈنگراں وانگوں چاری گئی آں

جو وی ریت بنائی گئی اے
عورت ہی ازمائی گئی اے

زن تے زر دے رولے اندر
قبراں تیک لڑائی گئی اے

اچھے قلم کار کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ اس کی تحریر اپنی طرف کھینچتی ہے، اور پھر پڑھنے والے کی سوچ کو اپنے مرکز کی طرف کھینچ لیتی ہے۔ خیالات ایک محور کے گرد گھومنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ باہر کا شور جاتا رہتا ہے اور اندر کی کرلاہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔

اور یہ بھی سنائی دیتا ہے کہ وہ اپنے شہر اور اپنے لوگوں سے کس قدر محبت کرتی ہیں

یہ جو لاہور ہے شہر وفا ہے

یہاں پر بے وفا کوئی نہیں ہے

محترمہ نرگس نور

محترمہ نرگس نور صاحبہ کا کلام سامنے ہے جتنا پڑھا اتنا ہی تجسّس بڑھا تو سوچا کہ صرف میرا ہی تجسّس کیوں بڑھے، دوسرے پڑھنے والے بھی اس سے لطف اندوز ہوں اور کلام پسند ہے تو اچھے قلم کار کی حوصلہ افزائی ضرور ہونی چاہیئے جو اس کا حق ہے۔

محترمہ نرگس نور کہتی ہیں کہ میری زندگی اسی لفظ کرلاٹ سے شروع ہوئی اور اسی لفظ پر ختم ہوتی ہے۔ اپنے تجربات سے سیکھنا، سمجھنا، اپنی درست سمت طے کرنا، مشکلات کو سہنا، صبر کرنا، اپنے مشاہدات کو بڑھانا، اپنے اپنے اندر اور باہر کو پہچاننا اور شکر کرنا یہ ایک روحانی اساس ہے اور انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اللہ کے بندوں سے اور اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی اس دنیا میں جہاں لوگ اپنے اصلی چہرے کو چھپاتے ہیں اور اپنے مصنوعی چہرے کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں محترمہ نرگس نور نے اپنے لیئے کسی مصنوعی چہرے کا انتخاب نہیں کیا۔ وہ اپنے حقیقی روپ کو باہر لانا چاہتی ہیں۔

معاشرے میں ناامیدی کا کینسر پھیلتا جا رہا ہے جس کہ وجہ یہی ہے کہ لوگ اصلی چہروں پر نقلی چہرے لگاتے ہیں، نہ اپنی حقیقی خوشی بیان کر سکتے ہیں نہ ہی اپنے حقیقی غم بانٹ سکتے ہیں۔ جب چہرے ہی مصنوعی ہوں تو پھر دوست اور دشمن بھی مصنوعی ہوتے ہیں کوئی نہیں جان سکتا کہ کا چہرے کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔

نرگسی کرلاٹ سچائی کی عکاس ہے اور صرف وہی کہنا چاہتی ہے جو وہ حقیقت میں ہے۔ دعا گو ہوں کہ محترمہ نرگس نور کی یہ کاوش معاشرے میں مثبت تبدیلی لے کر آئے ان کی کامیابی کے لیئے ایک سنگ میل ثابت ہو۔ آمین

تصنیف : دستکِ درِ مُقفّل

شاعرہ ومصنفہ : محترمہ کنیز بتول کھوکھر

تحریر : میاں وقار الاسلام

زندگی ایک خوابِ غفلت ہی ہے، قسمت بہت کم لوگوں کو اس خوابِ غفلت سے جاگنے کا موقع دیتی ہے۔ جنہیں موقع ملتا ہے پھر ان کے اندر یہ تڑپ بھی پیدا ہوتی ہے کہ وہ سوئی ہوئی قوم کو جگانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ کوشش تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر بہت کم لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کی کوشش رنگ لائے۔ نہ صرف ہمیں مسلمان پیدا کیا گیا ہے، بلکہ قومِ معتدل بنایا گیا، یعنی درمیان والی قوم جو برائی سے روکتی ہے اور اچھائی کا درس دیتی ہے۔ مگر بہت کم مسلمان اپنی زندگی کے اس بنیادی مقصد کو سمجھتے ہیں اور اپنی بہترین سمت کا تعین کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ آسان تو نہیں ہے، مگر ہر تڑپ رکھنے والا مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرتا رہتا ہے۔ پھر کس کی کوشش کو کس قدر قبول کیا جائے گا، اور کون اپنی کوشش میں کتنا مخلص ہے اس کا فیصلہ تو فیصلے کے دن ہی ہو سکتا ہے۔

محترمہ کنیز بتول کھوکھر کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے قلم کے ذریعے نورِ ہدایت سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔ ان کے مضامین لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ قلم کے ذریعے معاشرے میں پھیلی ہوئی اور پھیلتی ہوئی برائیوں کی طرف نہ صرف اشارہ کرتی ہیں بلکہ اپنے مخصوص انداز سے لوگوں کو ان معاشرتی اندھیروں سے نکالنے کے لیے اسلامی طریقے سے راستہ بھی بتاتی ہیں۔ ان کے مضامین اپنی زبان آپ بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جیسا کہ احساسِ ذمہ داری، تربیت، کیا یہی انصاف ہے؟، توجہ طلب مسئلہ، مظلوم کون؟، پیشہ ور بھکاری، تبدیلی کیسے آئے گی؟، لاعلمی، خود بنیں اپنی پہچان، نام بڑے اور درشن چھوٹے، اطمینانِ قلب، آخری بات، ماسی کلچر اور دیارِ غیر۔ ایسے بہت سے مضامین ہیں جو نہ صرف معاشرتی برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان سے جات کے ہل بھی بتائے گیے کہ کسی طرح ان برائیوں کا سدِ باب ہو یا پھر یہ برائیاں کم ہی ہو سکیں۔

سب سے آسان کام برائیوں کی طرف اشارہ کر دینا ہے، اور ہمارے ارد گرد بہت سے منافقانہ رویے پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ برائی کرتے کرتے اتنے آگے چلے جاتے ہیں کہ انہیں سوائے برائی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ ان کی باتوں کی ناامیدی اور مایوسی چھلکنے لگتی ہے۔ ایسے لوگوں کی کوششوں سے نہ ہی ان کا کوئی بھلا ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے کو کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ تو معاشروں کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اور سب سے مشکل کام ہوتا ہے لوگوں کے لیے امید اور یاس کی بات کرنا، بہتری کا رستہ دیکھانا۔ اور لوگوں کو اندھیروں سے روشنیوں کی طرف لے کر آنا۔

محترمہ کنیز بتول کھوکھر نے رویتی قلم کاروں کی طرح صرف تنقید کرنا ہی نہیں سیکھا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر بھی محنت کی ہے، ان کے اندازِ بیاں میں امید کی کرن بھی نظر آتی ہے اور خود اعتمادی بھی۔ ان کی تحریروں میں صرف تنقید نہیں بلکہ ان کا وسیع مطالعہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ علم اور ہدایت کے جس سفر پر نکلی ہیں اس کا اثر ان کی اپنی ذات میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ نہ صرف قدم قدم پر ہدایت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں بلکہ اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش بھی جاری ہے۔

محترمہ کنیز بتول کھوکھر نے شاید اپنی کتاب کا نام "دستکِ درِ مُقفّل" اسی لیے رکھا ہے کہ اس میں احتیاط کا عنصر پایا جاتا ہے۔ نہ صرف وہ یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر دستک دی جائے بلکہ وہ اپنی علمی اور ادبی مسافت سے اپنی ذات کو بھی آشکار کرنا چاہتی ہیں تاکہ وہ قدرت کے رازوں کو اور گہرائی میں جا کر پہچان سکیں، تاکہ وہ اس کائنات کی وسعت کو اور اچھی طرح سمجھ سکیں، اور یہی وہ چیز ہے جو ایک قلم کار کے اندر کامیابی سے سفر کو ہمیشہ جاری رکھتی ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو دنیا میں لوگوں کی فلاح کے لیے اور آخرت میں ان کی اپنی کامیابی کے لیے وسیلہ بنائے۔

میاں وقار الاسلام، پرنسپل کنسلٹینٹ مارل سسٹم

فاؤنڈر وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم

منفرد شخصیت، انفرادی کتاب

تحریر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: میں اور مفتی جی

مصنف: محترمہ فرحین چودھری

زندگی میں کچھ لوگوں کی اہمیت زندگی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ زندگی کو جینے کا مقصد دیتے ہیں۔ زندگی کو اور خوبصورت اور بامعانی بناتے ہیں۔ انسان بہت سے انسانوں سے سیکھتا اور سمجھتا ہے۔ مگر کچھ انسان اپنے اندر ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس نے نام سے میری ایک بک سیریز ہے، جیسے میں نے کئی برس پہلے شروع کیا اور چند برس پہلے اس کی 10 جلدیں مکمل ہو گئیں۔ بیسٹ لائف نوٹس کا آغاز اسی بات سے ہوا کہ میں نے جس سے جو جو بات سیکھی جس سے میری زندگی کو نیا رُخ یا نئے معانی ملیں تو میں اسے قلم بند کرتا چلا جاؤں۔ ایک تو میں نے اپنی زندگی پر گہرا اثر ڈالنے والے لوگوں کی باتیں لکھیں، اور دوسرا، دوسرے لوگوں سے بھی معلومات اکٹھا کیں کی کس کی باتوں سے کس کی زندگی میں کیا فرق پڑا، اور اس طرح دوسرے لوگوں کی باتیں بھی اکھٹی ہونا شروع ہوئیں اور اس طرح 10 کتابوں کا مجموعہ اکٹھا ہو گیا۔

مگر سفر یہیں تک نہیں رُکا، میں ایسا سوچنے، لکھنے اور مرتب کرنا والا اکیلا نہیں تھا، جتنا میں اپنی کھوج میں آگے بڑھتا گیا، دنیا اتنی ہی بڑی محسوس ہونے لگی اور احساس ہونے لگا کہ ہمیں کس قدر کم علم دیا گیا ہے۔ بعض دفعہ انسان کی ایک شخص کی کھوج میں پوری زندگی لگا دیتا ہے مگر پھر بھی اُس کی شخصیت کے پہلو پوری طرح سے عیاں نہیں ہوتے۔ علم ہے ہی ایسی چیز، یہ ایک سمندر ہے کہ ختم نہیں ہوتا، یہ ایک پیاس ہے جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

محترمہ فرحین چودھری، خود ایک باکمال شخصیت کی مالک ہیں، اور یہ جس شخصیت سے متاثر ہوئیں ہیں یقیناوہ کسی درس گاہ سے کم نہیں ہیں۔ جب انسان علم کی خواہش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے باکمال انسانوں کو وسیلہ بنا دیتا ہے جو اپنی ذات میں علم کا سمندر ہوتے ہیں۔ اور پھر دیے سے دیا جلتا ہے، روشنی سے روشنی پھیلتی ہے اور انسان کے اندر اور باہر سے جگمگانے لگتا ہے۔

محترمہ فرحین چودھری جب بولتی ہیں تو لگتا ہے ان کے لفظوں پر ان کے استادوں کی شفقت ہے، اور ان کی آنکھوں کی چمک بتاتی ہے کہ انہوں نے اپنے استادوں سے وفا کی ہے۔ اور ان کا اعتماد بتاتا ہے کہ وہ کتنی ثابت قدم رہی ہیں۔ شمع خود ہی نہیں جلتی، شمع ضرور کسی نہ کسی چراغ سے ٹکرائی ہوتی ہے۔ ہم جو فیض یاب ہوتے ہیں، یہ فیض کہیں سے تو آتا ہوگا۔ علم ہے ہی ایسی روشن اور مقدس چیز، یہ انسان کو نکھارتی ہی چلی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے ہم پر علم فرض کیا گیا ہے کہ ہم دنیا کے رازوں کو پہچانیں، تاکہ ہم اللہ کے رازوں کو پہچانیں، تاکہ ہمیں شکر گزار ہوں۔ اللہ کا فضل تو ہمارے چاروں طرح مختلف شکلوں میں ہر وقت موجود رہتا ہے مگر پوری طرح سے فیض یاب وہی لوگ ہو پاتے ہیں جو باادب ہوتے ہیں۔ محترمہ فرحین چودھری کی کتاب اس بات کی بھی عکاس ہے کہ وہ کس قدر باادب ہیں۔

ہر انسان مشکلوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے، مگر کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے پریشانیاں بانٹنے سے پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں یا پھر کم تو ضرور ہو جاتی ہیں، اور شاید ان کے پاس ہماری مشکلوں کا حل ہوتا ہے، جب بھی ان سے بات کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی رستہ نکل آتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کردار زندگی کے اندھیروں میں روشنی جیسا ہوتا ہے۔ محبت اور عقیدت کے رشتے ہمارے آس پاس ہی ہوتے ہیں، اب یہ ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے ایسے محسن تلاش کرتے ہیں جو ہماری زندگی کو آسان بنائیں، یا پھر ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو ہماری مشکلوں کو اور بڑھا دیں۔ منزلیں انہیں ہی ملتی ہیں جو راستوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔

محترمہ فرحین چودھری کی اور مفتی جی کی باتیں پڑھ کر لگتا ہے جیسے وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کھوج میں رہی ہیں۔ انسان کے اندر اگر سوال ہی پیدا نہ ہوں تو پھر اسے جواب کہاں سے ملیں گے۔ اس کتاب میں جس طرح کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے، اگر ان مضامین کے ناموں پر ہی غور کیا جائے تو محترمہ فرحین چودھری کے دل میں اُٹھنے والے بے قرار سوالوں کا پتہ چلنے لگتا ہے۔

چند مضامین کے نام یہ ہیں، اللہ لوک کا ڈھابہ، دیواریں بولتی ہیں، بابے پیچھا کرتے ہیں، چہرے بدلتی زندگی، عکسی کا لوک ورثہ، سیکرٹ ایجنٹ، اصلی نقلی مسکراہٹ، تیسری آنکھ، سچ تو یہ ہے، ٹھنڈا میٹھا چشمہ اور میگنٹ ممتاز مفتی۔ اس کتاب میں اور بھی مضامین شامل ہے، یہ چند نام صرف عکسِ خیال کی مناسبت سے لکھ دیے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان مضامین نے نام اچھوتے ہیں، بلکہ ان مضامین میں بہت سی گہری باتیں ہیں جو بڑے ہلکے پھلکے آسان انداز سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بعض دفعہ زندگی کے بڑے بڑے مسائل کا حل بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں نکل آتا ہے، اور انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اتنی سطحی سی بات اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ شاید بالکل اسی طرح جیسے قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اور پھر اس کی لاش لیے پھرتا رہا اور اس کے ذہن میں اتنی سی بات بھی نہ آئی کہ زمین میں ایک گڑھا کھودے اور اس میں اپنے مقتل بھائی کو دفنا دے۔ روزمرہ کی پریشانیوں کا بوجھ بھی ہمارے کاندھوں پر رہتا ہے جب تک ہم انہیں دفنا نہیں دیتے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی میں ایسے رہنما دوست ملتے ہیں جو انہیں

پریشانیوں کو دفنانے کا طریقہ بتاتے ہیں اور ان کی زندگی آسان بناتے ہیں۔ زندگی ایسے رہنما دوستوں کی مقروض رہتی ہے، اور ان کے قرض اتارنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، کہ انسان ایسے دوستوں کے رہنما اصولوں کو قلم بند کرے اور ان کی اچھی، سچی اور پیاری باتوں کو دوسروں کی فلاح کے لیے پیش کر دے۔

جب میں نے مفتی جی کے بارے میں پڑھا، اور یہ بھی پڑھا کے مفتی جی شہاب صاحب کے پیچھے تھے اور شہاب صاحب مفتی جی کے پیچھے تھے، اور ان عظیم ہستوں کا یوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہونا ایک تو علم، ادب اور روحانیت کی وجہ سے تھا، اور دوسرا تعلق پاکستان سے دل و جان سے محبت کی وجہ سے بھی تھا، تو ان کے احوال جو محترمہ فرحین چودھری نے بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور محترمہ فرحین چودھری نے جس محبت اور عقیدت سے ان احوال کو قلم بند کیا ہے، مجھے تو یہ بھی کوئی پہنچی ہوئی عظیم ہستی معلوم ہوتی ہیں۔ تو یقیناً یہاں دو ہستیوں کے باب نہیں کھلتے بلکہ اس ہستی کا باب بھی کھلتا ہے جس نے یہ پوری داستان اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس داستان کے ہر حصہ ہر نظر رکھی ہے، بلکہ نہ صرف نظر رکھی ہے بلکہ اپنی محبت اور عقیدت بھی پیش کی ہے اور یہی محبت اور عقیدت کا جذبہ ان کی تحریر میں اور ان کے اندازِ بیاں میں صاف جھلکتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے والا کچھ اور لکھ رہا ہوتا ہے مگر اس کا اندازِ بیاں کچھ اور کہنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ جیسے کہ محبت سے بھری ایک زندہ تصویر ہو، جو منہ سے تو انکار کر رہی ہو مگر اس کی آنکھوں سے چھلکے ہوئے سچے موتی اس کی سچی محبت کا پورا پورا اقرار کر رہے ہوں۔

محترمہ فرحین چودھری، اپنی تحریر میں جہاں جہاں مفتی جی کا ذکر کرتی نظر آتی ہیں وہیں وہیں، ان کے ارد گرد پڑی ہوئی چیزوں، مفتی جی سے جُڑے ہوئے رشتوں کو بھی پوری پوری اہمیت دیتی نظر آتی ہیں۔ محترمہ فرحین چودھری کو مہارت حاصل ہوئی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی چیز کو غیر معمولی کرتی چلی گئیں ہیں۔ یہ بات ان کے تجسّس اور ان کی بیقراری کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر تجسّس اور بے قراری نہ ہو تو انسان دنیا کے اچھے سے اچھے ماہر استاد سے بھی کچھ نہیں سیکھ پاتا۔ محترمہ فرحین چودھری کا تجسّس اور ان کی بے قراری بتاتی ہے کہہ انہوں نے اپنے وقت کے ضائع نہیں کیا اور اپنے وقت سے اتنا ہی سیکھا ہے جتنا سیکھا جا سکتا تھا۔ اور پھر عظیم مرشد کا انتخاب تو انسان کو ولی بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ روحانی تعلق کبھی ٹوٹتے ہیں ہیں۔ یہ روحانی تعلق ہی تو ہے کہ ہم ایک امت ہیں اور ایک رسول سے جڑے ہوئے ہیں اور اتنے گہرے جڑے ہوئے ہیں کہ اس کی عظمت اور توقیر کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔ بزرگ ہستیوں کے ساتھ بھی روحانی تعلق رہتے ہیں، بزرگ ہستیاں جو محبت اپنے چاہنے والوں میں بانٹ جاتی ہیں وہ محبت ان کے چاہنے والوں کی شخصیت کی اساس بنتی ہے، اور جب ان کے چاہنے والوں کے پاس بیٹھتے ہیں تو ان کے بزرگوں کی خوشبو ان سے محسوس ہوتی ہے۔

مفتی جی آج ہم میں نہیں ہیں، مگر مفتی جی کا علم، ان کا ادب اور ان کی روحانی اساس ان کے چاہنے والوں کے دلوں میں محفوظ ہے۔ جیسا کے محترمہ فرحین چودھری جی کو ہی لے لیجئے، ان کی مفتی جی پر لکھی ہوئی کتاب اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ انہوں نے مفتی جی کا علم، ان کا ادب اور ان کی روحانی اساس، سب کو اپنے سینے میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے، اور یہ سب کچھ اب قلم کے زریعے باہر آنا چاہتا ہے۔

محترمہ فرحین چودھری کو مفتی جی سے محبت ملی ہے، اور مجھے وہی محبت ان کی کتاب "مفتی جی" کے ذریعے ملی ہے۔ یقیناً یہ کتاب جہاں جہاں جائے گی اپنی محبت کا پیغام اپنے ساتھ لے کر جائے گی۔

یہاں ایک بات یہ بھی سیکھنے کی ہے، کہ جیسے انہوں نے اپنے محسن کی محبتوں کا قرض اتارنے کی کوشش کی ہے، بالکل اسی طرح اگر آپ نے بھی زندگی میں کسی سے کچھ سیکھا ہے سمجھا ہے اور اپنی زندگی کو بامعانی بنایا ہے تو قلم اُٹھایئے اور ان سے محبت کا قرض اُتار دیجئے۔ صرف اچھے بن کر چلے جانا اہم نہیں ہوتا، اہم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اچھے ہونے سے معاشرے کے لوگوں کی زندگیوں میں بھی تبدیلی آئے۔ جو ہم سیکھتے ہیں وہ ہم پر قرض ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس قرض کو ضرور اُتارئیں اور اپنے حصے کا کام ضرور کریں۔

میں نے یہاں اس کتاب کو پڑھا، سمجھا اور بہت کچھ سیکھا اور پھر اس کتاب سے پیغامِ محبت لیا اور آپ کے سامنے رکھ دیا، اب آپ اس کتاب کو پڑھیں، امید کرتا ہوں کہ آپ بھی اپنے حصے کا کام کریں گے۔

محترمہ فرحین چودھری صاحبہ کے لیے دعائیں اور نیک خواہشات، دعا گو، میاں وقار الاسلام، فاؤنڈر وقارِ پاکستان، پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم۔

www.waqarpk.com & www.marvelsystem.com

تصنیف : دستور زبان بلوچی

مصنف : ہوت شفیع محمد

تحریر : : میاں وقار الاسلام

محترم ہوت شفیع محمد صاحب کا تعلق پاکستان کے معروف شہر اور دنیا کے نقشے پر ابھرتے ہوئی ایمرجنگ سمارٹ پورٹ سٹی گوادر سے ہے۔ محترم ہوت شفیع محمد صاحب ہوت فیملی کے چشم وچراغ ہیں ہوت فیملی گوادر کے گردونواح میں سیاسی، سماجی اور کاروباری حلقوں میں اپنی بھرپور خدمات اور تاریخی ساکھ کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

محترم ہوت شفیع محمد صاحب ایس پی نور انٹرپرائیزز پرائیویٹ لمیٹیڈ کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر ہیں۔ان کی کمپنی گذشتہ تین دہائیوں سے مختلف کاروباری سرگرمیوں میں اپنے آپ کو منوا چکی ہے۔بنیادی طور پر ان کی کمپنی رئیل اسٹیٹ، کنسٹرکشن، سی فوڈ اور زراعت کے شعبے سے منسلک ہے۔

ایس پی نور انٹرپرائیزز پرائیویٹ لمیٹیڈ کے اہم پراجیکٹس میں النور کارگو سٹی گوادر، سرائے نور گوادر، نور مروا گوادر اور جی ڈی آے بولان سٹی گوادر شامل ہیں۔اس کے علاوہ کریب فارمنگ، لابسٹر فارمنگ اور زرعی فارمز کے پراجیکٹس الگ ہیں۔

محترم ہوت شفیع محمد صاحب ایک سیاسی، سماجی اور کاروباری شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی شخصیت بھی ہیں، ان کی ادب سے محبت اور ادبی لوگوں سے خاص تعاون کی وجہ سے انہیں ادبی حلقوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

محترم ہوت شفیع محمد صاحب علم وادب کا سرچشمہ ہیں، اپنے ملک سے محبت کرنے والے انسان ہیں اور اپنی خاندانی اقدار کی نمائندہ شخصیت بھی ہیں۔انتہائی پُرخلوص اور مہمان نواز دوست ہیں۔جو شخص بھی ان سے مل کر آتا ہے، اپنا دل وہیں ہار جاتا ہے۔جب بھی ان سے ملاقات کا شرف ہوا، ان سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔ تیز رفتار دنیا اپنی تیزی میں جو قدریں بھلا بیٹھی ہے، محترم ہوت شفیع محمد صاحب کو مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا۔

محترم ہوت شفیع محمد صاحب کی کتاب کا مسودہ میرے سامنے ہیں جس کا نام ہے "دستور زبان بلوچی"۔ یہ کتاب نہ صرف اس بات کی گواہ ہے کہ محترم ہوت شفیع محمد صاحب ادب سے کتنی محبت کرتے ہیں بلکہ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ انہیں اپنی مٹی، اپنی قوم، اپنی زبان اور اپنے ملک سے کتنی محبت ہے۔

کسی بھی زبان کے دستور یا اصول و ضوابط کو سمجھنا ایک سطحی علم نہیں، بلکہ یہ اچھا خاصا تحقیقی امر ہے۔ ان کی اس کاوش کو دیکھ کر خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کام کو کس لگن، محنت اور نیک دلی سے سرانجام دیا ہے۔

ہم بطور علمی و ادبی گروپ وقارِ پاکستان لیٹر ری ریسرچ فورم، ادب سرائے انٹر نیشنل اور سوشوآن کی طرف سے انہیں ان کے اس عظیم سنگِ میل کے حصول پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید کامیابیاں اور کامرانیاں عطا کرے اور یہ اپنے ملک، اپنے شہر، اپنے علاقے اور اپنے لوگوں کے لیے مزید خدمات سرانجام دیتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام نیک خواہشات پورے کرے۔ آمین

دعاگو: میاں وقارالاسلام

فہرست مضامین

	اسلامی اور مذہبی	
1	اظہارِ تشکر کے چند قطرے	177
2	جب پہلی دفعہ قران پڑھا	178
3	قرانِ مجید کا بہترین شاہکار	180
4	امت معتدل	182
5	زادِ راہ	184
6	آخر ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے	187
7	کیا رب ہم سے ناراض ہے؟	190
8	مکہ اور مدینہ، اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نشانیاں	193
9	وہی میں ہوں	195
10	حرم میں ختم القران	198
11	ابلیس نے ٹھیک کہا تھا	200
12	دنیائے حرم	202
13	خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں سحری و افطاری کا نظام و انتظام	204
14	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللہ	205
15	انسان باکمال خالق کی باکمال تخلیق	209
16	زم زم کے خزانے	210
17	اسلام کی معراج کا دور	212
18	آگے بڑھ جانے والے	214
19	اللہ کے بندے	217
20	مشکل کے ساتھ ہی آسانی ہے	218
21	اللہ کے نور کو پھیلانے کی ضرورت ہے	219
22	کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا	221
23	اعتراف نامہ	223
24	ہم کب راضی ہوں گے	225

25	اسلام اور سلامتی	227
26	ہم خواہشات کے بچاریوں کا کیا بنے گا	229
27	ہماری توقعات ہمیں مایوس کرتی ہیں	230
28	اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں	233
29	ہائے قوم	235
30	مردہ پرستی	237
31	اچھا ہونا اور اچھا نظر آنا	239
32	دن، رات اور نشانیاں	240
33	قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو	240
34	صبر، تحمل، حوصلہ اور امید	246
35	اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں	248
36	جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا کیوں نہیں ہوتا؟	249
37	اللہ کی مرضی	252
38	یادِ یار میں ڈوبے تو کیا ڈوبے	255
39	شیطان کا حربہ	257

اظہارِ تشکر کے چند قطرے

تحریر: میاں وقار الاسلام

خدا نے اپنے علم سے کائنات کی ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے، ہم اس کائنات میں، علم کے وسیع سمندر سے، اپنے رب کی اجازت سے، چند قطرے چن کر لاتے ہیں، یہی قطرے ہمارے ہماری پہچان بنتے ہیں، ہمارے جینے کا مقصد بنتے ہیں، ہمیں راستہ دیکھاتے ہیں اور ہمارے سیکھنے کے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ کبھی یہ ہماری آنکھوں میں خوشی بن کر چمکتے ہیں، کبھی ہماری توبہ کی قبولیت کی وجہ بنتے ہیں، کبھی ہمارے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں اور یوں یہ ہماری شخصیت کو بناتے، سنواتے اور نکھارتے چلے جاتے ہیں۔

اور اگر یہی قطرے ہماری دسترس سے نکل کر دور چلے جائیں، تو احساس دم توڑنے لگتا ہے، سانسیں گھٹنے لگتی ہیں، آنکھیں پتھرانے لگتی ہیں، منظر دھندلانے لگتے ہیں، راستے کھو جاتے ہیں، منزلوں کے نشان بھی باقی نہیں رہتے، زندگی بے راہ روی کی دلدل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ وجود کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور ایسے وجود کی پہچان ایک زندہ لاش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ جیسے ہی موت آئی بھلا دیا گیا۔ یا پھر ایسے یاد رکھا گیا کہ اگر بھلا ہی دیا جاتا تو قدرے بہتر ہوتا۔

شکر ہے اُس پاک ذات کا جس نے ہمیں پیدا کیا، ہمارے مردہ دلوں کو اپنے علم کے نور سے روشن کیا، ہمیں اپنی مخلوقات میں سب پر فضیلت دی، ہمیں سیکھے اور سمجھنے کے قابل بنایا، ہمیں راستے دیئے، ان راستوں پر چلنے کا طریقہ سیکھایا اور منزلوں کے نشان بھی وضع کئے۔ اس کے باوجود بھی ہم ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے ہیں، کبھی کنوئیں میں جا گرتے ہیں، کبھی کھائی میں جا پڑتے ہیں اور وہاں سے بھی جب اپنے رب کو پکارتے ہیں تو وہ ہمیں تمام اندھیروں اور ہر طرح کی گہرائیوں سے پھر نکال لاتا ہے، ہماری حالت درست کرتا ہے اور ہم پر اپنی رحمتیں پوری کرتا ہے اور اپنے فضل سے نوازتا ہے، تاکہ ہم صرف اور صرف اُسی کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلیں جس میں ہماری دنیا اور آخرت کی کامیابی لکھ دی گئی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں اپنے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور اسی پر ثابت قدم رہنے کی توفیق دے۔ امین۔

میاں وقار الاسلام

شہرِ داغدار

جب پہلی دفعہ قران پڑھا

تحریر : میاں وقار الاسلام

جب میں نے پہلی دفعہ قران ترجمے کے ساتھ پڑھا، تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہی قران تھا جسے پڑھ کر صحابہ روتے جاتے تھے، پھر یہ سوچا کہ مجھ پہ تو ایسی کیفیت آئی ہی نہیں، پھر یہی سوچ کر قران دوبارہ پڑھنا شروع کیا، پھر وہ پہلی آیت آ ہی گئ جس پر انتہا کی رقعت قائم ہوئی اور 45 منٹ تک : میں اس آیت سے آگے نہیں بڑھ سکا

پارہ نمبر 4، آیت نمبر 188، سورت ال عمران

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ١٨٨

آپ ہر گز خیال نہ کریں کہ جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں اور اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کئے ان پر ان کی تعریف کی جائے ان کے بارے میں آپ ہر گز یہ خیال نہ کریں کہ وہ عذاب سے چھوٹ گئے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ الفاظ میرے کانوں سے گزرتے اور میرے ماضی اور حال کے حالات میرے سامنے گھومنے لگتے، اگر مجھے کبھی کسی نے دھوکہ دیا، تو اس کے پیچھے جھوٹی تعریفیں ہی نظر آئیں، اور پروفیشنل لائف میں بہتر سے بہتر پرا گرس کے لیے ہمیں یا اپنی کمپنی یا اپنے پراڈکٹس یا اپنی سروس کی خاطر خواہ تعریف کرنی یا کروانی پڑتی۔ میری زندگی کی فلاسفی کو بدلنے کے لیے یہ ایک آیت کافی تھی۔

میں اپنے آپ کو اسی دن سے مسلمان سمجھتا ہوں، اسلام کی روح کیا ہوتی ہے، اللہ کو یاد کیسے کیا جاتا ہے اس کے لیے رویا اور تڑپا کیسے جاتا ہے، میری ذات اس طرح کی کسی بھی کیفیت سے سطحی طور پر بھی ناواقف تھی۔

قران پڑھیئے، دنیا میں ہماری ذات کو جھنجوڑنے کے لیے اس سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اتاری گئی اسی لئے اسے مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے۔

:ایک اور جگہ اللہ فرماتا ہے

:کیا تمہیں پوری زندگی میں اتنا وقت نہیں ملا تھا، کہ ایک دفعہ قران پڑھ لیتے

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو قران پڑھنے ، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے، اور اپنی ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رہنے کی طاقت بھی دے، امین۔

مصنف : میاں وقار الاسلام

تصنیف : بیسٹ لائف نوٹس

قرانِ مجید کا بہترین شاہکار

تحریر : میاں وقار الاسلام

میری ناقص عقل جس چیز کو قرانِ مجید کا بہترین شاہکار سمجھنے پر آمادہ ہے, میں اسے دوستوں سے ضرور شئیر کرنا چاہوں گا

قرانِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر طرح طرح کے مناظرے کئے ہیں، خاص طور پر جب محشر کے دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کرکے میدانِ محشر کر طرف لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قران میں ہر جماعت کے معاملات بیان کئے ہیں، ان جماعتوں میں ایک گناہ گار جماعت شامل ہے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، ایک دوسری جماعت جو پرہزگاروں کی ہو گی جن کے چہرے روشن ہوں گے اور ایک تیسری جماعت جو سب سے آگے بڑھ جانے والی جماعت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان جماعتوں کے آپس میں بحث و تکرار کو بھی قلم بند کیا ہے۔ یہ بحث و مباحثہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

اور جب وہ دوزخ کو اپنے سامنے دیکھ لیں گے اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ اس میں ڈالے جانے والے ہیں تو ہر گناہ گار جماعت طرح طرح کے عذر پیش کرے گی تاکہ کسی نہ کسی طرح دوزخ کے عذاب سے بچ جائے۔ ایک جماعت کہے گی کہ یا اللہ یہ ہمارے بڑے، ہمارے عالم، ہمارے حکمران، ہمارے آباؤاجداد، دوست احباب خواہ کوئی بھی جماعت جس نے ان کو بہکایا ہوگا وہ اس کے بارے میں کہیں گے کہ انہیں دوگنا عذاب دیا جائے کیوں کہ انہوں نے ان کی زندگی اور آخرت تباہ کر دی۔ اللہ فرمائے گا کہ ان کو بھی دگنا عذاب اور تم کو بھی دگنا عذاب تم عقل نہیں رکھتے تھے۔ یوں ہر جماعت اس طرح کے عذر قبول نہیں کئے جائیں گے۔

ایک اور جماعت کہے گی کہ یا اللہ ہم سے ہماری زمینیں، جائیدادیں، جاگیریں، سونا و چاندی، کاروبار، بال، بچے اور اہل خانہ خواہ جو کچھ بھی ان کی ملکیت ہو وہ سب لے لیا جائے اور کسی طرح ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ اس دن صرف اعمال کے سودے ہوں گے اور کسی سے ان کی ملکیت کا کچھ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ ایک اور جماعت یہ کہے گی کہ یا اللہ اگر ہمیں دوبارہ دنیا میں جانا نصیب ہو تو ہم بھی نیک اعمال کریں اور گمراہوں میں نہ ہوں۔ تو ان کی یہ درخواست بھی رد کر دی جائے گی۔ ایک اور جماعت یہ کہے گی کہ یا اللہ ہمیں تو شیطان نے گمراہ کر دیا تھا، تو شیطان جواب دے گا کہ یا اللہ مجھ میں طاقت نہ تھی کہ ان سے کوئی گناہ کروا سکتا میں انہیں دور سے بلاتا تھا اور یہ خود ہی دوڑے چلے آتے تھے۔ تو اس جماعت کا یہ عذر بھی جاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہر گناہ گار جماعت کے ہر طرح کے عذر ان کو واپس کر دیے جائیں گے اور گناہ گار انسان یا جماعت کے ہاتھ میں صرف مایوسی اور بے بسی ہی رہ جائے گی۔

اب گناہ گار انسان یا جماعت کو یہ یقین ہو جائے گا کہ اب سارے عذر ختم ہو گئے ہیں اور بچنے کی کوئی تدبیر باقی نہیں رہی اور اب اس کا ٹھکانہ صرف دوزخ ہے۔ اور جب دوزخ کے داروغہ انہیں دوزخ کی طرف ہانکتے ہوئے لے جا رہے ہوں گے، اور ان کے چہروں پر رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا، اور ان کے دل اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے پھر ہم کلام ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس وقت تمہاری ذات جس قدر بیزار ہو رہی ہے کہ دوزخ میں ڈالی جائے گی، اللہ کی ذات اس سے کئی گناہ زیادہ بیزار ہوتی تھی جب تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کی راہ اختیار کیا کرتے تھے۔

مصنف و مرتب : میاں وقار الاسلام

تصنیف : بسٹ لائف نوٹس

امتِ معتدل

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ نے ہمیں امتِ معتدل بنایا یعنی درمیان والی امت، مطلب، گواہی دینے والی امت، یعنی حق بات کرنے والی امت جو حق بات چاہے لوگوں کو بری ہی کیوں نہ لگے پھر لوگ چاہے اپنے ہوں یا غیر، امیر ہوں یا غریب، مظلوم ہو یا ظالم یا پھر ہماری بات میں ہمارا فائیدہ ہو رہا ہو یا نقصان۔

کتنے بابرکت نام سے ہمیں پکارا گیا، کتنی شان و عظمت ہمیں دی گئی، اللہ نے ہمیں اپنی بے مثال امت کہا ہے۔

بے مثال امت کو اللہ نے عزت کے آسمانوں پر بیٹھا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے کیا

کیا ہم واقعی بے مثال امت ہیں جیسی کہ ہماری تعریف کی گئی، کیا ہم واقعی اس منصب پر بیٹھنے کے قابل ہیں جو منصب ہمیں عطا کر دیا گیا۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اسلام ہمیں ذرے سے ستارہ بنا سکتا ہے، مگر ہماری جہالت کی گرد پھر سے ہمیں بے نور کر دیتی ہے اور ہمارا شمار ذروں میں ہی ہونے لگتا ہے۔

معیاری قوم بننے کے لیے معیار اپنانے پڑتے ہیں، قدر و قیمت اعمال سے ہی بنتی ہے جن کی اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے۔

کاش ہمیں اپنے مقام کا اندازہ ہو سکے، کاش ہم اپنے اوپر سے جہالت کے اندھیرے ہٹا سکیں، کاش ہمیں وہ نور واپس مل سکتے جو ایمان لانے سے ملتا ہے، کاش ہمارے دل ہدایت سے پُر نور ہو سکیں، کاش ہمارا ہر فرد ملت کا ستارہ بن سکے۔

کاش ہم امتِ معتدل بن سکیں جو چھوٹ کو نابود کرتی ہے اور سچ کو پروان چڑھاتی ہے، حق بات کہتی ہے اور حق کا پرچم بلند کرتی ہے۔

ایمان کی حقیقت یہ ہے، کہ ہر طرف ظلم ہو تو رحم کریں، ہر طرف برائی ہو تو اچھائی کریں، ہر طرف ملاوٹ ہو تو ملاوٹ دور کریں، ہر طرف چھوٹ وہ تو سچ بولیں ہر طرف کرپشن ہو تو دیانت داری سے کام لیں۔ مگر اکثر ہم اسلام کے رنگ کو چھوڑے دیتے ہیں جیسے پہننے کا حکم ہے اور برائیوں کو اُڑھ لیتے ہیں جن سے دور رہنے کا حکم ہے۔

آج کا پاکستان ویسا ہی ہے جیسا ہم خود کو آئینے میں دیکھتے ہیں، اور کل کا پاکستان بھی ویسا ہو گا جیسا ہم خود کو مستقبل میں تصور کرتے ہیں۔

تبدیلی کا سفر میں سے شروع ہوتا ہے، میں تبدیل ہو گی تو ہم تبدیل ہوں گے، ہم تبدیل ہوں گے تو پاکستان تبدیل ہو گا

دعا ہے کہ اللہ ہمیں ویسی امت بنائے جس کا خواب ہمارے پیارے پیغمبر نے دیکھا تھا، دعا ہے کہ اللہ ہمیں ویسی مملکت بنائے جس کا خواب ہمارے پیارے قائد نے دیکھا تھا۔

آمین یارب الالمین

میاں وقار الاسلام

زاد راہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہر سفر کے لیے ضروری سامان باندھا جاتا ہے جسے زاد راہ بھی کہتے ہیں تاکہ جب مشکل وقت آئے تو انسان بے یار و مددگار نہ ہو۔ اور تاکہ وہ اپنی منزل مقصود تک آسانی سے پہنچ جائے۔

انسان چاہے چاند پر پہنچ جائے، چاہے زمین کے چکر کاٹتا رہے یا چاہے آسمانوں کی حدوں سے نکل جائے، انسان کی سب سے بڑی مسافت اس کی اپنی زندگی ہی ہے جو اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔

اکثر لوگ موت تک کا سامان بھی نہیں باندھتے جب کہ اصل زندگی تو موت کے بعد ہی شروع ہونی ہے جس کے لیئے شاید بہت سے لوگوں کے ہاتھ خالی ہوں۔

انسان کو دسترس حاصل ہے کہ وہ اپنے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھتا چلا جائے یا پھر برائیاں لکھتا جائے یا پھر دونوں۔ پھر یہ بھی کہ نادم ہو اور توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہے یا مہلت حاصل کرتا جائے۔

انسان کے لیے حدود بھی مقرر کی گئی ہیں جیسے کسی کو کمزور بنایا کسی کو مضبوط بنایا، کسی کو امیر اور غریب میں تقسیم کیا اور اسی طرح مذاہب اور حسب نسب کے حساب سے بھی تقسیم کر دی۔

پھر انسان کے سامنے دنیا کھول کر رکھ دی گئی اور جگہ جگہ نشان لگا دیئے گئے، ماضی کے احوال بھی کھول کر بیان کر دیئے گئے، جنہیں دنیا میں اعلی مقام دیئے گئے ان کا ذکر خیر بھی جاری کر دیا گیا، جو ہدایت کے سیدھے راستے پر تھے اور جنہیں مقام عبرت بنا کر چھوڑا گیا، جو کہ کھلی گمراہی کا شکار تھے انہیں بھی سچائی کے ساتھ قلم بند کر دیا گیا۔

پھر فکر کرنے والوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے مشاہدے میں آنے والی چیزوں پر نظر دوڑائیں، دنیا کے رازوں کو جاننے کی کوشش کریں، ماضی کی امتوں کے احوال پڑھیں جو سند کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور اس صداقت کو پہچانیں جس صداقت کی تصدیق دنیا کا ذرہ ذرہ بیان کر رہا ہے۔

تین چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے آنکھ جو دیکھتی ہے، کان جو سنتے ہیں اور زبان جو بولتی ہے پھر ایک اشارہ اور کیا گیا دل کا جو محسوس کرتا ہے۔

پھر کہا گیا کہ جو آنکھ حق کو دیکھ نہیں سکتی وہ آنکھ اندھی ہوتی ہے اور پھر یہ بھی کہ انکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو شعور کی آنکھ سے دیکھ نہیں پاتے۔

پھر کہا گیا کہ جو کان حق کو سن نہیں سکتے وہ کان بحرے ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی کہ کان بحرے نہیں ہوتے بلکہ دل بحرے ہوتے ہیں جو شعور کے کانوں سے سن نہیں سکتے۔

پھر کہا گیا کہ جو زبان حق کی گواہی نہیں دیتی وہ زبان گونگی ہوتی ہے اور پھر یہ بھی کہ زبان گونگی نہیں ہوتی بلکہ دل گونگے ہوتے ہیں جو شعور کی زبان سے بول نہیں سکتے۔

خوش قسمتی سے ہم کلمہ گو تو ہیں مگر بد قسمتی سے ہم کلمہ ء حق کے عکاس نہیں ہیں۔ شاید وہ اس لیئے کہ ہم اسلام تو لائے ہیں مگر دین حق ہمارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ جب دل کلمہ ء حق کے ساتھ روشن ہو جاتا ہے تو انسان کا پور پور کلمہ ء حق کا عکاس ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہدایت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، مگر ایسا ممکن ہی نہیں کہ انسان ہدایت کے لیے اپنے رب کی طرف سچے دل سے رجوع کرے اور اللہ اسے ہدایت سے محروم رہنے دے، اللہ کا فضل تو بارش کر طرح ہر چیز پر برستا ہے، مگر ہم کم ہی فکر کرتے ہیں۔

جن لوگوں کے دل کسی مرض کی وجہ سے ہدایت قبول کرنے سے معذور ہوتے ہیں ان کے دلوں کی بیماری کا علاج بھی اللہ کی ہدایت بھری کتاب میں موجود ہے، مگر لوگ کم ہی رجوع کرنے والا دل لے کر آتے ہیں۔

مردہ دلوں کی مثال پتھر سی ہے، کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اللہ چاہے تو پتھر کو بھی موم کر دے۔

جن لوگوں کے کانوں میں بہرا پن نہیں ہوتا، جب وہ اللہ کا کلام سنتے ہیں تو ان کے دل دھل جاتے ہیں، ان کے چہروں کی کھالیں نرم پڑ جاتی ہیں، اس طرح رجوع کرنے والی کیفیت سے اللہ جسے چاہتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔

ایک اور جگہ بیان ہوتا ہے کہ ان سے کہ دیجئے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے تو انہیں کہیں کہ قران پڑھا کریں تاکہ ان پر رحم کیا جائے۔

اللہ تو ہم پر رحم کرنا چاہتا ہے، کیا ہم بھی اپنے اوپر رحم کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ خود پر رحم نہیں کرنا چاہتے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور اپنے لیئے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔

منزل ڈھونڈنے والے تو کٹھن راستوں سے گزرتے ہوئے بھی اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں، مگر گمراہ لوگ آسان راستوں میں ہی کھو جاتے ہیں یہاں تک کہ منزل سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی دسترس سے دور نکل جاتی ہے۔

کیا ہم جانتے ہیں کہ ہم اپنے حق میں جو سودا کر رہے ہیں وہ گھاٹے کا ہے یا فائدے کا۔ اگر نہیں تو ہماری جگہ ہمارے لیئے کون آئے گا اور آ کر ہماری فکر کرے گا۔

اے اللہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن سے تو راضی ہوتا رہا نہ کہ ان لوگوں کے جن سے تو ناراض ہوتا رہا۔

دعا گو ہوں کہ جب ہمیں ہمارا زاد راہ، ہمارا اعمال نامہ تھمایا جائے تو اس میں دوزخ کا پروانہ نہ ہو، اللہ ہماری مغفرت فرمائے اور ہم پر اپنا فضل کرم کرے۔ آمین

عنوان: آخر ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ جس کے پاس ہر چیز کا علم ہے، اسی نے ہمیں علم حاصل کرنے کا حکم دیا، اس علم کا جسے وہ لامحدود حد تک جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہم جتنی بھی کوشش کر لیں ایک حد سے زیادہ کا علم ہم حاصل نہیں کر سکتے پھر بھی اس نے ہمیں حکم دیا کہ علم حاصل کرو اور چاہو تو آسمانوں کی حدوں سے نکل جاؤ، اور جب انسان آسمانوں کی حدوں سے نکلا تو اسے احساس ہوا کہ علم کا سمندر کتنا وسیع ہے اور یہ بھی کہ اسے کتنا کم علم دیا گیا ہے۔

علم کے خزانے، چاہے زمین میں ہوں، چاہے ہواؤں میں ہوں، چاہے آسمانوں میں ہوں اور چاہے خود انسان کے اپنے اندر ہوں یہ اس قدر وسعت رکھتے ہیں کہ آج تک بھی انسان اس کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا مگر پھر بھی اسے حکم ہے کہ اپنا سفر جاری رکھے۔

انسان سرپٹ دوڑتا ہی چلا جا رہا ہے، اور نئے سے نئے افق تلاش کرتا جا رہا ہے، چند ہی سالوں میں دنیا تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے، مگر پھر اس دنیا کو تبدیل کرنے والے چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لوگ آ جاتے ہیں، اور پھر سے دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے سرپٹ دوڑ پڑتے ہیں۔

انسان نے کتنا دوڑنا ہے، انسان نے کتنا بھاگنا ہے، ہم کہہ نہیں سکتے کہ 30 سال بعد کا انسان آج کے انسان سے کتنا آگے جا چکا ہو گا، یا 50 سال تک یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ مگر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آج جیسے تو ہرگز ہرگز نہیں ہو گی۔

انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے، اور جس کے لیے وہ محنت کر رہا ہے اللہ اسے اس کی سوچ سے زیادہ نوازتا جا رہا ہے۔ اللہ حکم دیتا ہے کہ اس کا فضل تلاش کر، اور اس کے فضل کی دنیا بہت بڑی ہے ہمیں لگتا ہے کہ ہم نے میلوں کا سفر طے کیا مگر سیکڑوں سالوں بعد بھی انسان آیا ہے تو کہاں آیا ہے۔ ایک طرف اتنا طاقت ور کہ پوری دنیا کو ایک دھماکے سے اُڑا دے اور دوسری طرف اتنا کمزور کہ ایک نہ نظر آنے والی تخلیق نے اس پوری مخلوق کے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ اور ابھی ایسی کروڑوں تخلیقات سے تو پردہ اُٹھنا باقی ہے۔

ہر پردے کے پیچھے ایک نیا منظر ہے، جو انسان کا منتظر ہے کہ کب انسان پردہ اُٹھائے اور نیا منظر اس کے لیے جلوہ گر ہو۔ سال 2020 بھی جب شروع ہوا تو ایک پردہ ہی تھا جو انسان کی آنکھ کے سامنے اُٹھایا گیا اور جو منظر پیش کیا گیا اس نے انسان کو سکتے میں ڈال دیا، کوئی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا کہ اربوں لوگ گھروں میں قید ہو جائیں گے، کروڑوں لوگوں کا روزگار روک جائے گا، لاکھوں لوگ وبا کی لپیٹ میں آ جائیں گی اور ہزاروں لوگ ہر روز لقمہء اجل بن رہے ہوں گے۔

دنیا نے ایک دم سے کروٹ لی، تو ہر قلم کار کے قلم کا رُخ تبدیل ہو گیا، بہت سے لوگوں نے کرونا کا نام بھی نہیں سنا ہو گا، مگر یہ لفظ لاکھوں قلم کاروں کے قلم کی نوک سے رواں ہو گیا اور ابھی تک گھوم گھوم کر ایک ہی عنوان زیر بحث ہے اور وہ ہے کرونا۔

انشاء اللہ جلد وہ وقت بھی آئے گا جب دنیا کے لوگوں کو یاد بھی نہیں ہو نا کہ ایک وبا آئی تھی اور اس کا نام تھا کرونا، نا جانے دنیا اگلی کروٹ کس طرف لے، اور اگلا پردہ جب اُٹھایا جائے گا تو کون سا منظر انسان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

کہتے ہیں کہ درد دل کے واسطے انسان کو پیدا کیا گیا، شاید انسانوں کے دل بے حس ہو چکے تھے اسی لیے مردہ دلوں میں روح پھونکنے کے لیے انسان کی آزمائش کی گئی ہو، مگر انسان بھی عجیب چیز ہے، آزمائش کو بھی کھیلتے ہوئے لیتا ہے، جب تک آزمائش خود اس کے گھر کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیے۔

اللہ نے ہمیں انسان بنایا ہے، ہم نے خود کو انسان رہنے دیا ہے یا پھر حیوان بنا لیا ہے شاید ہمیں یہ آئینہ دیکھانا بھی ضروری ہے۔ ہم مشکل کی اس گھڑی میں اپنی اپنی شکلیں صاف شفاف آئینے میں دیکھ چکے ہیں، کیا ہم نے انسانوں میں چھپے ہوئے حیوانوں کو نہیں دیکھا۔

کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ لوگ ذخیرہ اندوزی کر رہے ہیں جب کہ کھانے پینے کی چیزیں پوری نہیں ہو رہیں، کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ دوائیوں کو چھپا کر مصنوعی قلّت کی جا رہی ہے اور اسے انتہائی مہنگے داموں بیچا جا رہا ہے۔

کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ جو ماسک اور حفاظتی کٹیں امدادی طور پر ہمیں ملی تھیں ان سے وزیروں کے بچے سیلفیاں بناتے نظر آتے ہیں اور وہی مارکیٹ میں مہنگے داموں بیچی جاتی ہیں۔

دوسری طرف ایک روشن پہلو بھی ہے، لوگ رضاکارانہ خدمت کر رہے ہیں، مفت ادویات اور خوراک بھی مہیا کر رہے ہیں، اور ڈاکٹرز جانوں کے نذرانے بھی پیش کر رہے ہیں اور حفاظتی سامان بھی لوگ اپنی اپنی طاقت کے مطابق عطیہ کر رہے ہیں۔

انسان کی زندگی میں اس طرح کے پردے اُٹھتے رہیں گے ، اور جو لوگ نیک ہیں ان کی بھی شناخت ہوتی رہے گی اور جو لوگ برے ہیں ان کی نشاندہی بھی ہوتی رہے گی، آخر ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

عنوان: آخر ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ جس کے پاس ہر چیز کا علم ہے، اسی نے ہمیں علم حاصل کرنے کا حکم دیا، اس علم کا جسے وہ لامحدود حد تک جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہم جتنی بھی کوشش کر لیں ایک حد سے زیادہ کا علم ہم حاصل نہیں کر سکتے پھر بھی اس نے ہمیں حکم دیا کہ علم حاصل کرو اور چاہو تو آسمانوں کی حدوں سے نکل جاؤ، اور جب انسان آسمانوں کی حدوں سے نکلا تو اسے احساس ہوا کہ علم کا سمندر کتنا وسیع ہے اور یہ بھی کہ اسے کتنا کم علم دیا گیا ہے۔

علم کے خزانے، چاہے زمین میں ہوں، چاہے ہواؤں میں ہوں، چاہے آسمانوں میں ہوں اور چاہے خود انسان کے اپنے اندر ہوں یہ اس قدر وسعت رکھتے ہیں کہ آج تک بھی انسان اس کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا مگر پھر بھی اسے حکم ہے کہ اپنا سفر جاری رکھے۔

انسان سرپٹ دوڑتا ہی چلا جا رہا ہے، اور نئے سے نئے افق تلاش کرتا جا رہا ہے، چند ہی سالوں میں دنیا تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے، مگر پھر اس دنیا کو تبدیل کرنے والے چلے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے لوگ آ جاتے ہیں، اور پھر سے دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے سرپٹ دوڑ پڑتے ہیں۔

انسان نے کتنا دوڑنا ہے، انسان نے کتنا بھاگنا ہے، ہم کہہ نہیں سکتے کہ 30 سال بعد کا انسان آج کے انسان سے کتنا آگے جا چکا ہو گا، یا 50 سال تک یہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ مگر ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آج جیسے تو ہرگز ہرگز نہیں ہو گی۔

انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے، اور جس کے لیے وہ محنت کر رہا ہے اللہ اسے اس کی سوچ سے زیادہ نوازتا جا رہا ہے۔ اللہ حکم دیتا ہے کہ اس کا فضل تلاش کر، اور اس کے فضل کی دنیا بہت بڑی ہے ہمیں لگتا ہے کہ ہم نے میلوں کا سفر طے کیا مگر سیکڑوں سالوں بعد بھی انسان آیا ہے تو کہاں آیا ہے۔ ایک طرف اتنا طاقت ور کہ پوری دنیا کو ایک دھماکے سے اُڑا دے اور دوسری طرف اتنا کمزور کہ ایک نہ نظر آنے والی تخلیق نے اس پوری مخلوق کے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ اور ابھی ایسی کروڑوں تخلیقات سے تو پردہ اُٹھنا باقی ہے۔

ہر پردے کے پیچھے ایک نیا منظر ہے، جو انسان کا منتظر ہے کہ کب انسان پردہ اُٹھائے اور نیا منظر اس کے لیے جلوہ گر ہو۔ سال 2020 بھی جب شروع ہوا تو ایک پردہ ہی تھا جو انسان کی آنکھ کے سامنے اُٹھایا گیا اور جو منظر پیش کیا گیا اس نے انسان کو سکتے میں ڈال دیا، کوئی سوچ بھی نہیں

سکتا تھا کہ اربوں لوگ گھروں میں قید ہو جائیں گے، کروڑوں لوگوں کا روزگار روک جائے گا، لاکھوں لوگ وبا کی لپیٹ میں آ جائیں گی اور ہزاروں لوگ ہر روز لقمہء اجل بن رہے ہوں گے۔

دنیا نے ایک دم سے کروٹ لی، تو ہر قلم کار کے قلم کا رُخ تبدیل ہو گیا، بہت سے لوگوں نے کرونا کا نام بھی نہیں سنا ہو گا، مگر یہ لفظ لاکھوں قلم کاروں کے قلم کی نوک سے رواں ہو گیا اور ابھی تک گھوم گھوم کر ایک ہی عنوان زیر بحث ہے اور وہ ہے کرونا۔

انشاء اللہ جلد وہ وقت بھی آئے گا جب دنیا کے لوگوں کو یاد بھی نہیں ہو نا کہ ایک وبا آئی تھی اور اس کا نام تھا کرونا، نا جانے دنیا اگلی کروٹ کس طرف لے، اور اگلا پردہ جب اُٹھایا جائے گا تو کون سا منظر انسان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

کہتے ہیں کہ درد دل کے واسطے انسان کو پیدا کیا گیا، شاید انسانوں کے دل بے حس ہو چکے تھے اسی لیے مردہ دلوں میں روح پھونکنے کے لیے انسان کی آزمائش کی گئی ہو، مگر انسان بھی عجیب چیز ہے، آزمائش کو بھی کھیلتے ہوئے لیتا ہے، جب تک آزمائش خود اس کے گھر کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیے۔

اللہ نے ہمیں انسان بنایا ہے، ہم نے خود کو انسان رہنے دیا ہے یا پھر حیوان بنا لیا ہے شاید ہمیں یہ آئینہ دیکھانا بھی ضروری ہے۔ ہم مشکل کی اس گھڑی میں اپنی اپنی شکلیں صاف شفاف آئینے میں دیکھ چکے ہیں، کیا ہم نے انسانوں میں چھپے ہوئے حیوانوں کو نہیں دیکھا۔

کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ لوگ ذخیرہ اندوزی کر رہے ہیں جب کہ کھانے پینے کی چیزیں پوری نہیں ہو رہیں، کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ دوائیوں کو چھپا کر مصنوعی قلّت کی جا رہی ہے اور اسے انتہائی مہنگے داموں بیچا جا رہا ہے۔

کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ جو ماسک اور حفاظتی کٹیں امدادی طور پر ہمیں ملی تھیں ان سے وزیروں کے بچے سیلفیاں بناتے نظر آتے ہیں اور وہی مارکیٹ میں مہنگے داموں بیچی جاتی ہیں۔

دوسری طرف ایک روشن پہلو بھی ہے، لوگ رضاکارانہ خدمت کر رہے ہیں، مفت ادویات اور خوراک بھی مہیا کر رہے ہیں، اور ڈاکٹرز جانوں کے نذرانے بھی پیش کر رہے ہیں اور حفاظتی سامان بھی لوگ اپنی اپنی طاقت کے مطابق عطیہ کر رہے ہیں۔

انسان کی زندگی میں اس طرح کے پردے اُٹھتے رہیں گے ،اور جو لوگ نیک ہیں ان کی بھی شناخت ہوتی رہے گی اور جو لوگ برے ہیں ان کی نشاندہی بھی ہوتی رہے گی،آخر ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

مکہ اور مدینہ، اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نشانیاں

تحریر: میاں وقار الاسلام

مکہ اور مدینہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ہیں۔ دونوں ہی مقام بچپن سے ہر مسلمان کے ذہن میں تخیل کی جنت بنائے رکھتے ہیں۔ اور ان مقامات کو دیکھنے کی خواہش وقت سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ان مقامات کر طرف روانہ ہو رہا ہو یا وہاں سے واپس آیا ہو، اس سے بھی ملنے کا تجسّس بڑھ جاتا ہے، کہ اس نے جب پہلی نگاہ ڈالی ہو گی تو کیسا محسوس کیا ہوگا، جس جس مقام سے گزرا ہو گا تو اس کی کیفیت کیا ہو گئی اور جب وہاں سے واپس ہوا ہو گا تو کیا ہوا ہو گا۔

انہیں محبتوں سے بھرے ہوئے دل جب مقامِ مکہ یا مقامِ مدینہ پر پہنچتے ہیں تو طرح طرح کی کیفیات سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ لوگ اپنے تجربات بتاتے بتاتے نہیں تھکتے اور سننے والے ان تجربات کو سنتے سنتے نہیں تھکتے۔ اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

ہر مسلمان کی طرح مجھے بھی حسرت تھی کہ دونوں مقامات پر حاضری کی سعادت نصیب ہو جائے۔ مگر سعادت تو تبھی نصیب ہوتی ہے جب حکم آتا ہے۔ سو مجھے بھی حکم ہے اور راستے کھول دیے گئے مشکلیں ہٹادی گئی، اور مجھے اپنے تخیل کی جنت میں اُتار دیا گیا۔ دونوں مقامات کی زیارت کے بعد مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے میری تخیل کی جنت میں ایک باغ ہے، جس کا ایک حصہ مکہ ہے اور دوسرا حصہ مدینہ ہے۔ مکہ کی زیارت کے بعد جب میں مدینہ گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ اب سفر مکمل ہوا ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ مکہ زیادہ اچھا لگا یا مدینہ زیادہ اچھا لگا، میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے دونوں ہی بہت اچھے لگے۔ دونوں کا اپنی اپنی اہمیت اور اپنا اپنا مقام ہے جو اللہ نے رکھ دیا ہے۔ دونوں مقامات کی اپنی ہی کشش ہے۔ جتنا دل مکہ جانے کا کرتا ہے اتنا ہی دل مدینہ جانے کا کرتا ہے، جتنا دل مکہ نا چھوڑنے کا کرتا تھا، اتنا ہی دل مدینہ نہ چھوڑنے کرتا تھا، اور جتنا دل پھر سے مکہ جانے کا کرتا ہے اتنا ہی دل مدینہ دوبارہ جانے کا کرتا ہے۔

جس طرح مکہ میں لوگوں کو اللہ کی یاد میں تڑپتے اور روتے ہوئے محسوس کیا، اسی طرح مدینے میں بھی لوگوں کو صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں تڑپتے اور روتے ہوئے دیکھا۔ اور خود کو بھی اسی طرح کی کیفیت سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دنوں ہی مقامات عشقِ الٰہی اور عشق نبوی منزلیں ہیں جو ظاہری طور پر تو الگ الگ ہیں مگر روحانی طور پر آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ دونوں مقامات کی زیارت کے بعد ہی بے چین دل کے احساس کی تکمیل ہوتی ہے۔ روحانیت کا سفر مکہ سے شروع ہوتا ہے تو مدینہ پر ختم ہوتا ہے۔

اُن دوستوں کے لیے دعا گو ہوں جو سفر میں میرے ساتھ رہے، جو میرے لیے دعائیں کرتے رہے میں بھی ان کے لیے دعائیں کرتا رہا، جن کے نام یاد تھے ان کے نام لے کر دعائیں کی اور جن کے نام یاد نہیں تھی ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کہ جنہیں یاد نہیں کر سکا اللہ ان پر بھی اپنی رحمتیں پوری کرے۔ انسان جتنی دعائیں کرتا ہے مانگنے کر حسرت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے شاید اسی طرح اللہ اپنے بندوں کو اپنے قریب کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میرے مانگنے میں کمی ہو سکتی ہے مگر اللہ کے دینے میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ دینے والی ذات ہے دینا پسند کرتی ہے اور دیتی ہی چلی جاتی ہے۔ اللہ سے مانگتے رہیں، میرا یقین ہے کہ اللہ کسی ہاتھ کو خالی نہیں بھیجتا۔

میاں وقار الاسلام

وہی میں ہوں

تحریر : میاں وقار الاسلام

وہی میں ہوں کہ کمزور ہوں خطاوار ہوں گناہ گار ہوں راہ راست سے بھٹکا ہوا ہوں۔

وہی میں ہوں کہ اس کی نعمتوں سے مالا مال ہوں، کلمہ گو ہوں، مسلمان ہوں، اور وہ جب چاہتا ہے کچھ نہ کچھ اعمال زاد راہ کے طور پر مجھ سے کروا بھی لیتا ہے۔

وہی میں ہوں کہ جب بھٹکتا ہوں تو کئی کئی دن مسجد کا رخ نہیں کرتا، ذکر الٰہی سے بھی غافل ہو جاتا ہوں، نفلی عبادتیں تو دور کی فرض عبادتیں بھی جاتی رہتی ہیں۔

وہی میں ہوں جس پر وہ اپنا فضل کرتا ہے اسے اپنے گھر بلاتا ہے کئی عمروں کی سعادت نصیب کرتا ہے، غلاف کعبہ سے لپٹ کا رونا نصیب کرتا ہے حجرہ اسود کا بوسہ نصیب کرتا ہے اپنے گھر میں اعتکاف کے لیئے مہمان بھی کرتا ہے

وہی میں ہوں کہ جب اس کے گھر سے نکلتا ہوں تو آنکھیں پھیر لیتا ہوں، پاوں بھی ایسے موڑتا ہوں کہ ایک طرف میں اور ایک طرف راہ ہدایت۔

وہی میں ہوں جسے وہ اپنے محبوب کے روضے پر لے جاتا ہے، مسجد نبوی میں مہمان کرتا ہے اور مکہ اور مدینہ کے مقدس مقامات کی زیارت بھی نصیب کرتا ہے۔

وہی میں ہوں کہ اس کی نعمتوں سے مالا مال ہوتا چلا جاتا ہوں اور پھر وہی میں ہوں کہ اتنی نعمتیں حاصل کرنے کے بعد پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا ہوں۔

میں وہی ہوں جس پر اس کے رب کہ نعمتیں بارشوں کی طرح برستی رہتی ہیں اور جیسے ہی بارش رکتی ہے زمانے کی ہوا میرے جسم کو خشک کر دیتی ہے اور میرے بھٹکے ہوئے اعمال مجھے پھر سے جھلسانے لگتے ہیں

میں وہی ہوں جو قران پڑھتا ہوں اس کی ہر بات مجھ پر کھول دی جاتی ہے میرے لیے کیا اچھا ہے کیا برا ہے مجھ پر سب واضع کر دیا جاتا ہے

اور پھر وہی میں ہوں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے انجان ہو جاتا ہوں جو تھوڑی بہت روشنی میرے دل میں اکھٹی ہوئی ہوتی ہے وہ بھی میرے اعمال کی وجہ سے شب تاریک میں ڈھل جاتی ہے۔

وہی میں ہوں کہ نہ صرف اپنے دینی فرائض سے غافل ہوں بلکہ اپنے دنیاوی فرائض سے بھی غافل ہوں

وہی میں ہوں کہ اپنے ماں باپ کا فرمابردار بھی ہوں اور وہی میں ہوں کہ مجھے سے بہت سی نافرمانیاں بھی ہو جاتی ہیں۔

وہی میں ہوں کہ بہت سے معاملات میں بے غرض بھی ہوں اور وہی میں ہوں جس کی غرض بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

وہی میں ہوں کہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہوں اور پھر وہی میں ہوں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی عمل نہیں کرتا۔

وہی میں ہوں کہ جو لوگ مجھے کم جانتے ہیں بڑھ بڑھ کر میری تعریفیں بھی کرتے ہیں اور پھر وہی میں ہوں کہ جو مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں میری ساری کوہتایاں جانتے ہیں اور آئینہ بھی دیکھا دیتے ہیں۔

وہی میں ہوں کہ اپنے اعمال کا احاطہ کروں تو مجھ میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں جس سے میری پکڑ لازمی ہے۔

اور پھر وہی میں ہوں کہ تھوڑے اعمال ہتھیلی پر سجائے پھرتا ہوں اور یقین کیئے ہوئے ہوں کہ میرے کھوٹے سکے دربار الٰہی میں چل جائیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے سارے سکے کھوٹے ہیں پر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا رب ایسا بادشاہ کہ جس کے دربار میں جب فضل کی بارش ہوتی ہے تو کھوٹے سکے بھی چل جاتے ہیں۔

میں وہی ہوں جو جانتا ہے کہ اعمال کے سودے میں سوائے خسارے کے اور کچھ بھی نہیں میں وہی ہوں جو یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بڑے فضل کا مالک ہے۔

میں وہی کو جو بہت کمزور ہے، لاغر ہے، ناتواں ہے، نہ ارادے کا پختہ ہے نہ وعدے کا پختہ ہے، ہدایت پا لینے کے بعد بھی الٹے پاوں مڑ جاتا ہے پھر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے منہ کے بل گرتا رہتا ہے اور پھر اسی خاک ذدہ منہ سے توبہ کے لیئے پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں وہی ہوں جو یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ جس نے مجھے توبہ کے لیئے کھڑا کیا ہے وہ ہر حال میں میری سننے والا ہے۔

تو میں اسی کو سناتا ہوں اور اسی سے مغفرت مانگتا ہوں نہ صرف اپنے لیئے بلکہ ان سب کے لیئے جنہیں میں اپنی دعاوں میں ہمیشہ یاد رکھتا ہوں جن سے میں کسی نہ کسی طرح منسلک ہوں چاہے وہ مجھ سے قریب ہیں یا دور چاہے جو مجھ میں ہیں یا پھر مجھے میں نہیں رہے۔

اس مہینے جس کا نام رمضان ہے بہت فضیلت والا ہے اور اس کی آخری دس راتیں خاص طور پر طاق راتیں بہت اہم ہیں اور سب سے اہم ہے وہ رات جسے اس نے ہزار مہینوں سے افضل کیا ہے۔ اور جس کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔

امید کرتا ہوں کہ وہ اپنے علم سے ہم پر رحمت کرے گا اور ہمارے لیئے آسانیاں فرمائے گا اور ہماری بخشش فرمائے گا۔

آمین، دعا گو، میاں وقار الاسلام

حرم میں ختم القران

تحریر : میاں وقار الاسلام

کل مکہ میں ماہ رمضان کی 29 ویں رات بھی تھی اور الواعی جمعہ مبارک بھی تھا اور اس کے ساتھ ہی ختم القران بھی تھا جس کے بعد خصوصی دعا کروائی گئی۔ خشک موسم تھا مگر آسمان میں بادلوں کی آمد بھی تھی۔

حرم میں روئے زمین پر یقینا مسلمانوں سب سے بڑی اور مقدس دعا یا تقریب جاری تھی، لاکھوں لوگ کانپتے ہاتھوں، بھیگی آنکھوں، سسکیوں اور ہچکیوں سے اپنے رب کو راضی کرنے کوشش کر رہے تھے، ظاہر ہے میری کیفیت بھی ان سے الگ نہیں تھی، پہلی مرتبہ اتنے قریب سے اس طرح کا منظر دیکھنے کو ملا تھا، اسے یقینا لفظوں کا روپ نہیں دیا جا سکتا مگر مجھے بار بار قران کی دو آیات نظر آ رہیں تھیں۔

اول یہ کہ اللہ قران میں فرماتا ہے کہ جنت میں انسان کوئی لغو بات نہیں سنیں گے اور ان کا آپس میں کلام ہو گا اسلام و علیکم

حرم میں لاکھوں لوگ موجود تھے مختلف رنگ و نسل کے اور ظاہری طور پر سب کا کلچر بھی جدا جدا تھا اور انداز بھی الگ الگ تھے سب کا آپس میں زیادہ تر کلام بھی اسلام و علیکم تھا اور یقینا کوئی آپس میں لغو بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ ایک ایسا روح پرور منظر تھا جو کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور جنت کے اس خوبصورت نظارے کی منظر کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس کا ذکر اللہ نے قران پاک میں کیا ہے۔ یقینا اللہ قادر ہے جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔ جو چاہتا ہے دیکھاتا ہے۔

ایک اور آیت کا مفہوم ہے کہ روئے زمین پر تمام لوگوں کی آنکھیں مل کر بھی تمہارے رب کا تدارک یا احاطہ نہیں کر سکتیں میں تمہارا رب ہر آنکھ کا تدارک یا احاطہ کر سکتا ہے۔

حرم میں لاکھوں آنکھوں عشق الٰہی میں ڈوبی اپنے رب کی نظر کرم کی منتظر تھیں یقینا ہم اپنی آنکھ سے اپنے رب کو دیکھ تو نہیں سکتے مگر اپنی کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے سنتا ہے یقینا اس نے تمام آنکھوں کا احاطہ کیا ہوا ہے اور ہر دل کی کیفیت کو باخوبی جانتا ہے۔

اللہ کی شان بہت بلند ہے، حرم کی طرح پوری دنیا میں چھوٹی بڑی دعا یا محفلیں ہوتی رہتی ہیں یا لوگ اکیلے بیٹھ کر بھی رب کی یاد میں گم ہوتے ہیں اور اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں یقینا اللہ دیکھتا ہے سنتا ہے اور ہر آنکھ کا تدارک یا احاطہ کیئے ہوئے ہیں۔

اگر 29 روزے ہوئے تو کل تک سب سے رابطہ بحال ہوگا۔ سب کے لیئے بہت سی دعائیں اور نیک خواہشات، اللہ ہم سب پر اپنا فضل و کرم قائم رکھے، زندگی کا امتحان اور آخرت کا سفر ہم پر آسان کرے اور ہمیں ہمیشہ رہنے والی کامیابی عطا کرے۔ امین

ابلیس نے ٹھیک کہا تھا

تحریر : میاں وقار الاسلام

ابلیس نے ٹھیک کہا تھا تیرے بندوں پر میرا زور نہیں چلے گا۔ یقینا ابلیس کی اوقات ہی نہیں کہ اللہ کے بندوں پر اپنا زور چلا سکے۔

مانا کہ حج اور عمرہ صرف انہیں کے لیئے ہے صاحب حیثیت ہے اور حرم تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مگر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو بے حیثیت لوگ با حیثیت ہو جاتے ہیں اور جنہیں طاقت نہیں ہوتی انہیں طاقت دے دی جاتی ہے، غریب، بوڑھے، لاچار، کمزور لوگ دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں حرم پہنچ جاتے ہیں اور یہ سلسلہ سارا سال رات دن جاری رہتا ہے۔

یقینا شیطان اپنی بے بسی پہ روتا ہوگا کہ جن لوگوں کو اس نے ساری زندگی اپنی ابلیسی زنجیروں سے جکڑے رکھا انہیں جب بھی اللہ کا حکم ہوا کسی نے بھی ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں کی اور اللہ کے گھر پہنچ گئے۔

لاکھوں پروانے دل میں محبت الہی کی شمع جلائے نور ربانی کے دربار میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ جب جماعت کھڑی ہوتی ہے حرم میں قدم رکھنے کی بھی جگہ نہیں بچتی تقریبا ہر جگہ سجدوں کے لیئے مخصوص ہو چکی ہوتی ہے پھر بھی ہزاروں لوگ بچ جاتے ہیں اور حرم سے باہر سڑکوں میں گلیوں میں پارکنگ میں جہاں اور جیسے کی بنیاد پر ماتھا ٹیک دیتے ہیں، مردوں اور عورتوں دونوں کے حالات ایسے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ظاہری کشمکش سے زیادہ لوگوں کی روحانی حالت اور دل کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

یقینا شیطان تو ایسے حالات میں الٹی چارپائی پہ سوتا ہوگا۔

سوتا بھی ہوگا کہ نہیں۔

اللہ کی شان بہت بلند ہے، اللہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے، دنیا کے سب سے گناہگار بندے کو بھی چن لے تو ایک سیکنڈ سے پہلے اس کا دل پھیر دے اور شیطان دیکھتا ہی رہ جائے۔

حرم کے رقعت آمیز لمحات دیکھ کر یقینا شیطان سر پیٹتا ہوگا، کہ کاش وہ انسان کو ایک سجدہ کر دیتا تو روز روز کی ذلالت سے تو بچ جاتا۔

مگر اللہ نے جس کے ساتھ ذلالت چپکا دی سو چپکا دی

شیطان کے ساتھیوں کو سوائے ذلت کو اور کچھ نہیں ملتا دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں شیاطین کے حربوں سے بچائے رکھے اور ہمیں اپنے عزت والے اور مقرب بندوں میں شامل کرلے۔

آمین

دنیائے حرم

تحریر: میاں وقار الاسلام

حرم اپنے آپ میں ایک پوری دنیا ہے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کے پور نور چہرے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں قدم رکھتے ہی انسان یہاں کا ہو جاتا ہے۔ چند دنوں میں ایسے لگتا ہے کہ کہ ہم اسی دنیا کے باسی ہیں اور یہی دنیا ہماری پہچان ہے۔ تمام حوالے مدھم ہونے لگتے ہیں، اور ذہن میں نئی کائنات جنم لیتی ہے، روح ہر وقت عالم طواف میں ہوتی ہے سر سجود میں نظر آتے ہیں جسم مسجود معلوم ہوتا ہے۔ جسم کا پور پور ٹوٹ کر وجود کے اندر ایک نیا سنگم بناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے دل نے ابھی جنم لیا ہے اور نئے نئے احساس اور جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دھڑکنوں کا ڈھنگ بدل جاتا ہے، سانسوں کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ کلمہ حق پہلی مرتبہ دل سے ادا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ بے وقعت ذرہ خود کو بڑا قیمتی محسوس کرنے لگتا ہے جیسے اس کو بارگاہ الٰہی نے چن لیا ہو اور ذرہ خواہش کرتا ہے کہ اے کاش اسے یہیں کہیں چن دیا جائے تاکہ جو رشتہ اللہ کے ساتھ جڑا ہے وہ جڑا ہی رہ جائے۔ اعتکاف کے 5 دن مکمل ہو گئے ہیں میں ابھی سے پریشان ہوں کہ رب کے در کو چھوڑا کیسے جائے۔ میری جبیں جس در پر جھک کر ساتویں آسمان پر پہنچ گئی ہے وہ زمیں پہ واپس کیسے آئے گی۔ دنیائے حرم کا مہمان جو خود کو یہاں کا باسی تصور کرنے لگا تھا اب وہ واپس اپنی دنیا میں کیسے جائے گا۔ یقیناً یہ معاملہ کسی بھی دل کے لیئے آسان نہیں ہوتا۔

تجلّیوں کی چوکھٹ سے اندھیروں کی طرف واپسی کا سفر بڑا ہی کٹھن ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ آپ سے آپ کی ساری کائنات چھننے والی ہے، پھر سے آپ کی روایتی پہچان آپ کو واپس ملنے والی ہے۔ مان اور مرتبہ آپ سے واپس لے لیا جائے گا۔ آپ سارے اختیار ختم ہو جائیں گے۔ اللہ کے گھر آنے کی جو حسرت آپ کے دل میں تھی، پھر سے وہی حسرت رہ جائے گی، مگر اب کی بار اس حسرت کی شدت کئی گناہ بڑھ چکی ہو گی۔ لوگ حرم سے ہو کر تو چلے جاتے ہیں مگر ایک عجیب سی تڑپ آپ کی روح میں اتر چکی ہوتی ہے۔ جب میزبان خدا کی ذات ہو تو وہ آپ کو اپنے گھر سے خالی ہاتھ کیسے جانے دے گی۔ دوبارہ آنے تڑپ وہ قیمتی تحفہ ہے جو آپ کو اللہ کے گھر جا کر نصیب ہوتا ہے۔ اور یہ عمدہ مہمان نوازی کا کھلا ثبوت ہے۔

دنیائے حرم کو سلام ہے، حرم اس زمین کا ایسا روشن ٹکڑا ہے جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ دنیائے حرم اللہ کی تجلّیوں سے آباد ہے اور یہ نور ایسا ہے کہ روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ جن آنکھوں نے ہمیشہ اندھیرا ہی دیکھا ہو وہ یہاں آتے ہی چندھیا سی جاتی ہیں، دیر سے ہوش آتا ہے کہ گناہ گار بندے کے ساتھ معاملہ کیا پیش آیا۔

اعتکاف کا سفر جاری ہے آپ سب کے لیئے دعاوں کا سفر بھی جاری ہے اللہ آپ سب کو اپنی آمان میں رکھے، اعتکاف کے بعد سب سے رابطہ ہو گا۔

خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں سحری وافطاری کا نظام وانتظام

تحریر: میاں وقار الاسلام

آج کل کے دور میں جہاں ہمیں ساری برائیاں ہی مسلمانوں میں نظر آتی ہیں وہاں کچھ ایسی روایتیں ابھی تک پوری آب وتاب سے زندہ ہیں جس سے انسانیت کی خدمت بھی ہوتی ہے اور ثواب کا حصول بھی۔

جیسے ہی ماہِ رمضان شروع ہوتا ہے خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کی رونقیں آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔ دنیا بھر سے لوگ عمرہ اور اعتکاف کی نیت سے خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کا رُخ کرتے ہیں۔

جس جوش اور جزبے سے لوگ یہاں پہنچتے ہیں اس سے کہیں زیادہ جذبے سے یہاں کے لوگ ان کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مہمان نوازی کا حق ادا کرے۔ مہمان نوازی صرف خانہ کعبہ اور مسجد نبوی تک محدود نہیں ہوتی بلکہ پورے سعودی عرب میں یہ سلسلہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔

خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، باقاعدہ گروپس بنتے ہیں کئی کئی لوگوں کو ملازمت پر رکھا جاتا ہے جن کا کام صرف سحری اور افطار کا خاطر خواہ بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ اکثر مقامی لوگ رمضان کے آخری دس یا پندرہ دنوں کی چھٹیاں لے لیتے ہیں اور خانہ کعبہ میں یا پھر مسجد نبوی میں جا کر اپنی ٹیم کے ساتھ سحری اور افطاری کا انتظام کرتے ہیں۔

دسترخوان لگ جاتے ہیں، سب کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے مہمان بنے اور انہیں خدمت کا موقع دیں۔ پوری دنیا سے مسلمان ان لوگوں کے جوش اور جذبے سے متاثر ہو کر جاتے ہیں۔ اور انتہائی خوبصورت یادیں ان کے سفر کا حصہ بنتی ہیں۔

جو لوگ صاحبِ توفیق ہوتے ہیں باقاعدہ اس کارِ خیر کے حصہ دار بن جاتے ہیں اور پوری دنیا سے اس نیک کام کے لیے لوگ اپنا اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں اور انتظامی معاملات بہتر سے بہتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پوری دنیا سے ہزاروں لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی میں سحری اور افطار کا انتظام میں اپنا باقاعدہ حصہ ڈالتے ہیں اور مقامی لوگوں کا پہلے سے ہی اس میں اپنا حصہ ہوتا ہے جو باہر سے آنے والے فنڈز سے اور مستحکم ہو جاتا ہے اور وہ اسے باخوبی سرانجام دیتے ہیں۔

حال ہی میں میرا کچھ ایسے دوستوں سے رابطہ ہوا جنہوں نے اس سارے طریقہ کار کی تفصیل شئیر کیں۔

مسلمانوں میں اچھی روایتیں کم ہوتی جا رہیں، انہیں زیادہ سے زیادہ پروان چڑھنا چاہیے اللہ تعالی ہمیں زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کا موقع دے امین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عنوان : لاالٰہَ اِلّاَ اللہ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ اللہ

تحریر : میاں وقار الاسلام

عنوان : لاالٰہَ اِلّاَ اللہ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ اللہ

نہیں ہے کوئی معبود (حاجت روا) سوائے اللہ کے محمدؐ اللہ کے رسول ہیں

اس کلمہ کا سمجھ کر زبان سے اقرار اور دل سے یقین کرنے والا ایمان والا اور پوری زندگی میں اللہ و رسولؐ کے احکام پر مرتے دم تک عمل کرنے کی کوشش کرنے والا مسلمان ہے۔

اسلام ''سَلَمَ'' جس کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے علاوہ امن و چین کے بھی ہیں، یعنی مسلمان اپنی زبان اور ہاتھ سے دوسرے کو ناحق نقصان و تکلیف نہیں پہنچا سکتا اگر کوئی مسلمان اس کی خلاف ورزی کرتا ہو تو وہ اللہ کے پاس مسلمان نہیں۔ کیونکہ اللہ نے عمل اور اس کی جزا کا جو قانون بنایا ہے وہ بے حد اٹل ہے۔

غلطی پر توبہ 'کفّارہ' معافی کی التجا اور اصلاح کی کوشش کرتے رہنا ہی ''حقیقی مسلمانی'' ہے۔ کلمہ کا اقرار کرتے ہی مرنے والا جنّتی ہے۔ احکام کے خلاف خواہشاتِ نفس پر چلنے والا مشرک ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلّاَ اللہ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ اللہ یہ صرف کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقدس رشتہ ہے جس سے جڑے رہنا جنت کے حصول کا واحد رستہ ہے اور جس سے ٹوٹ کر دوجا گرنا جہنم کے رستے پر چلنے کے مترادف ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلّاَ اللہ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ اللہ یہ صرف کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک سیدھی راہ ہے، اور جو اس سیدھی راہ سے بھٹک گیا پھر اس کی منزل جہنم ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلّاَ اللہ مُحَمَّدُ الرَّسُولُ اللہ یہ صرف کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی، کچھ پیغمبروں کے والدین بھی یہ کلمہ نصیب نہیں ہوا اور کچھ کی اولاد کو یہ کلمہ نصیب نہیں ہوا۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللہ یہ صرف کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقدس رشتہ ہے جو ایک مسلمان کو اپنی ماں اور اپنے باپ سے زیادہ عزیز ہے، اپنی اولاد اور اپنے دوستوں سے زیادہ عزیز ہے یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللہ یہ صرف کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ یقین ہے دوبارہ جی اُٹھنے کا اور پھر ہمیشہ کی زندگی کا۔ اسی لیے کوئی بھی مسلمان اپنے ایمان کا سودا نہیں کرتا اپنے کلمہ حق کا سودا نہیں کرتا۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللہ یہ صرف کلمہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بیش قیمت خزانہ ہے جو ہماری سانسوں سے قیمتی ہے اور ہماری دھڑکنوں سے مہنگا ہے۔ بہت سے مسلمان اس دنیا میں مظالم سہتے سہتے شہید ہو گئے مگر اس کلمے سے نہیں پھرے، بہت سے لوگوں نے اپنے ملک چھوڑے اپنی زمینیں چھوڑیں اپنے قرابت والے اور رشتے دار چھوڑے، اپنی اولادیں اور اپنے خاندان تک چھوڑ دیے یہاں تک کے جان کے نذرانے پیش کرتے رہے مگر اپنے کلمہ حق کا سودا کبھی نہیں کیا۔

آج ہندستان میں حق و باطل کی لڑائی جاری ہے جہاں مسلمان کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ ہندیوں کا مشرکانہ اور گمراہ کن کلمات ادا کر دیں۔ مگر کسی بھی مسلمان کے لیے وندے ماترم کو ماننا کسی بھی طرح سے ممکن ہی نہیں۔

وندے ماترم کا نغمہ ۱۸۷۵ء میں لکھا گیا، لیکن ابتدا میں اسے کوئی شہرت نہ مل سکی، بلکہ وہ ایک عرصہ تک گوشہ گمنامی میں پڑا رہا، اس نغمہ کو شہرت تب ملی جب اس کے تخلیق کار بنکم چٹرجی نے اسے اپنے ناول آنند مٹھ میں شامل کیا، یہ ناول بنیادی طور پر مغل حکمرانوں سے ہندوؤں کی جنگ کے موضوع پر ہے، یہ ایک مسلم مخالف ناول ہے جو فرضی کرداروں پر مشتمل ہے، اس کا مرکزی کردار بھوانند نامی ایک برہمن سنیاسی ہے، جو ہندوؤں کو مغل حکمرانوں کے خلاف اُکساتا ہے۔

اس ناول کے کرداروں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناول نفرت اور فرقہ پرستی سے لبریز ہے، ناول کا وہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے، جس میں بھوانند ایک دوسرے کردار جس کا نام مہندر ہے سے کہتا ہے: ”ہمارا مذہب، ہماری ذات، ہمارا وقار خطرے میں ہے اور جب تک اس ملک میں مسلمان رہیں گے ہم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکیں گے“ مہندر کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا تم تنہا مقابلہ کروگے؟ بھوانند کہتا ہے: ”جب تین کروڑ آوازیں بلند ہوں گی اور دو کروڑ بازوؤں میں لہراتی تلواریں ہوں گی تو کیا تب بھی میری ماتا کمزور ہوگی، مہندر کو تب بھی اطمینان نہیں ہوتا تو وہ اسے لیکر آنند مٹھ مندر جاتا ہے جہاں درگا اور کالی کی مورتیوں کے سامنے اس کے جذبات برانگیختہ کرتا ہے، اور جوش دلاتا

ہے،اس ناول کے ایک اور منظر میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جو وندے ماترم کا نعرہ لگاتے ہوئے آپس میں سوال کرتے ہیں کہ وہ دن کب آئے گا جب ہم مسجدوں کو مسمار کرتے ہوئے ان مقامات پر مندر تعمیر کرنے میں کامیاب ہوں گے، نیز اس ناول سے انگریز اور ان کی حکومت سے وفاداری کا بھی خوب اظہار ہوتا ہے۔

چنانچہ ناول کا مرکزی کردار بھوانند اپنے ساتھی سے کہتا ہے کہ اب ہماری جان ومال کو امان ملے گی، کیوں کہ مغل حکمرانوں کی جگہ پر انگریز آئے ہیں۔آنند مٹھ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس ناول سے بنکم چندر چٹرجی کا مقصود ہندوستانی قومیت کو فروغ دینا نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانا تھا۔

نیرج سی چودھری اپنی کتاب ''آٹو بائیو گرافی آف این نان انڈین''میں لکھتے ہیں: ''بنکم چندر چٹرجی اور رمیش چندر کی تاریخی تصانیف میں مسلم حکومت کے خلاف ہندو بغاوت کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے، اور مسلمانوں کو نامناسب ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ وندے ماترم میں کیا پیش کیا گیا ہے؟ تو اس پر روشنی ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وندے ماترم کا ترجمہ پیش کیا جائے، تاکہ ترجمہ دیکھ کر ہر شخص اس میں پیش کئے گئے مواد کو راست طور جان سکے، ذیل میں جو ترجمہ دیا جارہا ہے وہ اورنگ زیب ملک کا ہے جو ان کے تحقیقی مقالہ ''بر صغیر میں قومی ترانے -تاریخ واثرات''میں شامل ہے۔

وندے ماترم''۱- میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں اچھے پانی، اچھے پھلوں، بھینی خنک، جنوبی ہواؤں اور شاداب کھیتوں والی میری ماں ۲-'' حسین چاندی سے روشن رات والی شگفتہ پھلوں والی، گھنے درختوں والی میٹھی ہنسی، میٹھی زبان والی سکھ دینے والی، برکت دینے والی میری ماں ۳- تیس کروڑ گلوں کی پرجوش آوازیں ساٹھ کروڑ بازوؤں میں سنبھلنے والی تلواریں کیا اتنی طاقت کے ہوتے ہوئے بھی اے ماں تو کمزور ہے تو ہی ہمارے بازوؤں کی قوت ہے میں تیرے قدم چومتا ہوں تو دشمن کے لشکر کی غارت گر ہے میری ماں ۴- تو ہی میرا علم ہے، تو ہی میرا دھرم ہے تو ہی میرا باطن ہے، تو ہی میرا مقصد ہے تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے تو ہی بازوؤں کی طاقت ہے دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے تیری ہی محبوب مورتی ہے ایک ایک مندر میں ۵- تو ہی درگا دس مسلح ہاتھوں والی تو ہی کملا ہے کنول کے پھولوں کی بہار تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ور کرنے والی میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں اچھے پانی اچھے پھلوں والی میری ماں میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں وندے ماترم
ناقابل قبول کیوں؟

ترجمہ کو غور سے پڑھئے پھر خود فیصلہ کیجئے کہ کیا کوئی مسلمان اس ترانے کو پڑھنے کے بعد اپنے دین وایمان پر باقی رہ سکتا ہے؟ترانے میں واضح الفاظ میں وطن کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے جب کہ اسلامی عقیدے کے مطابق لائق عبادت تو خدائے وحدہ لاشریک لہ ہی ہے، اس کے علاوہ کسی کی پرستش کی قطعی اجازت نہیں

اسی طرح اس کا ایک بندیوں ہے: ''تیری ہی محبوب مورتی ہے ایک ایک مندر میں''، ''میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں''، ''سکھ دینے والی برکت والی اے میری ماں'' ان مصرعوں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس ترانے میں جگہ جگہ شرکیہ الفاظ ادا کئے گئے ہیں۔

وندے ماترم کے تعلق سے دارالعلوم دیوبند کے فتوے کا یہ حصہ بھی لائق ملاحظہ ہے: ''اس گیت میں مندروں کی تمام مورتیوں کو خاک وطن کا عین قرار دیا گیا ہے، اور یہ خالص مشرکانہ نظریہ ہے، نیز اس گیت میں خاک وطن کو دُرگا دیوی اور کملا دیوی فرض کیا گیا ہے جو قطعاً شرک ہے، اور اس گیت میں خاک وطن ہی کو دھرم قرار دیا گیا ہے جب کہ ایک مسلمان کا دھرم صرف اسلام ہے اور اس گیت میں خاک وطن کے سامنے وندنا کی جاتی ہے، یعنی سر جھکا کر ہاتھ جوڑ کر سلام کیا جاتا ہے، یہ بھی اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے، بادشاہ روم کے دربار میں رکوع کی طرح سر جھکا کر داخلہ سے انکار کرتے ہوئے ایک صحابی نے فرمایا تھا کہ مجھے کافر کے سامنے رکوع کی طرح سر جھکانے میں رسول اللہ ﷺ سے شرم آتی ہے کہ میں آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

انسان باکمال خالق کی باکمال تخلیق

تحریر: میاں وقار الاسلام

میں نے برے سے برے انسان میں بھی کئی اچھائیاں دیکھی ہیں جو سطحی طور پر نظر نہیں آتیں اور میں نے اچھے سے اچھے انسان میں بھی برائیاں دیکھی ہیں جو سطحی طور پر نمائیاں نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر بندے کو انمول بنایا ہے انسان اپنی محدود کمال آنکھوں سے اللہ کے بنائے ہے باکمال انسان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ انسان تو اپنے کمال کا احاطہ نہیں کر سکتا تو دوسروں کے کمال کا احاطہ کیسے کرے گا۔

پوری دنیا کے انسان مل کر بھی ایک انسان کا احاطہ نہیں کر پائے انسان کے جسم کے ایک ایک پور پر تحقیق جاری ہے اور روز روز ان کے کمالات سامنے آتے رہتے ہیں۔

اتنے نایاب حضرتِ انسان کو ہم بے وقعت و بے حرمت کیسے کر دیتے ہیں، انسان کے پورے وجود میں جو اس کا دل ہے اس کی اہمیت مرکزی ہے، دل کو وہ کمال حاصل ہے کہ وہ جسم کے جس حصے تک خون کی سپلائی بند کر دے وہ حصہ مردہ ہو جاتا ہے۔

اتنا طاقتور دل جس کے بھروسے پر انسان پوری زندگی گزار دیتا ہے، اس کی حقیقت دیکھی جائے تو اس کا ٹوٹنا ایک معمولی سے لمحے کی بات ہے، ایک چھوٹا سا جھٹکا اور بس اس کی ساری طاقت ختم، ہر دل اللہ کے حکم سے ڈھرکتا ہے، جس دن حکم ختم اس دن دل کی دھڑکن بند۔

ہمارے لہجے اور رویے دلوں کی رفتار کو بدل دیتے ہیں، اور ہماری وجہ سے اللہ کی ایک باکمال تخلیق لرزش میں آ جاتی ہے۔

اور ہماری زبان کو یہ کمال حاصل ہے کہ ہم میٹھے بول سے مردہ دلوں کو زندہ کر سکتے ہیں اور زندہ دلوں کو مردہ بھی کر سکتے ہیں۔

خدا کرے کہ ہمارا معاشرہ محبتوں کا معاشرہ بنے جہاں ایک دل سے دوسرے دل تک محبت کا راستہ تو جاتا ہے۔۔۔

زم زم کے خزانے

تحریر : میاں وقار الاسلام

حضرت انسان جہاں جہاں پاوں مارا وہاں وہاں رب کے خزانے نکلے ، کہیں پانی نکلا، کہیں تیل نکلا، کہیں سونا نکلا، کانوں میں گیا تو ہیرے نکلے ، سمندر میں گیا تو موتی نکلے ، زمین پھاڑی تو طرح طرح کا اناج نکلا، پہاڑ توڑے تو بھی چشمے پھوٹے ، آسماں کی طرف دیکھا تو رحمت برسی، سوچنے بیٹھا تو علم کا نور پایا، خود کو پہچانا تو اپنے خالق کے گماں میں کھو گیا۔

نہ زم زم کا چشمہ تھمانہ زم زم کے خزانے رکے۔ وقت گزرتا گیا اور انسان اللہ کی رحمتوں سے مالا مال ہوتا چلا گیا۔ آج کا انسان کسی بھی دور کے انسان سے زیادہ نعمتوں کا حصول رکھتا ہے، خدا کی نعمتوں کی فراوانی ہے کہ بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ چند ہی سالوں میں ایسی ایسی سہولتیں عام انسان تک بھی پہنچ جاتی کہ خاص انسانوں نے بھی شاید اس کا کبھی تصور بھی نہ کیا ہو

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نعمتوں کا بے بہا حصول انسان کو اپنے خالق کے اور قریب کرتا، مگر انسان کو آج بھی جو حاصل ہوتا ہے اسے لگتا ہے کہ اس نے محنت کی اور پالیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے انسان کے لیئے خزانوں کا بندوبست کیا گیا تھا اور وقت بھی طے کیا گیا تھا کہ کب کسے کس چیز سے نوازنہ ہے اور کس پر اپنی رحمت پوری کرنے ہے، مگر انسان گھاٹے میں ہے

انسان کی عمر بھی کی کمائی ایک ایسی قوم کو منتقل ہو جاتی جس قوم کو نہ اس نے دیکھا ہوتا نہ جانا ہوتا ہے۔ اور زم زم کے خزانے یوں ہی ان لوگوں تک پہ پہنچتے رہتے ہیں جن کا ان خزانوں پر نام لکھا ہوتا ہے

نا جانے کون کون سا خزانہ کہاں کہاں سے چلتا پھرتا بغیر کسی محنت کے ہم تک آ پہنچتا ہے اور اسے ہم اپنا حق سمجھ کر لے لیتے ہیں لیکن اس زم زم کے چشمے کے مالک کا شکر ادا نہیں کرتے جو ان چشموں کو بند کرنا یا ان کے رخ موڑنے پر قادر ہے۔

اللہ ہمیں اپنے شکر گزار بندوں میں شامل کرے اور ہمیں ناشکروں جیسا نہ بنائے آمین۔

اسلام کی معراج کا دور

تحریر : میاں وقار الاسلام

جب اسلامی شریعت کو رائج کرنے کی بات آتی ہے، سب سے پہلے تو کاروباری اور سیاسی دیوتا اس کی رہ میں رکاوٹ بنتے ہیں کیوں کہ اس سے انہیں دونوں طبقات کا سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے، کاروبار والوں کو کاروبار خطرے میں نظر آتا ہے اور سیاست دانوں کو سیاست خطرے میں نظر آتی یہ اس لیے کہ دونوں کی اصول اسلام پر مبنی نہیں ہیں اور انہیں شریعت کے رائج ہونے سے باہمی ٹکراؤ کی صورتِ حال نظر آتی ہے۔

دوسری طرف ہمارے فرقہ پرست لوگوں کی یہ کوشش رہتی ہے کہ اگر شریعت کبھی رائج بھی ہو تو اسلام کی شریعت رائج نہ ہو بلکہ ان کے فرقے کی شریعت رائج ہو، کیوں کے اگر صحیح معانوں میں اسلام کی شریعت رائج ہو جائے تو تمام فرقوں کو اپنے اپنے بچاؤ کی جنگ لڑنی پڑ جائے گی سو انہیں بھی شریعت کے رائج ہونے سے باہمی ٹکراؤ کی صورتِ حال نظر آتی ہے۔

اسی لیے شریعت کو ہی مشکل بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے جب کہ مشکل شریعت کی طرف سے نہیں بلکہ مشکل انہیں طبقات کی طرف سے ہے جو شریعت کو رائج نہیں ہونے دینا چاہتے۔

پھر مثال دی جاتی ہے کہ وہ پرانا دور تھا، لوگ پہاڑوں میں رہتے تھے، گھوڑوں پر سواری کرتے تھے اور جنگی ساز و سامان بھی پرانی نوعیت تھا، اور اسلامی سزائیں انتہائی سخت تھیں ان کو رائج کرنا آج کے دور میں بہت مشکل ہے اور اس طرح کی ہزاروں باتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ صرف شریعت سے جان چھڑانے کے بہانے ہیں، حالانکہ شریعت ان کی جانوں پر ظلم نہیں کرتی بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

گھوڑوں اور نیزوں کا دور اسلام کی معراج کا دور تھا، معاشرے انصاف پر قائم تھے، پوری دنیا میں اسلام کا رعب تھا۔ وہ دور ہمارے لیئے مشعل راہ ہے اور وہ ایک اعلی ترین دور تھا، اس وقت کے گھوڑے آج کے میزائل اور ٹائم بم سے زیادہ رعب رکھتے تھے اس وقت کے مسلمان اعلی ترین مسلمان تھے جنہوں نے دنیا میں دین کی حاکمیت قائم کی اور اپنا رعب برقرار رکھا جنگیں صرف فوجی اسلحے اور بارود سے نہیں بلکہ جذبے سے جیتی جاتی ہیں۔ اس وقت کے منصف اعلی منصف تھے۔ اس دور کی سنہری بنادیں کامیاب معاشرے کی روح تھیں۔ وہ سنہرا دور جہالت کا دور نہیں تھا بلکہ آج کا دور جس کی روشنیوں سے آنکھیں اندھی ہوتی جا رہی ہیں یہ جہالت کا دور ہے اور اس کی جہالت کو دور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس سنہرے دور کے کامیاب اصول اس جدید دور میں رائج کیے جائیں۔ انہیں اصولوں پہ اسلام نے ترقی کی تھی اور جب سے وہ اصول ختم کیے گئے ہیں اسلام ایک قدم آگے نہیں بڑھا۔ ہم تعداد میں زیادہ سے زیادہ ہوتے گئے ہیں اور ہمارا رعب بڑھنے کی بجائے گھٹتا گیا ہے۔

ہم نے قران اور سنت کو پیچھے رکھ کر دیکھ لیا ہے، پوری دنیا کی ترقی کی کسی دوڑ میں ہم شامل نہیں ہیں۔ جب کہ قران اور سنت ہمیں جدید دور کی طرف لے کر جاتی ہے، اللہ فرماتا ہے کہ اپنے گھوڑے تیار رکھو، اس سے مراد جانور نہیں بلکہ جو بھی جنگی ساز و سامان ہو سکے چاہے آج کے

مزائل ہوں یا پھر بم، اسی طرح اللہ فرماتا ہے کہ آسمان کی حدوں سے آگے نکل جاؤ اور زور کے سوا تو تم نکل نہیں سکتے۔ اسلام ہمیں نئی سے نئی چیزیں مسخر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس کی کئی مثالیں قران و حدیث میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

شریعت کے جدید اصول اپنانے کی وجہ سے ہی اسلام پوری دنیا میں غالب آیا تھا، اور شریعت کو پشت پیچھے ڈالنے کی وجہ سے ہی ہم مغلوب ہوئے اور ہمارے لوگ اپنے اپنے ملکوں میں مغلوب ہو گئے یہاں تک کہ ہم اپنے خاندان اور اپنے گھر میں بھی مغلوب ہیں، ہمیں ہر سطح پر غالب آنے کے لیے پھر سے شریعت کے معراج کی طرف سفر جاری کرنا پڑے گا اس کے علاوہ جتنے بھی راستے ہیں وہ دھوکے کا سامان ہے اور باطل کو مضبوط اور خود کو کمزور کرنے کی کھلی راہ ہے۔

اللہ ہمیں ہدایت دے کہ ہم اس کی دی ہوئی ہدایت کو رائج کر سکیں۔

امین۔ دعا گو

میاں وقار الاسلام

آگے بڑھ جانے والے

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ تعالی قران میں فرماتا ہے کہ روز محشر انسانوں کی جماعت تین طرح کے لوگوں میں تقسیم ہو گی ایک جماعت بائیں ہاتھ والی دوسری جماعت دائیں ہاتھ والی اور تیسری جماعت آگے بڑھ جانے والی اور پھر آگے بڑھ جانے والی جماعت کی تعریف بھی کی جاتی ہے کہ کیا ہی کہنے آگے بڑھ جانے والوں کی

دیکھا جائے تو یہی جماعتیں ہمیں زندگی کے میدان میں بھی نظر آتی ہیں۔ ہمیں تین طرح کے رستے ملتے ہیں آسان، مشکل اور انتہائی کٹھن۔ جو لوگ دنیا میں اپنے آپ کو منوانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے وہ انتہائی کٹھن راستے کا انتخاب کرتے ہیں پھر اس رستے پر چلتے ہیں اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔

اللہ کی رحمت نہ ماننے والے پر بھی برستی ہے ماننے والے پر بھی برستی ہے اور سب سے زیادہ اس کی راہ میں محنت کرنے والے پر برستی ہے۔

میرے ایک استاد کا کہنا تھا کہ وقار تمہارا اور میرا ایمان تو دو فاقوں کی مار ہے۔

وہ بالکل صحیح فرماتے تھے کہ ہم نے کبھی ایسی مشکلات کا سامنا ہی نہیں کیا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم بھی انتہائی کھٹن راستوں کے مسافر ہیں۔

قران میں بھی ایک جگہ پر فرمایا جاتا ہے کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ جنت میں یونہی داخل کر دیئے جاوگے، ابھی تم لوگوں پر پہلے لوگوں جیسی آزمائشیں تو آئی ہی نہیں

ہو سکتا ہے کہ ہم نے مشکل راستے کا انتخاب کیا ہو مگر کھٹن راستوں کا انتخاب بہت کم لوگ کرتے ہیں اور پھر انہیں پر آزمائشیں اترتی ہیں، وہی قربانیاں دیتے ہیں اور انہیں پر صبر کے دھانے کھول دیئے جاتے ہیں۔

اور پھر وہی ہوتے ہیں جو اللہ کا حقیقی معنوں میں قرب حاصل کرنے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اور پھر یقیناً انہیں لوگوں کو اللہ کا خاص قرب نصیب ہوگا اور انہیں کے درجات سب سے بلند ہوں گے۔

آگے بڑھ جانے والوں کی مثال ایسی ہے کہ ان جیسی کوئی مثال نہیں۔ اللہ نے انسان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے مگر کم ہی لوگ اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگا پاتے ہیں اور کم ہی لوگ اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔

ایک جگہ فرمان ہوتا ہے کہ اگر تم چاہو تو آسمان کی حدوں سے نکل جاو اور زور کے سوا تو تم نکل ہی نہیں سکتے۔ جنہوں نے کائنات کو مسخر کیا ہے آج وہ پوری دنیا میں اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب رہے ہیں۔

اللہ کے قوانین ایسے ہی ہیں جو جس قدر محنت کرتا اسی قدر اس کا نصیب بھی کھول دیا جاتا ہے پھر چاہے وہ مسلمان ہو چاہیئے وہ غیر مسلم ہو اللہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور انہیں ان کی محنت کا صلہ ملتا رہتا ہے۔

ایک اور جگہ یوں بیان ہوتا ہے کہ لوگ وسائل کم ہونے کا شکوہ کریں گے تو اللہ فرمائے کا کیا تم نے میری زمین کو فراغ نہیں پایا تھا کہ چل پھر کر دیکھ لیتے۔

ایک اور جگہ بیان ہوتا ہے کہ اپنے گھوڑے تیار رکھو یہ صرف اس لیئے نہیں کہ آپ کو جنگ کرنی ہے بلکہ یہ اس لیئے کہ آپ کو زندگی کے کسی میدان میں محتاجی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اسی محتاجی کی وجہ سے رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

محنت کرنے والوں کو دنیا میں بھی ان کی محنت کا صلہ ملتا ہے اور آخرت میں بھی ان کا صلہ اللہ کے ہاں تیار ہے۔

جب تک مسلمان بطور امت محنت کر رہے تھے ان کا ایک الگ ہی مقام تھا اور ان کے قدم دنیا میں ایسے جمائے تھے کہ ایسے کسی کے نہیں جمائے اور پھر ان کا رعب پورے عالم میں تھا۔

اور پھر ہم پیچھے رہ جانے والوں میں ہوگئے اور پھر ہم اتنے پیچھے رہ گئے کہ دنیا بہت آگے نکل گئی۔ اور اسی خواب غفلت سے جگانے کے لیئے ہمیں اقبال نے خودی کا درس دیا اور ہم نے اس درس کو سمجنے کی کوشش بھی نہیں کی

اللہ ہمیں راہ راست پر چلائے اور ہمیں ہر میدان میں آگے بڑھ جانے والوں میں شامل کرے ایسے خاص لوگوں میں شامل کرے کہ ہم اپنے آپ کو دنیا میں بھی منوا سکیں اور آخرت میں بھی ہمیں خوب پزیرائی ملے اور سب سے بڑھ کر اللہ کا قرب حاصل ہو اور اللہ کے رسول بھی ہماری شفاعت کریں، آمین

دعا گو میاں وقار الاسلام

اللہ کے بندے

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر سب اللہ کے ہی بندے ہیں دنیا کا گناہ گار ترین شخص بھی اس کے رحمت کے دائرے سے باہر نہیں، جب بھی وہ توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ کی رحمت اسے بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ دنیا کا نیک ترین انسان بھی اگر خدا کے شرک کا مرتکب ہو جائے یا اس کی رحمت کا منکر ہو جائے یا مغرور اور متکبر ہو جائے تو اُس کی ساری زندگی جو راہِ راست پہ گذری ہو اسے بچا نہیں سکتی۔ اللہ کی رحمت سب پر برس رہی ہے کون کیس وقت اس کا فضل حاصل کر لیتے ہے اور کون کس وقت اس کے فضل سے باہر ہو جاتا ہے، اس کا راز بھی اللہ ہی جانتا ہے اور وہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔ اختلافِ رائے انسان کا حق ہے مگر اپنی انا کی تسکین کے لیے اس حد تک نہیں جانا چاہیے کہ ہم حضرتِ انسان کی حرمت کے تقدس کو بھی پامال کرتے چلے جائیں۔ انسانوں کے انسانوں پر حقوق بہت زیادہ ہیں یہ بھی انسان کا انسان پر حق ہے کہ اس کے حق میں مغفرت کی دعا کیا جائے اور اسے حق کی طرف بلانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ انسان پر تو جانوروں کا بھی حق کی کہ ان کی حرمت کا بھی خیال رکھا جائے، پھر نا جانے کیوں انسان انسان کی عزت نفس کے ساتھ کھیل جاتا ہے۔ ہمیں کم سے کم اس بات کا خیال ضروت رکھنا چاہیے کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ طائف کے لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لہولہان کر دیا مگر اُن کے لب سے بد دعا نہیں نکلی ہم اُسی رحمت اللعالمین کے پیروکار ہیں۔

مشکل کے ساتھ ہی آسانی ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوشت پوشت کا بنایا ہے، زندگی میں جہاں بہت سی خوشیاں آتی ہیں وہیں بہت سے غم بھی آتے ہیں۔ کوئی دل ایسا نہیں جو غم سے خالی ہو۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ انسان اپنے آپ کو دکھ میں سنبھالتا کیسے ہے۔ گوشت پوشت کے اس انسان کا وجود ایک خاص وزن سے زیادہ نہیں اُٹھا سکتا۔ جب اس کے وجود پر اس کا ذہنی دباؤ قوت برداشت سے بڑھ جاتا ہے تو اسے اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے، یہ قیمت اس کی اپنی صحت کی صورت میں وصول کر لی جاتی ہے یعنی یا وہ اعصابی بیماری کا شکار ہوگا، یا پھر بلڈ پریشر کا، یا پھر شوگر کا یا پھر ہارٹ پرابلم، کہیں نہ کہیں کچھ نا کچھ تو ضرور ہوگا کیوں کہ اسے بنایا ہے اسی طرح گیا ہے۔

اسلام صبر تحمل، قوتِ برداشت کا درس دیتا ہے اور پھر غموں اور دکھوں میں عید کی نوید بھی سناتا ہے جس سے انسان کا دل مضبوط ہو اور وہ اپنی قوتِ ایمانی یا پھر اپنے مثبت اعتقاد کی وجہ سے اپنے دکھوں کا بھرپور انداز میں سامنا کر سکے۔

دکھوں کا سامنا ہم سب کو ہوتا ہی رہتا ہے، اور ذہنی دباؤ کا شکار ہونا فطری سی بات ہے، مگر اس دباؤ کی حالت میں مذید ڈیپریشن والی چیزوں سے دور رہیں، اور امید اور روشنی کی طرف رُخ کریں اور صبر کریں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھیں، اللہ کہتا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے اور مشکل کے ساتھ ہی آسانی ہے، اللہ بہتر فیصلے کرتا ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔

اللہ ہمیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دے کہ ہم اپنی جانوں پر ظلم کریں، اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں کیوں کہ اللہ کہتا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی بے صبروں سے اللہ کی ذات بھی دور ہے۔

اللہ کی رحمت بھی ہم پر تب پوری ہوتی ہے جب ہم اس پر اپنا یقین بڑھاتے ہیں اور اس کی رضا میں خود کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اللہ کے نور کو پھیلانے کی ضرورت ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے۔ اور چراغ ایک قندیل میں ہے۔ اور قندیل (ایسی صاف شفاف ہے کہ) گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارہ ہے اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے (یعنی) زیتون کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے (پڑی) روشنی پر روشنی (ہو رہی ہے) خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اور خدا نے (جو مثالیں) بیان فرماتا ہے (تو) لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔

جاہلانہ حرکتیں ہمیشہ جاہلانہ معاشرے میں ہی پروان چڑھتی ہیں، پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے معاشرے اپنی خوشبو سے پہچان لئے جاتے ہیں اور ان کی رشنیاں پورے عالم پر چھا جاتی ہیں۔ ہم اپنے مسائل کا حل اندھیرے میں تلاش کر رہے ہیں جہاں کسی کو کچھ بھی نہیں ملنا، علم کی روشنی جلالی جائے تو جہالت کے اندھیرے باقی نہیں رہتے۔ اور جو ہم اندھیروں میں ڈھونڈ رہے ہیں وہ تو خود ہی مکمل اندھیرا ہے

اسلام میں غلطی کرنے والے اسلام کے طالب علم کو سزا دی جاتی ہے، اگر اسلام کو غلط پڑھانے والے استاد کے گرد احاطہ تنگ کیا جائے تو نہ ہی ایسے طالب علم کبھی بھی منظرِ عام پر نہ آئیں۔ مریض کو مارنے کی بجائے کینسر کا علاج کیا جائے تو ایسی بیماریوں کا علاج ممکن ہے

اسلام امن کا شہر ہے، وحشت اور حیوانیت اس امن کے شہر کے پاک دروازے پر ایک بڑا تالہ ہے، جو کسی سانپ کی طرح آ بیٹھا ہے، وحشت اور حیوانت پھیلانے والے دین اسلام کی خدمت سے نہ صرف کوسوں دور ہیں بلکہ اسلام کی تنزلی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ظالم ہیں وہ لوگ جو امن کے دین کو وحشت اور ظلم کی پہچان بنانے میں تلے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اسلام کے اہل کار نہیں خوارج کہا جاتا ہے۔ اسلام کو جب بھی خطرہ ہوا ہے آستینوں کے سانپوں سے ہی ہوا ہے۔

رحمان وہ ہے جو کافر اور منکر کو بھی توبہ کرنے پر مکمل معاف کر دیتا ہے۔ انسان وہ ہے جو اختلافِ رائے رکھنے پر اللہ کی تخلیق کو مسمار کر دیتا ہے۔ رحمان کے بندے کبھی بے رحم نہیں ہوتے، شیطان کے چیلے ہی غضب ناک ہوتے ہیں

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ (39)

جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور خدا ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اسے اس کا حساب پورا پورا چکادے۔ اور خدا جلد حساب کرنے والا ہے۔

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (40)

یا (ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے جس پر لہر چڑھی چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر (آرہی ہو) اور اس کے اوپر بادل ہو، غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں، ایک پر ایک (چھایا ہوا) جب اپنا ہاتھ نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے۔ اور جس کو خدا روشنی نہ دے اس کو (کہیں بھی) روشنی نہیں (مل سکتی)

اگر ہم تم میں فاصلے نہ رکھتے رہتے تو کرہ ارض تباہ ہو جاتا اے اللہ تو ہمارے اور جاہل لوگوں کے درمیان فاصلوں کو قائم رکھنا۔ یا تو جاہلوں کو عقل دینا، یا ہمیں ان کے شر سے محفوظ رکھنا، امین

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا

تحریر : میاں وقار الاسلام

اگر راہ_راست ہی نہیں ہے تو ہر قسم کی موٹیویشنز بے کار ہیں آپ کو پتا ہے دنیا کی سب سے بہترین موٹیویشنل سپیچ کیا ہے؟ کلمہء حق، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اگر کلمہء حق آپ کو حق کا راستہ نہیں دیکھاتا تو ایک باطل آپ کے اندر موجود ہے جو آپ کی تمام گمراہیوں کی بڑی وجہ ہے۔ جو گمراہ رہنا چاہتا ہے اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو راہ راست پر آنا چاہتا ہے اللہ اس کے لیے سبب ضرور پیدا کرتا ہے۔

انسان عذر دینے کی ماہر مشین ہے اس کے پاس اپنے تمام گناہوں کا عذر موجود ہے یہاں تک کہ اگر وہ قتل بھی کر دے تو صفائی میں عذر ڈھونڈ لیتا ہے اور خود کو عارضی طور پر مطمئین بھی کر لیتا ہے۔

مگر اس دن کیا ہو گا جب انسان سے اس کا کوئی بھی عذر قبول نہیں کیا جائے گا یہاں تک کہ شیطان بھی کہے گا کہ میں اسے دور سے بلاتا تھا اور یہ خود ہی دوڑا چلا آتا تھا تو یہ مجھ پر عذر نہ رکھے بلکہ یہ خود گناہ گار تھا۔

اللہ مومنوں سے فرماتا ہے کہ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں، پھر اللہ مومنوں سے فرماتا ہے کہ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں

پھر فرماتا ہے کہ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ وہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت اُن پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟

انسان کو بہت حیلے بہانے آتے ہیں اور وہ اس کام میں بڑا ماہر ہے، اتنا شیطان انسان کو گمراہ نہیں کرتا جتنا انسان انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ اور اتنا کوئی انسان کسی انسان کو گمراہ نہیں کرتا جتنا انسان اپنے اپ کو گمراہ کرتا ہے۔ اللہ انسان سے اس کے احوال بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ تو ہم کس دھوکے میں ہیں ہم کسے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اور خود کو گمراہ رکھ کر ہم کون سا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کاش ہم جانتے کہ ہم اپنی جانوں پر کس قدر ظلم کرتے ہیں۔

ہم اتنے ماہر ہو چکے ہیں کہ لوگوں کی خاموشی اور ان کے چہرے کے تاثر پکڑ لیتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کو بھی بھانپ لیتے ہیں جن سے ہم کبھی ہم کلام ہی نہیں ہوئے ہوتے۔ ہم ماہر نفسیات ہے، ماہرِ فلکیات ہیں، ماہر طب ہیں، ہم زمین کے نیچے دیکھ سکتے ہیں، ہم آسمانوں سے اوپر دیکھ سکتے ہیں، ہم سمندروں کی گہرائیاں ناپ سکتے ہیں، ہم آنے والے موسموں کا احوال بتا سکتے ہیں، مگر ہم اپنے چہروں کو نہیں پہچان سکتے بلکہ ان پر اور چہرے سجا لیتے ہیں، ہم اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنتے مگر جانوروں کی زبانیں سمجھنے میں ہمیں زیادہ دلچسپی ہے۔

سب کچھ بس میں کر لینے کی خواہش کاش ہمیں اس دن سے بچا سکتی جس دن ہم بے بس ہوں گے۔ صدیوں پر صدیاں گزر گئی، بستیوں پر بستیاں پلٹ دی گئیں مگر ہم پر وہ وقت نہ آیا کہ ہم عبرت پکڑ سکتے اور ہم نے پکڑے بھی تو نئے نئے عذر۔۔۔

دعا گو ہوں اللہ ہمارے عذر قبول کرلے امین

اعتراف نامہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے اور جھوٹ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے۔ اور جو باتیں تم بناتے ہو ان سے تمہاری "
ہی خرابی ہے۔

"

[القرآن، سورہ الانبیاء۔ آیت 18]

اے اللہ اگر تو نے یہ دنیا اس لیے بنائی ہے کہ جھوٹ کر سچ پر کھینچ مارے اور وہ اس کا سر توڑ دے تو میں اعتراف کرتا ہوں کے لاکھ چاہنے کے باوجود میں آج تک اپنی ذات سے بھی صحیح معانی میں سچا نہیں ہو سکا۔ میں نے بار بار اپنی ذات پر ظلم کئے ہیں، میں نے بار بار اپنے ساتھ منافقت کی ہے، میں نے بار بار خود سے سچ بولنے کے عہد کر کرکے توڑ دیے ہیں۔ میری اپنی ذات کے ساتھ سچے ہونے کی کوشش آج تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ میں اپنے لیے جو کمزور سے معیار بھی رکھے میں انہیں بھی پورا نہیں کر سکا تو لوگوں کے معیار پر کیسے پورا آ سکتا ہوں۔ میرا حساب کرنے کے لیے تو ایک ہی آیت کافی ہے کہ میرا اپنے ہی سچ کے ساتھ کھڑا ہونا کتنا ہی کھوکھلا اور کمزور ہے۔

تو نے مجھ علم اور شعور دیا، سمجھ بوجھ دی، بااختیار بھی بنایا، میں جانتا ہوں کہ سچ نے مجھے ہمیشہ عزت دی، طاقت دی ہے اور اسی نے ہر طرح کی مشکل سے باہر نکالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جھوٹ نے مجھے ہمیشہ ذلت دی ہے، مجھے کمزور کیا ہے، اور میں جب بھی کسی بھی مشکل میں پھنسا تو اس کی بنیادی وجہ جھوٹ ہی پر مبنی تھی۔ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود بھی میں کتنا کمزور ہوں کہ پھر اسی دلدل میں جا گرتا ہوں۔

جھوٹ پر ثابت قدمی کتنی آسان ہیں، منافقت کتنی آسانی سے ہو جاتی ہے، اپنی ذات سے کئے ہوئے عہد توڑنا کتنا آسان ہے۔ اس کے برعکس سچ پہ ثابت قدم رہنا کتنا مشکل ہے، اپنے نفس کے خلاف لڑنا بھی بہت مشکل ہے اور اپنے ساتھ کئے گئے عہد پر قائم رہنا بھی آسان نہیں۔ مگر جب تو اپنا فضل کرتا ہے تو مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہوتے چلے جاتے ہیں، جب بھی میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں میری ذات کی کمزوریاں مجھے جگہ جگہ سے توڑتی اور بکھیری چلی جاتی ہیں، میں پھر سے اکھٹا ہونے کی کوشش کرتا ہوں، پھر سے رجوع کرتا ہوں اور پھر سے بکھر جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا خود پر اختیار کچھ بھی نہیں۔ تو ہی میری ذات کے اندر موجود جھوٹ کے بڑے بڑے شگافوں بند کر سکتا ہے، تو ہی مجھے ثابت قدم رکھ سکتا ہے، تو ہی میرے اندر کی منافقت کو مار سکتا ہے۔ جیسے تو نے مجھے سیدھا راستہ دیکھایا ہے، جسے دیکھنا میری کمزور آنکھ کے بس میں نہیں تھا اور جسے سمجھنا بھی میری ناقص عقل کے لیے ناممکن تھا، ویسے ہی تو مجھے اپنے راستے پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔

مجھ پر یہ آیت بڑی سخت محتسب ہے، تو چاہے تو میرا حساب آسان کر سکتا ہے، تو چاہے تو میری حالت درست کر سکتا ہے۔ اس ایک آیت کا وزن اُٹھانا میرے لیے نا ممکن ہے تو پورے قران سے گزرنا تو پل صراط جیسا ہی ہے۔ میں ایک ایسے امتحان کی طرف دھکیلا جا رہا ہوں جس کا سبق تو میں پڑھ سکتا ہوں، یاد بھی کر سکتا ہوں، مگر اس کا پریکٹکل میری ذات میں نظر ہی نہیں آتا۔ تیرے سوا کس سے مانگا جا سکتا ہے، اے اللہ جب مجھے اُٹھانا تو اپنے با عمل لوگوں میں سے اُٹھانا۔ تو میری پور پور کا خالق ہے، میں پور پور بکھرا ہوا ہوں، تو ہی مجھے پور پور درست کر سکتا ہے

دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنے علم سے نوازے اور ہمیں با عمل اور ثابت قدم رہنے کی توفیق دے امین

ہم کب راضی ہوں گے

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہم اکثر دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہم تجھ سے راضی ہیں تو بھی ہم سے راضی ہو جا آمین

جب ہم اللہ سے راضی ہونے کا دعوی کرتے ہیں تو کیا ہم واقعی اللہ سے راضی ہوتے ہیں یا پھر اپنے ساتھ منافقت کرتے ہیں۔

جب ہم تنقید پر آتے ہیں تو اپنے ملک کو افریقہ سے بھی گیا گزرا کر دیتے ہیں جب کہ پاکستان بہت سی چیزوں کی وجہ سے بہت سے ملکوں سے بہت بہتر ہے

جب ہم تعریف پر آتے ہیں تو اپنے ملک کو امریکہ سے بھی آگے کر دیتے ہیں جب کہ پاکستان بہت سی چیزوں کی وجہ سے بہت سے ملکوں سے پیچھے ہے .

یہ کیا معاملہ ہے کہ جس کے پاس جتنا زیادہ ہے وہ اتنا ہی دھاڑیں مار کر روتا ہے اور جس بیچارے کے پاس کچھ نہیں ہوتا اس کے پاس الفاظ بھی نہیں ہوتے .

ہم جس کے ساتھ ہو جاتے ہیں ہمیں اس کے عیب نظر نہیں آتے اور ہم جس کے خلاف ہو جاتے ہیں اس کی اچھائیاں ہم پر مخفی ہو جاتی ہیں۔

ہمیں لوگوں پر منصف ہونا چاہیئے، اللہ بھی یہی کہتا ہے کہ انصاف کے ساتھ کھڑے ہو جاو مگر ہم لوگوں پر دروغہ بننا یا لوگوں کے خوشامدی بننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ملکی اور بین القوامی سطح پر کمزور طبقہ ہو یا کمزور ملک اسے شدید تنقید کا سامنا ہوتا ہے اور مظبوط طبقہ ہو یا مضبوط ملک اس کی خوشامد کی جاتی ہے۔

بہت سی غلط چیزیں ہیں جو رواج پا جاتی ہیں بہت سی اچھی چیزیں ہے جن کا رواج نہیں پڑتا وجہ یہ ہے کہ دنیا زیادہ لوگ دیکھتے ہیں عاقبت بہت کم لوگ دیکھتے ہیں۔

نفاق مرض ہی ایسا ہے کہ کم ہی لوگ صحت یاب ہو پاتے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں کا شمار تو ہم کر ہی نہیں سکتے مگر چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو ہم بڑا بڑا عذاب سمجھ کر روتے ہیں، کاش ہمیں سمجھ ہوتی کہ عذاب الٰہی ہوتا کیا ہے۔

ہمیں حکم ہے کہ ہم ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کریں اور مشکلوں میں صبر سے کام لیں مگر ہمارا حساب الٹا ہے مگر ہمیں یاد رہنا چاہیئے ہمارا حساب سیدھا ہوگا۔

اگر کوئی خوش نہ رہنا چاہے تو کسی حال میں اسے خوش نہیں کیا جا سکتا بہت سے لوگوں کا بے چین رہنا حالات اور واقعات کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ بے چین رہنا ان کی فطرت ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ اس طرح پریشان ہوتے ہیں کہ پہلے سیل اتنی تھی اب اتنی رہ گئی یا پہلے پیداوار اتنی تھی اب اتنی رہ گئی اور یہ وہی ہوتے ہیں جو اللہ کی راہ میں حصہ نہیں نکالتے۔

راضی ہونے والے ہر حال میں راضی ہوتے ہیں اور راضی نہ ہونے والے کسی حال میں راضی نہیں ہوتے، اللہ ہمیں ہر حال میں راضی رہنے والوں میں شامل کرے۔

جب دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے تو اے کاش ہم ناشکروں میں شمار نہ ہوں۔، دعا گو میاں وقار الاسلام

اسلام اور سلامتی

تحریر : میاں وقار الاسلام

لفظ اسلام کا لفظی مطلب امن اور سلامتی ہے۔ اور پیغمبر کا لفظی مطلب اللہ کی طرف سے امن اور سلامتی کا پیغام پہنچانے والا۔ پیغمبر نہ کبھی حملہ کرنے آتا ہے، نہ کوئی ذاتی فائدے کے لئے بلکہ صاف صاف اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے معبوث کیا جاتا ہے۔

اسلام میں جانوروں، پرندوں، حشرات وغیرہ یا آبی جانوروں یہاں تک کہ پودوں، فصلوں اور درختوں کو بھی نقصان پہنچانے کی ممانیت ہے سوائے اس کے کہ انہیں انسانیت کی ضرورت اور فلاح کے لیے استعمال کیا جائے۔

پیغمبروں کو ہمیشہ دہشت گردی اور ظلم کے خلاف امن اور سلامتی کا فرمان بنا کر بھیجا گیا ہے جیسا کہ فرعون کے خلاف یا پھر کسی بھی دوسرے حاکم کے خلاف جو وہاں کی پست حال عوام پر اپنے مظالم ڈھاتے ہوں۔

امن کا پیغام جہاں امن اور سلامتی کا فرمان بن کر آتا ہے وہیں ظالم اور ظلم کے لیے موت کا سامان بھی بن کر آتا ہے۔ کیوں کہ امن اور ظلم کسی معاشرے میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ جیسے جھوٹ اور سچ اکھٹے نہی رہ سکتے۔ سچ ایک دن اپنے آپ کو منوالیتا ہے اور جس دن ایسا ہوت ہے جھوٹ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جب امن و سلامتی اپنے آپ کو منوالیتی ہے اس دن ظلم کی اور ظالم کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

دنیا کی سب سے ظالم حکومتیں دہشت گردی پر پیسہ اور وسائل لگا رہیں ہیں کہ کہیں امن قائم نہ ہو جائے۔ کیوں کہ امن کا قائم ہونا ان کے ظلم کے نظام کی موت ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلام اپنے ملکوں یا معاشروں میں امن کیوں نہیں لا سکا۔

اسلامی معاشری کلمہ پڑھنے سے وجود میں نہیں آتا بلکہ شریعت کے نفاذ سے قائم ہوتا ہے۔ مجرمانہ سوچ کا حامل طبقہ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ شریعت کا نفاذ ہو کیوں کہ جب شریعت نافذ ہوتی ہے ظالم غیر محفوظ ہوتا ہے اور مظلوم محفوظ ہوتا ہے۔

ہم خواہشات کے بچاریوں کا کیا بنے گا

تحریر : میاں وقار الاسلام

امیروں کی بڑی بڑی ناجائز خواہشیں بھی پر بھر میں پوری ہو جاتی ہیں، اور غریبوں کی جائز خواہشیں بھی پوری ہوتے ہوتے عمر گنوا دیتی ہیں۔ امیر شخص یہ سوچتا ہے کہ میں پیدا ہی خوش نصیب ہوا ہوں، اور غریب پیدا ہی بد نصیب ہوا ہے۔ غریب آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ پیدا ہی بد نصیب ہوا ہے اور امیر تو ہوتے ہی خوش نصیب ہیں۔ امیر آدمی دنیا کے ہر میدان میں جیت جاتا ہے، غریب آدمی دنیا کے ہر امتحان میں ہار جاتا ہے۔

صبر اور شکر کرنے والا سوکھے نوالے پر بھی صبر اور شکر کر سکتا ہے۔ صبر اور شکر نہ کرنے والا سونے کے نوالے کھلانے سے بھی راضی نہیں ہوتا۔ دنیا غریب اور امیر دونوں کی برابر آزمائش گاہ ہے۔ اللہ کے نزدیک حجت صرف نیک اعمال کی ہے۔ جسے زیادہ دیا گیا اس کا حساب بھی اسی قدر سخت ہوگا۔ جسے جس قدر ملا اسے اسی قدر فکر مند ہونا چاہیے، دنیا کا غریب سے غریب انسان، دنیا کے امیر سے امیر انسان پر اعمال میں بھاری ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اللہ نے بہت ہی زیادہ نوازا ہے، مگر ہماری خواہشات ہمیں اندھا کر دیتی ہیں اور مزید سے مزید کی دوڑ میں دوڑاتی رہتی ہیں۔

شائید جب ہم دوڑ دوڑ کر تھک جائیں تب ہمیں خبر ہو کہ اعمال کے لے دوڑنا خواہشات کے لیے دوڑنے سے بہت آسان تھا۔ غریب تو بیچارہ دوڑتا ہی دو وقت کی روٹی کے لیے ہے، اس کی تو دوڑ دھوپ بھی اس کے اعمال کا اولین حصہ ہے۔ اللہ نے ہمیں ہر سہولت دی ہے، کسی چیز کا محتاج نہیں رکھا، ہمارے لیے سب سے آسان کام نیک اعمال کمانا ہے مگر ہم اکثر گھاٹے کے سودے کرتے ہیں اور خواہشوں کو عزیز رکھتے ہیں۔

ہماری توقعات ہمیں مایوس کرتی ہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہم اکثر اپنی توقعات پر پورا نہیں اُترتے مگر ہم یہ توقع ضرور کرتے ہیں کہ ہمارے قریبی دوست یا رشتہ دار ہماری توقعات پر پورا اتریں، بہترین دوست اور رشتہ دار اس وجہ سے جدا ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کی آپ میں توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ مدد اللہ کی طرف سے ہوتی ہے بہت دفعہ تو ہم اپنی مدد خود نہیں کر سکتے تو پھر دوسروں پر اس کا بوجھ کیوں۔ توقعات کا رجوع اگر اللہ کر طرف رکھا جائے تو انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا، جب ہم اپنی توقعات بڑھاتے ہیں تو اپنے دوستوں میں کمی کرتے جاتے ہیں اپنے اختلافات کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں، اور جب ہم اپنی توقعات کو کم کرتے ہیں تو ہمارے دوست بھی بڑھتے ہیں اور ہمارے اختلافات بھی کم ہوتے ہیں۔

ہم ایسی دنیا کے باسی ہیں جہاں لوگ اپنے آپ کو رب کے لیے نہیں بدل سکتے، تو ہم کیا توقع کرتے ہیں کہ کوئی ہمارے لیے خود کو بدلے، جب کہ ہم خود کو کسی کے لیے بدلنے سے معذور ہیں۔ تبدیلی اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیے نہ کہ ہماری ذاتی خواہشات کے مطابق۔

جو لوگ تعریف پسند کرتے ہیں ان کے پاس صرف خوشامدی دوست ہی بچتے ہیں اور آپ کبھی بھی اپنی خامیوں کا سامنا نہیں کر پاتے، آپ سمجھتے ہیں کہ صرف آپ صحیح ہیں اور آپ سے اختلافات رکھنے والے سب لوگ غلط ہیں۔ جب خوشامدی ٹولا آپ کو پھنسوا دیتا ہے تو سب سے پہلے بھاگنے والے بھی وہی ہوتے ہیں۔ جس طرح سے آپ تعریف کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح کھولے دل سے تنقید کو بھی جگہ دیں تاکہ آپ کی شخصیت کا توازن بہتر ہو سکے۔

کچھ لوگ تو پیدا ہی تنقید کے لیے ہوتے ہیں، جس طرح تعریف کرنا خوشامد کی بیماری میں بدل سکتا ہے اسی طرح ضرورت سے زیادہ تنقید بھی ایک منفی سوچ کو جنم دیتی ہے اور آپ متنازعہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صحت مندانہ تعریف اور صحت مندانہ تنقید دونوں اپنی اپنی حدود میں رہیں تو آپ کی شخصیت کی تشکیل و تعمیل ہوتی ہے اور ان میں سے دونوں اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو شخصیت پر برے اثرات چھوڑتی ہیں۔

ہمیں کچھ لوگوں سے ہمیشہ تعریف کی توقع رہتی ہے اور کچھ لوگوں سے ہمیشہ تنقید کی توقع رہتی ہے کیوں کہ کچھ لوگوں کو تعریف میں کمال حاصل ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کو تنقید میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ تعریف ضرور کریں مگر جہاں تنقید کر ضرورت ہو وہاں تنقید بھی کریں، اور جہاں تنقید کریں وہاں تعریف کرنے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی کنجوسی کا مظاہرہ نہ کریں۔

تنقید اور تعریف دونوں کو دشمنی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، لازمی نہیں جو اپ پر تنقید کر رہا ہو وہ آپ کا دشمن ہی ہو اور یہ بھی لازمی نہیں کہ جو آپ کی تعریف کر رہا ہو وہ آپ کا خیر خواہ ہی ہو۔

لوگ آپ کو طرح طرح سے دیکھتے ہیں اور آپ لوگوں کو طرح طرح سے دیکھتے ہیں بعض دفعہ آپ جس بات پر تنقید کرتے ہیں دوسرے لوگ اس پر تعریف کرتے ہیں اور بعض دفعہ اپ جس پر تعریف کرتے ہیں لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں یہاں آتی ہے اختلافِ رائے۔ جیسے ہم اختلافِ رائے رکھتے ہیں ویسے دوسرے بھی اختلافِ رائے رکھ سکتے ہیں۔ اور رائے وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہو جایا کرتی ہے۔ مگر ہم معملات کو وقت نہیں دیتے اور فوری فیصلہ لے لیتے ہیں۔

اختلافات کے زہر کو اگر وقت کے پانی میں گھلنے دیا جائے تو ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اختلافات کا زہر اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے، اگر اختلافات کا مزہ اسی وقت چکھ لیا جائے تو طویل دشمنیوں میں بھی بدل سکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں صبر جو اختلافات کے کڑوے پھل کو بھی شہد جیسا میٹھا بنا سکتا ہے۔

گھوڑے کی تربیت نہ کی جائے تو وہ اپنے اوپر کسی کو بیٹھنے نہیں دیا، اسی طرح لوگ شروع شروع میں اختلافات کر برداشت کرنے کا مادہ کم رکھتے ہیں مگر حالات و واقعات کی ضربیں کھا کھا کر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ برداشت کی مثال بن جاتے ہیں۔ اپنی برداشت کو بڑھائیں اور لوگوں کو وقت دیں کہ ان میں بھی برداشت کا مادہ وقت کے ساتھ زیادہ ہوسکے پھر وہ آپ کی مشکل باتیں بھی سمجھ پائیں گے۔

جیسے ہمیں لوگوں سے توقعات ہوتی ہیں ایسے ہی لوگوں کو بھی ہم سے توقعات ہوتی ہیں کہیں کوئی ہماری توقعات پر پورا نہیں اتر رہا تو کہیں ہم بھی کسی کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہے لوگ پھر بھی ہم سے دوستی رکھتے ہیں، ہمیں پھر بھی لوگوں سے دوستی رکھنی چاہیے۔

توقعات کا رجوع اللہ کی طرف ہو تو دوستیاں اور رشتے زیادہ لمبے چلتے ہیں

خود سے بھی لمبی لمبی توقعات نہ رکھیں، مختصر سی زندگی ہے اسے زیادہ بوجھل نہ کریں۔ خوش رہیں

----------خوشیاں بانٹیں----------خوشیوں کا ہر طرف قحط ہے---

اللہ کرے آپ ہر دن عید کی نوید لے کر آئے

امین

میاں وقار الاسلام

"اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں"

تحریر: میاں وقار الاسلام

اُمتِ مسلمہ کی طرح پاکستانی عوام کا بھی سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنے تمام مسائل اللہ پہ چھوڑ دیتے ہیں۔

یاد رکھیں جو قومیں محنت نہیں کرتیں، اپنی حالت خود نہیں سنوارتیں نہ اللہ انہیں دنیا میں چھوڑے گا اور نا آخرت میں چھوڑے گا ہاں مگر رسوا کرکے۔

اللہ فرماتا ہے کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے، اللہ خود فرماتا ہے کہ محنت کرنے والے اور محنت نہ کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ سمجھتے ہیں جنت میں یوں داخل ہو جائیں ہے ان پر تو ابھی پہلے لوگوں جیسی آزمائشیں آئی ہی نہیں۔

اللہ نے ان لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو حالتِ جنگ میں گھروں میں بیٹھے رہ گئے تھے۔ سوائے بیماروں اور معذوروں کے۔

جو قومیں آج بھی محنت کر رہی ہیں دنیا میں ان کا مقام ہی الگ ہے ان کا رعب ہی الگ ہے ان کا مرتبہ ہی الگ ہے۔ ایسی قومیں اپنی تقدیریں خود لکھتی ہیں اور اللہ ان سے وہ کام لے لیتا ہے جو کام اللہ نے مسلمانوں سے لینے تھے۔ یہ اس لیے کہ ہم نے خود کو اس قابل ہیں نہیں بنایا کہ ہم سے کوئی بھی کام لیا جاسکے۔

ہر بہترین انوینشن غیر مسلموں کی طرف سے ہی کیوں آتی ہے کیا وہ اللہ کو زیادہ پیارے ہیں۔ ایسا نہیں ہے اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ محنت کا صلہ مل کر رہے گا چاہے وہ مسلم کرے یا پھر غیر مسلم کرے۔

اللہ یہ نہیں کہتا کہ ہم اپنے کام اللہ پر چھوڑ کر مفلوج ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ یہ کہ محنت کی جائے اور ایک باوقار مقام حاصل کیا جائے۔

اگر انسان صرف دعاوں سے سب کچھ حاصل کر سکتا تو علم فرض نا کیا جاتا اور علاج بھی فرض نہ کیا جاتا۔

اللہ فرماتا ہے کہ اگر تم چاہو تو آسمان کی حدوں سے اگے نکل جاؤ مگر تم زور کے سوا نکل نہیں سکتے۔

اللہ فرماتا ہے کہ سیاروں کی منزلوں کی قسم اور یہ سب سے بڑی قسم ہے اگر تم سمجھو

اللہ بار بار اشارہ کرتا ہے کائنات کی وسعتوں کی طرف اور بلاتا ہے اپنے علم کے خزانوں کی طرف۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم اپنے خزانوں کو زمین میں اور تم میں وقتاً فوقتاً نکالتے رہتے ہیں۔ یہ خزانے ڈھونڈنے سے ملتے ہیں۔

اسلامی ملکوں میں وسائل کی کمی نہیں نہ ناہی ذہین افراد کی کمی ہے، ہم نے اپنے اُوپر جو حاکم مسلط کئے ہوئے ہیں ان میں کچھ کر دکھنے کی نہ تو نیت ہے نہ کپیسٹی ہے اور نہ ہی حوصلہ ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی اپنے سروں پر چھوڑنے کے بعد ہم سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ تو اللہ بھی بے وقوفوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ فرماتا ہے گھوڑے تیار رکھو مطلب حفاظت کا سامان تیار رکھ، علم حاصل کرو، وسائل کو مسخر کرو تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ، اور پھر چاہو تو اللہ پر چھوڑ دو

کوئی بھی امتحان پاس کرنے کے لیے کڑی محنت درکار ہے، انسان محنت کرتا ہے تو اللہ کی مدد بھی اترتی ہے سارا سال سو کر وقت گزارنے یا آوارا گردی کرنے کے بعد مسلے پر بیٹھ کر دعائیں کرنے سوا گر کوئی ٹاپ کر جاتا تو لوگ سکولوں میں نہ جاتے اور نہ ہی ایکسٹرا ٹیوشن لیتے۔

بغیر ہل چلا ہے اور دانہ پانی دینے کے کھیت کبھی ہرے نہیں ہوتے

اللہ نے آپ کا مقدر آپ کے ہاتھ میں دیا ہے اسے تقدیر پر مت چھوڑیں۔

ہائے قوم

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہائے قوم یہاں کوڑا پھینکنا منع ہے، مطلب یہاں کوڑا پھینکنا ہے۔ ہائے قوم یہاں ہارن بجانا منع ہے، مطلب یہاں ہارن بجانا ہے۔

ہائے قوم یہاں سیاسی گفتگو منع ہے، مطلب یہاں سیاسی گفتگو کرنی ہے۔ ہائے قوم یہاں مسلک پر بات منع ہے، مطلب یہاں مسلک پر بات کرنی ہے۔

ہائے قوم یہاں سپیڈ کم کر لیں، مطلب یہاں سپیڈ بڑھانی ہے۔ ہائے قوم یہاں لائن بنانی ہے، مطلب یہاں لائن نہیں بنانی۔

ہائے قوم ملاوٹ ہماری پہچان مگر ملاوٹ والے ہم میں سے نہیں۔ ہائے قوم تمہیں ایک بتلانے والا آیا جس کے نام پر تم مرتے ہو اور اسی کی پیروی کرتے ہوئے تمہاری جان جاتی ہے۔

اللہ اس بات سے عار محسوس نہیں کرتا کہ مکھی مکڑی مچھر یا اس سے بھی حقیر چیز کی مثال دے کر انسان کو سمجھائے جیسا کہ اللہ تعالی نہ قران مجید میں بہت بار سمجھایا ہے، کیا واقعی ہم عقل نہیں رکھتے۔

ایک مثال بندر کی بھی ہے جس سے شرارت کے طور پر کوئی بھی حرکت کی جائے تو وہ فطری تور پر پلٹ کر ویسے ہی کرتا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ بندر بھی سمجھنے لگے ہیں اور ہو بہو ویسے ہی کرتے ہیں جیسا کہ انہیں سیکھایا جاتا ہے۔

بندروں کے علاوہ بہت جانور ہیں جنہیں خوب سدھایا جا چکا ہے مگر افسوس قوم۔۔۔۔۔ ہم خود کو سیکھانے میں کس قدر کامیاب رہے ہیں ہمیں سوچنا چاہیئے۔

ایک چیز ہوتی ہے سویک سینس، جس کا مطلب انسان کا ایک دوسرے انسان کے لیے اس قدر سینس رکھنا کہ اس کے کسی عمل سے دوسرے کو تکلیف نہ ہو

دوسرے انسان کی تکلیف کا احساس رکھنے کے بارے میں قران حدیث اور سنت میں جس قدر زور دیا گیا ہے اگر اسے ہم تھوڑا سا بھی سمجھ لیں تو ہمارا معاشرہ مثالی ہو جائے مگر افسوس دنیا انسان کے رہن سہن کے اس بنیادی اصول میں اتنا آگے جا چکی جتنا آگے شاید ہم دیکھ بھی نہیں سکتے۔

ہم کیسے کلمہ گو ہیں کہ ہمارے دل عام انسانوں کے احساس سے خالی ہیں۔ اسلام میں تو جانوروں اور درختوں کو بھی بلاوجہ نقصان یا تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں، دنیا میں جہاں انسان یہ سیکھ چکا ہے کہ دوسرے انسان کو تکلیف نہیں دینی وہاں ایک مسلمان کو کیا تکلیف ہے کہ اپنے مومن بھائی کے درپے ہے

ہم کس ذات اقدس کے نام لیوا ہیں اور کس کی تعلیمات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور دنیا کو کیا منظر پیش کرتے ہیں ہمیں ضرور سوچنا چاہیئے۔

دعا ہے کہ جب ہمیں حضور اکرم کا دیدار نصیب ہو تو ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔
آمین، دعا گو میاں وقار الاسلام۔

مردہ پرستی

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہم بھی کتنے عجیب لوگ ہیں جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی اچھائیاں ڈھونڈ کر اسے تعریف کے ساتھ یاد کرتے ہیں، اس کی کمی محسوس کرتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں ہمارے منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے جس سے مردہ شخص کی دل آزاری ہو اور غلطی سے اگر کسی کے منہ سے کوئی غلط بات نکل جائے چاہے وہ سچی بھی ہو تو لوگ ہماری بات وہی روک دیتے ہیں اور ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ہم نے کتنی غلط بات کر دی اور ہم اس غلطی کو فوری طور پر غلطی تسلیم کرتے ہوئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہم کتنے عظیم لوگ ہیں، واہ کیا بات ہے ہماری۔ ہمارا رب ہم سے کتنا خوش ہوتا ہوگا کہ میرے بندے کمال ہیں۔

اب ذرا زندوں کا حال دیکھتے ہیں جن کی دل آزاری ہم اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اگر لوگ باتوں سے مرتے ہوتے تو میں یہ بات یقین سے کہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہمارے لہجوں کی وجہ سے مر جاتے، اور شاید کئی اسی وجہ سے مر بھی جاتے ہوں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہمیں مردوں کی کتنی فکر ہے جن کے بارے میں قران میں آتا ہے کہ یہ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں سوائے شہیدوں کے جو زندہ ہیں اور اللہ کے ہاں سے انہیں رزق پہنچتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔ اور بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ مردے اسی طرح سنتے ہیں جیسے زندہ سنتے ہیں تو یہ معاملہ انہیں پر چھوڑ دیتے ہیں۔

مردے سنتے ہوں یا نہ سنتے ہیں، مگر زندہ لوگ تو سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور جو تکلیف ہمارے لفظوں اور لہجوں سے انہیں پہنچتی ہے اسے محسوس بھی کرتے ہیں۔

ہمیں چاہیئے کہ زندہ لوگوں کا کم سے کم اتنا ہی احترام کر لیں جتنا ہم مردہ لوگوں کا کرتے ہیں، یا پھر زندہ لوگوں کو اپنی عزت کروانے کے لیئے مر کر دیکھانا پڑے گا۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لوگوں کی مرنے کے بعد جو ہم ان کی تعریف کرتے ہیں اس میں یا تو کھلا احساس_ندامت ہوتا ہے یا پھر ہماری چھپی ہوئی منافقت ہوتی ہے۔

اگر احساس_ندامت ہے تو ہمیں چاہیئے کہ یہ ندامت ہم لوگوں کے جیتے جی اٹھالیں اور اپنی ذات کا بوجھ بھی ہلکا کریں اور اس زندہ شخص کا بوجھ بھی ہلکا کریں جس کے دل میں ہماری زبان کی کمان سے نکلے ہوئے تیز انداز الفاظ خنجر کی طرح گڑھے ہوئے ہیں۔ اور وہ اندر سے بری طرح گھائل ہے مگر بتا نہیں سکتا۔ ذرا سوچیں اگر اس کیفیت سے کوئی شخص اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو آخرت میں ہمیں کیسی ندامت اٹھانی پڑے گی

دوسری طرف اگر منافقت ہے تو منافقت ہی سہی کسی کا دل رکھنے کے لیئے جو ہم نے بعد میں اپنی جانوں کے ساتھ ڈرامے کرنے ہیں، وہ اس شخص کے جیتے جی ہی کر لیں تاکہ لوگوں کے انسانوں کے بارے ہیں یہ خیال کہ انسان بہت برے ہوتے ہیں، کچھ گمان تو بہتر ہوں، اندر سے ہم جیسے ہیں وہ تو ہمیں پتا ہی ہے، کم سے کم باہر سے ہم کچھ تو بہتر نظر آئیں۔

اندر کی انسانیت تو پتا نہیں کب کی مر گئی باہر کی انسانیت کو تو زندہ رہنے دیں، ہمارا معاشرہ محسوس کرنے میں انسانوں کا معاشرہ نہ لگے کم سے کم دیکھنے میں تو لگے۔

باقی کبیرہ گناہوں کی طرح لوگوں کی دل آزاری بھی کبیرہ گناہ ہے کاش ہم سمجھتے ہوتے اور اس بات کا احساس رکھتے

اللہ ہمیں ایک دوسرے کی دل آزاری سے بچائے، اور یہ توفیق دے کہ ہم مردہ لوگوں کی طرح زندہ لوگوں کا بھی احترام کریں۔ آمین

دعا گو، میاں وقار الاسلام

اچھا ہونا اور اچھا نظر آنا

تحریر: میاں وقار الاسلام

پہلے لوگ اچھے ہوتے تھے اور اچھے نظر بھی آتے تھے، پھر لوگ اچھے نہیں رہے مگر اچھے نظر آتے تھے، پھر لوگ اچھے نظر آنا بھی بند ہو گئے اور دنیا تاریک ہو گئی۔ آج اگر کوئی اچھا نظر آنے کی کوشش بھی کر رہا ہے تو تاریک رات میں دیا جلانے کے مترادف ہے۔ اسے منافق کہہ کر دفن نہ کریں، اس کی کوشش کی قدر کریں تاکہ جیسا وہ باہر سے اچھا بننے کی کوشش کر رہا ہے ویسا وہ اندر سے بھی اچھا بن سکے۔ آج کے دور میں اچھا بننا کوئی آسان کام نہیں، لوگ تو باہر سے بھی اچھے نہیں رہے۔۔۔

عزت و احترام سے بات کرنا۔۔۔ نایاب ہو گیا ہے۔۔۔ احترام آدمیت ختم ہوتی نظر آ رہی ہے۔۔۔ اچھے نظر آیئے۔۔۔ اچھی باتیں کیجئے ۔۔۔۔ اپنے ظاہر کو بدلیئے اور اپنے اندر کو بدلنے کی دعا بھی کیجئے اور کوشش بھی۔۔۔۔ اللہ ہماری محنت کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔۔۔ ہم مجموعی طور پر انسانی قدروں سے بہت دور جا چکے ہیں۔۔۔ ہم سب کو یکسر بدلنے کی ضرورت ہے۔۔۔

ہم جنہیں اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں ہم ان سے بہت زیادہ اچھے بھی نہیں ہیں۔ اللہ ہمیں ہدایت دے، ہمیں ایسی قوم بنائے جس کا خواب ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا۔ ہم اکیلے اکیلے اس خواب کو پورا نہیں کر سکتے ہمیں ایک دوسرے کے لیئے زحمت نہیں رحمت بننے کی ضرورت ہے۔ اللہ ہمارے لیئے آسانیاں پیدا فرمائے۔

عنوان : دن، رات اور نشانیاں

تحریر : میاں وقار الاسلام

دن اور رات کے آگے پیچھے آنے جانے میں، غور کرنے والوں کے لیے اللہ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو ہمیں ہر معاشرے اور ہر جماعت میں روشن اور تاریک پہلو نظر آئیں گے۔ مگر سب سے تاریک پہلو منافقت کا پہلو ہوتا ہے۔ جب ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ پوری جماعت ہی خراب ہے یا پھر یہ کہ پورا معاشرہ ہی خراب ہے تو یقنا ہم منافقت سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔

جب کوئی یہ کہہ دیتا ہے تمام مدارس جہالت کی یونیورسٹیاں ہیں تو کسی مدرسے کا سربراہ بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ تمام یونیورسٹیاں جہالت کا گڑھ ہیں۔ یہاں دونوں ہی منافقت سے کام لے رہے ہوتے ہیں اور وہ جانتے بھی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ایم اے اسلامیات بھی ہوتا ہے، اور اسلامیات میں پی ایچ ڈی بھی کروائی جاتی ہے اور اسی طرح مدارس سے بہترین عالمِ دین بھی نکلتے ہیں جو آگے جا کر یونیورسٹیوں میں پڑھاتے بھی ہیں۔

آج بہت سے مدارس ایسے ہیں جو صرف اسلامی تعلیم نہیں دیتے بلکہ دیگر علوم بھی فراہم کر رہے ہیں اور بہت سے تعلیمی ادارے ایسے ہیں جو صرف دیگر علوم میں تعلیم نہیں دیتے بلکہ قران حفظ کروانے کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

قلمکاروں پر بھی الزام آتا ہے کہ جیسے معاشرے میں سارا بگاڑ ہی انہیں کی وجہ سے ہو، مگر پاکستان کا خواب بھی ایک قلمکار نے دیکھا تھا، اور وکیلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جیسے بدامنی اور لاقانونیت کی بڑی وجہ یہ خود ہیں، مگر پاکستان کے خواب کو تکمیل بھی ایک وکیل نے ہی دی تھی۔ ڈاکٹروں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ بیمار ذہنیت کی جماعت کوئی نہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کرونا ہو، ڈینگی ہو یا کوئی اور وبا تو جو لوگ صفِ اول میں اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں وہ بھی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ کسی ایک جماعت کو نہ تو قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے اور نہ ہی نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر جماعت میں بہترین سے بہترین لوگ بھی ہوتے ہیں اور یقینا برے سے برے لوگ بھی ہوتے ہوں گے۔

عورت مارچ کے حق میں جب بات کی جاتی ہے تو ساری ہی عورتوں کو مظلوم ٹھہرا دیا جاتا ہے، اور جب عورت مارچ کے خلاف بات کی جاتی ہے تو ان بے کس اور لاچار عورتوں کے مسائل کو بھی پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے جو پوری عمر اپنے بنیادی انسانی حقوق کے لیے لڑتی رہتی ہیں۔ بہت سے غریب مزدور اور محنت کش بھی پوری زندگی اپنے حقوق کے لیے لڑتے رہتے ہیں مگر یہاں وہ انسان ہوتے ہیں نہ کہ مرد اور عورت۔ ہر معاشرے میں انسانوں کی ایک جماعت کے (کہیں کم یا کہیں زیادہ) حقوق مارے جاتے ہیں جس کا تعلق غربت، مہنگائی اور ظالموں کے ظلم سے ہے نہ کہ جنس سے۔

ہر جماعت میں کچھ لوگ انتہائی ظالم ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ انتہائی مظلوم ہوتے ہیں، ان پر کوئی باہر کی جماعت ظلم نہیں کرتی بلکہ اسی جماعت کے مفاد پرست لوگ ان پر غالب آ رہے ہوتے ہیں۔ انتہائی بری رسم ہے کہ ظالم ظالم کا ساتھ دیتا ہے اور مظلوم دیوار سے لگا دیے جاتے ہیں۔ ظالموں کا ظلم بڑھتا رہتا ہے اور مظلوموں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور بدترین عدالتی نظام معاشرے کی اس پستی کا خاموش تماشائی بن کر رہ جاتا ہے۔ جہاں عدالتیں برائے فروخت ہوں، وہاں قوانین بھی برائے فروخت ہوتے ہیں اور وہاں ضمیر بھی برائے فروخت ہوتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ کمزور لوگ ظالموں کے خلاف اکھٹے ہوں، مگر یہاں تفریق کر دی جاتی ہے، لوگوں کو جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور ہر جماعت پر اس کا ظالم گروہ غلبہ پا جاتا ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو ہر جماعت میں اس کی کمزور جماعت نقصان اُٹھا رہی ہوتی ہے۔

چھوٹے علاقے محروم رہ جاتے ہیں، مگر چھوٹے علاقوں میں بڑے لوگ آج بھی کئی ایکڑوں کی حویلیوں میں بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں اور ان کے 50 سے زیادہ نوکر بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑے شہروں میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو کرایے کے مکانوں میں رہتے ہیں اور ان کی پوری زندگی کرائے کے مکانوں میں ہی گزر جاتی ہے۔ کمزور لوگ ہر جگہ کمزور ہیں اور مضبوط لوگ ہر جگہ مضبوط ہیں۔ ایک علاقے کے مضبوط لوگ جب دوسرے علاقے کے مضبوط لوگوں سے لڑتے ہیں تو یہ اپنے مفادات کی جنگ لڑتے ہیں نہ کہ یہ اپنے علاقے کے کمزور لوگوں کی جنگ لڑتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے ہے کمزور لوگوں کو ان کے علاقے، یا ان کی جماعت یا پھر ان کی برادری کے بڑے لوگ ہی ڈس لیتے ہیں۔ منافقت کے اس دور میں اندھیر نگری اور چوپٹ راج کی سمجھ کسی کو کب آنی ہے۔

اپنے علاقے کے لوگوں کا ساتھ دیں، اپنی جماعت کے لوگوں کا ساتھ دیں، اپنی برادری کے لوگوں کا ساتھ دیں مگر ظالم اور منافق لوگوں کا ساتھ ہر گز نہ دیں یہ صرف اپنے مفادات کی جنگ لڑیں گے اور آپ کو پیادوں کی طرح لڑواتے اور مرواتے رہیں گے، اور آخر میں جیت بھی انہیں کی ہو گی۔

میں اپنے آپ کو بہترین قلمکاروں کی صف میں کبھی شامل نہیں کرتا، بلکہ میں قلمکاروں سے سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور بڑے قلمکاروں کا طالب علم ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے زندگی میں بہت سے قلمکاروں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور ان سے سیکھنے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ میرے حلقہء احباب میں بہت سے قلمکار ہیں جو انتہائی نفیس شخصیت کے مالک ہیں، اپنے رب سے، اپنے رسول اور اپنے ملک سے محبت کرنے والے ہیں، رہنما دوست ہیں جو ہمیشہ اپنے مفاد سے زیادہ دوسروں کے مفادات کی فکر کرتے ہیں۔ مگر میں قلمکاروں کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا، کیوں کہ ہر جماعت کی طرح اس جماعت میں بھی ظالم اور منافق لوگ شامل ہیں۔ ایسے لوگ بھی شامل ہے جو نئے لکھنے والوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں، انہیں گمراہ کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے قلم اور اپنے ضمیر کو بیچ دیتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے لیے ادب ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنی جماعت کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر لکھوں نہ کہ منافقت سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دوں سے سب اچھا ہے، اور نہ ہی یہ کہوں کہ سب برا ہے۔

ہر جماعت میں نئے آنے والوں کے لیے مسائل ہوتے ہیں، جو لوگ کسی بھی جماعت میں پرانے ہیں انہیں چاہیے کہ جن مسائل کا سامنا انہیں کرنا پڑا تھا اس طرح کے مسائل کا سامنا نئے آنے والوں کو نہ کرنا پڑے۔ بہت سی جماعتوں میں ایسا دیکھنے کو ملتا ہے، کہ پرانے لوگ نئے آنے والے لوگوں سے چن چن کر بدلہ لیتے ہیں، شاید جو سلوک ان سے ان کے بڑوں نے کیا تھا، وہ نئے آنے والوں سے اُسی بات کا بدلہ لے کر اپنی ذات کی تسکین چاہتے ہیں۔ یقین مانیں بدلہ لینے میں وہ تسکین ہر گز نہیں ہے، جو بدلے کی کیفیت کو بدل دینے میں تسکین ہے۔

تاریک پہلوں کی حوصلہ شکنی بھی ضروری ہے، اور روشن پہلوؤں کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے، مگر ضروری نہیں کہ منافقت سے بھی کام لیا جائے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ ہمیں فکری سوچ دے تاکہ ہم اپنے رب کی مزید نشانیوں کو پہچان سکیں اور اپنے لیے بہتر راستے کا انتخاب کر سکیں۔ آمین۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو

تحریر : میاں وقار الاسلام

قران پڑھیں ، تاکہ ہمیں معلوم ہو یہ کائنات کیوں تخلیق کی گئی اور ہمیں اس میں کیوں بھیجا گیا، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہماری طرف کیا پیغام بھیجا گیا اور ہماری طرف پیغام بھیجنے والا کون ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے لیے دینِ اسلام ہی کیوں منتخب کیا گیا، اور جو لوگ سیدھے راستے سے ہٹ گئے وہ لوگ کون تھے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ پچھلی اُمتوں کے ساتھ کیا ہوا، جنہوں نے احکامات کو مانا ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا جنہوں نے احکامات کو جھٹلایا ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور وہ کس چیز سے غافل ہو رہے تھے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ کائنات کتنی بڑی ہے، کتنے بڑے بڑے سیارے ہیں، ان کی کیا منزلیں ہیں، کون نہیں تھامے ہوئے ہے، زمین کیسے بنائی گئی ہے، سورج اور چاند کو کس نے حرکت میں رکھا ہوا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی نہیں ہے، جو اس دنیا میں آیا ہے اس نے ایک دن چلے جاتا ہے اور مٹی نے اس کے جسموں کا وجود بھی باقی نہیں رکھنا، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ جتنے بھی لوگ اس دنیا سے جا چکے ہیں انہیں ایک دن جی اُٹھنا ہے اور ان سے ان کے اعمال کا حساب ضرور ہو گا۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ کہ انسان پیدا کیسے ہوتے ہے، اس کا وجود کیا ہے، اس کے اعضاء کو کیسے درست کیا جاتا ہے اور کسے اس کے اعضاء کو کام میں لایا جاتا ہے اور پھر کیسے اس کے اعضاء کام کرنا چھوڑتے جاتے ہیں اور کیسے ہو بچپن کی حالت میں لوٹا دیا جاتا ہے اور آخر میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانے سے ہمارا ایمان مکمل ہوتا ہے اور کن کن چیزوں کے انکار سے ہمارا ایمان جاتا رہتا ہے اور کس طرح کسی کو شریک ٹھہرانے سے ہمارا ایمان باقی نہیں رہتا اور ہمیں مشرک جماعت میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ کون کون سے اللہ کے مقرب اور چنے ہوئے لوگوں کو کون کون سی امت کے لیے ہدایت کا سرچشمہ بنا کر بھیجا گیا، انہوں نے اپنی قوموں سے کیا کہا، ان کی قوموں نے انہیں کیا جواب دیا اور ان کی قوم کے احوال کیا تھے اور ان کے بعد آنے والی قوموں کے احوال کیا تھے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ دین اسلام کی کس طرح سے تبلیغ کی گئی کس طرح سے ایک چھوٹی سی جماعت کو پوری دنیا میں پھیلا دیا گیا اور اس کی جڑھیں مضبوط کر دی گئیں اور کس طرح سے اللہ نے اپنا فضل جاری رکھا۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ اخلاقی اور معاشرتی برائیاں اور بیماریاں کیا ہیں، ایسے کون سے برے اعمال ہیں جنہیں ہم برا ہی نہیں سمجھتے ،اور کس طرح سے اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے رستے پر چلنا ہے اور کس طرح سے شیاطین کی پیروکاری کو چھوڑنا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہمیں انتہائی برے لوگوں سے کیسے پیش آنا ہے، اچھا اخلاق کیا ہے، حسنِ سلوک کیا ہے، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ لوگوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں، ہمسائیوں کے کیا حقوق ہیں، رشتہ داروں اور دوستوں کے کیا حقوق ہیں اور عام عوام جن سے ہم کام لیتے ہیں یا جن سے ہمیں فائدہ پہنچتا رہتا ہے ان کے ہم پر کیا حقوق ہیں۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہم نے اللہ سے مانگنا کیا ہے، اپنے گناہوں کا اعتراف کیسے کرنا ہے، توبہ کیسے کرنے ہے، پھر سے گناہ نہ کرنے کا عہد کیسے کرنا ہے، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ خاص اللہ کو یاد کر کے رونا کیا ہوتا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ نیک بندوں کے اوصاف کیا ہوتے ہیں،، برے بندوں کے اوصاف کیا ہوتے ہیں، اس دنیا کی اور اس دنیا کی دولت شہرت عزت اور مرتبے کی حیثیت کیا ہے، اور آخرت کی دولت کیا ہے، آخرت میں شہرت اور عزت اور بلند مرتبہ کسے ملے گا اور آخرت میں رسوا ہونے والے کون ہیں۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ نجی زندگی صرف نجی زندگی نہیں ہے، بلکہ ایک ذمہ داری ہے جس کے فرائض ہم پر لازم ہیں، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ عورتوں کے اور مردوں کے حقوق اور فرائض کیا ہیں اور ان کی حدیں کیا ہیں اور ان حدوں سے تجاوز کرنے کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ انصاف اور عدل کیا ہے، تعلیم اور تربیت کی کیا اہمیت ہے، عبادات کی کیا اہمیت ہے اور انسانیت کا کیا معاملہ ہے۔ حیا کیا ہے، پردہ کیا ہے شرم کیا ہے، وراثت کے بارے میں کیا سوال ہوں گے، زنا اور بے حیائی سے کیوں روکا گیا ہے۔ حلال کیا ہے حرام کیا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ اگر لوگ ہم سے محفوظ نہیں تو ہم کتنا بڑا ظلم کر رہے ہیں، قتل کیا ہے، قصاص کیا ہے، ظلم کیا ہے، مہربانی کیا ہے، معاشرے کیسے تباہ ہوئے، قوموں کا عروج کیا تھا، قوموں کا زوال کیا ہے۔ اپنے لوگوں کے حقوق کے لیے لڑنا کیا ہے، جہاد کیا ہے، دفاع کیا ہے سیاست کیا ہے۔

قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ دنیا کھیل تماشے کے لیے نہیں بنائی گئی، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ جیسے ہم ہیں ویسا ہمیں نہیں ہونا چاہیے، قران پڑھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ جیسا ہمیں ہونا چاہیے ویسا ہم کیسے بن سکتے ہیں۔

قران پڑھیں تاکہ معلوم ہو کہ کسی کا مذاق اڑانا کسی کی تزلیل کرنا کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ گناہ کبیرہ ہے جس کس حساب ضرور لیا جائے گا۔

قران پڑھیں تاکہ معلوم ہو، کسی کے 10 روپے بھی ناحق مارنا کتنا بڑا گناہ ہے، ورنہ لوگ لاکھوں روپے ہڑپ جاتے ہیں، اور اسے اپنی قابلیت سمجھتے ہیں، یہ ایک آگ ہے جسے وہ پیٹوں میں بھرتے ہیں، مگر نہیں جانتے۔

قران پڑھیں تاکہ معلوم ہو کہ ہمیں کس چیز سے ڈرایا گیا ہے، اور ہمیں کس چیز کی خوش خبری سنائی گئی ہے، قران پڑھیں تاکہ معلوم ہو کس کس عمل سے ہمیں دکھ دینے والا عذاب اُٹھانا پڑ سکتا ہے، قران پڑھیں تاکہ معلوم ہو کہ ہمارے پاس وقتِ مہلت بہت کم ہے۔

قران پڑھیں تاکہ اللہ ہماری مغفرت فرمائے اور ہم پر اپنا فضل قائم رکھے آمین

دعا گو میاں وقار الاسلام

صبر، تحمل، حوصلہ اور امید

تحریر: میاں وقار الاسلام

صبر، تحمل، حوصلہ اور اُمید ہر نفیس انسان میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ انہیں چیزوں کی وجہ سے انسان ثابت قدم رہتا ہے اور مشکلات کا سامنا کرتا چلا جاتا ہے۔ بظاہر بہت زیادہ خوش نظر آنے والے لوگوں کے سینے میں کتنے غم ہوتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ صبر ایک خاص صفت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے دکھ بڑے ہیں، مگر ہم نے دکھ دیکھے ہی کہاں ہیں۔ دنیا میں موت سے بھی اذیت ناک تکلیفیں ہیں۔ اس دنیا نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب لڑکیاں زندہ دفنادی جاتی تھیں، اور وہ دور بھی دیکھا ہے جب لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔

لوگ ایسے ظالم بھی تھے کہ پیغمبروں کو قتل کر دیا کرتے تھے، اور نیک لوگوں کا یہ کہ کر تمسخر بھی اُڑتے تھے کہ " یہ نیک بننا چاہتے ہیں۔ آج بھی حق کی آواز اُٹھانے والوں کو مفاد پرست طبقہ ناحق قتل کر دیتا ہے۔ اصلاح کے نام پر لوگ ہر طرح کا ظلم و جبر کر گزرتے ہیں۔

مال اور دولت لوگوں کو اپنی جانوں سے بھی پیارا ہوتا ہے تو پھر دوسروں کی جانوں سے پیارا کیوں نہیں ہوگا۔ انسانیت کا نام لیتے لیتے ہر طرح کی حیوانیت سے اپنے ہاتھ لال اور اپنے اعمال کالے کر لیے جاتے ہیں۔ امن کے نام پر بدامنی پھیلائی جاتی ہے، اور انصاف کے نام پر ناانصافی کی جاتی ہے۔ دین کے نام پر دنیا اور آخرت بیچ دی جاتی ہے۔

رشوت اور سود میں کوئی برائی نظر نہیں آتی اور رزقِ حلال کمانے والے مزدور کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بڑا گھر، بڑی گاڑی، بڑا بنک بیلنس، جس کے پاس ہے وہ بڑی شخصیت اور جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اسے تو انسان ہی تصور نہیں کیا جاتا۔

اُس دن کیا ہوگا جس دن صرف دلوں کی نمائش ہوگی، اور ظاہری چیزوں کو بے وقعت کر دیا جائے گا، تو جن کے دل رجوع سے خالی ہیں، ان کی کیا عزت رہ جائے گی۔

کاش ہم اپنے آپ کو پہچان سکیں، کاش ہم اس پیغام کو سن سکیں جو ہماری طرف بھیجا گیا ہے، کاش ہم جنت کی خوش خبر کو سمجھیں، کاش ہم دوزخ کے عذاب کو سمجھیں، کاش ہم فلاح پائیں۔

ایک طرف انسان آزمائش میں ہے اور دوسری طرف انسانیت خطرے میں ہے مگر تیسری طرف صبر ، تحمل، حوصلہ اور امید رکھنے والے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے رب سے ہر گز مایوس نہیں۔

اللہ صبر کرنے والوں کا صبر اور شکر کرنے والوں کا شکر دیکھتا ہے، اور اللہ صبر اور شکر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور اللہ امید رکھنے والوں کو کبھی ناامید نہیں کرتا۔

میرے ایک محسن تھے وہ کہا کرتے تھے کہ وقار تمہارا اور میرا ایمان تو دو فاقوں کی مار ہے، درست فرماتے تھے نہ ہم اس قابل ہیں اور نہ ہمارا ایمان اس قابل ہے کہ کسی بھی طرح کی آزمائش پر پورا اُتر سکے، ہم تو اللہ سے اس کا فضل و کرم مانگتے ہیں، ہم گناہ گار ہیں، مگر ہم بندے تو اسی کے ہیں، اور ہمیں مانگنا تو اسی سے ہے، اور ہم اس سے مانگ کر کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں

تحریر : میاں وقار الاسلام

زندگی میں کبھی کبھی ایسے موڑ آتے ہیں کہ انسان چاروں طرف سے پریشانیوں کا شکار ہو جاتا، یہاں تک کہ جن پر اس کا سالوں کا مان اور بھروسہ ہوتا ہے وہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے، انسان سمجھتا ہے کہ اسے بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا گیا ہے، یہاں تک کہ لوگ بھی کہنے لگتے ہیں کہ یہ تھا ہی ایسا جیسا اس کے ساتھ ہو رہا ہے، لوگوں کی تکلیف دہ باتیں درد کے احساس کو کئی گنا کر دیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ اپنے بندے کو سمجھانا چاہتا ہے کہ دیکھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے سوا تیرا کوئی بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں جو دعائیں اور معافی کے کلمات دل سے نکلتے ہیں ان کی لفاظی رب کی طرف سے آتی ہے اور دامن میں جو موتی گرتے ہیں وہ جنت سے آتے ہیں۔

انسان کی انتہائی بیزاری کی حالت اسے کس قدر مالا مال کر جاتی ہے اس کا وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا، بد قسمت وہ نہیں جو اس بیزاری کی کیفیت سے گذرتے ہیں بلکہ بد قسمت وہ ہیں جنہیں اللہ نے زندگی میں خود کو اچھی طرح سے بخشوانے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ پھر اللہ فرماتا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے اور مشکل کے ساتھ ہی تو آسانی ہے۔ پھر اللہ فرماتا ہے یا رسول اللہ ان سے کہ دیجئے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، سو ان سے کہ دیجئے کہ قران پڑھا کریں تاکہ ان پر رحم کیا جائے۔ پھر اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ جو تم دیکھتے ہو کہ تمارے حق میں بہتر نہیں ہے ہو سکتا ہے وہ دنیا اور آخرت کے حساب سے تمہارے حق میں بہتر ہو، اور جو تم سمجھتے ہو تمہارے حق میں بہتر ہے ہو سکتا ہے وہ دنیا اور آخرت کے حساب سے تمارے حق میں بہتر نہ ہو۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں اللہ ہی بہتر جانتا کہ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا نہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کو کبھی اکیلا نہیں کرتا۔

جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا کیوں نہیں ہوتا؟

تحریر: میاں وقار الاسلام

جیسا ہم چاہتے ہیں اگر سب ویسا ہونے لگ جائے تو دنیا جنت نہ بن جائے، اللہ فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو سب کو نیک کر دیتے، پھر یہ بھی فرماتا ہے کہ ہم جس سے جو کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں، اور پھر یہ بھی کہ یہ دنیا ہم نے کھیل تماشے کے لیے نہیں بنائی یہ اس لیے کہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ ماریں اور وہ اس کا سر توڑ دے اور پھر یہ بھی کہ تمہیں تمہارے حق میں بہتر معلوم ہوتا ہے ہو سکتا ہے دنیا اور آخرت کے لحاظ سے تمہارے حق میں بہتر نہ ہو، اور پھر یہ بھی کہ جو تم دیکھتے ہو تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے ہو سکتا ہے دنیا اور آخرت کے لحاظ سے تمارے حق میں بہتر ہو۔

مجھے نہیں معلوم کہ جب چیزیں ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتیں تو ہم ناامید اور مایوس کیوں ہو جاتے ہیں، جب کہ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے اور اللہ کیا ہی زبردست احاطہ کرنے والا ہے، اللہ فرماتا ہے کہ اگر میں تم میں فاصلہ نہ رکھتا رہتا تو کرہء عرض تباہ ہو جاتا، پھر یہ بھی فرماتا ہے کہ میں ہی سیاروں کو تھامے رکھتا ہوں، بادلوں کو چلاتا ہوں اور زمین مردہ کی طرف بھیج دیتا ہوں، میں ہی ہواوں کو چلاتا ہوں جو خوشخبری لے کر آتی ہیں، اور ان سارے کاموں میں میرا کوئی شریک بھی نہیں، یہ سب اللہ کی تنہا ذات کرتی آ رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے اور مشکل کے ساتھ ہی تو آسانی ہے، سو جس کو اللہ تعالی نے آزمائش میں ڈالا اور اس نے اس پر صبر اور شکر کیا یہ نہیں دیکھا گیا کہ اللہ نے اس کا مقام بلند نہ کیا ہو۔ اللہ اس طرح سے مردہ قوموں کو زندہ کیا کرتا ہے کمزور دلوں کو مضبوط کیا کرتا ہے اور آزماتا بھی ہے کہ کس کا دل رجوع لانے والا ہے اور کس کا دل انکار کیے دیتا ہے۔

اللہ کی ذات کے وجود پر ایمان لاتے ہوئے ناامیدی کی نحوست پر بھی یقین رکھنا اللہ کی طاقت اور رحمت سے منکر ہونا ہی تو ہے، اللہ کی رحمت ہر وقت ہر بندے پر برس رہی ہے مگر ہم بہت جلد ناامید ہو جاتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ جب ہم اپنے بندے کو اس طرح سے آزماتے ہیں کہ اسے اپنی نعمتوں سے نوازتے جاتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور جب دوسری طرح سے آزماتے ہیں کہ اس سے کچھ واپس لے لیتے ہیں تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔

پاکستان لاشوں کے ڈھیر پر بنا تھا، جن لوگوں نے مصیبتیں اُٹھائیں اور اپنے گھر چھوڑے، اپنا مال چھوڑا، اپنی زمینیں چھوڑیں، اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑا اور پاکستان کا حصہ بنے جن میں بہت سے شہید بھی ہو گئے اور بہت سے زخمی بھی ہوئے بہت سوں نے اپنے خون کے رشتے گنوا دیے مگر پاکستان کا حصہ بن کر رہے۔ انہیں اللہ کی اس بڑی نعمت کا یقین تھا اسی لیے انہوں نے پاکستان کی بنیادیں اپنے خون سے مضبوط کیں اور ہمیں اپنے ملک کی چار دیواری عطا کی اور چھت بھی فراہم کی۔ آج ہم کتنی آسانی سے اس بڑی نعمت کی ناشکرانی کر دیتے ہیں حالانکہ ہم نے اس کے لیے کسی قسم کی قربانی نہیں دی۔

یہ ملک آج بھی اپنے چاروں اطراف قربانیاں مانگ رہا ہے، شہیدوں کے لہو سے ہماری روز حفاظت کی جاتی ہے، کیا ہمیں اللہ کا شکر ادا نہیں کرنا چاہیے جس نے ہمیں اتنا مظبوط کیا کہ ہم خود سے پانچ گناہ بڑی طاقت کے سامنے پوری عزت اور وقار سے کھڑے ہیں، اگر زخمی ہم ہوتے ہیں تو زخمی وہ بھی ہوتے ہیں، اگر نقصان ہم اُٹھاتے ہیں تو نقصان وہ بھی اُٹھاتے ہیں مگر اللہ نے ہر موقع پر ہماری حفاظت فرمائی ہے تو کیا ہمیں شکر ادا نہیں کرنا چاہیے۔

محل وقوع کے لحاظ سے پاکستان دنیا کی جتنی اہم ترین جگہ پر واقع ہے اتنی ہی مشکل ترین جگہ پر بھی واقع ہے، دنیا کی 30 فیصد آبادی ایسی ہے جو دنیا کا 70 فیصد کماتی ہے اور دنیا کی 70 فیصد آبادی ایسی ہے جو دنیا کا 30 فیصد کماتی ہے اور یہ 70 فیصد آبادی چائنا کے ساتھ منسلک ہو رہی ہے جن میں 60 سے زیادہ ممالک شامل ہیں۔ چائنا اگلے دو سو سال تک ان علاقوں میں 4 سے 8 ٹریلین ڈالر کی سرمایا کاری کی منصوبہ بندی رکھتا ہے چائنا کا ون بیلٹ اکنامک روڈ منصوبہ اس وقت دنیا کا سب کے بڑا ترقیاتی منصوبہ ہے جو 70 فیصد دنیا کو آپس میں جوڑے دے گا یہ تقریبا 7700 کلومیٹر بنتا ہے جو گوادر سے یورپ تک جائے گا۔ دنیا کے 70 فیصد گیس اور تیل کے وسائل انہیں ملکوں میں ہیں جنہیں چائنا ایکسپلور کر رہا ہے۔ اور دنیا کی 70 فیصد دہشت گردی بھی انہیں علاقوں میں ہے اور اس کی وجہ سب کو سمجھ آ جانی چاہیے

دنیا جسے وار آن ٹیرر کے نام سے جانتی ہے وہ بنیادی طور پر وار آن آئل اینڈ گیس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جس میں امریکہ کے جیتنے کے آثار مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں بلکہ سو کالڈ امریکی سپر پاور کا سر اس میں پھنس چکا ہے اب وہ ہاتھ چلاتا ہے تو ہاتھ زخمی کروا بیٹھتا ہے اور پاوں چلاتا ہے تو پاوں زخمی کروا بیٹھتا ہے۔

گذشتہ دنوں بل گیٹس جو کہ مائکروسافٹ کا مالک اور دنیا کا امیر ترین شخص ہے اس نے امریکی نیشنل ہونے کے باوجود بیان دیا کہ چائنا دنیا کا واحد ملک ہے جس سے دنیا کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس نے مزید کہا کے گذشتہ 20 سالوں سے امریکہ نے انٹرنیشنلی کوئی بھی ڈپلومیٹک ویکٹری نہیں لی۔ اس نے مذید کہا کہ دنیا میں وسیع پیمانے پر روزگار کے نئے مواقع صرف اور صرف چائنا فراہم کر رہا ہے اور امریکہ بتدریج روزگار کے

مواقع کم کر رہا ہے۔اس نے یہ بھی کہا کہ گلوبل وارمنگ کو کم کرنے کے لیے رینیوایبل انرجی میں دنیا میں سب سے بڑا کردار چائنا ادا کر رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور بہت کچھ۔

امریکہ کے ساتھ چلنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم فیل سٹیٹ کے سٹیٹس تک پہنچ گئے، چائینا کے ساتھ چلنے سے ہم نہ صرف عسکری اور دفاعی لحاظ سے مضبوط ہوئے بلکہ معاشی تو پر بھی دنیا کے سب سے بڑے معاشی پراجیکٹ سی پیک اور چائنہ ون بیلٹ اکنامک پراجیکٹ کا حصہ بھی ہیں۔

اس پراجیکٹ کی ملکی سطح پر خوبصورتی یہ ہے کہ پاکستانی کی ساری سیاسی جماعتیں، بیوروکریسی اور فوج ایک پیج پر ہیں اور اس پراجیکٹ کی سیگنیٹری ہیں، ان کے آپس میں جتنے بھی اختلافات ہوں یہ سی پیک مخالف بیان نہیں دے سکتے اور پیچھے 7 سے 8 سالوں میں ایک بھی سی پیک سے متعلقہ اختلافی سیاسی بیان نہیں آیا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ میں دوسرے سے زیادہ سی پیک کو جانتا ہوں اور بس۔

اللہ کی ذات ہماری بے شمار کوہتائیوں کو باوجود ہم پر بہت مہربان ہے، ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، یقیناً دنیا کی اس بدلتی ہوئی صورتِ حال میں ہمیں کہاں فٹ ہونا ہے ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا، یہ جو راہیں ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں اس کے پیچھے اللہ کے راز ہیں تو ہمیں اپنے دو چھٹانگ کے ذہن پر اس کے وزن سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

اللہ کی مرضی

تحریر : میاں وقار الاسلام

جب اس کائنات میں کوئی بھی چیز نہیں تھی تب صرف ایک ہی نام تھا، ہمارے رب، ہمارے پروردگار، ہمارے اللہ کا نام۔ اور بالکل اسی طرح ایک ایسا دن آئے گا جب کرہ عرض تباہ ہو جائے گا، آسمان فنا ہو جائے گا، نہ انسان باقی رہیں گے نہ جن اور نہ فرشتے اور نہ ہی ان کا وجود رہے گا جنہیں اللہ کے سوا پکارا جاتا یہاں تک کہ زمین اپنا بوجھ اتار پھینکے گی اور اسے ایک ہموار میدان میں تبدیل کر دیا جائے گا اور قیامت قائم کر دی جائے گی، پھر صور پھونکا جائے گا اور روحیں جسموں سے ملا دی جائیں گی اور پھر اعمال کی عدالت لگائی جائے گی۔

دنیا کیا حقیقت یہی ہے کہ اس پوری کائنات کا کوئی مالک نہیں سوائے ہمارے رب کے جس نے ہمیں پیدا کیا، ہم اس دنیا میں اپنے رب کے مہمان ہیں اور اس کے فضل کے محتاج ہیں۔ نہ کوئی سانس اپنی مرضی سے چل سکتی ہے اور نہ ہی کوئی دل اپنے رب کے حکم کے بغیر دھڑک سکتا ہے۔ نہ زمیں کچھ اگا سکتی ہے نہ آسمان کچھ برسا سکتا ہے نہ کوئی مادہ کچھ جن سکتی ہے نہ کسی کو موت آ سکتی ہے مگر جیسے اللہ چاہے۔

اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، نہ کوئی پتہ گرتا ہے نہ زمین میں کوئی سوئی نکلتی ہے نہ کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے نہ کچھ آسمان میں چڑھتا ہے مگر اللہ ہر چیز کا علم ہے۔

اللہ ہمارے نفع اور نقصان کا مالک ہے پوری دنیا مل کر کسی کو نقصان پہنچانے چاہے تو نہیں پہنچا سکتی اور نہ ہی کسی کو فائدہ پہنچا سکتی ہے مگر جس کے حق میں اللہ اپنا حکم لکھ دے۔

جب ایک ایک چیز پر اللہ کی مرضی ہے اور یہاں تک

اللہ کا نظام ہے۔۔۔ مرنے والے نہیں آ سکتے مگر ہم سب نے ان سے ملنا ہے

ہم زندگی میں جو کچھ بھی بنتے ہیں اس کے پیچھے ماں کہ گود سے لے کر گھر والوں کی محبت، دوستوں کا ساتھ، استادوں کی شفقت اور اللہ کا فضل شامل ہوتا ہے

تب ہماری شخصیت ویسی بنتی ہے جیسی ہم دیکھتے ہیں، اور پھر ہم خود پر فخر بھی کرتے ہیں۔۔۔اس کے پیچھے ہزاروں لوگوں کی توقعات ہوتی ہیں۔۔۔ ہمیں بر حال ان محبتوں کے قرض اتارنے ہوتے ہیں

ہنستے مسکراتے چہروں کے پیچھے اکثر دکھوں کے سمندر ہوتے ہیں یہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ غم کی لہریں آنکھوں کے جھرنوں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی ہیں اور دامن بھی گیلا نہیں ہوتا۔۔۔ یہ اللہ کے فضل کے بغیر ممکن نہیں اور یہ فضل صبر کرنے والے دلوں پر نازل ہوتا ہے

انسان بڑے بڑے غم سہہ جاتا ہے، اللہ کیسے کیسے دھانے کھول دیتا ہے۔۔۔ بے شک وہی قادر ہے

اور جن کا انتخاب اللہ کرے، ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔۔۔ انسان اللہ کی رضا کو سمجھ لے تو کسی حال میں نادل نہیں ہو سکتا

جس کو آزمایا جاتا ہے وہ خاص ہوتے ہیں تو ہی انہیں آزمایا جاتا ہے

جیسے اللہ شہید چنتا ہے ویسے ہی ان کے لواحقین بھی چنتا ہے دنیا کے سب سے دکھی انسان کے سامنے جب جنت لائی جائے گی تو وہ کہے گا کہ یا اللہ میں تجھ سے راضی ہو گیا

اس پر بھی ہمیں حکم ہے کہ جن چیزوں پر اختیار ہے وہ بھی اللہ کی رضا کے لیئے ہوں

جدا ہو جانے والے انسانوں میں ایک خاص روح پھونکی جاتی ہے جس سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا ہے۔۔۔ اللہ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ لے لیتا ہے

اگر صبر کے بدلے جنت مل جائے۔۔۔ تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔۔۔ ہم اللہ کے مہمان ہیں، وہ جیسے ہمیں رکھنا چاہتا ہے ویسے ہی ہمیں رکھتا ہے بہت کم چیزیں ہیں جو ہم اپنی مرضی سے کرنے کا اختیار رکھتے ہیں

اور جن کا انتخاب اللہ کرے، ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے

انسان اللہ کی رضا کو سمجھ لے تو کسی حال میں نادل نہیں ہو سکتا

جس کو آزمایا جاتا ہے وہ خاص ہوتے ہیں تو ہی انہیں آزمایا جاتا ہے

جیسے اللہ شہید چنتا ہے ویسے ہی ان کے لواحقین بھی چنتا ہے

ہمیں اس کے رازوں کا کچھ علم نہیں ہوتا۔۔۔ ہم جس بات سے روتے ہیں نا جانے وہ اس بات سے کون سے فضل کے دروازے کھولنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

زندگی میں جو بھی تبدیلیاں آتی ہیں وہ یونہی نہیں آتیں۔۔۔ اس میں اللہ کے گہرے راز ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بعض دفعہ ہم بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر الفاظ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ کا نظام ہے۔۔۔ مرنے والے نہیں آ سکتے مگر ہم سب نے ان سے ملنا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یادِ یار میں ڈوبے، تو کیا ڈوبے

تحریر: میاں وقار الاسلام

کسی کی آنکھیں، کسی کے آنسو، کسی کے ہونٹ، کسی کا تبسم، کسی کے گیسو، کسی کا چہرہ، کسی کا آنچل، کسی کی پائل، کسی کا جھمکا، کسی کی چوڑی، کسی کا کنگن، کسی کا پہلو، کسی کا لہجہ، کسی کا شرمانا کسی کی ادا۔۔۔۔۔۔ یاد_یار میں ڈوبے، تو کیا ڈوبے

اس کائنات کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ انسان جہاں نظر دوڑاتا ہے وہیں ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔ کوئی نیلگوں آسمان میں ڈوبا ہے، کہکشاوں میں ڈوبا ہے، کوئی وادیوں میں کھویا ہے، کوئی پہاڑوں پر فدا ہے، کوئی آبشاروں میں ڈوبا ہے، کوئی ساحل_سمندر کے جھرنوں میں ڈوبا ہے، کوئی سمندر گہرائیوں میں ڈوبا ہے، کسی کو صبح سویروں سے عشق ہے، کسی کو ڈھلتی شاموں سے محبت ہے تو کوئی رات کے پچھلے پہروں میں ڈوبا ہے۔ نگاہ_انسان نظاروں میں ڈوبی تو کیا ڈوبی

ادبی اور علمی تخیل بھی انسان کو بیٹھے بیٹھے گہری یاد میں ڈبو دیتے ہیں کسی کی بات، کسی کا شعر، کسی کی غزل کسی کی نظم، کسی کی کہانی، کسی کا فسانہ، کسی کی نصیحت، کسی کا قوم، کسی کا مشاہدہ، کسی کا تجربہ، کسی کا فن، کسی کی پینٹنگ، کسی کا سر کسی کا ساز، کسی کا کھیل، کسی کی اداکاری یا پھر کسی کا کوئی اور انداز انسان کو حیران اور پریشان کرنے کے لیئے کافی ہو سکتا ہے۔ انسان اپنی ہی سوچ میں ڈوبا تو کیا ڈوبا

انسان خوشی میں بھی ڈوبتا ہے، انسان غم میں بھی ڈوبتا ہے انسان نشے میں بھی ڈوبتا ہے اور انسان ہوش میں بھی ڈوبتا ہے۔

انسان اللہ کی یاد میں بھی ڈوبتا ہے، جن لوگوں کے دل اللہ کے یاد سے منور رہتے ہیں ان کے دل جب اللہ کی یاد میں ڈوبتے تو ایسے ڈوبتے ہیں جیسے کسی بھی اور چیز کی یاد میں نہیں ڈوب سکتے، ایسے ہی دل سکون پاتے ہیں ایسے ہی دل رجوع کرنے والے ہیں، ایسے ہی دل اپنے اندر ایک جنت رکھتے ہیں، ایسے ہی دلوں کا ٹھکانہ جنت ہے۔

انسان غیر اللہ کی یاد میں بھی ڈوبتا ہے، جن لوگوں کے دل اللہ کے یاد سے منور نہیں ہوتے ان کے دل جب غیر اللہ کی یاد میں ڈوبتے تو ایسے ڈوبتے ہیں جیسے کسی بھی اور چیز کی یاد میں نہیں ڈوب سکتے، ایسے ہی دل بے چین اور بے سکون رہتے ہیں ایسے ہی دل ہیں جو رجوع کرنے والے نہیں، ایسے ہی دل اپنے اندر ایک دوزخ رکھتے ہیں، ایسے ہی دلوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ ایسے لوگ اللہ یاد سے غافل ہیں۔ ایسے ہی لوگ سے کہا جائے گا پکارو آج ان خداوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے۔

اللہ کی یاد میں ڈوبنا کسی نعمت سے کم نہیں، جو لوگ اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے وہ بہت گناہوں سے بچا لیئے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر شیاطین کا داو نہیں چلتا، ایسے لوگوں کو نہ دنیاداری غافل کرتی ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب قران پڑھا جاتا ہے یا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں، ایسے لوگ ہی سمجھتے ہیں کہ اللہ کی یاد رونا کیا ہوتا ہے۔ جو دل اللہ کی یاد میں

روتے ہیں انہیں چھوٹی چھوٹی خواہشات کا ٹوٹنا بے چین نہیں کرتا، ایسے لوگ اللہ پر بھروسہ کیے رہتے ہیں مشکل حالات میں گھبراتے نہیں ہیں، صبر کیئے رہتے ہیں اور ناامید نہیں ہوتے اور اللہ کی رضا میں خوش رہتے ہیں ایسے لوگ اللہ سے راضی ہیں اور اللہ ان سے راضی ہے۔

دعا گو ہوں اللہ ہمیں اپنی ہدایت پانے والے لوگوں کے راستے پر چلائے نہ کہ بھٹکے ہوئے لوگوں کے راستے پر۔ آمین۔

شیطان کا حربہ

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہر شخص جو کلمہ گو ہے اور اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور آپنے رب کو راضی کرکی خواہش رکھتا ہے وہ کم یا زیادہ اسی کوشش میں رہتا ہے کہ جس طرح اس کے لیئے ممکن ہو وہ اپنے رب کو راضی کرے۔

اس خواہش کے حصول کے لیئے کوئی صدقہ خیرات وغیرہ زیادہ کرلیتا ہے، کوئی نماز اور روزوں کا خیال زیادہ رکھتا ہے یا جس کے پاس استطاعت زیادہ ہوتی ہے وہ حج اور عمرے زیادہ کرلیتا ہے۔ لوگ فلاحی کام بھی کرتے ہیں، جیسے سکول اور ہسپتال بنانا یا مذہبی کام جیسے مسجد اور مدرسے بنانا یا کسی کا خرچہ اٹھانا یا غریب بچیوں کی شادی کروادینا یا اسی طرح کے اور کام۔ کوئی ان تمام کاموں میں سارے بھی کرتے ہیں اور کوئی کچھ کام تو کر پاتے ہیں اور کچھ نہیں۔

جب انسان اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق کوئی بھی اچھا کام شروع کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا دل اسی کام کی طرف مائل ہونے لگتا ہے اس انسان کے اندر بھی بہتری آتی ہے اور ارد گرد کے لوگ بھی اسے اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔

یہاں سے دو رستے نکلتے ہیں ایک خود پسندی اور خود نمائی اور دوسرا عاجزی اور انکساری۔

دونوں رستے اپنے اپنی انتہا کر طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ ایک شخص چاہتے ہوئے مشہور ہو جاتا ہے اور دوسرا نا چاہتے ہوئے شہرت کی بلندیوں کی طرف پہنچ جاتا ہے۔

ایک اپنے آپ کو صحیح سمجھتا جاتا ہے اور مزید متکبر ہوتا جاتا ہے، لوگوں سے دور ہوتا جاتا ہے اور اپنی ذات کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو وہ کر رہا ہے وہ ٹھیک ہے اور جو اس طرح نہیں کر رہے وہ سب غلط ہیں۔ خو لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں وہ بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کا یقین جو وہ کر رہا ہوتا ہے اور پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ شخص لوگوں میں مشہور زیادہ ہوتا ہے۔

دوسرا شخص لوگوں کے قریب ہوتا جاتا ہے اپنے گناہوں پر مذید شرمندہ ہوتا رہتا۔ اس کی عاجزی اور انکساری اور بڑھتی ہے اور وہ زیادہ اخلاص کے ساتھ اپنے رب کو راضی کرتا ہے۔ یہ شخص شہرت کی بلندیوں پر تو نہیں ہوتا مگر لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

معاشرہ دونوں کو قدر کی نگاہ سے ہی دیکھتا ہے، معزز کو بھی اور مشہور کو بھی۔

فہرست مضامین

	ثقافتی اور سماجی	
1	سرائیکی کلچرل ڈے	260
2	وقارِ پاکستان کے سنگ	261
3	متوازن سیاحت	264
4	غلبہ یا سمجھوتہ	266
5	شریکِ محبت	269
6	مرد، عورت اور انسان	272
7	حیااور غیرت	273
8	تہذیب کادائرہ	277
9	اختلاف برائے اختلافات	278
10	مذہبی اور سیاسی گفتگو کی ممانیت ہے	280
11	بے پردہ، باپردہ	282
12	غیرت مند کہاں جائیں	284
13	دیانت دار معاشرہ اور بد دیانت معاشرہ	286
14	جہالت کے جہاں اور بھی ہیں	289
15	ٹاؤٹ شاؤٹ آؤٹ	293
16	ابھی نہیں تو کبھی نہیں	295
17	ایک مچھلی	298
18	جنگل کا بھی کوئی قانون ہوتا ہے۔	301
19	قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے	303
20	اتائی ڈاکٹروں کا کینسر	305
21	تنگ نظری اور آزادی خیالی	307
22	بناؤ سنگھار	310
23	غیر مہذب رویئے غیر مہذب قومیں	314
24	بچوں سے زیادتی واجب القتل جرم	316

25	مسئلہ مرد اور عورت کا نہیں مسئلہ انسانیت کا ہے	319
26	پاکستانی ڈرامے اور کافرانہ نظریات کا پرچار	321
27	چلتی پھرتی زندگی اور موت	323
28	غیر معیاری سوچ کبھی معیاری معاشرہ تشکیل نہیں دے سکتی	325
29	لوگوں کو تکلیف رہے گی	326
30	زنانہ مرد، مردانہ عورت	329

سرائیکی کلچرل ڈے ملتان

تحریر: میاں وقارالاسلام

مارچ کو وسیب کے واسی ہر سال سرائیکی اجرک ڈے کو قومی تہوار کے طور پر مناتے ہیں اور پوری دنیا کو محبت اور امن کا پیغام بھیجتے ہیں 6 ۔اجرک کا لفظ عربی لفظ ''ازرق'' سے نکلا ہے۔جس کے معنی ہیں نیلا رنگ۔سندھیوں نے بھی سندھی اجرک کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے کہ جب عرب افواج علاقے میں داخل ہوئی تو مقامی باشندوں نے نیلی چادریں اوڑھی ہوئی تھیں اور وہ ان چادروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کی زبان سے بے ساختہ ازرق، ازرق کے الفاظ ادا ہوئے۔پھر ''ز'' کا حرف ''ج'' میں تبدیل ہوا اور یہ اجرک کہلائی جانے لگی۔

گذشتہ روز 17 مارچ 2021 کو ملتان میں سرائیکی کلچرل ڈے کا اہتمام کیا گیا، پروگرام میں مقامی مہمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر شہروں سے بھی مہمانوں کو مدعو کیا گیا جن میں لاہور سے جناب میاں وقارالاسلام، پرنسپل کنسلٹینٹ مارول سسٹم، فاؤنڈر وقارِ پاکستان، سیالکوٹ سے جناب سہیل رضا ڈوڈھی، سیکٹری پی ایچ ایم اے، ملتان سے محمد ذوالقرنین مغل، ڈائیریکٹر جرنل، ایکمے انسٹی ٹیوٹ آف سیفٹی پروفیشنل، اور ملتان ہی سے محمد مختار علی، مینیجنگ ڈائیریکٹر کیلی گرافرز آن لائن شامل تھے۔پروگرام کا مقصد مقامی کلچر، خاص طور پر سرائیکی کلچر کو فروغ دینا تھا، پروگرام میں سرائیکی شاعری کی نشست بھی ہوئی، اور سرائیکی لوگ گیت اور موسیقی کا اہتمام بھی کیا گیا، ملتان سے تعلق رکھنے والے نوجوان موسیقار جناب حمزہ عارف جنجوعہ نے مشہور لوگ گیت سنا کر محفل میں سماں باندھ دیا۔پروگرام میں سرائیکی کلچرل ڈے کے حوالے سے کیک بھی کاٹا گیا اور مہمانوں کو مقامی اجرک بھی پیش کی گئی۔ مہمانوں نے پروگرام میں گرم جوشی سے حصہ لیا اور سرائیکی موسیقی اور سرائیکی شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ مہمانوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا اور پروگرام کی حوصلہ افزائی اور تعریف بھی کی اور اس طرح کے پروگرامز کو جاری رکھنے کا بھی عزم کیا۔ پاکستان سے اور پاکستان سے باہر مقیم سرائیکی کلچر سے تعلق رکھنے والے اور سرائیکی کلچر سے محبت رکھنے والے بہت سے دوستوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنے محبت بھرے پیغامات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ خاص طور پر، اسلام آباد سے ڈاکٹر شہناز مزمل، چیئر پرسن ادب سرائے، لاہور سے ڈاکٹر سلطان محمود، ایم ڈی ایکو کیئر، اور سعودی عرب سے جناب ندیم اختر، سی ای او سائی سینس اور دیگر نے سرائیکی کلچر ڈے کے حوالے سے پروگرام کے بہترین انعقاد پر مبارکباد دی اور سرائیکی کلچر سے اپنی محبت کا بھرپور اظہار کیا۔پروگرام کے اختتام پر میزبانوں نے مہمانوں کی تشریف آوری اور ان کی بھرپور شراکت کا شکریہ ادا کیا۔

وقارِ پاکستان کے سنگ

تحریر: میاں وقار الاسلام

اپنی شناخت سے محبت کریں، دوسروں کی شناخت کی عزت کریں۔ اپنی زبان سے محبت کریں، دوسروں کی زبان کی عزت کریں، اپنی ثقافت سے محبت کریں، دوسروں کی ثقافت کی عزت کریں۔ اپنی پہچان پر مان کر ہر کسی کا حق، مگر اپنی پہچان سے دوسروں پر بڑائی مارنے، یا دوسروں کو چھوٹا دیکھانے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ انسانیت کا رنگ محبت ہے، اور محبت ہر انسان میں پائی جاتی ہے، جب تک انسان کو گمراہ نہ کر دیا جائے، یا ایک خاص طبقے کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انسانیت کا سودا نہ کیا جائے۔

اسلام ہمیں امن اور سلامتی کا پیغام دیتا ہے، نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے ساتھ رہنے اور بسنے والے تمام لوگوں کے لیے۔ اسلام ہمیں یہاں تک بھی تلقین کرتا ہے کہ لوگوں کی بری باتوں کا جواب بھی اچھے انداز میں دیا کرو۔ اسلام یہ بھی تلقین کرتا ہے کہ کسی کے خداؤں کو برا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ کہیں ہونا سمجھی میں واپس تمارے خدا کو برا کہیں۔

دنیا میں بہت سی قومیں بستی ہیں، بہت مذاہب ہیں، بہت سے کلچر ہیں، بہت سی رسمیں ہیں، بہت سے رنگ ہیں اور بہت سی نسلیں ہیں۔ مگر سب کا خدا ایک ہی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ رہنے دیتا ہے اور لوگ ہدایت آ جانے کے بعد بھی گمرہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رنگ نسل، قومیت، امیری اور غریبی کی وجہ سے کسی انسان کو فضیلت نہیں دی، بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر انسان کی اصل پہچان ہونی ہے۔

انسانیت سے محبت کرنے والے، اور خوفِ خدا رکھنے والے لوگ پاکستان کے ہر کونے میں موجود ہیں، مجھے پاکستان اور پاکستان سے باہر ہر علاقے کے پاکستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع ملا۔ جس طرح کا خلوص اپنے سرائیکی بھائیوں سے ملا، اسی طرح کا خلوص بلوچی بھائیوں سے بھی ملا، سندھی بھائی بھی بہت مہمان نواز ہیں اور کشمیروں کی مہمان نواز بھی کم نہیں۔ پنجابیوں اور سرائیکیوں میں تو کبھی فرق ہی محسوس نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے علاقے ہیں اور بہت سی زبانیں بولنے والے دوست ہیں، اگر عام سطح پر معاملات دیکھے جائیں تو سب اچھا ہے، سب دوست بن کر رہنا چاہتے ہیں کوئی دشمنی نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی کسی کے دل میں نفرت پلتی ہے۔

وہیں اگر محرومیوں کی بات کر لی جائے، تو ظاہر ہے، بڑے شہروں کی طرف ہر کوئی لپکتا ہے اور چھوٹے شہروں کی طرف کسی کی سوچ نہیں جاتی، جو سہولیات قریبی بڑے شہروں میں ملتی ہیں اور شاید سالوں بعد چھوٹے علاقوں تک پہنچیں۔ مسائل شاید اس سے بھی نہیں ہوتے،

بلکہ مسائل اس سے ہوتے ہیں جب سیاست دان عوام کو جھوٹے اور بے بنیاد خواب دیکھاتے ہیں اور پھر انہیں اپنے ہی لوگوں کے سامنے چکنا چور کر دیتے ہیں۔ ہر علاقے میں نواب، رئیس اور وڈیرے پائے جاتے ہیں جو خود کو عام عوام سے الگ سمجھتے ہیں، یہاں ہر طرح کے امیر لوگ بھی ای جیسے نہیں، ہاں مگر جو ضمیر فروش ہیں وہ سب ایک جیسے ہیں۔

غیر منصفانہ عدالتی نظام، کرپشن، سیاسی انتقام اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش نے ایک خاص طبقے کو ہمارے سر پر مسلط کر رکھا ہے۔ وہی طبقہ رنگ بدل بدل کر ہمارے اوپر آ بیٹھتا ہے، پھر سے ہمیں نئے نئے خوابوں میں گھیراتا ہے اور پھر ایک نئی داستان رقم ہو جاتی ہے۔ عوام ایک ہی طرح کی چکی میں پستی رہتی ہے اور انہیں کی محرومیوں پر کسی ظاہم کی عمارتیں کھڑی ہو جاتی ہیں، کسی کے محل بن جاتے ہیں، کسی کی فیکٹریاں لگ جاتی ہیں اور کوئی بوریا بستر اسمیٹ کر باہر فرار ہو جاتا ہے۔ اور پیچھے رہ جاتی ہے وہی عوام اور ان کی محرومیاں۔

عوام لیڈروں کے پیچھے تقسیم ہوتی اور اور لیڈر عوام کو اور تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔ خیر بڑے لوگوں کے بڑے مسئلے اور چھوٹے لوگوں کے چھوٹے مسئلے۔ پھر بھی چھوٹے لوگوں میں بہت محبت پائی جاتی ہے۔ بہت خلوص پایا جاتا ہے، اس درجے کی لالچ نہیں پائی جاتی جس درجے کی لالچ مفاد پرست طبقے میں پائی جاتی ہے۔ اگر درمیانے متوسط طبقے کو لوگوں کو دیکھا جائے یا غریب لوگوں کو دیکھا جائے تو ان کے وسائل بھی ایک جیسے ہیں، یا پھر کچھ کم یا زیادہ، اور مسائل بھی ایک جیسے ہیں، کچھ کم یا کچھ زیادہ۔

تمام تر مسائل کے باوجود بھی، اور محرومیوں کا سامنے کرنے کے باوجود بھی، عام سطح پر محبت کا پہلو صاف نظر آتا ہے۔ اور محبت کیوں نظر نہ آئے ہم سب پاکستانی ہیں اور اپنے ملک اور اپنی مٹی سے پیار کرنے والے ہیں اور پیار کا رنگ ہمیں ہر جگہ نظر آئے گا۔ مگر کچھ لوگوں کو نفرت کی عینک بھی اتارنی پڑے گی۔ اللہ کرے کہ ہمارے ادارے اپنا فرض پوری ایمانداری سے نبھائیں، اور جو دوریوں کے کانٹے ہمارے سینے میں گاڑھے گئے ہیں انہیں نکال پھینکا جائے۔

آج کا نوجوان، کل کے نوجوان سے زیادہ باشعور ہے، آج کی تعلیم، کل کی تعلیم سے کافی بہتر ہے۔ آج کا میڈیا زیادہ آزاد ہے۔ آج کسی کی آواز کو دبانا ممکن نہیں۔ آج لوگوں میں فاصلے ڈالنا بھی آسان نہیں۔ آج دشمن کی شر انگیزیوں کے پول بھی کھل کر دنیا کے سامنے آ چکے ہیں۔ آج کا نوجوان زبان پر صرف شکوے اور شکائیت ہی نہیں رکھتا، بلکہ ہمت اور حوصلہ بھی رکھتا ہے اور وقت کی سنگینیوں کو سمجھتا ہے۔ آج کا نوجوان نہ کرپٹ لوگوں کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی نااہل لوگوں کو قبول کرے گا۔ وہ وقت بہت قریب ہے، جب آج کا نوجوان اس ملک کی قیادت سنبھالنے کے لیے کھڑا ہوگا۔

نیا پاکستان، نوجوان اور پڑھی لکھی باشعور قیادت ہی بنا سکتی ہے، پرانے خیالات کے اُلجھے ہوئے ذہنوں میں وہ ذرخیزی ہی نہیں کہ اس نرم مٹی سے سونا نکال سکیں۔ پرانی روائتی، کرپٹ، مفاد پرست اور نااہل قیادتوں نے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا اور پاکستان کی سلامتی پر حملے کئے اور پوری قوم کو شرمندگیوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

بہت جلد نئے پاکستان کا خواب نوجوان قیادت ہی پورا کرے گی اور اسی قیادت کے نمائندے اقبال کے شاہین ہوں گے اور یہی قیادت ملک کا نام روشن کرے گی اور وقارِ پاکستان کہلائے گی۔ نوجوان قیادت آج سیاست میں اپنی جگہ بناتی نظر آتی ہے اور بہت جلد یہاں سے روائتی سیاست کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نوجوانوں کے روشن مستقبل کے لیے اور پاکستان کے روشن مستقبل کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو اور پوری طرح سے پُرامید، میاں وقارالاسلام، فاؤنڈر، وقارِ پاکستان۔

متوازن سیاحت

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہماری 70 فیصد ٹورازم چھوٹے شہروں سے بڑے شہروں کی طرف ہے اور 30 فیصد بڑے شہروں سے چھوٹے شہروں کی طرف۔

اگر ہماری 70 فیصد ٹورازم بڑے شہروں سے چھوٹے شہروں کی طرف ہو جائے تو بہت سے چھوٹے شہروں کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔

چھوٹے شہروں کی ٹورازم بڑھے شہروں کی ٹوازم سے 70 فیصد سستی ہے، مگر یہ چھوٹے شہروں کی تقدیر بدلنے کے لیے بہت ہے۔

چھوٹے شہروں نے بڑے شہروں کو بہت دیکھا ہے، مگر بڑے شہروں کو چھوٹے شہروں کا بہت کم علم ہے، بہت سے چھوٹے شہر ابھی تک مسخر نہیں ہوئے۔

بڑے شہروں کو ٹورازم کے لیے تیار کرنے میں بلین آف ڈالرز کی لاگت چاہیے جبکہ چھوٹے شہروں کو تیار کرنے کی لاگت انتہائی کم ہے۔

بین القوامی سیاحوں کے لیے بڑے شہروں سے زیادہ چھوٹے شہر دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ بین القوامی سیاح ایسے مقامات کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں جنہیں پہلے کم ہی دیکھا گیا ہو۔

بڑے شہروں میں عام طور پر ملی جلی ثقافت پروان چڑھتی ہے جب کہ چھوٹے شہروں میں ثقافت بہت حد تک محفوظ رہتی ہے۔

چھوٹے شہر بڑے شہروں کی معشیت کو ہر لحاظ سے سپوٹ کرتے ہیں، جیسے سستی لیبر اور سستا خام مال اور ان گنت سستی اجناس وغیرہ۔

بڑے اور چھوٹے شہروں میں فاصلے کم ہونے کی وجہ سے مڈل مین مافیا کا گلا دبایا جاسکتا ہے اسی لیے دلال ایسے لوگوں کے لیے موزوں لفظ ہے۔

بروکرز اور دلال کسانوں کا بھی خون چوستے ہیں اور فیکٹریوں کا بھی خون چوستے ہیں، انسانوں میں سب سے گندے انسان یہی ہوتے ہیں۔

شہروں میں ویلج ٹاؤن اور دہاتوں میں سٹی ٹاؤن بننے چاہیں تاکہ دونوں اطراف کا باہمی لین دین مناسب قیمتوں پر ہو۔

جن چھوٹے شہروں کو کبھی ٹورازم کے لیے تیار کیا گیا تھا، آج وہاں کے لوگوں کا رہن سہن دیگر چھوٹے شہروں سے کئی درجے بہتر ہے۔

چھوٹے شہروں کے لوگوں کو بڑے شہروں میں جا کر اپنے شہروں کا نمائندہ بننا چاہیے، اور انہیں کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے بڑے شہروں کے دوستوں کو اپنے چھوٹے شہروں میں مدعو کریں اور اپنے ابائی شہروں کی عکاسی کریں۔ چھوٹے شہروں کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مقامی شہروں پر مضامین لکھیں، شارٹ ڈاکومنٹریز بنائیں، بہترین قدرتی مناظر کی تصاویر زیادہ سے زیادہ شئیر کریں۔ اگر چھوٹے شہروں کے لوگ اپنی مدد آپ نہیں کریں گے تو ان کی مدد کون کرے گا۔

بڑے اور چھوٹے شہروں کے درمیاں متوازن سیاحت پورے ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

DOMINATE OR COMPROMISE

غلبہ یا سمجھوتہ

ڈومینیٹ یا کمپرومائیز

تحریر : میاں وقار الاسلام

شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں یکسر مختلف طرز زندگی کے عادی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر لڑکی کا رجحان کھانے پکانے، سلائی کڑھائی کرنے کی طرف اگر زیادہ نہ بھی ہو تو تھوڑا بہت تو ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح شوخ رنگ پہننے اور میک اپ کا شوق بھی اپنی جگہ ہے۔ کچھ ماحول کا اثر سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارنے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح گھومنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا بات کرنا وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف لڑکوں کا اپنا ماحول ہوتا ہے، دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا زیادہ باہر رہنا یا پھر ہاسٹل لائف۔ اسی طرح ان کی شاپنگ بھی مختلف، پہننا، اوڑھنا، بچھونا بھی یکسر مختلف۔

لڑکیاں لڑکوں کی نسبت زیادہ آرگنائز ہوتی ہیں، زیادہ بن سنور کر بھی رہتی ہیں لڑکے ذرا کھلے ڈولے ماحول کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر عادی نہ بھی ہوں تو عادات کا فرق لڑکیوں میں اور لڑکوں میں خوب دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر یوں کہا جائے کہ لڑکا ایک گلیکسی سے آتا ہے اور لڑکی دوسری گلیکسی سے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہو گی۔

اب ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور دو مختلف قسم کے ماحول میں نشو نما پانے والے افراد ایک بندھن میں بندھنے کے بعد ایک چھت کے نیچے آ جاتے ہیں۔

اب لڑکا یہ چاہتا ہے کہ جس طرح کے ماحول میں وہ ڈھلا لڑکی بھی اسی ماحول میں ڈھل جائے اور لڑکی یہ چاہتی ہے کہ جس طرح کے ماحول میں وہ رہی لڑکا اس طرح کے ماحول میں ڈھل جائے۔ اگر دیکھا جائے تو فوری طور پر یہ تبدیلی ممکن نہیں ہوتی مگر پھر بھی تبدیلی آتی ہے۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ لڑکا ڈومینیٹ کر جائے اور لڑکی کمپرومائیز کر لے یا پھر لڑکی ڈومینیٹ کر جائے اور لڑکا کمپرومائیز کر لے۔ خیر جو بھی ڈومینیٹ کرے اس سے فرق نہیں پڑتا اور ایک خوبصورت سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اور دونوں میاں بیوی خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ ڈومینیٹ کرنے والا ڈومنیٹ کرتا رہتا ہے اور کمپرومائیز کرنے والا کمپرومائیز کرتا رہتا ہے۔ یہ دونوں ایک چھت کے نیچے اپنے اپنے رول کو ایڈجسٹ کر چکے ہوتے ہیں۔ جو ڈومینیٹ کر چکا ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور زندگی آئیڈیل ہے جبکہ کہ جو کمپرومائیز کر رہا ہوتا ہے وہ بھی اسے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر چکا ہوتا ہے۔

ڈومینیٹ کرنے والے کی زندگی تو جیسے شادی سے پہلے تھی شادی کے بعد بھی ویسی ہی رہتی ہے جب کہ کمپرومائیز کرنے والے کی زندگی میں کچھ تبدیلی نظر آنے لگی ہے تو وہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی جب اس کے دوست یا اس کی سہلیاں یا پھر ان کے ماں باپ یا بھائی بہن ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ہائے ہائے تم میں تو پہلے والی بات ہی نہیں رہی تو مسئلے یہاں سے شروع ہوتے ہیں۔

کمپرومائیز کرنے والا ڈومینیٹ تو کر نہیں سکتا مگر کمپرومائیز کرتا جاتا ہے اور پھر ایک پوائینٹ آتا ہے جب وہ پھٹ پڑتا ہے۔ اب ڈومنیٹ کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ کمپرومائیز کرنے والے کل تک تو ٹھیک تھا بلکہ لمبے عرصے سے ٹھیک تھا اور زندگی آئیڈیل تھی تو پھر اچانک کیا ہوا

بلی ایک دم سے شیرنی بن جاتی ہے یا پھر بلا ایک دم سے شیر بن جاتا ہے اور شکایات کی ایک لمبی لسٹ سامنے آنے لگتی ہے جو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں ہوتی۔

ڈومینیٹ کرنے کی بجائے اپنے ساتھی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا احترام کریں اسے وہی ماحول دیں جیسا ماحول اسے شادی سے پہلے دستیاب تھا یا پھر اس سے بھی بہتر۔ اپنے ساتھی کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں اگر وہ آپ کے لیے بدلے گا تو وہ اپنا آپ کھو دے گا۔ اس کی پرانی شناخت چلی جائے گی اور وہ خود کو ڈھونڈتا رہے گا اس کی وہ تمام صلاحیات جنہیں کھل کر سامنے آنا تھا وہ دب جائیں گی۔ جس کے ساتھ آپ زندگی کی حقیقی خوشی دیکھنا چاہتے ہیں اگر وہ ہی حقیقی طور پر خوش نہ ہو تو جس خوشی کی آپ کو تلاش ہے وہ خوشی آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔

شادی سے پہلے کی زندگی ایک کلی کی صورت ہوتی ہے جو شادی کے بعد کھل کر گلاب ہو جاتی ہے اور اس کی خوشبو چاروں اطراف کو مہکا دیتی ہے۔ کلی کے مرجھانے سے اس کی وہ چاشنی جو اس کے اندر موجود ہوتی ہے وہ وہیں دم توڑ جاتی ہے اور پھر کسی طرح باہر نہیں آ پاتی۔ پھر چاہے وہ لڑکا ہو یا پھر لڑکی ایک ادھورا پن دونوں میں بنا رہتا ہے۔

اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا گلہ کبھی نہ دبائیں اگر آپ کو پینٹنگ کا شوق ہے، شاعری کا شوق ہے یا پھر کوئی بھی اور شوق ہے تو اس کا سودا کبھی مت کریں نہ اپنے لیئے نہ اپنے ساتھ کے لیئے۔ ہو سکتا ہے جو کام آپ کو فضول لگتا ہو وہ آپ کے ساتھی کی خوشی کا سبب ہو یا پھر جو آپ کا شوق ہے جسے آپ اپنی ساتھی کو خوش کرنے کے لیے چھوڑ رہے ہیں ہو سکتا ہے اس کے ساتھ آپ کی تسکین بھی چلی جائے۔ ایک دوسرے سے ایسی خواہش مت کریں جس سے آپ کو تو بہت آسانی ہو مگر اگلا مشکل میں پڑ جائے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی تعریف کر دینے میں شاید آپ کا تو کوئی نفع نقصان نہ ہو مگر یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کے ساتھی کے احساسات بہت زیادہ خوشگوار ہو جائیں۔

یاد رکھیں کہ خوشگوار ماحول کبھی یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی ڈوپہ مینسی کو بھی تقسیم کریں اور کمپرومائیز کو بھی تقسیم کریں اور معاملات کو برابری کی سطح پر لے آئیں آپ کے ماحول سے زیادہ خوشگوار ماحول کسی کا نہیں ہو گا۔

شریکِ محبت

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان جانتا ہے کہ جس نے اسے بنایا ہے وہی اس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے، اور انسان یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا پاس جو بھی نعمتیں ہے جو بھی رشتے ناتے اور تعلق ہیں سب کے سب اسی کے مالک کا فضل ہے، اور تو اور انسان یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا مالک جب چاہے جو بھی چاہے اس سے واپس لے سکتا ہے، چاہے وہ مال اور دولت ہو، چاہے وہ عزت اور شہرت ہو، چاہے وہ طاقت اور منصب ہو، چاہے وہ بچپن اور جوانی ہو، چاہے وہ بڑھاپا ہو یا پھر چاہے وہ صحت ہو۔ سارا اختیار اس کے مالک کا ہے، وہ جو بھی چاہے وہ کر سکتا ہے۔ اور انسان یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے مالک جیسا کوئی دوسرا مہربان بھی نہیں۔ اور نہ ہی اس کے مالک جیسی کسی کی پکڑ ہے۔

سب کچھ جاننے کے باوجود انسان نے چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے اپنے مالک کی محبت میں شریک ٹھہرائے ہیں۔ انسان کی تمام غلطیوں کے باوجود اس کے مالک نے اسے کبھی ناامیدی کا درس نہیں دیا، بلکہ وہ اسے اپنی طرف بلاتا رہتا ہے، اور جب بھی انسان اپنے مالک کی طرف پلٹتا ہے، اسے عزت، منزلت اور محبت سے نوازا جاتا ہے اور اس پر رحم و کرم کیا جاتا ہے اور اس پر فضل کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہاں محبت حقیقی ہے، یہاں محبت بناوٹی نہیں ہے، یہاں محبت بے لوث ہے۔

اور ایک انسان کی دنیاوی محبت ہے، جس کے پیچھے وہ پاگل ہو جاتا ہے، جس کے لیے وہ جان بھی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی اسی دنیاوی محبت کو اپنا سب کچھ مان لیتے تھا، مگر اس کی یہ جان سے بھی پیاری محبت تھوڑی سی بھی شراکت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی۔ یہاں اگر محبوب تھوڑی سی بھی غلطی کر کے واپس آ جائے تو اس کے لیے معافی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ معافی تو دور کی بات ہے، صرف شک کی بنیاد پر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ کوئی دہائی، کوئی سفارش، کوئی صدقہ کوئی خیرایت کوئی چڑھاوا کام نہیں آتا اور محبت دفن ہو جاتی ہے۔

قصور محبت کا نہیں ہے، قصور ہے ہماری خود غرضی کا، ہم صرف پانا چاہتے ہیں، حاصل کرنا چاہتے ہیں، جیتنا چاہتے ہیں مگر ہارنا نہیں چاہتے، دینا نہیں چاہتے اس لیے جب ہماری کسی سے امیدیں ٹوٹتی ہیں تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

محبت کا یہ فلسفہ ہی غلط ہے، پالو، حاصل کر لو، یا جیت لو، محبت کا درست فلسفہ صرف ایک ہے، معاف کر دو، دے دو، اور لوگوں پر رحم کرو۔ اللہ کی حقیقی محبت ہمیں بتاتی ہے، کہ وہ ہمیں کبھی رسوا نہیں کرتا، کبھی مایوس نہیں کرتا، ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہماری پکڑ نہیں کرتا،

ہمارے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے۔ یہ کیسی محبت ہے، کہ پیار کرنے والے ایک دوسرے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ جہاں بات لینے کی اور حاصل کرنے کی یا پھر جیتنے کی ہوتی ہے وہاں تو ہارنا انسان کا مقدر ہی بنتا ہے۔ اور جہاں بات دینے کی ہو، بانٹنے کی ہو وہاں انسان خالی ہاتھ بھی رہ جائے تو بھی جیت اسی کی ہوتی ہے۔

آپ کے لاکھ شریک محبت ہوں، لاکھ گناہ ہوں، لاکھ خود غرضیاں ہوں، اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ کے ہاں آپ کا کوئی راز، راز بھی نہیں ہے، اس کے باوجود بھی جب آپ اپنے رب کو منانے کے لیے چند جھوٹ موٹ کے آنسوں بھی بہادیتے ہیں تو یہ اللہ کی بادشاہت میں آپ کی سوچ سے بھی زیادہ وزن رکھتے ہیں اور انسان کی بخشش کی وجہ بن جاتے ہیں۔ یہ ہے حقیقی اور بے لوث محبت۔ اور اسی طرح کی محبت کی ایک جھلک آپ کو ماں کی آغوش میں ملتی ہے، جسے صرف دینا آتا ہے، اور ماں جب تک حیات ہوتی ہے اپنے بچوں کو دیتی ہی چلی جاتی ہے، وہ اپنے بارے میں بھی بہت کم سوچتی ہے اور اپنے بچوں کے بارے میں زیادہ سوچتی ہے۔

انسان دنیاوی محبت کی شرطیں پوری کرتے کرتے اور یقین دلاتے دلاتے اور صفایاں دیتے دیتے تھک جاتا ہے، اور پھر ایک اجڑا چمن بن کر رہ جاتا ہے، تو اسے اس کی خود غرض محبت نے کیا دیا، ایسی خود غرض محبت جس کے لیے انسان اپنا بہت کچھ برباد کر دیتا ہے۔ اپنا آپ تو برباد کرتا ہی ہے، اپنا گھر بار یہاں تک کہ رشتہ دار اور قرابت والے بھی چھوڑ دیتا ہے اور پھر جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اس سے اسے حاصل کیا ہوتا ہے، ذلت اور رسوائی۔

کیا محبت ایسی ہوتی ہے، خود غرض اور لالچی، نہیں ہر گز نہیں، محبت اتنی مطلبی اور خود غرض نہیں ہوتی، بلکہ انسان ہی خود غرض اور لالچی ہوتا ہے، انسان محبت کے نام پر خود کو دھوکا دیتا رہتا ہے اور جب اس کی خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو پھر وہ محبت کو گالیاں دیتا ہے اور اسے برا بھلا کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برا انسان خود ہوتا ہے، خود غرض، لالچی اور مفاد پرست انسان خود ہوتا ہے۔

محبت کی طرح تمام رشتے پاک ہے، ماں باپ، بھائی، بہن، میاں، بیوی، دوست، قرابت والے، یہ تمام حرمت والے رشتے ہیں، مسئلہ ان رشتوں میں نہیں ہے بلکہ انسان کی اپنی سوچ میں ہے جو ان رشتوں کو نچوڑ کر اپنی خود غرضی کی پرستش کرتا ہے، خود غرض انسان کا سوائے اپنے کسی سے کوئی تعلق، کوئی رشتہ، کوئی ناتہ نہیں ہوتا، وہ ساری عمر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہتا ہے اور پھر اسی دھوکے میں مر جاتا ہے۔

انسان اپنے دل میں ہزار بے وفائیاں گنتا ہے، ہزاروں لوگوں کو کوستا ہے اور ہزاروں رشتوں کو برا بھلا کہتا ہے، مگر انسان اپنے آپ کو ایک اعلیٰ انسان بنانے کے لیے بہت زیادہ محنت نہیں کرتا، انسان سے اسے کے ہزار رشتوں اور ہزار تعلق داریوں کا حساب نہیں ہونا بلکہ انسان سے

اس کے اعمال کا حساب ہونا ہے کہ اس کے ہاتھ سے کتنی بے وفائیاں آگے گئیں، انسان نے کتنے لوگوں کو دکھ پہنچائے اور انسان نے کتنے لوگوں کو تکلیف دی۔ اگر دکھ سہنے والوں کو ان کے صبر کا صلہ ملے گا، تو ظالم کو ظلم کرنے کا اجر بھی ضرور ملنا ہے اور اللہ کسی کے ساتھ ناانصافی کرنے والا نہیں۔

انسان اپنا مواخذہ کرے کہ کس قدر یہ جذبہ رکھتا ہے کہ وہ کسی کو معاف کر سکتا ہے یا پھر درگزر سے کام لے سکتا ہے، ہم تو کسی کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں معاف کرنے کا ظرف نہیں رکھتے، مگر ہمیں اللہ کے ہاں سے بڑی امید ہے کہ وہ ہم پر فضل کرے گا۔

ہاں، فضل ہی بہتر ہے، کیوں کہ اگر انصاف کرے گا تو پھر ہم میں سے اکثر کا پلڑا بالکل خالی ہی ہے۔

مرد عورت اور انسان

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ تعالیٰ نے لاتعداد مخلوق پیدا کی ہے، زمین پر رینگنے والے، ہوا میں اُڑنے والے، پانی میں تیرنے والے، نظر آنے والے بھی اور نہ نظر آنے والے بھی، وہ بھی جو انسان کے علم میں ہیں اور وہ بھی جو انسان کے علم میں نہیں، جنوں اور فرشتوں کو بھی، وہ بھی جو زندہ ہے اور وہ بھی جو مر گئی، وہ بھی جن سے جنت کے باغات کا وعدہ ہے اور وہ بھی جو دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

لاتعداد مخلوق کا اکیلا مالک، جس نے انسان کو اپنی لاتعداد مخلوق پر فضیلت بخشی، انسان کو پیدا کیا، انسان کو عقلِ سلیم سے نوازا، اچھے اور برے کی تمیز دی اور پھر محدود اختیار بھی دے دیا، کہ جو چاہے وہ کرتا پھرے۔ اور پھر اسے لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔

انسان کا یہ کھلا اختیار دوزخ اور جنت کے ساتھ مشروط ہے۔ جنت کی راہ بھی اسے معلوم ہے اور دوزخ کا راستہ بھی اسے پتا ہے۔ اور ان دونوں راستوں میں وہ کس کا انتخاب کرتا ہے اس کی بھی اسے طاقت ہے۔

دوزخ مرد یا عورت کے لیے نہیں بنی اور نہ ہی جنت میں یہ تفریق رکھی گئی ہے کہ اس میں مرد داخل ہوں گے یا عورتیں۔ بلکہ ایک نامہ اعمال ہے جو مرد کے ہاتھ میں بھی ہو گا اور عورت کے ہاتھ میں بھی ہو گا تو چاہے مرد ہو یا عورت جس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا اس کی منزل جنت ہے اور جس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا اس کی منزل دوزخ ہے۔

حیااور غیرت

تحریر: میاں وقارالاسلام

باحیا" ہونا عورت کا ہی دوسرا نام ہے۔ "بے حیا عورت" بے حیائی کی نمائندہ ہوتی ہے اسے عورت کی نمائندگی کا حق ہر گز نہیں ہونا چاہیئے"

غیرت مند" ہونا مرد کا ہی دوسرا نام ہے۔ "بے غیرت مرد" بے غیرتی کا نمائندہ ہوتا ہے اسے مرد کی نمائندگی کا حق ہر گز نہیں ہونا چاہیئے۔"

بے حیا عورت" اور "بے غیرت" مرد دونوں کی حیثیت دو ٹکے کی ہوتی ہے۔انسان کو عزت اس کے کردار کی وجہ سے ملتی ہے اس کی جنس" کی وجہ سے نہیں۔

باکردار" عورت کی بھی معاشرے کے تمام فرد عزت کرتے ہیں اور "باکردار" مرد کی بھی معاشرے کے تمام فرد عزت کرتے ہیں۔"

بدکردار" عورت اور "بدکردار" مرد دونوں کو معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

دنیاوی ترقی بڑی ظالم چیز ہے یہ مرد کی آنکھ سے غیرت اور عورت کی آنکھ سے حیا چھین سکتی ہے اور کافی حد تک چھین بھی چکی ہے ایسی ترقی کا کیا فائدہ جس کا نقصان آخرت کی تباہی ہو۔

کچھ بے جان تحریکیں معاشرے میں بگاڑ کے لیئے پیدا ہوتی ہیں اور وقت کی قبر میں اپنے آپ دفن ہو جاتی ہیں۔ فلک شگاف نعرے زمین میں شگاف ڈھونڈ لیتے ہیں۔

طاقت یہ نہیں کے آپ اختیار رکھیں تو کمزور کو دبا دیں، بلکہ طاقت تو یہ ہے کہ آپ اختیار بھی رکھتے ہوں اور پھر کمزور کو معاف کر دیں بلکہ اسے اپنی طاقت میں سے حصہ دیں اور اسے بھی مضبوط کریں۔

نہ صرف امیر یا طاقتور مرد غریب اور کمزور عورتوں کا استحصال کرتے ہیں بلکہ امیر یا طاقتور عورتیں بھی غریب اور کمزور مردوں کا استحصال کرتی ہیں۔

جن معاشروں میں کمزور اور بے بس لوگوں کو انصاف نہیں ملتا ان معاشروں میں امن اور خوشحالی کبھی بھی داخل نہیں ہوتی کیوں کہ ظلم چاہے کسی بھی شکل میں ہو امن اور خوشحالی کا بڑا دشمن ہے۔

دو طرح کے طبقے ہیں ایک اتنے آزاد ہیں کہ ان کے مرد بھی آزاد ہیں اور ان کی عورتیں بھی آزاد ہیں اور دوسرے جن کی عورتیں بھی مجبور ہیں اور عورتیں بھی مجبور ہیں۔

اور ایک تیسرا طبقہ ہے جو باوجود آزاد ہونے کے اپنی حدود کا تحفظ کرتا ہے اور باوجود مجبور ہونے کے پھر بھی اپنی حدود کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں لوگوں کی عاقبت محفوظ ہے۔

صرف عورت ہی گھر سے نہیں بھاگتی، اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرد بھی گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے اسے جانور کی پنجرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ جتنا حق ہے اتنی آزادی ضروری ہے۔

میرے ایک استاد نے کہا تھا کہ "وقار" ہمارا ایمان تو دو فاقوں کی مار ہے تو ہمیں بڑے بڑے دعوے نہیں کرنے چاہیں بلکہ اللہ سے رحم مانگنا چاہیئے کہ وہ ہمیں کسی آزمائش میں نہ ڈالے۔

اللہ کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے لوگوں کے دن بدل سکتا ہے، جو کبھی شہزادے تھے یا شہزادیاں تھیں آج ان کے حالات فقیروں سے بھی برے ہیں اور جو کبھی در بدر کی ٹھوکریں کھاتے تھے آج صاحب اختیار ہیں۔

انسان کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ انسان بہت ہی کم شکر ادا کرتا ہے بہت سارے لوگ اسی ناشکری میں بہت کچھ گنوا بیٹھتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس کی قدر نہیں کرتے۔

اللہ نے جیسے عورت کے لیئے حد بندی کی ویسے ہی مرد کے لیئے حد بند کی ہے اور دونوں کو اپنی حدود میں رہنے کا حکم ہے۔ نہ مرد کو اجازت ہے کہ عورت پر غیر شرعی حدیں قائم کرے نہ عورت کو حق ہے کہ وہ مرد کے لیئے نئی حدیں مقرر کرے یہ مرد اور عورت کو راضی کرنے کی بات نہیں یہ اپنے رب کو راضی کرنے اور اس کا حکم ماننے کی بات ہے۔

مغرب نے عورت کو بہت زیادہ آزادی دی اور آزادی نے ان کا معاشرہ تباہ کر دیا اور اب یہ تباہی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہے ہے۔ مگر اسی تباہی میں اپنا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر بہت سی مغربی عورتیں اسلام میں اپنے لیئے جائے پناہ ڈھونڈتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔

یہ ہے اسلام اور یہ ہے اسلام میں عورت کا مقام۔ قران کسی شیطان مردود کا کلام نہیں جسے کبھی بھی جھٹلایا جا سکتا ہے۔ یہ کلام الہی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے اور ہمیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے کاش ہم سمجھتے۔

اللہ تعالی تمہیں عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، برے کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں وعظ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔[النحل: 90]

اور اس شخص سے کس کا دین بہتر ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہو، وہ نیکوکار بھی ہو اور یکسو ہو جانے والے ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کر رہا ہو۔[النساء: 125]

بیوی کے عنوان سے سورہِ روم، آیت 21 میں ارشاد پروردگار ہے: "وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ"، "اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت (نرم دلی و ہمدردی) پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں"۔

ماں کے عنوان سے سورہ احقاف، آیت 15 میں ارشاد الٰہی ہے: "وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا"، "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اس کی ماں نے زحمت کے ساتھ اسے پیٹ میں رکھا اور زحمت کے ساتھ اسے جنم دیا"۔

آپ ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ : جب تم حیانہ کرو تو جو من میں آئے کرتے جاؤ، بخاری۔

یہ اللہ کے مقرر کیئے ہوئے اندازے ہیں اور حد سے تجاوز کرنے والوں کا حساب ضرور ہوگا۔۔۔ چاہے وہ مرد ہوں یا پھر عورتیں اللہ سب کے ساتھ انصاف کرنے والا ہے اور وہ کسی بات سے لاعلم نہیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ہمیں ہدایت دے اور ہم ہر گز ظالم لوگوں میں شامل نہ ہوں۔ آمین

چاہا ہم نے سورج کو بھی
چاند سے ہم نے الفت کی ہے

عکس خدا کا ہر ذرے میں
ذروں نے بھی عبادت کی ہے

حیا پروئی ہے نظروں میں
ہر انسان کی عزت کی ہے

اہل وفا سے دنیا بھر کے
ہر باسی نے شرارت کی ہے

رب سے پیار کیا ہے جس نے
اس نے سب سے محبت کی ہے

شاعر : میاں وقار الاسلام

تہذیب کا دائرہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

مہذب قومیں کی تہذیب انہیں یہ نہیں سکھاتی کر ہر ظالم اور سرکش کی جی حضوری کی جائے، بلکہ مہذب قوموں کے باشعور افراد مظلوم کی آواز کو اُٹھاتے ہیں، ظلم کے خلاف لکھتے ہیں اور ایک عام آدمی کے درد سمجھتے ہیں اور اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ بے حس قوموں کی طرح سب اچھا ہے کا راگ نہیں الاپتے۔ نہ ہی مفلوج قوموں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ اللہ سب دیکھ رہا ہے اللہ خود ہی سب ٹھیک کر دے گا۔ ہم بات کریں گے تو کسی مصیبت میں آ جائیں گے۔ اور لوگ کیا کہیں گے۔ یہ ظالم پہلے والے سے کم ظالم ہے، یہ کرپٹ پہلے والے سے بہتر ہے۔ یعنی بڑا فرعون ہونا ظلم اور چھوٹا فرعون ہونا باعث رحمت، ایسے پڑھے لکھے جاہل اور مصلحت کے ذریعے ہر طرح کے مافیے کو سپیس دیتے دیتے پوری قوم کو اس آگ کی لپیٹ میں لے آتے ہیں۔

چور چھوٹا ہو یا بڑا چور چور ہوتا ہے اور اسے پکڑے جانے کا ڈر ہر وقت ہونا چاہیے، اگر عدالتیں نااہل ہوں چور کو یقین ہو کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا تو وہ کبھی چوری نہیں چھوڑے گا بلکہ چوری کرنے کے ایک سے ایک مہذب رستے ڈھونڈے گا۔ اور عوام ایک طرف تو پستی جائے گی اور دوسری طرف واہ واہ کرتی جائے گی۔

ایک عام آدمی حق پر بھی ہو تو بھی کرپٹ اداروں سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اس کی لپیٹ میں نہ آ جائے، ہمارے ملک میں واپڈا، پی ٹی سی ایل، پولیس، ٹیکسیشن ریلوے خواہ کوئی بھی محکمہ ہو ہمیں سارے افسر جلاد نظر آتے ہیں، اور ہم ہر جگہ ہی ان سے ڈر ڈر کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں واسطہ نہ پڑ جائے، حق پر چلنے والے ان افسروں سے ڈر ڈر کر گذرتے ہیں جب کہ چور اور لٹیرے ان کی اوقات سے واقف ہوتے ہیں کہ کس کی کتنی قیمت ہے اور جہاں سے چاہتے ہیں باآسانی گذر جاتے ہیں۔

اگر ہم نے یہ مہذب معاشرہ بنایا ہے تو مجھے افسوس ہے ایسی سوچ پر جو اسے مہذب معاشرہ کہتی ہے جس کے پور پور میں کرپشن کا کینسر بھرا ہوا ہے اور اس سے زیادہ افسوس مجھے ان پڑھے لکھے جوانوں پر ہے جن کی آنکھوں پر مصلحت کے پردے ہیں اور وہ ظلم کے خلاف آواز آٹھانے کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔

ظلم کے خلاف بولنا غیر مہذب نہیں ہے بلکہ ظالم کے خلاف نہ بولنا غیر مہذب ہے۔

اختلاف برائے اختلافات

تحریر : میاں وقار الاسلام

قران میں بہت سی ایسی قوموں کا ذکر ہے جو ایمان لانے کے بعد آپس میں اختلاف کر بیٹھیں اور فرقہ فرقہ ہوں گئیں، کیوں وہ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے تھے اور خدا پرستی کی بجائے انہوں نے اپنے اپنے کئی اور خدا بنا لیے اور گمراہ ہو گئیں۔ اختلاف برائے اختلاف کی ہدت اتنی زیادہ تھی کہ انہوں نے پیغمبروں اور نبیوں کی تکزیب کی انہیں جھٹلایا، انہیں ہر طرح سے تکلیف دی کئیوں کو تو قتل بھی کر دیا اس لیے کہ وہ انہیں کچھ نہ کہیں اور اپنی من مانی کرتے چلے ہیں۔ کئی امتوں پر عذاب در عذاب بھیجے گئے مگر انہوں نے اپنی خصلت نہ بدلنی تھی اور نہ بدلے یہاں تک کہ ذلت اور رسوائی ان سے چمٹا دی گئی۔

کیا ہم بھی اختلاف برائے اختلاف کی دوزخ میں نہیں جل رہے، کیا ہم نے بھی اپنے اپنے لیڈروں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہوئی، ہم شریعت کی بات بہت کرتے ہیں لیکن اپنے لیے اسے چھوڑے دیتے ہیں، ہمیں سب سے زیادہ مزہ دوسروں کا احاطہ کرنے میں آتا ہے ہم کبھی اپنا احتساب نہیں کرتے۔ ہم ہر چیز کی برائی کرتے ہیں، ہم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے۔

سالوں محکوم رہنے کے بعد جب ہم آزار تو ہوئے ہیں مگر شاید ذہنی تو پر ابھی بھی ہمیں آزادی نہیں ملی، حکمرانوں یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں غاصبوں کا تسلط منتقل ہوا ہے اور عوام کو محکوم بنانا ان کا حق ہے، جو بھی آتا ہے وہ اپنے تمام اختار حاصل کر لیتا ہے مگر اختیارات اپنے سے نیچے اور عام عوام تک نہیں جانے دیتا کیوں کہ اس طرح تو عوام آذار ہو جائے گی۔

عوام میں اپنے لیول کا اختلاف برائے اختلاف پایا جاتا ہے، اور حکمران جماعتوں میں اپنے لیول کے مسائل نظر آتے ہیں۔ اداروں میں اپنے اپنے اختلافات الگ الگ ہیں۔

ہمیں حکم تھا کہ ہم ایک ہی رسی کو تھامے رکھیں مگر ہمیں ہر سطح پر تقسیم کر دیا گیا اور الگ الگ رسیاں پکڑا دی گئیں سو جس کے ہاتھ میں جو ہے وہ سمجھ رہا ہے کہ وہ سہی رستے پر ہے مگر کوئی بھی صحیح رستے پر نہیں ہے کیوں کے ہم ملک کو قومی نظری پر نہیں بلکہ پارٹی کے نظریے پر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قوموں کی ترقی ایک طویل اور ان تھک سفر کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ ترقی کے سفر کا تعین بہت ضروری ہے اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو بھی آ ہے وہ ترقی کے سفر کو جاری رکھے۔ مگر ہمارے ہاں ہر سیاسی پارٹی کا سفر الگ الگ ہے، جو کام ایک پارٹی پانچ سال میں شروع کرتی ہے اگلی اُسے تبدیل کر دیتی اور اس سے اگلی اسے تبدیل کر دیتی ہے، پھر یہ منصوبوں کو اپنے اپنے نام سے منسوب کرتے ہیں جو ان کی احمقانہ ترین سوچ کی عکاسی کرتی ہے جیسے کہ شہباز شریف لیپ ٹاپ سکیم یا پھر بے نظیر انکم سپورٹ فند، کیوں بھائی ان کے باپ کا پیسہ ہے۔ یہ صرف اس لیے کہ یہ ہمیشہ کی حکومت چاہتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ ان کی نسلیں حکمران رہیں۔

خدا کا واسطہ اس قوم کو آزاد کر دیں، نہ لوگوں کی زندگیاں جہنم بنایں نہ اپنے لیے جنم تیار کریں۔ اللہ نے آپ کو ملک کا سربراہ بنایا اور بار بار بنایا، اپنے لیے جنت تیار کریں اور لوگوں کو بھی جہنم کی زندگی سے نکالیں، ہر پارٹی گنواتی ہے کہ ہم نے یہ کیا ہم نے یہ کیا۔ ہماری عسکری طاقت کو دیکھ لیں جو ایک سمت میں چلی تو ہم دنیا کی اہم عسکری طاقت بن کر ابھرے۔ اگر ہم معاشی طور پر بھی ایک ہم آہنگ منصوبہ بندی پر کام کریں تو ہم ایک معاشی طاقت بن کر کیوں نہیں ابھر سکتے۔

ہمارے ہاں آج بھی کوئی سندھی کارڈ کھیلتا ہے، کوئی پنجابی کارڈ کھیلتا ہے اور کوئی سرائیکی یا پشتو کارڈ کھیلتا ہے۔ کیوں بھائی آپ کے ماموں کی سالگرہ ہے جو پاکستان کو اُس کی برتھ ڈے کے کیک کر طرح کاٹنا چاہتے ہو۔

رزق کے جو بھی وسائل ہیں وہ پاکستان کے ہیں اور اس پر ہر پاکستانی کا حق ہے چاہے وہ کسی بھی علاقے کا ہو یا کسی بھی عقیدے کا ہے وہ ہے تو پاکستانی۔

جیسے عسکری طاقت ہم سب کی طاقت ہے وقت پڑتا ہے تو یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کے دفاع میں کم اور کس کے دفعہ میں زیادہ استعمال ہونی چاہیے۔ بلکہ یہ ہر پاکستانی کی دفاع اور حفاظت کے لیے ہے۔

اسی طرح معاشی وسائل پر بھی کسی خاص طبقے کی اجارہ داری کھلی ناانصافی اور ظلم ہے۔

اللہ ہمارے حکمرانوں کو ہدایت دے، اور ہماری عوام کو شعور عطا کرے، امین

میاں وقار الاسلام

عنوان : مذہبی اور سیاسی گفتگو کی ممانیت ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

مذہبی اور سیاسی گفتگو کی ممانیت ہے، کیوں کہ اس سے لڑائی اور جھگڑے کی صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے، مگر ایسا کیوں ہے۔ اسلام ایسے معاشرے سے پھیلایا گیا، جہاں امن اور سلامتی کے نام سے کوئی واقف ہی نہیں تھا۔ وہاں نہ صرف اسلام پھیلا مگر امن اور سلامتی نے بھی اپنی مثالیں قائم کیں۔ اسلام نہ صرف مذہبی قوت بن کر ہی نہیں ابھرا مگر سیاسی قوت بن کر بھی ابھرا۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں مسلمان پیدا کیا گیا ہے، مگر کیا ہم اتنے خوش قسمت ہیں کہ ہم نے اسلام کو اپنی زندگیوں میں بھی داخل کیا ہو۔ ہمارا اپس میں اتنا اتفاق ہے کہ ہم آپس میں کسی بات پر اتفاق نہیں کرتے۔

جنہیں ہم ثواب کی نیت سے ٹھنڈا پانی پلانے کا بندوبست کرتے انہیں کے لیئے گلاس کو باندھ کر رکھتے ہیں کہ کہیں پانی کے ساتھ گلاس ہی نہ لے جائیں۔ آج بھی لوگ مسجدوں میں نئی جوتی پہن کر نہیں جا سکتے کیوں کہ اکثریت کو یہی ڈر ہوتا ہے کہ واپسی پر بچنی نہیں۔

ہم اتنے امانت دار لوگ ہیں کہ سٹور والوں کو لکھ کر لگانا پڑتا ہے کہ ادھار مانگ کر شرمندہ نہ ہوں۔ ہم اتنی پڑھی لکھی اور سمجھ دار قوم ہیں کہ ہمارے ہوٹلوں میں صاف لکھا ہوتا ہے یہاں سیاسی اور مذہبی گفتگو منع ہے۔ سب سے زیادہ صبر لی تلقین ہمیں کی گئی سب سے زیادہ بے صبری ہم میں پائی جاتی ہے۔

غیروں کے ملک میں غیر بھی محفوظ ہیں اور اپنے ملک میں اپنے بھی محفوظ نہیں۔ ہمیں تو حکم ہے کہ جو تم سے نہ لڑیں ان کو نقصان پہنچانے کا حق میدان جنگ میں بھی نہیں ہے۔

جب اسلام پھیلا، تو سب مسلمان ایک تھے، مسلمان ہر موضوع پر بات کر سکتے تھے، اور دلائل کے ساتھ بات کرتے تھے، مسلمان ترقی کی انتہا پر تھے مگر انتہا پسندی کی انتہا پر نہیں تھے۔

ہم کہتے ہیں کہ مغرب ہمارے خلاف چالیں چلتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے، کبھی ہم نے سوچا ہے کہ ساری چالیں ہمارے خلاف ہی کیوں چلی جاتی ہیں۔ جب ہم ترقی کر رہے تھے اور غلبہ پا رہے تھے تو اس وقت ہمارے خلاف کوئی چال کیوں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کمزور لوگوں پر مضبوط لوگوں کی چالیں چل ہی جایا کرتی ہیں۔

ہمارے سامنے چین نے ترقی کی ہے، اور آج مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے، مغرب چالیں تو چین کے خلاف بھی چل رہا ہے، مگر پھر بھی کامیاب نہیں ہوا، کیوں کہ چین ان سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔

آج بھی ہم آپس میں مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، تو پھر مغرب کی چالیں ہمارے خلاف کیوں نہیں چلیں گی۔ کفار کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں، مگر ہمارے دلوں کو کیا ہو گیا ہے۔

اللہ ہم پر رحم کرے اور ہمیں اپنی ہدایت کے سیدھے راستے پر چلائے۔ جانتا ہوں کہ سیاسی اور مذہبی گفتگو بہت سے لوگوں کو نہیں پسند، پُر امید ہوں کہ اللہ ہمارے دلوں کو کھول دے۔ امین۔

بے پردہ، باپردہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

پردے کا تعلق جنس سے نہیں ہے بلکہ پردے کا تعلق انسان سے ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ پردہ صرف نقاب یا چلمن نہیں، دیکھنے، بولنے، لکھنے، سننے اور سوچنے کے انداز میں بھی پردہ ہوتا ہے۔ اسی لیے پردے کا حکم جتنا عورت کے لیے ہے اتنا ہی مرد کے لیے ہے۔

تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے نے ہر چیز کا پردہ اتار دیا ہے۔ ایک وقت تھا جب لڑکے بھی شرمیلے ہوا کرتے تھے، اب تو کوئی لڑکی بھی شرمیلی نہیں ملتی۔

ہوا کچھ یوں کہ پردے کو کمزوری سمجھا جانے لگا، جیسے جیسے میڈیا نے ترقی کی دیکھنے، سننے اور سوچنے کے انداز بدل گئے اور آہستہ آہستہ چلمن اور نقاب بھی دور پرانا ہوتا چلا گیا۔ جو چڑ چڑ باتیں نہ کرے اور پٹر پٹر جواب نہ دے وقت نے ایسے لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، خوشامد کرنے والے، باتوں میں سے بات نکالنے والوں کو سمارٹ سمجھا جانے لگا اور شریف اور سادہ لوگ مار کھانے لگے۔ لڑکیوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، نئے انداز کی ملبوسات نہ پہننے والی لڑکیوں کو معاشرے نے مایوس کر دیا اور ان کی جگہ ماڈرن لڑکیوں نے لینا شروع کر دی۔

بہت سے لوگوں نے وقت کی گستاخانہ اور بے باک تبدیلیوں کو نہیں اپنایا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی رہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگ بھی ویسے ہی رہے۔ بہت سے لڑکیاں اور خواتین ہیں جنہوں نے پردے کا خاص خیال رکھا، نہ صرف دیکھنے بولنے سننے اور سوچنے کے پردے کو بلکہ انہوں نے نقاب بھی پہنے، اوڑھنیاں بھی اوڑھیں اور اپنے آپ کے معاشرے میں کسی سے پیچھے بھی نہیں رہنے دیا۔ اسی طرح بہت سے مرد حضرات بھی ہیں جنہوں نے نہ صرف نظریں نیچی رکھیں، بلکہ بولنے، سننے، دیکھنے اور سوچنے کے انداز کو بھی وقت کے ساتھ تبدیل نہیں کیا اور اس کے باوجود بھی انہوں نے معاشرے میں وہ مقام پایا جو بہت سے بے باک مرد و حضرات نے نہیں پایا۔

ہمیں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے، کہ پردہ کمزوری نہیں ہے، اور بے پردگی طاقت نہیں ہے۔ انسان کی صلاحیتں اس کی بات کی محتاج نہیں کہ وہ بے پردگی سے اپنے آپ کو منوائیں، بہت سے خواتین ایسی ہیں جو باپردہ بھی ہیں اور بااعتماد بھی ہیں، اور بہت سے مرد بھی ایسے ہیں کہ نظریں نیچی رکھتے ہیں مگر ان کی خود اعتمادی عام لوگوں سے بہت بہتر ہے۔

معاشرے نے ہمیں بہت بگاڑا ہے، کیوں کہ ہم نے معاشرے کے رنگ کو پہن لیا ہے اور اسے قبول کر لیا ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں جو لوگ اس رنگ کو نہیں پہن رہے وہ بھی پہن لیں اور ہمارے جیسے ہی ہو جائیں، اگر سب ہمارے جیسے ہو جائیں تو کیا ہو جائے گا۔ یقینا کچھ بھی نہیں ہوگا بلکہ معاشرہ اور بگڑے گا۔ کامیابی صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے میں ہے، کامیابی اس میں ہر گز نہیں کے ساری عورتوں کے چہرے بے پردہ ہو جائیں اور سارے مردوں کی آنکھیں بے پردہ ہو جائیں۔

نجی زندگی میں اگر دیکھا جائے تو بھی ایسے لوگ کامیاب جو پردہ رکھتے ہیں، اور ایسے بہت سے لوگ ناکام ہیں جن کی بے باکی مثال ہوا کرتی تھی۔ اور پھر آخرت کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔

ہم پردہ کریں یا نہ کریں اس سے کسی کو شاید فرق پڑے یا نہ پڑے مگر ہمارے رویوں سے بہت سے لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ جو لوگ باپردہ رہنا چاہتے ہیں چاہے مرد ہوں یا عورتیں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کی دل آزاری کریں، انہیں نیچا دیکھائیں اور ان کی حوصلہ شکنی کریں۔ بہت سے ادارے اسی لیے تباہ ہو جاتے ہیں جو لوگوں کی بے باکی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور لوگوں کی صلاحیتوں کو نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں۔

چاہیے تو یہ کہ جتنی حوصلہ افزائی بے باک لوگوں کیا کی جاتی ہے کم از کم اتنی ہی حوصلہ افزائی باصلاحیت لوگوں کی بھی کر دی جائے۔ مگر میرا نہیں خیال کے لوگ اپنی روش کو بدلنا چاہیں گے یا بدل سکیں گے۔ کیوں کہ یہ نصیب کی بات ہے، جو لوگ کمزور راستوں پر چلنا چاہتے ہیں، انہیں دور سے مضبوط راستوں کی طرف بلایا تو جا سکتا ہے مگر کھینچ کر لایا نہیں جا سکتا۔ کیوں کہ یہ ہدایت کا معاملہ ہے سو اللہ جسے چاہے اسے ہدایت دے۔ اور جو ہدایت ہی نہیں چاہتا اسے ہدایت مل بھی کیسے سکتی ہے۔

اے اللہ ہم اندر سے بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ دنیا نے ہم پر جو رنگ چڑھا دیا ہے وہ بہت برا ہے۔ ہم نے تو اس رنگ کو پہنچا تھا جو ہماری طرف بھیجا گیا، مگر ہم نے وہی غلطیاں کی جو ہم سے پہلے اُمتوں نے کیں اور ہمارا بھی انہیں جیسا حال ہے۔ اے اللہ ہم پر رحم فرما، ہم جو آگ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اسے نہیں جانتے اور شاید ہمارے جاننے سے پہلے ہماری زندگیاں ختم ہو جائیں۔ اور جو ہم زاد راہ اکھٹا کر رہے ہیں وہ یقینا بہت برا ہے۔ ہماری آنکھیں وقت کی روشنیوں میں چندھیا گئی ہیں۔ سلام ہے ایسے لوگوں پر جو اس کر تیز روشنیوں میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بہت سے لوگوں سے بہت الگ ہیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ ہمیں دنیا اور آخرت کی نہ نظر آنے والی آگ سے بچائے، آمین، میاں وقار الاسلام

غیرت مند کہاں جائیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

آزادی اور فحاشی کا فرق قائم رہنا چاہیے۔ جو لوگ باپردہ رہنا چاہتے ہیں، ان کی آزادی پر حملہ نہیں کرنا چاہیے۔ عجیب صورتِ حال ہے کہ غیر مسلم معاشرے میں عورتیں پردے کے حق کے لیے لڑ رہی ہیں اور مسلم معاشرے میں عورتیں پردے کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ بہت سی آزاد خیال عورتیں قران کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد باپردہ ہو رہی ہیں، اور جنہیں اسلام کا کچھ بھی نہیں معلوم تو چادریں اتارنے پر تلی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حیا تو صرف آنکھوں میں ہوتی ہے، پردے سے کیا فرق پڑتا ہے، حیا اگر آنکھوں میں ہی ہوتی ہے تو پھر لباس کی بھی کیا ضرورت ہے۔ عجب قیامت ہے کہ فحاشی اور عریانی کے حق میں بھی دلائل دیے جاتے ہیں، اور عزت و ناموس پر انگلیاں اُٹھائی جاتی ہیں۔

چند خواتین جو پردے کی آڑ میں فحاشی کی مرتکب ہوتی ہیں، انہیں مثال بنا کر پیش کیا جاتا، جیسے کہ پردہ وجہ ہے فحاشی کی۔ یا پھر داڑھی والے چند بدکردار دہشت گردوں کو مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ سارے مسلمان ہی دہشت گرد ہوتے ہیں۔ ہر جماعت میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں، کسی ایک مجرم کی سزا پوری جماعت کو نہیں دی جا سکتی۔

یہ بھی غلط ہے، کہ آپ کسی کے لباس کو نشانہ بنائیں اور اس کی طرح کے تمام لوگوں کی بدکردار ٹھہرا دیں۔ ہمارے ہاں ہر طرح کا ماحول پایا جاتا ہے، پردے والی عورتیں بھی ہیں، شلوار قمیض والی عورتیں بھی ہیں، اور جینز وغیرہ پہننے والی عورتیں بھی ہیں۔ لوگ لباس کی وجہ سے بدکردار نہیں ہوتے بلکہ بدکرداری کی وجہ سے بدکردار ہوتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ تم میں سے ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے دوسری جماعت پہلی سے بہتر ہو، مگر ہم ظلم کرتے دیر نہیں لگاتے۔ جبکہ ہمیں غیبت سے، الزام تراشی سے اور بہتان لگانے سے سختی سے روکا گیا ہے۔ ہم بہت کمزور ہیں، ہم بغیر تصدیق کے کسی کے بارے میں اپنی اچھی یا بری رائے قائم کرتے دیر نہیں لگاتے۔ جبکہ ہمیں حکم ہے کہ تم ہر نئی خبر کی تصدیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھوں سے کسی معصوم پر ظلم ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

ہر طرح کی انتہا بری ہے، ہم آزاد خیال ہوتے ہیں تو اتنے آزاد خیال ہو جاتے ہیں کہ انسانیت بھی شرمندہ ہو جاتی ہے، اور تنگ نظر ہوتے ہیں تو اتنے تنگ نظر ہو جاتے ہیں کہ انسانوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ توازن کسی بھی معاشرے کے لیے بہت اہم ہوتا ہے، توازن کی وجہ سے ہی باہمی اختلاف رکھنے والے لوگ ایک جگہ اکھٹے رہ سکتے ہیں۔

معاشرے نہ ہی اتنے تنگ نظر ہوں کہ لوگ گھروں کو قید خانہ سمجھیں اور گھروں سے بھاگ جائیں، اور نہ ہی اتنے آزاد خیال کہ جو من میں آئے کرتے پھریں۔ ایک طبقے کی آزادی اگر دوسرے طبقے کی آزادی کو کھا جائے تو یہ آزادی نہیں ظلم ہے۔

عورتوں کی ایک جماعت آزادی لینے نکلی ہے اور دوسری جماعت حیا مارچ کے لیے تیار ہے۔ ایک جماعت ہے جو اپنی اولاد کے لیے بے پناہ آزادی چاہتی ہے، اور ایک جماعت ہے جو بے پناہ آزادی کی وجہ سے اپنی اولاد کو برباد کر بیٹھی ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو اپنی عورتیں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے ہیں، مگر تعلیمی اداروں کا ماحول دیکھتے ہوئے ان کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان غیرت مند والدین کے بارے میں سوچیں، جن کی بچیاں، تعلیمی اداروں کے آزادانہ ماحول کی وجہ سے برباد ہو جاتیں ہیں یا پھر مزید پڑھنے کی ہمت نہیں کر پاتیں۔

کاش تعلیمی اداروں کو تعلیمی ادارے ہی رہنے دیا جائے، آزادانہ اور فحش ماحول کا پرچار کر کے تعلیمی ادارے منافع تو بہت کما لیں گے مگر یہ قوم برباد ہو جائے گی۔ اللہ ہماری بچیوں کی حفاظت کرے اور انہیں تعلیمی اداروں کے اندر بڑھتے ہوئے شر انگیز ماحول سے محفوظ رکھے، امین، دعا گو میاں وقار الاسلام۔

دیانت دار معاشرہ اور بد دیانت معاشرہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

دیانت دار معاشرے اور بد دیانت معاشرے کو پہچاننے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ دیانت دار معاشرے میں صرف دیانت دار لوگ ہی ترقی کرتے ہیں جب کہ بد دیانت معاشرے میں صرف بد دیانت لوگ ہی ترقی کی منازل طے کر پاتے ہیں۔

بد دیانت معاشرے میں دیانت داروں کے لیئے راستے مشکل کر دیئے جاتے ہیں اور منزلیں اپنی جگہ سے ہٹا دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی دیانت دار شخص اپنی کامیابی کو چھو سکے۔ اگر کوئی ایسا کر بھی پاتا ہے تو اسے بہت ہی لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے کیوں کہ راستے اگر ناممکن نہ سہی تو بہت زیادہ کٹھن ضرور بنا دیئے جاتے ہیں۔ حق والے کو ہر سطح پر لائین میں لگنا پڑتا ہے جب کہ ناحق کے پاس طرح طرح کے چور راستے ہوتے ہیں۔

دیانت دار معاشرے میں سب سے پہلے یہ کام کیا جاتا ہے کہ دیانت داروں کے لیئے راستے آسان کر دیئے جاتے ہیں اور منزلیں اپنی جگہ پر واپس رکھی دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بد دیانت شخص کسی کی کامیابی کو اپنے نام کر سکے۔ اگر کوئی ایسا کر بھی لیتا ہے تو اسے بہت ہی لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے کیوں کہ بد دیانت لوگوں کے لیے راستے اگر ناممکن نہ سہی تو بہت زیادہ کٹھن ضرور بنا دیئے جاتے ہیں۔ ناحق کو ہر سطح پر چور راستے ڈھونڈنے پڑتے ہیں جو اسے آسانی سے نہیں ملتے جب حق والوں کی ہر سطح پر مناسب حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ان کی حق تلفی نہیں ہوتی۔

چھوٹی سی شراکت داری کا کم منافع بخش کاروبار بھی کبھی بند نہیں ہوتا اگر اسے چلانے والے بد دیانت نہ ہوں اور صرف اپنا جائز حق لیتے ہیں۔ جب کہ بڑے بڑے ادارے جن کے کاروبار کا منافع بھی بہت زیادہ ہو دنوں میں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اگر ان کے منتظم بد دیانت لوگ ہوں۔

دنیا ایسی کمپنیوں کی مثالوں سے بھری پڑی جہاں درمیانے طبقے کے لوگوں نے ایک معمولی سا کاروبار شروع کیا اور پھر وہ پوری دنیا میں چھا گئے۔ اور ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ یہاں بہت بڑے بڑے کاروباری ادارے تھے جن کا نہ تو وجود باقی ہے اور نہ ہی کوئی ان کا نام لینے والا باقی ہے۔

بد دیانت معاشروں میں لوگ ترقی تو کر لیتے ہیں مگر اجتماعی طور پر اس ترقی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کیوں کہ یہ کسی نا کسی کا حق مار کر نصیب ہوتی ہے اور مجموعی طور پر ایسے معاشرے ایک دلدل کی طرح ہوتے ہیں وہ زور تو بہت لگاتے ہیں مگر پسماندگی کی دلدل انہیں واپس اپنے پاس کھینچ لیتی ہے۔ تبدیلی کا کوئی بھی منصوبہ ان پر کام نہیں کرتا کیوں کہ یہ خود کو بدلنا ہی نہیں چاہتے۔

منزل کسی قوم یا معاشرے کے پاس چل کر نہیں آتی بلکہ اس کے لیئے سفر کرنا پڑتا ہے قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں۔ اور قوم کو جاگنا پڑتا ہے تاکہ تبدیلی کا سفر باندھا جاسکے۔ کیوں کہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ آپ پسماندگی کے بیڈ پر سوئیں اور جب اٹھیں تو خوشگوار تبدیلی آپ کو صبح بخیر کہے۔

ایک بچے کو اپنے روشن مستقبل کے لیئے روز وقت پر اٹھنا پڑتا ہے سکول جانا پڑتا ہے ضرورت پڑے تو ٹیوشن یا کوچنگ کلاسز کے لیئے بھی جانا پڑتا ہے اور صحت و صفائی کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے ضرورت پڑے تو راتوں کو بھی جاگنا پڑتا ہے اور اپنا چھٹیاں بھی قربان کرنی پڑتی ہیں گویا بے اصول زندگی بااصول زندگی سے کبھی بھی بہتر نہیں ہو سکتی۔ مگر افسوس کہ ہم ایک اسے سسٹم میں رہتے ہیں جہاں ایک ایسا طبقہ ہم پر مسلط ہے جسے سب کچھ حاصل کرنے کے لیئے کچھ نہیں کرنا پڑتا اور اسے لوگ محکوم ہیں جنہیں سب کچھ کرکے بھی کچھ نہیں ملتا۔

یاد رہے کہ ایسی ہی بستیاں پلٹ دی جاتی تھیں ایسی ہیں بستیوں پر عذاب آتے تھے اور ایسے ہی معاشرے تباہ کر دیئے جاتے تھے، ایسے معاشرے صرف عبرت کا مقام بنا کر چھوڑ دیئے گئے تاکہ ان سے کچھ سبق سیکھا جائے نہ کہ ان جیسے ہو کر اپنا حال بھی خراب کر دیا جائے اور اپنا مستقبل بھی داو پر لگا دیا جائے۔

اسلام نے ہمیں ایک مکمل ضابطہ حیات فراہم کیا جیسا کہ ہم سے پہلے بھی پیغمبروں اور رسولوں کو دیا گیا مگر انہوں نے اسے پشت پیچھے ڈال دیا اور برباد ہو گئے ویسا ہی کھیل ہم بھی کھیل رہے ہیں۔ غیر مسلموں نے سب ہم سے تو نہیں سیکھا مگر خوب مار کھانے کے بعد اس نتیجے پر ضرور پہنچ گئے بغیر اصولوں کے جینے کا کوئی فائدہ نہیں شاید انہوں نے یہ صرف دنیاوی زندگی کے لیئے سوچا ہو مگر یقین کیجیئے اس کے بغیر اخروی زندگی میں بھی کوئی فائدہ نہیں۔

جیسے اللہ تعالی فرماتا ہے جس نے اپنا کل دیکھنا ہو وہ اپنا آج دیکھ لے۔ تو کیا ہم اپنے آج کے بد دیانت معاشرے سے اتفاق کرتے ہیں۔ کیا ہم اپنا کل اور اپنی آخرت بھی ایسے ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم چور راستوں سے ایسی ترقی کے خواہاں ہیں جو حقیقت میں کسی بھی طرح کی پسماندگی سے بدتر ہے

ہمیں ایک روشن اور کامل کتاب دی گئی ہے مگر افسوس کہ ہم نے اس سے اپنی زندگیاں روشن نہیں کیں۔ اسلام معاشرہ ہو اور دیانت داری کے تصور سے ہی خالی ہو اس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ہم پر رحم کرے اور ہمارے معاشرے کو عزت کا مقام عطا کرے اور ہمیں ایک باوقار قوم بنائے، امین

جہالت کے جہاں اور بھی ہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

جہالت صرف تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے عام نہیں ہوتی، حقائق سے نظریں چرانے کی وجہ سے بھی ہوتی ہے، لاعلمی کی وجہ سے بھی ہوتی، منفی سوچ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے اور تھکے اور ہارے ہوئے دماغ ہمیشہ جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔

لوگوں کا خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا بھی جہالت ہے، سب کچھ ہوتے ہوئے ایسے رونا جیسے دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا یہ بھی جہالت ہے، ہر وقت ناشکرانی کرنا یہ بھی جہالت ہے۔ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے جب دوسرا سبقت لے جائے اور پھر اس سے اس کی سبقت کی وجہ سے نفرت کرنا اس کا مزاق اڑانا یہ بھی جہالت ہے۔ کسی کی ترقی برداشت نہ کرنا، ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھنا یہ بھی جہالت ہے۔ اور سب کچھ حاصل کرنے کے بعد غرور سے اکڑ کر چلنا یہ بھی جہالت ہے۔ پیسے اور طاقت کی وجہ سے اپنے آپ کو اعلی مخلوق سمجھنا اور باقیوں کو کیڑے مکوڑے سمجھنا یہ بھی جہالت ہے۔

بد قسمتی سے جاہل لوگوں کو اپنے جیسے ہزاروں منفی سوچ رکھنے والے لوگ مل جاتے ہیں اس طرح انہیں مزید حوصلہ افزائی ملتی ہے اور وہ اپنی جہالت کی دنیا میں راج کرتے ہیں جب کہ ان کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مزید بد قسمتی یہ ہے کہ بہت سے منفی سوچ والے لوگ بہت سے مفاد پرست لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے اور یہ لوگ ان کی جہالت سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ان جاہلوں کو جاہل ہی رہنے دیا جاتا ہے کہ لوگ بہت پیچھے رہ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح سے کہ گاڑی تیزی سے آگے چلی جاتی ہے اور پیچھے صرف اور صرف دھول بچتی ہے۔ اور یہ اس دھول میں مگن اپنے منہ آلودہ کئے رہتے ہیں نہ ان لوگوں کو خود کچھ دیکھائی دیتا ہے اور نہ یہ کسی اور کو اس قابل چھوڑتے ہیں کہ اسے کچھ دیکھائی دے سکے۔

کچھ ناکام لوگ جو یونیورسٹی اور کالج میں کبھی نہیں جا پاتے یا وہاں سے ڈراپ آؤٹ ہوتے ہیں، یا پھر بچپن میں کوئی چائے بناتا تھا پھر وہ میکڈانلڈ چین کا مالک بن گیا، اس طرح کے گنتی کے کچھ واقعات ان کی زندگی کی سب سے بڑی انسپائیر شن ہوتی ہے۔

مجھے میرے ایک استاد نے سمجھایا تھا کہ ایسے لوگوں کی مثالیں نہ دیا کریں دنیا یہ لوگ نہیں چلا رہے، دنیا نے بہت سے محنتی لوگوں کی وجہ سے ترقی کی ہے اور جن قوموں کو عروج حاصل ہوا ہے وہ ان کی محنت کی وجہ سے ہی حاصل ہوا ہے، اس لیے خود بھی محنت کرنی چاہیے اور باقیوں کو بھی محنت کرنے کے تلقین کرنی چاہیے۔

بل گیٹ ہارڈورڈ سے ڈراپ ہوا تھا، مگر کیا بل گیٹ نے اپنی کمپنیوں میں ہارڈورڈ کے سارے ڈراپ آؤٹس کو جاب دے دی، کیوں کہ وہ اسی طرح کے ہی قابل ہوں گے، ہر گز ایسا نہیں ہے بل گیٹ کی کمپنیوں میں ہارڈورڈ یا اسی طرح کی اور یونیورسٹیوں کے ٹاپ پوزیشن ہولڈرز کو جاب دی جاتی ہے اور ان کی ہی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

چین بہت سالوں سے امریکہ کے لیے بہت کچھ بنا رہا ہے، اگر چین اور گیا ہے تو اس کی وجہ سے امریکہ اور امریکہ کے کاروباری لوگوں نے بھی بہت کمایا ہے۔ یہاں تک سب ٹھیک تھا۔ چین کے خلاف کوئی کنسپائیریسی نہیں ہوئی چین پر کوئی الزام نہیں لگے۔ وقت گزرتا گیا اور چین نے بہت سی فیلڈز میں ترقی کی، محنت کی پیسہ کمایا اور امریکہ سے بھی اچھی کمپنیاں کھڑی کیں جو آج سے 20 سال پہلے ہی امریکہ کو کھٹکنا شروع ہو گئی تھیں، مگر مقابلہ جاری رہا، امریکہ نے بھی بہت انویسٹ کیا چین نے بھی بہت انویسٹ کیا اور خوب محنت کی، اب جن امریکہ کو لگا کہ ان چائیز کمپنیوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تو امریکہ نے چین کے خلاف پروپیگنڈا اور شروع کر دی، چین کے خلاف پالیسیاں بنانا شروع کر دیں۔

اب بات تو ایسے ملکوں کی ہو رہی ہے جو ٹیکنالوجی کی دنیا میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دوڑ میں ہیں، اور درمیان میں پیدا ہو جاتی ہے ایک انتہائی جاہل مخلوق، جو ان دو چراغوں تلے اپنی جہالت کی کالی دنیا بسائے بیٹھی ہے۔

ان جاہلوں کو کبھی کسی نے اہمیت نہیں دی، نہ امریکہ نے ترقی کرتے ہوئے ان سے پوچھا، نہ چین نے ترقی کرتے ہوئے ان سے پوچھا، 20 سال پہلے جب یہ دوڑ شروع ہوئی تھی تب تو یہ لوگ بھنگ پی کر سو رہے تھے اور جب یہ دونوں ملک ٹیکنالوجی کی دوڑ میں ایک دوسرے کے اتنے مد مقابل آ گئے کہ امریکہ چین کی کمپنیاں بین کر رہا ہے چین امریکہ کی کمپنیاں بین کر رہا ہے دونوں اپنے اپنے گراؤنڈز میں اپنی جنگ جیتنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ درمیان میں ان فارغ لوگوں نے جنہیں کنسپائیریسی کا باپ کہا جاتا ہے یہ اپنی سودا بیچنے کے لیے بے تاب ہوئے جا رہے ہیں۔

جی سے کرونا آگیا، 5 جی سب کچھ تباہ کر دے گی، بل گیٹ سب کچھ کنٹرول کر لیے گا، اور یہ ساری باتیں وہی ناکام لوگ کر رہے ہیں جنہوں 5 نے زندگی میں کبھی کچھ حاصل کیا اور صرف اور صرف منفی سوچ کو آگے بڑھایا۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو آگے بڑھ جانے والے ہوتے ہیں، ہر وقت ان کی نظر اس چیز پر ہوتی ہے کہ ترقی کیسے کرنی ہے اور آگے کیسے بڑھنا ہے اور مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ اور کچھ لوگ سستی کے مارے ہوتے ہیں، ناکام در ناکام، یہ پیچھے بیٹھے رہتے ہیں، جب ان کو کوئی کام کہا جاتا ہے تو یہ حیلے بہانے سے کام لیتے ہیں، ایسے کہ بس انہیں کسی طرح کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ اور بس یہ چائے کی پیالی میں طوفان برپا کرتے ہیں۔

جب کرونا کی نئی قسم سامنے آتی ہے تو یہ میڈیکل فیلڈ کے لیے ایک نئے چیلنج کے طور پر سامنے آتی ہے، تمام تحقیق کرنے والے ادارے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، ماسک بنانے والے ماسک بناتے ہیں، وینٹیلیٹرز بنانے والے وینٹیلیٹرز بناتے ہیں، ٹیسٹ کیٹس بنانے والے ٹیسٹ کیٹس بناتے ہیں، حفاظتی کیٹس بنانے والے حفاظتی کیٹس بناتے ہیں، ویکسین بنانے والی درجنوں کمپنیاں ویکسین بنانے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں، فوج اور پولیس والے اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں، ڈاکٹرز اور پیرامیڈیکل سٹاف اپنا اپنا کام سنبھال لیتے ہیں اور لوگوں کے احتیاط برتنے کا کہہ دیا جاتا ہے۔

اور درمیان میں یہ کنسپائیر سی تھیوریز گھڑنے والی مخلوق اپنے کام میں لگ جاتی ہے، جن کا اس پورے کام میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، کیوں کہ لوگ پہلے سے پریشان ہوتے ہیں تو ایسے ہی حالات میں ان کی دوکان چل جاتی ہے۔

جب بھی دنیا میں مشکلات آئی ہیں ان لوگوں کا کردار ابو جہل کے چیلوں جیسا ہی رہا ہے، اور آخر تک رہے گا، دنیا جلد اس تباہ کن صورت حال پر قابو پالے گی۔ اور صورت حال قابو میں آنے کے بعد بھی جن لوگوں کا دماغ یہ لوگ خراب کر چکے ہیں کچھ عرصے تک ان کا دماغ خراب رہے گا اور پھر یہ لوگ اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

جب سونامی آیا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ امریکہ نے زیر زمین دھماکے کئے ہیں جس کی وجہ سے یہ کسی بھی ملک میں سیلاب لا سکتا ہے، جب کہیں زیادہ بارشیں ہوتیں ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی امریکہ نے کیمیکل لوچا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ جہاں چاہتا ہے بارشیں زیادہ کرواتا ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے دنیا میں سب اچھا ہی ہوتا ہے، مگر جنگیں باتوں سے نہیں جیتی جاتیں، دنیا میں ہر جگہ ہی میڈیا کا کردار انفارمیشن پھلانے کی بجائے ڈیس انفامیشن پھلانا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح ان کی دوکان چمک جاتی ہے اور یہ اس کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ایک ہزار طرح کا کانٹینٹ لوگ پڑھتے تھے، مگر جب سے کرونا آیا شاید ہی لوگ اس کے علاوہ کچھ پڑھ رہے ہیں، تو بس ہو گئی ان جاہلوں کی بھی چاندی یہی تو وقت ہے اپنی تمام خرافات کو منوانے کا، بعد میں تو ان کی طرف کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھنا۔

جب وائے ٹو کے کا ایشو کھڑا ہوا تھا تو اس وقت بھی یہ لوگ کہتے تھے کہ دنیا تباہ ہو جائے گی، مزائل اور راکٹ خود بخود چل پڑیں گے، گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گی، اور سارے کمپیوٹر پاگل ہو جائیں گے۔ یہاں تک بھی کہا گیا، کہ جب یہ مسٹر وائے ٹو کے تشریف لائیں تو اپنا اپنا موبائل آف کر دیں ورنہ موبائل پھٹ جائیں گے اور پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

پھر دنیا نے دیکھا کہ پھٹے ہوئے منہ بند ہو گئے اور کسی کا بھی موبائل نہیں پھٹا۔

گھبرانے کی ہر گز ضرورت نہیں، احتیاط کر ضرورت ہے، اللہ ہم سب کر رحم کرے اور ہمیں اپنے حفظ و آمان میں رکھے اور جھوٹوں کے شر سے ہمیں محفوظ رکھے۔

ٹاؤٹ شاؤٹ آؤٹ

تحریر: میاں وقار الاسلام

ٹاؤٹ شاؤٹ بد قسمتی سے ہمارے معاشرے وہ ستون ہے جو سب سے زیادہ بے کار اور سب سے زیادہ مضبوط بھی ہے۔ ٹاؤٹ شاؤٹ نہ صرف ہر سیاسی جماعت میں پائے جاتے ہیں بلکہ پڑھے لکھے اور جاہل دونوں طبقوں میں فراوانی سے پائے جاتے ہیں۔

ٹاؤٹ شاؤٹ چاہے جتنے بھی تعلیم یافتہ ہو جائیں یا کسی بھی پروفیشن میں چلے جائیں یہ جیسے تھے ویسے ہی رہتے ہیں۔ جس معاشرے میں کوئی بھی کام سیدھی انگلی سے نہ نکل سکتا ہو وہاں ٹاؤٹ شاؤٹ ٹیڑھی انگلی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے ہاں سیدھے کام بھی سیدھے طریقے سے سرانجام نہیں ہو پاتے ٹیڑھے کام تو پھر ٹیڑھے ہیں۔

ہمارے ہاں جو لوگ اپنے آپ کو بڑے وی آئی پی سمجھتے ہیں وہ باہر کے ممالک میں جاتے ہی بندے کے پتر بن جاتے ہیں۔ جو لوگ پاکستان میں 10 لوگوں کی لائن میں بھی سیدھے کھڑے نہیں ہوتے وہ باہر 100 لوگوں کی لائن میں بھی ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں جماعت بندی اچھے اور برے کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ ذات پات، سیاست، پروفیشن یا پھر کاروبار کی بنیاد پھر گروہ بندیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے کبھی کوئی بھی اپنے پیٹی بھائی کی طرف انگلی نہیں کرتا اور ہر مخالف گروہ کی پتلون کھینچنے کے چکر میں لگا رہتا ہے۔

صحت مندانہ تنقید معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری ہے، تنقید برائے تنقید معاشرے کو بیمار کرتی چلی جاتی ہے۔ معاشرے کے بڑے لوگ جب اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں گراتے چلے جاتے ہیں تو پھر عام لوگوں سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔

ہمارا تعلیم یافتہ ہونا، یا کسی اہم عہدے پر فائز ہونا اتھارٹی سے زیادہ ذمہ داری ہے۔ جب اداروں کے اہم لوگ ٹاؤٹ شاؤٹ قسم کے بھرتی ہونگے تو پھر یہ امید رکھنا کہ ادارہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو پائے گا یہ دیوانے کا خواب ہی ہو سکتا ہے۔

قوتِ برداشت کا فقدان جب کلچر بن کر سامنے آتا ہے تو ایسے لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جنہوں نے کبھی تو اور اوئے بھی استعمال نہیں کئے ہوتے۔ معاشرے میں جب تنقید کو مثبت ہی نہ لیا جاتا ہو تو پھر اصلاح کا سفر رُک جاتا ہے، اور جن لوگوں کو بہتر کیا جا سکتا تھا ان کو بھی انہیں کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

جب قانون صرف ٹاوٹ شاوٹ کے لیے کارآمد اور اور امن پسند لوگوں کے ہاتھ میں صرف ناانصافی ہی آئے تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ نالائق لوگ راج کریں گے۔ جب تک ہماری صفوں سے ٹاوٹ شاوٹ لوگ آؤٹ نہیں ہوں گے ہمارا معاشرے ہماری نمائندگی نہیں کرے گا بلکہ انہیں کی نمائندگی کرتے گا جو ٹاوٹ اور شاوٹ کرتے ہیں۔

ہمارے اعمال ہماری بدقسمتی بن کر ہمارے ہی سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں شر پسند عناصر کی نشاندہی بھی کرنی ہو گی اور ان کی حوصلہ شکنی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں، آج یہ ہمارے سر پر ناچ رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ ہماری وہ کوہتائیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی اور یہ لوگ معاشرے میں زور پکڑ گئے۔

کاش ہم اپنی اپنی صفوں سے ٹاوٹ شاوٹ قسم کے لوگوں کو آؤٹ کر سکیں۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

ابھی نہیں تو، کبھی نہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

اگر ہم دن اور رات کے آگے پیچھے آنے جانے پر غور کریں تو ہمیں زندگی ماضی، حال اور مستقبل کے تین نمایاں زمانوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ ایک وہ وقت ہوتا ہے جو ہم گزار چکے ہوتے ہیں، ایک وہ وقت ہوتا ہے جو ہم گزار رہے ہوتے ہیں اور ایک وقت باقی رہتا ہے جو ہم نے گزارنا ہوتا ہے۔

اگر ہم ماضی کو دیکھیں تو شاید یہ ایک داستان ہے کئی داستانوں کی، بہت سی داستانیں ایسی ہیں جنہیں ہم یاد رکھنا چاہتے تھے، شاید انہیں بھول چکے ہیں، اور بہت سی داستانیں جنہیں ہم بھولنا چاہتے تھے، مگر ہمیں وہ یاد رہتی ہیں، اور بہت سی داستانوں میں ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، جو ماضی ہو چکا ہے ہم اسے ماضی ہونے نہیں دینا چاہتے۔

ایک ہمارا حال ہے، ہمارا روشن حال، جس پر ہم فخر کرتے ہیں اور بتاتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں، ایک ہمارا وہ حال بھی ہے جس پر سب ہمیں یہ کہتے ہیں کہ یہ تو کوئی حال نہیں، اور ایک ہمارا حال ہے جسے ہم اپنے آپ سے بھی چھپاتے ہیں اور اگر ظاہر بھی کرنا پڑے تو اپنے رب کے سامنے ظاہر کرتے ہیں اور گڑگڑا کر معافی تلافی چاہتے ہیں۔

ایک ہمارا مستقبل ہے، جسے ہم کل جیسا نہیں دیکھنا چاہتے، جسے ہم آج سے بہتر دیکھنا چاہتے ہیں، اور کبھی کبھی ہم یہ بھی خواہش کرتے ہیں کہ کاش ہمارے ماضی کے کچھ کردار ہمارے مستقبل میں بھی ہمارے ساتھ ہوں۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں، جو گزر گیا ہے وہ گزر گیا ہے، جو ہے، وہ ہے اور جو آنا ہے وہ آ کر رہنا ہے۔

کچھ خوشیاں ہیں جو ہمارے ماضی کا حصہ تھیں، کچھ غم ہیں جو ہمارے ماضی کا حصہ تھے، کچھ خوشیوں کو سوچ کر ہم آج بھی خوش ہوتے ہیں اور کچھ دکھوں کو سوچ کر ہم آج بھی دکھی ہوتے ہیں اور ہمارا یہی حال ہمیں اُٹھا کر مستقبل میں رکھ دے گا، اگر ایسا ہوتا ہے تو یقیناً ہمارا کل بھی ہمارے آج جیسا ہی ہونا ہے۔ مگر ہم اپنا کل اپنے آج جیسا ہرگز نہیں چاہتے۔

ہر شخص، روز یہی سوچتا ہوگا کہ اس کا آنے والا کل اس کے آج سے بہتر ہو، اسی لیے وہ محنت کرتا ہے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ مگر بہت سے لوگ بہت سوچتے اتنا سوچتے ہیں کہ ان کے آج کی دلکشی اور چاشنی جاتی رہتی ہے۔ جو لوگ اپنے کل کے لیے اپنے آج کا سودا کرتے ہیں وہ اکثر دھوکے میں ہی رہتے ہیں، انہیں ان کا من چاہا کل کبھی نہیں ملتا۔

ہمیں اپنے ماں باپ کے لیے، اپنی نجی زندگی کے لیے، اپنے دوستوں کے لیے، اپنی خوشیوں کے لیے نہ الگ سے وقت ملنا ہے نہ ہی الگ سے زندگی ملنی ہے۔ جو لوگ اپنے آج کو بہتر کر سکتے ہیں، ان کا مستقبل اپنے آپ کو ان کے لیے خود ٹھیک کر لیتا ہے، اور جو لوگ اپنے آج کو بہتر نہیں کر پاتے انہیں ان کا مستقبل بھی ویسا ہی ملتا ہے جیسا ان کا آج ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ ہمیں پریشان حال ملتے ہیں، حقیقت میں وہ پریشان حال نہیں ہوتے بلکہ جان بوجھ کر اپنے حال کو بے حال رکھتے ہیں، ایسے لوگوں سے اگر آپ 10 یا 20 سال کے بعد بھی ملیں تو اسی طرح کی بے چینی ان کے چہروں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور اگر آپ خوش حال لوگوں کا جائزہ لیں، جو حقیقت میں اتنے خوش حال بھی نہیں ہوتے، بلکہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ وہ خوش حال نہیں، انہیں آپ 10 یا 20 سال کے بعد بھی دیکھیں تو ان کے چہروں پر اطمینان کی کیفیت ہمیشہ نظر آئے گی۔

حالات اور واقعات، اچھے یا برے اپنی جگہ پر ہوتے ہیں، مگر انسان کے سوچنے کا انداز بھی اپنی جگہ اہم ہوتا ہے۔ کچھ لوگ حالات اور اقعات کے مثبت پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور برے حالات اور واقعات میں سے بھی اچھی چیزیں نکال لیتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو آسان سے آسان کرتے چلے جاتے ہیں اور کچھ لوگ اچھے حالات اور واقعات میں سے بھی بری چیزیں نکالتے رہتے ہیں اور اپنی زندگی اور مشکل سے مشکل کرتے چلے جاتے ہیں۔

بہت سے امیر لوگ ہیں، پھر وہ بے سکون کیوں ہیں، اور بہت سے غریب لوگ ہیں پھر وہ پُر سکون کیوں ہیں۔ سکون انسان کے اندر پایا جاتا ہے، جو اپنے اندر جھانکتے رہتے ہیں انہیں سکون مل ہی جاتا ہے، اور جو لوگ باہر کی طرف جھانکتے رہتے ہیں اور اپنے اندر کی طرف غور نہیں کرتے وہ عجیب الجھنوں کا شکار ہی رہتے ہیں۔

لا محدود خواہشیں انسان سے اس کی حقیقی مسکراہٹ چھین لیتی ہیں، مادی چیزوں پر خوش ہونے والا زیادہ دیر خوش بھی نہیں رہ سکتا۔ انسان کو حقیقی خوشی کے لیے اپنے اصل کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ اپنے اصل کی طرف وہی لوٹ پاتے ہیں جو اپنی کوششوں کا مرکز اپنے آج کو بناتے ہیں

اور اپنی زندگیوں کو بدل لیتے ہیں۔ جو لوگ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اپنے آج کو زیادہ سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں، بلکہ کل کو زیادہ سنجیدہ لینے کی ضرورت ہے تو ان کے لیے ایسا کل کبھی نہیں آتا جو انہیں سنجیدہ لے۔

اپنے آج کو بھرپور جی لیں، ایسا نہ ہو کہ کل آپ حسرت زدہ ہو کر بیٹھ جائیں اور اپنے گزرے کو کل کو یاد کر کے روتے ہیں۔ ابھی نہیں جو کبھی نہیں۔

ایک مچھلی

تحریر: میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے، کچھ مرد سارے مردوں کو بدنام کر رہے ہیں اور کچھ عورتیں ساری عورتوں کو بدنام کر رہی ہیں تالاب خالی کرنے کی بجائے گندی مچھلی کو نکالنا چاہیئے۔

جو عورتیں اپنے فرائض سے آشنا نہیں اور صرف اپنے آشناؤں کے ساتھ تعلق رکھنا چاہتی ہیں جو کہ بے حیائی کا کام ہے۔ تمام عورتوں کو ان کے خلاف کھڑا ہونا چاہیئے، جس طرح سے وہ کھڑی ہوئی ہیں۔ جو عورتیں اپنے فرائض سے آشنا ہیں تمام مردوں کو ان کے حقوق کے لیے ساتھ کھڑا ہونا چاہیئے یہی انسانیت ہے۔

خاندان مردوں اور عورتوں کو ملا کر بنتے ہیں رشتوں کے بندھن سے آزاد نہ مرد کی کوئی عزت ہوتی ہے اور نہ ہی عورت کی کوئی عزت ہوتی ہے۔ مرد کے پاس ماں، بہن، بیوی اور بیٹی سے قیمتی اثاثہ اور کوئی نہیں ہوتا اور نہ ہی عورت کے پاس باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے سے زیادہ کوئی قیمتی اثاثہ ہو سکتا ہے۔

میں نے ایک بھی عورت کی پوسٹ نہیں پڑھی جس نے "میرا جسم میری مرضی" کی حمایت کی ہو سوائے چند رنگ برنگی تخریب کار آنٹیوں کے، مگر کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ ماروی سرمد کا بھائی بننے کا شوق ہے۔ جس عورت کا حیا سے واسطہ ہے اس کا ماروی سرمد سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح سے عورتیں ماروی سرمد کے خلاف اٹھی ہیں اور اپنی اقدار کی محافظ بنی ہیں انہیں سلام ہے میرا تو دل نہیں کرتا کہ ماروی سرمد کے نام کے ساتھ عورت بھی لگاؤں یہ کوئی اور ہی بلا ہے۔

ماروی سرمد کی حرکتیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، اس عورت کا نہ کوئی دین ہے نہ ایمان، اس کا عورت کے نام سے منسوب کوئی ایجنڈا نہیں، اس کے منہ سے جب بھی کچھ سنا ہے سوائے خرافات کے کچھ نہیں سنا۔ ایک باحیا اور باکردار عورت ماروی سرمد جیسی ایک ہزار بے حیا اور بد کردار عورتوں پر اکیلی ہی بھاری ہے۔

بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا، ماروی سرمد کا صرف اتنا ہی نام کہ وہ بدنام ہے۔ ماروی سرمد کا نشانہ مرد نہیں بلکہ باحیا عورتیں ہیں۔ ماروی سرمد بے حیا عورتیں کی نمائندگی کرتی ہے ہر باحیا عورت سمجھ دار ہے۔

ہم نے مار بھی کھائی ہے ہم زخمی بھی ہوئے ہیں ہم نے قربانیاں بھی دی ہیں اور ہم پوری قوت سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے ہیں، لاکھ اختلافات کے باوجود ہمیں کوئی تقسیم نہیں کر سکتا، مگر کوشش میں بہت سے لوگ ہیں۔

جو عورت ہمیشہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کے خلاف رہی، پاک فوج اور اسلام کے خلاف رہی، قائداعظم رح اور علامہ اقبال رح کے خلاف رہی، آج تمام لعنت کرنے والے اس پر لعنت کرتے ہیں۔ ماروی سرمد کو جس طرح کی آزادی چاہیئے، وہ ہیرا منڈی کی عورتوں کو وافر مقدار میں حاصل ہے، تاریخ گواہ رہی ہے کہ اس طرح کی عورت سے عورت بھی شرمسار ہوئی ہے۔

ماروی سرمد کہتی ہے کہ اس کی بے عزتی ہو گئی ہے، جس عورت نے کبھی کوئی عزت والا کام نہ کیا ہو اس کی بے عزت کیسے ہو سکتی ہے جتنا یہ گند پھیلاتی رہی ہے وہ آج سود سمیت اس کے سامنے ہے۔ پاکستان میں بہت سی این جی اوز کو بند کر دیا گیا جو ملکی مفاد کے خلاف کام کر رہی تھیں ان کا کام بھی ماروی سرمد کی طرح خرافات پھیلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اچھی بات یہ ہے کہ دو ٹکے کی عورت کو ٹکے کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، ماروی سرمد کو ہمیشہ سے لعنتوں کے حصول کی خواہش رہی اور وہی اسے ملیں اور اسی کے اسے پیسے ملتے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ میرا ملک اتنا کمزور نہیں کہ دو ٹکے تخریب کار عورتیں یہاں اپنے گھناؤنے عزائم میں تھوڑی سی بھی کامیاب ہو سکیں۔ جو عزت چاہتا ہے اللہ اسے عزت دیتا ہے اور جو ذلت چاہتا ہے اللہ اسے ذلت دیتا ہے ہمیشہ یہ بات 100 فیصد سچ رہی ہے۔

مگر ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، جس کی وجہ سے ماری سرمد جیسی عورتوں کو مزید ریٹا پھیلانے کی وجوہات ملتی ہیں۔ ایسے مردوں کا احاطہ بھی ضروری ہے جو عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرتے ہیں۔ اور ایسی عورتوں کا احاطہ بھی بہت ضروری ہے جن کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جن کی وجہ سے عورتیں مزید محرومی میں چلی جاتی ہیں۔

ہم اسلام کے علمبردار تو بہت بنتے ہیں مگر ہم اسلام کی بنیادوں کو ہلانے میں خود بھی مصروف نظر آتے ہیں۔ اللہ کسی کمزور پر ظلم کی اجازت نہیں دیتا اور نہ کی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جائے۔ اور جو لوگ ظالم ہیں وہ اللہ کے گرفت

سے باہر نہیں، اگر اللہ انہیں مہلت دے سکتا ہے تو کبھی بھی ان کی پکڑ بھی کر سکتا ہے۔ ظالموں کی اپنی پکڑ سے ڈرنا چاہیے اور اس انجام سے بھی ڈرنا چاہیے تو اللہ کے ہاں تیار ہے۔ اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

مرد اور عورت دونوں انسان ہیں، دونوں کو ہی ایسے کام کرنے چاہیں جس سے انسانیت شرمندہ نہ ہو۔ دعا گو، میاں وقار الاسلام

جنگل کا بھی کوئی قانون ہوتا ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

اسلام کا جب آغاز ہوا تو ایک سے بڑھ کر ایک تکلیف راستے میں حال ہوئی۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک ذات اور صحابہ کرام نے بہت سی مشکلوں کا سامنا کیا، پھر کئی غزوات بھی ہوئے، بحث و تکرار بھی رہی معاہدے بھی ہوئے یہ حق اور باطل کی لڑائی تھی اسلام جن سے لڑ رہا تھا وہی اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے اس عمل کے پیچھے اللہ کے راز تو اپنی جگہ تھے مگر جو حکمتِ عملی تھی اس کی مثال بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اسلام نے خود کو سچ اور حق بات سے منوایا، صبر مسلسل کی مثالیں قائم کی، اخلاق کے اعلی معیار قائم کیے، کھلے عام معافی اور در گزر سے کام لیا گیا۔ اسلام نے کہیں پر پر سنل ہونا نہیں سکھایا، توہین آمیز فقرے نہیں کسے، غیر عسکری جان و مال، درختوں، جانورں، باغوں اور کھیتوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔

اسلامی معاشرے کو سب سے پہلے اعلیٰ مہذب معاشرہ بنانے کی ایسی مثال قائم کی گئی جو دنیا نے پہلے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ معاشرے کا خدوخال ایسا تھا کہ لوگ اسلام میں داخل ہوتے چلے جاتے تھے۔

زمانہ جہالت کے جس معاشرتی و سماجی ماحول کو اسلام نے دفن کیا تھا ہم نے اپنے ارد گرد وہی ماحول دوبارہ پیدا کر لیا ہے۔ عملی طور پر ہم اخلاقی اور سماجی گراوٹ کا شکار ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا مگر وہ شکر کرتے نہیں تھکتے تھے، ہمارے پاس سب کچھ ہے اور ہم شکوہ کرتے نہیں تھکتے۔

جن برائیوں کو اسلام ختم کرنے کے لیے آیا تھا وہی برائیں ہم نے اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ جھوٹ ہم بولتے ہیں، غیبت ہم کرتے ہیں، ملاوٹ ہم کرتے ہیں، رشوت کا بازار ہمارے معاشرے میں گرم ہے، حیا کی چادر ہم نے نہیں سنبھالی، رشتہ داروں کو ہم شریک سمجھتے ہیں، ہمسایوں سے ہماری روش رہتی ہے، دوستوں پہ ہم اعتبار نہیں کرتے۔ شائید کوئی ایسی برائی ہو جس سے اسلام روکتا ہے اور ہمارے معاشرے نے اسے اُڑھنا بچھونا نہ بنایا ہو۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کو تعمیر نو کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں پتا ہے کہ ہمارے مسائل کیا ہے، ہمیں پتا ہے ہم کس طرف جا رہے ہیں ہمیں پتا ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے مگر ہم اتنے کمزور ہو چکتے ہیں۔ کہ سب جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرتے۔

اللہ فرماتا ہے تم پہ جو مشکل آتی ہے تو تمہاری شامتِ اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور جو تمہیں نعمت ملتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔اس میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ ہم اپنی ساری مشکلوں کی وجہ صرف اور صرف خود ہیں۔ جنگل کے بھی کوئی قانون ہوتے ہیں، ہمارے پتا نہیں کیا قانون ہیں۔

ہم توقع کرتے ہیں راتوں رات سب ٹھیک ہو جائے، مگر جب خود کو ٹھیک کرنے کی بات آتی ہے تو ہم منہ موڑ لیتے ہیں۔ ہمیں انفرادی سطح پر خود کو ٹھیک کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ ہمیں تو ایسی جماعت بنایا گیا تھا جس کہ پہچان کہ تھی کہ برائیوں سے روکتی تھی اور نیکی کی ترغیب دیتی تھی۔ ہمیں تو اب اپنے اندایک جماعت چاہیے جو برائی سے روکے اور نیکی کی ترغیب دے۔ ہم بہت کمزور ہو چکے ہیں مگر ہم میں ایک دوسرے پر انگلیاں اُٹھانے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی تو پوری طاقت ہے مگر اپنا انفراد

ی احاطہ کرنے کا حوصلہ نہیں۔

احساس جانوروں میں بھی ہوتا ہے، خدا جانے ہمارے احساس کا جانور کس جنگل میں ہے

اے اللہ ہماری آنکھیں کھول ہم دیکھ نہیں سکتے، اے اللہ ہمارے کان بند ہیں سن نہیں سکتے، اے اللہ ہماری زبانیں گونگی ہیں ہم بول نہیں سکتے، اے اللہ ہمارے دل مردہ ہیں کچھ محسوس نہیں کر سکتے۔ اے اللہ ہم بہت سے راستوں میں بھٹکے ہوئے ہیں ہمیں ہدایت کا راستہ دیکھا۔ ہم ہر سطح پر بکھرے ہوئے ہیں ہمیں ایک کر۔ ہم کمزور ہو چکے ہیں ہمیں مضبوط کر، ہم صبر نہیں کرتے ہمیں صبر کرنے والا بنا ہم شکر نہیں کرتے ہمیں شکر کرنے والا بنا۔ یا اللہ ہم سے ہماری برائیوں کو دور کر ہمیں فلاح کا رستہ دیکھا۔ امین

دعا گو - میاں وقار الاسلام

قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے

تحریر: میاں وقار الاسلام

پاکستان کا سب سے بڑا نقصان ہو گیا، پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا اور بنگلہ دیش وجود میں آ گیا، قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے، قوم آج بھی تقسیم ہے کہ اصل قصور وار کون تھا، کچھ لوگ ابھی بھی بھٹو کو مسیحا سمجھے ہیں اور کچھ لوگ بھٹو کو اس نقصان کا بنیادی کردار سمجھتے ہیں۔ قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے۔

ضیا نے ملک پر قبضہ کر لیا، بھٹو کو پھانسی دے دی گئی، کچھ لوگ ضیا کو مسیحا سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ آج بھی یہی کہتے ہیں کہ جمہوریت پر شب خون مارا گیا، اور جو مارا گیا وہ شہید تھا۔ قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے

مشرف نے نواز شریف کی حکومت ختم کر دی، کچھ لوگ سمجھتے ہیں بہت اچھا کیا گیا، اور لوگ ابھی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مشرف نے جمہوریت پر شب خون مارا، کچھ لوگ کہتے ہیں مشرف کا ٹرائل ہونا چاہیے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مشرف کو ہی دوبارہ آ جانا چاہیے۔

قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے۔

نئی جنریشن بڑی کنفوز ہے کہ ہمارے بڑوں نے کیا کیا حرکتیں کی ہیں کہ ساری کی ساری لیڈر شیپ کو حوالات کے راستے پارلیمنٹ میں لایا گیا ہے۔ خواہ فوج نے پکڑ دھکڑ کی ہو، خواہ سیاسی مخالفت ہو، ذاتی رنجش ہو یا پھر کرپشن کے بڑے بڑے سکینڈل ہو سارے سیاست دانوں نے تھوڑی یا زیادہ حوالات کی ہوا ضرور کھائی ہے۔

قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے۔ نئی جنریشن کنفوز ہے کہ جو جیلوں میں رہ کر آئے ہیں کیا انہیں بے قصور جیلوں میں ڈالا گیا، پھر جب وہ باہر نکلے تو ایسے نکلے جیسے حج یا عمرہ کر کے آئے ہوں۔ عدالتوں نے باعزت کو بے عزت کر کے جیل میں ڈالا یا بے عزت کو جیل میں ڈال کر باعزت کر دیا گویا عدالت نہ ہوئی سیاسی کریکٹر کی واشنگ مشنز ہو گئیں جو بھی گیا نہا دھو کر پاک صاف ہو کر واپس سیاسی میدان میں گند مچانے آ گیا۔

قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے۔ نئی جنریشن کنفوز ہے کہ سیاسی قیدیوں میں سے مجرم کون ہیں اور ملزم کون ہیں، ہر پارٹ دوسر پارٹی کو چور کہہ رہی ہے، عوام کا سارا مال لٹ گیا ہر سیاسی ٹولے کے بنک اکاؤنٹس بھر گئے مگر جرم کسی کا بھی عدالت میں ثابت نہیں ہو سکا سب ایک دوسرے کو چور چور تو کہہ رہے ہیں مگر ایک بھی چور جیل میں نہیں ہے سب کے سب مقدس ایونوں میں بیٹھے ہیں۔

قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے۔ نئی جنریشن کو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ سیاست جیسی مقدس گائے کے گلے پر بار بار چھریاں پھیرنے والے مجرم اور سزا یافتہ سیاسی دھڑے سیاست جیسی مقدس گائے کے پھر سے رکھوالے بن گئے۔

اگر عدالتیں فعال ہوتیں اور فیصلے حق پر ہوتے تو یقیناً آج صورتِ حال مختلف ہوتی۔ قوم کو کنفیوز کرنے میں جتنا کردار سیاسی دھڑوں کا ہے اتنا ہی کردار عدالتوں کا ہے ورنہ چور کی ہمت ہی نہ ہوتی کے دوسری تیسری دفعہ چوری کر سکے۔ قوم آج بھی تقسیم ہے، عدالت کو کٹہرے میں لانا چاہیے، عدالتوں نے اس قوم کے ساتھ جو کھلواڑ کیا ہے اور قوم کو جو مضاحکہ خیز تاریخ عطا کی ہے وہ قوم کے مزاج میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ہمارے مزاج میں جو کڑواہٹ اور تیکھاپن ہے وہ عدالتوں کی ناانصافیوں کا کھلا ثبوت ہے لائیں عدالتیں اپنے آپ کو کٹہرے میں اور پھر کسی اور کا انصاف کریں۔

اتائی ڈاکٹروں کا کینسر

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ نہ کرے پاکستان میں کرونا وائرس پھیلے، کسی کو کرونا کی علامات ظاہر ہوں تو خدا کے لیے کسی پیر فقیر، ہومیو پیتھ، ہربلیسٹ یا کسی دو نمبر ڈاکٹر کے ہتھے نہ چڑھیں ہی انتہائی سنجیدہ معاملہ ہے۔ پاکستان میں معمولی بیماریاں انتہائی خطرناک صورت اختیار کر جاتی ہیں جس کی سیدھی وجہ یہی تمام اتائی ڈاکٹرز ہیں، بد قسمتی ہے کہ حکومتوں نے کچھ نہیں کیا، ہمیں احتیاط کرنی چاہیئے۔

جب ڈاکٹرز تشویس کا اظہار کرتے ہیں تو ہم اپنی صحت کو سیریز لیتے ہیں جبکہ ہمیں بہت پہلے سے اس بات کی احتیاط کرنی چاہیئے تھی کہ ہمارا لائف سٹائل کیا ہونا چاہیئے، ہم سب جانتے ہیں کہ شیلف پراڈکٹس ہماری صحت کے لیئے ٹھیک نہیں، مگر ہم اپنے بچوں کو شاپر بھر بھر کے دیتے ہیں، جبکہ بچوں کو ہم سے بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔بڑوں سے جلدی بچے بیمار ہو رہے ہیں۔ حکومت اگر واقعی حرکت میں آئے تو 80 فیصد کھانے کی مصنوعی اشیاء فوری طور پر بین ہو جائیں، بد قسمتی سے یہ فیکٹریاں حکومتی کمائی کی بیک بون ہیں اور عوام کی بیک بون کھا رہی ہیں۔

پاکستان گورنمنٹ اگر لوگوں سے کرونا کا علاج پوچھنے لگے تو 73 ہزار لوگ کرونا کا علاج نکال کر لے آئیں گے اور اکثر قسمیں کھائیں گے کہ یہ 100 فیصد چلے گا۔ بغیر کلینیکل ٹرائل کے کوئی بھی علاج تجویز کرنا اور لوگوں کو کھلے عام گمراہ کرنا ایک مجرمانہ عمل ہے اور ایسے لوگوں کو فوری جیل میں ڈالنا چاہیئے۔

پاکستان میں کرونا وائرس کے ایک یا دو کیس سامنے آئے ہیں ابھی ٹھیک سے اتائی ڈاکٹروں کو پتا ہی نہیں کہ یہ بیماری کیا ہے اور اس کی علامات کیا ہے اور فیس بک پر کرونا کے علاج کی مشہوریاں چل رہی ہیں۔ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان پڑھ عوام کسی پر بھی بھروسہ کر سکتی ہے، پروفیشل ڈاکٹرز کی بجائے اتائی ڈاکٹروں کی کہانیاں انہیں زیادہ متوجہ کرتی ہیں میڈکل کیمپس میں یہ میں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں

کم سے کم عوام کا یہ تو حق ہے کہ انہیں بنیادی شعور ہی فراہم کر دیا جائے تاکہ انہیں کم سے کم اتنا تو معلوم ہو کہ کون ان کی صحت سے کس طرح کھیل رہا ہے۔ سینکڑوں اتائی ڈاکٹروں کو روز پکڑا جاتا ہے جرمانے بھی لگائے جاتے ہیں شاید اتنی ہی حکومتی کیپسٹی ہے مگر ان کی تعداد ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے، انتہائی تشویشناک صورت حال ہے۔

جگر اور گردوں کے اکثر امراض انہیں اتائی ڈاکٹروں کی دین ہیں اور جب یہ مریض پروفیشنل ڈاکٹرز کے پاس پہنچتے ہیں تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ گھر کے ایک فرد کی جان کتنی قیمتی ہوتی ہے کاش ان بچوں سے پوچھیں جن کے سر سے ان کا واحد سہارا چھن جائے، اللہ ہم پر رحم کرے

خدا جانے وہ وقت کب آئے گا جب اس معاشرے سے اتائی ڈاکٹروں کا کینسر ختم ہو گا، حیرانی کی بات ہے کہ ایک تو اتائی ڈاکٹرز دو نمبر دوائیاں دیتے ہیں اور پھر دعائیں بھی پڑھ کر پھونکتے ہیں کہ اللہ شفا دے گا، جانے اللہ عقل کب دے گا۔

اللہ ہم پر رحم کرے، دعا گو، میاں وقار الاسلام

تنگ نظری اور آزادی خیالی

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہم تنگ نظری اور آزاد خیالی ہے پر حامل دوہری شخصیات پیدا کر رہے ہیں جہاں اچھائی اور برائی کے معیار یکسر مختلف ہیں چاہیے وہ مرد حضرات ہوں یا پھر عورتیں۔

یہاں کی تصور ہے جہاں ایک طرف آزاد خیال مرد یا آزاد خیال عورت کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے وہاں دوسری طرف اسے بے حیا اور بے غیرت بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں دوسرا تصور یہ ہے کی جہاں ایک طرف تنگ ذہن مرد یا عورت کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے وہیں دوسری طرف اسے باحیا اور غیرت مند کہہ کر اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔

مسئلہ تنگ نظری اور آزادی خیالی کا نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں صورتوں میں اپنے حد سے تجاوز کرتے چلے جاتے ہیں پھر چاہے وہ مرد ہو چاہے وہ عورتیں ہوں ذلت اور رسوائی انہیں تنگ نظری ہے عالم میں بھی نصیب ہوتی ہے اور آزاد خیالی میں بھی ان کی حالت کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے جس قدر جہالت تنگ نظری میں پائی جاتی اسی قدر جہالت آزاد خیالی میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور ایسا ہوتا اس لیئے ہے کہ ہم رہنا تنگ نظر چاہتے ہیں اور نظر آزاد خیال آنا چاہتے ہیں اس طرح ہم دوہری زندگی جیتے ہیں گھر کی الگ باہر کی الگ اپنے لیئے کچھ اور اور دوسروں کے لیئے کچھ اور۔۔۔

جب ہم مارکیٹس میں جاتے ہیں اور آزاد خیال عورتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمارے خون کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور جب ہمارے گھر کی عورتیں جنہیں ہم آزاد خیال ہر گز نہیں دیکھنا چاہتے ہیں اگر وہ آزاد خیال ہونا چاہیں تو بھی غیرت کے مارے ہمارے خون کی رفتار تیزی ہو جاتی ہے۔

اگر گھر میں کوئی عورت دوپٹہ کرلے یا باحیا لباس پہنے تو ہم اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اگر آزاد خیال لباس پہنے تو ہم اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جب کی کاروباری زندگی اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر دفاتر میں کوئی عورت باحیا لباس پہنے تو اسے بہن جی یا پھر تنگ نظر تصور کیا جاتا ہے اور حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور وہیں اگر کوئی عورت آزاد خیالی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اسے بے حد سراہا جاتا ہے۔

اب ہم دو مختلف دنیا بنائے بیٹھے ہیں جہاں دنوں کے معیار مختلف ہیں۔ گھر کی عورت کسی سے ہنس کے بات کرلے تو غیرت کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور اگر دفتر میں کوئی لڑکی کھل کر بات نہ کرے تو کہا جاتا ہے کو وآپریٹ نہیں کرتی۔

اسی کشمکش میں چلتے چلتے آج کچھ گھر بھی آزاد خیال ہو گئے ہیں اور کچھ دفاتر بھی تنگ نظر ہو گئے ہیں۔ کچھ کمپنیاں ایسی ہیں جن کی پالیسی ہی نہیں کہ عورتوں کا کام پر رکھا جائے اور کچھ کمپنیاں ایسی ہیں جہاں لڑکیاں تو رکھی جاتی ہیں مگر پردہ دار خواتین کا وہاں کوئی کام نہیں۔

اب جو لوگ پوری طرح سے آزاد خیال ہیں وہ بھی سکون میں ہیں اور جو پوری طرح سے تنگ نظر ہیں وہ بھی سکون میں ہیں اب رہ گیا وہ طبقہ جو آدھا باحیا ہے اور ادھا بے غیرت ہے۔ ایسے طبقہ کی تباہی صرف اتنی سی بات پہ ہو جاتی ہے کہ دفتر کی بات گھر پہنچ جائے یا گھر کی بات دفتر پہنچ جائے۔ تو یہ لوگ نہ تیتر تصور ہوتے ہیں اور نہ ہی بٹیر۔ نہ گھر کے رہتے ہیں اور گھاٹ کے۔ ہاں جنہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو اور چیمپئن بن چکے ہوں انہیں نہ کوئی مسئلہ ہے اور نہ ہی کوئی دقت۔ یہ دونوں جگہ خوب انجوائے کرتے ہیں جب تک پکڑے نہ جائیں۔

اب ایسی صورت حال میں اسلام کیا کہتا ہے۔ کہ یہ لوگ خود کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اور دھوکے کی ہنڈیا تو بیچ چوراہے ہی پھوٹتی ہے۔ تو ایسے چیمپئنز 70 سال کے بھی ہو جائے شک سے آزاد نہیں ہوتے۔ مگر پھر بھی جیسے تیسے سفر کٹ ہی جاتا ہے۔

اب دوسرے معصوم لوگ جو بے چارے ہمیشہ ہی اناڑی رہتے ہیں اور ان کی ہمیشہ جان اٹکی رہتی ہے ایک تو ان سے ہوتا کچھ نہیں دفتر میں بھی سب انہیں بھائی جان کہ کر رسوا کرتے ہیں اور گھر میں بھی بیگم انہیں یہ سمجھ کر ذلیل کرتی رہتی ہیں کہ جیسے بیچارے چیمپئن ہوں۔ تو ایسے چیمپئن بھی برے اور ایسے شریف بھی برے۔ بات پھر وہیں آ کر ٹھہرتی ہے کی ہمارے اندر دو طرح کی شخصیات جنم لیتی ہیں اور دنوں کی زندگی بچاتے بچاتے مر جاتے ہیں۔

مینڈک چاہے ایک کنویں میں رہے یا تالاب میں مینڈک تو مینڈک ہی رہتا ہے کیوں کہ پھدکنا تو اس کی عادت ہے۔ یہ اور بات کہ کنویں اور تلاب میں جتنے مینڈک ہوتیں ہیں اتنی مینڈکیں بھی ہوتیں تو حقوق کی بات صرف مینڈکیں ہی کیوں کرتی ہیں کیا مینڈکوں کے کوئی حقوق نہیں۔

ہر حال میں خوش رہیئے۔ جس طرح کا خوف اور شک دل میں بیٹھا لیا جاتا ہے حالات کی گردش ویسے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ فیس بک میں ایک آپشن ہے پوک کرنے کی جس سے لوگ نذیک آ سکتے ہیں مگر حقیقت میں اگر اپنے رشتوں کو پوک کرتے ہیں تو وہ مزید دور چلے جاتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کے رشتوں کو مضبوط رکھے اور شکوک و شبہات سے پاک رکھے آمین۔

بناو سنگھار

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ نے ہر چیز کو خوبصورتی بخشی ہے، پھر بھی انسان چاہے مرد ہو یا عورت خوب سے خوب تر کی دوڑ میں ہر کوئی بھاگ رہا جس کے پاس چند روپے ہیں اس نے ابھی اس کا کچھ حصہ اپنے بناو سنگھار کے لیئے رکھ لیا ہے اور جس کے پاس لاکھوں کروڑوں یا اربوں ہیں وہ بھی خاطر خواہ سجنے سنورنے میں لگا رہا ہے۔

سب کے پاس اپنے اپنے عقیدوں کا بوجھ بھی ہے اور اپنے اپنے کلچر کا بوجھ بھی ہے اور اپنے اپنے رسم و رواج کا بوجھ بھی ہے اور اسی طرح کا کچھ بوجھ اسے اس کی تعلیم نے اور اس کے کاروبار نے بھی دے دیا ہے تو سٹیٹس کا ایک بھاری وزن ہے جو اس کے کندھوں پر ہے اور اس کی مینٹیننس اس کے لیئے ضروریات زندگی کی طرح ہی ہیں۔

انسان کو معلوم ہے کہ جب وہ یہ سب لوازمات اتار پھینکتا ہے تو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے مگر پھر بھی کسی چیز کو پشت پیچھے نہیں ڈالتا سوائے آپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے۔۔۔ بس وہ اپنی تمام تر بناوٹوں کا بوجھ اٹھاتا ہے اور چل پڑتا ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں سے اتار لیا جاتا ہے اور پھر اس کے جسم کو ہر طرح کے چڑھاوں سے پاک کر کے کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور زمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

انسان کیسی مخلوق ہے کہ جب یہ اپنے مقام سے گرتی ہے تو مردے کے کفن دفن کا سامان اور قبر کی اینٹیں سلیبیں تک بھی چرا لیتی ہے یا پھر انہیں قبروں پر بیٹھ کر چڑھاوں کا دھندا شروع کر دیتی ہے اور مجاروں کی نوبت لڑنے مرنے تک بھی جا پہنچتی ہے۔ اور انسان اپنا شرف بھی کھو بیٹھتا ہے اور عقل و فہم بھی اور کیا سے کیا ہوتا چلا جاتا ہے۔

خیر موضوع تو تھا بناو سنگھار۔۔۔ اور مجھے لگا کہ قبروں کے بھی بناو سنگھار ہوتے ہیں۔ زندوں پہ خرچ نہ کرنے والے قبروں پر بہت لٹاتے ہیں۔ سماج کا بوجھ بھی تو اٹھانا ہے۔۔۔ آخر لوگ کیا کہیں گے۔۔۔۔ جو کہیں وہی کرنا پڑے گا چاہے عقل مانے یا نا مانے۔۔۔ چاہے مذہب، دین یا عقیدہ اجازت دے یا نہ دے دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کے ساتھ تو چلنا پڑے گا۔ کس دنیا کے ساتھ ۔۔ جس نے ساتھ نہیں رہنا۔ سمجھ تو سب جاتے ہیں۔۔۔ پر غور نہیں کرتے۔۔۔ کہیں بدلنا نہ پڑ جائے۔۔۔ کہیں اندر کا سچا انسان باہر کے جھوٹے انسان سے ہار نہ جائے۔۔۔

اندر کا انسان ہی سچا ہوتا ہے کیوں کہ اس پر کوئی چڑھاوا نہیں ہوتا مگر ہماری منافقت اسے کمزور سے کمزور کرتی چلی جاتی ہے اور ہمارے باہر کا بناوٹی انسان جو بہت کمزور ہوتا ہے وہ مضبوط سے مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور اندر کے سچے انسان پر حاوی ہونے لگتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کے اتنے پڑھے لکھے انسانوں پر بھی عقل کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی علم ہو جو ان کے پاس نہ ہو۔ پھر یہ بہت پڑھے لکھے لوگ جب بات کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں اثر کیوں نہیں ہوتا جبکہ وہی بات جب ایک ان پڑھ گنوار موچی یا ریڑھی والا کرتا ہے تو جلد سمجھ آ جاتی ہے۔

میں جب اس طرح سوچتا ہوں تو مجھے نفاق کے مرض سے بڑا مرض کوئی نظر نہیں آتا اور جو شخص خود نفاق کے مرض کی دلدل میں پھنسا ہو وہ بھلا کسی کی مدد کیسے کر سکتا ہے اسے تو خود مدد کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ذات کے دلدل سے باہر نکلے اور خود کو دنیا کے مصنوعی خولوں سے آزاد کرے اور اپنے آپ کو پہچانے اور جب اپنے آپ کو پہچان لے تو پھر وہ اپنے رب کو پہچانے اور جب وہ اپنے رب کو پہچان لے گا تو پھر ہی اس کی باتوں میں تاثیر پیدا ہو گی اور اس کی بات لوگوں کے دلوں پر اثر کر پائے گی۔

کیسا لگتا ہے جب ایک جھوٹا شخص سچ کا درس دے رہا ہو۔۔۔۔ یقین کریں لوگوں کا سچ سے اعتبار اٹھ جائے گا۔۔۔ اور جب ایک سچا شخص سچ کا درس دیتا ہے تو جھوٹے شخص کی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ اس سے آنکھیں ملا سکے اسی طرح اللہ تعالی جھوٹ کو نابود کرتا ہے اور سچ کو غلبہ دیتا ہے۔

ہمیں ہمارے ارد گرد غریب لوگ ظالم اور مجرم نظر آتے ہیں ہمیں لگتا ہے کہ سب ڈرامہ کر رہے ہیں اور یہ عقیدہ ہمارے باہر کے بناوٹی انسان کو تقویت دیتا ہے اور ہماری بے حسی میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ہمیں دھوکا دے کر مال کھینچنے والے درست اور رو دھو کر مدد مانگنے والے ہمیشہ غلط نظر آتے ہیں اور پھر ہمارے لیے دھوکے کا سامان ہی کر دیا جاتا ہے ہم بار بار دھوکا کھاتے ہیں اور ہمارے اعمال نامے دو گنے سیاہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور تو نیکی نہ کر پانے کی وجہ سے اور دوسرا بار بار دھوکہ کھانے کی وجہ سے کیوں کہ مومن تو ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا مگر ہم بار بار ڈسے جاتے ہیں پھر ہمارا لوگوں پر بھروسہ اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اب بھی بہت سے لوگ اعتماد کے قابل ہیں مگر وہ ہمیں تب تک نہیں ملیں گے جب تک ہم اپنے اندر کے اعتماد والے انسان کو زندہ نہیں کرتے۔۔۔ کیوں کہ باہر کا مصنوعی انسان نہ ہمیں بھروسے کے قابل چھوڑے گا اور نہ ہے ہمارے سامنے کسی بھروسہ مند انسان کے حق میں گواہی دے گا۔

شرافت کا جو خول ہم نے پہنا ہوا ہے۔۔۔ شہر کے سارے شریفوں نے وہی خول پہنے ہوئے ہیں وہ جو ہم میں دیکھتے ہیں وہ ہمارا اصل نہیں اور جو ہم ان میں دیکھتے ہیں وہ ان کا اصل نہیں۔ دونوں چمک دار چیزیں ایک دوسرے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور دونوں کو سوائے دھوکے کے کچھ نہیں ملتا۔

معاشرہ ہمارا ہی عکس ہے اگر ہم برے ہیں تو معاشرہ برا ہے اور اگر ہم اچھے ہیں تو معاشرہ بھی اچھا ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ شہروں میں لوگوں کا چلنا پھرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔۔۔ اور ایک جگہ اور فرماتا ہے کہ تم اپنے سوا کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس طرح ہم دھوکے کا سامان اکٹھا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کہتا ہے کیوں کہ میں زیادہ پڑھا لکھا ہوں تو زیادہ سے زیادہ کمانا میرا حق ہے۔ اور یہ چیز اسے ترغیب دیتی ہے کہ وہ قابل ڈاکٹر بننے کی بجائے مشہور ڈاکٹر بننے کی کوشش کرتا ہے اور ہم ہر مشہوری والی چیز لے لیتے ہیں چاہے اس کی قابلیت صفر ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ پھر مشہور سے مشہور ڈاکٹروں سے دھوکا کھاتے کھاتے ہماری قسمت کہ ہم کسی قابل ڈاکٹر کے پاس پہنچتے بھی ہیں یا نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی قابل ڈاکٹر فیس کم لے لے تو ہمیں اس کیا قابلیت پر شک ہونے لگتا ہے اور اگر کوئی نکما ڈاکٹر فیس زیادہ لے لے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے اصل ڈاکٹر۔۔۔ اور نتیجہ دونوں صورتوں میں دھوکہ۔

ڈاکٹروں کی میں نے صرف مثال دی ہے یہ کچھ وکیل بھی کرتے ہیں اور تاجر بھی اور دیگر شعبوں کے لوگ بھی۔ جب ڈاکٹر وکیل کے پاس جاتا ہے تو وہ بھی مہنگا وکیل کرتا ہے مطلب مشہور وکیل نہ کہ قابل۔۔۔۔ پھر کیا۔۔۔ پیسے بھی زیادہ لگ گئے اور فائدہ بھی نہ ہوا۔ پھر اگر ڈاکٹر صاحب یا وکیل صاحب کا بچہ سکول چلا جائے تو جیسا سلوک وہ اپنے مریض یا کلائینٹ کے ساتھ کرتے ہیں ویسا ہی بچوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

ہم دراصل کاسمیٹکس، بناو سنگھار اور مشہوریوں پر خرچ کر رہے ہیں اور ایک بھنور ہے جو ہمیں ڈبویے جا رہا ہے۔

ہمیں آہستہ آہستہ اس عذاب سے باہر نکلنا ہے اور اپنے اندر کے انسان کو پہچان دینی ہے۔ ہمارا اصل حسن ہمارے اندر ہے۔۔۔ اگر ہم اپنے اندر کے انسان کو باہر لائیں گے تو ہمارے سامنے کسی دوسرے کا بناوٹی انسان کھڑا ہی نہیں ہو سکے گا اگر ہم لوگوں کے حقوق کا تحفظ کریں گے اللہ ہمارے حقوق کا تحفظ کرے گا۔ اگر ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیں گے تو اللہ ہمیں بھی لوگوں کے دھوکوں سے محفوظ رکھے گا۔

جن لوگوں نے اپنے اندر کے انسان کو زندہ کیا ہے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے ہیں لوگ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی انہیں یاد رکھتے ہیں۔۔۔ اور جو لوگ دھوکے کے غلافوں میں رہتے ہیں وہ چاہے جتنے بھی مشہور ہوں اور ان کے پاس جتنا بھی پیسہ ہو وہ لوگوں کے دلوں میں گھر نہیں بنا پاتے۔۔۔۔ لوگ انہیں جیتے جی بھلا دیتے ہیں۔۔۔ مرنے کے بعد تو دور کی بات۔۔۔۔

اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہمارے دانستہ اور غیر دانستہ گناہوں کو معاف فرمائے اور ہمیں ہر طرح کی منافقت سے پاک کرے اور ہمارے اندر کے انسان کو ہم پر غلبہ دے اور ہمارے چہروں پر اپنے نور کا سنگھار کرے جس اے ہمیں دنیا میں بھی فائدہ ہو اور ہماری آخرت بھی سنور جائے امین۔۔۔

دعا گو۔۔۔۔

میاں وقار الاسلام

غیر مہذب رویئے غیر مہذب قومیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ تعالی نے بدلہ لینے کی یا پھر حملہ کرنے کی جبلی صفات ہر چرند اور پرند وغیرہ میں رکھی ہیں۔ سانپ ڈس لیے گا، کتا کاٹ لے گا، گینڈ ٹکر مارے گا، گدھا دولتی مارے گا، بارہ سنگا سینگھ مارے گا، اسی طرح دیگر چرند پرند اپنے اپنے انداز میں چھپٹتے پلٹتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

انسان کی حالت بھی ان سے سے کچھ مختلف نہیں، مولوی فتوہ دے دے گا، وکیل کیس کر دے گا، فوجی بندوق کا استعمال کرتے گا، صحافی زبان اور قلم کا استعمال کرے گا اور ارباب اختیار اپنے اپنے اختیار کا استعامل کریں گے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے مگر انسانوں کو بہت سے جبلی تقاضے حیوانوں کی طرح پورے کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے، جیسے انسان کاٹ بھی لیتے ہیں، پاوں اور ہاتھ کا استعمال بھی کرتے ہیں اور سب سے زیادہ جبلی تقاضہ زبان سے برے کلمات ادا کرکے یا پھر جوتا مر کر یا پھر سیاہی پھینک کر یا پھر کسی کی عزت تار تار کرکے اپنے جبلی تقاضوں کی تسکین کی جاتی ہے۔

جن معاشروں پر کبھی مہذب ہونے کا ٹیگ نہیں لگا ہوتا ہوا سے بھی اپنی تہذیب کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں اور طوفانِ بد تمیزی کو اپنے شعار کا حصہ بناتے دیر نہیں لگاتے۔ پھر ہر پلیٹ فارم چند ہی لمحوں میں مچھلی منڈی کا منظر پیش کرنے لگتا ہے اور جب سارا معاشرہ بد تہذیبی کے سمندر میں نہا نہیں لیتا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ایک طرف لوگوں کی جبلی تسکین پوری ہوتی چلی جاتی ہے ور دوسری طرف ایک اور جماعت نئے نئے آئیڈیاز کو جنم دینے میں لگی رہتی ہے۔

افسوس کا مقام تب آتا ہے جب اس مسئلے کو مسئلہ نہیں بلکہ مسائل کا حل سمجھنا شروع کر دیا جاتا ہے جس سے اس طرح کے دیگر عناصر تقویت پاتے ہیں اور اور پھر برائی کو اچھائی کے ساتھ مکس کرکے پروان چڑھایا جانے لگتا ہے۔

تہذیب کی بنیادی اکائیوں کا جنازہ نکل جاتا ہے، پڑھے لکھے افراد جنہیں معاشرے میں مثبت تبدلی لانی چاہیے تھی وہ بھی اس کارِ خیر میں آگے آگے ہوتے ہیں اور جنہوں نے کبھی سکول، کالج اور یونیورسٹی کا منہ ہی نہیں دیکھا ہوتا ان میں اور پڑھے لکھے افراد میں فرق نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ جاہل اور عالم ایک جیسے راگ الاپتے نظر آتے ہیں گویا محمود و ایاز کر فرق کچھ یوں ختم کر دیا جاتا ہے۔

اسلام ہمیں واضع طور پر تمسخر اُڑانے سے روکتا ہے، مگر کچھ لوگوں کے عقیدوں میں پین دی سری سرائیت کر جاتی ہے اور وہ اپنی جہالت کے اندھیروں کو اسلام کا نور بنا کر پیش کرتے ہیں جبکہ کہ نہ اسلام کبھی ایسا تھا اور نہ ہی اسلام کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا شمار مہذب قوموں میں ہو تو ہمیں اپنے رویوں میں تبدلی کی نہیں بلکہ یکسر بدلنے کی ضروت ہے۔ ہم جس چیز کو اپنے رویوں میں شامل کرتے جا رہے ہیں یہ ہماری تہذیب میں کینسر کی طرح شامل ہو سکتا ہے۔ کینسر کا بروقت علاج نہ ہو تو اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے

اللہ ہمیں اپنی ذات اور اپنے معاشرے کا احاطہ کرنے اور خود کو راہ راست پر لانے کی توفیق دے

آمینَ دعا گو میاں وقار الاسلام

بچوں سے زیادتی واجب القتل جرم

تحریر : میاں وقار الاسلام

بچے معصوم ہوتے ہیں اور من کے سچے بھی۔ جب انہیں بچوں کو معاشرے کے سیاہ چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں اور بھیانک سے بھیانک کردار ان کی نظر سے گزرتے ہیں تو ان کی معصومانہ شخصیت کا قتل وہیں کر دیا جاتا ہے۔

بچپن میں ہی پھولوں کی پتیاں توڑ کر پھینک دی جاتی ہے اور ان سے پھلنے پھولنے کی صلاحیت بھی چھین لی جاتی ہے۔ اس پر ظلم یہ بھی ہوتا ہے کہ گناہ گار جانوروں کو معاشرہ قبول کیئے رہتا ہے اور برائی برائی کے ساتھ مل کر نئے نئے جانور پیدا کرتی ہے اور معاشرے پر اس کا بوجھ بڑھتا ہی چلاتا ہے۔

اگر کسی برائی کو وقت پر روکا نہ جائے تو پھر وہ معاشرے کا کینسر بن کر ابھرتی ہے اور بچوں کے ساتھ زیادتی کا کینسر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

مدرسوں میں پڑھانے والے اساتذہ ہوں، سکول میں پڑھانے والے ٹیچرز ہوں، بچوں سے گھروں میں کام کروانے والے مرد ہوں یا پھر ہر وقت تاڑ میں رہنے والے بے ہودہ کردار ہوں معاشرے میں ہر سطح پر یہ گند پایا جاتا ہے۔ اور شاید جو منظر عام پر آنے والا گند ہے اس سے کہیں زیادہ گند پس منظر میں ہے جس پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔

جن بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہوتی ان میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہے جو ہر اس منٹ کی کیفیت یا اسی طرح کے ستم کی ذہنی اذیت سے گزرتے ہیں۔ ڈر اور خوف کی کیفیت میں پروان چڑھنے والے بچے معاشرے کا کیسا کردار بن پائیں گے اس کے بارے میں ہمیں غور سے سوچنے کی اشد ضرورت ہے۔

بچوں کو اپنی آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے سول سوسائیٹی ایسے گھناونے جرائم کو فاش کرنے کی ضرورت ہے معاشرے کے ایسے گند سے صاف کرنا بہت ضروری ہے۔

ہم کیسی قوم بن کر ابھرنا چاہتے ہیں ایسی قوم جس کے بچوں کو بھی تحفظ حاصل نہیں، کیا ہم ایسی قوم بن کر ابھرنا چاہتے ہیں جہاں بچے پیدا ہوتے ہی اپنے آپ کو شیطانوں میں گھرا ہوا محسوس کریں۔ کیا ہم ایسی قوم بن کر ابھرنا چاہتے ہیں جہاں لوگ بچوں کے معاملے میں اندھے گونگے اور بہرے ہیں۔

جب جرم کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو ہم مجرمانہ خاموشی اختیار کرتے ہیں اور جب یہی جرم بڑھتا بڑھتا معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو ہم چیختے چلاتے نہیں تھکتے۔

بچوں کے ساتھ زیادتی معاشرے کے گناہ گار لوگوں کی پہلی تجربہ گاہ ہوتی ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان انسان نہیں رہتا بلکہ جانوروں سے بھی بدتر کردار بن کر ابھرتا ہے۔ یہیں سے معاشرے کے کرپٹ لوگ پیدا ہوتے ہیں یہی لگے جا کر چور ڈاکو اور قاتل بنتے ہیں یہیں مکروہ کردار اغوا برائے تاوان اور دہشت گردی کا سبب بنتے ہیں یہی لوگ نشہ آور چیزیں بیچتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بچوں کے ساتھ زیادتی دوسرے تمام بڑے گناہ کی ماں ہے تو اس میں بہت سی ایسی لاجکس ہیں کہ اگر انسان سوچنا چاہے تو یقین کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگر ہمارے معاشرے میں بچوں کے ساتھ زیادتی کا رجحان پایا جاتا ہے تو پھر یقین کر لیں کہ نہ تو یہ معاشرہ اسلامی ہے نہ ہی اخلاقی ہے اور نہ ہی انسانی ہے۔ ایسے گندے کردار ایسے ہی بے ہودہ جوہڑوں میں پیدا ہوتے ہیں جہاں انسانیت پوری طرح سے مر چکی ہوتی ہے۔

اگر آپ بچوں سے محبت کرتے ہیں تو ایسے کرداروں پر نفرت کرنا آپ پر واجب ہے۔ ایسے کرداروں کو منظر عام پر لائیں اور انہیں عبرت کا نشان بنائیں۔ اگر ہم اپنے معاشرے کو اس گند سے پاک نہیں کر سکتے یا معاشرے کو ایسے گناہوں سے بچانے میں اپنے کردار ادا نہیں کر سکتے تو پھر ہم ایسے گناہوں میں برابر کے شریک ہیں اور ہمارا کردار سرے سے کوئی کردار ہی نہیں۔

اگر ہم زندہ قوم ہیں اور اپنے معاشرے کو ایک بہتر معاشرے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی بند زبانوں کو کھولنا پڑے گا اور بڑھ کر اس برائی کے سد باب کی کوششیں کرنی پڑیں گی۔

بچوں کے ساتھ زیادتی کے بے ہودہ کردار ہماری شناخت کو خراب کر رہے ہیں ہم سے ہماری پہچان چھینی جا رہی ہے۔ کیا ہم اپنے آپ کو ایک گناہ گار معاشرے کا فرد کہلانا پسند کریں گے، ہر گز نہیں۔

معاشرے کا مردہ کردار بننے سے بہتر ہے اپنا اپنا کردار ادا کریں۔

اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہماری رہنمائی فرمائے اور ہمیں بے حیائی کے کاموں سے دور رکھے۔۔۔امین

مسئلہ مرد اور عورت کا نہیں مسئلہ انسانیت کا ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو انسان پیدا کیا ہے اور دونوں ایک ہی طرح کے دھڑکنے والے دل اور سوچنے والے ذہن دیے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا پروفیشنل، سوشل یا نجی کام ہو جو مرد کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ یہ اور بات ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات نے نظام کو چلانے کے لیے مرد اور عورت کی کچھ حدود بندی ضرور کی ہے مگر انسانیت کے معیار پر عزت سے جینے کے لیے جو حقوق مرد کو حاصل ہیں وہی حقوق عورت کو بھی حاصل ہیں۔

انسان چاہے مرد ہو یا عورت ہر نفس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے پر سبقت لے جائے، جنگل کا قانون انسان نے اپنے معاشرے میں بھی قائم کر رکھا ہے اور اسی قانون کے توڑنے کے لیے انسان کی تربیت کی جاتی رہی ہے اور کی جا رہی ہے۔ مگر انسان ایسا احمق ہے کہ اپنی روش نہیں چھوڑتا۔

چاہے گھر ہو یا پھر دفتر یا پھر کوئی سماجی یا ثقافتی پلیٹ فارم ہو جس میں طاقت زیادہ ہوتی ہے، علم زیادہ ہوتا ہے یا تجربہ زیادہ ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو منوالیتا ہے۔ بہت سے مرد عورتوں پر سبقت لے جاتے ہیں اور بہت سی عورتیں مردوں پر بھی سبقت لے جاتی ہیں۔ مگر بغیر محنت کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا نہ ہی مرد کو نہ ہی عورت کو جو محنت کرتا ہے اللہ اس کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور اسے اس کا مقام مل کر ہی رہتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

ڈومینیٹ کرنے کی صلاحیت جتنی مرد میں ہے اتنی ہی عورت میں بھی ہے، کئی مرد ایسے ہیں جو اپنے حقوق سے دستبردار ہوتے ہوتے اس سطح پر پہنچ جاتے ہیں کہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ عورتوں سے بھی گئے گزرے ہیں اور اسی طرح کچھ عورتیں اپنے حقوق کے لیے لڑتے لڑتے ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہیں کہ اس طرح کا مقام بہت سے مردوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا۔

دونوں جنس بھرپور صلاحیتوں کے مالک ہیں تو پھر مسئلہ کہاں ہے۔ مسئلہ انسانیت کا ہے جہاں ہم اپنے اختیار سے تجاوز کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ دوسرے کا دم گھٹنے لگتا ہے اور اس پر ہر سانس مشکل سے مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔ بعض دفعہ تو ہم لوگوں سے وہ حقوق بھی چھین لیتے ہیں جو کہ جانوروں کو بھی حاصل ہیں۔

غیرت کے نام پر انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، کچھ اس طرح سے کہ غیرت کے نام پر عورت قتل ہو سکتی ہے مگر مرد کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اگر غیرت کا پیمانہ برابر کر دیا جائے تو شاید غیرت کے نام پر اتنی عورتیں نہ مریں جتنے مرد مار دیے جائیں۔ اور اگر حیا کی بات کی جائے اور حیا کے معیار کو بھی برابر کر دیا جائے تو شاید چادر اُڑھنے کی ضرورت مرد کو عورت سے کہیں زیادہ ہے۔ خیر ہر چیز سے پردہ نہ اُٹھایا جائے تو بہتر ہے۔

اسلام جب لفظ غیرت اور حیا کی بات کرتا ہے تو انسان کو مخاطب کیا جاتا ہے نہ کہ مرد اور عورت کو، جہاں عورت کو شرم و حیا کا درس دیا جاتا ہے وہیں مرد کو بھی آنکھیں نیچی رکھنے کو کہا جاتا ہے۔ جہاں پاک دامن عورت کی بات ہوتی ہے وہیں پاک دامن مرد کی بھی بات ہوتی ہے۔ جہاں امانت دار عورت کی بات ہوتی ہے وہاں امانت دار مرد کی بھی بات ہوتی ہے۔ جہاں ماں کے حققوق کی بات ہوتی ہے وہاں باپ کے حقوق کی بات بھی ہوتی ہے جہاں شوہر کے فرائض کی بات ہوتی ہے وہاں عورت کے فرائض کی بات بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم ترازو سیدھی نہیں رکھتے۔ ہمارے ہاں ایک پلڑا ہمیشہ ہی بھاری رہتا ہے۔

بھاری پڑنے والے مرد یا بھاری پڑنے والی عورتیں جن کی وجہ سے انسان دب جائے اور انسانیت مر جائے انہیں ان کا ایک دوسرے پر بھاری پڑنا آخرت میں کتنا بھاری پڑ سکتا ہے شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایک دوسرے پر بھاری پڑنا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانا دنیا کا کھیل تو ہو سکتا ہے مگر آخرت میں اس کا ٹھکانہ کیا ہو سکتا ہے یہ ہمیں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ضرور سوچنا چاہیے۔ شاید ہمارے اندر کا انسان ہماری آواز سن لے، شاید ہم غور کریں، شاید ہم شرم سار ہوں، شاید ہمیں احساس ہو شاید ہم درگزر کریں، شاید ہم مغفرت مانگیں اور شاید ہم پر رحم کیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ ہمیں توفیق دے اور ہم ایک دوسرے کو کم از کم انسان ہونے کی وجہ سے انسانیت کے حق سے محروم نہ کریں۔ امین،

دعا گو، میاں وقار الاسلام

پاکستانی ڈرامے اور کافرانہ نظریات کا پرچار

تحریر: میاں وقار الاسلام

پاکستانی ڈاموں میں کالے جادو اور کافرانہ نظریات کا پرچار کھلم کھلا کیا جارہا ہے، انٹرٹینمنٹ کے نام پر داغی جانے والی خرافات جو ہمارے معاشرے کو دین سے دور تو کر ہی چکی ہیں اور اب گناہ کا مرتکب بھی کرتی جارہی ہیں۔ ناپاک عقائد جن کا ذکر اللہ تعالی کے احکامات کی کھلی خلاف ورزی کے ذمرے میں آسکتا ایسی خرافات کا استعمال تسلسل کے ساتھ کیا جارہا۔

خدارا اپنا احاطہ ضرور کریں اور کوئی بھی ڈرامہ دیکھتے وقت اس بات کا تعین ضرور کرلیں کہ کہیں ہم انٹرٹینمنٹ کے نام پر گناہ کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔

سموکنگ میں ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے پیسیو سموکنگ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ ایک سموکر کے ساتھ بیٹھے اور سگریٹ نہیں پیتے تو بھی اس کا دھواں آپ تک پہنچتا ہے اور اس کے مضر اثرات بھی آپ تک پہنچتے ہیں۔

یقیناً آپ میں سے مان لیتے ہیں کہ 100 فیصد لوگ کالے علم اور اس کی خرافات پر یقین نہیں رکھتے ہوں گے پھر بھی ڈراموں کی شکل میں انہیں خرافات کو بار بار دیکھنا بھی اسی طرح گناہ کے زمرے میں آسکتا ہے جیسا کہ ان پر یقین رکھنے والے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کیونکہ پیسیو آڈیئنس تو ہم سب ہی ہیں۔

ہو سکتا بہت سے لوگ میری بات سے اتفاق نہ بھی کریں۔ مگر میں صرف اتنا چاہوں گا کہ وہ ایک دفعہ درج ذیل کچھ آیات کا مطالعہ ضرور کر لیں۔

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

☆ وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ 231)

اور اللہ کے احکام کو مذاق نہ بناؤ اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اس کے ذریعے سے تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کے غضب سے بچو اور سمجھے رہو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

ترجمہ: ''اور اس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جارہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقین رکھو کہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے''۔

اس آیتِ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو بڑے سخت انداز میں اس بات پر متنبہ کیا جارہا ہے کہ وہ ان لوگوں کی مجالس اور محافل سے پرہیز کریں' جو اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جو شخص ایسی باتیں سن کر بھی اُن کے ساتھ بیٹھا رہا تو وہ انہی میں سے شمار ہوگا اور آخرت میں اُس کا حشر بھی انہی کافروں کے ساتھ ہوگا۔

یہ آیت مبارکہ سورۃ الانعام کی ہے' اللہ کریم فرماتے ہیں

واذا رأیت الذین یخوضون فی اٰیٰتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ واما ینسینک الشیطٰن فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظٰلمین (الانعام ۶۸۔)

ترجمہ: ''اور جب تم اُن لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کو برا بھلا کہنے میں لگے ہوئے ہیں تو اُن سے اُس وقت تک کے لئے الگ ہو جاؤ جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمہیں یہ بات بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو''۔

ہو سکتا ہے میرے سمجھنے میں فرق ہو

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہم پر رحم فرمائے ایسے ڈرامے لکھنے والوں کو ہدایت دے اور ایسے دیکھنے والوں کی بھی رہنمائی فرمائے۔ اور ہماری بخشش فرمائے۔ آمین، میاں وقار الاسلام

چلتی پھرتی زندگی اور موت

تحریر: میاں وقار الاسلام

پوری دنیا غموں میں ڈوبی ہے، ایک عجیب سا قہر برپا ہے، ہر شہر میں اداسی چھائی ہے، خوشیاں تو جیسے روٹھ ہی گئی ہوں۔ بیان کرنے والے غم بیان نہیں کر پا رہے، لکھنے والوں کو لکھنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے، داستانیں آنسوؤں سے رواں ہو رہی ہیں، شاید یہ دور سیاہی سے نہیں اشکوں سے لکھا جائے گا۔ لوگوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے مگر وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر تنے کی طرح کھڑے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھتے جا رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی کہیں سے آواز دے رہا ہے، کہ ایک ایک کر کے چلے آؤ۔ زمین کی طرف دیکھتے ہیں تو لگتا ہے زمین پھٹ جائے گی، اور آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو لگتا ہے آسمان پھٹ جائے گا۔

جہاں جہاں نظر جاتی ہے وہاں وہاں لوگوں کے ٹوٹے پھوٹے خواب نظر آتے ہیں، چلتی پھرتی زندگی اچانک موت کے منہ میں جا گرتی ہے۔ ابھی کچھ لوگ اپنوں کا غم منا رہے تھے اور غم مناتے مناتے اپنوں سے جا ملے، اب ان کے پیچھے کوئی اور اپنا ان کا غم منا رہا ہے۔ موت اپنا کھیل بڑی بے دردی سے کھیلتی جا رہی ہے، اور زندگی، اس زندگی سے تو جیسے اعتبار ہی اُٹھتا چلا جا رہا ہے۔

اٹلی میں ایک فیملی کے تمام لوگ کرونا سے مر گئے، صرف ایک شخص بچا، اس نے بھی چھت سے کود کر جان دے دی، وہ زندہ کس کے لیے رہتا۔ لوگ مثلِ قیامت کا رقص اپنے گھر کے آنگن میں دیکھ رہے ہیں۔ بوڑھا باپ اپنے جوان بچوں کے جنازے اُٹھا رہے ہیں، ماں اپنے دودھ پیتے بچوں کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہے۔

کس کس آنکھ کا درد لکھا جائے، کس کس دل کی داستان بیان کی جائے، جن لوگوں کے بارے میں لکھنا پڑ رہا ہے، یہ لوگ کوئی نہیں تھے، یہ لوگ اپنے تھے، پیارے تھے، عمر بھر کے ساتھی تھے، اب نہیں رہے۔

سنو مجھ سے ملنے کے لیے مت آنا، مجھے بھی کرونا ہے اور میری ساری فیملی کو بھی کرونا ہے، کہیں تمہیں بھی میری وجہ سے کرونا نہ ہو جائے، زندگی رہی تو پھر ملیں گے، میرے خدایا، پھر زندگی ہی نہیں رہی۔ میرے خدایا، ہم اس قدر قیمتی لوگوں کو کہاں سے واپس لائیں، جن کی یادیں

صبح، شام ہمارے ارد گرد گھومتی ہیں، ہماری آنکھوں کے وہ سب حسین منظر کہاں چلے گئے، وہ ہمارے دوست وہ ہمارے ساتھی وہ ہمارے منتظر سب کہاں چلے گئے۔

موت برحق ہے، موت حقیقت ہے، مگر موت ایک دن یوں ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے گی، شاید ہم میں سے کسی نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا، مگر جو ہم نے نہیں سوچا تھا، وہ اب ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔

اپنے رب کو راضی کر لیں، اپنے رب کو راضی کر لیں اپنی رب کو راضی کر لیں، کسی کو نہیں معلوم کہ اُس کے پاس اپنے رب کو راضی کرنے کا کتنا وقت بچا ہے۔ جب تک سانس باقی ہے، توبہ کا دروازہ کھلا ہے، معافی کی امید باقی ہے، مغفرت مانگی جا سکتی ہے۔ اللہ تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

مسلمان جانتے ہیں کہ یہ دنیا ان کی مستقل قیام گاہ نہیں، انسانوں کی اصل قیام گاہ جنت ہے یا پھر دوزخ۔ زندگی لمبی ہو یا مختصر شاید اس سے اتنا فرق نہیں پڑتا جتنا فرق اس سے پڑتا ہے کہ یہ زندگی ہمیں بدلے میں کیا دے گی جنت یا پھر دوزخ۔ ہم میں سے بہت سے لوگ خوش قسمت بھی ہوں گے، جو آزمائشوں سے سیکھتے ہیں، اور اپنی حالت درست کر لیتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لیے آزمائش گھاٹے کا سودا بن کر نہیں آتی۔ اللہ کے رسول اور پیغمبر اپنے بچوں کے لیے دعائیں کرتے تھے اور تلقین کرتے تھے کہ بیٹا مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ موت تو برحق ہے، مگر موت باطل عقائد پر نہیں آنی چاہیے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ ہمیں ثابت قدم رکھے، اور ہمیں سیدھے راستے پر چلائے اور ہمارے عزیز و اقارب کو حفظ و آمان میں رکھے، اور یونہی چلتے پھرتے ہم سے جدا ہو جانے والوں کی مغفرت فرمائے، سب کی سلامتی کے لیے دعا گو، میاں وقار الاسلام

غیر معیاری سوچ کبھی معیاری معاشرہ تشکیل نہیں دے سکتی

تحریر : میاں وقار الاسلام

جب ہم انتخاب ایک آنکھ کے زاویے سے کرتے ہیں تو ہمیں ہمارا انتخاب فرشتہ اور دوسرے کا انتخاب شیطان نظر آتا ہے، اسی طرح ہم سے اختلاف رکھنے والوں کو ہمارا انتخاب شیطان اور اپنا انتخاب فرشتہ نظر آتا ہے۔

دراصل ہم جو اپنے معیار کی بنیادیں رکھتے ہیں وہ انصاف پر مبنی نہیں ہوتیں، اسی لیے ہمیں اپنی چیزیں سونا اور دوسروں کی چیزیں مٹی نظر آتی ہیں۔ ہم اپنی حماقتوں کی جنت میں رہتے ہیں اور جو ہم سے اختلاف کرے اُسے سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ دوزخ میں جلے گا۔

حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ہم سب کے سب ہی جہالت کی دوزخ میں جل رہے ہوتے ہیں۔ ہماری سوچ اپنے معیار کے لیے ضرورت سے زیادہ مثبت ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسروں کی سوچ کے معیار کے بارے میں منفی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کبھی بھی نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اپنی سوچ کے معیار کو تبدیل نہ کریں۔

جب تک ہماری سوچ میں ہم سے اختلاف رکھنے والوں تک وسعت نہیں آتی، نہ ہی ہم اپنا کوئی بھلا کر سکتے ہیں، نہ ہی ہم کسی اور کا کوئی بھلا کر سکتے ہیں۔

ایسی قوموں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو ترازو سیدھا نہیں رکھتی تھیں، ہماری سوچ کے ترازو میں بھی ہم اپنے پلڑے کو ہمیشہ بھاری رکھتے ہیں۔ ایسے دوہرے معیاروں سے ہم اپنی جہالت کو تقویت دینے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے حالات کو بدلنے کے لیے اپنے غیر معیاری معیار تلف کرنا ہوں گے۔ تاکہ ہم ایک معیاری معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

لوگوں کو تکلیف رہے گی

تحریر: میاں وقار الاسلام

اگر آپ نے کسی بھی نیک کام کا ارادہ کیا ہے، یا ترقی کے کسی بھی میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کو سب سے پہلے جس چیز کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہے دوسروں کو تکلیف۔ اب دیکھتے ہیں کہ دوسروں کو تکلیف کیا ہے اور دوسروں کو تکلیف ہوتی کیوں ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ لوگ دراصل اپنی کمی اور کوتاہی دوسروں میں دیکھتے ہیں اور یہ فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ جیسے وہ کچھ نہیں کر پائے اسی طرح کوئی دوسرا بھی کچھ نہیں کر پائے گا۔

دوسری وجہ یہ کہ لوگ اتنے فیلیئر دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ ان کی عقل سلیم انہیں اس بات پر آمادہ ہی نہیں کرتی کہ کوئی دوسرا کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔

تیسرا یہ کہ معاشرے میں ہمیں بہت سے مسائل اور بیریئرز کا سامنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم بہت سے آسان کام بھی نہیں کر پاتے اسی لیئے عمومی طور پر یہ سوچا جاتا ہے کہ ہر کوئی انہیں معاشرتی مسائل میں پھنس جائے گا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔

چوتھا یہ کہ ہم بہت کم نیک گمان کرتے ہیں اور بد گمانی ہمارے وجود کا ناسور بن چکی ہوتی ہے اور ہم کم ہی نیک گمان کرتے ہیں۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھتے ہیں۔

جو لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور لوگوں کو ہونے والی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور مسائل کا حل اس طرح تلاش نہیں کرتے جیسے فیل ہونے والے لوگوں نے کیا ہوتا ہے، اور معاشرے کے مسائل کو مختلف انداز سے ہینڈل کرتے ہیں اور بد گمان نہیں ہوتے اور اپنے زور_بازو پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے پھر وہ دیکھتے ہیں کہ تپتی دھوپ میں بھی ان کے سروں پر بادل آ جاتے ہیں اور سائے کیے رہتے ہیں یہاں تک کہ کامیابی کی بارش ان پر یوں برستی رہتی ہے کہ بنجر زمین بھی جل تھل ہو جاتی ہے۔

یہ ہے اوقات اس تکلیف کی جو دوسروں کو ہوتی ہے۔ اور اتنی ہی وقعت دوسروں کو ہونے والی تکلیف کو دینی چاہیئے۔

اللہ فرماتا ہے کہ ہم جس سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس سے وہ کام لے لیتے ہیں۔ انسان کی اوقات نہیں کہ وہ کچھ بھی کر پائے مگر جو اللہ چاہے۔ ایک اور جگہ ذکر ہوتا ہے کہ جب کسی کام کا ارادہ کریں تو یہ نہ کہیں کہ میں یہ کام کر دوں گا بلکہ یہ کہیں کہ انشاءاللہ میں یہ کام کر

دوں گا یعنی اللہ نے چاہا تو میں یہ کام کر دوں گا یہ مناسب بات ہے۔

پھر جب کوئی کام شروع کریں تو اپنی طاقت اور حیثیت کو دیکھتے ہوئے نہیں، بلکہ اللہ کی بادشاہت جو ہر چیز پر غالب ہے اسے نظر میں رکھیں اور کام شروع کریں انشاء اللہ آپ کے کام ہوتے چلے جائیں گے کیوں کہ اللہ بڑے فضل کا مالک ہے اور جب وہ کام لینا چاہتا ہے تو امیر غریب نہیں دیکھتا، چھوٹا بڑا نہیں دیکھتا، زیادہ ذہین اور کم ذہین نہیں دیکھتا، طاقت ور اور کمزور نہیں دیکھتا بس جس پہ چاہتا ہے اپنا بے پنا فضل نازل فرما دیتا ہے اور پھر کام خود بخود ہونے لگتے ہیں اور یوں ہونے لگتے ہیں کہ عقل سلیم خود پر حیران ہو رہی ہوتی ہے اور وہ کہ جن کو بہت تکلیف تھی وہ ہکے بکے رہ جاتے ہیں۔

ہر معاشرے میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو صرف تکلیف لینے کے لیئے پیدا ہوتا ہے اور اسی معاشرے میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جسے کام لینے کے لیئے چن لیا جاتا ہے اور چنے ہوئے لوگ معاشرے کے بہترین لوگ ہوتے ہیں اور وہ جنہیں تکلیف ہوتی ہے اگر دیکھا جائے تو وہ معاشرے کے بدترین لوگ ہوتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتے ہے کہ نیک کاموں میں لوگوں کا ساتھ دیا کریں اور برے کاموں میں ان کی مدد نہ کیا کریں تو ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم حق کا ساتھ نہیں دیتے اور باطل کی نہ چاہتے ہوئے سپوٹ کرتے جاتے ہیں۔

ہمیشہ نیک گمان رکھیں، ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے چاہنے اور نہ چاہنے سے سب کچھ ہوتا ہے، ہم اکثر لوگوں کو پسند نہیں کرتے جس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں مگر اللہ ہماری رائے کا پابند نہیں وہ اکثر انہیں پہ اپنا فضل کرتا ہے جسے ہم حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور پھر وہ ہمارے فیصلے ہمارے منہ پر مار دیتا ہے اور ہمیں سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تو خواہ مخواہ کی شرمندگیوں سے بچیں لازمی نہیں کہ جو آپ نہ کر پائیں وہ دوسرے لوگ بھی نہ کر پائیں۔

لوگوں پر جج بنانا چھوڑ دیں جب اللہ چاہتا ہے سب سے کمزور انسان کے قدم اتنے مضبوط کر دیتا ہے کہ جتنے کسی کے مضبوط نہیں کیئے ہوتے، اور جب اللہ چاہتا ہے تو مضبوط سے مضبوط شخص کے قدم ایسے اکھیڑ دیتا ہے کہ جیسے کبھی جمے ہی نہ ہوں۔ یہ ہے اللہ اور یہ ہے اس کی قدرت۔

اگر اللہ نے آپ سے کام لینا ہے تو پھر چاہے پوری دنیا تکلیف میں رہے آپ سے وہ کام لیا جائے گا۔ اور اگر آپ سے کوئی کام نہیں لینا تو پھر چاہے پوری دنیا آپ کے ساتھ کھڑی ہو جائے آپ کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ اللہ کی قدرت اور طاقت ہے۔ اور اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے

جنہیں تکلیف ہوتی ہے انہیں چاہیئے کہ اپنی تکلیف کم کر لیں اس سے پہلے کہ موت ان کا کام تمام کر دے، اور جو کام کرنے میں لگے ہوئے ہی انہیں چاہیئے کہ لوگوں کی تکلیف پر دھیان نہ دیں کیوں کہ شیطان تو چاہتا ہی یہی ہے کہ بدگمانیوں سے آپ کا راستہ روک لے اور جو آپ

کرنا چاہتے ہیں آپ اس کا ارادہ ترک کر دیں، سب سے کمزور حربہ شیطان کا ہوتا ہے آگر آپ ارادہ پختہ کر لیں تو پختہ ارادہ رکھنے والوں کے راستے میں آج تک نہ شیطان آ پایا ہے اور نہ آنے کی اوقات رکھتا ہے۔

ارادے مضبوط رکھیں اللہ آپ کے نیک ارادوں کو انشاء اللہ تکمیل تک ضرور پہنچائے گا، چاہے تکلیف میں رہنے والوں کو برا ہی لگے

دعا گو میاں وقار الاسلام

زنانہ مرد، مردانہ عورت

تحریر: میاں وقار الاسلام

احساس ذمہ داری یا تو ہوتا ہے یا پھر سرے سے نہیں ہوتا۔ بہت سی بیٹیاں ہیں جو بیٹوں سے بڑھ کر ثابت قدم رہتی ہیں اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں نہ خود ٹوٹتی ہیں نہ اپنے گھرانے کے کسی فرد کو ٹوٹنے دیتی ہیں۔

اسی طرح کچھ بیٹے ایسے بھی ہوتے ہیں تو ثابت قدم نہیں ہوتے اور مشکلات کا سامنا نہیں کر پاتے۔ یہ نہ تو اپنا بوجھ اٹھا پاتے ہیں اور نہ ہی گھر کے افراد کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ یہ گھر پر عورتوں کی بیٹھے رہیں اور گھر کی ذمہ داریوں سے بری ہو جائیں۔

صرف مرد پیدا ہونا ہی مرد کہلانے کے لیئے کافی نہیں، مرد ہونا ثابت بھی کرنا پڑتا ہے۔ جو مرد اپنے آپ کو مرد ثابت نہیں کر پاتے وہ معاشرے کے معزور لوگوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔

عورت پیدا ہونا کمزوری کی نشانی نہیں، بہت سی عورتیں خود کو مردوں سے زیادہ ذمہ دار اور مضبوط ثابت کرتی ہیں۔ مگر معاشرہ ان کو وہ عزت اور مقام نہیں دے پاتا جس کا وہ حق رکھتی ہیں۔

جہاں جہاں عورتیں ذمہ داری اٹھانے کے لیئے آگے بڑھتی ہیں ان کی حوصلہ شکنی اور کردار کشی کی جاتی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرے کا ایک موثر فرد ثابت کرنے میں کامیاب رہتی ہیں مگر معاشرے کے بااثر افراد کو یہ بات ہم ہی ہضم ہوتی ہے۔

حوصلہ شکنی تو ایسے مردوں کی ہونی چاہیئے جو معاشرے میں منفی کردار ادا کرتے ہیں اور عورتوں کو اس حال میں پہنچا دیتے ہیں کہ انہیں اپنے حصے کی ذمہ داری بھی سونپ دیتے ہیں اور آرام سے معذوروں کی طرح پڑے رہتے ہیں اور کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

حالانکہ عورتوں کو شرعی اور قانونی اختیارات بھی حاصل ہیں مگر قانون کو حرکت میں آتے آتے ظلم کی داستانیں رقم ہو چکی ہوتی ہیں اور جس چکی میں عورتیں پستی چلی آئی ہیں اسی چکی میں باقی عورتیں بھی پستی چلی جاتی ہیں۔ ظلم پر ظلم ہوتا ہے مگر بیمار معاشرے کی صحت پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔

شاید ہم باحیثیت انسان بے حس ہی ہیں، جنہیں اپنا درد تو درد نظر آتا ہے مگر دوسرے کے درد پر خوشی بھی ہوتی ہے، اور اگر خوشی نہ بھی ہوتی ہو تو درد کا احساس تو بالکل بھی نہیں ہوتا۔ مگر دوسری طرف ہم لوگوں کے طرف دار ہونے کے بڑے بڑے دعوے بھی کرتے ہیں۔

فہرست مضامین

	تجارتی اور معاشی	
1	اور پھر کرونا آ گیا	331
2	کرونا اور رونا	336
3	مذاق مذاق میں	341
4	تھرڈ کلاس سکسیسرز	344
5	عوام کو اپنے حقوق مانگنے کی نہیں چھیننے کی ضرورت ہے	347
6	بنیادیں	349
7	باس کی ناانصافی	351
8	قابلیت نیچے جہالت اوپر	352
9	بیریرز اور بنیادیں	354
10	اپنا تو بن	356
11	خاموش	358
12	ملتان ایک صاف ستھرا شہر	360
13	عید آئی اور چلی گئی	363
14	دہشت زدگی اور دہشت گردی	365
15	غیر منطقی سوچ کے حامل افراد	368
16	چھوٹے میاں بڑے میاں	373
17	جرم اور جرمانے	375
18	ٹماٹر کسانوں کی ہنسی اُڑاتا ہے	377
19	چندے سے فرق پڑتا ہے	379
20	پاکستان ہر گز مایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے	383

اور پھر کرونا آ گیا

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان عذر پیش کرنے کی ایک ماہر مشین ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی غلطی تسلیم کر لے اور اپنے آپ کو بہتر کرنے کی کوشش کرے۔ انسان برباد ہو جاتا ہے مگر عذر پیش کرنے سے بعض نہیں آتا۔ اور جب بات سیاست دانوں کی ہو تو پھر تو یہ ایک ناممکن سی بات لگتی ہے۔

دنیا میں بہت سے ملکوں کے سیاست دانوں کی صورتِ حال کچھ اسی طرح کی ہے، ان کے ووٹ بنک کا بڑا حصہ پرانے سیاست دانوں کے خلاف تقریریں اور الزامات کا ہوتا ہے، جس میں کچھ حقائق بھی ہوتے ہیں مگر کہاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اور جب وہ الیکشن جیت جاتے ہیں تو ان کی حالت بھی پرانے سیاست دانوں سے کچھ خاص اچھی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ تو یہ پہلے سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔

سیاسی مفادات کے لیے مخالف پارٹیوں کو نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں۔ مگر موجودہ حالات نے اس کا ایک نیا رُخ لیا ہے۔ 9/11 کے بعد مسلمان جہاں تک امریکہ کے جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہوئے وہیں انہیں سیاسی کارڈ کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ مودی اور ٹرمپ کا بار بار کامیاب ہونے کی بڑی وجہ مسلمانوں سے دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف شدید بیانات اور شدید ردعمل بھی تھا۔

کسی نہ کسی کے خلاف بیان بازی سے حکومتیں تشکیل تو پا جاتی ہیں مگر نفرت کی اپنی کوئی کارکردگی نہیں ہوتی۔ جب حکومتوں کو خود کام کرنا پڑتا ہے تو انہیں لگ پتا جاتا ہے۔ لوگوں میں کیوں کہ گذشتہ حکومتوں کے خلاف بھی نفرت کی آگ بھڑک رہی ہوتی ہے اسی لیے نئی حکومتوں کی بری کارکردگی کی وجہ سے یہ نفرت دوگنی ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کی کارکردگی پر زیادہ سوالات کرتے ہیں کیوں کہ انہیں نے نفرت میں آ کر بڑے بڑے دعوے کیے ہوتے ہیں اسی لیے انہیں جواب زیادہ دینا پڑتا ہے۔

جب نئی حکومتوں کو کٹہرے میں لایا جاتا ہے تو نئی حکومتیں اپنی بری کارکردگی کو بچانے کے لیے میڈیا پر وار کی صورتِ حال پیدا کر دیتی ہیں کیوں کہ ان کے پاس جواب دینے کے لیے نہ کوئی بات ہوتی ہے اور نہ کی کارکردگی دیکھانے کے لیے کوئی پراجیکٹ یا بہتر حکمتِ عملی ہوتی ہے۔

میڈیا کا کردار کبھی بھی مثبت نہیں رہا، اور میڈیا کا کاروبار ہی ٹینشن پھیلانے کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے انہیں ریٹنگ زیادہ ملتی ہے۔ ایک تو عوام میں پہلے سے بے چینی ہوتی ہے اوپر سے نئی حکومتیں جو بنی ہی نفرت کی بنیاد پر ہوتی ہیں ان کے پاس کارکردگی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تو اسی چھتری کے سائے تلے میڈیا کو بھی اپنی گیم بھرپور انداز سے کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔

میڈیا چاہے پاکستان کا ہو، انڈیا کا ہو یا پھر امریکہ کا ہو اس وقتی ایک جیسا کردار ہی ادا کر رہا ہے اور تینوں حکومتوں کی کارکردگی جیسی ہے وہ سب کو پتا ہی ہے۔ قصور صرف ان حکومتوں کا نہیں ہے ان سے پہلے جو حکومتیں تھیں وہ بھی فرشتوں کی نہیں تھیں انہوں نے بھی یہی کیا تھا کہ کوئی نہ کوئی عذر گھڑ لیتے تھے اور اپنی حکومت کی مدت پوری ہونے کے بعد ان کے پاس صرف اور صرف عذر ہی ہوتے تھے کارکردگی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔

جہاں پوری دنیا کی بدقسمتی کہ کرونا وائرس پھیل گیا وہیں ناکام حکومتوں کی خوش قسمتی کہ انہیں اپنی بری کارکردگی چھپانے کے لیے کرونا وائرس کا بہانہ مل گیا۔

حال ہی میں اگر بیانات دیکھیں تو یہ تاثر ملتا ہے، کہ جیسے امریکہ معاشی طور پر چین کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا، اور امریکہ نے اپنے تمام معاشی ریکارڈز توڑ دئے تھے اور پھر کرونا آ گیا۔ جب کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے، امریکہ نے ٹرمپ سے بدترین حکومت نہیں دیکھی، بے روزگاری اپنے عروج پر تھی، بیرونی سرمایہ کاری میں چین امریکہ کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا، چین سے امریکی کمپنیوں کے واپس لانے کے اقدام کے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ کمپنیاں چین چلی گئیں۔ اور جتنا برا ہو سکتا تھا اتنا برا ہو رہا تھا۔ اور پھر کرونا ٹرمپ کی بری کارکردگی چھپانے کے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

ٹرمپ ان دنوں اپنی ساری ناکامی کرونا کے پیچھے چھپانے کے چکر میں ہے۔ ٹرمپ کی بری کارکردگی ایک ہاتھی جتنی بڑی ہے جسے ٹرمپ ایک نہ نظر آنے والے کرونا کے پیچھے چھپانے کے بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ ٹرمپ نے اپنی تمام تر ناکامیوں کے لیے ایک عذر تلاش کرنا تھا اور وہ عذر اسے کرونا کی شکل میں مل چکا ہے۔ اور ٹرمپ اس عذر کو بہت لمبا کھیلنے والا ہے۔

دوسری طرف مودی ہے جس کی کارکردگی ٹرمپ سے بھی گئی گزری ہے، مودی کے کردار کو ہٹلر کے کردار سے مثال دی جا رہی تھی، ہندستان میں آر ایس ایس کے گنڈے مسلمانوں کا قتلِ عام کرنے میں مصروف تھے، کشمیر کو لاک ڈاؤن کر دیا گیا تھا، پاکستان میں انڈیا کے جہاز گرنے سے جو بدنامی ہوئی وہ اپنی جگہ مودی کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا، کراچی میں بھی انڈیا کر طرف سے کی گئی کاروائی کا منہ توڑ جواب دیا

گیا معاشی طور پر بھی بھارت کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، انڈیا میں ہی مودی کے خلاف مظاہرے جاری تھے، اور پھر کرونا آ گیا۔ ٹرمپ کی طرح بھارت کو بھی اپنی سیاسی ناکامیوں کے لیے ایک عذر مل گیا اور نئی کہانیاں شروع ہو گئیں۔

مودی کا بھی یہی بیان ہے کہ بھارت 5 ٹریلین ڈالر کیا بڑی مارکیٹ تھی، امریکہ کے ساتھ سب طے پا چکا تھا، بھارت نے چین کو بھی پیچھے چھوڑ دینا تھا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا پھر کرونا آ گیا۔

امریکہ کی طرح بھارت بھی اسے چین کا وائرس کہتا ہے، اور پاکستان پر یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ پاکستان کرونا وائرس سے متاثر لوگوں کو بھارت میں داخل کر رہا ہے اور بھارت میں کرونا وائرس بڑھنے کی بڑی وجہ پاکستان ہے۔ مودی بھی کرونا کے عذر کو بہت لمبا کھیلنے والا ہے۔ اور اس کے پیچھے جس قدر بھی سیاسی مقاصد پورے کئے جا سکتے ہیں وہ کئے جائیں گے۔

پی ٹی آئی کی حکومت کی طرف آنے سے پہلے، ہم نواز شریف کا بیانیہ بھی دیکھتے چلیں، نواز شریف کا بھی یہی کہنا تھا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پاکستان بس ایشن ٹائگر بننے کے قریب ہی تھا کہ مجھ سے استعفیٰ لے لیا گیا اور میری حکومت ختم کر دی گئی، اگر ہم ہوتے تو یہ ہو جاتا اور ہم ہوتے تو وہ ہو جاتا۔ خیر نواز شریف صاحب چلے گئے، ان کی بات اب ماضی کا حصہ ہے۔

اب آتے ہیں ہم پاکستان کی طرف، پی ٹی آئی کی حکومت کے آتے ہی اس کی ناکامیاں کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے دعوے تمام سیاسی جماعتیں کرتیں ہیں، مگر جو دعوے پی ٹی آئی نے کئے تھے لگتا تھا کہ پاکستان کو اُٹھا کر چاند پر لے جائیں گے۔ نیا پاکستان، مدینے کی ریاست، قرضے آئی ایم ایف کہ منہ پر ماریں گے اور جانے کیا کیا۔ سب سے پہلے ان کا معاشی آئین سٹائین آتے ہی ڈھیر ہو گیا، نہ کسی نے قرضہ دیا نہ کسی نے کوئی اور امداد کی، ڈالر اتنا چڑھا کے ڈبل ہو گیا، مہنگائی اتنی بڑھی کہ کمر ٹوٹ گئی، کبھی گندم غائب تو کبھی چینی غائب، کبھی وکیلوں سے پنگے کبھی ڈاکٹروں سے جھگڑے اور کبھی میڈیا پر دھاوا اور کارکردگی صفر۔ کبھی کسی کا تبادلہ کبھی کسی کا استعفیٰ، کبھی کسی پر الزام کبھی کسی کی خوشامد۔

اور پھر یہ حکومتی بیانیہ کے سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک تھا، ڈالر مضبوط ہو چکا تھا، ایکسپورٹ ریکارڈ توڑ رہی تھی، ترقیاتی کام اپنے عروج پر تھے، پاکستان میں اس سے اچھی حکومت تو کبھی آئی ہی نہیں تھی، پاکستان ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنے ہی والا تھا کہ کرونا آ گیا۔

امریکہ اور بھارت کی طرح پاکستان کی حکومت کے لیے بھی کرونا ایک لائف لائن سے کم نہیں ہے، پی ٹی آئی کی ساری ناکامیاں کرونا کے پیچھے چھپ جائیں گی، اب حکومت کے پاس ایک بڑا عذر موجود ہے کہ جب کرونا نے امریکہ کا بیڑا غرق کر دیا اور بھارت کا بیڑا بھی غرق کر دیا تو پھر پاکستان تو بہت چھوٹا سا ملک ہے ہم کیا کر سکتے تھے۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے، ایک بچہ سکول سے فیل ہو جاتا ہے اور منہ لٹکائے ہوئے اپنے گھر کا رخ کرتا ہے، اس کے ذہن میں بہت سی چیزیں چل رہی ہوتی ہیں کہ وہ اپنی ناکامی کا عذر کیا پیش کرے، یہی سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچ جاتا ہے تو اس کا باپ اس سے پوچھتا ہے، کیوں بیٹا آج سکول میں تمارے امتحان کا نتیجہ آنا تھا تو کیا بنا، بچا معصومیت سے جواب دیتا ہے کہ پاپا وہ ڈاکٹر کا لڑکا بھی فیل ہو گیا، باپ کہتا ہے کہ اچھا تمہارا کیا بنا تو بچہ کہتا ہے کہ وہ ایم پی اے کا بچہ بھی فیل ہو گیا تو اس کا باپ غصے سے پوچھتا ہے دفعہ کر سب کو تم بتاؤ تمہارا کیا بنا۔ تو بچہ کہتا ہے پاپا تم کون ساڈی سی لگے ہو تمہارا بچہ بھی فیل ہو گیا۔

فیل ہونے کے عذر ڈھونے جا رہے ہیں، اور ایک سے ایک سکیم پیش کر کے عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ناکامیوں سے سمندر میں سر تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پہاڑ کھودیں تو اس کے نیچے سے ایک چھوٹی سی چوہیا نکلے اور وہ بھی مری ہوئی۔

عذر پیش کرنا، ناکام لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے، جو لوگ محنت کرتے ہیں قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے، اور بڑی سے بڑی آزمائش بھی انہیں تار تار نہیں کرتی۔

کرونا کی آزمائش چین پر سب سے پہلے آئی، چین نے بجائے امریکہ پر الزام لگانے کے سب سے پہلے اپنا بندوبست کیا، جو ممکن تھا اور جہاں تک ممکن تھا اس آزمائش کا سامنا کیا اور کافی حد تک کامیاب بھی رہا، اور ساتھ ہی پوری دنیا کے لیے میڈیکل کا سامان بنانا اور بھیجنا شروع کر دیا۔ کرونا نے چین کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی تھی مگر اسی کرونا سے ہی چین دوبارہ اوپر آنا شروع ہو گیا ہے اور کئی درجن ممالک میں اس کا سامان اور سپورٹ پہنچ رہی ہے۔

یہاں امریکہ چاہتا تو اپنا بہترین کردار ادا کر کے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو واپس لا سکتا تھا، مگر امریکہ کی چین سے ضرورت سے زیادہ نفرت اسے کھا گئی اور اگر وہ کچھ کر بھی سکتا تھا تو نہیں کر پایا۔

پاکستان میں کرونا کا دباؤ کم تھا، پھر لاک ڈاؤن میں نرمی کی گئی اور صرف دو ہفتوں میں کرونا کیسز 5 ہزار سے اُٹھے اور 20 ہزار کے قریب لگ گئے۔ گمان کیا جا رہا ہے کہ ایک یا دو ہفتوں میں یہ تعداد 30 سے 40 ہزار تک پہنچ جائے گی۔

حکومت شاید زیادہ ہی سمجھدار ہے، ڈاکٹروں کی رائے کو خاطر میں لانا اپنی توہین سمجھتی ہے، اللہ ہم پر رحم کرے، کرونا نے جو کرنا ہے وہ تو اس نے کرنا ہے، مگر حکومت نے کیا کرنا ہے یہ حکومت کو خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے۔

اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و آمان میں رکھے اور پاکستان کی حفاظت فرمائے، امین دعا گو، میاں وقار الاسلام

اور پھر کرونا آ گیا

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان عذر پیش کرنے کی ایک ماہر مشین ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی غلطی تسلیم کر لے اور اپنے آپ کو بہتر کرنے کی کوشش کرے۔ انسان برباد ہو جاتا ہے مگر عذر پیش کرنے سے بعض نہیں آتا۔ اور جب بات سیاست دانوں کی ہو تو پھر تو یہ ایک ناممکن سی بات لگتی ہے۔

دنیا میں بہت سے ملکوں کے سیاست دانوں کی صورتِ حال کچھ اسی طرح کی ہے، ان کے ووٹ بنک کا بڑا حصہ پرانے سیاست دانوں کے خلاف تقریریں اور الزامات کا ہوتا ہے، جس میں کچھ حقائق بھی ہوتے ہیں مگر کہاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اور جب وہ الیکشن جیت جاتے ہیں تو ان کی حالت بھی پرانے سیاست دانوں سے کچھ خاص اچھی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ تو یہ پہلے سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔

سیاسی مفادات کے لیے مخالف پارٹیوں کو نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں۔ مگر موجودہ حالات نے اس کا ایک نیا رُخ لیا ہے۔ 9/11 کے بعد مسلمان جہاں تک امریکہ کے جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہوئے وہیں انہیں سیاسی کارڈ کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ مودی اور ٹرمپ کا بار بار کامیاب ہونے کی بڑی وجہ مسلمانوں سے دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف شدید بیانات اور شدید ردعمل بھی تھا۔

کسی نہ کسی کے خلاف بیان بازی سے حکومتیں تشکیل تو پا جاتی ہیں مگر نفرت کی اپنی کوئی کارکردگی نہیں ہوتی۔ جب حکومتوں کو خود کام کرنا پڑتا ہے تو انہیں لگ پتا جاتا ہے۔ لوگوں میں کیوں کہ گذشتہ حکومتوں کے خلاف بھی نفرت کی آگ بھڑک رہی ہوتی ہے اسی لیے نئی حکومتوں کی بری کارکردگی کی وجہ سے یہ نفرت دوگنی ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کی کارکردگی پر زیادہ سوالات کرتے ہیں کیوں کہ انہیں نے نفرت میں آ کر بڑے بڑے دعوے کیے ہوتے ہیں اسی لیے انہیں جواب زیادہ دینا پڑتا ہے۔

جب نئی حکومتوں کو کٹہرے میں لایا جاتا ہے تو نئی حکومتیں اپنی بری کارکردگی کو بچانے کے لیے میڈیا پر وار کی صورتِ حال پیدا کر دیتی ہیں کیوں کہ ان کے پاس جواب دینے کے لیے نہ کوئی بات ہوتی ہے اور نہ کی کارکردگی دیکھانے کے لیے کوئی پراجیکٹ یا بہتر حکمتِ عملی ہوتی ہے۔

میڈیا کا کردار کبھی بھی مثبت نہیں رہا، اور میڈیا کا کاروبار ہی ٹینشن پھیلانے کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے انہیں ریٹنگ زیادہ ملتی ہے۔ ایک تو عوام میں پہلے سے بے چینی ہوتی ہے اوپر سے نئی حکومتیں جو بنی ہی نفرت کی بنیاد پر ہوتی ہیں ان کے پاس کارکردگی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تو اسی چھتری کے سائے تلے میڈیا کو بھی اپنی گیم بھرپور انداز سے کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔

میڈیا چاہے پاکستان کا ہو، انڈیا کا ہو یا پھر امریکہ کا ہو اس وقتی ایک جیسا کردار ہی ادا کر رہا ہے اور تینوں حکومتوں کی کارکردگی جیسی ہے وہ سب کو پتا ہی ہے۔ قصور صرف ان حکومتوں کا نہیں ہے ان سے پہلے جو حکومتیں تھیں وہ بھی فرشتوں کی نہیں تھیں انہوں نے بھی یہی کیا تھا کہ کوئی نہ کوئی عذر گھڑ لیتے تھے اور اپنی حکومت کی مدت پوری ہونے کے بعد ان کے پاس صرف اور صرف عذر ہی ہوتے تھے کارکردگی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔

جہاں پوری دنیا کی بدقسمتی کہ کرونا وائرس پھیل گیا وہیں ناکام حکومتوں کی خوش قسمتی کہ انہیں اپنی بری کارکردگی چھپانے کے لیے کرونا وائرس کا بہانہ مل گیا۔

حال ہی میں اگر بیانات دیکھیں تو یہ تاثر ملتا ہے، کہ جیسے امریکہ معاشی طور پر چین کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا، اور امریکہ نے اپنے تمام معاشی ریکارڈز توڑ دئے تھے اور پھر کرونا آ گیا۔ جب کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے، امریکہ نے ٹرمپ سے بدترین حکومت نہیں دیکھی، بے روزگاری اپنے عروج پر تھی، بیرونی سرمایہ کاری میں چین امریکہ کو بہت پیچھے چھوڑ چکا تھا، چین سے امریکی کمپنیوں کے واپس لانے کے اقدام کے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ کمپنیاں چین چلی گئیں۔ اور جتنا برا ہو سکتا تھا اتنا برا ہو رہا تھا۔ اور پھر کرونا ٹرمپ کی بری کارکردگی چھپانے کے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

ٹرمپ ان دنوں اپنی ساری ناکامی کرونا کے پیچھے چھپانے کے چکر میں ہے۔ ٹرمپ کی بری کارکردگی ایک ہاتھی جتنی بڑی ہے جسے ٹرمپ ایک نہ نظر آنے والے کرونا کے پیچھے چھپانے کے بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ ٹرمپ نے اپنی تمام تر ناکامیوں کے لیے ایک عذر تلاش کرنا تھا اور وہ عذر اسے کرونا کی شکل میں مل چکا ہے۔ اور ٹرمپ اس عذر کو بہت لمبا کھیلنے والا ہے۔

دوسری طرف مودی ہے جس کی کارکردگی ٹرمپ سے بھی گئی گزری ہے، مودی کے کردار کو ہٹلر کے کردار سے مثال دی جا رہی تھی، ہندستان میں آر ایس ایس کے گنڈے مسلمانوں کا قتلِ عام کرنے میں مصروف تھے، کشمیر کو لاک ڈاؤن کر دیا گیا تھا، پاکستان میں انڈیا کے جہاز گرنے سے جو بدنامی ہوئی وہ اپنی جگہ مودی کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا، کراچی میں بھی انڈیا کر طرف سے کی گئی کاروائی کا منہ توڑ جواب دیا

گیا معاشی طور پر بھی بھارت کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، انڈیا میں ہی مودی کے خلاف مظاہرے جاری تھے، اور پھر کرونا آ گیا۔ ٹرمپ کی طرح بھارت کو بھی اپنی سیاسی ناکامیوں کے لیے ایک عذر مل گیا اور نئی کہانیاں شروع ہو گئیں۔

مودی کا بھی یہی بیان ہے کہ بھارت 5 ٹریلین ڈالر کیا بڑی مارکیٹ تھی، امریکہ کے ساتھ سب طے پا چکا تھا، بھارت نے چین کو بھی پیچھے چھوڑ دینا تھا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا پھر کرونا آ گیا۔

امریکہ کی طرح بھارت بھی اسے چین کا وائرس کہتا ہے، اور پاکستان پر یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ پاکستان کرونا وائرس سے متاثر لوگوں کو بھارت میں داخل کر رہا ہے اور بھارت میں کرونا وائرس بڑھنے کی بڑی وجہ پاکستان ہے۔ مودی بھی کرونا کے عذر کو بہت لمبا کھیلنے والا ہے۔ اور اس کے پیچھے جس قدر بھی سیاسی مقاصد پورے کئے جا سکتے ہیں وہ کئے جائیں گے۔

پی ٹی آئی کی حکومت کی طرف آنے سے پہلے، ہم نواز شریف کا بیانیہ بھی دیکھتے چلیں، نواز شریف کا بھی یہی کہنا تھا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پاکستان بس ایشن ٹائگر بننے کے قریب ہی تھا کہ مجھ سے استعفیٰ لے لیا گیا اور میری حکومت ختم کر دی گئی، اگر ہم ہوتے تو یہ ہو جاتا اور ہم ہوتے تو وہ ہو جاتا۔ خیر نواز شریف صاحب چلے گئے، ان کی بات اب ماضی کا حصہ ہے۔

اب آتے ہیں ہم پاکستان کی طرف، پی ٹی آئی کی حکومت کے آتے ہی اس کی ناکامیاں کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے دعوے تمام سیاسی جماعتیں کرتیں ہیں، مگر جو دعوے پی ٹی آئی نے کئے تھے لگتا تھا کہ پاکستان کو اُٹھا کر چاند پر لے جائیں گے۔ نیا پاکستان، مدینے کی ریاست، قرضے آئی ایم ایف کہ منہ پر ماریں گے اور جانے کیا کیا۔ سب سے پہلے ان کا معاشی آئین سٹائین آتے ہی ڈھیر ہو گیا، نہ کسی نے قرضہ دیا نہ کسی نے کوئی اور امداد کی، ڈالر اتنا چڑھا کے ڈبل ہو گیا، مہنگائی اتنی بڑھی کہ کمر ٹوٹ گئی، کبھی گندم غائب تو کبھی چینی غائب، کبھی وکیلوں سے پنگے کبھی ڈاکٹروں سے جھگڑے اور کبھی میڈیا پر دھاوا اور کارکردگی صفر۔ کبھی کسی کا تبادلہ کبھی کسی کا استعفیٰ، کبھی کسی پر الزام کبھی کسی کی خوشامد۔

اور پھر یہ حکومتی بیانیہ کے سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک تھا، ڈالر مضبوط ہو چکا تھا، ایکسپورٹ ریکارڈ توڑ رہی تھی، ترقیاتی کام اپنے عروج پر تھے، پاکستان میں اس سے اچھی حکومت تو کبھی آئی ہی نہیں تھی، پاکستان ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنے ہی والا تھا کہ کرونا آ گیا۔

امریکہ اور بھارت کی طرح پاکستان کی حکومت کے لیے بھی کرونا ایک لائف لائن سے کم نہیں ہے، پی ٹی آئی کی ساری ناکامیاں کرونا کے پیچھے چھپ جائیں گی، اب حکومت کے پاس ایک بڑا عذر موجود ہے کہ جب کرونا نے امریکہ کا بیڑا غرق کر دیا اور بھارت کا بیڑا بھی غرق کر دیا تو پھر پاکستان تو بہت چھوٹا سا ملک ہے ہم کیا کر سکتے تھے۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے، ایک بچہ سکول سے فیل ہو جاتا ہے اور منہ لٹکائے ہوئے اپنے گھر کا رخ کرتا ہے، اس کے ذہن میں بہت سی چیزیں چل رہی ہوتی ہیں کہ وہ اپنی ناکامی کا عذر کیا پیش کرے، یہی سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچ جاتا ہے تو اس کا باپ اس سے پوچھتا ہے، کیوں بیٹا آج سکول میں تمارے امتحان کا نتیجہ آنا تھا تو کیا بنا، بچا معصومیت سے جواب دیتا ہے کہ پاپا وہ ڈاکٹر کا لڑکا بھی فیل ہو گیا، باپ کہتا ہے کہ اچھا تمہارا کیا بنا تو بچہ کہتا ہے کہ وہ ایم پی اے کا بچہ بھی فیل ہو گیا تو اس کا باپ غصے سے پوچھتا ہے دفعہ کر سب کو تم بتاؤ تمہارا کیا بنا۔ تو بچہ کہتا ہے پاپا تم کون سا ڈی سی لگے ہو تمہارا بچہ بھی فیل ہو گیا۔

فیل ہونے کے عذر ڈھونے جا رہے ہیں، اور ایک سے ایک سکیم پیش کر کے عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ناکامیوں سے سمندر میں سر تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پہاڑ کھودیں تو اس کے نیچے سے ایک چھوٹی سی چوہیا نکلے اور وہ بھی مری ہوئی۔

عذر پیش کرنا، ناکام لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے، جو لوگ محنت کرتے ہیں قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے، اور بڑی سے بڑی آزمائش بھی انہیں تار تار نہیں کرتی۔

کرونا کی آزمائش چین پر سب سے پہلے آئی، چین نے بجائے امریکہ پر الزام لگانے کے سب سے پہلے اپنا بندوبست کیا، جو ممکن تھا اور جہاں تک ممکن تھا اس آزمائش کا سامنا کیا اور کافی حد تک کامیاب بھی رہا، اور ساتھ ہی پوری دنیا کے لیے میڈیکل کا سامان بنانا اور بھیجنا شروع کر دیا۔ کرونا نے چین کی بھی کمر توڑ کر رکھ دی تھی مگر اسی کرونا سے ہی چین دوبارہ اوپر آنا شروع ہو گیا ہے اور کئی درجن ممالک میں اس کا سامان اور سپورٹ پہنچ رہی ہے۔

یہاں امریکہ چاہتا تو اپنا بہترین کردار ادا کر کے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو واپس لا سکتا تھا، مگر امریکہ کی چین سے ضرورت سے زیادہ نفرت اسے کھا گئی اور اگر وہ کچھ کر بھی سکتا تھا تو نہیں کر پایا۔

پاکستان میں کرونا کا دباؤ کم تھا، پھر لاک ڈاؤن میں نرمی کی گئی اور صرف دو ہفتوں میں کرونا کیسز 5 ہزار سے اُٹھے اور 20 ہزار کے قریب لگ گئے۔ گمان کیا جا رہا ہے کہ ایک یا دو ہفتوں میں یہ تعداد 30 سے 40 ہزار تک پہنچ جائے گی۔

حکومت شاید زیادہ ہی سمجھدار ہے، ڈاکٹروں کی رائے کو خاطر میں لانا اپنی توہین سمجھتی ہے، اللہ ہم پر رحم کرے، کرونا نے جو کرنا ہے وہ تو اس نے کرنا ہے، مگر حکومت نے کیا کرنا ہے یہ حکومت کو خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے۔

اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و آمان میں رکھے اور پاکستان کی حفاظت فرمائے، امین دعا گو، میاں وقار الاسلام

مذاق مذاق میں

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہنسی مذاق کسے نہیں پسند، بچوں سے لے کر بوڑھے تقریباً تمام لوگ مذاق کرتے بھی ہیں اور انہیں مذاق پسند بھی ہیں۔ اگر آپ کے مذاق سے کسی کی دل آزاری نہ کی جائے تو کسی حد تک اس کی گنجائش بھی ہے۔

بعض اوقات مذاق اس حد تک بڑھ جاتا ہے، کہ کسی کی عزتِ نفس مجروح ہو جاتی ہے، اور یہاں تک بھی کہ لوگ مرنے مارنے پر بھی آ جاتے ہیں۔ کسی کی غربت کا مذاق اُڑانا، کسی کی تذلیل کرنا، کسی کی غیبت میں دلچسپی رکھنا، کسی کی عزت اور غیرت کا جنازہ نکال دینا، کسی کے عقیدے یا کسی کے مذہب کا اس حد تک مذاق اُڑانا کہ وہ اشتعال میں آ جائے، یا کسی کے بڑے، بزرگوں کو بری طرح تنقید کا نشانہ بنانا۔ اور کمزور پر تو وار کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔

امریکہ نے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے یا بھارت جو مسلمانوں کے ساتھ اپنے ملک میں کشمیر میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے تو یہ دکھ اور رنج کا مقام ہے ہی، بلکہ یہ انسانیت کے لیے بھی دکھ کا مقام ہے۔ پردے کا مذاق اڑانا، داڑھی کا مذاق اُڑانا، خواتین کے لباس کی بے حرمتی کرنا یہ تو معمولی باتیں ہیں یہاں تو انسانوں کو زندہ جلایا جاتا رہا ہے۔ یہ سب تو ہو گئے دشمنوں احوال انہوں نے تو یہی کرنا ہے جو ان کے بس میں آئے گا۔ مگر دوسری طرف ہم کیا کر رہے ہیں۔

سوشل میڈیا پر طرح طرح کے ہنسی مذاق چلتے رہتے ہیں، لوگ نا سمجھی میں اسے لاکھوں کروڑوں لوگوں تک شئیر کرنے میں دیر نہیں لگاتے اور ایک کا گناہ لاکھوں کے ہاتھوں سے کروڑوں کے جذبات کو مجروح کرتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔ یہ بات نہ صرف سوشل میڈیا کی حد تک محدود ہے بلکہ ڈراموں اور فلموں کے بعد اب ہماری حقیقی زندگی کا بھی حصہ ہے۔

ہر انسان اپنی لگن میں مگن ہے، اپنی خوشی ہمیں سب سے پیاری ہے، ہماری ہنسی اور خوشی دوسرے کے لیے کس قدر وبالِ جان بن جاتی ہے اس کا ہمیں کم ہی احساس ہوتا ہے، اور جب یہ ہنسی مذاق ہماری زندگی کا حصہ بن جائے تو پھر ہنسنے والوں کو ان لوگوں کا احساس ہی نہیں ہوتا جن کے احساسات ان کے کھیل ہی کھیل میں مجروح ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ تم میں سے ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے کہ وہ جماعت تم سے بہتر ہو۔ایک اور جگہ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ انتہائی بری باتوں کا جواب بھی انتہائی اچھے انداز میں دیا کرو۔اور پھر اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ تم کسی کے خداؤں کو برا نہ کہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ بھی اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے تمارے رب کو برا کہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب تم دیکھوں کے قرانی آیات کی ہنسی اُڑائی جارہی ہے تو ایسے لوگوں کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہیں جیسے شمار ہوگے،اور یہ بھی کہ کسی کی غیب اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے اور اسے تو تم یقینا ناپسند کروگے۔

جھوٹ بولنے اور بہتان لگانے سے منع کیا گیا ہے اور اس سے بھی کہ بہت زیادہ گمان نہ کیا کرو بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

مثال دی جاتی ہے کہ مسلمان قوم ایک جسم کی مانند ہیں جب جسم کے ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے حصے کو اس تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔تو کیا جب ہماری باتوں سے ہمارے مسلمان بھائیوں کو تکلیف ہوتی ہے تو کیا ہمیں بھی واپس اس کی تکلیف ہوتی ہے یا پھر ہم یہ سب مذاق ہی مذاق میں کر جاتے ہیں۔یا پھر یہ کہ ہم قوم ہی نہیں رہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس بھی ہو۔

اللہ ہم پر رحم کرے،جب معاشرے کے احوال پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو ایک نفسا نفسی کا عالم نظر آتا ہے،لگتا ہے کہ اسلامی اقدار ہمیں کبھی چھو کر بھی نہیں گزریں۔

ہر امت کسے احوال بتانے والے کو بلایا جائے گا،جب احوال بتانے والا بتائے گا کہ یہ قوم جو کرتی رہی ہے یہ ہر گز وہ نہیں ہے جس کی انہیں تعلیم دی گئی تھی تو اس وقت شرمندگی کا کیا مقام ہوگا،کیا ہم ایسی حالت میں ہیں کہ اپنے اعمال کا احاطہ کر سکیں یا ہم اس انتظار میں ہیں کہ کب ہمیں مار کر دفنا دیا جائے اور کب مٹی ہموار کر دی جائے جو ہمارے ساتھ ہمارے گناہوں کو بھی برابر کر دے،تو کیا ہم یہ یقین نہیں رکھتے کہ اُٹھائے بھی جائیں گے۔اس وقت کیا معاملہ ہوگا جب ہمارا نامہ اعمال ہمارے ہاتھوں میں پکڑایا جائے گا،اور اسے پڑھ پڑھ کر ہم شرمندہ ہو رہے ہوں گے۔تب تو انسان یہ پکارے گا کہ کاش وہ مٹی ہو گیا ہوتا،کاش اسے کبھی اُٹھایا ہی نہ جاتا کہ جس قدر کی شرمندگی اسے اُٹھانا پڑ رہی ہے اس سے تو ہمیشہ کے لیے مر جانا بہت بہتر تھا۔

ہمیشہ کامر جانا انسان کی قدرت میں نہیں ہے، مگر اس کی اسے قدرت ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے آگے کیا بھیجتا ہے۔ جو ہم بو رہے ہیں وہی ہمیں کاٹنا ہے۔ بے شک اللہ مسلمانوں پر فضل کرنے والا ہے، مگر اللہ ناانصاف بھی نہیں ہے اور سخت حساب لینے والا بھی ہے۔ جہاں ہمیں خوش خبری سنائی گئی ہے وہیں ہمیں ڈر بھی سنایا گیا ہے۔ کھلے نافرمان اور بدکار لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

اے اللہ، ہم پر رحم فرما، ہمارے قدم مضبوط رکھ، ہم سے برائی کو دور کردے، ہمیں ہدایت عطا فرما، ہمیں ان بندوں کے راستے پر چلا جن سے تو خوش ہوتا رہا نہ کہ ان کے جن سے تو ناراض ہوتا رہا اور ہمیں آخرت میں شرمندگی اُٹھانے والوں میں شامل ہونے سے بچالے بے شک تو اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے اور بے شک تو توبہ قبول کرنے والا ہے، تو ہماری توبہ قبول فرما اور ہم پر رحم فرما اور ہمارے دلوں کو نرم کر، ہمارے دل ہماری غفلت کی وجہ سے پتھر ہو چکے ہیں، اور تو ہی فرماتا ہے کہ پتھر بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں یا پھر ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، ہمارے دلوں میں سے بھی ہدایت کے چشمے جاری کردے، بے شک عاصی اور گناہ گار دلوں کا بوجھ پتھر سے بھی بھاری ہوتا ہے، ہمارے دلوں کو گناہوں کے بوجھ سے ہلکا کردے، اور ہمارے اندر کے اندھیروں کو اپنی ہدایت کی روشنی سے بدل دے، بے شک ہدایت تجھ ہی سے ہے اور تو کسی مانگنے والے کو اپنی ہدایت سے محروم نہیں کرتا، بے شک تو اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

دعا گو، میاں وقار الاسلام

تھرڈ کلاس سکسیسرز

Third Class Successors

تحریر: میاں وقار الاسلام

کچھ لوگ اپنے بارے میں بڑے بڑے گمان رکھتے ہیں۔ اور پھر اپنے گمان کی دنیا میں ہی بسیرا کیے رہتے ہیں۔ اُن کی اپنی ہی ایک الگ دنیا ہوتی ہے اور وہ دوسروں کا بہت کم اثر لیتے ہیں۔ یہ لوگ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں، ساری دنیا کو تھرڈ کلاس سمجھتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو ورلڈ کلاس خیال کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اُن کی کوئی کلاس ہی نہیں ہوتی۔ یہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے سوائے خود اپنی ذات کے۔ اس لیے ان کی دوستی ایسے لوگوں سے ہوتی ہے جو ان کی خوشامد میں لگے رہیں اور ان کے مکمل اختیار یا اقتدار کو قبول کر لیں۔ جس دن انہیں اپنا اختیار یا اقتدار خطرے میں نظر آتا ہے یہ پرانے سے پرانے دوستوں کو اپنی زندگی سے ایسے نکال دیتے ہیں، ایسے کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ ہزار بار اپنا اور دوسروں کا نقصان کریں گے مگر ہمیشہ یہ سمجھتے رہیں گے کہ وہ تو بالکل ٹھیک تھے مگر انہیں کبھی اس نے مروا دیا تو کبھی اس نے مروا دیا۔ حالانکہ ہر دفعہ یہ اپنی موت کا سامان خود کرتے ہیں۔

شوخ پن انسان کی شخصیت پر گہرا اثر رکھتا ہے اور انسان کو کسی حد تک ہر دل عزیز بھی بناتا ہے مگر انسان کا شوخا پن بالکل مختلف چیز ہے۔ شوخا پن نہ صرف انسان کی شخصیت پر بد نما داغ بن کر ابھرتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی سر درد بنا رہتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ دوسرے کی اذیت کا سامان پیدا کرتے ہیں اور دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر انہیں اپنے حاکم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ دوسروں کو احساسِ کمتری دیکھا کر اور اپنے چھوٹے پن کو بڑا دیکھا کر یہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ موقع پرست لوگ ان کے ساتھ چپکے رہتے ہیں اور فائدہ بھی اُٹھاتے رہتے ہیں۔ اور یہ خود بھی فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں ان کے ذہن میں شیخ چیلی جیسے بڑے بڑے منصوبے ہوتے ہیں۔ کیونکہ سب ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوتے ہیں تو انہیں اپنے ناقص منصوبے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ خوشامد پسند بھی بڑے بڑے دعوے کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ تو ان کے ذہنوں میں ایک بہت بڑا سبز باغ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہی سبز باغ یہ خود بھی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی دیکھا کر انہیں بھی خوش رکھتے ہیں۔ پھر جب بھی انہیں موقع ملتا ہے تو انہوں نے جو رائی کا پہاڑ بنانے کا لوگوں سے وعدہ کیا ہوتا ہے وہ کبھی کھڑا ہی نہیں ہو پاتا۔ بس صرف باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ اپنا بھی وقت برباد کرتے ہیں اور لوگوں کا بھی وقت برباد کرتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ یہ دنیا کے سب سے بڑے آئین سٹائن ہیں مگر ان سے بڑا بدھو کوئی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ انہوں نے ہر خوشامدی کو نوازا ہوتا ہے، اور خوشامدیوں نے کام ہی کیا کرنا ہوتا ہے، انہیں مکھن چاہیے ہوتا ہے اور لوگ انہیں مکھن دیکھا کر چونا لگاتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی سیلف ریسپیکٹ کا سودا کر دیتے ہیں اور اس سودے کو کامیابی کے لیے پارٹ آف دی گیم سمجھتے ہیں۔ اپنی بے عزتی ہو یا دوسرے کی بے عزتی ہو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دشمنی میں کسی حد تک بھی چلے جاتے ہیں۔ جس طرح یہ خود خوشامد

پسند ہوتے ہیں اس طرح دوسروں سے اپنا مقصد نکالنے کے لیے خوشامد کا سہارا لیتے ہیں مگر ہمیشہ پلٹ کر وار کرتے ہیں اسی لیے ان کے ساتھ بھی پلٹ کر وار ہوتا ہے۔ سینے میں کینہ اور بغض رکھتے ہیں منہ پر ان سے زیادہ میٹھی اور شیریں زبان کسی کی نہیں ہوتی۔ یہ باہر سے جتنے اجلے اور چمکدار ہوتے ہیں اندر سے اتنے ہیں میلے اور کردار کے سیاہ ہوتے ہیںَ۔

تھرڈ کلاس سکسیسرز کے حواری بھی انہیں کے جیسے ہوتے ہیں، جیسے بہت سے مراثیوں کا ایک بڑا مراثی، اس لیے میلا تو خوب لگتا ہے اور بعد میں ان سب کا جنازہ بھی ضرور نکلتا ہے۔ خود بھی پھنستے ہیں اور لوگوں کو بھی بری طرح پھنسوا دیتے ہیں۔

اندھوں میں کانا راجہ بن جاتا ہے، مگر جب ان کے سامنے کوئی دو آنکھوں والا آ جائے تو آپ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ نہ کسی کی مفید رائے لیتے ہیں نہ ہی مشورہ، یہاں تک کہ بالکل سامنے کنواں ہو اور سارے لوگ انہیں مل کر سمجھا بھی رہے ہوں تو انہیں نے کنویں میں گرنا ہی گرنا ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے ماننی تو کسی کی ہوتی نہیںَ۔ نقصان ہو جانے کے بعد بھی نہیں مانتے تو پھر نقصان ہونے سے پہلے کیسے مانیں گے۔

باطل معاشرے میں سب سے بڑا باطل حکمران بنتا ہے، حق ایسے معاشرے کے لیے موت کا سامان لے کر آتا ہے، جب انسان کو اس کے اعمالِ بد نیک کر کے دیکھا دیئے جائیں تو اسے تباہی سے کون روک سکتا ہے۔ تو انہوں نے تباہ ہو کر ہی رہنا ہوتا ہے۔ ایک راہِ حق ہے اور راہِ باطل لوگوں دونوں راستوں میں بڑی محنت کرتے ہیں راہِ حق کا مسافر صبر کرنے والوں میں ہوتا ہے، اور ہر حال میں شکر کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ جبکہ یہ لوگ بڑے ہی بے صبر ہوتے ہیں اور بڑے ہی ناشکرے بھی۔ نہ کبھی کسی کی تعریف کرتے ہیں اور نہ ہی کبھی کسی کی تعریف برداشت کرتے ہیں سوائے اپنی۔ کسی کی بھلائی کو خود پر احسان نہیں سمجھے بلکہ دوسروں پر خواہ مخواہ محسن بھی بنے رہتے ہیں اور ان کا بیڑا غرق بھی کرتے رہتے ہیںَ۔

تھرڈ کلاس کامیابی سے فرسٹ کلاس ہار زیادہ بہتر ہے کم سے کم انسان منہ کے بل کبھی نہیں گرتا۔ یہ ہر بار نئے طریقہ واردات سے کامیاب ہو جاتے ہیں پھر پکڑے جاتے ہیں پھر کامیاب ہو جاتے ہیں پھر پکڑے جاتے ہیں اور پھر کامیاب ہو جاتے ہیں اور پھر پکڑے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ نحوست کا یہی چکر چلتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ساری زندگی جگاڑ لگاتے ہیں اور ان کی جگاڑ لگتی بھی ہے پھر ایک دن زندگی ان کے ساتھ جگاڑ لگاتی ہے اور وہ دن دیکھنے کا ہوتا ہے۔

جو لوگ ان کی وکالت کرتے ہیں دراصل ظالموں کی دلالی کرتے ہیں ان کی وکالت کو کسی صورت وکالت نہیں کہا جا سکتا۔ جو لوگ ان کے لیے صحافت کرتے ہیں اس طرح کے ان کے جھوٹ کو سچ بنا بنا کر پیش کرتے ہیں اور حق بات کو چھپاتے ہیں تو ایسی صحافت کو صحافت بھی نہیں کہا

جاسکتا بلکہ یہ ذلت آمیز خرافت بھری سیاہ قلم کاری ہے تو جو چور کی سزا وہی ان کی سزا یہ بھی اسی طرح ذلیل ہوتے ہیں جیسے یہ خود ذلیل ہوتے ہیں۔

کیوں کہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کسی طور انصاف پر نہیں ہوتے اور ناانصافی کا کوئی موقع انہیں نے ہاتھ سے جانے نہیں دینا ہوتا اس لیے یہ وقت کے منصف کو خرید لیتے ہیں اور اپنی مرضی کے فیصلے کرواتے ہیں اور اپنے اختیار کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ جو منصف ان کے ہاتھوں اپنے ایمان کا سودہ کرتے ہیں انہیں جج یا منصف نہیں کہتے بلکہ انصاف اور ایمان فروش کہتے ہیں یہ لوگ بھی معاشرے کا اتنا ہی بڑا ناسور ہیں جتنا بڑا ناسور یہ خود ہوتے ہیں۔ کیوں کے ججوں اور وکیلوں کے سیاہ لباسوں کے پیچھے ہی یہ اپنا مکروہ چہرا چھپاتے ہیں اور پھر اپنا ظاہری اجلا اجلا چہرا لے کر دوبارہ آجاتے ہیں جیسے انہیں سچے اور پاک صاف ہونے کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہو۔

ایک بار جب حرام کا پیسہ حلق سے اتر جاتا ہے تو پھر پورے وجود کو ناپاک کر دیتا ہے پھر نہ حلال ہضم ہوتا ہے نہ ہی سمجھ میں آتا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو بھوکے مر جائیں گے مگر حرام نہیں کھائیں گے ان کے وجود میں حلال کے عنصر ابھی باقی ہیں۔ کچھ لوگ مرتے مر جائیں گے مگر حرام نہیں چھوڑیں گے، ان کے وجود میں حلال کا کوئی عنصر باقی ہی نہیں، ان کے دل پتھر ہیں یا اس سے بھی سخت۔ اور پھر اللہ بھی ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے کہ کچھ محسوس نہیں کر سکتے، کانوں میں ثقل ڈال دیتا ہے کہ کچھ سن نہیں سکتے اور آنکھوں کی بینائی اُچک لیتا ہے کہ کچھ دیکھ نہیں سکتے اور پھر انہیں مہلت دیے جاتا ہے کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر لیں اور اپنی آخرت کا سامان مزید اکٹھا کر لیں۔

یقیناً انہیں کے بارے میں اللہ تعالی کہتا ہے کہ کاش تم انہیں تب دیکھو جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں۔ کرپٹ لوگوں کے چہرے آخرت کے دن سیاہ ہوں گے مطلب ان کے چہروں پر عیاں ہو گا کہ یہ ہیں کرپٹ لوگ جنہیں تم پہچاننے میں غلطی کیا کرتے تھے۔

اللہ ہمیں ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھیں، اور اسلام ہماری اسی سلسلے میں تربیت بھی کرتا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ نیک کاموں میں لوگوں کا ساتھ دے دیا کرو اور برے کاموں میں لوگوں کا ساتھ نہ دیا کرو ورنہ تم بھی گویا انہیں جیسے تصور کیے جاؤ گے۔ اللہ ہمیں تھرڈ کلاس سکسیسرز اور خود پرست لوگوں کے وبال سے بچائے یہ لوگ اپنے لیے تو دوزخ کا ایندھن اکٹھا کرتے ہیں اور ان کے اعمالِ بد کا وبال ہم پر بھی گرتا رہتا ہے۔ اللہ ہماری مغفرت قبول کرے، امین

دعا گو، میاں وقار الاسلام۔

عوام کو اپنے حقوق مانگنے کی نہیں چھیننے کی ضرورت ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

میں یہاں کراچی کی ایک مثال دینا چاہوں گا جہاں لمبے عرصے سے لا اینڈ آرڈر کی صورتِ حال کچھ خراب رہی اور کچھ خراب رکھی گئی۔ لوگ جب انتظامیہ سے مکمل طور پر ناامید ہو گئے تو انہیں نے اپنی مدد آپ کے تحت چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنے انجام کا تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ جس قدر وہ طاقت رکھتے تھے انہوں نے چوروں اور ڈاکوؤں کے دل میں اپنا خوف بیٹھانے کی کوشش کی کیوں کہ انتظامہ کا خوف تو کیا بیٹھنا تھا انہیں چوروں میں ایک آدھ انتظآمہ کا اپنا بندہ ہی بیٹھا ہوتا تھا۔

ملک کے باقی حصوں میں بھی حالات کچھ خاص اچھے نہیں، اکثر وارداتوں میں محکمے کے لوگ براہ راست ملوث پائے جاتے ہیں۔ جس انتظآمیہ سے لوگ امید کرتے ہیں ہے وہ ان کے جان و مال کا تحفظ کر گی ظلم یہ ہوتا ہے یہ وہ انتظآمیہ لوگوں کے مال اور جان کے درپے ہوتی ہے۔

بیس سال پہلے بھی عوام اپنے مسائل کا رونا روتی تھی، آج بھی روتی ہے اور آج سے بیس سال بعد بھی اسے رونا ہی ہے۔ جب میں کسی فورم پر یہ بات کرتا ہوں تو فوراً سوال ہوتا ہے تو پھر کیا یہ مایوسی اور ناامید کی بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بالکل ناامید اور مایوسی کی بات ہے جس میں امید کی کرن صرف ایک صورت میں اپنا راستہ نکال سکتی ہے کہ یا تو مظلوم اپنے رویے بدلیں یا پھر ظالم اپنے رویے بدلیں اگر رویے دونوں طرف سے ایک جیسے ہی رہے اور کچھ تبدیل نہ ہوا تو پھر تبدیلی کا خواب بھی خواب ہی رہے گا۔

پنجابی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ کُتی چوراں نا رلی اے صورتِ حال کچھ اس سے مختلف نہیں اگر ہماری انتظامیہ ہی چوروں کے ساتھ ملی ہو گی تو پھر ہمیں اپنی امیدوں کو تیل لینے بھیج دینا چاہیے۔

عورتیں مروں سے حقوق مانگتی ہیں گویا بکری شیر سے کہتی ہے بھیا مجھے مت کھانا اور پھر شیر اسے جھوٹے دلاسے دے کر پھر اگلی کی تاڑ میں بیٹھ جاتا ہے۔ نہ بکری اپنی رویہ بدل رہی ہے نہ ہی شیر اپنا رویہ بدل رہا ہے۔ جو ڈر بکری کے دل میں بیٹھ گیا ہے وہ ڈر اسے کبھی جیتنے نہیں دے گا۔ اور وہی ڈر گیدڑ کو بھی شیر بنائے رکھے گا۔ جب تک بکری کو یہ احساس نہ دلایا جائے کہ وہ بکری نہیں اور کمزور بھی نہیں وہ اپنی طاقت کا اظہار کبھی نہیں کرے گی، اور جب تک شیر کو احساس نہ دلایا جائے کہ اس نے صرف کھال ہی شیر کی پہنی ہے اندر سے وہ بھی وہی انسان ہے اور جو سزا ایک عام انسان کی ہوتی ہے اس کی بھی ہو گی وہ بھی اپنی روش نہیں چھوڑے گا۔

عوام بھی اسی طرح ایک طرف کمزور ترین سطح پر ہے اور امید رکھتی ہے کہ حکمران ان کے حق میں کچھ کریں گے۔۔۔۔۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا۔ جب تک عوام خود اپنے حقوق کا تحفظ نہیں کرے گی حق ظالموں سے تو ملنے سے رہے۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہمارے حقوق کا ہی نہیں پتہ اس لیے جو ہم سے چھن جاتا ہے ہم اسے اپنی قسمت سمجھے ہیں اور جو ہمیں مل جاتا ہے وہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری اوقات سے زیادہ مل گیا ہے۔ ہم نے اپنی اوقات کو کیڑے مکوڑوں سے ملا دیا ہے سو جو حقوق ان کو ملتے ہیں وہ ہمیں بھی ملتے ہیں اور ہم ان پر بھی خوش ہیں۔

ہمیں جو سیاست دان دن رات چونا لگاتے رہتے ہیں ہم انہیں کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے اور ان کے حق میں دلائل دیتے رہتے ہیں۔ ہم سسٹم کی بجائے شخصیت پرست کے عادی ہیں۔ ہم اپنے تمام اختیارات اپنے سے اوپر والوں کو دے دیتے ہیں اور پھر وہ انہیں اختیارات کا فائیدہ اُٹھاتے ہوئے چلتے بنتے ہیں۔

میں عمران خان کا جتنا حمائیتی ہوں اتنا ہی اس بات کا مخالف بھی ہوں کہ ہمیں شخصیت پرستی سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے۔ تاکہ سیاست دانوں کے آنے جانے سے ہمارا سسٹم بار بار غیر فعال نہ ہوتا رہے۔ زرداری کو پورے پروٹوکول کے ساتھ لایا گیا، اور پوری طرح ذلیل اور رسوا کر کے نکالا گیا، نواز شریف کو بھی اسی طرح باعزت آنا اور بے توقیر جانا نصیب ہوا اسی طرح عمران خان کو پورے پروٹوکول سے لایا گیا اب آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہمارا فوکس ہی ایک شخص پر کروایا تا ہے تو پھر چڑھتے سورج کو سلام جسے جیتوانا ہوگا سارے لوٹے اس کے غسل خانے میں رکھ دیے جائیں گے اور جب اس کی حاجت پوری ہو جائے گی تو پھر دوسرے امیدروار کو اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے لایا جائے گا۔

میرا سوال ہے سسٹم کہاں ہے جو ہجوم کے شور اور مظلوم کی آواز میں فرق کر سکے۔ جب ہجوم کی ہی سنی جانی ہے تو پھر رش لگائیں اور اپنے حقوق چھین کر حاصل کریں۔ انگلی سیدھی رہی تو گھی کبھی نہیں نکلے گا، کیوں کے گدھا 20 سال پہلے بھی گدھا تھا 20 سال بعد بھی گدھا ہے اور 20 سال بعد بھی گدھا رہے گا۔ دعا کرتا ہوں کے ہمارے سسٹم میں کوئی ایسا طریقہ متعارف کروایا جائے جو ہجوم کے شور اور مظلوم کی آواز میں فرق کر سکے۔ ورنہ عوام کو اپنے حقوق مانگنے کی نہیں چھیننے کی ہی ضرورت پڑے گی

بنیادیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

کسی بھی عمارت کو کھڑا کرنے سے پہلے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا جاتا ہے تاکہ اس پر ایک بڑی عمارت کھڑی ہو سکے۔ اگر بنیادیں کمزور اور کھوکھلی ہوں تو اس پر کچھ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ آج ہمیں ہر ادارے اور محکمے میں بڑے بڑے مسائل نظر آتے ہیں جن کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بنیادیں مضبوط نہیں۔

صحافت کی بنیاد انفارمیشن پھیلانا ہے مگر صحافت ہمیں سوائے ڈس انفارمیشن کے اور کچھ کچھ پھیلاتے نظر نہیں آتی، غیر حتمی ذرائع سے پورا ہفتہ چلنے والی خبر حتمی نہیں نکلتی تو پھر ایک ہفتہ عوام کا سر کھانے والے میڈیا کا سر کھولنا بنتا ہے یا نہیں۔

سیاست کی بنیاد یہ ہے کہ ہر محکمے قانون اور ضوابط کو ریگولیٹ کیا جائے تاکہ کرپشن میں کمی مرحلہ وار چلتی رہے اور ان اقدامات کا مقصد کرپشن کا خاتمہ ہی ہونا چاہئے۔ مگر سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کرپشن بھی بڑھتی جائے اور ریگولیٹرز بھی تو پھر ایسی سیاست کو کیا کہنا چاہئے۔ ظاہر ہے اگر بنیاد ہی ٹھیک نہیں تو عمارت کبھی سیدھی کھڑی نہیں ہو گی۔

اسلام: اسلام کی بنیاد سلامتی ہے کہ قوم کو جوڑا جائے، باہمی اختلافات کو کم کیا جائے اور غیر مسلموں کے حقوق کا بھی تحفظ کیا جائے۔ اول تو عام عوام کو اسلام کا سرے سے پتا ہی نہیں اور باقی کسر مذہبی پیشوا پوری کر دیتے ہیں۔ جس کا جو دل کرتا ہے اپنا اسلام لے کر آ جاتا ہے اور ایک نئی تقسیم شروع ہو جاتی ہے۔ اسلام میں اول تو تمام اختلافات پیدا کیئے گئے ہیں یہ اختلافات اسلام کے نہیں بلکہ اسلام کا روز نیا ترجمہ کرنے والے جاہل عالموں کے ہیں جن کی بنیاد ہی ٹھیک نہیں کہ اسلام کا مطلب اکٹھا کرنا ہے تقسیم کرنا نہیں۔ ہم نے اسلامی بنیاد کو مضبوط نہیں کیا اس لیئے ہمیں مذہبی مسائل کا سامنا ہر آئے دن رہتا ہے۔

مارشل لاء: جمہوریہ پاکستان ہمارے ملک کی بنیاد ہے اور عسکری اداروں کا مقصد ملک کو مضبوط کرنا اور طاقت دینا ہے نہ کہ خود اس پر قابض ہونا، جمہوریت کمزور ہے تو اس کی بنیادیں مضبوط کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ عسکری بنیادوں کو توڑ کر جمہوری بنیادوں پر بیٹھ جانا۔ اگر ہسپتال ٹھیک نہیں چل رہا تو اسے عدالتوں کے حوالے کر دیا جائے یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ ہر ادارے کی اپنی حرمت ہے اور ہر ادارہ اپنے اپنے دائرے میں کام کرتا اچھا لگتا ہے اور اسی میں ان کے سربراہوں کی عزت اور تکریم ہے۔

عدلیہ : عدالتوں کا کام عدل پر گھٹ جوڑ کرنا ہر گز نہیں کہ جس کا دباؤ زیادہ فیصلہ اسی کے حق میں۔ یہ انصاف کی موت ہے جو ہمیشہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسے فیصلے جن کی قانونی ہجت قائم نہ کی جاسکے ان کا کوئی فائیدہ نہیں۔ زمینوں کے فیصلے اکثر مظلوم کے حق میں آجاتے ہیں مگر قبضہ عدالتیں نہیں چھڑواتیں۔ ایسے فیصلے نے مظلوم کا ساتھ دیا یا ظالم کا۔ کہتے ہیں اگر آپ کی لڑائی ہو جائے تو مخالف کو تسلی سے پیٹو۔۔۔ بعد میں عدالت میں تو صلاح ہی ہونی ہے۔ کرپشن اسی لیئے کم نہیں ہوتی کیوں کہ لوگوں کو پتا ہے زیادہ سے زیادہ نوکری جائے گی یا حکومت کیوں کہ عدالتوں کی کپیسٹی ہی نہیں کہ چوری برآمد کرواسکے پھر ایسے معذور فیصلے اپنی وقعت کیا رکھیں گے اور اپنی ہجت کیا قائم رکھیں گے۔

ہر سطح پر ہمیں اپنی بنیادیں مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، سٹرکچرز جتنے بھی بڑے ہوں بغیر مضبوط بنیادوں کے گر جاتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کے اندازے مقرر کئے۔ یہ کائینات انہیں اندازوں پر کھڑی ہے۔ اور اللہ کیا ہی اندازے مقرر کرنے والا ہے۔

ملک کو چلانے کے لیئے بھی کچھ باہمی اصول و ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے جن پر عمل درامد ہر فرد پر لازم ہوتا ہے۔ ورنہ لاقانونیت کا قانون ہی رہ جاتا ہے۔

اللہ ہماری ہر سطح پر رہنمائی کرے آمین

باس کی ناانصافی

تحریر: میاں وقارالاسلام

اکثر ملازموں کو اپنے باس سے شکائیت ہی رہتی ہے کہ باس انہیں وقت پر تنخواہ نہیں دیتا، ان سے کام زیادہ لیتا ہے، ان کی سیلف ریسپکٹ نہیں ہوتی، پروموشن نہیں ہوتی یا پھر سہولتیں پوری نہیں دی جاتیں۔ اکثر لوگ اسی وجہ سے جاب پر جاب تبدیل کرتے جاتے ہیں اور آخر میں ان کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ سارے باس ہی خراب ہوتے ہیں۔

ہم باحیثیت ملازم کبھی سوچتے ہیں نہیں کہ ہم نے کمپنی کے لیے کیا کیا، ہم نے اپنی صلاحتیں کام کرنے میں لگائیں یا پھر تنقید برائے تنقید کی منزلیں طے کرتے گئے۔

ادھر باس اپنی جگہ سر پکڑ کر بیٹھا ہوتا ہے کہ ایک سے ایک ملازم آئے سارے کے سارے ہڈ حرام، نکمّے اور کام چور۔

ذرا سوچیے کہ ایک باس پر 100 یا اس سے بھی زیادہ نکمّے لوگوں کا بوجھ ہو اور وہ پھر بھی کمپنی کو چلائے تو کیا یہ انصاف ہے۔ باس تو ہر ماہ تنخواہوں کا ذمہ دار ہے مگر ملازم صرف تنخواہ لینے کی ہی ذمہ داری ہے۔

جب ہم سرکاری ملازمتوں کی بات کرتے ہیں تو صورتِ حال اس سے کہیں بدتر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ سب سے نکما ہمارے وزیرِ اعظم ہے، ہوگا مگر ان پڑھے لکھے نکمّے لوگوں کا کیا کریں گے جو سرکاری جاب کو جاب ہی نہیں سمجھتے سرکاری وسائل کا بے جا استعمال کرتے ہیں اور اپنے ساتھ 10 اور لوگوں کا پیٹ لگا کر کھاتے ہیں اور کھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور پھر نکل پڑتے ہیں کبھی ہڑتالوں پر کبھی تنخواہوں کے اضافے کے لیے اور کبھی پروموشن کے لیے، کیا ان کا کام صرف مراعتیں لینا اور عوام کے پیسوں کو بلاوجہ اڑانا ہے۔

ہم ایسے ماحول میں توقع کرتے ہیں کہ صرف سیاست دان فرشتے ہوں اور باقی سب شیطان کے چیلے بنے رہیں تو چلے گا

دراصل جب انگی ایک کی طرف کی جاتی ہے تو چار اپنی طرف ہوتی ہیں لیکن ہم کبھی بھی اپنی طرف نہیں دیکھتے۔

قابلیت نیچے جہالت اوپر

تحریر : میاں وقار الاسلام

ترقی یافتہ ملکوں میں اگر دیکھا جائے تو دیکھنے، سننے، بولنے اور چلنے پھرنے سے معذور افراد کے لیئے بھی روزگار کے نئے نئے طریقے دیکھنے میں ملتے ہیں۔ صحت منداور پڑھے لکھے افراد کے لیے تو مواقع ہیں ہی۔

ترقی پذیر ملکوں میں اگر دیکھا جائے تو صحت منداور پڑھتے لکھے افراد بھی روزگار کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ایک تو روزگار کے مواقع بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں اور دوسرا پڑھے لکھے افراد کا حق بھی بے دردی سے مارا جاتا ہے۔

نوکریوں کے مواقع گویا ہوا میں اچھالے جاتے ہیں جن میں لپک کر موقع چھین لینے کی طاقت ہوتی ہے اسے تو نوکری اس کی قابلیت سے بھی بڑی مل سکتی ہے اور جو کوئی شرافت سے پیچھے بیٹھا رہ جائے اس کا کوئی پرسان حال نہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے وہ فاقے کاٹے یا خود کشی ہی کر لیئے یا پھر جرم کی دنیا میں جا بسے۔

ایسا ہی کچھ قلم کاروں کی دنیا کا حال ہے، جس طرح کی فلمیں اور ڈرامے لکھے جاتے ہیں یا جس طرح کی صحافت ہوتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ بہت سے انتہائی قابل لوگ اپنی تمام تر قابلیت کے ساتھ دفن ہو جاتے۔اور بہت ایسے لکھنے والے جن کا سرے سے قلم ہی سیدھا نہیں ہوتا ادبی صنعت کی باگ ڈور سنبھالتے نظر آتے ہیں۔

کسی بھی تباہ حال صنعت کی طرح ادب بھی اپنا رونا آپ رو رہا ہے۔لوگ انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔کچھ لوگوں قابل ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو منوانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں اور مشکل حالات میں بھی اپنا نام بنا لیتے ہیں مگر ان کے پیچھے ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو بے پناہ قابلیت رکھنے کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ پاتا جس مقام کا وہ پوری طرح اہل ہوتا ہے۔

ایسے قابل لوگ ہر میدان کی طرح ادبی میدان میں بھی ایک بڑی تعداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں جنہیں اگر بہتر طرح سے چینلائز کیا جائے تو ادبی صنعت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جا سکتا ہے اور خلا قومی اور علاقائی زبانوں کی ترقی کے درمیان حائل ہے اسے اگر ختم نہیں کیا جا سکتا تو کم ضرور کیا جا سکتا ہے۔

گورنمنٹ اگر ایسی پالیسیاں مرتب کر دے جس سے ادبی صنعت کے اوپر بنی ہوئی برفیلی سطح ٹوٹ جائے تو یہ صنعت اپنے آپ کو منوانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

ترقی یافتہ قومیں صرف اسی وجہ سے ہی ترقی کرتی ہیں کہ وہ قابلیت کو اوپر لاتی ہیں اور جہالت کو پیچھے چھوڑتی جاتی ہیں یہاں کہ وہ اگر ختم نہ بھی ہوسکے تو کم سے کم ہو جائے۔

قابل معاشرے وہی ہوتے ہیں جنہیں معاشرے کے قابل لوگ چلائیں ایسے معاشرے ہی معیاری معاشرے کہلاتے ہیں۔ادب کی صنعت کو اپنے پاوں پر کھڑا کرنے کے لیے اس میں معیار قائم کرنا بہت ضروری ہے۔

اگر قابل لوگ ہی منظر عام پر نہیں لائے جائیں گے تو پھر نئے لکھنے والوں کی ادب میں دلچسپی ہی کیا رہے جائے گی اور پھر وہ پیروی بھی کن کی کریں گے۔

بہت لاپرواہی سے کام لیا جا چکا ہے جس کا نقصان ہمارے سامنے ہے۔اگر اس پر آج غور نہ کیا گیا تو ہمارا کل کیسا ہوگا اس پر ہمیں آج سوچنے کی ضرورت ہے۔

بیریزاور بنیادیں

تحریر: میاں وقارالاسلام

کامیابی کاایک راستہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی بنیادوں کا سمجھوتہ کرتے چلے جاتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ اپنے آپ کو ہر جگہ منوا لیتے ہیں، امیر بھی بہت ہوتے ہیں اور اثر ورسوخ بھی کافی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ایک شاٹ کٹ ہے اور نسبتاً ایک آسان راستہ بھی ہے۔

کامیابی کاایک راستہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے راستے میں آنے والے بیریز کو گراتا چلا جائے۔ یہ نسبتاً ایک کٹھن راستہ ہے اور یہ ایک لانگ کٹ بھی ہے۔ اس راستے پر چل کر بھی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، مگر انہیں اپنی بنیادوں پر سمجھوتہ نہیں کرنا پڑتا۔

جو لوگ اپنی بنیادوں کی حفاظت کرتے ہیں، ان کی ترقی نہ صرف دیرپا ہوتی ہے، بلکہ ایسے لوگ دلوں پر حکمرانی بھی کرتے ہیں۔

جیسے اللہ تعالی فرماتا ہے کہ تم میں سے کامیاب شخص وہ ہے جو پرسکون ہے۔ جو لوگ اپنی بنیادوں کی حفاظت نہیں کرتے ان کے حصے میں جس قسم کی کامیابیاں آتی ہیں، اللہ اسے کامیابی نہیں کہتا، اور ان لوگوں کے دل بتاتے ہیں کہ وہ اندر سے کس قدر ناکام ہیں اور کس قدر کامیابی ان کو چھو کر گزری ہے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ گھاٹے کے سودے تو کر لیتے ہیں مگر کبھی بھی اپنی بنیادوں کے سودے نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ہمیشہ مشکل راستہ اپناتے ہیں، ان کی زندگی میں شارٹ کٹس نہیں ہوتے، ان کے رستے پکے ہوتے ہیں اور ان کے رشتے بھی پکے ہوتے ہیں اور ان کے تعلق دیرپا رہتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ فائدے کی بات کرتے ہیں اور کبھی نقصان کا سودا نہیں کرتے مگر حقیقت میں انہیں کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی زندگی اندر سے تباہ ہو چکی ہوتی ہے، ان کے رستے کچے ہوتے ہیں اور ان کے رشتے اور تعلق بھی صرف فائدہ اٹھانے کے لیے ہی ہوتے ہیں اور جیسے ہی فائدہ پورا ہو جاتا ہے ان کے تعلق بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

کون کتنا پریکٹیکل ہے کون کتنا کامیاب ہے اس کا اندازہ کسی کی بیرونی شخصیت سے نہیں لگایا جاسکتا۔ اس شخص کا اندر کتنا پریکٹیکل ہے اور اس کا اندر کتنا کامیاب ہے وہ اس پر انصاف کرنے کے لیے اکیلا کافی ہے۔ اور اگر وہ خود کو دھوکا دیتا رہے اور فائدہ اٹھاتا رہے تو اللہ کہتا ہے دنیا کا فائدہ تو بہت تھوڑا ہے پھر یہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

بہت سی قومیں بہت زیادہ فائدے میں تھیں، اتنے زیادہ فائدے میں کہ ان کی کامیابیوں کے نشانات آج بھی باقی ہیں اور ان پر آنے والے عذابوں کے نشانات بھی کافی ہیں۔ اور انہیں نشانات کی روشنی میں کچھ لوگ اپنے لیے منافے کا کاروبار کرتے ہیں اور کچھ لوگ گھاٹے کا سودہ کرتے ہیں۔

آخرت کا نقصان دنیا کے نقصان سے بہت بڑا ہے۔ اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہماری رہنمائی فرمائے اور ہمیں گھاٹے کے سودوں سے دور رکھے اور ہمیں آخرت کے منافے کا علم دے۔

دعا گو: میاں وقار الاسلام

اپنا تو بن

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہمیں کٹر ور سی، لکھنے، پڑھنے، سننے، سنانے، ڈھونڈنے اور پھر شئیر کرنے میں بہت مزا آتا ہے چاہے وہ سیاسی ہو چاہے مذہبی ہو، چاہے سماجی ہو کاروباری ہو یا پھر بین الاقوامی معاملات یہاں تک کہ اگر ادبی بھی ہو تو اسے ہم اٹھا کر بے ادبی کی طرف لے جاتے ہیں۔

پروفیشل یا کاروباری اداروں میں ان معاملات کو اداروں سے باہر رکھا جاتا ہے یا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کیوں کہ یہ سب نان پروٹیکٹیو کام ہیں اور انسان کی پروڈکٹیویٹی کو کھا جاتے ہیں۔

جو لوگ بہت زیادہ کیریئر فوکسڈ ہوتے ہیں وہ ایسی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے۔ مگر کسی حد تک اپنے کام کی فرسٹریشن نکالنے کے لیئے یا پھر ڈرائنگ روم ایکٹیوٹی کے طور پر صرف طنز و مزاح کی حد تک۔

ہر چیز کی زیادتی بری ہے اسی طرح فرسٹریشن ٹائپ کی نان پروڈکٹیو ایکٹویٹیز جب ضرورت سے بڑھ جاتی ہیں تو نہ صرف وہ اپنا وقت برباد کرتی ہیں بلکہ بہت سے دوسرے لوگوں کا وقت بھی ضائع کرتی ہیں خاص کر کے قوم کا۔۔۔۔اور اگر قوم تھوڑی جذباتی بھی ہو تو بس پھر ہو گیا کام۔

ہمارے بچے ہم سے بہت زیادہ تیز ہیں اگر ہم باتوں کو ایک یا دو بار ٹوسٹ کرتے ہیں تو ہمارے بچوں کی صلاحیت اسے 10 بار ٹوسٹ کرنے کی ہوتی ہے اور پھر ہم کہتے ہیں کہ بچے بڑے بد تمیز ہیں بچے ہمارے قابو میں نہیں یا کہ بچے بے لگام ہو گئے ہیں۔

اگر ہم ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کریں گے تو ہمیں بچوں سے توقعات بھی ویسی ہی رکھنی چاہیں۔

میڈیا ٹیکنالوجی اور موبائل نے بچوں پر کافی حد تک برا اثر ڈالا ہے مگر اس کے ذمہ دار بچے نہیں ہم نے انہیں ٹیکنالوجی کا پروڈکٹیو استعمال سکھایا ہی نہیں تو ہم اپنے اعمال کا سارا وزن نئی جنریشن پر کیسے ڈال سکتے ہیں۔ معاشرہ ہمارے ہی مشترکہ اعمال کا آئینہ دار ہوتا ہے جو ہم کرتے جاتے ہیں اسے اپنے سامنے ویسا ہی پا لیتے ہیں تو پھر شکوہ کس بات کا۔

نئ جنریشن خود جینریٹ نہیں ہوئی بلکہ ہماری ہی جینریٹ کی ہوئی ہے ہمیں ان کے لیئے صحت مندانہ ایکٹیویٹیز کے لیئے دروازے کھولنے پڑیں گے تاکہ نہ صرف ان کا مستقبل روشن ہوسکے بلکہ ہمارا بھی کچھ فرض ادا ہوسکے۔

ہم ہر چیز کا الزام کبھی اس پر کبھی اس پر کبھی امریکہ پر کبھی اسرائیل پر کبھی انڈیا پھر کبھی کسی پر کبھی کسی پر ڈالتے رہتے ہیں، مان لیتے ہیں کہ سب برے ہیں۔۔۔۔۔ تو کیا ہم اچھے ہیں یا جو ہم کر رہے ہیں وہ اچھا ہے۔۔۔ ہم سے ہمارے بچے کیا سیکھتے ہیں۔۔۔ اور ہم خود اپنے لیے کیا کر رہے ہیں۔۔۔ کیا ہم خود اپنے ساتھ ٹھیک ہیں۔

ہم بہت بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اتنی بڑی باتیں کہ جیسے سارے ملک کا ٹھیکہ ہم نے اٹھایا ہوا ہے اور جو ہم انرجی لگاتے ہیں اس سے جیسے ملک کا کوئی بڑا کام سرانجام پا رہا ہو۔۔۔ دوسری طرف اگر حالات دیکھیں تو ادھے سے زیادہ لوگ صرف اپنی فرسٹریشن نکالتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس کوئی پروڈکٹیو کام نہیں ہوتا اس لیئے یہ ساری دنیا کو ڈرائینگ روم سمجھتے ہیں۔

خدارا آپ کسی کے نہیں بن سکتے تو نہ بنیں کم سے کم اپنے تو بنیں۔ ہم ملک میں بہت بڑا حصہ ڈالنے کی اہلیت نہ بھی رکھتے ہوں، جتنی بھی ہماری طاقت ہے کم یا زیادہ اسے تو بہتر استعمال کریں۔

اگر ہم اپنے بن گئے تو شاید بہت لوگوں کے کام آسکیں اور ہم سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ اور اگر ہم اپنے بھی نہ ہوئے تو پھر ہم کسی کے کیا ہو سکتے ہیں۔

اللہ ہمیں راہ ہدایت کو سمجھنے اور اس پر چلنے کی توفیق دے، امین۔۔۔ دعا گو

میاں وقار الاسلام

خاموش

تحریر: میاں وقار الاسلام

لفظ "خاموش" میری زندگی کا ایک بہت خوبصورت پہلو ہے جسے میں سونے کے لفظوں سے لکھنا چاہوں گا اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں اب تو میں "سب کچھ کہہ دیتا ہوں مگر ایک وقت تھا جب میرے پاس اپنے جذبات کے اظہار کا صرف طریقہ تھا اور وہ تھا "خاموشی

میں نے شاید اتنی باتیں کبھی کسی سے نہیں کیں جتنی باتیں میں نے اپنی خاموشی سے کی ہیں، خاموشی ہی میری سب سے بڑی رازداں رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ خاموشی کی برف پگھلنا شروع ہوئی، کچھ کچھ مجھے بولنا آنے لگے اور کچھ کچھ لکھنا اور پھر شاعری میری راز فشاں بن گئی۔ بہت سے لوگ تباہی کے قلم کار ہوتے ہیں اور بولنے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا مگر پھر بھی ان کے اندر خاموشی کے پہاڑ ہوتے ہیں۔

سینے میں چھپی ہوئی خاموشی کبھی کبھی اپنی داستان آنسوؤں کے ذریعے بیان کرتی ہے تو کبھی چہرے پر مسکراہٹ کی صورت میں عیاں ہوتی ہے۔ بعض دفعہ خاموشی کو اپنے لب سینے کی سزا ملتی ہے، جب کبھی خاموشی کا مطلب لوگوں کی نظر میں ہاں یا ناں میں اخذ کر لیا جاتا ہے۔ خاموشی صبر کا دوسرا نام بھی ہو سکتی ہے، مگر خاموشی اپنی ہی ذات پر ظلم کا دوسرا نام بھی ہے۔ کچھ ظلم ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر شہر کا شہر خاموش ہو جاتا ہے اور پھر وہ ظلم اسی شہر کی منحوس رسم بن کر کئی زندگیاں نگل جاتا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں لکھنا بھی آتا ہے اور بولنا بھی آتا ہے مگر وہ خاموش لبوں کی زبان نہیں بنتے۔ جو لوگ لکھنا اور بولنا جانتے ہیں مگر آواز نہیں اُٹھاتے انہیں ایک دن اپنی خاموشی کا حساب دینا پڑے گے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے حق کے لیے چیختے چلاتے مر جاتے ہیں مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ زمانے کی ناانصافی پر جو لوگ تھک ہار کر خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر صبر کر لیتے ہیں اللہ کے ہاں اس کا اجر تیار ہے۔

بعض دفعہ بولنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو اسے بولنے میں کمال حاصل ہوا ہے اس کی وجہ سے وہ ہر میدان مار سکتا ہے۔ مگر کسی کی خاموشی اسے بہت بری طرح ہرا سکتی ہے۔ خاموشی کا ایک سفر بزدلی کی طرف ہے جہاں ہر شخص ڈر ڈر کر زندگی گزارتا ہے اور ایک لفظ نہیں بولتا یہاں تک کہ خاموش ہو جاتا ہے۔ خاموشی کا دوسرا رُخ صبر کی طرف ہے جہاں پر ظلم کرنے والا ظلم کرتا رہتا ہے اور آخر کار وہ بھی خاموش ہو جاتا ہے۔

اللہ خاموش لبوں کی پکار کو سنتا ہے، وہ دلوں کے حال خوب جانتا ہے اور اس کی مدد رنجیدہ دلوں پر اترتی ہے۔ اللہ دلوں کے پھیر دینے پر قادر ہے، اللہ بہت بولنے والے کو شرمسار بھی کروادیتے ہے اور اللہ صبر کرنے والے کے مقام کو بلند بھی کر دیتا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے، اللہ ثابت کئے دیتے ہے کہ وہ ان کے لیے برا تھا، اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے حق میں برا ہے اللہ ثابت کئے دیتے ہے کہ وہ ان کے حق میں اچھا تھا۔

خاموشی کا ایک سفر اللہ کی ذات کی طرف بھی، لوگ چپکے چپکے اپنے اشکوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں اور اپنے رب کو ہر طرح سے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسرے لوگوں کی رنجیدہ باتوں پر دکھی نہیں ہوتے وہ صبر کئے رہتے ہیں ان کے نزدیک ان کے لیے اللہ ہی کافی ہوتا ہے اور پھر اللہ ثابت کیے دیتے ہے کہ اللہ ہی کافی ہے۔

اُس ظلم سے بچیں جو آپ کے ہاتھوں کسی خاموش نفس پر گزرے اور وہ اس پر خاموش ہو جائے اور اس کی خاموشی اسے تو بچالے مگر آپ کی پکڑ ہو جائے۔ اپنے ارد گرد لوگوں کی خاموشیوں کو پڑھیں کیا جانے کون سی خاموشی آپ سے ہم کلام ہونا چاہے اور آپ اسے سمجھنے میں دیر کر دیں۔

ظلم کے خلاف ضرور بولیں، ہو سکتا ہے آج آپ کسی کی آواز بنیں تو کل کوئی آپ کی آواز بن جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آج آپ کسی ظلم پر خاموش ہوں اور کل کوئی آپ پر ظلم ہوتے دیکھے اور خاموش ہو جائے۔ بد قسمتی سے ہم ایسے خاموش نہیں کے کہ باصبر لوگوں میں گنے جائیں بلکہ ہم ایسے خاموش ہیں جو ظلم سہتے ہیں اور ہم ظالموں میں ہی لکھے جائیں گے۔ اللہ ہماری حالت پر رحم فرمائے امین۔

ملتان ایک صاف ستھرا شہر

تحریر: میاں وقار الاسلام

ملتان میرا اپنا شہر ہے، مگر میں گذشتہ 20 سالوں سے ملتان میں نہیں رہا، حال ہی میں اپنے ہی شہر کا ایک چھوٹا سا سروے کرنے کا موقع ملا تو کلی کھلی کے سامنے آ گئی۔ ہر شخص کو اپنا شہر بھلا معلوم ہوتا ہے خواہ وہ دنیا کر سب سے بدترین شہر ہی کیوں نہ ہو۔

صفائی اور ستھرائی کا مطلب کیا ہوتا ہے شائید ملتان لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی، انڈسٹریل ایئراز، پبلک مارکیٹس، ہوٹلز اور ہسپتال، گویا شہر میں ہے تو سب کچھ، مگر کوڑے کے ڈھیر پر۔ زہریلی ویسٹ کو ویسٹ کرنے کا انتظام تو دور کی بات عام انسان کو پتا ہی نہیں ہے کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ لوگ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں جیسے آنکھوں میں جلن، سکن کی بیماریاں اور طرح طرح کی الرجیز اور جانے کیا کیا۔

جب عام آدمی سے بات کی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ آپ بات تو ٹھیک کر رہے ہیں مگر یہ سب تو قدرتی ہوتا ہے جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں ملتان شہر کو ایسے ہی دیکھ رہے یہ ایسے ہی رہے گا اس میں محکمہ کیا کرے، گورنمنٹ کیا کرے، سول سوسائٹی کی کرے اور لوگ کیا کریں، گویا انہیں معلوم ہی نہیں کہ صحت مند آب و ہوا کہتے کسے ہیں۔ سارا شہر ان مسائل کو قدرتی سمجھ کر برداشت کر رہا اور اُف تک بھی نہیں کر رہا، سو چل سو چل۔

ہم کچھ دوستوں سے ملے جو سعودی عرب میں 15 سے 20 سال ملازمت کرنے کے بعد، اپنی فیملیز میں واپس آنے کی خواہش سے، ملتان میں کچھ کاروبار کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اپنے حالات کچھ یوں بتاتے ہیں کہ جب سے بچے ملتان آئے ہیں بیمار رہنا شروع ہو گئے ہیں، اور ہماری اپنی حالت تو بچوں سے بھی بری ہے، بڑی مشکل سے 2 یا 3 ماہ گزارنے کے ہم سوچ رہیں ہیں کہ ملتان میں کام کیا جائے یا ملتان سے جان بچا کر بھاگا جائے۔ کچھ لوگوں کا رہنا اس لیے مجبوری ہے کہ ان کے والدین یہاں رہتے ہیں یا پھر عزیز و اقارب اور وہ اپنا شہر نہیں چھوڑنا چاہتے کیوں کہ بیماریاں ان میں رچ بس گئی ہیں اور وہ اسے مسئلہ نہیں سمجھتے، مگر ہم جو کہ باہر رہ کر آئے ہیں ہمارا یہاں رہنا موت کو دعوت دینے سے کم نہیں۔

میں نے یہ سارے واقعات بہت قریب سے سنے بھی اور دیکھے بھی۔ تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ بھی سارے لوگوں کی طرح شہر چھوڑ دیں گے تو شہر کا بنے گا کیا۔ آپ کو اس سلسلے میں کچھ کام کرنا چاہیے تاکہ شہر کا کچھ بھلا ہو۔ انہوں نے فوراً میری بات مان لی اور اس سلسلے میں میری خدمات بھی مانگ لیں۔

ملتان کتنا صاف ستھرا شہر ہے یہ تو مجھے پہلے بھی معلوم ہی تھا کیوں کہ کبھی کبھی ملتان کا چکر تو لگ ہی جاتا تھا، مگر باقاعدہ رہنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ سو اس دفعہ یہ اتفاق بھی ہو گیا۔ ملتان کے رہائشی اور انڈسٹریل منصوبوں کے ساتھ ساتھ، شہر کے تقریباً تمام علاقوں کا سروے کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملتان شہر کو انتہائی گندا شہر کہنا بھی انتہائی کم ہے۔ کیوں کہ صورتِ حال اس سے کہیں بدتر ہے۔ یہ صورتِ حال شہر کو دیکھ کر یا رپورٹ مکمل کر کے نہیں بلکہ سروے کے بعد ایک ہفتہ باجماعت بیمار رہنے کے بعد معلوم ہوئی۔

سروے مکمل کرنے کے ایک دن بعد ہی میرا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا، مجھے لگا شائید عمر کا تقاضا ہے، تھوڑا ویٹ گین کیا ہے، یا پھر کافی دنوں سے جِم نہیں گیا۔ پھر ڈاکٹر نے کہا کہ شروع میں یہ پرابلم سٹریس سے بھی ہو سکتی ہے تو فکر نہ کریں اور سٹریس کو کم کرنے کی کوشش کریں۔ خیر میں ایک عجیب طرح کی صورت حال کا شکار رہا اور بہتری اسی میں جانی کے سارے ٹیسٹ مکمل کروا لیے جائیں۔ ہر طرح سے تسلی کر لینے کے بعد مجھے صرف ایک وجہ نظر آئی کہ میں نے ملتان کا چکر لگا لیا، سو مجھے ہسپتالوں کے درجنوں چکر لگانے پڑ گئے۔ اور میں مان گیا ملتان شہر کی صفائی اور ستھرائی کو۔

اگر آپ ملتان میں رہتے ہیں تو آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ آپ آلودہ ماحول کے عادی ہو چکے ہیں اور آپ کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اور اگر آپ کسی دوسرے شہر سے ملتان گئے ہیں اور جاتے ہی بیمار ہو گئے ہیں تو فکر نہ کریں واپس اپنے شہر جائیں کچھ دن تک ملتان کے اثرات رہیں گے اور پھر آپ ٹھیک ہو جائیں گیں، اپنا ٹور لمبا نہ کریں ورنہ ہسپتال میں داخل بھی ہونا پڑ سکتا ہے۔

ملتان کے لوگوں کو یہ پوسٹ پڑھ کر ہنسی آ رہی ہو گی، وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں کیوں کہ انہیں آلودگی سے پاک ماحول کبھی ملا ہی نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ گلیوں سڑکوں اور پارکوں کو صاف کر دینا ہی صفائی ہوتی ہے۔ دراصل انہیں بہت زیادہ آگاہی کی ضرورت ہے کہ شہروں کے ویسٹ کو روزانہ کی بنیاد پر مختلف چھوٹے اور بڑے کنٹینرز میں جمع کیا جاتا ہے اور پھر شہر سے باہر ڈمپ کر کے پراسس کیا جاتا ہے تاکہ اس کا مکمل خاتمہ کیا جا سکے۔ اگر ویسٹ کو ہوا ملتی رہے تو سارے شہر کہ ہوا زہریلی ہو جاتی ہے جس سے صرف بیماریاں ہی نہیں قیمتی جانیں بھی جا سکتی ہیں۔

ملتان جیسے کئی شہر اس صورتِ حال کا شکار ہیں، ترس آتا ہے لوگوں کی زندگیوں پر جن کے شہروں کے ہسپتال پر ہسپتال چڑھا دیے گئے مگر شہروں کو بیماریوں کی آرام گاہ بنا دیا گیا۔ ملتان کے لوگ جب شکائت بھی کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں کہ مزید ہسپتال چاہیں، مزید ہسپتال چاہیں، مگر اس سے ہو گا کیا۔ سارے کے سارے شہر کو ہی ہسپتال جانیں، جس کو ہسپتال مل گیا وہ ہسپتال میں داخل اور جس کو ہسپتال نہیں ملا ہوا اپنے گھر میں داخل ہے تو سارے کے سارے مریض کے مریض۔ ہسپتالوں کی ضرورت اپنی جگہ مگر جس طرح سے شہر کے شہر گندے ہوتے جا رہے ہیں، ضرورت ہسپتالوں سے زیادہ شہروں کو صاف ستھرا کرنے کی ہے۔ ایکو کیئر کی ٹیم ملتان شہر کے سروے کے بعد بیمار ہو گئی جس کی وجہ سے ہمارے سارے پلان دو ہفتے تاخیر کا شکار ہو گئے۔ اب ہم اپنے سارے میڈکل ٹیسٹ کروانے کے بعد دوبارہ ملتان جانے کا سوچ رہے ہیں، اور یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ جب ہماری ٹیم ملتان جائے تو اپنے بچاؤ کا مکمل انتظام کر کے ہی جائے۔

اس پیپر کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ملتان والو اپنی فکر کرو، اُٹھو اور اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت کرو، ملتان کے لوگ تو بڑے ہی مہمان نواز ہیں، گویا کسی بھی شہر سے زیادہ مہمان نواز، مگر بھائیو آپ کے شہر کی ہوا مہمان نواز نہیں رہی، اس سے پہلے کہ مہمان آنا چھوڑ دیں یا پھر آپ کے اپنے لوگ کہیں اور منتقل ہو جائیں، اپنے شہر کی خاطر خواہ صفائی اور اپنے بنیادی حقوق کے لیے لڑیں۔ تاکہ جو آپ نے ساری زندگی برداشت کیا ہے آپ کے بچوں کو وہ سب برداشت نہ کرنا پڑے۔ جب آپ یہ کر لیں گے تو پھر ہی ہم کہہ سکیں گے "ملتان ایک صاف ستھرا شہر" وقتی صورتِ حال تو پوچھیں بھی مت۔

عید آئی اور چلی گئی

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہر سال کہ طرح عید آتی ہے اور چلی جاتی ہے، کچھ لوگ عید کی خوشیوں کو پوری طرح سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ عید کی آدھی خوشیاں سمیٹ پاتے ہیں اور کچھ لوگوں کے حصے میں تھوڑی ہی خوشیاں آتی ہیں اور کچھ لوگوں کے نصیب میں بالکل بھی خوش ہونا نہیں ہوتا۔

زندگی بھی شاید عید کی طرح ہی ہے، دیکھیں تو خوشیوں اور رنگوں سے بھرپور اور اگر دوسری طرف دیکھیں تو غموں اور تکلیفوں سے چور جگہ جگہ سے زخمی اور بے حال۔

نہ ہی زندگی پھولوں کا بستر ہے اور نہ ہی کانٹوں کی سیج، موسموں کی طرح زندگی بھی بدلتی رہتی ہے اور اپنے سارے رنگ دیکھاتی جاتی ہے۔

اب فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ ہم روتے زیادہ ہیں یا مسکراتے زیادہ ہیں۔

ہمارے رونے کا مسکرانے سے زندگی نے رکنا ہے نہ ہی زندگی رکی ہے۔ زندگی اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔

جیسے ہمارے پاس رونے اور رولانے کے ہزار بہانے ہیں، اسی طرح ہمارے پاس ہنسنے اور ہنسانے کے بھی ہزار بہانے ہیں۔

اب ہم پر منحصر ہے کہ ہم زندگی کا زیادہ حصہ عید کی طرح خوش ہو کر غموں اور تکلیفوں کو سہتے ہوئے اپنے آپ کو خوشگوار موڈ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر دوسرا رستہ اختیار کرتے ہیں۔

دوسرا راستہ یعنی خوشیوں اور رنگوں کی طرف دیکھے بغیر اپنے زخموں کو کریدتے ہوئے اور اپنی تکلیفوں کو بڑھا چڑھا پر پیش کرتے ہوئے اور برے حالات کا واویلا مچاتے ہوئے زندگی کو گزارتے ہیں۔

مسکرانے کے لیے پیسہ نہیں چاہیئے مسکراہٹ غریب کے چہرے پر بھی آ جاتی ہے۔اسی طرح مایوسی کی تفریق بھی امیری اور غریبی نہیں دیکھتی کئی امیر چہرے بھی مایوسی کا سیاہ رنگ پہنے رہتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ تم میں کامیاب شخص وہ ہے جو پر سکون ہے۔ پھر اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ وہ صبر اور شکر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

امید کرتا ہوں کہ آپ دوستوں کی عید خوشیاں سمیٹتے ہوئے گزری ہو گی یہ جانتے ہوئے کہ زندگی میں بہت سے غم ہیں آپ نے غم بانٹیں ہوں گے اور خوشیاں تقسیم کی ہوں گی

اللہ آپ کو مزید خوشیوں سے نوازے، آپ کو صبر اور ہمت دے اور آپ کی زندگی کو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے پر مسرت اور بامعانی بنائے۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہم سب کو صبر اور شکر کرنے والے میں شامل رکھے آمین۔

دہشت زدگی اور دہشت گردی

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہم لوگ دہشت گردی سے زیادہ دہشت زدگی کے مارے ہوئے ہیں، دہشت گردی تو ایک بار مارتی ہے دہشت زدگی ہیں ہر روز ہر لمحہ مارتی ہے۔ مزید یہ کہ دہشت زدہ لوگوں پر دہشت گردی بڑی آسانی سے اپنا کام کر جاتی ہے۔

کسی بھی قسم کی آزمائش یا مصیبت آ جائے تو ترقی یافتہ ملکوں میں چند لوگوں کی جانوں کا نقصان ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں ہزاروں لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی بنادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے لوگوں کے اندر مشکل حالت کا سامنا کرنے کی کپیسٹی ہی نہیں ہوتی۔

ہم اتنا بیماری سے نہیں ڈرتے جتنا ڈاکٹر کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں ہمیں پتا ہے کہ ڈاکٹر ہماری جہالت کا پورا فائیدہ اُٹھائے گا اور شائید ہمیں بیماری سے پہلے ہی مار دے۔ اسی طرح اگر ہمارا واسطہ پولیس سے پڑ جائے تو ہم اتنا چور سے نہیں ڈرتے جتنا پولیس سے ڈرتے ہیں، چور تو ایک دفعہ چوری کرتا ہے پولیس والے تو بار بار دھیاڑیاں لگاتے رہیں گے۔

ہم اتنا سماجی اور معاشی ناانصافیوں سے نہیں ڈرتے جتنا وکیلوں، عدالتوں اور ججوں سے ڈرتے ہیں کیوں کہ ہمیں پتہ ہے ایک دفعہ وکیلوں کے ہاتھ چڑھ گئے تو ساری زندگی کیس ہی ختم نہیں ہونا۔

آج بھی جب ہمارے ذہن میں ٹیچر کا تصور آتا ہے تو ہاتھوں پہ ڈنڈوں کا نقشہ بن جاتا ہے اتنا ہم جہالت سے نہیں ڈرتے جتنا ہم استادوں کی مار سے ڈرتے ہیں۔ ہماری عزتِ نفس کا جنازہ سکول سے ہی نکال دیا جاتا ہے۔

ہم بجلی اور فون کے ناجائز بل بھی بھرتے جاتے ہیں اور کبھی اُف تک نہیں کرتے کیوں کہ ہمیں پتہ ہے کہ اگر محکمے میں چلے گئے تو پھر نہ فون چلے گا نہ بجلی کا میٹر چلے گا۔

آج بھی ہمیں راستے میں کہیں سیکورٹی افسر کھڑے ہوئے نظر آ جائیں تو ہم راستہ بدل لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے منہ نہ ہی لگنا پڑے۔

دین کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اتنا ہم اللہ سے نہیں ڈرتے جتنے ہم مولویوں سے ڈرتے ہیں، یہاں تک کہ ان سے سوال جواب سے بھی کتراتے ہیں کہ کہیں فتویٰ ہی نہ لگا دیں۔

گھر میں شوہر بیوی سے ڈرتا ہے، بیوی شوہر سے ڈرتی ہے، والدین بچوں سے ڈرتے ہیں اور بچے والدین سے ڈرتے ہیں اور خاندان معاشرے سے ڈرتا ہے اور معاشرا رسم و رواج سے ڈرتا ہے۔

جب ہم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ہر مصیبت ہمیں روندتی چلی جاتی ہے۔ یہاں کمزور کا مقابلہ طاقت ور سے ہو جائے تو فیصلہ ہو گیا کمزور نے ہارنا ہی ہے چاہے وہ حق پر ہو اور باطل نے جیتنا ہے چاہے وہ حق پر نا بھی ہو۔

ترقی یافتہ قوموں کے احوال ایسے نہیں ہوتے، بچوں کو سیکھایا جاتا ہے کہ اگر آگ لگ جائے تو کیا کرنا ہے، سیلاب آ جائے تو کیا کرنا ہے، روڈ کیسے کراس کرنا ہے، پولیس یا سیکورٹی اداروں سے کیسے بات کرنی ہے، کوئی مشکوک حرکت نظر آئے تو اسے جاننا کیسے ہے اور متعلقہ ادارے کو اطلاع کیسے دینی ہے، چھوٹی چھوٹی باتیں سکول لیول پر سمجھا دی جاتی ہے تاکہ مشکل حالات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

ہمارے ہاں جب تیل کا ٹرک دھماکے سے اُڑ جاتا ہے اور درجنوں لوگ مر جاتے ہیں تو ہم اس مصیبت سے نمٹنے کی بات کرتے ہیں جب سکول میں بچوں کو شہید کر دیا جائے یا مارکیٹ میں یا کسی پبلک پلیس پر بم پھٹ جائے تو ہم سکولوں اور دفتروں میں اس کے تربیتی کورسس شروع کر دیتے ہیں یا کیمرے لگانا شروع کر دیتے ہیں، جیسے کہ دہشت گرا اگلی دفعہ بھی یہی کرنے والا ہے۔ یا پھر شائید اگلی دفعہ بھی سیلاب یہیں سے گزرے گا اور زلزلہ بھی وہیں آئے گا جہاں پہلے آیا ہے۔

یہ سب بنیادی چیزیں ہیں اور ہماری تعلیم کا پہلے سے حصہ ہونا چاہیں جیسے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ ابھی تک ہمارے لوگوں کو روڈز پر چلنا نہیں آیا اور کئی اموات روڈ پر غلط سمت میں چلنے سے ہو جاتی ہیں ڈرائیونگ کا تو پوچھیں مت اور روڈ سگنلز کی بات تو صرف بڑے شہروں تک ہے چھوٹے شہروں میں تو مجھے سگنلز ہی نظر نہیں آئے۔

کئی سالوں سے ہم لوگ دہشت گردی سے لڑنے میں لگے ہوئے ہیں مگر ابھی تک ہم نے اپنے اداروں کو فول پروف نہیں کیا اپنے عوام کی تربیت نہیں کی، ہمارے ہاں وسائل کی کمی نہیں ہے مگر ہمیں وسائل کا صحیح جگہ استعمال کرنا ہی نہیں آیا۔ ہم اداروں کا بنیادی سٹرکچر ہی قائم نہیں کر سکے۔

اساتذہ، پولیس اور ججز کی تنخواہوں اور مراعات کے ساتھ ساتھ ان اداروں کے بجٹ میں بھی زمین اور آسمان کا فرق پڑ گیا ہے مگر ان لوگوں کی ذہنیت آج بھی جوں کی توں ہے۔ عوام کا ان پر بھروسہ آج بھی ویسا ہی ہے جو خوف کی فضا پہلے تھی آج بھی وہی ہے۔ کچھ تو فرق پڑنا چاہیے تھا۔ سمت کا تعین ہی ہو جاتا۔

لاہور میں ماڈل ٹاون کا واقعہ رونما ہوتا ہے، یا پھر نواز شریف کی نااہلی ہوتی ہے یا پھر مشرف کیس، فوج سیاست دانوں سے لڑ رہی ہے، سیاست دان عدالتوں سے لڑ رہے ہیں، اور پولیس اپنی جگہ پر کٹھ پتلی کا کام ادا کر رہی ہے۔ عدالتوں کے فیصلے ہوا میں اُڑا دیے جائیں گے اور پھر سے ایک مچھلی منڈی لگ جائے گی۔ عوام کو پھر سے ایک مشغلہ مل جائے گا، میڈیا اپنا گھناؤنا کردار ادا کرتا رہے گا اور ہم سب مل کر یہ ثابت کرتے ہیں گے کہ ہم ایک جاہل قوم ہیں جس نے ابھی تک اپنی سمت کا تعین نہیں کیا۔

ہر محکمے کا اپنا ایک مرکزی سیل بھی ہوتا ہے جو یہ تعین کرتا ہے کہ اگر اس محکمے کا کوئی فرد یا گروہ غلط کام میں ملوث ہے تو اس کا احاطہ کیا جائے اور اسے اپنے انجام تک پہنچایا جائے۔ مگر ہمارے ہاں جب کوئی فوجی ڈکٹیٹر پھنستا ہے تو پیٹی بھائی اسے بچا لیتے ہیں، جب کوئی سیاست دان پھنستا ہے تو سارے سیاست دان اکھٹے ہو جاتے ہیں، جب کوئی پولیس والا پھنستا ہے تو سارے پولیس والے اکھٹے ہو جاتے ہیں، جب کوئی جج پھنستا ہے تو جج اکھٹے ہو جاتے ہیں اور جب کوئی ڈاکٹر پھنستا ہے تو سارے ڈاکٹر اکھٹے ہو جاتے ہیں کہ اپنے کرپٹ بھائی کو بچایا جائے۔ مذہبی دیوتا بھی یہی کرتے ہیں۔ یہی کام جرنلسٹ بھی کرتے ہیں، یعنی ہر محکمے کو اپنا گند عزیز ہے چاہے اس سے ملک کی عزت تار تار ہوتی رہے۔ سیلف اکاؤنٹ ایبلیٹی کسی بھی محکمے کے لیے ستون کا کام کرتی ہے اور ہم نے ابھی تک اپنے ستون ہی سیدھے کھڑے نہیں کئے۔

اب یہ منظر کشی دیکھئے اور پھر دیکھئے اس قوم کا احوال جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے خواہ وہ دہشت گردی ہو، خواہ سیلاب ہو، خواہ زلزلے ہوں، خواہ کرپشن ہو یا کوئی بھی اور صورتِ حال۔ ہم لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں، بزدلانہ حملے، بہادر قوم اور پتا نہیں کیا کیا بڑی بڑی باتیں وہی جو غریب اور جاہل قوم کے حصے میں آتی ہیں۔ جب تک ہم اپنی پرابلم کو پرابلم ہی نہیں سمجھیں گے کون بیٹھے گا ہماری پرابلم کو حل کرنے کے لیے، ہم جیسے تھے، ویسے ہیں اور ویسے ہی رہیں گے، اگر ہم نے وہی کیا جو ہم کرتے آئے ہیں۔ ہمارا آج اگر ہمارے کل سے بہتر نہیں تو ہمارا کل ہمارے آج سے بہتر کیسے ہو سکتا ہے۔

غیر منطقی سوچ کے حامل افراد

People With Logical Disorders

تحریر: میاں وقار الاسلام

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی سوچ انتہائی غیر منطقی ہوتی ہے۔ اول تو وہ کچھ کرتے ہی نہیں اور اگر کچھ کرتے ہیں تو انہیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیوں کر رہے ہیں۔ ان کی تمام مسافتیں منزلوں کے تعین سے پاک ہوتی ہیں۔ یہ سب سے لمبی بحث کرتے ہیں اور ان کی کوئی بھی بحث کیسی بھی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔

1۔ سکول میں داخلے کے لیے جاتے ہیں تو ضروری کاغذات گھر بھول جاتے ہیں۔ سکول جاتے ہیں تو بستہ گھر بھول جاتے ہیں۔ بستہ لے بھی جائیں تو جب کاپی نکالتے ہیں تو پن گھر ہوتا ہے۔

2 ۔ یہ مارکیٹ شاپنگ کے لیے جاتے ہیں تو بٹوا گھر بھول جاتے ہیں۔ بٹوا لے بھی جائیں تو شاپنگ کے بعد دکان دار کو پیسے دیئے بغیر بحث کرتے رہتے ہیں کہ پیسے دیے تو تھے، گھر آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے بٹوے میں پیسے زیادہ ہیں اور دکان دار ٹھیک کہ رہا تھا۔

3 ۔ یہ گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر گھر آ جاتے ہیں اور گھر والوں سے کہتے ہیں میں تو پیدل گیا تھا، گاڑی تو گھر پہ تھی۔ ان کی جیب سے جب پارکنگ کی سلپ نکلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اوہ گاڑی تو پارکنگ میں رہ گئی۔ اگر یہ گاڑی گھر پر لے بھی آئیں تو گاڑی کی چابی ان کی جیب میں رہ جاتی ہے اور سارا گھر چھان مارتے ہیں کہ چابی نہیں مل رہی، گھر کے سارے افراد سے بحث کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چابی تو ابھی تک جیب میں ہے۔

4 ۔ کھانا یہ سوچ کر کھانا بھول جاتے ہیں کہ شاید کھا لیا ہے۔ اور کھا لیں تو یہ پتا نہیں ہوتا کھایا کیا تھا۔ اور کھانا باہر سے لانا پڑے تو اول تو جاتے ہی نہیں، اگر بہت زور ڈالنے پر چلے بھی جائیں تو روٹیاں لے آتے ہیں سالن بھول جاتے ہیں اور سالن لے آتے ہیں تو روٹیاں بھول آتے ہیں اور اگر سالن اور روٹیاں دونوں لے آئیں کچن میں رکھ کر بھول جاتے ہیں کہ کھانا لایا بھی ہوں یا نہیں۔

5۔ یہ دوستوں کو ٹائم دے کر بھول جاتے ہیں کہ کہیں جانا بھی تھا، اور کوئی انہیں ٹائم دے تو یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی نے آنا بھی تھا۔ اور اگر کوئی انہیں لکھ کر بھیج دے یعنی شادی کارڈ یا کسی بھی فنکشن کا کارڈ تو کارڈ رکھ کر بھول جاتے ہیں، اور پھر اعتراض کرتے نہیں تھکتے کہ ان کو کسی نے بلایا ہی نہیں۔ کئی دن بعد کارڈ نظر سے گزرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا اعتراض غلط تھا کارڈ تو پڑے پڑے اپنی مدت گزار گیا۔

6۔ امتحان میں جاتے ہیں تو اُس مضمون کی تیاری کر کے جاتے ہیں جس کا پرچہ اس دن ہوتا ہی نہیں۔ اگر یہ امتحان میں فیل ہو جائیں تو کسی اور کا نتیجہ دیکھ کر کئی دن تک خوش رہتے ہیں کہ فیل تو کوئی اور تھا، اور جو پاس تھا وہ میں ہوں۔ پھر استاد کو اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ وہی فیل ہے اور پھر سے تیاری کرے۔

7۔ یہ لوگ انتہائی سیلف میڈیکیشن کرتے ہیں، پیٹ کی دوائی یہ سمجھ کر کھاتے رہتے ہیں کہ سر درد کی ہے اور سر درد کی دوائی یہ سمجھ کر کھاتے رہتے ہیں کہ پیٹ کی ہے۔ اور جب ٹھیک نہیں ہوتے تو کہتے ہیں آج کل دوائیاں 2 نمبر آ رہی ہیں۔ یا پھر یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر 2 نمبر آ رہے ہیں۔

8۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے فالو کریں، پھر ان کو خود پتا نہیں ہوتا کہ فالو کسے کرنا ہے۔ پھر یہ راستے میں گم ہو جاتے ہیں اور ساتھ والے سے پوچھتے ہیں کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔

9۔ جب ان کی منگنی ہوتی ہے (اگر ہوتی ہے تو) تو انگوٹھی یا تو لیتے نہیں، اور اگر لے بھی لیں تو کہیں بھول آتے ہیں۔ اور انگوٹھی لے بھی آئیں تو تقریب کا مقام بھول جاتے ہیں، تقریب کے مقام پر پہنچ بھی جائیں تو مقررہ وقت بھول جاتے ہیں۔ اتفاق سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے تو یہ بھول جاتے ہیں کہ منگنی چھوٹی والی سے ہوئی تھی یا بڑی والی سے۔

10۔ ان کے ساتھ جب کوئی بھی گیم کھیلی جاتی ہے تو اپنا سکور مرضی سے بڑھا دیتے ہیں اور دوسرے کا سکور مرضی سے کم کر دیتے ہیں۔ اپنے سے بڑا پلیئر کسی کو نہیں مانتے، اسی لیے کبھی نہیں ہارتے، کیوں کہ مانے گے تو ہاریں گے۔ اور ہار ثابت ہو جائے تو کہتے ہیں یہ تو کھلی دھاندلی ہے ضرور سکورز میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہو گی۔ اور اگر سب مل کر بھی سمجھائیں کہ صاحب آپ ہار چکے ہیں، تو کہتے ہیں یہ سارے ملے ہوئے ہیں اور سب نے مل کر دھاندلی کی ہے۔

یہ اہم چیزوں کو کم ہی اہمیت دیتے ہیں۔ اور غیر ضروری چیزوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بڑی سے بڑی پریشانی بھی ان کی 11 پریشانی کی وجہ نہیں بنتی، اور جب یہ پریشان ہوتے ہیں ایسی چیز پر بھی پریشان ہو جاتے ہیں جس میں پریشان ہونے والی کوئی بات سرے سے ہوتی ہی نہیں ہے۔

۔ مشکل سے مشکل کام کے لیے بھی ہاں کر دیتے ہیں، ٹائم فریم پوچھا جائے تو وہ بھی 10 سے 15 منٹ، وہ بھی زیادہ سے زیادہ۔ اور پھر 125 منٹ میں ہی بھول جاتے ہیں کہ انہیں کوئی کام کہا بھی گیا تھا یا نہیں۔ انہیں بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ 10 یا 15 منٹ والا کام کر دیں، اور پھر وہ بار بار وعدہ کرکے بھی 5 منٹ میں بھول جاتے ہیں کہ کام کیا تھا۔

۔ یہ ایم بی بی ایس کر لیں تو مارکیٹنگ کی جاب ڈھونڈتے رہتے ہیں، ایل ایل بی کر لیں تو الیکٹرانکس کی شاپ کھول لیتے ہیں، ایم بی اے کر 13 لیں تو کسی سکول میں ٹیچنگ شروع کر دیتے ہیں، ہر ڈگری ان کے لیے مس فٹ ہوتی ہے اور یہ ہر ڈگری کے لیے مس فٹ ہوتے ہیں، اور پھر سسٹم کو کوستے رہتے ہیں کہ ان کے مطابق کیوں نہیں چلتا۔ ان کو دنیا صرف ایک ہی طرح سے سیدھی نظر آ سکتی ہے کہ انہیں کسی درخت پر الٹا لٹکا دیا جائے۔

۔ ہمیشہ متنازعہ کتابیں پڑھتے ہیں جن سے فضول بحث شروع ہو جائے اگر کوئی ان کی اصلاح کرنا چاہے تو پھر یہ ان سے کبھی صلح ہی نہیں 14 کرتے۔ اگر یہ کسی بات پہ پھنس جائیں تو دنیا میں ابھی تک کوئی ایسی کرین نہیں بنی جو انہیں اس سے باہر نکال سکے۔ تصویر کا ہمیشہ ایک ہی پہلو دیکھتے ہیں اور دوسرے پہلو کی بات کی جائے تو لڑنے مرنے پہ آ جاتے ہیں۔

۔ انتہائی بے عزتی پروف ہوتے ہیں، جن باتوں پر ان کی ہمیشہ بے عزتی ہوتی ہے وہی باتیں بار بار کرتے ہیں اور لگاتار کرتے ہیں۔ بلاوجہ 15 اور بلامقام بولتے ہیں۔ صحیح بات کو بھی اتنا گھما گھما کر پیش کرتے ہیں کہ اس کا کوئی بھی لفظ صحیح نہ رہے۔ اگر انہیں کوئی نہ سننے کی گستاخی کر لے تو اس سے ناراض رہتے ہیں کہ ان کا پوائنٹ آف ویو کیوں نہیں لیا گیا۔

۔ ان کے سیلف ڈسپلن کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ ان کے گھر، بیڈ رومز، باتھ روم، آفس، میٹنگ رومز یہاں تک کہ کار پارکنگ سب ہی 16 دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیڈ روم میں اپنی چیزیں رکھ کے بھول جاتے ہیں اور بیگم بچاتی کی شامت آئی رہیئے ہے۔ باتھ رومز میں پانی چھوڑ کر آ جاتے ہیں۔ لائٹس آن رکھ کر بھول جانا تو معمومی بات ہے۔ آفس میں کمپیوٹر کبھی آف کرکے نہیں آتے، ٹیبل پہ کچھ ترتیب سے نہیں ہوتا ترتیب دے دیں تو بھول جاتے ہیں کون سی فائل کہاں تھی، میٹنگ روم سے نکلیں تو چیئر کہاں، ٹیبل کہاں، بورڈ کہاں، فلائر کہاں اور وائر جگہ

جگہ عجیب ڈھنگ سے گویا میٹنگ روم کی حالت چیخ چیخ کر بتا رہی ہوتی ہے کہ یہ ستم کسی عام انسان کے نہیں۔ کار ایسے پارک کرتے ہیں کہ بیس لوگوں کی کاریں پھنس جائیں۔ اور کسی گھر کے باہر پارک کریں تو محلّہ اکھٹا ہو جاتا کہ سر رستہ بلاک ہو گیا ہے گاڑی ہٹائیں۔

17 ۔ یہ اکثر لڑکیوں کے نام سے فیک اکاونٹس بنا لیتے ہیں اور پھر دونوں طرح کی زندگیاں یعنی لڑکے والی اور لڑکیوں والی اینجوائے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان سے جب پوچھا جاتا ہے کہ آج کیا کیا تو کہتے ہیں میں صبح صبح سکول گیا تھا اور ابھی سیدھی گھر واپس آ رہی ہوں۔ پہلے کپڑے تبدیل کروں گا پھر کھانا کھاوں گی۔ پھر میں نیٹ استعمال کروں گا اور ہم سہیلیاں فیس بک پر لمبی لمبی باتیں کریں گی۔ پھر یہ اپنے ورچیول بریک اپ پر پریشان رہتی ہیں۔

18 ۔ جب ان سے پیار سے بات کی جائے تو کہتے ہیں آپ غصہ کیوں کر رہے ہیں۔ جب غصے سے بات کریں تو ہنس پڑتے ہیں گویا ان سے مذاق کیا جا رہا ہو۔ اگر ان سے کوئی راز کی بات شئیر کی جائے تو سارے شہر کو یہ کہ کر بتا رہے ہوتے ہیں کہ کسی کو ہرگز مت بتانا۔ انہیں گول کمرے میں کونہ ٹھونڈھ کر بیٹھنے کو کہ دیا جائے تو ساری رات لگے رہیں گے اور اگلے دن پوچھیں گے کیا آپ واقعی سیریز تھے۔

19 ۔ یہ اپنی تنخواہ خواہ مخواہ 4 گناہ زیادہ بتاتے ہیں اوان سے کوئی اپنی تنخواہ کا ذکر کرے تو کہتے ہیں پھینک رہا ہے اس کی تنخواہ 4 گناہ کم ہو گی۔ احمقوں کی جنت میں رہتے ساری دنیا کو بے وقوف سمجھتے ہیں، اور ان کی نظر میں ان سے ذہین اور کوئی نہیں ہوتا۔ سب سے تیز گاڑی چلاتے ہیں اور ہمیشہ جلدی میں ہوتے ہیں اور ہر جگہ جاتے ہی سو جاتے ہیں۔ ان کی آنیاں جانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کام کو ہاتھ لگاتے ان کی جان جاتی ہے۔

20 ۔ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے اپنی ساری خامیوں کا بوجھ اپنے سے جونیئر پر ڈال دیتے ہیں، پہلے تو ان کا جونیئر بیچارہ کوئی کام کر نہیں سکتا اور اگر کچھ کر لے تو فورا اسے اپنے نام کے ساتھ چپکا لیتے ہیں۔ جیسے یہ خود ڈمپ ہوتے ہیں ویسے ہی اپنے جونئیر کو ڈمپ کر دیتے ہیں۔ کسی ٹیم کو لیڈ کرتے ہیں تو اس کا سارا مورال تباہ کر دیتے ہیں اور جب سالوں تک لاکھ کوششیں کر کے بھی ٹیم پرفارم نہیں کرتی تو کہتے ہیں ملک میں سرے سے ٹیلنٹ ہی نہیں ہے۔

21 ۔ بچپن سے ہی ماں باپ ان کی ٹھکائی کرتے چلے آتے ہیں تاکہ ان کا بچا ٹھیک ہو جائے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو کوئی ذہنی روگ ہے۔ اساتذہ سے بھی بڑی مار پڑتی ہے اور انہیں اساتذہ جلاد نظر آتے ہیں۔ کلاس میں دوسروں کی کاپیاں پھاڑ دیتے ہیں یا ان کی شرٹس پر سیاہی پھینک دیتے ہیں سو کلاس فیلوز سے بھی ان کی ٹھکائی واجب رہتی ہے۔ محلے میں کھیلتے ہوئے اکثر مار کھا کر ہی گھر آتے ہیں اور رشتہ داروں میں جاتے ہیں تو کزنوں سے مار کھا کر آ جاتے ہیں۔ گویا زندگی انہیں کندن بنا چکی ہوتی ہے۔ یہ عمر میں بڑے بھی ہو جائیں پھر بھی حرکتوں سے باز

نہیں آتے۔اور خبطی بزرگوں کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ جب کسی کو نصیحت کرتے ہیں تو سننے والوں کی ایک دم ہنسی نکل جاتی ہے۔ظاہر ہے انہوں نے سیکھا کیا ہوتا ہے جو سیکھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ان کے سارے کارنامے لطیفوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

چھوٹے میاں بڑے میاں

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہمارے ہاں ایک کلچر پایا جاتا چھوٹے میں خود کو بڑے میاں سمجھتے ہیں اور بڑے میاں اپنے بڑے ہونے کا ثبوت نہیں دیتے۔ پھر ہوتا یوں کہ نہ چھوٹے کی عزت بچتی اور نہ بڑوں کا بھرم بچتا دونوں ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ایک مچھلی منڈی کا ساماں بندھ جاتا ہے۔ وکیل کا سب سے بڑا دشمن وکیل، استاد کا سب سے بڑا دشمن استاد، جج کا سب سے بڑا دشمن جج، سیاست دان کا سب سے بڑا دشمن سیاست دان، شاعر کا سب سے بڑا دشمن شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا دشمن خود ادیب، ڈاکٹر کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر اور جرنلیسٹ کا سب سے بڑا دشمن جرنلیسٹ۔

یہ اگر کہیں اپنی کوئی یونین یا گروپ بھی بناتے ہیں تو بڑے میاں ایک طرف اور چھوٹے میاں ایک طرف اور دونوں طبقے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے نظر آتے ہیں اور لوگوں کو یہ نظر آتا ہے کہ آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے۔ ان سب میں ایک بات یکساں پائی جاتی ہے کہ ایک تو سسٹم ٹھیک نہیں اور دوسرا کہ گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ کبھی کسی طبقے کا کسی بھی بات پر تسلی کا جواب موصول نہیں ہوتا۔

ہماری تربیت سکولوں سے کی جاتی ہے جہاں سینئر طلبہ نئے آنے والوں کا بے عزتی سے بھرپور ویلکم کرتے ہیں، مختلف ملازمتوں میں نئے ملازموں سے ہتک آمیز کام لیئے جاتے ہیں جس سے ان کی عزت نفس مر جائے اور پرانے ملازموں کی تسکین پوری ہو جائے کیوں کہ جب یہ میدان میں آئے تھے تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس کلچر کو ختم کرنے کے لیئے ریگولیشن کی ضرورت ہوتی ہے جس سے سیلف ریسپیکٹ کو پروٹیکٹ کیا جاتا اور ہتک آمیز رویوں کو کرائم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ کچھ ملکوں میں اوے کہنا یا انگلی سے اشارہ کرنے کی بھی باقاعدہ سزا ہے۔ ہمارے بزرگوں سے ہمیں کچھ مثالیں ملتی ہیں کہ بچے ماں باپ کے برابر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ نیچے یا پاؤں کی طرف بیٹھتے تھے لڑکوں کی نظریں نیچی ہوتی تھیں اور لڑکیوں میں بغیر دوپٹے کے سامنے آنے کا رواج نہیں۔ اساتذہ کی عزت بھی بڑے بزرگوں کی طرح کی جاتی تھی۔ پھر کیا ہوا بڑے میاں اور چھوٹے میاں سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے اچھی ہو۔ مگر ہم اپنے آپ کو اونچا ثابت کرنے کے لیئے دوسرے کو نیچا دیکھانا فرض سمجھتے سو سب کی عزت جاتی رہتی ہیں۔

ہمارے لیئے ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ جب بیٹھے ہوتے تھے یا پیدل یا سوار آ رہے ہوتے تھے تو فرق محسوس نہیں ہوتا تھا کہ مالک کون نوکر کون۔ مقام دل میں اتنا کہ ایک دوسرے پہ جان چھڑکی جائے۔ پیٹھ پیچھے بھی کسی کی بے عزتی کرنے کی مثال نہیں مگر اب تو منہ پر بے عزتی کر دی جائے تو سر فخر سے تن جاتا ہے کہ بازی مار لی گئی۔

بڑے میاں اور چھوٹے میاں جب تک آپس میں ایک دوسرے کی حرمت کا تعین نہیں کریں گے رسوائی پوری جماعت پر ہر طرف سے حملے کرتی رہے گی۔ عزت کروانے کے لیے عزت دینی پڑتی ہے اور بڑوں کے عزت کیے بغیر جو مقام ملتے ہیں وہ بھی کھوکھلے ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں ایک دوسرے کی عزت کرنے اور ایک دوسرے کا بھرم قائم رکھنے کی توفیق دے آمین۔

جرم اور جرمانے

تحریر: میاں وقار الاسلام

جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں، کاش ملاوٹ کرنے والے جانتے کہ اسلام میں ان پر کس قدر لعنت کی گئی ہے، یہاں تک کہ انہیں اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ ملاوٹ کرنے والوں کے مکروہ چہرے اخبار میں چھپنے چاہیں تاکہ لوگ انہیں پہچانیں اور یہ عبرت پکڑیں، مگر پولیس چوروں کے ساتھ ملی ہو تو کیا کریں۔

جب تک ملاوٹ کرنے والے کو جان کے لالے نہیں پڑتے کوئی مائی کا لال انہیں ملاوٹ کرنے سے نہیں روک سکتا یہ بڑے ہی بے حس لوگ ہیں۔ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا ہے اور ملاوٹ کا جرم چوری کے جرم سے بڑا ہے۔

ادویات میں ملاوٹ سے خدا جانے کتنے لوگوں کی اموات ہو جاتی ہیں مگر انے کے مافیاز جرمانہ دے کر چھوٹ جاتے ہیں ان کی کمپنیاں سیل بھی کر دی جائیں تو ان کی درجنوں جعلی کمپنیاں ہوتی ہیں۔

ملاوٹ کی کمائی اول درجے کی حرام کی کمائی ہے یہ سور کھانے سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ ملاوٹ کرنے والوں پر جتنا ہاتھ ڈالا جاتا ہے ملاوٹ اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہیں تو خرابی ہے۔ ملاوٹ کے قانون میں بھی ملاوٹ نظر آتی ہے۔

ملاوٹ صرف ایک جرم نہیں جو ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے ہے دن بدن نشو نما پاتا چلا جا رہے۔ معاشرے میں کوئی جرم تب تک اپنے قدم مضبوط نہیں کر پاتا جب اسے خاطر خواہ ماحول فراہم نہ کیا جائے۔

ہمارے ہاں ایک طرف جرم ہے اور دوسری طرف جرمانے جو اس جرم کو روکنے کے لیے لگائے جاتے ہیں، اگر جرم کے مقابلے میں جرمانے معمولی حیثیت کے ہوں تو۔ اور اگر جرم کا راستہ روکنے والے راستوں میں بے شمار چور راستے ہوں تو کیا کوئی بھی جرم کبھی رک پائے گا۔ اور اگر مجرموں کو ہی جرائم روکنے کی مکمل ٹھیکداری مل جاتی ہو تو، پھر ہر طرح کی پیداوار کم ہو سکتی ہے جرائم کی پیداوار کبھی کم نہیں ہو گی۔

ایسے جرم اور ایسے جرمانے ہمارا مزاق اُڑاتے ہیں، جنہیں ہر روز موضوع بحث تو لایا جاتا ہے، پکڑم پکڑائی کے نام پر ڈرامے بازی بھی کی جاتی ہے لکھا بھی بہت جاتا ہے اور کاروائیاں بھی بہت کی جاتی ہیں مگر مرض ایسا ہے کے بڑھتا ہی جاتا ہے جوں جوں دوا کیا جاتی ہے۔

معاشرتی بیماریوں کی ایک دلدل ہے جس میں عوام بری طرح پھنسی ہوئی ہے، نہیں نہیں، پھنسی ہوئی نہیں ہے بلکہ پھنسائی ہوئی ہے اور جنہوں نے عوام کو خود اس میں پھنسایا ہوا ہے وہ کیوں چاہیں گے کہ عوام اس دلدل سے نکلے کیوں کہ یہی دلدل تو ان کا اصل بزنس ہے عوام پھنسے گی نہیں تو یہ کمائیں گے کیسے۔

کھوکھلے دعوے سنتے سنتے عوام کے کان پک گئے ہیں، ہر نیا آنے والا ایک نئی فلم کا ٹریلر دے جاتا ہے، مگر جب فلم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو انجام پہلے سے بھی برا ہوتا ہے۔

ایک پلڑا ظلم کرنے والا ہے وہ ظلم ہی کرتا جا رہے ہے، ایک پلڑا ظلم سہنے والا ہے وہ ظلم سہتا ہی جا رہا ہے اللہ ہی رحم کرے لگتا نہیں کے دونوں پلڑوں میں سے کوئی بھی اپنے اوپر رحم کرنا چاہتا ہے۔

ٹماٹر کسانوں کی ہنسی اُڑاتا ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

ذخیرہ اندوزی اور دلالی نے ٹماٹر کو سبزیوں کا بادشاہ بنا دیا ہے۔ ذخیرہ اندوز اور سبزیوں کے دلال کسانوں کے براہ راست معاشی قاتل ہیں۔

بوریاں بھر بھر کر سبزیاں کھیتوں سے اُٹھائی جاتی ہیں اور پھر شاہی تشتروں میں بیکتی ہیں۔ مٹی کے مول حاصل کی جانے والی سبزیاں بلیک مارکیٹ سے گزر کر سونے کے بھاؤ بکتی ہیں۔

سبزیاں اُگانے والا اور سبزیاں کھانے والا دونوں پر ایک بہت بڑا مافیہ غالب ہے جو دونوں کا خون چوس رہا ہے۔

ذخیرہ اندوزی اسلام میں حرام ہے یہ کسی کا ناحق مال کھانے کے مترادف ہے ایسے لوگ اپنے پیٹ میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھرتے۔

ذخیرہ اندوزی کرکے حرام کھانے سے بہتر ہے کھوتا ہی کھالو، کیا ایسا معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلائے گا جہاں ہر سطح پر ظلم پر ظلم چھایا ہوا ہے۔

ہر شعبہ بے لگام ہے اور ایک گھوڑے کی طرح لاتیں مار رہا ہے جسے کبھی سدھایا ہی نہیں گیا ایسے بے لگام گھوڑوں کے لیے استبل کھولے جائیں۔

ترسیل کی ضرورت سے زیادہ قیمت بڑھنے کی غرض سے مال رکھنے والوں کو اُٹھا کر کسی گودام میں بند کر دینا چاہیے

معاشرتی بیماریوں کو نظرانداز کرنے سے بیماری لاعلاج ہو جاتی ہے جہاں سرجری کی ضرورت ہو سرجری کریں جہاں گولی کی ضرورت ہو گولی ماریں۔

جہالت خود بخود پھیلتی ہے شعور کے لیے تبلیغ کرنی پڑتی ہے، جہاد اسی لیئے فرض ہے کہ ہر طرح کی برائی سے ٹکرا جائے اور اس کا صفایا کر دے اپنے حصے کی آواز ضرور اٹھائیں اس سے پہلے کہ جہالت کا شعور آپ کی آواز کو دبا دے

اگر سارا حساب کتاب دنیا میں ہی ہوتا تو نماز کے ساتھ جوتے بھی جاہلوں کے لیے فرض کر دیئے جاتے
جیسے دنیا میں بستیوں کے احوال ہیں اگر عذاب کے سلسوں میں وقفہ نہ کیا جاتا تو جانے کتنی بستیاں تباہ ہو چکی ہوتیں۔

اللہ کے بندو اللہ کے حساب سے ڈرو ڈرو ایسے کام کرنے سے جن کی وجہ سے پچھلی قوموں پر عذاب نازل ہوئے۔

اللہ پوچھے گا میرے بندوں کو رزق کیوں نہیں دیا، بندہ کہے گا تو رازق میں کیسے رزق دیتا اللہ کہے گا میں نے وسائل دیئے تو قابض ہو گیا۔

کسی بھی طرح سے اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو روکنے والے ذخیرہ کرنے والے اور ناجائز مہنگا کرنے والے سب اللہ کے عذاب سے ڈریں۔

اسلام کی شکل میں ہمیں روشنی پر روشنی دی گئی مگر ہم نے اندھیروں پر اندھیرے منتخب کیے اسی لیئے رسوائی کو ہمارے پیچھے لگا دیا گیا۔

اللہ ہم پر رحم کرے اور ہمیں ہدایت دے اور ہمیں اپنی حالت درست کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین

دعا گو، میاں وقار الاسلام

چندے سے فرق پڑتا ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

مادر ٹریسا ہو یا عبدالستار ایدھی دور حاضر کے ہی چند نام ایسے ہیں جنہیں اللہ نے لوگوں کی خدمت کے لیئے شاید خالی ہاتھ گھر سے نکالا اور ان کے ہاتھ اتنے مضبوط کر دیئے کہ وہ ہزاروں خالی ہاتھوں کا وسیلہ بن گئے جس سے نہ صرف ضرورت مند لوگوں کے پیٹ بھرے بلکہ بہت سے لوگوں کی خالی زندگیاں بھی آباد ہو گئیں۔

اللہ نے انسان سے رزق کا وعدہ کیا ہے اور وہی سبب الاسباب ہے وہ ہمیں میں سے وسیلے پیدا کرتا ہے اور جسے سعادت پہنچانا چاہتا ہے اسے سعادت پہنچا دیتا ہے اور جسے رزق پہنچانا چاہتا ہے اسے رزق پہنچا دیتا ہے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کسی گھر میں ایک کوڑا اٹھانے والا آتا ہے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو ایک بچہ دروازے پر اسے دیکھتا ہے اور اپنی ماں سے کہتا کہ ماں کوڑے والا آیا ہے۔ تو اس کی ماں کہتی بیٹا کوڑے والا یہ نہیں بلکہ کوڑے والے ہم ہیں یہ تو صفائی والا ہے اس کی وجہ سے تو گھر صاف رہتا ہے۔

اسی طرح جب مانگنے والا آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھکاری ہے، محتاج ہے یہ ہم سے خرایت مانگنے آتا ہے تاکہ اس کا بھلا ہو جب کہ اللہ تعالی نے صدقہ خرایت کا ہمیں حکم دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سے مال پاک ہوتا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہماری کمائی میں مسافروں یتیموں، محتاجوں، ہمسائیوں اور تنگدستوں وغیرہ سب کا حق ہے۔ انہیں دے کر ہم ان پر کچھ احسان نہیں کرتا بلکہ اللہ کا ہم پر احسان ہوتا ہے کہ وہ ہم سے یہ خدمت لے لیتا ہے ورنہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالی اس خدمت کے لینے سے ہی معذور رکھتا ہے۔ پھر ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے پاس جو رزق آتا ہے اس کے پیچھے کس کا وسیلہ ہے۔

قران میں ایک ایسے شخص کی مثال دی جاتی ہے جس کا باغ تھا اور وہ یہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی محنت سے اسے ملا ہے اور اگر وہ مر کر دوبارہ زندہ بھی کیا گیا تو اسے یہ سب پھر سے ملے گا۔ ایک دن جب فصل کاٹنی تھی تو اس نے سوچا کیوں نہ صبح جلدی چلا جائے تاکہ کسی غریب کو کچھ نہ دینا پڑے تو اس نے یہی کیا جیسے ہی وہ اپنے باغ میں پہنچا تو اس کا باغ تباہ ہو چکا تھا تو وہ اپنی چھتریوں پر ناامید ہو کر اوندھا گر پڑا۔

ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگی اور پھر صحابہ کا دور سب ہماری وسیع تربیت کرتا ہے کہ صدقہ خرایت کی اہمیت کیا ہے۔ اس سنہرے دور کا یہ بھی خاصہ ہے کہ لوگ زکواتہ لے کر گھومتے تھے اور انہیں زکواتہ لینے والا نہیں ملتا تھا۔

عمران خان نے کرکٹ کی دنیا کو خیر باد کہنے کے بعد شوکت خانم کا آغاز کیا نیت نیک تھی تو اللہ نے ہاتھ مضبوط کر دیے تو انہوں نے شوکت خانم کو نہ صرف مکمل کیا بلکہ بہت اچھے طریقے سے چلا کر بھی دیکھایا بدلے میں اللہ نے بے پناہ عزت دی اور آج وہ پاکستان کے وزیر آعظم ہیں۔ سو اللہ جیسا چاہتا ہے ویسا کرتا ہے۔

خان صاحب پر بہت سے اعتراضات کیئے جاتے ہیں، اعتراضات کرنے والوں کا اپنا نقطہ نظر ہو سکتا ہے مگر خان صاحب نے اپنے سپوٹ کرنے والوں کو کچھ کر کے دیکھایا ہے تو ہی لوگوں کا ان پر بھروسہ بنا ہے اور اسی وجہ سے ان کی فنڈ ریزنگ بڑھتی جا رہی ہے۔ خان صاحب اگر لوگوں کے لیئے یہ فلاحی کام نہ کرتے تو شائید انہیں جو مقام آج حاصل ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوتا۔

تو چندے سے فرق تو پڑتا ہے۔

ایک چندہ محترم نواز شریف صاحب نے بھی مانگا تھا جس میں کشکول توڑنے کی بات کی گئی تھی بعد میں کیا ہوا اسے جانے دیتے ہیں اسی طرح ایک بینظر انکم سپورٹ فنڈ پی پی پی نے بھی قائم کیا اور ایک ایم کیو ایم کا بھی نیٹ ورک ہے۔ اسی طرح کچھ خدمت سیاسی مولانا بھی کرتے ہیں۔ تو مسئلہ چندہ لینے کا نہیں بلکہ اس کام کو نیک نیتی سے کرنے اور آگے بڑھانے کا بھی ہے۔ سو جس نے جس قدر بھی حصہ ڈالا، جس قدر بھی فلاح کے کام کیئے اسی قدر اللہ نے انہیں عوام سے جوڑ دیا اور انہیں اس کی خاطر خواہ پزیرائی بھی ملتی چلی آ رہی ہے۔

اسی طرح کا ایک فنڈ جناب چیف جسٹس صاحب نے بھی قائم کیا جس میں لوگوں نے پیسے جمع کروانا بھی شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ جس درجہ کی اس میں نیک نیتی ہو گی اسی قدر اللہ اس میں برکت بھی ڈال دے گا۔

سماجی حلقوں میں یہ موضوع کافی سر گرم ہیں کہ چندوں سے کچھ نہیں ہونا یہ بڑے منصوبے ہیں یہ اس طرح پورے نہیں ہوں گے وغیرہ وغیرہ، تو جس طرح پورے ہونے چاہئیں تھے اس طرح بھی تو آج تک پورے نہیں ہوئے وجہ یہ تھی کے اس کے پیچھے لگن اور خلوص کی کمی تھی ورنہ میٹرو چل سکتی تھی تو ڈیم بھی بن سکتے تھے۔

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے اگر پی ٹی آئی کی نیت ٹھیک رہی تو یہ ناہموار راستوں پر چل کر بھی منزل تک پہنچ جائیں گے اور اگر نیت صاف نہ ہوئی تو کارپٹ روڈ پر بھی سفر آگے نہیں بڑھے گا۔

ہمارے اندر منفی سوچ کس قدر زیادہ ہے، اس کے لیئے صرف ایک لفظ لکھ دیں جیسا کہ وکیل، جج، پولیس، ڈاکٹر، کسٹم، مولوی اور سیاست دان تو لوگ اپنی دکھ بھر داستانیں شئیر کرنے لگتے ہیں جو کہ زیادہ تر تلخ حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ ہم کبھی ایسا سوچتے ہی نہیں کہ یہ سارے لوگ اچھے بھی تو ہو سکتے ہیں۔ ایسا اس لیئے ہوتا ہے کہ ہم نے کبھی اچھا ہوتے دیکھا نہیں ہوتا اس لیئے ہماری رائے کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ مثبت آئے۔

میں ایک شارٹ سٹوری پڑھ رہا تھا جس میں ایک بچہ چند سیپیاں لے کر ایک شاپ پر جاتا ہے اور دوکان دار سے کہتا ہے کہ وہ اس کے بدلے اس کے بہن کے لیئے ایک چاکلیٹ دے دے۔ دوکان دار آدھی سیپیاں رکھ لیتا ہے اور باقی واپس کر دیتا ہے اور بدلے میں چاکلیٹ بھی دے دیتا ہے۔ دکاندار کا ملازم حیران ہوتا ہے اور بچے کے جانے کے بعد پوچھتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا سیپیوں کی تو کوئی قیمت اور وقعت نہیں۔ تو دکاندار جواب دیتا ہے کہ جب یہ بچہ بڑا ہوگا اور یہ سوچے گا کہ میں نے اس کے ساتھ اچھائی کی تو اس کا معاشرے میں اچھائی کے وجود پر یقین بڑھے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ کوشش کرے اور ایک اچھا انسان بنے۔

معاشرے ایسے بنتے ہیں اگر ہر شخص یہ سوچ کر بیٹھ جائے کہ یہ چندہ لینے والا بھی فراڈ اور یہ دوسرا اور تیسرا بھی فراڈ ہے تو کبھی کسی شخص کا بھلا ہی نہ ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جو لوگوں سے پیسے اکٹھے کر لیتے ہیں تو کیا یہ ہم کر لیتے ہیں ہر گز نہیں ہر شخص مدر ٹریسا نہیں بنتا نہ ہی ہر شخص عبدالستار ایدھی بن سکتا ہے اور نہ ہی عمران خان بن سکتا ہے بلکہ اللہ کی ہی طاقت ہے وہ جسے جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے اور جس سے جو کام لینا چاہتا ہے لے لیتا ہے۔

مولویوں کا نام سنتے بھی ہمارے ذہن میں جو پہلا تصور آتا ہے وہ مسجدوں سے جوتے چوری کا آتا ہے یا پھر حلوے یا تصور آتا ہے کیوں کہ یہ ہوتا ہے اور ہم نوٹس کرتے ہیں اور ہم بھولتے نہیں۔ مگر اس کا دوسرا رخ بھی تو ہے جس کے ساتھ ایک بہت بڑا مقصد بلکہ اس دنیا کا سب سے بڑا مقصد منسلک ہے وہ اسلام کی تعلیم و تبلیغ ہے ایسے لوگ بھی تو ہیں جنہوں نے ہماری زندگیاں بدل دیں بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا، حافظ اور عالم بھی بنایا اور دینی علم کی شمعیں روشن کیں اور کر رہے ہیں۔ اسی طرح اسے بہت سے مجاہدین ہیں جو باطل قوتوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں اور جام شہادت نوش کر رہے ہیں اور بہت سے مولوی جنہیں اچھا نہیں سمجھتے انہیں کی جمع شدہ مالی امداد سے مسلم امت کے لٹے پھٹے لاوارث مسلمانوں کی مدد جاری ہے ان کے لیئے خوراک کا بندوبست کیا جاتا ہے تعلیم اور صحت کی سہولتیں دی جاتی ہیں یا ان کے حقوق کے لیئے آواز بلند کی جاتی ہے۔ تو اگر ان خدمات کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے مولویوں کا بہت بڑا مقام ہے۔

اسی طرح ہر شعبے میں ایسے انسان ہیں کہ فرشتہ ہونے کا گمان ہوتا ہے اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ ان کے شیطان ہونے کا گمان بھی ہوتا ہے۔ مگر ظلم یہ ہے کہ ہم بدگمان بہت پہلے بغیر کسی تصدیق کے ہو جاتے ہیں اور نیک گمان بہت دیر سے تصدیق ہو جانے کے بعد بھی نہیں ہوتے۔ اللہ ہمیں بدگمانی سے بھی منع کرتا ہے۔

میں نے ایک تجویز رکھی تھی کہ ہمارے علماء کا بہت بڑا دینی نیٹ ورک ہے اگر ان کو ڈیمز کے فنڈ کے لیئے اکٹھا کیا جائے تو یہ بہترین معاون ہو سکتے ہیں تو بجائے اس بات کو مثبت لینے کے ہوا میں اڑا دیا گیا کہ مولوی حضرات تو ایسے ہوتے ہیں اور مولوی حضرات ویسے ہوتے ہیں۔

یہ مولوی حضرات تحفظ ختم نبوت بھی کر گئے، افغان وار بھی لڑ گئے جنہیں وائٹ ہاوس میں سلامی پیش کی گئی، کشمیر کی آواز کو بھی اٹھا رہے ہیں اور فلسطین کا معاملہ بھی آگے بڑھا رہے ہیں جو کام اسلامی ممالک کو کرنا چاہیئے یہی مولوی حضرات انہیں لٹے پھٹے مسلمانوں کا نہ صرف درد لیئے گھوم رہے بلکہ خاطر خواہ معاونت بھی کر رہے ہیں۔ اب میں ان کی زیادہ تعریف کر کے مولوی نہیں لگنا چاہتا مگر جس حد تک ان کے اچھے کام ہیں انہیں بھی برابر سراہنا چاہیئے۔

اگر قومی دھارے میں ملک کر ترقی کے لیئے انہیں کوئی بہتر کردار دے دیا جائے اور یہ اس کی آنرشپ بھی لے لیں تو یہ ملک کے مفاد میں بہت بہتر ہو سکتا ہے۔

معاشرے کے باقی ستونوں کی طرح یہ ستون بھی بہت اہم ہے اور یہ اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ ان کو دیوار کے ساتھ لگا کر بھی ہم معاشرے میں توازن نہیں لا سکتے۔

پاکستان کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالیں، اور برکت کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں وہ ہمیں ہماری نیتوں کا پھل ضرور دے گا اور ہمارا نقصان ہر گز نہیں کیا جائے گا دعا ہے اللہ ہمارے تمام جائز خوابوں کو تعبیر عطا کرے۔ آمین

پاکستان ہر گز مایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہمیں کبھی بھی اچھی لیڈر شپ نہیں ملی، ہمارے ادارے کمزور سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں، عوام میں بھی شعور کا فقدان ہے اور بھی بہت سے مسائل پاکستان کو درپیش ہیں۔ ہم سارا دن پاکستان کی سیاسی پر اور پاکستانی اداروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں یہ سب ہم پاکستان کی محبت میں کر رہے ہوتے ہیں تاکہ پاکستان کو ہر چیز نمبر 1 ملے۔

آئیڈل ازم دنیا میں کہیں نہیں ہے، خود امیریکہ بھی اپنی تاریخ کی بدترین لیڈر شپ کے شکنجے میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے سب ختم ہو گیا۔

پاکستان ہر گز ہر گز مایوس کن صورتِ حال میں نہیں ہے۔ شاید پاکستان جتنا مضبوط آج ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ آج ہماری ملٹری طاقت کا موازنہ تاریخ کی کسی بھی دور سے نہیں کیا جا سکتا، معاشی لحاظ سے بھی پاکستان جس طرح کے معاہدے چین سے کر چکا ہے اس طرح کے اور اس سطح کے معاشی معاہدے کبھی امریکہ سے بھی نہیں ہوئے۔ 500 بلین ڈالر کی انوسٹمنٹ پاکستان میں 2045 تک ہر حال میں آنی ہے جس کے لیے چائنز کمپنیز گزشتہ 2 دہائیوں سے بھی زائید عرصے سے پاکستان میں دن رات کام کرنے میں مصروف ہیں، دنیا کر سب سے بڑا سولر پلانٹ لگ چکا ہے، سی پیک کو دنیا کے سب سے بڑے روڈ، ریل اور کمیونیکیشن کوریڈور سے ملا جا رہا ہے جن پر 24 گھنٹے کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بجلی کے منصوبے جتنے زیادہ اور جتنے بڑے لیول پر آج ہو رہے ہیں کبھی نہیں ہوئے۔

ان منصوبوں کا فائدہ مشرف بھی لینا چاہتا ہے، زرداری بھی لینا چاہتا ہے اور نواز شریف بھی لینا چاہتا ہے اور آرمی بھی لینا چاہتی ہے۔

مگر یقین مانے ان سارے منصوبوں کے پیچھے سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی نہیں جس نے دنیا کے نقشوں کو تبدیل کرنا شروع کیا، چین معاشی طور پر اتنا مضبوط ہوا کہ اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ایشا کے 60 ملکوں میں اپنی انوسٹمنٹس کا ایک وسیع نیٹ ورک بنانے کے قابل ہو گیا۔

چائنہ 60 ملکوں میں ایک ہی وقت میں کام کر رہا ہے، اور چائینہ کر ترقی میں ان 60 ملکوں کی اپنی ترقی بھی شامل ہے اور اس عظیم کام کے لیے چائنہ کے اندازے کے مطابق 4 سے 8 ٹرلین ڈالر کی انوسٹمنٹ کی جائے گی اور اس میں ولڈ بنک، ایشن ڈویلپمنٹ بنک اور آئی ایم ایف پہلے سے شامل ہیں۔

یہ 60 ملک دنیا کی آبادی کا 60 فیصد ہیں، دنیا کے تیل کے وسائل کا 70 فیصد ہیں جب کہ دنیا کی آمدنی کا صرف 30 فیصد ہیں۔ اسی لیے ان میں انوسٹمنٹ پر آمدنی کی شرع بھی ترقی یافتہ ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔

ایشا دنیا کی سازشوں کا گھڑا ایسے لیے بنا ہوئے ہے کیوں کہ جو ایشیا میں ڈومنیٹ کرے گا وہی دنیا کی اگلی معاشی طاقت ہوگا۔ اور جو ایشیا کی معشیت کا حصہ نہیں بن سکے گا ایسے ترقی یافتہ ملک اگلے دور کے ترقی پذیر ملک ہو سکتے ہیں۔

ایک طرف غریب ملک اپنے بہتر مستقبل کی جن لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف ترقی یافتہ ملک اپنی ڈوبتی ہوئی معشت کو بچانے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

پاکستان میں چائینہ نے تب تک یہ معاہدے نہیں کئے جب تک سب سیاسی جماعتوں اور آرمی سب کو ایک پیج پر لا کر دستخط نہیں کروا لیے۔ اس کا فائیدہ یہ ہوا ہے کہ یہ آپس میں جتنا بھی لڑیں س پیک کے حوالے سے کبھی نہیں لڑیں گے۔

ہمارے سیاسی حکمران اتنے سیانے نہیں ہیں کہ اس طرح کی صورت حال کو خود جنم دے لیتے جن کی سوچ ہمیشہ سے بانجھ پن کا شکار رہی ہے۔

اللہ نے ہمیں ایک ایسی لوکیشن دی ہے جو پوری دنیا میں اپنی اہمیت کا لوہا منواتی آ رہی ہے جس کی وجہ سے پہلے ہمیں امیریکہ بیٹھا کر کھلاتا رہا اور اب چایئنہ بیٹھا کر کھلا رہا ہے۔

انڈیا نے بھوٹان میں اپنی فوج داخل کی جس کی وجہ سے چائنہ اور انڈیا کا ایشو گذشتہ دنوں سے کافی شدت اختیار کر گیا تھا کیوں کہ چائینہ نے انڈیا پر واضع کر دیا کہ وہ یہاں سے نکل جائے ساتھ یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر پاکستان اشارہ کرے تو سوڈان میں انڈین آرمی کی طرح کمشیر میں چائینہ کی آرمی بھی داخل ہو سکتی ہے اور یہ ایک دن ضرور ہونا ہے۔ امریکہ سے تو ہم اخلاقی تعاون کی بھی امید نہیں کر سکتے کیوں کہ امیریکہ کا اندھا پن اس بات سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسے دہشت گرد اور حریت پسند کا فرق ہی نہیں معلوم۔

یہ ہماری قوم کے مسلسل صبر کا پھل اور ہماری تمام تر آزمائشوں کا اچھا بہترین بدل ہے۔اب جو بھی پاکستان اور چائینہ کی دوستی کے خلاف بات کرتا ہے وہ یقینا پاکستان کے روشن مستقبل کے خلاف بات کرتا ہے اور یہ بات آرمی نے تمام سیاسی کارکنوں کو اچھی طرح سے سمجھادی ہے۔

پاکستان زندہ باد

فہرست مضامین

	علمی اور تربیتی	
1	چمکنے کی صلاحیت	387
2	کوورڈ سٹانس	388
3	کامیابی ہر انسان کا خواب ہے	392
4	شجرِ سایہ دار	394
5	گمنام ماہر تعلیمی کردار	397
6	کامیابی کا راستہ	400
7	اپنے ہیروز کا تحفظ کریں	402
8	حقیقی اور تصوراتی دنیا	405
9	امید پر دنیا قائم ہے	408
10	مشینوں کا انسانوں پر قبضہ	411
11	آرٹیفیشل انٹیلی جینس	415
12	دوستیوں کا جھرمٹ یا تنہائیوں کا مرکز	419
13	منزل	424
14	کوئلے کی کان میں ہیرا	427
15	درخت کی بجائے باغ لگائیں	429
16	آئینہء خودی	432
17	متوازن آئینہ داری	434
18	آئینے پر داغ	438
19	نئی نسل نیا دور	441

چمکنے کی صلاحیت

تحریر : میاں وقار الاسلام

میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر ذرے کو چمکنے کی بھرپور صلاحیت عطا کی ہے، چمکنے کی طاقت صرف وہ ذرہ نہیں رکھتا جو اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتا۔ ورنہ اللہ کی رحمت ہر ذرہ پر یکساں برستی رہتی ہے۔ ذرہ جب اپنی حقیقت پہچان لیتا ہے تو اس پر اس کے بنانے والے کے راز آشکار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جو ذرہ رب کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو پوری دنیا تک اس کی روشنی پہنچتی ہے۔ جو ذرے اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتے وہ اپنی بے نوری پر روتے رہتے ہیں جبکہ نور کے خزانے ان کے دلوں میں ہی دفن رہتے ہیں۔

مصنف : میاں وقار الاسلام

تصنیف : بیسٹ لائف نوٹس

کوورڈ سٹانس

Covered Stance

تحریر: میاں وقار الاسلام

"اگر پاکستان کی تاریخ دیکھی جائے تو جو چیز تمام سیاست دانوں اور ڈیکٹیٹروں میں یکساں طور پر نظر آتی ہے وہ ہے " کوورڈ سٹانس

اب یہ " کوورڈ سٹانس " ہوتی کیا بلا ہے۔

جب بھی کوئی اقتدار سنبھالتا ہے تو اپنی بری کارکردی یا نالائقی کو چھپانے کے لیئے پچھلی حکومت کی بری کارکردگی یا نالائقی کے پیچھے منہ چھپاتا نظر آتا ہے۔ اپنے کلیئر سٹانس کو سامنے لانے کی بجائے ایک چور راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور اپنی تمام تر نالائقیوں کا بوجھ پچھلی حکومتوں پر ڈال کر جان چھڑالی جاتی ہے۔ اور یہ کوورڈ سٹانس بنیادی طور پر ان سب کے لیئے فیس سیونگ کا کام کرتا ہے۔

ناہم کسی کو اچھا کہ سکتے ہیں اور نہ ہی ہم کسی کو برا ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمیں سارے ظالم نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں ان کی مظلوم شکلیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک سے بڑھ کر ایک نجات دہندے ہم پر مسلط کیے جاتے ہیں اور پھر انہیں نجات دہندوں سے ہمیں نجات بھی دلوائی جاتی ہے۔ کبھی یہی لوگ قوم کے صف اول کے محسن ہوتے ہیں اور کبھی صف اول کے مجرم اور یوں تختے پر تختہ پلٹا جاتا ہے۔

جانے ہم اپنی قوم سے کب سچ بولیں اور کب سیدھی بات کریں گے۔

مصطفٰی زیدی کا ایک شعر میرے ذہن میں اکثر گھومتا رہتا ہے

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

زیدی

قوم مجرم کون ہیں، قوم کے محسن کون ہیں کیا ہماری قوم اسی میں تقسیم ہوتی رہے گی۔

ہم اپنی اگلی نسل کو کیا دینے جارہے ہیں۔ پاکستان کے دو حصے ہو گئے اور ہماری قوم کے ہاتھ میں کوورڈ سٹانس تھما دیا گیا۔
نہ مجرموں کا پتہ نہ محسنوں کی خبر

بھٹو شہید ہے یا عدالت کا ایک سزا یافتہ مجرم یہ قصہ بھی تاریخ کے پنوں میں کھو گیا۔

ضیاء اور مشرف نے قانون کے توڑ کر ملک کا بھلا کیا یا ملک مشکلیں بڑھائیں یہ بھی سوالیہ نشان رہے گا۔

پی پی پی اور نون لیگ۔۔۔ ان کے پس پردہ بھی کئی راز ہیں یہ باری باری حکومتوں میں رہے اور اپنی کارکردگی تو کیا دکھانی تھی قوم کے سامنے ایک کوورڈ سٹانس رکھ کر چلتے رہے اور آج دونوں پارٹیوں کے سربراہ جیل میں ہے۔

اقتدار آج پی ٹی آئی کے ہاتھ میں ہے تو کیا قوم کو ایک بار پھر کوورڈ سٹانس۔۔۔۔ یعنی لال بتی کے پیچھے لگایا ہوا ہے۔

ایسا کیا ہے کہ ان کی کھلی نالائقی پر بات نہیں کی جس سکتی اور کیوں نہیں کی جاسکتی یہ بھی تو ایک کوورڈ سٹانس لے کر چل رہے ہیں اور اپنی ساری غلطیاں ن لیگ اور پی پی پی کے پیچھے چھپانے میں لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔ کیا یہ ایک اور کوورڈ سٹانس نہیں

زمین کو آسمان سے ملا دینے والے سارے دعوے خاک ہو گئے یوٹرن کے بھی کئی ٹرن ہو گئے مگر قوم کے کسی بھی اقتدار میں آنے والے نے سچ نہیں بولا

سیاست گندی نہیں ہے اور نہ ہی عدلیہ گندی ہے مگر دونوں اداروں کو ہمیشہ گندے طریقے سے چلایا گیا ہے نہ عدالتیں کبھی قوم کے سامنے سچ لانے میں کامیاب ہوئی نہ ہی سیاست دانوں نے کبھی سچ بولا ہے۔

فرض کر لیتے ہیں کہ آج تک جتنی بھی حکومتیں آئی ہیں سب سفر تھیں۔۔۔۔ یہ تو ہمیشہ منوایا جاتا رہا ہے تو اب بھی مان لیتے ہیں۔

مگر سوال ہمیشہ ایک ہی رہے گا اور ایک ہی رہنا چاہیئے کہ کارکردگی کیا ہے۔

ہر حکومت خود کو مسیحا بنا کر اقتدار میں آتی ہے اور خود کو ایک مسئلہ ثابت کر کے چلی جاتی ہے۔

خدا کے لیئے پاکستان پر رحم کریں، اسے مسیحا نہیں چند قابل لوگ چاہیں جو سیدھی طرح سے اپنے حصے کا کام کریں اور اپنی کارکردگی کی بنا پر آگے بڑھے نہ کہ ایک دوسرے کی نالائقیوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے اور ایک کوورڈ سٹانس کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگائے رکھیں۔

کوورڈ سٹانس کا لولی پاپ سیاست دانوں سے چھین لینا چاہیئے اور اس ٹرک کی بتی بھی توڑ دینی چاہیئے جس کے پیچھے یہ عوام کو لگائے رکھتے ہیں۔

ایک قسم کا کوورڈ سٹانس ججز بھی رکھتے ہیں جو جھوٹے فیصلے لکھتے ہیں اور لکھتے آئے ہیں اور مجرموں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے ہیں اور ایک کوورڈ سٹانس اسٹیبلشمنٹ کا بھی ہے اور یہی قوم کو تقسیم کر دیتے ہیں پھر اکھٹا بھی کر دیتے ہیں۔۔۔۔ یعنی جیسے چاہا جاتا ہے ویسے کیا جاتا ہے۔

آج تک قوم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ جیل سے کون سا راستہ پارلیمان کو جاتا ہے۔۔۔۔

سنا ہے پیسہ لوٹنے والوں سے پیسہ نکلوایا جا رہا ہے۔۔۔۔ یہ سچ ہے یا کوورڈ سٹانس۔۔۔۔

خدارا کہیں کچھ تو سچ بولیں۔

سچ بولنے سے ملک مضبوط ہوتے ہیں اور قوم یکجا ہوتی ہے۔ جانے کو ورڈ سٹانس کے ذریعے قوم کو کون سا شعور دیا جاتا ہے۔
اللہ ہمیں اپنی قوم کے ساتھ سچ بولنے کی توفیق دے آمین

کامیابی ہر انسان کا خواب ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

کامیابی ہر انسان کا خواب ہے اور وہ اپنے خواب کی تعبیر کے دن رات سر گرم ہے۔ ہر انسان اپنے ذہن میں کامیابی کا ایک نقشہ بناتا ہے اور پھر اپنی پوری زندگی اس کے حصول کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ بہت سے لوگ سائے کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور جب منزل پہ پہنچتے ہیں تو سایہ اندھیروں میں غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی مسافتیں اتنی طویل ہوتی ہیں کہ زندگی ہار جاتی ہے۔ کچھ لوگ اپنا ہر تعلق اور واسطہ پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور جب وہ منزل پر پہنچتے ہیں تو بالکل تنہا رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سب کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں کچھ لوگ رب کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ سب کچھ پا کر بھی ناخوش رہتے ہیں اور کچھ سب کچھ لٹا کر بھی بے چین نہیں ہوتے۔

کامیابی ہر انسان کا خواب ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے کامیابی خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ کچھ لوگ تھک ہار کر خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے خواب ہی ٹوٹ جاتے ہیں، کچھ لوگوں کے خواب بھیانک روپ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ زندگی کی افسردگیوں سے ہی باہر نہیں نکل پاتے کہ خواب بھی دیکھیں تو کیا دیکھیں۔ کچھ لوگ اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے لوگوں کو خواب دیکھاتے رہتے ہیں اور وہ بھی ایک سے ایک سہانے، کچھ لوگ اپنے خوابوں کی تعبیر عام لوگوں کے خوابوں کے قبرستان پر بناتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنا دین بیچ دیتے ہیں، اپنا ایمان بیچ دیتیں ہے، ان کے لیے ان کے خواب ہی خالق و معبود ہوتے ہیں اور وہ اسی کر پر ستش کرتے چلے جاتے ہیں۔ خوابوں کا دیوتا ساری زندگی ان سے چڑھاوے مانگتا رہتا ہے اور وہ لوگوں کا خون چوس چوس کر اپنے دیوتا کو خوش کرتے رہتے ہیں۔

ایسی کامیابی جس میں انسانی قدریں دم دوڑ دیں، اپنے دوست پیچھے رہ جائیں، والدین کی خبر نہ ہو، رشتہ داروں کا احساس نہ ہو، ہمسائے اجنبی ہو جائیں، اپنائیت صرف اور صرف اپنے مقاصد کے حصول تک رہے جائے ایسی کامیابی ایک سہانا خواب ہی تو ہے، جو انسان سوتے ہوئے نہیں بلکہ جاگتے ہوئے دیکھتا ہے اور ساری زندگی دیکھتا ہے، یہ خواب ٹوٹتا تب ہے جب انسان کو ابدی نیند آتی ہے۔

لوگ جانتے ہیں کہ ان کی کامیابیاں انہیں آخرت میں کچھ نہیں دے سکتیں مگر پھر بھی وہ اپنے پیٹ میں آگ کا سمندر بھرتے جاتے ہیں۔ بے چین رہتے ہیں بے تاب رہتے ہیں، ان کی ایسی کامیابیاں جو انہیں دنیا میں کسی قسم کا سکون نہیں دے سکتیں وہ آخرت میں انہیں کیا نجات دیں گی۔

انسان اپنے خوبصورت خوابوں میں قید ہے، کئی بستیوں کو انسانوں کے خوابوں سمیت الٹا کر رکھ دیا گیا تاکہ انسان سمجھے کہ حقیقی کامیابی کیا ہے۔ مگر انسان کی فطرت ہی بڑی ظالم ہے، وہ اس سے اسی کے نفس اور جان پر ظلم کرواتی ہے اور انسان اس پر ایمان لانے میں ہمیشہ جلدی کرتا ہے، اور ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔

حقیقی کامیابی کبھی ظالم لوگوں کو نہیں ملتی، کبھی ایسے لوگوں کو نہیں ملتی جو اپنے خوابوں کو اور اپنی خواہشوں کو معبود رکھتے ہیں، کبھی ان کو نہیں ملتی جو لوگوں کی خوشیاں چھین کر اپنے خواب پورے کرتے ہیں۔ بے چین اور بے تاب لوگوں کی ڈکشنری میں حقیقی کامیابی کا لفظ ہی نہیں ہوتا۔ انسان کو کامیابی کے ایسے خوابوں سے ڈرنا چاہیے جس کی تعبیر ناکامی سے سوا کچھ نہ ہو۔

شجرِ سایہ دار

تحریر : میاں وقار الاسلام

اللہ اسلام کی ایک مثال بیان کرتا ہے کہ ہم نے زمین سے ایک سوئی نکالی پھر وہ پودا بنی پھر وہ تن آور درخت بنی اور پھر وہ غیر مسلموں اور مشرکوں کا دل جلانے لگی۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ تم بہت کم تعداد میں تھے علاقے میں تمہارے قدم بھی مضبوط نہیں تھے پھر ہم نے تم پر اپنا فضل کیا اور تمہیں جماعت کثیر بنایا تمہارے علاقے میں قدم مضبوط کیئے اور تمہارا رعب اور دبدبا قائم کیا۔

پھر ایک اور جگہ بیان ہوتا ہے کہ یہودی، عیسائی اور مشرک لوگ چاہتے ہیں کہ اسلام کے چراغ کو پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر کسی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے وہ کر کے ہی رہتا ہے۔

اللہ نے اگر آپ کو زندگی کے کسی میدان میں مضبوط کیا ہے تو اللہ چاہتا تھا کہ وہ ایسا کرے اور آپ کے پاوں جمائے، اگر آپ جماعت کی شکل میں ہیں تو اللہ چاہتا تھا کہ آپ کو کثیر تعداد میں کر دے، اسی طرح ہمیں جو بھی ملتا ہے یا ہمارے کام میں جو بھی برکت پڑتی ہے اس میں اگر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہو تو کچھ بھی باقی نہ رہے۔

پھر اللہ جو آپ کو دیتا جاتا ہے اس کی اسی دنیا میں آزمائش بھی کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ آپ کتنا رجوع کرنے والے ہیں اور کتنا شکر ادا کرنے والے ہیں اور جو آپ کو دیا گیا ہے اس میں سے کتنا لوگوں میں واپس بانٹنے والے ہیں۔

قران میں بہت سی مثالیں آتی ہیں جیسے ایک شخص کا باغ تھا اور جو گماں کر بیٹھا تھا کہ یہ سب کچھ اسے اس کی محنت سے ملا ہے، اور وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اگر میں مر کر زندہ اٹھایا گیا تو مجھے پھر بھی یہی سب کچھ حاصل ہو گا جو مجھے یہاں حاصل ہوا ہے۔ پھر یہ بھی بیان ہوتا ہے کہ اس کا باغ برباد کر دیا گیا اور وہ حسرت زدہ ہو کر اپنی چھتریوں پر الٹا پڑا رہ گیا۔

ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ ناشکروں کا حال بہت برا ہوتا ہے، سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی انہیں چین اور سکون نہیں ملتا، وہ ہر وقت مایوسی اور فرسٹریشن کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات اور واقعات میں انہیں سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نظر نہیں آتا۔

شکر کرنے والوں کے چہروں پر اطمینان ہوتا ہے، انہیں کم ملے یا زیادہ ان کے حرص اور لالچ نہیں بڑھتی انہیں جب مضبوط کیا جاتا ہے تو غرور میں نہیں آتے انہیں جب کسی نقصان سے گزارا جاتا ہے تو مایوس نہیں ہوتے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ جس نے انہیں پہلے نوازا تھا وہ چاہے گا تو انہیں پھر نواز دے گا۔ اور یہ جب کثیر جماعت میں ہوتے ہیں تو اپنی جماعت کی وجہ سے اکڑ کر نہیں چلتے بلکہ ان میں مزید عاجزی اور انکساری آتی ہے۔

اگر اللہ نے آپ کو کسی اعزاز سے نوازا ہے تو شجر سایہ دار بنیں، آپ پر پھل لگتا ہے تو اس پھل کو بانٹیں اور اگر آپ پر ہریالی آتی ہے تو لوگوں پر سایہ کریں۔

تکبر اور خود پرستی کے درخت پر اول تو کوئی پھل ہی نہیں لگتا اور اگر لگ بھی جائے تو کڑوا کسیلا اور اسی طرح اس درخت پر ہریالی بھی نہیں آتی اور اس کا تنا سوکھ جاتا ہے تو اس سے سایے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ ناشکروں اور مغرور لوگوں کا نصیب اس لے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے۔

اللہ نے اگر آپ کو کوئی مقام عطا کیا ہے تو اللہ کے فضل کو پہچانیں۔ اور خود اپنی جگ ہنسائی کا سامان اکٹھا نہ کریں۔

عجیب لگتا ہے جب ایک مالا مال شخص بھوک سے مرنے کی بات کرتا ہے ایسا مالا مال شخص جس کی نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔

عجیب لگتا ہے، بڑا قلم کار مایوسی کی بات کرتا ہے حالانکہ اللہ نے اسے بڑا نام اور بہت عزت دی ہوتی ہے

عجیب لگتا ہے جب ایک بڑا عالم یہ کہتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے حالانکہ کہ اللہ نے اسے منتخب کیا اور اعلی مقام عطا کیا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جو اپنے اپنے اداروں کے ہیڈ ہیں نام بھی رکھتے ہیں اور شہرت بھی اور سب کچھ حاصل کرنے کے بعد صرف مایوسی کی بات کرتے ہیں اور ان کے اندر کی فرسٹریشن ہے کہ ان کی جان نہیں چھوڑتی۔

اگر اللہ آپ کو عزت اور مقام دے سکتا ہے تو ذلیل اور رسوا بھی کر سکتا ہے جیسے کہ آپ ناشکرانی کرکے اپنے مقام کو خود گرانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ پھر بھی آپ خو سنبھال لیتا ہے۔ کیوں کہ جس مقام پر اللہ نے آپ کو بیٹھایا ہوتا ہے وہاں سے آپ گریں گے تو بہت سے لوگوں کا بھرم ٹوٹ جائے گا اور شاید اللہ آپ کا اور باقی لوگوں کا بھرم قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور آپ اندر سے جو کچھ بھی ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔

کوشش کریں کہ شجر_سایہ دار بنیں آپ کی باتوں سے امید کا پیغام جانا چاہیئے جس خدا نے آپ کو عزت عطا کی ہے وہ چاہے تو بہت سے لوگوں کو عزت دے دے جن کو آپ یا تو کچھ نہیں سمجھتے یا پھر آپ کا تکبر آپ کی نظریں چندھیا دیتا ہے اور آپ کو نظر کچھ نہیں آتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نئی آنے والی جینریشن پہلے سے زیادہ علم اور طاقت رکھتی ہے، شعور اور وسائل رکھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری توقعات سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ تو جو فضل اللہ نے ہم سے نیچے والی جماعت پر کرنا ہے وہ کرنا ہے۔

جس اللہ نے ہماری جینریشن کو پڑھایا لکھایا بڑا کیا اور ہمارے لیئے رزق کے انتظامات کیئے، وہی رب اگلی جنریشن کا بھی رب ہے، وہ جانتا ہے کہ کب کس پر کتنا فضل کرنا ہے کتنا پڑھانا ہے اور کتنا آگے لے کر جانا ہے۔

اللہ اس بات کا محتاج نہیں کہ ہماری مایوسی اور فرسٹریشن کا بوجھ ہماری اگلی نسل پر بھی ڈال دے۔ اگر وہ چاہیے تو ہم ہی میں سے ایسی جماعت نکال کھڑی کرے جو ہر لحاظ سے ہم سے بہتر ہو اور وہ اس بات پر پوری طرح قادر ہے اور وہ ایسا کرتا آیا ہے۔

امید کرتا ہوں کہ آپ مایوسی پھیلانے والے بڑے بڑے نام نہاد بابوں کی عقل_سلیم سے نقصان اٹھانے کی بجائے ایسے لوگوں کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے جو پر امید ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں۔

گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھیں، حالات کی گرمی سے آپ کا وجود محفوظ رہے گا۔ اور آپ کی زندگی میں انشاءاللہ ہریالی آئے گی

دعا گو میاں وقار الاسلام

گمنام ماہر تعلیمی کردار

تحریر : میاں وقار الاسلام

جہاں ہر بندہ خود غرض ہو وہاں ملک فلاحی ریاست کیسے بن پائے گا۔ پتا نہیں ملک فلاحی ریاست بن پائے گا یا نہیں کم از کم تعلیمی ادارے تو فلاحی ادارے ضرور بننے چاہیں۔

اگر تعلیمی ادارے ہی کاروبار کی آڑ میں خود غرضی اور لالچ سے بھرے پڑے ہوں تو ہم کس طرح کی نئی نسل کو سامنے لائیں گے۔

بہت سے اداروں کا پہلے سے ہی بیڑا غرق ہے کوششوں کے نام پر کیا کوششیں ہوتی ہیں مجھے نہیں معلوم۔ کیا ہم صرف تعلیمی اداروں کو فلاحی ادارے نہیں رہنے دے سکتے۔

تعلیمی اداروں کے سربراہان کا صاحب کردار ہونا بہت ضروری ہے اس طرح کے عہدوں کا کسی غیر ذمہ دار شخص کے ہاتھ میں چلے جانا بد قسمتی ہے۔

بہت سے تعلیمی ادارے ہیں جہاں عملے کو ہراساں کیا جاتا ہے بچوں کو بھی ہراساں کیا جاتا ہے بچے اغوا اور قتل بھی ہوتے ہیں یا پھر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف تعلیم کو کاروبار بناتے بناتے تعلیم اتنی مہنگی ہو چکی ہے کہ عام آدمی صرف دال چینی سے ہی محروم نہیں ہو رہا بلکہ مناسب تعلیمی سہولیات سے بھی محروم ہو رہا ہے۔

تعلیم کے حوالے سے مجھے نہیں معلوم کے ہمارے ملک کی کیا منصوبہ بندی ہے مگر بہت سے ممالک ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اعلی تعلیمی میدان میں منوایا اور دیکھتے ہی دیکھتے معاشی طاقت بھی بن گئے۔

تعلیم ہمیں بہت کچھ دے سکتی ہے مسئلہ یہ نہیں مسئلہ یہ ہے ہم تعلیم کو کیا دیتے ہیں کہ تعلیم ہمیں واپس کچھ دے پائے۔

ایسا نہیں ہے کہ سارے ہی تعلیمی ادارے برے ہیں مگر جو تعلیمی ادارے برے ہیں وہ بے لوث محنت کرنے والے اداروں کا بھی حق مار رہے ہیں۔

بدماش قسم سے تعلمی ادارے ہر سطح پر حاوی ہو جاتے ہیں چاہے قانونی مسائل ہوں یا کوئی اور معاملات ہوں شریف اور بے لوث اداروں سے دب جاتے ہیں اور ان سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔

حکومت تعلیمی اداروں کا ماحول ٹھیک رکھنے کیلیے جرمانے لگاتی ہے جو طاقتور اداروں کے لیے معمولی بات ہے مگر محنت کرنے والے لوگوں کی حوصلہ افزائی ویسے نہیں ہوتی جیسے ہونی چاہیے۔

ایدھی کی طرح بہت سے لوگ ہیں جو خاموشی سے خدمت خلق میں لگے رہتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھتا نہیں ایسے لوگوں کی خبر ہمیں تب ہوتی ہے جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

میں اگر تعلیمی میدان میں اپنے ان اساتذہ کو دیکھوں جنہوں نے میری اور میرے جیسے کئی لوگوں کی زندگیاں بدلی ہیں تو میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ان کی زندگی طویل مسافت کے بعد بھی نہیں بدلی۔

ہمیں اپنے گمنام ماہر تعلیمی کرداروں کو پہچاننے کی ضرورت ہے انہیں عزت دینے کی ضرورت ہے ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے جنہوں نے ہماری ضروریات پوری کیں ہمیں ان کی ضروریات کا خیال رکھنا پڑے گا۔

بہت سے لوگ نیک نیتی سے تعلیمی میدان میں آتے ہیں اور بہت محنت کرتے ہیں اپنا مقام بھی بناتے مگر سرمایہ دار انہیں تباہ کر سکتا ہے کیوں کہ ہمیں بھی چمکتے ہوئے ادارے پسند ہیں۔

معاشرے میں اگر بدنیت ترقی کر رہے ہوں اور نیک نیت لوگوں کو اپنی نیک نیتی کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہو تو ہمیں یہ جاننے میں مشکل نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم کس سمت میں جا رہے ہیں اور ہمارے دائیں بائیں کون لوگ ہیں۔

ہم اللہ سے اپنی حالت پر رحم مانگتے ہیں مگر ہم خود اپنی حالت پر رحم کب کریں گے۔

دعا گو: میاں وقار الاسلام

کامیابی کا راستہ

تحریر : میاں وقار الاسلام

کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے باقی سارے راستے جھوٹے ہیں۔ وہی راستہ سچا ہے جس پر رب راضی ہوتا ہے۔

وہی راستہ سیدھا ہے جس پر اللہ کے پیغمبر چلتے رہے اور اللہ کے نیک بندے جس کی پیروی کرتے ہیں۔

جو رستہ مشکل ہو مگر آسانیاں لائے وہ بہتر ہے اس رستے سے جو آسان ہو مگر کسی مشکل میں پھنسا دے۔

جو لوگ فرعون کی کامیابیوں پر رشک کرتے تھے انہیں لوگوں پر فرعون کا انجام نشان عبرت بنا اور آگے آنے والے کے لیے مثال عبرت۔

کامیاب وہ نہیں جس کے پاس دو جہان کے خزانے ہوں بلکہ کامیاب وہ ہے جس کے پاس کچھ زاد راہ ہو جس سے اس کی آخرت سنورے۔

مسئلہ یہ نہیں کہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ درست سمت اور غلط سمت کون سی ہے مسئلہ یہ کہ لوگ جانتے بوجھتے ہوئے غلط رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔

یہ نہیں ہے کہ دنیا میں رزق کی فراوانی نہیں انسان نے اگلے 10 سال کا بندوبست کر رکھا ہے پھر بھی بھوک بڑھ رہی ہے اور بھوک سے مرنے والوں کی تعداد بھی۔

ایک طرف ایسے انسان ہیں جن کی 10 نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں دوسری طرف ایسے انسان ہیں جن کا دوڑنا بھاگنا بھی ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

جو لوگ پانیوں پہ قابض ہیں اللہ ان سے ضرور پوچھے گا کہ پیاس سے مرنے والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا

جو لوگ اناج پر قابض ہیں اللہ ان سے ضرور پوچھے گا کہ جو بھوک سے مر رہے تھے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

ان عالم فاضل لوگوں سے ضرور پوچھا جائے گا جنہوں نے علم کا حصول مہنگا کیا اور ان کے ماتحت لوگ جاہل رہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سوشل اینیمل ہے، پھر اگر وہ سوشل نہیں ہے تو پیچھے صرف اینیمل ہی رہ جاتا ہے۔

ایسی تعلیم جو ماں باپ کے آگے سرکش کر دے اس کا بھی کیا فائیدہ اور ایسا علم جو رب کی پہچان بھی نہ دے سکے ایسے علم کا بھی کیا فائیدہ۔

انسان اپنے لیے بھی یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں کامیاب ہو اور اپنی اولاد کے لیے بھی یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں کامیاب ہو۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ انسان اپنی بھی آخرت کی فکر کرے اور اپنی اولاد کی بھی آخرت کی فکر کرے۔

جب پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تھا۔۔۔۔ تو ہم کیا کہیں گے کہ ہم نے کامیابی کے کون سے رستے کا انتخاب کیا؟

اللہ ہمیں ہدایت دے کہ ہم جس بھی راستے کا انتخاب کریں اس کی منزل رسوا کرنے والی نہ ہو

دعا گو میاں وقار الاسلام

PRESERVE YOUR MARVELS

STORE YOUR KNOWLEDGE

پریزرو یور مارولز، سٹور یور نالج

اپنے ہیروز کا تحفظ کریں، اپنے علم کو محفوظ کریں

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہمارے ہاں بہت ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنے اپنے میدان میں بہت کام کیا اور بڑا نام کمایا اور پھر اس دنیا سے چلے گئے ہمیں ایسے لوگوں کے شاید نام بھی معلوم نہ ہوں۔ ایسے لوگ جب بھی جاتے ہیں ایک خلا چھوڑ جاتے ہیں اور پھر ایک نسل کو دوبارہ صفر سے محنت کرنی پڑتی ہے کیوں کہ ہم نے ایسے شاندار لوگوں کے کام کو نہ تو اہمیت دی، نہ سیکھا، نہ آگے بڑھایا اور نہ ہی پریزرو کیا۔

2 سے 4 سالوں میں کسی بھی فیلڈ میں پی ایچ ڈی کی جا سکتی ہے، اگر پی ایچ ڈی کر بھی لی جائے تو وہ تجربہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ لوگ کسی فیلڈ میں اپنی پوری زندگی لگا کر حاصل کرتے ہیں۔ ہم ایسے بہت سے لوگ ہر دن ضائع کر دیتے ہیں اور ہماری ترقی کا سفر پھر صفر سے شروع ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں نئی جینریشن کو اولڈ جینریشن کی محنت پریزرو کر کے فراہم کی جاتی ہے اور وہ اپنے صفر کا آغاز وہیں سے کرتی ہے۔ کامیاب لوگوں پر بکس لکھی جاتی ہیں ریسرچ پیپرز پبلیش ہوتے ہیں۔ ان کے نام پر اکیڈمیز بنتی ہیں، کالجز اور یونیورسٹیز بنتی ہیں اور ریسرچ سینٹرز بنتے ہیں اور ان کے کام کو بغیر کسی رکاوٹ کے تسلسل کے ساتھ چلایا جاتا ہے اور پھر انہیں کے اداروں سے ہمارے سٹوڈینٹس ملک کا وسیع سرمایہ خرچ کر کے پی ایچ ڈی کر کے آتے ہیں۔ ایم بی اے میں بہت سے ایسے لوگوں کی کیس سٹڈیز پڑھائی جاتی ہیں جو خود گریجویٹس بھی نہیں ہوتے۔ کیا ہمارے ہاں اس طرح کے تجربہ کار نان گریجویٹس نہیں ہیں جن کا کام کسی بھی پی ایچ ڈی سے بڑھ کر ہو۔ یقینا بہت ہیں مگر ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

ہمارے ہاں ہر میدان میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جن کا کام مثالی ہے مگر ان کے کام کی نہ تو حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور نہ ہی انہیں کوئی پہچان ملتی ہے۔ وہ اپنی انفرادی کیپسٹی میں اتنا کچھ کر جاتے ہیں کہ پوری سٹیٹ اپنی ساری مشینری کو استعمال کرتے ہوئے بھی نہیں کر سکتی۔ پھر آپ سوچیں کہ اگر ان پر تھوڑی سی توجہ دے دی جائے تو وہ کیا سے کیا کر دیکھائیں گے۔

پاکستان میں ایسے بہت سے گروپس ہیں جن کے مالک زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر انہوں نے بہت سی فیکٹریز یا لگائیں اور اپنے کام کو پھیلاتے چلے گئے۔ پھر ان کی نئی جینریشن جو امریکہ یا برطانیہ سے اعلی تعلیم حاصل کرکے واپس آئی تو ان فیکٹریوں کو بڑھانا تو دور کی بات سنبھال بھی نہیں پائی اور ان کے والد کی لگائی ہوئی فیکڑیاں کچھ بند ہو گئیں کچھ خسارے میں چلی گئیں۔ اگر وہ اپنے بڑوں سے کچھ تجربہ لے لیتیں تو شاید ان کا کاروبار کبھی نیچے نہ آتا۔

اب نئی جینریشن پھر صفر سے سب کچھ شروع کرے گی ہو سکتا ہے مار کھا کھا کر وہ کامیاب بھی ہو جائے مگر پھر وہ اپنے تجربات کو محفوظ کرنے کی بجائے کہیں گم کرکے چلی جائے گی۔ اور پھر نیا سفر صفر سے باندھنا پڑے گا۔

ہماری ایک حکومت کوئی کام کرتی ہے تو دوسری کو نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے مطلب کوئی حکمت عملی نہیں کوئی ویژن نہیں۔

قومیں 100 سال سے بھی زیادہ کی منصوبہ بندی کرتی ہیں اور پھر سیڑھوں کی طرح اوپر کی طرف چلتی ہیں اور پھر چلتی ہی چلی جاتی ہیں انہیں رائزنگ نیشنز کہتے ہیں۔ یہ قومیں اپنی مجموعی محنتوں کا تحفظ کرتی ہے اور اپنی محنتیں ضائع نہیں کرتیں اور اس طرح وہ دنیا میں ایک مثال بن کر ابھرتی ہیں۔

اگر اللہ نے آپ کو کوئی صلاحیت دی ہے اسے کم سے کم اپنی سطح پر ضرور محفوظ کریں کیوں کہ جو نالج اور تجربہ آپ کو دیا جاتا ہے یہ آپ کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ آپ کو اس لیئے تیار کرتا ہے کہ آپ سے لوگوں کی فلاح کا کام لے۔ تو جو علم اور تجربے کی امانت اللہ نے آپ کو دی ہے اسے اپنی حد تک ضرور محفوظ کریں اور اسے نئی جینریشن کے حوالے کرتے جائیں آپ دیکھیں گے کہ آپ کے خواب آپ کے ارد گرد ہیں تعبیر ہونے لگیں گے۔ بجائے اس کے کہ آپ اپنا تجربہ اور علم کسی صندوق میں یا پھر اپنے اندر ہی رکھ کر ہی دفن ہو جائیں۔ علم ایک قرض ہے جو آپ پر اتارنا واجب ہے۔

رہی گورنمنٹ کی بات تو اسے چاہیئے کوئلے کی کان میں ہاتھ ڈالے اور اس طرح کے نایاب ہیروں کی تلاش کرے انہیں سنوارے اور سامنے لائے تاکہ جو بے نوری ہمارے معاشرے میں نظر آتی ہے اسے ختم کیا جاسکے۔

ہم جن معاشروں سے علم اور آگہی ڈھونڈتے ہیں وہ ہمارے ہی علاقوں سے ہر سال طرح طرح کے ہیرے چوری کر کے لے جاتے ہیں اور ہم اپنی بے بسی کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہمیں اپنے مارولز کی پہچان کرنی پڑے گی اور ان کے تجربات کو محفوظ کرنا پڑے گا یا پھر ہماری محنتیں یوں ہی رائیگاں جاتی رہیں گی

حقیقی اور تصوراتی دنیا

تحریر : میاں وقار الاسلام

ویسے تو یہ دنیا ہم سب کے لیے ایک ہی دنیا ہے۔ دوسری طرف اگر تصور کیا جائے تو ہم ایک سے زیادہ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ جیسے ہمارے ذہن میں جنت اور دوزخ کا تصور ہے ویسے ہی ایک کچھ دنیاؤں کا وجود ہمارے دل میں ہوتا ہے اور کچھ دنیاؤں کا وجود ہمارے دلوں میں ہوتا ہے۔ جس طرح ہم اپنی دنیا کو خوبصورت دیکھنا اور بنانا چاہتے ہیں ویسے ہی ہم اپنے تصور کی دنیا کو بھی خوبصورت دیکھنا اور بنانا چاہتے ہیں جس کا وجود یا تو ہمارے دلوں میں ہوتا ہے اور یا پھر ہمارے دماغوں میں۔

جوں جوں ہم بڑے ہوتے ہیں ہماری حقیقی دنیا ہمارے سامنے رنگ بدلتی نظر آتی ہے اور اچھے ،برے یا مشکل حالات سے ٹکراتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اندر کی دنیا بھی حالات کا سامنے کرتے ہوئے مختلف انداز سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس طرح ہم اپنے باہر کی دنیا کو مختلف روپ میں دیکھتے ہیں ویسے ہی ہمیں ہمارے اندر کی دنیا مختلف روپ میں ملتی ہے۔ بعض دفعہ یہ بدلتے ہوئے روپ ہم دوسروں کو بیان کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہتے ہیں اور بعض دفعہ ہم اسے بالکل بھی بیان نہیں کر پاتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تصور کی دنیا یا تو کھل کر باہر آ جاتی ہے یا پھر کہیں دبی سی حالات کی راکھ کے نیچے سلگتی رہتی ہے اور کوشش کرتی رہتی ہے کہ ہم حالات سے لڑتے رہیں اور اس کے کے وجود کو باہر لا سکیں۔

باہر کی دنیا ہمیں کچھ اور بنانا چاہتی ہے جسے کہ ڈاکٹر، انجنیر، وکیل، استاد یا پھر کوئی بھی اور کاروباری، سیاسی یا سماجی کارکن۔ اور ہمارے اندر کی دنیا ہمیں کچھ اور بنانا چاہتی ہے جیسا کہ مصور، شاعر، گلوکار، افسانہ نگار یا پھر فن یا پھر کھیل سے متعلق کچھ جیسا کہ کرکٹر، فٹ بالر یا کوئی کوئی بھی اور کھیل۔

باہر کی دنیا ہمیں پریکٹیکل دیکھنا چاہتی ہے مگر اندر کی دنیا ہمارے شوق کی تسکین چاہتی ہے۔ جس طرح ہمارا پریکٹیکل کریکٹر ہوتا ہے اسی طرح ہمارا ایموشنل کرکٹر ہوتا ہے۔

ایک موٹیویشن یا انسپائیشن ہم پر مسلط کی جاتی ہے اور ایک ہمارے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ایک شخص اچھا دوڑ سکتا ہے مگر اس سے جمپنگ کروائی جاتی ہے یا پھر ایک شخص اچھی جمپنگ کر سکتا ہے مگر اس سے دوڑ لگوائی جاتی ہے۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے اندر کے احساسات اور باہر کے محرکات ایک ہی پیج پر آ جائیں۔

ہماری باہر کی دنیا یہ زور لگاتی رہتی ہے کہ وہ ہمارے اندر جگہ بنا سکتے اور ہمارے اندر کی دنیا یہ زور لگاتی رہتی ہے کہ وہ باہر کی دنیا میں اپنی جگہ بنا سکے۔

جب ہم اپنے اندر کی کشمکش کو لوگوں کے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں اس صورتِ حال کا مختلف انداز میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ہر انسان اس طرح کی صورتِ حال سے گزر چکا ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے تجربات کے لحاظ سے اس کا جواب دیتا ہے۔ کچھ لوگ ہماری کشمکش کو پوری طرح دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کچھ لوگوں کو دبا بھی دیتے ہیں، کچھ لوگ ہاں اور ناں کے درمیان رہتے ہوئے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے اور تیسرے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ہماری کشمکش کو بہترین راستہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے ہیں۔

والدین اپنے بچوں کو اگر ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے بچے کی کسی اور خوبی کی طرف غور ہی نہیں کرتے یوں بچوں کی اندر کی دنیا وہیں دب جاتی ہے مگر مرتی نہیں اور وہ اپنی کشمش کا دائیں بائیں اظہار کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں بعض دفعہ خطرناک حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے کیوں کہ لازمی نہیں کہ ان کا سننے والا ان کے ساتھ مخلص بھی ہو۔ یا پھر انہیں کوئی دوست، استاد یا ساتھ ایسا بھی مل سکتا ہے جو ان کی کشمکش کو درست موڑ دے دے اور وہ شروع ہی سے درست راہ کا انتخاب کر پائے۔

بچپن کی بات ہے جب میری شاعری کو شاعری بھی نہیں کہا جا سکتا ہے، جب میرے والد نے اس دیکھا تو کچھ خاص حوصلہ افزائی نہیں کی، فطری سی بات ہر کوئی بھی والد نہیں چاہے گا کہ اس کا بچہ اپنی تعلیم کو کمپرومائز کرے۔ شاید اسی وجہ سے آج تک شاعری میرا آخری شوق ہی رہی۔ مگر میں نے اس شوق کو کبھی مرنے نہیں دیا۔

شاعری میرے آخری شوق تک رہنے کے باوجود بھی مجھے بہت کچھ دے پائی، شاعری نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنی اندر کی دنیا کو مسخر کر سکوں اور اپنے احساسات کو باہر لا سکوں۔ شاعری نے مجھے وہ انسان بھی بنا دیا جو مجھے میرے تعلیمی ادارے کبھی نہیں بنا سکتے تھے۔ شاعری میرے اندر محبت سے بھرے ہوئے جذبات کو لے کر چلی جس کی وجہ سے میں اپنے تک آتی ہوئی ہر محبت کو محسوس کر سکا اور اسی احساس کے ساتھ اسے لوگوں تک واپس بھی پہنچا سکتا۔ شاید اسی سفر میں میں نے اپنے رب کی تلاش بھی کی انہیں جذبات سے قران کو بھی پڑھا اور اسی جذبات سے لوگوں کو بھی سمجھا۔ شاعری اگر میری ہمسفر نہ ہوتی تو شائید ایک ادھورا پن میرے اندر ضرور رہ جاتا۔

جب میں کسی نئے لکھنے والے سے ملتا ہوں یا بات کرتا ہوں، تو اسے کبھی نہیں روکتا کہ وہ اپنے شوق کو دبنے دے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں کہ وہ اپنے اندر کی دنیا کو باہر لانے کی کوشش ضرور کرے اور ساتھ یہ مشورہ بھی دیتا ہوں کہ باہر کی دنیا بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ اندر کی دنیا، شوق اس حد تک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے آپ کی تعلیمی، کاروباری، سماجی یا پھر نجی زندگی اثر انداز ہونے لگے۔ اندر اور باہر کی دنیا کا توازن بہت ضروری ہے کیوں کے توازن برقرار نہ رہے تو کچھ بھی برقرار نہیں رہتا۔

امید پر دنیا قائم ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہم نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب جیل سے سیاست دان مذید سیاسی ساکھ حاصل کرکے میدان میں آتے تھے اور بڑی واضع برتری کے ساتھ جیت کر پھر ایوانوں میں بیٹھ جاتے تھے۔

تمام بڑے سیاست دان وہی ہیں جنہوں نے جیلیں کاٹی ہیں اور اب وہی سب سیاست کی اعلی ڈگری لینے پھر سے جیل گئے ہیں۔

پی ٹی آئی سے پہلے بھی تو سیاست دانوں کو جیل جانے کے اعلی سطحی شوق تھے۔اور اگر یہ شوق دوبارہ پورے ہو رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔خدا کرے کہ عدالتیں سیاست دانوں کے شوق پورے کرنے کی بجائے احتساب کو یقینی بنائے

ایک طرف تو تبدیلی کا سورج ابھی طلوع ہی نہیں ہو رہا اور دوسری طرح موروثی سیاست کا سورج ڈوب چکا ہے۔اور معیشت پر اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہے۔امید ہے کہ یہ سیاہ رات کٹے گی امید تو اچھی ہی رکھنی چاہیئے۔

دیکھنا یہ بھی ہے کہ جب بے ایمانوں سے حساب مانگا جاتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ عوام صبر کرے

اور آج جب ایمان داروں سے حساب مانگا جاتا ہے تو وہ بھی کہتے ہیں صبر عوام بچاری صبر کرتی آئی ہے اور صبر کر رہی ہے اور صبر کے ساتھ امید بھی لگائے بیٹھی ہے کہ کاش تبدیلی کے وعدے پورے ہوں

پاکستان میں ڈالر نے بھی بڑی کرپشن کی ہے ہر دور میں بڑھ جاتا ہے چھوٹے قد والے چیف جسٹس صاحب ہوتے تو ایک دن میں سو پر سو کر دیتے۔خدا جانے کہ پہلے عوام کے ساتھ مذاق ہو رہا تھا یا کہ اب ہو رہا ہے۔

سیاست کے ایک طرف چالاکوں کی بستی ہے اور دوسری احمقوں کا گاؤں ہے۔

اسد عمر کو معیشت کا ارسطو بنا کر پیش کیا گیا، اور ایسے ایسے دعوے کیے گئے کہ زمین کو آسمان سے ہی ملا کر غلط ملط کر دیا گیا، اور پھر تبدیلی کا ایک سال پورا ہوتا ہے اور عوام پوری طرح سے دھڑام سے نیچے آ گرتے ہیں۔ اسد عمر جس کا چہرا نجات دھندہ کا نظر آتا تھا اس کے پیچھے سوائے نحوست کے کچھ نہیں نکلا۔ پی ٹی آئی کا پہلا سال برباد کرنے پر اسد عمر کو جیل میں ہونا چاہیئے تھا۔

الطاف، زرداری اور نواز شریف کو اس کے حواریوں نے کئی بار پھنسوایا، خان صاحب بھی اپنے ارد گرد ایسے ہی حواریوں سے محتاط رہیں۔ فواد چوھدری جیسا جاہل انسان اگر پی ٹی آئی عقل مندیاں بیان کرے گا تو پھر تبدیلی کا خدا ہی حافظ ہے۔

عوام کے ایک ہاتھ میں تھمزاپ ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں تھمز ڈاون، ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ بری کارکردگی پہ بھی تھمزاپ مل جائے۔

خان صاحب کو چاہیئے کہ اب نواز اور زرداری فوبیا سے خود بھی باہر آئیں اور اپنی جماعت کو بھی اس فوبیا سے باہر لائیں اور کام کریں۔

جب بندہ خود امتحان میں بیٹھا ہو تو اسے چاہیئے توجہ سے اپنا پیپر مکمل کرے بجائے اس کے کہ نالائق طلبہ کی ماسٹر کو شکایت کرتا رہے۔

میں پی ٹی آئی کی ہر فورم پر حمایت کرتا ہوں، مگر پی ٹی آئی کی حماقتوں کی ایک لسٹ بھی ہے جس کی حمایت گناہ سمجھتا ہوں۔

مانا کہ کہیں کوئی کرپشن نہیں ہوئی، مگر گاڑی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی ہے نہ ڈرائیور کو تنخواہ دی نہ پیٹرول ڈالا نہ ہی گاڑی کی مرمت کا خرچہ ہوا، مگر اب تو گاڑی چلنی چاہیئے۔

مانا کہ پی ٹی آئی خراب گاڑی کو ٹھیک کر رہی ہے پچھلے سال والا معاشی مکینک تو بھاگ گیا اب دوسرا معاشی مکینک اسے ٹھیک کرنے آیا ہے اللہ کرے اس بار گاڑی چل پڑے

پی ٹی آئی خود کو خطروں کی دلدل میں پھنسا ہونے کا تاثر دے رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اب پی ٹی آئی کو کسی سے بھی خطرہ نہیں، اور ان کی یہ معصومیت شاید زیادہ دیر ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اب تو سوال صرف اور صرف پی ٹی آئی کی کارکردگی کا ہی باقی ہے

یہ سال پی ٹی آئی کا کاؤنٹ ڈاؤن بھی ثابت ہو سکتا ہے، پچھلے سال کا خسارہ بھی باقی ہے اور اس سال کی کارکردگی بھی باقی ہے۔

ڈرائینگ روم ڈسکشن اور پرائمنسٹر سپیچ میں بہت فرق ہوتا ہے، غلط الفاظ نکالنے سے بہتر ہے پرچی رکھ لی جائے کیا مدینہ کی نئی ریاست میں یہ عمل شرعی طور پر جائز نہیں وہ سب جائز ہے جس سے پاکستان کی بہتری ہو

ڈالر ایک سو ساٹھ روپے سے بھی زیادہ ہو گیا، بڑی عید تک 180 کا بھی ہو سکتا ہے خان صاحب آپ کی مہربانی ڈبل سینچری نہ کرنا۔ عوام کو آپ کی وجہ سے بڑا شعور آ چکا ہے یہی شعور آپ کے وزیروں کے گلے کی گھنٹی نہ بن جائے۔

جس امید پر دنیا قائم ہے، اسی پر پی ٹی آئی قائم ہے۔ اور اسی امید پر ہم پی ٹی آئی سے بہتر کارکردگی کی امید کرتے ہیں۔ اللہ پاکستان کے حق میں بہتری کرے آمین۔

مشینوں کا انسانوں پر قبضہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

اگر دیکھا جائے تو آج کا انسان ایک طرح سے پہلے ہی مشینوں کے قبضے میں ہے۔ اور ٹیکنالوجی سے محبت کرنے والے، نہ صرف اپنی دلچسپی بلکہ ٹیکنالوجی سے اپنی والہانہ محبت میں مشینوں کے یہ قبضہ فراہم کر چکے ہے۔ اور نہ صرف قبضہ فراہم کر چکے ہیں بلکہ نظر رکھے ہوئے ہیں کہ ٹیکنالوجی ان سے مذید اختیار مانگے اور وہ اپنا اختیار دیتے ہی چلے جائیں۔

ٹیکنالوجی کا ایک چہرہ بڑا روشن ہے، جس کے ذریعے ہمیں جدید ترین سہولیات سے مذین کیا جاتا ہے۔ پہلے انسان کے بہت سی چیزوں کو خودکار کیا، مگر انسان کو کم سے کم خود اُٹھ کر بٹن دبانا پڑتا تھا اور کام ہونے لگتے تھے۔ اس کے بعد ٹیکنالوجی نے مزید ترقی کی اور اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول آ گیا، تو وہ جو بھی کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اسے بس ریموٹ اٹھانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

پھر انسان نے مزید ترقی کی اور اس کے پاس پروگرام ایبل مشینیں آ گئیں، بس مشین کو سیٹ کرنا پڑتا ہے اور مشین خود کام کرنے لگتی ہے، بس ایک چیز کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ، بجلی نہ جائے یا بیٹری کی پاور ختم نہ ہو اور تیسرا انٹرنیٹ کا لنک ڈاؤن نہ ہو۔ پھر انسان نے مذید ترقی کی، پاور کے بیک اپ، آ گئے، انٹرنیٹ کے متبادل لنکس اور بہتر لنکس آ گئے اور بیٹریز پیکس اور پاور بنکس نے بھی پانی جگہ بنالی۔

پھر دو چیزیں اور ہوئیں، ایک تو روبوٹیکس نے اپنی جگہ بنانا شروع کی، یعنی خوکار چلنے والی مشینیں، روبوٹیک آرمز یا پھر پورے پورے روبوٹس۔ اور اسی طرح سے آواز یا پھر اشاروں سے چلنے والے سسٹم بھی ایجاد ہے گئے، ہزار طرح کے سینسرز نے جگہ بنانا شروع کی، ایسے سینسر جو فنگر تھم، فیس مگ، بول چال، نقل حرکت اور اشارے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ صرف اس مشین کے آپریٹ کرنے والے کے اپنے اشارے بھی۔

سے زائید دنیا کی امیر ترین کمپنیاں، اپنی ہزاروں قسم کی مصنوعات تیار کر کے بیٹھی ہیں، ان کے لیب میں تمام تجربات بھی مکمل ہیں اور 100 ان کی سیلی کان ویلیز ان تمام مصنوعات کے گذشتہ 20 سالوں سے استعمال بھی کر رہی ہیں اور دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں یہ تحقیق بھی ہو چکی ہے کہ یہ مصنوعات کس طرح سے انسان کی زندگی کو یکسر بدل دیں گے اور ان مصنوعات سے مثبت اور منفی کس کس طرح سے اثرات ظاہر ہوں گے اور دینا کا معاشی نظام کس طرح سے تبدیل ہوگا۔

جب کمپیوٹر انسان کی زندگی میں شامل ہوا تو اس نے انسان کی زندگی کے ہر پہلو کو بدل کر رکھ دیا، سکولوں، گھروں، دفتروں فیکٹریوں، دوکانوں ہسپتالوں، سرکاری اور پرائیویٹ اور سوشل سیکٹر شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو ہو جس پر کمپیوٹر اثر انداز نہ ہوا ہو۔ بڑے شہروں سے لے کر دور دراز کے چھوٹے چھوٹے گھروں اور یہاں تک کہ گھروں کے ایک ایک کمرے میں کمپیوٹر اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔

پھر اس کے بعد موبائل نے اپنی جگہ بنائی اور بناتا ہی چلا گیا، اور بہت جلد ہم نے دیکھا کہ شاید ہی دنیا میں کوئی ہاتھ بچا ہو جس کے ہاتھ میں موبائل نہیں ہے، کیا بچے، کیا بوڑھے اور کیا نوجوان، موبائل ہاتھ میں نہیں تو کچھ بھی نہیں، اور اگر سال میں ایک یا دو بار موبائل بدلا نہ جائے تو بھی زندگی کا مزا جاتا رہتا ہے۔

کمپیوٹر کیا انڈسٹری بہت بڑی تھی، مگر موبائل کی انڈسٹری نہ صرف کمپیوٹر کی انٹرسٹری سے بہت بڑی تھی، بلکہ اس سے زیادہ منافع بخش بھی تھی اور اس سے زیادہ تیز بھی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے 1 جی سے 5 جی کچھ ہی سالوں میں ہمارے سامنے ہے۔

آگے آنے والا دور اس سے بھی زیادہ تیز ہے، آج کا نوجوان ہر وقت موبائل میں گھسا ہوا ہے، اور آگے آنے والے نوجوان انسانوں سے زیادہ موبائل اور اس کے لنک ہوئی چیزوں سے باتیں کر رہے ہوں گے۔ آنے والے نوجوانوں کے ہاتھ میں موبائل نہیں بلکہ موبائل سسٹم ہوگا جس سے وہ براہ راست باتیں کرتے ہوئے سوئیں گے اور باتیں کرتے ہوئے اٹھیں گے۔ اور یہ سب ہمارے سامنے ہونے جا رہا ہے اور بہت جلد ہونے جا رہا ہے اور کسی حد تک تو ہو بھی چکا ہے۔

باتیں کرنے والی کاروں کے آنے سے پہلے باتیں کرنے والے کھلونے مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ کچھ کھلونے موبائل سے بھی آپریٹ ہوتے ہیں۔ اور موبائل سے ہم پہلے سے ہی بات کرنے کی سہولت رکھتے ہیں، کچھ لوگ اسے استعمال کرتے ہیں اور کچھ اسے استعمال نہیں کرتے، مگر اب یہ عین ممکن ہے کہ ہم اپنے گھر میں موجود تمام برقی چیزوں سے براہ راست بات کر سکیں اور انہیں اپنے موڈ اور مزاج کے مطابق پروگرام کر سکیں۔ تو کچھ اس طرح کی زندگی ہمارے سامنے رونما ہونے کے لیے تیار ہے۔

ایک طرف ہم پر مشینیں آدھا قابو تو پا چکی ہیں اور باقی کا آدھا قابو ہم پر بہت جلد پا لیں گی، مگر یہ وہ قابو ہے جو ہم مشینوں کو اس لیے دیں گے تاکہ وہ ہمیں روزمرہ کی سہولیات فراہم کر سکیں اور ہماری زندگی پہلے سے زیادہ سہولیات سے آراستہ ہو سکے۔

دوسری طرف حکومتیں بھی ہمیں انہیں مشینوں سے قابو کر رہی ہیں حکومت کے پاس ہمارے فنگر تھم اور فیس ٹیمپلیٹ پہلے سے ہی موجود ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں کسی بھی پبلک پلیس یا ملک سے باہر آتے جاتے باآسانی شناخت کیا جا سکتے ہے، اور اس طرح ملین آف ملین فیس

ٹیمپلیٹس اور بائیو آئی ڈیز مشینوں کے پاس پہلے سے ہی موجود ہیں جنہیں حکومتیں اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی صرف ایک شخص کی بائیو آئی ڈی سے اس کے پورخاندان اور پورے شہر کے ریکارڈ کا آپس میں موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

تیسری طرف ہم یہ ڈیٹا پرائیویٹ کمپنیوں کو بھی دے چکے ہیں جیسے موبائل کمپنیاں اور بنکس اور اسی طرح کی دیگر خدمات فراہم کرنے والی کمپنیاں اور موبائل میں موجود بائیو آئی ڈی ان ایبل ایپس۔

چوتھی طرف مشینوں کو انسان کی سیکیورٹی اور سیفٹی کے لیے بھی تیار کیا جارہا ہے، سی سی ٹی وی پہلے سے گھروں، دفتروں اور گاڑیوں میں نصب ہو چکے ہیں۔ چین نے انہیں کیمروں کی کپیسٹی کو بڑھایا تو پورے کے پورے شہر کے ہر ایک بندے کی نقل و حرکت کو دیکھا جاتا رہا۔ اور اسی طرح سے کہیں بھی یہ کام باآسانی کیا جاسکتا ہے کیوں کہ بائیو آئیڈیز تو پہلے سے ہی حکومت اور ایجنسیوں کے پاس محفوظ ہیں۔

پانچویں طرف، ایسی مشینیں تیار کی جارہی ہیں جو کہ خودکار ہیں، یعنی پبلک ڈرون اناؤنسمنٹ سسٹم کے ذریعے لوگوں کے وارننگ دینا، گیٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعے لوگوں کو روکنا اور ریلیز کرنا، یہ بھی چین میں ابھی ابھی تجرباتی طور پر استعمال ہو چکا ہے۔ یعنی پبلک وارننگ سسٹم پہلے سے تیار ہے۔ خودکار سپرے ڈرونز اور خودکار سپرے مشینز اور اور خودکار کار گو سرویز بھی چین کے شہر وہان میں استعمال ہو چکی ہے۔ یہ تو خیر ایمرجینسی میں ایپڈیکس کے لیے استعمال ہوئی اور وہ بھی تجرباتی طور پر۔

خودکار روبوٹس، خودکار ڈرونز، خودکار گاڑیاں نہ صرف پبلک کو کنٹرول کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ انہیں جنگی حالات میں خودکار ہتھیاروں کے طور پر بھی تیار کیا جاسکتا ہے، یعنی مارکیٹس میں ایسے کیمرے لگ سکتے ہیں جن میں گن نصب ہو، اور خودکار ڈرونز اور خودکار گاڑیوں کو بھی خودکار ہتھیاروں سے لیس کیا جاچکا ہے۔ خودکار گاڑیاں 500 کلومیٹر شہر سے باہر اور 130 کلومیٹر شہر کے اندر خودکار طریقے سے چلائی جاچکی ہیں۔

ایک طرف خودکار کیریرز ہیں، دوسری طرف خودکار ہتھیار ہیں اور تیسری طرف انسانوں کی بائیو آئیڈیز ہیں، اور چوتھی طرف ان کا سیٹلائٹ اور 5 جی نیٹورک کے ساتھ لنک ہے۔ یہ ایک مکمل خودکار وپین سسٹم ہے جو نہ صرف بارڈر ٹو بارڈر فوجیوں کے درمیاں استعمال ہو سکتا ہے بلکہ شہروں اور دیہاتوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے، اور اسے جنگلوں، سمندروں اور دریاؤں تک بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے روبوٹ تو پہلے سے ہی تیار ہو چکے ہیں جو پانی، ہوا، ریگستان، اور جنگلوں میں چلنے پھرنے، تیرنے اور اُڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مشین ہمیں تین طرح سے کنٹرول کرتی جارہی ہے، ایک سہولیات کے نام پر، اور دوسرا سیکیورٹی کے نام پر اور تیسرا معاشی ترقی کے نام پر۔

اللہ تعالی نے انسان کو جو دماغ دیا ہے اس کی ایک خاصیت ہے کہ وہ آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اور یہ دوڑ انسان کو آج یہاں تک لا چکی ہے، انسان کے آگے کہاں تک اور کتنا جانا ہے یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے۔ مگر ایک بات طے ہے، زندگی رہے گی، تو پہلے جیسی کبھی نہیں رہے گی۔ ہر دور پہلے دور سے بہت مختلف ہو کر سامنے آتا ہے، اور دنیا یہ تبدیلیاں پہلی دفعہ نہیں دیکھ رہی۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس

تحریر: میاں وقار الاسلام

آپ نے ہزاروں سال پرانی ہمزاد کی کہانیاں تو سنی ہوں گی، جس میں یہ کہا جاتا تھا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک ہمزاد پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ کچھ انسان اچھی خاصی ریاضت کے بعد اسے اپنے بس میں کر لیتے ہیں اور پھر اس سے اپنے جائز اور ناجائز کام کرواتے ہیں، اور پھر یہ بھی کہ جب انسان بوڑھا ہونے لگتا ہے تو اس کا ہمزاد ایک نیا جسم تلاش کرتا ہے اور پھر اس میں گھس جاتا ہے اور اس طرح وہ ہزاروں سال زندہ رہتا ہے۔ بچپن میں ایسی کچھ کہانیاں میں نے بھی پڑھی تھیں تو تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان شروع سے ہی اپنی پاورز منتقل کرنے کا خواہش مند رہا ہے، یا پھر دوسروں کی طاقت کو اپنے قابو میں کرنے کا خواہش مند رہا ہے جیسے جنوں کو قابو کرنا یا پھر جادو کا سہارا لینا۔ ہم سب نے ان سارے معاملات پر کچھ نہ کچھ پڑھ رکھا ہے اور مختلف کہانیاں سن رکھی ہیں۔ آج بھی کالا جادو اور پتا نہیں کیا کیا ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے، شاید یہ بھی اسی خواہش کی کوئی تسکین ہے۔

اب دوسری طرف آتے ہیں سائنسی تحقیق، انسان نے شروع شروع میں مکینکل مشینری بنائی تو اپنے بہت سے کام اس مشین سے لینا شروع کیے یہاں تک کہ میتھی میٹیکل اور لاجیکل پراسس بھی اس نے مشین کے ذریعے مکمل کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی اور پھر یہ مکینکل سے ڈیجیٹل دنیا میں آ گیا۔ شروع شروع کی ڈیجیٹل دنیا پراسسنگ اور سٹوریج کے حوالے سے بہت محدود تھی مگر انسان کرنا وہی چاہتا تھا جو وہ آج کرنا چاہتا ہے۔

میں باقاعدہ آرٹیفشل انٹیلی جینس کا پہلا پروگرام لکھا گیا جس کے ذریعے کمپیوٹر شطرنج کی بازی کھیل سکتا تھا۔ مگر ایک تو یہ سسٹم کافی 1951 سست تھا پھر یہ جو انسٹرکشنز لے سکتا تھا وہ بہت کم تھیں، 1980 میں جو کمپیوٹر ایجاد کیا گیا وہ 1951 کے کمپیوٹر سے 10 ملین ٹائمز زیادہ تیز تھا اور وقت کے ساتھ اس کی کپیسٹی بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ پھر ٹیلی کمیونیکیشن اور انٹرنیٹ نے انسان کے بہت سے خواب شرمندہ تعبیر کر دیے اور 20 سال سے کم عرصے میں آرٹیفشل انٹیلی جینس اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کی شاید 20 سے زیادہ تمام بڑی کمپنیاں اور دنیا کے تمام امیر ترین شخصیات نے اپنا پیسہ آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر میں ڈال دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل کر رہ گئی۔

سال 2000 سے ہی ہم آرٹیفشل انٹیلی جینس کی دنیا میں رہتے ہیں اور پچھلے 20 سال سے درجنوں کمپنیاں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہیں، ہم کمپیوٹر پر جو سافٹ ویئرز استعمال کرتے ہیں یا جو ہارڈ ویئر پلیٹ فارم استعمال کرتے ہیں، یا پھر جو موبائل استعمال

کرتے ہیں ان سب کے ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر مکمل طور پر آرٹیفشل انٹیلی جینس کی ایک بڑی دنیا سے جڑے ہوئے ہیں۔ اور پچھے 20 سال سے آرٹیفشل انٹیلی جینس ڈیٹا سینٹرز ہماری حرکات اور سکنات کو پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف ہیں۔

سال پہلے یہ ٹیکنالوجی آچکی تھی کہ آپ اپنے موبائل سے اپنے گھر کی تمام چیزیں اور اپنی دور دراز آفس کی تمام برقی چیزیں آن یا آف کر 20 سکیں یا پھر انہیں پروگرام کر سکیں۔ ڈیجیٹل سوئچنگ کا کنسیپٹ نیا نہیں ہے۔ اسی طرح مینو فیکچرنگ سیکٹر میں آٹومیشن کا کنسپٹ بھی نیا نہیں ہے یہ سب کچھ ہم 20 سال پہلے کر چکے ہیں اور اس طرح کی سائنس کو اس وقت کے بچے بھی سمجھ چکے تھے۔ مگر اس سب کو عام کرنے میں ایک رکاوٹ تھی انٹرنٹ کی سپیڈ اور اس طرح کے آلات کی لاگت جس وجہ سے کہ عام عوام تک تو نہیں پہنچا مگر بہت سے بڑے دفاتر یا فیکٹریاں اسے پہلے سے ہی اچھی طرح استعمال کر رہی ہیں۔

ڈیجٹل آئی کا کنسپٹ بھی نیا نہیں ہے 20 سال پہلے سنائپر گنز کے ذریعے آر ایف آئی ڈی چیپ جو کہ کو ٹیڈ ہوتی تھی جس سے دشمن کو یہ احساس ہی نہ ہو کہ اس کے جس میں کوئی چیپ داخل ہوئی ہے اور وہ مچھر کے کاٹنے جیسی تکلیف سمجھ کر اسے بھول جائے اور پھر اس کی ٹریکنگ کی جا سکے، اس طرح کے تمام ٹرائل بھی کب کے ہو چکے۔

سال پہلے ہی کچھ کمپنیاں انگریزی سپیکنگ کے سافٹ ویئر بنا چکی تھیں اور اس طرح کے سافٹ ویئرز بھی بن چکے تھے جو انسان کی آواز کو 20 سنیں اور اس پر رسپانس کریں۔ یہ انڈسٹری 20 سال پہلے ہی اپنے انویسٹرز کو اپنی طرف مدعو کر چکی ہے اور اس سیکٹرز میں اچھی خاصی سرمایا کاری بھی ہو چکی ہے اور اسی وجہ سے یہ کمپنیاں اپنے عروج پر ہیں۔

اوکے گوگل، بیکسپی، الیکسا، سیری ان تمام ناموں سے آپ واقف ہوں گے، ان میں سے اکثر ایپلیکیشن 35 سے زیادہ زبانوں میں اپنے آپ کو اپ ڈیٹ کر چکی ہیں اور نہ صرف انسانی زبانوں کی سیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں بلکہ انسان کے موڈ کو سمجھے کی بھی کوشش کر رہی ہیں کے ہم نارمل، یا پھر غصے میں یا پھر پیار میں کس طرح سے بات کرتے ہیں اور ہمیں کیا پسند ہے اور کیا نہیں پسند اور جانے کیا کیا۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس کا اگلا دور وائس کا ہے جس کے بعد آپ اپنے گھر کی ہر چیز سے بات کر سکیں گے، جیسے گھر کے افراد کے نام ہوتے ہیں اسی طرح گھر کی ہر چیز کے نام ہوں گے اور آپ ہر چیز کو اس کے یونیک نام سے بلائیں گے اور پھر اسے ہدایت دیں گے اور اس کے بعد ہر چیز آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرے گی۔

ذرا سوچیں کہ آپ کے موڈ کے مطابق گھر کی سیٹنگ ہو جائے، یعنی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو جائیں یا کھل جائیں، میوزک لگ جائے، لائٹس کم زیادہ ہو جائیں، اے سی، ہیٹر یا پنکھوں کی رفتار آپ کے مزاج کے مطابق ہو جائے، اور آپ کمرے سے باہر جائیں تو ہر چیز خود بخود آف ہو جائے۔ آج سائنس کے لیے یہ تمام باتیں انتہائی معمولی ہیں۔ اور لیبز میں کمپنیاں اس سب سے کہیں زیادہ ایجاد کر چکی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق آرٹیفشل انٹیلی جینس کی ایک ایک فیلڈ 3 سے 4 ٹریلین ڈالرز کا مارکیٹ سکوپ رکھتی ہے۔ اور وہ بھی 3 سے 5 سالوں میں۔

ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں آرٹیفشل انٹیلی جینس کی زیادہ تر کمپنیاں امریکہ میں ہیں اور دوسرے نمبر پر چین ہے اور تیسرے نمبر پر یورپ ہے۔ آرٹیفشل انٹیلی جینس مارکیٹ شیئر کے مطابق امریکہ 40 فیصد کے قریب ہے جب کہ چین 32 فیصد پر ہے اور یورپ تقریبا 22 فیصد پر ہے۔ 2019 کے مطابق چین نے 35 بزنئ کمپنیاں خریدی ہیں اور امریکہ نے 27 فیصد نئ کمپنیاں خریدی ہیں جن کا تعلق آرٹیفشل انٹیلی جینس سے ہے اسی طرح 2019 میں امریکہ کی نسبت چین میں آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر میں کہیں زیادہ سرمایاکاری ہوئی ہے۔

چین کچھ وجوہات کی وجہ سے ایک بہتر مارکیٹ سمجھا جاتا ہے، ایک تو چین میں ہنر مند افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کی کاسٹ بھی دنیا کے باقی افراد کی نسبت ایک تہائی ہے، دوسری وجہ ہے وہاں پر پاور اینڈ انرجی جو دنیا کے کسی بھی ملک سے بہت سستی ہے اور تیسری وجہ ہے وہاں پر ایک مضبوط حکومت جس کے پیچھے عوام پوری طرح سے کھڑی ہے۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کی تمام بڑی کمپنیوں کے ایسٹ 20 بلین سے شروع ہو کر سینکڑوں بلینز تک ہیں اور ان تمام کمپنیوں کے نام آپ نے سن رکھے ہوں گے جیسے ایپل، ہواوے، مائکروسافٹ، سامسنگ، گوگل وغیرہ۔ امریکہ کی کئ کمپنیاں بہت پہلے سے ہی چین میں بین ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کی بڑی کمپنیاں ہیں اور دوسری طرف درجنوں چین کی آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کی کمپنیاں امریکہ میں بھی بین ہیں جین میں موبائل، ٹیلی کام، سرویلینس، سافٹوئیر، آن لائن سوشل میڈیا ایپس وغیرہ شامل ہیں۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس سیکٹر کا معاملہ 20 سالہ جدوجہد کے بعد ایک فیصلہ کن مراحلے میں شامل ہو چکا ہے اور جو جیتا وہی سکندر۔

کرونا، جہاں تک سائنس کہتی ہے ایک قدرتی وبا ہے اور اس کی کسی لیب سے لیک ہونا ابھی تک ثابت نہیں ہوا مگر اسی امتحان سے اس بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ کون کتنا تیار ہے اور اسی کے پس پردہ جہاں بڑی بڑی کمپنیوں کو بہت نقصان ہوگا وہی بہت سے کمپنیاں اس تیاری میں بھی ہیں کہ اگلی حکمرانی کن کے پاس ہو گی۔

آرٹیفشل انٹیلی جینس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کے استعمال سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے، ہماری نوجوان نسل، بیوروکریسی، حکومت، آرمی اور خفیہ اداروں کو چاہیے کہ اس سیکٹر میں اپنا کردار ادا کریں۔ جو لوگ آرٹیفشل انٹیلی جینس کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے انہیں اگلا دور قبول نہیں کرے گا۔ ہمارے پڑھنے اور لکھنے والے نوجوانوں کو چاہیے کہ نہ خود ڈریں اور نہ کسی اور کو ڈرائیں، بلکہ قدم بڑھائیں اور اس آنے والے دور میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

جو لوگ آئی ٹی کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انہیں آئی ٹی سیکٹر نے گذشتہ 20 سالوں میں کہاں سے کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ اگلا دور ان کے لیے جیٹ پیک کا کردار ادا کرے گا۔ جو جتنی تیزی سے اس میدان میں آگے آئے گا مستقبل اسی کا ہے۔

ڈیجیٹل پاکستان حکومت کا ایک اچھا قدم ہے حکومت کو اس طرح کے بہت سے اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے، جن ملکوں میں 5 جی پہلے جائے گی وہ بہت تیزی سے آگے نکل جائیں گے، کہتے ہیں جو ڈر گیا وہ مر گیا، شاید اسی لیے ڈرایا جا رہا ہے کہ جو ڈرتے ہیں وہ اس دوڑ سے پیچھے ہٹ جائیں۔ کیوں کہ اگلا دور ڈرنے والوں کا بالکل بھی نہیں ہے۔

پاکستان میں جن کمپنیوں نے ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا ہے، آج لوگ صرف انہیں کو جانتے ہیں، کیوں کہ یہی وقت سے ہم آہنگ ہیں۔ آرٹیفشل انٹیلی جینس تقریباً ہر شعبے میں انقلاب برپا کر دے گی۔ آج کیا آپ سوچ سکتے ہیں ایک چھوٹا سا کاروبار بھی بغیر کمپیوٹر، موبائل اور انٹرنیٹ کے چل سکتا ہے۔ ہرگز نہیں تو پھر بڑے بڑے کاروبار کیسے ہوں گے۔ جو ٹیکنالوجی کی رفتار سے نہیں چلے گا وہ کبھی منزل تک نہیں پہنچے گا۔ آگے بڑھنا ہے تو پھر آگے صرف آرٹیفشل انٹیلی جینس ہی ہے۔

اللہ تعالی ہمارے علم میں اضافہ کرے، کاش حکومت ہمارے آئی ٹی سیکٹر کی سرپرستی کرے اور دنیا کی 100 فیوچر سٹک کمپنیوں میں ایک پاکستان کی کمپنی بھی ہو۔ آپ کی معلومات کے لیے آخری بات عرض کرتا چلوں کہ چین کے ایک کمپنی ہے علی بابا، آپ کو معلوم ہے یہ صرف ایک کمپنی کتنا کماتی ہے، پاکستان بنگلہ دیش اور انڈیا کی کل کمائی سے بھی زیادہ کماتی ہے۔ اپنے آپ سے سوال کریں، ہمیں ڈرنا ہے یا بڑھنا ہے۔

دوستیوں کا جھرمٹ یا تنہائیوں کا جنگل

تحریر: میاں وقار الاسلام

سوشل میڈیا ایک طرف جہاں تک دوستوں کا جھرمٹ ہے وہیں پر دوسری طرف تنہائیوں کا جنگل بھی ہے۔

جہاں تک سوشل میڈیا میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملوا سکتا ہے وہیں سوشل میڈیا یہ بھی طاقت رکھتا ہے کہ ایک ہی گھر میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتا ہے۔

شاید سوشل میڈیا بھی کرونا وائرس کی طرح کام کرتا ہے، سوشل میڈیا سے بیمار تو ایک فیصد لوگ ہوتے ہیں مگر متاثر شاید ننانوے فیصد لوگ بھی ہو جاتے ہیں۔

شاید سوشل میڈیا پر ہمارے ہزاروں جڑے ہوئے لوگوں میں سے ہم صرف ایک فیصد سے بھی کم لوگوں کو حقیقت میں جانتے ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید ہم سوشل میڈیا پر ایسے لوگوں کو پکار رہے ہوتے ہیں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں نقصان دے رہے ہوتے ہیں۔ مگر پس پردہ ہماری زندگیاں گزر جاتی ہیں۔

مجھے پڑھو، مجھے لائک کرو اور مجھے شئیر کرو

ہر شخص اپنی ذات کا پجاری ہے، ہر کوئی اپنے بارے میں عمدہ سے عمدہ بات لکھے گا، جو لوگ اسے جانتے نہیں وہ اس کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھیں گے، اسے پڑھیں گے بھی، اسے لائک بھی کریں گے اور اسے شئیر بھی کریں گے۔

صرف اچھے مواد کی وجہ سے ہزاروں لوگ اسے فالو بھی کریں گے، مگر لوگ اس بات سے ہر گز واقف نہیں ہوں گے کہ کیا انہوں نے ایک فرشتے کو لائک کیا ہے یا کہ ایک شیطان کو پروموٹ کر رہے ہیں۔

سوشل میڈیا جہاں تک اچھے قلم کاروں کی جنت ہے، وہیں سوشل میڈیا ایک دھکتی ہوئی اگ بھی ہے جس کا ایندھن جھوٹ ہے اور ایندھن بھی اتنا تیز کہ لاتعداد سچائیوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

یہ جھوٹا ہے، یہ جاسوس ہے، یہ مکار ہے، یہ فراڈ ہے

سوشل میڈیا پر جہاں تک علم اور آگہی کی بات کی جاتی ہے، وہیں بے بنیاد خبریں، جھوٹے الزامات، اور جاسوسیاں اور فراڈ بھی کئے جاتے ہیں اور لوگوں کو بلیک میل کرنے کے نئے نئے طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں۔ 10 میں سے 9 رجسٹرڈ این جی اوز اور فلاحی ادارے فراڈ ہیں اور جو رجسٹرڈ نہیں وہ تو سیدھے سیدھے سوشل میڈیا پر آجاتے ہیں۔

پی ایم کا سیکٹری، یا آئی ایس آئی کے ہیڈ کا پی اے

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، جب جھوٹ بولنا ہو تو آپ سیدھے آسمان میں پرواز بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کو اگر پی ایم کے سیکٹری کا فون آجائے یا کسی آئی ایس آئی کے ہیڈ کا پی اے کال کرے یا پھر سٹیٹ بنک والے آپ سے آپ کی ذاتی تفصیلات مانگیں تو نہ ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی چوڑے ہونے کی ضرورت ہے کیوں کے اس سب کے پیچھے کوئی جیب کترا، کوئی فراڈیا، کوئی شیدا ٹلی، کوئی میدا کبھار کوئی بھی کن ٹٹا ہو سکتا ہے کیوں کہ محکموں کے سکوپ آف ورک میں اس طرح کی چیزیں بالکل بھی نہیں آتیں، اس طرح کی اور اس سے ملتی جلتی تمام چیزیں گھٹیا نسل کے چار سو بیسیوں کے ذہن میں ہی آسکتی ہیں۔

کیا ہم لاعلم ہیں، کیا ہمیں شعور ہے، ہم کیا جانتے ہیں

جب امریکہ میں سوشل میڈیا نیا نیا شروع ہوا، تو وہاں بہت سے مضامین لکھے گئے جن کا مقصد تھا بڑے اور بزرگوں کو ٹیکنالوجی سے آگاہ کرنا، سب سے پہلے انہیں سوشل میڈیا پڑھایا گیا، تاکہ وہ اپنے نیچے جوان ہوتی نسل کے مسائل سن سکیں انہیں سمجھ سکیں اور ان کی بہتر نشو نما کر

سکیں، مگر پاکستان میں یا پاکستان جیسے چھوٹے ملکوں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ جہاں ہمارے بڑے اور بزرگ ٹیکنالوجی سے ناواقف رہے وہیں ہمارے بچے ان کے بھی باپ نکلے اور ٹیکنالوجی میں بہت آگے نکل گئے۔ اور جو ٹیکنالوجی میں آگے نکل گئے وہ اب ادھیڑ عمر کو پہنچ گئے ہیں جن کی نگرانی نہیں کی گئی تھی۔ اب ایک طرف یہ ایکسپرٹ ہیں اور دوسری طرف ان سے بھی ایکسپرٹ ان کے بچے، یعنی اب ٹکر کا مقابلہ ہے۔

ٹیک ٹاک، لائیکی، بینگو

سوشل میڈیا تو اب پرانی بات ہو گئی ہے، ادھیڑ عمر کے لوگ ہی ابھی سوشل میڈیا پر زیادہ ہوتے ہیں، آج کے بچے جوان کے بھی باپ ہیں ان کے لیے ایک نئی سونامی آئی ہے اور وہ ہے، ٹیک ٹاک، لائیکی، بینگو جن کے ہاتھوں میں ہماری نئی نسل جوان ہو رہی ہے۔ گلو حلوائی سے لے کر ریشماں تندور والی تک سب کے سب جنٹل یگ بوائے اور جنٹل ینگ گرلز بن چکے ہیں اور غضب کی بات تو یہ نہ بوائے کا پتہ چلتا ہے کہ گرل ہے اور نہ گرل کا پتہ چلتا ہے کہ بوائے ہے، پریشان کر کے رکھ دیا ہے اس عجیب و غریب نسل نے۔

آشنائی سے ناآشنائی تک

وہ دونوں ہی ناآشنا تھے، پھر سوشل میڈیا کے ذریعے دونوں کی آشنائی ہوئی، خوب باتیں ہوتی رہیں پھر ایک آشنا نے دوسرے آشنا سے متاثر ہو کر تھوڑی سی مدد مانگ لی، اس کے بعد آج تک دونوں کی بات نہیں ہوئی، ایک ریما 100 روپے کے ایزی لوڈ والی نکلی اور دوسرا کالو کے ہوٹل پر ٹاکی لگاتا تھا۔

عجیب محبتوں کی عجیب کہانیاں

منٹ کی دوستی اور 30 منٹ کی محبت اور عمر بھر کی لاتعلّقی۔ عجیب محبتیں ہیں اور عجیب کہانیاں ہیں۔ جذبات نے عجیب پیراہن پہن لیے 15 ہیں۔ کسی کو متاثر کرنے کے لیے صبح صبح میک اپ کرنا تو دور کی بات منہ بھی نہیں دھونا پڑتا۔ مہنگے لباس والی کسی غیر معروف رقاصہ کی تصویر بھی چلے گی، اور دوسری طرف کسی پڑھے لکھے انسان کے 4 یا 5 عمدہ قسم کے سٹیٹس کاپی کرنے پڑیں گے یا پھر کوئی ٹائی والی فوٹو، یا پھر پارکنگ میں کھڑی ہوئی کسی مہنگی کار کے ساتھ ایک عدد سیلفی، چاہے ہیرو خود سائیکل یا پھر رکشہ پر ہی کیوں نا آیا ہو۔ تب تک محبت رہے گی جب تک کچھ مانگ نہ لیا جائے یا تب تک سچی محبت رہے گی جب تک اصلیت سامنے نہیں آتی۔ خوبصورت اور جذب بھری سچی باتیں، جن پر

کبھی انسان کو اتنا یقین آ جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر مر مٹنے کو بھی تیار ہو جاتا تھا، اس طرح کی باتیں اب سوشل میڈیا پر ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہر شخص اپنے آپ کو دھوکا دے گا

ہم سب جانتے ہیں، کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری جو تعریف کی جاتی ہے وہ اکثر اور بیشتر مفت والا مکھن ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں جو ہم دوسروں کی تعریف کرتے ہیں اس میں بھی قوی امکان یہی ہوتا ہے کہ واپس ہمیں بھی اسی طرح کی تعریف مل جائے گی۔ تعریف بھی ایک نشہ ہے یہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہم دوسروں کی تعریف کئے جاتے ہیں اور دوسرے ہماری تعریف کئے جاتے ہیں، ہم بھی خوش اور دوسرے بھی خوش، کوئی ہمیں الو بنا رہا ہے اور ہم کسی کو الو بنا رہے ہیں اور سارے الو راتوں کو دیر تک جاگتے ہیں۔

بیچ کا راستہ اختیار کریں، فلاح کا راستہ اختیار کریں

میں یہ نہیں کہتا کہ سوشل میڈیا استعمال نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اب شاید اس کے بغیر ہمارا گزارا بھی نہیں۔ مگر زیادتی ہر چیز کی تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ سوشل میڈیا سے اس حد تک جڑ جانا کہ آپ کا تنہائیوں کے جنگل میں الوؤں کی طرح بسیرا ہو اور آپ خود کو وہاں کا شیر یعنی ایسے جنگل کا بادشاہ ہی سمجھنے لگ جائیں یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔ اگر آپ نے سوشل میڈیا پر ایک ایسی راہ اپنا لی جس سے آپ کی ملازمت تباہ ہو جائے، آپ کا کاروبار تباہ ہو جائے، آپ کی دکان داری چلی جائے، یا پھر آپ کے ذاتی تعلقات خراب ہوں، اصلی دوست یار بچھڑ جائیں، بیوی گھر سے چلی جائے، بچے در بدر ہو جائیں، ماں باپ کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو تو یہ بربادی کا سامان ہے۔

اگر آپ ایک اچھے انسان ہیں

اگر آپ ایک اچھے انسان ہیں اور معاشرے میں اچھائی چاہتے ہیں تو اپنا حصہ ڈالیں، علم اور آگہی کے لیے کام کریں، ٹیچر ہیں تو اپنے طلبہ کو سوشل میڈیا کے ذریعے پڑھائیں، کاروبار کر رہے ہیں تو سوشل میڈیا سے اپنے کاروبار کو بڑھائیں، ملازمت کر رہے ہیں تو اپنی کمپنی کو فائدہ دیں اور اپنے کیریئر کو مضبوط کریں، طالب علم ہیں تو اپنے علم میں اضافہ کریں۔ نہ جھوٹ بولیں، نہ ہی جھوٹ کا حصہ بنیں، نہ لوگوں کے ساتھ فراڈ کریں نہ لوگوں کے فراڈ میں آئیں، نہ کسی کے جذبات سے کھیلیں، نہ ہی اپنے جذبات کو کھلواڑ کے لیے پیش کریں۔

اور آخر میں سب سے اہم بات

سوشل میڈیا مکمل طور پر ایک غیر حقیقی دنیا نہیں، مگر یہ واقعی ایک غیر حقیقی دنیا میں تبدیل ہو جاتی ہے جب ہم حقیقی دنیا کو سرے سے ہی بھلا دیتے ہیں۔اور آخر میں سب سے اہم بات، آپ کی اور ہماری آخرت، وقت آپ چاہے حقیقی دنیا میں گزاریں اور چاہے غیر حقیقی دنیا میں گزاریں مگر آپ کا وقت اگر آپ کی آخرت کو خراب کر رہا ہے تو یقنا آپ انتہائی گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔

اللہ ہمیں ہمارے اعمال سے ہونے والے ابدی نقصان سے محفوظ رکھے اور ہمیں اس بیچ کے راستے پر چلنے کی توفیق دے جسے اس نے ہدایت کا سیدھا راستہ کہا ہے۔امین۔ دعا گو۔ میاں وقار الاسلام۔

منزل

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہر شخص ایک نشان لگی ہوئی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، ہر شخص کے ذہن میں اپنی اپنی منزل کا مختلف خاکہ ہوتا ہے اور ہر شخص کے ذہن میں اپنی منزل کے مختلف راستے بھی ہوتے ہیں جو اسے اس کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

مگر ہمارے پیدا کرنے والے نے بھی ہماری ایک منزل کا تعین کر رکھا ہے اور اس کے راستے بھی بنا رکھے ہیں ہم چاہے دنیا گھوم لیں چاہے آسمانوں کی حدوں سے نکل جائیں ہمیں انہیں راستوں پر واپس آنا ہے اور اسی منزل پر پہنچنا ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اور پھر ہمیں ملنا بھی وہی ہے جس کا وعدہ پہلے سے کیا جا چکا ہے۔

مسافر جب اپنی منزل کی طرف نکلتا ہے تو اس کا ولولہ اور جوش اس پرندے کی طرح ہوتا ہے جس نے ابھی نیا نیا اڑنا سیکھا ہوتا ہے۔ جیسے تھوڑی سی کوششوں کے بعد نوزائیدہ پرندہ بھی لمبی پرواز بھرنے کے قابل ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح مسافر بھی بہت جلد اپنی رفتار پکڑ لیتا ہے۔ اور پھر یہ رفتار تیز سے تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ جیسے پرندے کو پلٹنا جھپٹنا اور پلٹ کر پھر جھپٹنا آ جاتا ہے ٹھیک اسی طرح مسافر بھی اپنی مسافت کو خوب سمجھ جاتا ہے۔

ہم بہت ساری چھوٹی چھوٹی کامیابیاں سمیٹتے چلے جاتے ہیں زندگی ہمیں کہاں سے کہاں لے جاتی ہے ہم کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے وہ سپنے بھی پورے ہونے لگتے ہیں جو سپنے ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہوتے۔ ہم اپنے آپ کو منواتے چلے جاتے ہیں۔ علم حاصل کرنے جاتے ہیں تو علم کا ایک وسیع سمندر ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ رشتے اور دوستیوں اور سماجی تعلقات کی طرف دیکھتے ہیں تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہمارے سامنے ہوتا ہے کاروبار کی طرف جاتے ہیں یا پھر جاب کی طرف تو مواقعوں کی ایک دنیا ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی۔

جیسے جیسے ہم مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے ہماری خواہشات بھی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ہم ایک منزل نہیں چاہیئے ہمیں ہزاروں منزلیں چاہیں۔ ہمیں لامحدود علم چاہیئے، ہمیں لامحدود رابطے اور تعلق چاہیں ہمیں بے شمار وسائل چاہیں ہم ہر چیز میں بڑھوتری چاہتے ہیں ہر چیز میں اوپر سے اوپر جانا چاہتے ہیں اب ہمیں ایک کامیابی نہیں ہمیں بے شمار کامیابیاں چاہیں۔

ہمارا ذہن وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا شعور بڑھتا چلا جاتا ہے اور بہت سی فیلڈز میں ہم اپنا نام منوا کر رہتے ہیں۔

انسان ایک ایسی ہی مشین ہے جب چل پڑتی ہے تو پھر سوچ کی وسعتوں میں کھو جاتی ہے۔ ہم اپنی منزل کا تعین کرنے نکلے تھے ہم اپنے بچوں کی قسمت لکھنے لگتے ہیں مذید طاقت ملے اور ان کے بچوں کی قسمت بھی سنورانے لگتے ہیں اور مزید طاقت ملے تو اپنے علاقے اور اپنے ملک کی قسمت بھی اور اگر اور طاقت ملے تو ملکوں کے فیصلے بھی ایک انسان کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔

انسان کمزور ہے تو اتنا کمزور کہ اپنے لیئے ایک نوالے کا انتظام نہیں کر سکتا ہے طاقتور ہے تو اتنا طاقتور ہے کہ آدھی دنیا کا رزق چند ہاتھوں میں قید ہو جاتا ہے۔

آج امریکہ طاقتور ہے تو اس قدر طاقتور کہ دنیا کی تقریبا 50 فیصد ادویات اکیلا امریکہ بناتا ہے، تقریبا 50 فیصد اسلحہ امریکہ بناتا ہے اور تقریبا 50 فیصد انرجی کے وسائل بھی امریکہ کے پاس ہیں۔ اور امریکہ دنیا کا صرف 5 فیصد ہے جیسے چاہتا ہے دنیا کو گھماتا ہے جھوٹ بھی بولتا ہے تو اتنے اعتماد سے کہ دنیا اسے جھٹلا نہیں پاتی کیونکہ امریکہ کے جھوٹ میں بھی اتنی طاقت ہے جتنی کسی کے سچ میں نہیں۔

دوسری طرف بھارت ہے دنیا کا تقریبا 20 فیصد اور بیٹھا بھی ہمارے سر پر ہے اور ہم نے کبھی اس کی دھمکی کو سیریز نہیں لیا بلکہ ہم تقریبا 2 فیصد آبادی والا ملک ہیں مگر انڈیا ہماری دھمکیوں کو سیریز لیتا ہے۔ ہمیں 20 فیصد آبادی والے ملک کا اتنا بھار نہیں جتنا 5 فیصد والے ملک کا بھار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طاقتور کا رعب بیٹھتا ہے چاہے کوئی مانے یا نہ ماننے، بکری کے کہنے سے بکری شیر نہیں بنتی شیروں والے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔

دوسری طرف چائینہ ہے جس نے صرف 30 سالوں میں اپنے آپ کو اس قدر منوایا کہ امریکہ کی 500 بڑی کمپنیوں میں سے ادھی سے زیادہ کمپنیاں خرید لیں یا ان کے مقابل بنالیں اور اپنا رعب بھی اس قدر بڑھایا کہ خود امریکہ کو چائنیہ کے خلاف کاروائیاں کرنے کے لیئے سوچنا پڑتا ہے۔

روس بھی بہت مضبوط تھا اسے بھی لگتا تھا کہ اسے کوئی ہرا نہیں سکتا اس لیئے اس کہ اس خواب دیکھنے سے پہلے ہی پورے ہو جاتے اور منزلیں یوں قدم پوجتیں کہ ایک منزل کی تلاش میں نکلتا تو دو چار ویسے ہی ہاتھ لگ جاتی ٹھیک اسی طرح جیسے مسلمانوں نے فتوحات حاصل کیں۔

انسان جب کچھ کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو مشکلیں بہت آسان ہو جاتی مشکل کام تو ہوں لگتے ہیں جیسے کوئی کام ہی نہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو کچھنہ کرنے کی ٹھان کر بیٹھے ہیں وہ آسان سے آسان کام بھی اگر کرنا چاہیں تو ناممکن ہو جاتا ہے۔

اللہ نے پاکستان کو اتنا نوازا ہے جتنا شاید کسی ملک کو نوازا ہو اور دوسری طرف ایسے حکمرانوں سے بھی نوازا ہے کہ ہماری معیشت کا ریورس گیئر ہی ختم نہیں کرتے۔

ہم بہت محنتی قوم ہیں مگر ہماری محنت ہمیں ہماری منزل کی طرف لے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف لے کر جا رہی ہے کوئی تو ہے جو ہمیں گول گول گمارہا ہے اور ہماری منزل جو کہ ہم سے بہت قریب ہے ہمارے سامنے ہوتے ہوئے بھی ہم سے دور ہو جاتی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم خود کو ہی گول گول گمانے میں مصروف ہیں۔ اگر ہم خود کو گول گول گماتے ہیں تو کوئی ہمیں بھی گمائے گا اور ہمیں گمانے والوں کو بھی کوئی گمائے گا۔ پھر سب گھمنے اور گھمانے والوں کا ایک دن مقرر ہے جب انہیں ایک ایسی منزل کی طرف دھکیل دے گا جس کے آگے کوئی بھی اور منزل نہیں تو ایسی منزل سے ڈرنا چاہیئے۔ سیدھا چلنے والا اور چلتے چلتے بار بار گر پڑنے والا برابر نہیں ہو سکتے اور جس نے اپنا کل دیکھنا ہو وہ اپنا دیکھے کہ کہیں اس کا آج ٹیڑھا تو نہیں۔

ہم سب کو سیدھا رستہ معلوم ہے اور سیدھے راستے کی منزل بھی معلوم ہے۔ آج اگر راستہ سیدھا ہے تو اس کی منزل کبھی ٹیڑھی نہیں ہو گی اگر آج رستہ ٹیڑھا ہے تو کل کبھی منزل سیدھی نہیں ہوتی۔

ہم خود اپنے اوپر گواہ کافی ہیں کہ ہم کتنے سیدھے ہیں دعا گو ہوں کہ اللہ ہمارے راستوں کو سیدھا رکھے تاکہ ہماری منزلیں بھی سیدھی رہیں

کوئلے کی کان میں ہیرا

تحریر : میاں وقار الاسلام

شیطان نے وعدہ کیا تھا کہ انسان کا راستہ روکے گا، مگر بہت سے انسان بھی انسان کا راستہ روکتے ہیں جن پر شیاطین کا سایہ ہوتا ہے۔ جو ڈٹ جاتا ہے، مشکلیں خود اسے راستہ دیتی ہیں ورنہ لوگ بہت سی آسانیوں کے باوجود بھی فیل ہو جاتے ہیں۔

بغیر محنت کے بھی بہت سے لوگوں کو بہت کچھ مل جاتا ہے مگر جو محنت سے ملتا ہے اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اسلام ہمیں آسمانوں سے بھی اوپر لے جانے کے لیے آیا تھا مگر افسوس کہ ہم نے صرف قبریں اور مقبرے ہی بنائے۔

اسلام کی اساس یہ ہے کہ دین مسلمان کو غیر مسلم یا لادین کے بھی دل میں اتار دیتا ہے افسوس کہ مسلمان مسلمان کے دل میں بھی نہ اتر سکا۔ اسلام ہمیں ملا تھا پوری آب و تاب اور روشنی کے ساتھ منور پھر کچھ تاریک ذہنوں نے اسے مقدس لحاف میں لپیٹا اور طاق میں رکھ دیا۔

ہم اسلام کو مولوی میں تلاش کرتے ہیں خاص کر کے اس مولوی میں جو سالوں سے اسلام کو گنوائے بیٹھا ہے۔ ہم اپنی نالائقیوں کا وزن بھی مولویوں پر ڈال کر بری ذمہ ہو جاتے ہیں، جب کہ اسلام کو سمجھنے کی ذمہ داری اکیلے اکیلے ہم سب پر آتی ہے۔

آج ایک غیر مسلم جس کے پاس کوئی مولوی نہیں وہ اسلام کی راہ میں محنت کرتا ہے اور ہم سے اچھا مسلمان بن کر سامنے آتا ہے۔ سب سے زیادہ عذر کاہل اور سست قوم کے پاس ہوتے ہیں، نہ وہ پریکٹیکل ہوتی ہے نہ ہونا چاہتی ہے، جب کہ پریکٹیکل قوموں کی سوچ یکسر مختلف ہوتی ہے۔

اسلام کی نئی فصل گل یورپ سے پھوٹ رہی ہے، وہیں سے اسلام اصل شکل میں واپس آ رہا ہے جیسے عرب سے جہالت کے بادل چھٹے تو روشنی چھا گئی۔

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو ہم دیکھتے پہاڑ اللہ کے خوف سے پاش پاش ہو جاتا۔ تو پھر کوئی جاہل قوم اس کا وزن کیسے اٹھائے گی۔

اسلام ایک ہیرے کی مانند ہے جو ہماری جہالت کی وجہ سے کوئلے کی کان میں پڑا ہے۔ ہماری جہالت کی وجہ سے اس کی آب و تاب کم نہیں ہو سکتی۔ اللہ جاہل لوگوں کو علم والوں سے بدلنے پر قادر ہے اگر ہم اپنی روش نہیں بدلیں گے تو اللہ ہماری شکلیں بدلنے پر پوری طرح قادر ہے۔

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس پر روشن کتاب لادی گئی ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم آج بھی اپنی جہالت کی وجہ سے اس کتاب کا وزن اُٹھانے کے قابل نہیں ہوئے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ہم سے ہماری جہالت دور کرتے اور ہمیں شعور دے اور ہمارے علم میں اضافہ کرے تاکہ ہم اسلام کو اُس طرح سے سمجھ سکیں جس طرح سے اسے سمجھنے کا حق ہے۔

درخت کی بجائے باغ لگائیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

تخلیق کاروں کے ساتھ اکثر یہ مسئلہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ان کی تخلیق کو یا تو چوری کر لیا جاتا ہے یا پھر ان کی کاپی بنالی جاتی ہے۔ نئے نئے تخلیق کار کیوں کہ ایسے مسائل کا سامنا پہلی بار کرتے تو انہیں ایسے لگتا ہے کہ جیسے ان کی دنیا ہی لٹ گئی۔ بہت سے لوگ تو اپنے آپ کو اس پریشانی سے باہر ہی نہیں نکال پاتے اور ان کا دنیا سے بھروسہ ہی اُٹھ جاتا ہے۔

پاکستان میں تو ویسے بھی کاپی رائیٹس کے قوانین بہت ہی کمزور ہے، اگر کچھ لوگ قانون کا سہارا لینا بھی چاہیں تو ان کی خواری میں مذید اضافے کے سوا ان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور پھر وہ ساری زندگی اپنے ملک کے قوانین کو کوستے رہتے ہیں۔

مغربی ممالک میں کاپی رائیٹس کو اہمیت ضرور دی جاتی ہے مگر یہ گمان کرنا کہ وہاں سب اچھا ہے ایسا بھی بالکل نہیں ہے۔ دنیا کے بڑی بڑی کمپنیوں کو یہ مسائل درپیش ہیں۔ خود مائکر سافٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے مالک بل گیٹس نے وینڈوز کا آئیڈیا ایپل کے آپریٹنگ سسٹم میک آوایس سے چرایا اور پھر آئی ٹی کی دنیا میں مائیکروسافٹ نے اپنا جو مقام بنایا اس سے ہم سب ہی واقف ہیں۔

آئی فون کو یا پھر سامسنگ یا پھر نئی ابھرتی ہوئی چائنز کمپنی ہواوے ان تمام کے درمیان ایک وسیع سرد جنگ پائی جاتی ہے اور جس کا جتنا زور چلتا ہے سب چلاتے ہیں۔ اور جو ان میں سب سے سمارٹ ہوتا ہے وہی بازی لے جاتا ہے۔

چائینہ بے بہت سے یورپین اور امریکن کمپنیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور بڑی وجہ تیکنیکی مہارت کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی کمپنیوں کے آئیڈیاز چرانا یا پھر انہیں کاپی کرنا بھی ہے۔

چاہے جنگی میدان ہو، چاہے میڈیکل سائنس ہو، چاہے الیکٹریکل یا پھر موبائل اینڈ کمیونیکیشن ہو ہر میدان میں یہی دوڑ نظر آتی ہے۔

آج امریکہ یہ رونا روتا نظر آتا ہے کہ اس کی تمام ریسرچ چائنہ نے لوٹ لی تو اس کا یہ رونا اتنا بھی درست نہیں کیوں کہ خود امریکہ کی بنیاد روس، جاپان اور جرمنی کے آئیڈیاز کو چوری کرنے کی بنیاد پر رکھی گئی تھی اور آج یہی کام چائینہ کر رہا ہے۔

جب چائینہ سے یہ سوال کیا جاتا ہے جو چائینہ کہتا ہے کہ جو بھی چیز چائینہ اور اس کی عوام کے لیے فائدہ مند ہے وہ اخلاقی طور پر ان کے لیے ٹھیک ہے۔ پھر خود امریکہ کے لوگ جانتے ہیں کہ اگر وہ اپنی مصنوعات کو چائینہ سے بنواتے ہیں تو ان کی لاگت ایک چوتھائی کم ہو جاتی ہے اور ان کی مصنوعات کی فروخت میں کئی گناہ اضافہ ہو جاتا ہے اس کے برعکس اگر وہ یہی مصنوعات امریکہ میں بنائیں تو ان کی لاگت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ یہ دنیا کی اوسط قوتِ خرید سے باہر ہو جاتی ہیں۔

خیر یہ تو ایک بین القوامی مسئلہ ہے اور ہمیں اسی مسائل کے درمیان رہ کر سمارٹ طریقے سے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ تو دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں، اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ نے کچھ تخلیق کیا اور اسے کسی نے چوری کر لیا یا کاپی کر لیا تو گھبرانے کی ضرورت ہر گز نہیں۔ کچھ اور بنائے کچھ اور نیا سوچئے کچھ اور لکھیئے اور اس سلسلے کو جاری رکھیں کبھی اس ڈر سے کہ آپ کا بنایا ہوا سب چوری ہو سکتا ہے اپنے تخقیقی کام کو مت روکیں۔

مثال کے طور پر آپ ایک درخت لگاتے ہیں اور اس کے تمام پھل کوئی توڑ کر لے جاتا ہے تو درخت لگانا مت چھوڑیں اور درخت لگائیں، اور درخت لگائیں اور پھر اور درخت لگائیں یہاں تک کہ آپ کا ایک باغ ہو اور اس باغ میں سے اگر کچھ پھل مسافر، یا پھر حسد رکھنے والے، یا پھر مانگنے والے یا پھر کوئی اور جن کا حصہ اللہ کی طرف سے رکھ دیا گیا ہے، اگر ان کو چلا جائے تو آپ کو اس سے کوئی فرق نہ پڑے۔

بڑا تخلیق کار بننے کے لیے دل اور سوچ بڑی رکھنی پڑتی ہے، یہ مت دیکھیں کہ کس نے آپ سے کتنا فائدہ اُٹھا لیا، بلکہ یہ سوچیں کہ آپ کتنوں کو فائدہ دینے کے لیے چن لیے گئے ہیں۔ اپنے سفر کو جاری رکھیں اور اس میں اتنی محنت کریں کہ چھوٹے چھوٹے نقصانات سے آپ کا سفر نہ رکے اور نہ ہی آپ کے چلنے کی رفتار کم ہو۔

اللہ نے آپ کی کمائی میں بہت سے لوگوں کا حصہ رکھا ہے، اسی طرح جب آپ کچھ سوچتے ہیں تو آپ کی سوچ میں بھی کئی لوگوں کا حصہ رکھا ہوتا ہے مگر آپ یہ نہیں جانتے۔ کچھ لوگوں کو سایہ دار درخت کی طرح بنایا جاتا ہے لوگوں کا کام ہوتا ہے ان کے سائے میں بیٹھنا۔ لوگوں کے اپنے سائے میں بیٹھنے دے اور اپنے مقام کو سمجھیں اگر اللہ نے آپ کو سایہ دار درخت بنایا ہے تو اس کے پیچھے اللہ کی حکمت ہے۔

اللہ کسی تنگ نظر کو وسعت نہیں دیتا اور کسی وسعت رکھنے والے پر تنگی نہیں لاتا، اللہ پر بھروسہ رکھیں اور لوگوں کے بارے میں کم سے کم بدگمان ہوں، اور لوگوں کو سپیس دیں۔ تنگ دل بنے کی بجائے وسعتِ دل کا مظاہرہ کریں، مذید تنگ نظری ملے تو اس کا مقابلہ مذید وسعتِ دل سے کریں۔

بڑے لوگ ایسے ہی بڑے نہیں ہوتے، اور نہ ہی بڑی قومیں ایسے ہی بڑی ہوتی ہیں، بڑا سوچنا پڑتا ہے بڑا کرنا پڑتا ہے۔ اور اسلام ہمیں ہر سطح پر وسعتِ قلب، صبر اور برداشت کا مظاہرہ کرنے کو کہتا ہے اور اللہ یہاں تک کہتا ہے کہ ہم صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے مگر ہم اپنی جلد بازی میں اپنی محنت کے پھل کو پکنے ہی نہیں دیتے۔ محنت کریں، مشکلیں آئیں گی اور محنت کریں کیوں کہ محنت کرنے والوں کی منزل ہمیشہ ہی مختلف ہوتی ہے اور یہ بہت سے لوگوں کے لیے روشنی لے کر آتی ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں کچھ بڑا کر کے گئے رہیں رہتی دنیا انہیں ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔

دعا گو: میاں وقار الاسلام

آئینہء خودی

تحریر: میاں وقار الاسلام

خودی ایک ایسا آئینہ ہے جو انسان کے بناوٹی چہرے کو اُتار پھینکتا ہے۔ وہی بناوٹی چہرہ جو انسان کے ہر جھوٹ کو سہارا دیتا ہے اور اس کے غلط کو صحیح کر کے دیکھاتا رہتا ہے۔ معاشرے کے باطل پہلوؤں میں جینے کے لیے ہمیں ایسے ہی بناوٹی چہرے کی کمزور بیساکھیاں اُٹھانی پڑتی ہیں تاکہ ہم بھی انہیں معذور اور لاغر لوگوں میں شامل ہو جائیں جنہوں نے اپنی اپنی معذوریاں اکھٹی کر کے ایک کمزور اور ناتواں معاشرہ تشکیل دیا ہے۔ ایسے معاشرے چاہیے سینکڑوں کی تعداد میں ہوں یا پھر لاکھوں کی تعداد میں ان کی حیثیت دھول مٹی کی طرح ہی ہوتی ہے۔ ایسے کمزور معاشروں کی نہ تو کوئی طاقت ہوتی ہے اور نہ ہی کہیں کوئی وقعت۔ گردشِ دوراں کے کی سی ہوا انہیں اُڑا کر ساتھ لے جاتی ہے یا پھر ہلکی سی بارش بھی ان کا وجود دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ باظاہر جھوٹا انسان بڑا مضبوط اور طاقت ور نظر آتا ہے مگر اس میں ایسی سکت کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ حق اور سچ کے سامنے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

آئینہء خودی میں جب انسان اپنا عکس دیکھتا ہے تو اس پر اُس کا اصل ظاہر ہونے لگتا ہے نہ صرف وہ اپنی کمزوریوں کا احاطہ کرنے لگتا ہے بلکہ اپنے مضبوط پہلوؤں کا بھی خوب جائزہ لیتا ہے۔ آئینہء خودی انسان پر نہ صرف اس کی مخفی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا چلا جاتا ہے بلکہ اسے اپنے بنانے والے کی طاقت اور اس کی کاریگری کے راز بھی کھولتا چلا جاتا ہے۔ جوں جوں انسان اپنی تسخیر کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اُس میں دنیا کو مسخر کرنے کی طاقت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حق جب انسان کے اندر سرائیت کر جاتا ہے تو پھر اسے کسی جھوٹے بناوٹی چہرے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان کا عمل، انسان کی محنت اور اس کی تحقیق اس کا اپنا آپ منوانے لگتی ہے۔ غاروں میں رہنے والا انسان بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگتا ہے، گھوڑوں اور اُنٹوں پر سفر کرنے والا انسان بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرنے لگتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ انسان زمین اور سمندر کے راز پانے کے ساتھ ساتھ دوسرے سیاروں کو مسخر نے کی صلاحیت بھی پالیتا ہے۔

آج اللہ کی یہ ادنا سی تخلیق پوری کائنات میں اپنے آپ کو منواتی آ رہی ہے اور لا ممکنات کا سفر بھی ممکنات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے آج کا انسان بہت سی ایسی چیزیں وجود میں لا چکا ہے جن کے بارے میں کل کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف تو یہ انسان ہے جس نے ترقی کا سفر جاری رکھا اور اپنے رب کے پوشیدہ رازوں کے قریب پہنچ گیا اور مزید راز پانے کی جستجو میں آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ یہ مضبوط اور طاقت ور انسان ہے جس کی حقیقت اس کے اپنے آپ کو خود منوا رہی ہے۔ اور دوسری طرف وہ انسان ہے جو اپنے لیے صرف دھوکے کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ اسے ابھی پتا ہی نہیں کے اللہ نے اس کے اندر کتنے گہرے راز محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ تمام عمری جھوٹی اور مصنوعی زندگی گزارتے ہیں اور آخر کار ناامیدی کی موت مر جاتے ہیں۔ ان کے نہ تو جینے سے کسی کو کچھ فائیدہ ہوا اور نہ ہی ان کے مرنے سے کسی کو کوئی فرق پڑے گا۔ کیوں کہ انہوں کبھی اپنا آپ دیکھا ہی نہیں اور اگر کچھ دیکھا ہے تو وہ ہے صرف ناامیدی۔

جب تک اپنا آپ نہ بدلا جائے اور اپنے آپ کو اپنی بناوٹی ذات سے باہر نہ لایا جائے کسی قسم کی تبدلی ممکن نہیں۔ اپنا آپ بدلنے کے لیے انسان کو اپنے اندر جھانکنا پڑتا ہے اپن ذات میں اترنا پڑتا ہے اور اس ذات کو پہچاننا پڑتا ہے جس نے اُسے اشرف المخلوقات بنایا اور اسے ہر تخلیق پر فوقیت دی۔ انسان چاہے تو آئینہ خودی میں وہ تمام شرف ڈھونڈ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیے ہیں۔

متوازن آئینہ داری

تحریر : میاں وقار الاسلام

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

مرزا غالب

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پی ٹی آئی کی گورنمنٹ اب تک کی تمام گورنمنٹس سے بہت بہتر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پی ٹی آئی کی گورنمنٹ زرداری گورنمنٹ سے بھی گئی گزری ہے۔

سب نے قرض اٹھائے اور ملک کی ترقی کی رفتا کو کم کیا اور ملک کا بوجھ بڑھایا اور سب نے یہی کہا کہ یہ ہمیں پچھلی حکومت کی بری کارکردگی کی وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ سب نے بڑے بڑے خواب دیکھائے اور عوام سے ان کے چھوٹے چھوٹے سپنے بھی چھین لیئے خود بھی خوار ہوئے اور عوام کو بھی خوار کیا۔

حکومتوں کے جن اقدام کی ایک طرف بہت زیادہ تعریف کی جاتی وہیں دوسری طرف انہیں اقدام کو اچھی خاصی تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ ہم جب چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں تو اس کے قدموں میں گر جاتے ہیں اور جب تنقید کرنے پر آتے ہیں تو اس کا کچھ بھی نہیں چھوڑتے ہمیں ہمارے رویوں میں توازن لانے کی بہت ضرورت ہے۔

جیسے خوشامد میں کچھ بھی کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح تنقید میں بھی کچھ بھی کہہ دیا جاتا ہے نہ خوشامد کو لاجک چاہیے اور نہ ہی تنقید کو لاجک چاہیئے۔ کیا قلم کار ہمارے معاشرے کے صحیح آئینہ دار ہیں؟ شاید ہم قلم کار سب سے بڑے منافق ہیں ہم معاشرے ویسی آئینہ داری نہیں کر پاتے جیسی آئینہ داری ہمیں کرنی چاہیئے۔

قلم کاروں کو بھی تنقید کا نشانہ بنانا غلط نہیں مگر معاشرے کے سامنے بھی اگر آئینہ رکھ دیا جائے تو شاید وہی شکل بنے گی جو قلم کار بناتا ہے۔ حکومتیں عوام کی توقعات پر پورا نہیں اترتیں یہ بات اپنی جگہ درست ہے مگر عوام کا عوام کے بارے میں بھی خیال کچھ اچھا نہیں۔ کہتے ہیں کہ جیسی روح ویسے فرشتے یا جیسی عوام ویسے ہی حکمران، کیا ہم سارے ایک جیسے ہیں۔

معاشرہ بہتے پانی کی طرح ہوتا ہے۔برائی الگ ہو کر ہی رہتی ہے اور اچھائی اپنے بہاو میں بہتی رہتی ہے تو ہم کسی بہاو میں ہیں یا کہیں رک کر جوہڑ بننے کی تیاری کر رہے ہیں۔

چھوٹی سوچ اور بڑی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے چھوٹی سوچ بہت جلد بیزار ہو جاتی ہے جب کہ بڑی سوچ میں صبر اور حوصلہ زیادہ ہوتا ہے مگر ہمارے ہاں بڑی سوچ والے کو بیوقوف بھی کہتے ہیں۔بڑی قومیں اپنی سوچ سے بڑی ہوتی ہیں اور ان کی بڑی سوچ کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ان پر آزمائشیں آتی ہے اور ان کے حوصلے دیکھے جاتے ہیں۔

یہی عوام جس پر ہم بہت زیادہ تنقید بھی کرتے ہیں آپ اسے آزمائش کی گھڑیوں میں کیسا دیکھتے ہیں کیا ایسے وقت میں ہم اپنے ساتھ مخلص ہوتے ہیں۔ کشمیر کا معاملہ ہو یا زلزلے ہوں یا دہشت گردی ہو اور باوجود اس کے کہ ہمارے حالات بہت برے ہوں اسی بکھری ہوئی قوم نے یکجا ہو کر وہ مثالیں قائم کی ہیں جو موجودہ تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔

یعنی کوئی بڑا خسارا تھا

سارا گاؤں گلے ملا ہے

جون ایلیاء

یہی قلم کار جو ہمارے جذبات کے صحیح عکاس نہیں ہوتے آزمائشیں کی گھڑی میں خون جگر سے لکھتے ہیں اور اپنی آواز کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچاتے ہیں اور قلم کا حق ادا کرتے ہیں۔

شاید ہماری یاداشت بہت کمزور ہوتی ہے ہم اچھائیاں بھی بہت جلد بھول جاتے ہیں اور برائیاں بھی بہت جلد بھول جاتے ہیں اور کسی بھی عزم کے لیے پھر سے اکھٹے بھی فوری طور پر ہو جاتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ ہماری قوم میں پوٹینشل نہیں شاید ہمارا پوٹینشل کسی بھی قوم سے کم نہیں مگر بہترین پوٹینشل کو بھی ٹھیک سمت نہ ملے تو وہ ضائع ہو سکتا ہے۔

قوم تو وہی ہے

قائدِاعظم رح نے ہمیں صرف ایک سمت دیکھائی اور انہیں لوگوں نے ایک ناممکن خواب کی تعبیر دیکھی

اور دنیا میں اپنی مثال قائم کر دی

قوم تو وہی ہے

جس نے اپنے سے پانچ گناہ بڑی قوت کو واپس بھگایا

دہشت گردی کے عذاب کا بھی سامنا کیا

اور قدرتی آفات کا بھی اور

بدقسمی سے سیاسی آفات کا بھی

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ قوم جس لیڈر کی فتح پہ خوشیاں مناتی ہے اور میٹھایاں بانٹتی ہے

اور اس کے جانے پر بھی خوشیاں مناتی ہے اور میٹھایاں بانٹتی ہے

قوم تو وہی ہے

قلم کار قوم کی خوشی میں خوش ہیں، جب قوم کسی کو اچھا ماننے لگتی ہے تو قلم کار بھی اسے اچھا لکھنے لگتے ہیں اور جب قوم کسی کو برا ماننے لگتی ہے تو قلم کار بھی اسے برا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

قرار کو بے چینی میں بدلتے دیر نہیں لگی اور بے چینی کو قرار میں بدلتے دیر نہیں لگی

بس ایک جھلک کی بات ہوتی ہے،

قوم تو وہی ہے

تین طرح کی مینٹلیلیٹیز ہوتی ہیں ایک ہر بات پر "جی ہاں" کہنا اور دوسرا ہر بات پر "جی نہیں" اور تیسرا جہاں "ہاں" کہنا ہو "ہاں" جہاں "ناں" کہنا ہو "ناں"

ہمیں چاہیئے کہ ہم متوازن آئینہ داری کریں اور سچ بات کے لیئے اکھٹے ہو جایا کریں، چاہے وہ بات بہت سے لوگوں کو بری بھی لگے

دعا گو میاں وقار الاسلام

آئینے پر داغ

تحریر: میاں وقار الاسلام

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر آپ صاف شفاف آئینے پر نظر دوڑائیں تو آپ کی نظر اس پر لگے ہوئے داغ کی طرف ضرور جائے گی اور پورا آئینہ آپ کے فوکس سے جاتا رہے گا۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور ہمیں اکثر اس بات کا سامنا ہوتا رہتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں صحافت بہت بری لگتی ہے۔ شاید یہ بھی ایک آئینہ پر داغ کی مانند ہے۔ اگر آپ ایک اچھے صحافی ہیں اور آپ کا تعلق اچھے صحافیوں تک رہتا ہے تو ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب آپ اپنے ارد گرد اچھے صحافیوں کا ایک حلقہ دیکھیں گے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے صحافی اچھے نہیں ہوتے مگر آپ کو اس سے کیا لینا آپ کی صحافت اور آپ کا حلقہ احباب تو اچھے صحافیوں کا ہی ہے۔ مطلب یہ کہ ناامیدی والی بھی ایسی کوئی بات نہیں جہاں برائی ہے وہاں اچھائی بھی ہے اور برائی سے الگ تھلگ اور نمایاں بھی۔ آپ برے صحافیوں میں رہتے ہوئے بھی اپنی برادری کے بھائی بندوں جیسے نہیں آپ جیسے تھے آپ ویسے رہے اور ویسے ہی آپ کے دوست بھی بنے۔ یعنی صرف آپ اچھے نہیں آپ کے ارد گرد اور بھی بہت سارے لوگ اچھے ہیں۔

یہی معاملہ دوسرے قلم کاروں کے ساتھ ساتھ دوسرے پروفیشنز جیسے کہ اساتذہ، وکلاء، ڈاکٹرز اور شاید ہر طرح کے جائز کام کرنے والے لوگوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مطلب پروفیشنز برے نہیں ہوتے لوگ اچھے یا برے ہر پروفیشن میں ہوتے ہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ برائی ہی زیادہ کیوں نظر آتی ہے اور ہماری نظر اچھائیوں کی طرف کیوں نہیں جاتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ارد گرد بہت سے لوگ اپنے پروفیشن میں ایسے جان مارتے ہیں جیسا کہ جان مارنے کا حق ہوتا ہے، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انہیں بہت سے مسائل اور مشکلات کا سامنا بھی ہوتا ہے مگر وہ اپنے کام پر فوکس رہتے ہیں اپنے حصے کا کام کرتے جاتے ہیں اور صبر کیئے رہتے ہیں اور شکر کرتے رہتے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت بڑے سٹیٹس اور بہت زیادہ وسائل کے باوجود بھی لوگ بے چین رہتے ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ محدود وسائل اور محدود اختیارات کے باوجود بھی لوگ خوش رہتے ہیں۔

سکون کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا آپ کے قدموں میں ہو اور آپ کی خواہشات ایک کے بعد ایک پوری ہوتی رہیں اور پھر آپ اپنی خواہشات میں دھنس کر مر جائیں پھر آپ کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔

دنیا بہت اچھی اور خوبصورت ہے اگر ہم اس میں اچھائی اور خوبصورتی دیکھنا چاہیں۔ دنیا بہت بری اور بدصورت ہے اگر ہم صرف برائی اور بدصورتی پر ہی بات کرتے رہیں۔

یہ دنیا اللہ کی طرف سے ایک مہمان خانہ ہے جس میں ہماری ضرورت سے کہیں زیادہ کچھ ہے۔ اگر ہم شمار کرنا چاہیں تو شمار بھی نہیں کر سکتے پھر بھی ہم خوش اور مطمئین کیوں نہیں پھر بھی ہمارے شکوے اور گلے کیوں ختم نہیں ہوتے۔

اگر دنیا میں اچھائی اور برائی برابر نہ رکھی جاتی تو حق اور باطل کا کھیل ہی ختم ہو جاتا، سب سچے ہوتے کوئی جھوٹا نہ ہوتا۔ مگر دنیا ایسی بالکل بھی نہیں ہے یہ دنیا ایک حکمت کے تحت بنائی گئی ہے۔ اور ہم شاید اس حکمت کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔

یہ دنیا ایک آئینہ کی مانند ہے ہم اس آئینے میں اچھا کریں گے تو یہ آئینہ ہمیں کبھی برا عکس نہیں دیکھائے گا ہم جب بھی اس میں دیکھیں گے اپنی اچھائیوں کو ہی پائیں گے اور ہمارا دل ہمیشہ اطمینان میں رہے گا۔ اور اگر ہم برائی ہی کرتے رہیں گے تو ہمارے اعمال بد کی تصویر اس میں ضرور بنے گی۔

اگر ہماری آنکھوں پر پردے ہیں اور کانوں میں ثقل ہیں تو کوئی بات نہیں یہ زندگی اتنی بھی لمبی نہیں ہے کہ ختم نہ ہو۔ پھر جس کی طرف ہم نے لوٹ کر جانا ہے اس کے پاس تو ہمارا حساب کتاب ہے ہی کہ ہم نے اس دنیا کے آئینے میں کیسا عکس بنایا ہے۔

ایک تجربہ کریں

اپنے سب سے اچھے دوست میں خامیاں تلاش کرتے رہیں اور اس کی خامیوں کا اظہار بھی کرتے رہیں۔ دیکھیں کہ وہ دوست کب تک آپ کا سب سے اچھا دوست رہتا ہے۔

یا پھر ایسا کریں کہ اپنے سب سے بڑے دشمن کی اچھائیوں پر غور کرنا شروع کر دیں اور اس کا اظہار بھی کرتے رہیں دیکھیں وہ کب تک آپ کا سب سے بڑا دشمن رہتا ہے۔

ممکن ہے کہ نتائج یکسو بدل جائیں

.برا تو ہمارے ارد گرد بہت ہو رہا ہے، کوشش کریں کچھ اچھا کریں

دعا گو

نئی نسل نیا دور

تحریر : میاں وقار الاسلام

اکثر یہ سننے کو ملتا ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کے لیئے کچھ کریں ان کے لیئے تعلیم اور روزگار کے مواقع پیدا کریں انہیں ایک بہترین ماحول فراہم کریں انہیں اپنی بہترین سماجی اور اخلاقی قدریں فراہم کریں اور انہیں ان برائیوں سے یا ان برے تجربات سے بچائیں جن کا ہمیں سامنا ہوا۔

ہم جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں اور ہماری سوچوں سے بالکل الگ تھلک ایک نئی دنیا تشکیل پا جاتی ہے اور ہم بہت جلد آوٹ ڈیٹیڈ ہو جاتے ہیں۔

ہر نئی آنے والی نسل اپنا ایک نیا دور لے کر آتی ہے۔ نئی نسل کے لیئے اللہ نے پہلے سے ہی روزگار کے مواقع پیدا کر چھوڑے ہیں۔ نئی نسل کا علم بھی ہم سے زیادہ ہے اور ترقی کی رفتار بھی ہم سے کہیں زیادہ ہے۔

صرف ہم 20 سال پہلے کے منظر کو دھرائیں تو شاید جو زندگی ہم گزار آئے ہیں ہمیں ویسا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہمارے دور کے لوگوں نے جو چیز بڑی محنت سے بنائی تھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اثار قدیمہ کا منظر پیش کر رہی ہے۔

بہت پرانی بات نہیں جب امریکہ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کو عروج ملا تو پچاس سے ساٹھ سال کے لوگوں دوبارہ کالجز میں بھیجا گیا اور انہیں آوٹ ڈیٹ ہونے سے بچانے کے لیئے اپ ڈیٹ کیا گیا تاکہ وہ آئی ٹی کے دور میں اپنا سروائول ڈھونڈ سکیں۔

آج سے صرف 10 سال پہلے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا مقام تھا اب یوں لگتا ہے جیسے 100 سال پرانی بات ہو۔ ہمارے ارد گرد کی دنیا یکسر بدل چکی ہو اور آج جو لوگ 50 یا 60 سال کی عمر میں ہیں اور اپنے وقت سے ہم آہنگ نہیں وقت ان کے لیئے پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں لا رہا۔

ہمارے سینئرز کے پاس بہت زیادہ تجربہ ہے اور علم بھی ہے مگر وہ اپنے علم کو اور تجربے کو شئیر ہی نہیں کر سکتے اگر وہ وقت کی ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو آپ ڈیٹ نہیں کرتے اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے دور حاضر کے لوگوں تک اپنا پیغام نہیں پہنچا سکتے

نئ جینریشن تو اپنے لیئے بہت کچھ کرلے گی بجائے یہ فکر کرنے کے کہ نئ جینریشن کا کیا بنے گا انہیں چاہیئے کہ خود کو ضائع ہونے سے بچائیں خود پر محنت کریں دور حاضر کا علم حاصل کریں اور دور حاضر کے لوگوں سے کمیونیکیٹ کریں اور اپنے علم اور تجربہ کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ تاکہ اس کا فائدہ ان کی میت نہ اٹھائے بلکہ آج کی نئ جنریشن ان کے علم سے مستفید ہو۔

ہمیں جو علم ملتا ہے یہ صرف ہماری ذاتی کاوش نہیں بلکہ اللہ ہمیں تیار کرتا ہے کہ ہم جو سیکھیں اس کا فائدہ آگے آنے والے لوگوں کو پہنچائیں مگر انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے اکثر تجربہ کار لوگ اپنا تجربہ اور اپنا علم اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں اور اس کا فائدہ کسی کو نہیں پہنچ پاتا جس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ جس دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور پھر ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہتا یہاں تک کہ جینے کی مہلت بھی۔

اس سے پہلے کہ سب ضائع ہو جائے، اپنے علم کو محفوظ کریں اور نئ نسل اور نئے دور سے ہم آہنگ ہوں۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

فہرست مضامین

	ادبی اور لسانی	
1	عہدِ شہناز	45
2	بیسٹ لائف نوٹس سے زریں ملفوظاتِ حیات تک	50
3	ماں بولی زبان پہلے	53
4	انگریزی سے پاک اردو	56
5	قلم	59
6	قیمتی الفاظ	61
7	کیا اردو کی جان خطرے میں ہے	63
8	نوک پلک	65
9	قانونِ تقلیلِ افادہ مختتم	68
10	عوامی شاعر کہاں گئے	71
11	ادب اور ادیب	74
12	رسمی تعریف	74
13	قابلِ تعریف، قابلِ توہین	81
14	بھاری الفاظ، ہلکا انسان	83
15	میری لائن چوری ہو گئی	85
16	عشقِ سخن	88
17	ایک ستارہ جو آسمان خالی کر گیا	91
18	رشکِ ادب	96
19	شوقِ داد	99
20	پیپر بک اور ڈیجیٹل بک	502
21	محبت میری نظر میں؟	06
22	پختہ رنگوں کی کہانیاں	06
23	افسانوی نظروں کا فسانہ	10
24	ویلیو کریشن	13

25	حسنِ نظر	15
26	اظہارِ رائے یا اظہارِ حرام زدگی	17
27	زخم ایک جیسے ہیں	20
28	وقت سے بڑا کہانی باز کوئی نہیں	22
29	احساسات اور جذبات	25
30	جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے	27
31	کیا پھول زخمی کرتے ہیں	30
32	قدر دان اللہ کی رحمت	32
33	تلخ لہجے، میٹھی باتیں	34
34	بے لوث محبت	36
35	شعور اور بلوغت	39
36	بلوچ صاحب —اللہ دی مرضی	42
37	چوہدری صاحب - کتی نال	46
38	اقبال کا شاہین	50

عہد شہناز

تصنیف : عہدِ شہناز

شاعرہ : ڈاکٹر شہناز مزمل

تحریر : میاں وقار الاسلام

اگر وقت کے چہرے سے دھول ہٹائی جائے تو ہمیں ہر عہد میں ایسے چمکتے ہوئے ستارے نظر آئیں گے جنہیں اللہ تعالی نے اپنے فضل سے چُن لیا اور انہیں کسی نہ کسی کام کے لیے خاص کر لیا۔

ہر بستی کے لیے رہبر اور رہنما بھیجے گئے، جو دن رات لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے انہیں خوشخبری سناتے تھے اور انہیں ڈر سناتے تھے تاکہ وہ اس کائنات کے رازوں کو سمجھیں اور ہدایت کا سیدھا راستہ اپنائیں۔

جن لوگوں نے اپنے رہنماؤں کی قدر کی ان کے لیے جنت کے باغات رکھ دیے گئے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور جن لوگوں نے اپنے رہنماؤں کی قدر نہیں کی ان کے لیے دکھ دینے والا عذاب تیار ہے جس کا ایندھن مشرک اور منافق لوگ ہوں گے۔

یوں ہر عہد کسی نہ کسی کے نام کر دیا گیا۔ ہمارا عہد بھی اسی طرح ایک رہبر اور رہنما کا عہد ہے جسے نبوت اور رسالت کے سلسلے کی آخری مہر بنا کر بھیجا گیا۔ جس کے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔

ہمارا یہ عہد اللہ کے آخری رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے اور ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں ان کے عہد میں پیدا کیا گیا، اور ہم اس سے بھی زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا گیا اور ہمیں ان پر ایمان لانے کا شرف بخشا گیا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف ہمارے رہبر اور رہنما ہیں اور رہیں گے بلکہ قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے بھی رہبر اور رہنما رہیں گے۔ انہوں نے ہمیں جنت کی خوشخبری بھی سنائی ہے اور دکھ دینے والے عذاب سے ڈرایا بھی ہے۔

جس راستے کی طرف ہماری رہنمائی کی گئی ہے ہمارا ایمان ہے کہ وہ راستہ ہمیں جنت کی طرف لے کر جائے گا اور اگر ہم اس راستے سے بھٹکے تو پھر ہمارا راستہ دوزخ کے سوا دوسرا کوئی نہیں۔

اللہ ہم پر بڑا مہربان ہے، اللہ نہیں چاہتا کہ ہمیں بال برابر بھی تکلیف ہو، بلکہ اللہ چاہتا ہے کہ وہ ہم پر فضل کرے، اللہ ہر عہد میں ہم پر فضل کرتا آیا ہے اور کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں جو اس کے فضل سے خالی ہو۔

اللہ کا فضل بارش کی بوندوں کی طرح ہم پر برستا رہتا ہے، اور اس کا فضل ہر وقت ہمیں اپنی طرف بلاتا رہتا ہے۔ اللہ کے فضل سے صرف وہ لوگ محروم رہتے ہیں جن کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں یا پھر جن کے کان قوتِ سماعت کھو دیتے ہیں یا پھر جن کے دل مردہ ہو جاتے ہیں۔

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ سے اس کا فضل مانگا جائے اور ہمیں مایوس لوٹا دیا جائے۔ باوجود کھلی گمراہی اور سرکشی کے اللہ تعالیٰ ہمیں مہلت دیتا رہتا ہے کہ کب ہم توبہ کریں اور اس کے فضل کی طرف لوٹ آئیں اور اپنے لیے اُس راستے کا انتخاب نہ کریں جس میں تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

اللہ کے فضل کی بہت سی نشانیاں ہیں، جیسے سب سے بڑا فضل تو یہ ہے کہ ہمیں مسلمان پیدا کیا گیا اور ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کا شرف بخشا گیا۔

اس کے علاوہ بھی اللہ کے فضل کی ان گنت نشانیاں ہیں۔ جیسے، ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہم پر ہونے والے فضل کا اندازہ مقرر کر دیا جاتا ہے، ہم کس گھرانے میں پیدا ہوں گے، کون ہمارا باپ ہوگا، کون ہماری ماں ہو گی، کون ہمارے بھائی بہن ہوں گے، یہاں تک کہ کیا ہم نقص کے ساتھ پیدا ہوں گے یا پھر بغیر نقص کے۔ اور پھر یہ بھی کہ ہمارا عہد کب شروع ہوگا اور کب ہمارا عہد ختم ہو جائے گا اور پھر شاید وقت کی دھول ہمیں بے نام و نشاں کر دے گی۔

انسان کی نظر میں بہت سی چیزیں بے نام و نشان ہیں اور بہت سی چیزوں کے نام و نشان باقی ہیں۔ مگر اللہ کے علم میں ہر چیز ہے۔ وہ چیز بھی جو ہمیں نظر آتی ہے اور وہ چیز بھی جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ وہ راز بھی جو انسان نے پا لیے ہیں اور وہ راز بھی جو انسان سے ابھی تک پوشیدہ ہیں۔

اللہ کو ہر چیز کا علم ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیا اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجتے ہیں۔ اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرشتے ہر چیز کا حساب رکھتے ہیں اور اچھے یا برے کسی بھی عمل کو لکھنے سے نہیں چوکتے۔ اور ہر شخص کا اعمال نامہ اللہ کے ہاں مکمل طور پر محفوظ ہے، اور ہر شخص اپنے اعمال نامے پر خود گواہ ہوگا۔

جب ہم سے پوچھا جائے گا کہ دنیا میں کتنے عرصہ رہے تو ہم کہہ اُٹھیں گے کہ ایک دن یا پھر اس سے بھی کم۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہمارا عہد بہت بڑا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی بہت ہی مختصر ہے اور پلک جھپکتے ہی گزر جاتی ہے۔

اگر ہم اپنے ماضی کی طرف دیکھیں تو سالوں پرانی بات بھی ایسے معلوم ہوتی ہے کہ جیسے ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔ اور بس پھر ایک کل آتا ہے جو ہمیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور ہماری زندگی بھی ایک قصہ اور کہانی بن کر رہی جاتی ہے اور پھر وہ کہانی بھی بھلا دی جاتی ہے۔

مگر کچھ لوگوں کی کہانیاں یاد رکھی جاتی ہیں، کیوں کہ وہ اپنے نام کو اپنے عہد کے ساتھ اس طرح منسوب کر لیتے ہیں کہ ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عہد کے ساتھ وفا کرتے ہیں۔ جس کام کے لیے انہیں خاص کیا جاتا ہے وہ اس کام کے ساتھ وفا کرتے ہیں۔ یوں ان کا عہد ایک سنہری عہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک عہد کا نام ہے "عہد شہناز"۔

مادرِ دبستانِ لاہور محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ، چیئر پرسن، ادب سرائے انٹرنیشنل جنہیں بہت سے اعزازی ناموں سے بھی پہچانا جاتا ہے اور وہ بہت سے اداروں کی اعزازی چیئر پرسن بھی ہیں۔

ان کی چالیس سے زیادہ کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں اور وہ ہزاروں لکھنے اور لاکھوں پڑھنے والوں کی روح رواں بھی ہیں ان کے کام کو دیکھ کر لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے کام اور اپنے عہد کے ساتھ خوب وفا کی ہے۔

آج کی بات "ان کی وفاؤں کا ایک سلسلہ ہے جسے وہ گذشتہ کئی برسوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں، اور اس سلسلے کے ذریعے وہ اپنے بے شمار" سننے والوں تک روزانہ کی بنیاد پر اپنی آواز میں اپنا پیغام بھیجتی رہتی ہیں۔ آج کی بات کے حوالے سے ان کے پیغامات کے ایک حصے کو کتابی شکل میں محفوظ کیا جا چکا ہے۔ اور باقی حصوں پر بھی کام جاری ہے۔

جب کوئی شخص اپنے کام کے ساتھ وفا کرتا ہے تو اللہ بھی اس پر اپنے فضل و کرم کی بارش بڑھا دیتا ہے۔ یہ ان کی ذات پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اس حد تک بڑھا دیا کہ ان کے کئی نعتیہ مجموعے بھی مکمل ہو گئے اور ان کی نعتوں کو باقاعدہ ٹی وی، ریڈیو اور ان کے یوٹیوب چینلز پر بھی نشر کیا جانے لگا۔

نعتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے حمد باری تعالیٰ پر بھی کافی کام کیا۔ نورِ فرقان منظوم مفہوم ان کی ایک ایسی تخلیق ہے جو اس بات کی گواہ ہے کہ اپنے رب سے کس قدر محبت کرتی ہیں۔ اپنی اس تخلیق کو انہوں نے بارہ سالوں کی ان تھک محنت سے مکمل کیا ہے۔ جس میں انہوں نے قرانِ مجید کے منظوم مفہوم کو اپنی شاعری کے انداز میں قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس منفرد کام کو ہر سطح پر بھرپور پزیرائی ملی ہے اور اس کام کو نہ صرف تعلیمی اداروں میں سراہا گیا ہے بلکہ اس پر باقاعدہ تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔

جو محبت انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے اپنے لکھنے اور پڑھنے والوں کو بھیجی ہے یا پھر جس محبت کا اظہار انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے اپنے رسول اور اپنے رب سے کیا ہے شاید اسی کو وسیلہ بنا کر نورِ فرقان کو ان کے دل پر اتارا گیا ہے۔ اللہ کا فضل ان پر جاری ہے، بے شک اللہ کے فضل کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں۔

محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ نے اپنے عہد کی ہر چیز سے محبت کی ہے، اپنے رسول سے محبت کی ہے اپنے رب سے محبت کی ہے، اپنے استادوں سے محبت کی ہے، اپنے لکھنے اور پڑھنے والوں سے محبت کی ہے، اپنے کام سے محبت کی ہے، اپنے ادارے سے محبت کی ہے، اور اپنے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے ہزاروں قلم کاروں سے محبت کی ہے۔

انہیں محبتوں کی وجہ سے انہوں نے اپنے عہد کو اپنے نام سے منسوب کیا ہے۔ اور اب ان کی یہ بے لوث محبت عشق کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے کام کے لیے وقف کیا ہے تو ان کا کام بھی آج ان کے حق میں بول رہا ہے۔

محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ اپنے آپ کو اپنے عہد کا روشن ستارہ منوانے میں کامیاب رہی ہیں۔ اس ستارے نے میرے دل اور دماغ کو روشن کیا ہے، اور میں حدِ نظر ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں جنہیں انہوں نے اپنی علم و ادب کی روشنی سے منور کیا ہے۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ان پر لکھنے والوں نے ان کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص اپنے عہد کو رائیگاں نہ جانے دے اور اللہ تعالیٰ اس کے کام کو رائیگاں جانے دے۔ میں کچھ نہ بھی لکھوں، کوئی کچھ نہ بھی لکھے، میں کچھ نہ بھی بولوں، کوئی کچھ نہ بھی بولے تو بھی آج ان کا بے مثال کام ان کے حق میں بہت کچھ بول رہا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان کا عہد، ان کا ہی عہد ہے اور ان کے نام سے ہی جانا جائے گا۔

عہدِ شہناز کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو

میاں وقار الاسلام، فاؤنڈر وقارِ پاکستان

بیسٹ لائف نوٹس سے زریں ملفوظاتِ حیات تک

تحریر : میاں وقار الاسلام

بیسٹ لائف نوٹس کے نام سے میری ایک پبلیکیشن سیریس ہے جس کے 10 والیمز یا جلدیں مکمل ہو چکی ہیں جو ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں اور اس سیریز میں ایک سو سے زیادہ لکھنے والوں نے اپنا حصہ ڈالا ہے اور اپنی تحریروں اور عمدہ انتخاب سے بیسٹ لائف نوٹس کو چار چاند لگائے ہیں۔ بیسٹ لائف نوٹس میری زندگی کا وہ اثاثہ ہے جو مجھے ان لوگوں سے ملا جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی چاہے وہ میرے والدین اور قریبی رشتہ دار تھے، چاہے وہ میرے ٹیچرز اور کلاس فیلوز تھے یا پھر وہ میرے باس یا پروفیشنل کولیگز تھے یا کہ ادب کی دنیا کے کچھ چمکتے ستارے۔ جہاں جہاں سے زندگی کو رہنمائی ملی وہاں وہاں سے بیسٹ لائف نوٹس نے روشنیاں سمیٹیں اور ایک بہترین یاداشت کو جنم دیا جو بیسٹ لائف نوٹس کے نام سے محفوظ ہے اور لاکھوں لوگوں کی نظر سے گزر چکی ہے۔

ایک کتاب جس کا 80 فیصد حصہ اردو پر مشتمل ہے اس کا عنوان انگریزی زبان سے کیوں لیا گیا یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میں ابھی تک تلاش کر رہا ہوں۔ میں اس کا جواب تو نہیں ڈھونڈ سکا مگر اپنے فیصلے کو سپوٹ کرنے کے لیے بہت کچھ کہتا رہا۔ حقیقت یہی تھی کہ میں اس عنوان کو بدلنا ہی نہیں چاہتا تھا کیوں کہ انگریزی کے تین لفظوں کی جگہ مجھے اردو کے تین متبادل الفاظ متاثر ہی نہیں کر سکے۔ جس کی بنیادی وجہ شائید یہ تھی کہ میں نے انگریزی زبان میں تعلیم لی اور جو بھی نئے مضامین پڑھنے کا موقع تعلیمی کا کاروباری میدان میں ملا ان کا براہ راست تعلق انگریزی زبان سے ہی تھا۔

آج کل انڈیا کے ایک چینل پر اپنی زبان کے حوالے سے ایک ویڈیو کلپ مشہور ہو رہا ہے جس میں ایک لڑکی اپنی مقامی زبان سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پوائینٹ آف ویو کو سامنے لانے کی کوشش کرتی ہے۔ لڑکی سکول سے واپس آتی ہے اور انگریزی زبان کے پیپر کا نتیجہ اپنی والدہ کو دیکھاتی ہے جس میں اس کے نمبر حیران کن حد تک کم آتے ہیں تو والدہ اس سے پوچھتی ہے کہ امتحان میں کیا پوچھا گیا تو وہ بتاتی ہے کہ انگریزی میں اپنے خوابوں کے بارے میں ایک مضمون لکھنا تھا تو میں نے سوال ہی چھوڑ دیا تو والدہ اسے کہتی ہے کہ تمہیں تو یہ سب لکھنا آتا تھا پھر تم نے کچھ لکھا کیوں نہیں۔ تو اس پر لڑکی بڑی معصومیت سے جواب دیتی ہے کہ ماں کیا ہم اپنے خواب بھی اپنی زبان میں نہیں لکھ سکتے۔ کیوں کہ کوئی بھی خواب مجھے کبھی انگریزی میں نہیں آیا بلکہ اپنی ہی زبان میں آیا ہے تو میں اپنے احساسات، جذبات اور خوابوں کا اظہار انگریزی میں کیوں کروں۔ یہ کلپ تو یہیں ختم ہو جاتا ہے مگر کئی سوال جنم دے جاتا ہے کہ آخر ہم جا کس طرف رہے ہیں۔

شاید اس لڑکی کو اس بات کا احساس بہت جلد ہو گیا کہ اپنے خوابوں کے اپنی ہی زبان میں لکھنا چاہیے مگر مجھے یہ احساس تب ہوا جب میں اپنے سارے خوابوں کو انگریزی زبان میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔

بہترین زندگی کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ہم نے انہیں انگریزی میں ہی سیکھا جیسے کہ موٹیویشن، انسپائیر شن، کمٹمنٹ، ہارڈ ورک، لانگ ٹرم ریلیشن شپ، آنیسٹی، آنر، ڈسیپلن، ٹائم مینیجمنٹ، سیلف لیس نیس، فیوچر یسٹک اپروچ، سوفٹ سکیلز اور جانے کیا کیا۔ یہ تمام ایسے کنسیپٹ نہیں ہیں جنہیں اردو میں لکھا پڑھا اور سمجھا یا نہ جا سکے۔ ہم ان الفاظ کو پہن تو لیتے ہیں مگر کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ یہ کنسیپٹ ہماری شخصیت پر اسی طرح ہی اثر انداز ہوں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے۔ وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنے خواب بھی دوسری زبانوں میں دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

اپنی زبان سے دوری کی وجہ سے مجھے بیسٹ لائف نوٹس ایک بہترین عنوان لگا اور مجھے یہ لگا کہ اگر اس لفظ کو متعارف کروایا جائے گا تو عام پڑھنے والے اس کے مفہوم کو زیادہ آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ اور ہوا بھی کچھ ایسے ہی کہ مجھے اپنی بات سمجھانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اور تصنیف مکمل ہو گئی۔

دوسری طرف مجھے اردو زبان کے ایسے الفاظ کی تلاش رہی جنہیں میں بیسٹ لائف نوٹس کا متبادل رُخ دے سکتا۔ اسی ٹاپک پر کئی دفعہ ڈاکٹر سلطان محمود سے بات ہوتی رہتی تھی، وہ مجھے میرے ہر کام پہ ہمیشہ سپوٹ کرتے چلے آ رہے تھے مگر جب بیسٹ لائف نوٹس کا لفظ میرے منہ سے نکلتا تو وہ وہیں رک جاتے کیوں کہ یہ لفظ انہیں ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میں یہ کہ کر ٹال دیتا کہ بیسٹ لائف نوٹس کا ایک حصہ انگریزی زبان میں بھی ہے اور اسی طرح کے اور کمزور دلائل مگر انہیں نے کبھی اس بات کو سپوٹ نہیں، آخر میں یہ بات یہاں ختم ہوتی کہ ڈاکٹر سلطان صاحب جس دن مجھے آپ اس کا متبادل لفظ دیں گے جس سے میری تسلی ہو تو میں اس پر ضرور سوچوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سے عنوان تجویز کئے مگر مجھے وہ لفظ چاہیے تھا جو اب عام فہم نہ رہا ہو مگر ہو اردو زبان کا تاکہ میں بھی کچھ ثابت کر سکوں کہ عام فہم انگریزی غیر فہم اردو عنوان سے بہتر تھی۔ سو یہ تجسّس کا سلسلہ جاری رہا۔

گذشتہ دنوں میں نے ڈاکٹر سلطان صاحب کا ایک لفظ پکڑ لیا جو شاید وہ روانی میں کہہ گئے وہ لفظ تھا " ملفوظاتِ عمری" جسے مذید ریفائن کر کے اور دوستوں کے مشورے سے "زریں ملفوظاتِ عمری" کے عنوان سے محفوظ کر لیا گیا۔ اگر دیکھا جائے یہ عنوان کسی بھی صورت بیسٹ لائف نوٹس سے کم نہیں مگر کیوں کہ یہ عام فہم نہیں اس لیے اس لفظ کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی طرح اردو زبان کے خوبصورت الفاظ وفات پا رہے ہیں۔

جب یہ عنوان فائنل ہو گیا تو میں نے بھی ایک شرط رکھی کہ ڈاکٹر صاحب کچھ تبدیلی آپ بھی لائیں وہ یہ کہ آپ کے آفس میں تمام ملازمین کے پروفیشنل سٹیٹس انگریزی زبان میں ہیں جیسا کہ مارکیٹنگ مینجر، سیسز اینڈ آپریشنل سٹاف، انوائیر مینٹل ایسٹس، ریسرچرز اور کنسلٹینٹ، کمپیوٹر آپریٹر، ڈیزائنز اور پرسنل سیکریٹری اور ہاں اپنا ٹائٹل بھی بدلیں مینیجنگ ڈائیرکٹر کی جگہ کوئی اور مناسب عنوان۔

مجھے یقین ہے کہ جتنا عرصہ مجھے بیسٹ لائف نوٹس کے متبادل عنوان تلاش کرنے میں لگا ہے اتنا ہی عرصہ ڈاکٹر سلطان محمود صاحب کو اپنے کمپنی کے ملازمین کے نئے پروفیشنل سٹیٹس تلاش کرنے میں لگ جائے گا۔ اور اگر انہوں نے سٹیٹس تبدیل کر بھی دیئے تو جب یہ سٹاف فیلڈ میں جائے گا تو کیا یہ اپنی نئی پہچان کروا پائے گا

ہم اردو سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کے سب کچھ اردو زبان میں پوری اپنائیت سے تبدیل ہو جائے تو کیا ہم اس تبدیلی کے لیے تیار بھی ہیں۔ کیا ایسا نہیں کہ آج کی اردو 50 سال پہلے کی اردو سے بہت زیادہ کمزور ہے۔ ہمیں تو پھر بھی ٹوٹی پھوٹی اردو آتی ہے کیوں کہ ہم نے میٹرک نہیں تو مڈل تک تو اردو ضرور پڑھی ہو گی۔ مگر ہماری اگلی آنے والی جنریشن جس کا آغاز ہی انگلش میڈیم سے ہوتا ہے وہ اردو زبان کو کتنا وقت دے پائے گی۔ آج اکثر گھروں میں اردو کا اخبار آتا ہے تو گھر کے بچے اسے پڑھ بھی نہیں سکتے ہاں اگر کچھ بزرگ باقی ہیں تو وہ شوق سے پڑھ لیتے ہیں۔ کیا اردو کو صرف ہمارے بزرگوں نے بچانا ہے یا اس سلسلے میں باقی لوگوں کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ کاش قوم اپنی قومی زبان کے ساتھ انصاف کر سکے۔ خدا جانے اردو زبان کا سکہ کب رائج الوقت ہو گا

دعا گو

میاں وقار الاسلام

مدر لینگویج فرسٹ

ماں بولی زبان پہلے

تحریر: میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ ماں کی گود انسان کی پہلی درس گاہ، پہلا سکول، پہلا کالج اور پہلی یونیورسٹی ہوتی ہے۔

انسان کی شخصیت کا سوشل فیبرک، یا انسان کی شخصیت کا بنیادی ڈھانچہ ماں کی گود میں ہی تشکیل دے جاتا ہے۔

ہر زبان کا اپنا ایک ووکل سٹرکچر ہوتا ہے اسی طرح جو زبان ماں بولتی اس کا بھی ایک ووکل سٹرکچر ہوتا جو انسان براہ راست اپنی ماں سے سیکھتا ہے۔

بہت کم ایسا ممکن ہوتا ہے کہ انسان اپنی ماں بولی زبان جیسا ووکل سٹرکچر دوبارہ کسی دوسری زبان کا سیکھ پائے حالانکہ انسان بہت سی زبانوں میں کمال حاصل کر لیتے ہیں۔

شعور کے نام پر ہمیں کیسی جہالت پلائی جا رہی ہے کہ چاند پر پہنچنے کے خواب میں ماں کے چاند کو اپنی ماں بولی زبان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

غیر ملکی کمپنیاں جب ہمارے دیہی علاقوں میں اپنی مصنوعات بیچنے کے لیئے مارکیٹنگ کرتی ہیں تو اپنے اشتہارات مقامی زبانوں میں بنواتی ہیں تاکہ انہیں اپنی بات سمجھانے میں کم سے کم محنت کرنی پڑے۔

ہم اپنے ہی لوگوں کو وہ زبان سیکھاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی اپنی ہی باتیں ان کے والدین اور ان کے رشتے داروں اور ان کے علاقے کے لوگوں کو سمجھ میں نہ آئیں۔

دنیا کا کوئی جانور اپنی مادری زبان نہیں چھوڑتا اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان جانور بن جائے۔

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انسان بہت سی زبانوں پر عبور حاصل کر لیتا ہے۔

آج انسان نہ صرف مختلف زبانوں پر عبور حاصل کر چکا ہے بلکہ اپنی زبانیں جانوروں کو اور جانوروں کی زبانیں خود کو سمجھانے کے مراحل طے کر رہا ہے

بہت سی زبانیں سیکھنے کی غرض سے یا پھر ترقی کی خاطر یہ ضروری نہیں کہ انسان اپنی ماں بولی زبان کو ترک کر دے بلکہ اسے چاہیے کہ دوسری زبانوں پر عبور حاصل کر کے اس علم کے ذریعے اپنی زبان کو مضبوط کرے اور اپنے لوگوں کو آگے بڑھنے میں مدد کرے۔

نئی نئی زبانیں سیکھنے کے چکر میں ہمیں اپنی قومی اور علاقائی زبانوں کا سودا ہر گز نہیں کرنا چاہیئے۔

جو بات اپنی زبان میں اپنے لوگوں کو سیکھائی یا سمجھائی جا سکتی ہے وہ کسی اور زبان میں سمجھانا ممکن ہی نہیں۔

ہماری بد قسمتی ہے کہ ووٹ لینے کے لیے، ٹیکس لینے کے لیے اور ملکی و غیر ملکی مصنوعات کو بیچنے کے لیے یہاں تک کہ اپنے اپنے عقیدوں کے پرچار کے لیئے تو علاقی زبانوں کو یاد کر لیا جاتا ہے مگر اسی علاقائی زبان کو علاقے کی ترقی، فلاح، اصلاح، تعلیم، شعور، معاشی آگہی اور سماجی بیداری کے لیئے استعمال نہیں کیا جاتا۔

کسی بھی ملک کا ملٹی لنگوول ہونا اس کی پہچان ہوتا ہے اور زبانوں کے مارنے سے زبانیں ہی نہیں مرتیں لوگوں کی پہچان اور شناخت بھی مر جاتی ہے اور اس سے جڑے ہوئے تمام خواب بھی چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

خواب نہ رہیں توانسان کوشش کس چیز کے لیے کرے گا۔ خواب زندہ رہنے چاہیں، خوابوں کے زندہ رہنے سے معاشرے زندہ رہتے ہیں، زبانوں کے زندہ رہنے سے ان زبانوں سے جڑے ہوئے معاشرے زندہ رہتے ہیں۔

کسی بھی علاقے میں مقامی لوگوں کے قدم مضبوط کرنے کے لیے ان کی مقامی زبانوں کا تحفظ اور ترویج بہت ضروری ہے۔ لوگوں پر اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں کہ ان سے ان کی پہچان چھین لی جائے یا پھر کمپرومائز کروالی جائے۔

ایسے بے زبان اور بے جان معاشرے جو اپنے نہیں رہیں گے۔۔۔ تو پھر وہ کسی کے نہیں رہیں گے۔ لوگوں کو اپنا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنی زبان واپس دی جائے۔ وہی زبان جو انہیں ان کی ماں کی گود سے بالکل مفت ملتی ہے اور اسے اضافی قیمت لے کر چھین لیا جاتا ہے۔

دعا گو

میاں وقار الاسلام

انگریزی سے پاک اردو

تحریر: میاں وقار الاسلام

آخر ہم اردو کی تحریر میں انگریزی کے الفاظ کیوں شامل کرتے ہیں۔ انگریزی سکولوں سے اردو قلم کاری کی طرف تشریف لانے والے اکثر میرے جیسے نئے لکھنے والوں کو یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کے مطابق عام فہم الفاظ کو اردو میں شامل کرکے اردو کو اور پیچیدہ کر دیتے ہیں۔

انگریزی کو اردو میں شامل کرنا انہیں کمزوری نہیں لگتا کیوں کہ عام فہم الفاظ جیسے ان کے ذہنوں میں ہوتے ویسے ہی پڑھنے والوں کے ذہن میں بھی ہوتے ہیں۔ تو جو غلطی لکھنے والا کر جاتا ہے وہی غلطی پڑھنے والا بھی کر جاتا ہے۔ مگر دونوں اطراف کی غلطیوں سے غلط بات ٹھیک نہیں ہو جاتی جو بات غلط ہے وہ غلط ہی رہے گی۔

اردو کو اگر انگریزی سے پاک کر دیا جائے اور عام فہم انگریزی کے الفاظ کو بھی اردو کی تحریر سے تلف کر دیا جائے تو اردو اور نکھر کر سامنے آئے گی۔

دراصل لکھنے کی روانی میں جب ہم کوئی بات مکمل کرنا چاہتے ہیں تو ایک دم سے انگریزی کا لفظ ٹپک پڑتا ہے اور ہماری بات مکمل ہو جاتی ہے مگر اس طرح سے بات کو مکمل کرنا ایک خلا چھوڑ جاتا ہے اور یہ خلا پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں جانتا کہ اس طرح کی انگریزی سے آلودہ رنگ برنگی اردو کس نے شروع کی اور پھر یہ ہم پر اتنی بری طرح سے اثر انداز ہوئی کہ جیسے ساری اردو کو دیمک ہی لگ گئی ہے۔

آج اگر ہم انگریزی کی دیمک سے پاک صاف صاف اردو لکھتے ہے تو ہمیں یہ ڈر رہتا ہے کہ شاید اسے پڑھنے والے اس میں دلچسپی نہیں لیں گے اس لیئے ہم کبھی اپنا الو سیدھا نہیں کرتے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ الو کو کبھی سیدھا ہی نہ کیا جائے۔

ہم نے خود ہی انگریزی سے آلودہ رنگ برنگی اردو ایجاد کی ہے جو ایک لت کی طرح لوگوں کو لگ چکی ہے۔ اگر انگریزی کے دو چار لفظ نہ مارے جائیں تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص پڑھا لکھا نہیں ہے۔

حال ہی میں ٹرمپ نے مودی کو چائے والا کہنے کی بجائے چیڑے والا یا پتا نہیں کیا کہہ دیا نہ اسے خود سمجھ آئی کہ اس نے کیا کہا ہے اور نہ سننت والوں کو سمجھ آئی کہ وہ کیا کہ رہا ہے خود کو اردو جاننے والا بنانے کے چکر میں ٹرمپ خود بھی بدنام ہوا اور مودی کو بھی رسوا کیا اور زبان کی بھی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ یہ ہوتی ہے لسانی ملاوٹ اور لسانی گراوٹ۔

آخر پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیئے کیا اردو میں انگریزی شامل کرکے اسے مسخ کرنے اور اس کی ٹانگ توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

اگر ہماری اردو کمزور ہے تو اس میں بے چاری اردو کا کیا قصور ہیں ہمیں اپنی ادھوری اردو کو پورا کرنے کے لیئے انگریزی کی ملاوٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

کیا واقعی اردو اس بات کی محتاج ہے کہ اسے انگریزی سے سہارا دیا جائے۔۔۔ ہر گز نہیں۔۔ دراصل ہم اپنی کمزوریوں کو انگریزی زبان کے الفاظ شامل کرکے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح کی رنگ برنگی آلودہ اردو ہم بول بھی لیتے ہیں لکھ بھی لیتے ہیں اور پڑھ بھی لیتے ہیں اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔

کہتے ہیں کہ غلطیوں کا اعتراف کر لینے میں کبھی کوئی غلط نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک درست قدم ہے اور یہ قدم ہمیں اٹھانا چاہیئے ہو سکتا ہے کہ جس نے بھی اردو کو خراب کرنے کی رسم شروع کی تھا شاید اس رسم کا خاتمہ ہو۔

یقین مانیں میں نے اپنی بہت سی تحریروں کو انگریزی سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے، میں روانی میں پھر کبھی کبھی غلطی کر جاتا ہوں کیوں کہ میرے اندر کا خلا ابھی بھرا نہیں ہے مگر جب بھی میں اپنی کسی تحریر کو انگریزی سے پاک کرتا ہوں تو وہ مجھے انتہائی خوبصورت بھی لگتی اور متاثر بھی کرتی ہے اور میرے اندر کے خلا کو کم کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

محترسلطان محمود صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح کی ملاوٹ کرنے والے قلم کار اردو کے قاتل ہیں اور وہ ٹھیک کہتے ہیں میں سے 100 فیصد متفق ہوں۔

اسی طرح محترمہ شہناز مزمل صاحبہ کہتی ہیں کہ اردو ایسی ہونی چاہیئے کہ اس پر کوئی اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔اس بات میں بھی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔

ہمیں چاہیئے کو اردو کو اس کی اصل حالت میں برقرار رکھیں بجائے اس کے کہ اردو ہماری کمزوریوں کا شکار ہوتی رہے۔

اردو سے محبت کرنے والے سے اپنی معذوری پر معذرت کے ساتھ دعا گو ہوں کہ ہمارے قلم سے اردو کا وقار مزید مجروح نہ ہو اور نہ ہی ہماری زبان ہماری اردو کو انگریزی سے آلودہ کرے۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

قلم

تحریر : میاں وقار الاسلام

صدیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سچے قلم کی نوک سے دنوں میں دفن ہو سکتے ہیں۔۔۔ مگر ہاں کوئی سچ لکھنے والا ہو۔

قلم کے ذریعے جب حق کی آواز اٹھائی جاتی ہے تو بڑے بڑے فرعون بھی بو کھلاہٹ کا شکار نظر آتے ہیں اور یہ بو کھلاہٹ ان کے چہروں سے صاف عیاں ہوتی ہے قلم کا نشانہ کروز مزائل سے بھی درست ہوتا ہے۔

قلم ایک طاقت ہے اگر یہ ظلم کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔۔ قلم ایک کمزوری بھی ہے اگر یہ ظالم کے خلاف جھک جاتا ہے یا پھر خوشامد کے لیئے استعمال ہوتا ہے۔

قلم ایک خوبصورت اور قیمتی چیز ہے قلم سے ہمیں عزت اور مقام ملتا ہے ہمیں چاہیئے ہم اس کا پاس رکھیں نہ کہ ہم قلم کو اپنی عزت کم کرنے یا اپنا مقام گرانے کیلئے استعمال کریں۔

قیامت کے دن ہاتھ بولیں گے کہ کس قدر زہریلا قلم ظالموں کے ہاتھ میں تھا اور کس قدر زہر قرطاس پر بکھیرا گیا

قلم کی گرفت اگر ظالموں کے ہاتھ میں ہو تو معاشرے کے غریب اور کمزور لوگوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

قلم کی چال اہل قلم کی چال ہوتی ہے جیسا اہل قلم ہوتا ہے ویسا ہی قلم چلتا ہے۔

قلم وزن میں ایک بہت ہلکی چیز ہے مگر اس کے لفظوں کا وزن بہت بھاری ہوتا ہے۔

قلم کے پیچھے اگر ضمیر کی آواز نہ ہو تو قلم سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ لکھتا ہے۔

اہل قلم پر واجب ہے کہ وہ قلم کی نوک سے جھوٹی باتیں نہ لکھیں۔

بہت سے لوگ ترستے رہ جاتے ہیں کہ قلم کبھی کوئی فیصلہ ان کے حق میں بھی لکھے گا۔

قلم کی نوک سے بہت سے لوگوں کے حق مار لیئے جاتے ہیں۔

قلم اگر حق ادا نہ کرے تو کئی نسلوں کی قسمت برباد ہو جائے۔

قلم اگر حق ادا کرے تو نسلوں کی قسمت بدل سکتی ہے۔

قیمتی الفاظ

تحریر : میاں وقار الاسلام

قیمتی سے قیمتی الفاظ بھی ہمارے قیمتی رشتوں سے قیمتی نہیں ہو سکتے، پھر بھی ہم اپنے غم کو ہلکا کرنے کے لیئے احساس کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں، آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور درد اپنی زبان میں بولنے لگتا ہے۔

لفظوں کے خزینے بھی ہم پر وارد ہوتے رہتے ہیں، ہم کیا سے کیا لکھتے ہیں، کہاں سے کہاں تک لکھتے ہیں، اور جہاں سے جہاں تک لکھتے ہیں غم کی وسعت پھیلتی جاتی ہے جدائی کا احساس گہرے سے گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہی قیمتی الفاظ ہمیں کسی حد تک سہارا بھی دیتے ہیں اور ہمارے زخموں کو ہرا بھی رکھتے ہیں۔

ہم جنہیں یاد کرکے روتے ہیں انہیں کو یاد کرکے تسکین بھی پاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اب ان تک صرف ہماری سوچ ہی جا سکتی ہے اور واپس صرف ان کی یادیں ہی خالی ہاتھ لوٹتی ہیں۔ پھر بھی ہمیں لکھنا ہے، ہمیں سوچنا ہے ہمیں یاد کرنا ہے کیوں کے جو خلا ہمارے قیمتی رشتے چھوڑ جاتے ہیں وہ کبھی بھرنا ہی نہیں ہے۔

ہم در حقیقت اپنا خالی پن لکھتے ہیں اور اپنی تنہائی کو قیمتی سے قیمتی لفظوں سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دن پر دن گزر جاتے ہیں، ماہ پر ماہ اور سال پر سال گزر جاتے ہیں اور ہمارا خالی پن بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

کچھ رشتے ہوتے ہی ایسے ہیں، ان سے قیمتی کچھ بھی نہیں ہوتا، شاید اپنی جان سے بھی قیمتی ہوتے ہیں تو پھر ایسے قیمتی رشتوں کا بدل بھی کیا ہو سکتا ہے، آخر ہم کتنے لفظ تبدیل کریں، ایسے الفاظ تو بنے ہی نہیں جو ہمارے احساسات کی مکمل ترجمانی کر سکیں۔

ہم بہت کوشش کرتے ہیں بہت لکھتے ہیں لکھتے لکھتے تھک بھی جاتے ہیں مگر احساسات اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں اور کی ترجمانی کرنے والے الفاظ چاہے جتنے بھی قیمتی ہوں اپنی قیمت کھو دیتے ہیں اور پھر ہم اور لکھنے لگتے ہیں پھر اور لکھتے ہیں پھر اور لکھتے ہیں مگر جتنا بھی لکھتے ہیں ایک کمی ہمارے ساتھ چلتی ہے شاید اسی کمی کو پورا کرنے کے لیئے ہم اور لکھتے ہیں اور ہماری تسکین کبھی پوری نہیں ہوتی

قران میں ایک جگہ اللہ کو یاد کرنے کے بارے میں ذکر ہوتا ہے کہ اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اپنے باپ دادا کو یاد کرکے روتے ہو اللہ نے خود کو یاد کرنے کی مثال جن رشتوں کے لیئے دی وہ ہمارے بزرگ ہی ہیں اللہ جانتا ہے کہ انہیں یاد کرنا کیسا ہوتا ہے اسی لیئے انہیں کی مثال دیتا ہے جو اپنی جگہ سچی اور کھری بات ہے۔ کیوں کہ ایسے یاد کرنے کی تو انتہا ہی نہیں۔

آخر انسان کس کس بات کو روئے اور پھر کس کس بات کو یاد کرے اور کس کس بات کو لکھے ساری باتیں قیمتی اور ہر اگلی بات پہلے سے زیادہ قیمتی کیوں کہ یہ تعلق ہی انمول ہیں جن کی قیمت لفظوں سے تو کیا کسی بھی چیز سے نہیں لگائی جا سکتی

پھر بھی ہم اپنی سوچ بھیجتے رہتے ہیں، رشتوں کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے، سالوں سلگتی رہتی ہے، بے چین بھی رکھتی ہے چین بھی دیتی ہے اور بے بس بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔

بس میں تو سب اللہ ہی کے ہے۔۔۔ اور اسی کے بس میں ہی سب رہے گا۔۔۔ ہمارے لیئے صرف صبر کا دامن چھوڑا گیا ہے اور وہی ہمیں کرنا ہے، اور وہی کیا جا سکتا ہے اور وہی کرنا چاہیئے، اور وہی دیکھا جائے گا کیوں کہ ہم اسی کا مال ہیں اور آخر کار ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے اور شاید کوئی ہمارا لکھا خود ہمارے لیئے پڑھ رہا ہو اور ہم ان میں نہ رہیں، یہ سلسلہ ایک حقیقت ہے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے اسے ماننا تو پڑھے گا

دعا گو وقار الاسلام

کیا اردو کی جان خطرے میں ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

آج سے تقریبا 30 سال پہلے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے والدین اور میرے خاندان کے بڑوں نے مجھے جس معیار کی اردو ورثے میں دی آج وہ ورثہ لٹ چکا ہے۔ آج جو اردو میں اپنے بچوں کو دے رہا ہوں یقینا اس کا معیار دیکھ کر سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

جس معیار کی اردو ہمیں ورثے میں ملی تھی ہم نے اسے اپنے سینے سے نہیں لگایا اور نہ ہی اسے آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ہم نے جو تعلیم حاصل کی اور جو معیارِ زندگی اپنایا اس میں اردو کا کردار نہ ہونے کے برابر رہا۔ اور یہ معیار گرتے گرتے چوراچورا ہو گیا اور یہ چوراچورا آج ہمیں اپنے بچوں کی زبانوں پر ٹوٹی پھوٹی اردو کی شکل میں نظر آتا ہے۔

ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، ہمارے بچے جو ہمیں اپنی جان سے بھی عزیز ہیں ہم انہیں وہ ورثہ بھی نہیں لوٹا پائے جو ورثہ ہمیں ہمارے بڑوں نے دیا تھا۔ اردو کی جان خطرے میں ہے ہی، ساتھ ہی ہمارے بچوں کی پہچان بھی خطرے میں ہے۔ ہم کیسی نئ قوم چھوڑ کر جا رہے ہیں کہ ان کی چوراچورا اردو ہمیں تو کچھ کچھ سمجھ آتی ہے مگر ہمارے جو بزرگ آج زندہ ہیں، جو اردو کو اس کے اصل روپ میں پہچانتے ہیں ہمارے بچوں سے بات تک بھی نہیں کر سکتے۔

ہم دو نسلوں کے درمیاں کھڑی ایک عجیب نسل ہیں جس نے دادوں اور پوتوں کو ایک دوسرے سے اجنبی کر دیا ہے۔ ہم نے جدت کے نام پر ایک ایسا زہریلا بیج بو دیا ہے جس کی جنس بھی زہر آلودہ ہو گی۔ جو فاصلہ ہم نے پیدا کیا ہے آنے والے بچے شاید اس فاصلے کو اور زیادہ بڑھانے جا رہے ہیں۔

ہمارے دادوں کو تو شاید ہمارے پوتوں کی اشاروں کی زبان سمجھ میں آتی ہو، مگر شاید ہمارے پوتے اتنے زیادہ جدت پسند ہوں کہ ہم ان کے اشارے بھی نہ سمجھ پائیں۔ نہ صرف اردو کی جان خطرے میں ہے بلکہ ہماری پہچان خطرے میں ہے۔

کیا ہم اتنے بے یار و مددگار ہو گئے ہیں کہ اپنی پہچان کی بقا کے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم نے جدت کے نام پر کس قدر جہالت کمالی ہے مجھے تو اس کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔ اور میں اسی شدت سے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح دم توڑتی اردو کی چند سانسیں ہی بحال کر دی جائیں۔

جو کینسر اردو کے اندر سرائیت کر چکا ہے اس کا علاج میرے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ اتنا آسان کے کہ اس کا ذمہ کسی فردِ واحد پر ڈال کر آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اردو کی جان بچانے کا ذمہ ہم سب کو مشترکہ طور پر اُٹھانا پڑے گا وہ کہتے ہیں نا ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ اردو کی جان خطرے میں ہیں

اپنی زبان کے لیے کچھ کیجئے

اپنی پہچان کے لیے کچھ کیجئے

نوک پلک

تحریر: میاں وقار الاسلام

شہر کی کشادہ سڑک کے کنارے خوبصورت ترتیب سے بنے ہوئے عظیم لاشان محل، یا بلند و بالا عمارتیں یا پھر فن کی شاہکار مسجدیں اور مدرسے اگر ان سب کی حقیقت دیکھی جائے تو سیمنٹ، بجری، سریا، اینٹیں، پلاسٹک یا اسی طرح کے اور میٹیریل کے سوا ان میں اور کیا ہے۔

انسان نے طرح طرح کے میٹیریلز کو اکھٹا کیا ایک تناسب سے انہیں مکس کیا اور نوک پلک سنوارتے سنوارتے طرح طرح کے شاہکار نمونے کھڑے کر دیئے۔

انسان اپنی تخلیق پر اتراتا بھی ہے، دوسروں کو حیران کر دینے پر بھی قادر ہے۔ دنیا جہان کی چیزیں جن کا انسان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا ایجاد ہوئیں انسان نے انہیں جدت کی علامت منوایا پھر ان کا بے پناہ استعمال کیا اور پھر سب مٹی ہو گیا۔ اور سب مٹی ہی تھا بس نوک پلک سنواری گئی اور اپنے آثار باقی چھوڑ دیئے

انسان اسی مٹی کی زمین کو پھاڑتا ہے اور پرانی ایجادات کو اکٹھا کر کے میوزیم میں رکھتا ہے اور کئی سال پہلے کی ایجادات کو اکھٹا کر کے پھر آج کے لوگوں کو حیران کرتا ہے کہ ایک وقت تھا کہ جب کی ایجادات آج کی نوادرات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

تو انسان کی حیرانی پرانی چیزوں میں بھی اتنی ہی شدت سے ہے جتنی کہ نئی ایجادات میں ہے۔ زمانے گزر گئے دنیا کیا تھی۔۔۔ پھر کیا ہوئی۔۔۔ اور اب کیا ہوتی جا رہی ہے۔ نوک پلک سیدھی کرنے کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔

علم کا ایک سمندر ہے جو ایک طرف سے سوکھتا ہے تو دوسری طرف پھیلتا چلا جا رہا اور زمانوں پر اپنی چاپ چھوڑتا چلا جا رہا۔ اور جدت کے اس عمل میں ہر روز ایک نئی تیزی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ایک جینریشن ہے جو بوڑھی ہو چکی ہے اور اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر ہو چکی ہے۔ مگر چند دہائیوں پہلے ان کی جو رفتار تھی وہ دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسری طرف ایک اور جنریشن ہے جس کی رفتار اتنی تیز ہے کہ بوڑھی جنریشن یہ تصور بھی نہیں کر سکتی کہ یہ جینریشن دیکھتے ہی دیکھتے کتنا آگے چلی جائے گی۔ نوک پلک ٹھیک کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

حیران کر دینے والی چیزوں کی ایجادات کے پیچھے ایک تو وہ خزانے ہیں جو زمین کے اندر قدرت نے کسی نہ کسی شکل میں رکھ دیئے ہیں اور دوسرے وہ خزانے ہیں جو اللہ تعالی نے انسان کے ذہن میں رکھ دیئے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔

تو اللہ اپنی طرف سے جس پر جتنا چاہتا ہے علم ظاہر کر دیتا ہے اور جتنا چاہتا ہے پوشیدہ رکھتا ہے۔

مگر راز بھی انہیں پر کھلتے ہیں جو راز پانے کی جستجو رکھتے ہیں۔ تو جو جتنی جستجو کرتا ہے اور جس قدر اپنی نوک پلک درست کرتا ہے اتنی کشش اس میں پیدا کر دی جاتی ہے اور اسی قدر وہ لوگوں کو حیران کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ کیا دیکھنے والا اور اندھا برابر ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔ یا پھر کیا سننے والا اور سماعت سے محروم شخص برابر ہو سکتے ہیں۔

بد قسمتی سے بہت سے شعبوں میں ہم حیران کرنے کی بجائے حیران ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دنیا میں ایجادات کے ماہر لوگوں کے پاس بھی وہی وسائل ہیں جو ہمارے پاس ہیں مگر ہمارے وسائل ہمارے لیئے مٹی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ اسی مٹی کو سونے میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جس طرح سے میٹیریلز کی نوک پلک سنواری جاتی ہے بالکل اسی طرح سے انسانوں کی تربیت کر کے ان کی بھی نوک پلک سنواری جاتی ہے۔
ایک ہی طرح کے انسان ہیں مگر کچھ انسان ایسے ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کے نشانات ختم نہیں ہو سکتے جو کام انہوں نے نسل انسانی کے لیے کیئے اس کی مثال ہمیشہ قائم رہے گی۔

وہیں بہت سے انسان ایسے ہیں کہ جن کی نوک پلک نہیں سنواری گئی۔ ایسے انسانوں کی حیثیت شاید چرند پرند سے زیادہ نہ ہو کہ آئے کھایا پیا اور چلے گئے۔

ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اس تیز رفتار دنیا میں آج ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمارے ارد گرد کی قومیں اپنے آپ کو سنوارتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل گئی ہیں۔

ایک طرح سے دیکھا جائے جو تو اوسط یہ ہے کی ترقی یافتہ قوموں کا ایک فرد جسے تعلیم اور تربیت دی گئی ہے اور اس کی نوک پلک بہتر کی گئی ہے وہ ترقی پذیر قوموں کے کئی درجن افراد سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہم بھی کبھی اپنی نوک پلک درست کریں گے، کیا ہم بھی اپنے آپ کو ترقی یافتہ قوموں کے افراد جتنا موثر بنائیں گے۔

یا ہماری قسمت میں صرف حیران ہونا ہی رہ جائے گا،

دعا گو، میاں وقار الاسلام

قانون تقلیل افادہ مختتم

تحریر: میاں وقار الاسلام

۔اس کا اگر سادہ الفاظ میں ترجمہ Law of Diminishing Marginal Utility معاشیات میں ایک قانون ہے "قانون تقلیل افادہ مختتم" یعنی کے کم ہونے کا قانون ہے۔ یہ قانون بیان کرتا ہے۔(Marginal Utility) کیا جائے تو یہ مارجنل یوٹلٹی

ایم بی اے کا پہلا سمیسٹر تھا اور پہلی کلاس اکنامکس کی تھی۔ کلاس میں ہمارے اکنامکس کے ٹیچر نے اٹینڈنس لینے کے بعد کچھ سٹوڈنٹس سے کے بارے میں پوچھا۔ بد قسمتی سے سب سے پہلے جس طالب علم کا انتخاب کیا گیا اس نے Law of Diminishing Marginal Utility کی ڈیفینیشن کرنے کی Law of Diminishing Marginal Utility گریجویشن میں اکنامکس نہیں بلکہ معاشات پڑھی تھی تو اس نے بجائے قانون تقلیل افادہ مختتم کی تعریف کر دی۔۔۔ اور بیچارے کی شامت آ گئی

ہمارے پروفیسر محترم جو کہ اکنامکس میں پی ایچ ڈی تھے اور گورنمنٹ آف پاکستان کے اکنامکس کے کنسلٹینٹ بھی تھے معاشیات ان کے سر Law of Diminishing Marginal سے گزر گئی تو انہوں نے کہا کہ میں دیکھوں گا کہ تمہیں اس ادارے میں داخلہ کس نے دیا تمہیں کا بھی نہیں پتا۔ Utility

یہ ہے ہمارے ہاں اردو کا میعار، اردو کا مقام اور اردو کی کل حیثیت

نہ ہی مسئلہ پروفیسر کا ہے نہ ہی سٹوڈینٹس کا نہ ہی اداروں کا بلکہ ہم نے اپن کاندھوں پر طرح طرح کا بوجھ رکھا ہوا ہے یہاں انگریزی بولنے والوں کو اردو کا کمپلیکس ہے اور اردو بولنے والوں کو انگریزی کا کمپلیکس ہے اور دونوں ہی طبقات ایک دوسرے کا مزاق اڑاتے ہیں حالانکہ دونوں ہی اپنی جگہ پر غلط ہیں۔

آج ہماری عام فہم اردو میں انگریزی کی ٹرمز اتنی اچھی طرح سے شامل ہو چکی ہیں کہ ہم اگر پوری بات با قاعدہ اردو میں کریں تو کسی کو اردو سمجھ ہی نہ آئے اس لیئے ہماری فارمل اور ان فارمل گفتگو میں بھی انگریزی کے الفاظ کا استعمال ایسے کیا جاتا ہے کہ جیسے یہ تمام الفاظ اردو کے ہی ہوں۔

افسانوں اور ڈراموں میں تو انگریزی زبان کے الفاظ کی شمولیت عام سی بات ہے مگر شاعری میں بھی اس کا رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اور میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ اگلے 5 یا 7 سال میں یہ رجحان خاطر خواہ حد تک بڑھ جائے گا تو جو لوگ آج یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شاعری کو کیا ہوتا جا رہا ہے وہ یہ دیکھیں کہ ہماری عام فہم زبان کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔

شاعری میں الفاظ مریخ سے نہیں اتریں گے انہیں الفاظ کی آمیزش ہو گی جو معاشرے میں عمومی طور پر بولے جائیں گے۔ پرانی اردو کے الفاظ اپنا مطلب کھو رہے ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیئے اردو کی ڈکشنری کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جبکہ انگریزی کے الفاظ اتنے عام فہم ہو رہے ہیں کے ایک ان پڑھ بھی ان الفاظ کا مطلب جانتا ہے تو پھر ان الفاظ کا رنگ شاعری پر کیوں نہیں آئے گا

ہمارے اردو کو ماہرین اردو کے ساتھ ہوتا ہوا یہ ستم دیکھتے رہے سہتے رہے اور دانت پیستے رہے یہاں تک کہ بیچاروں کے دانت بھی ختم ہو گئے اور ان کی جگہ انگریزی مصنوعی ٹوتھ نے لے لی ان کی اپنی جنریشن نے تو انہیں سنا نہیں اور ان کی تھرڈ جینریشن بھی انہیں دادا دادی یا نانا نانی کہنے کی بجائے گرینڈ فادر یا گرینڈ مدر کہنے میں زیادہ فخر محسوس کرتی ہے

ہائے اردو۔۔۔

ہماری 50 فیصد اردو کو انگریزی کھا گئی ہے ہماری اردو نے گذشتہ 50 سالوں میں یہ ترقی کی ہے

آج سے 30 سال پرانی فلموں اور ڈراموں میں کہیں کہیں انگریزی نظر آتی تھی آج کل انگریزی زیادہ اور اردو کہیں کہیں نظر آتی ہے

اگر ہم اسی طرح سوتے رہے تو اردو کا بس نام ہی اردو رہ جائے گا

آج ہم اپنی محبت کا اظہار آئی لو یو کہہ کر اور نفرت کا اظہار آئی ہیٹ یو کہہ کر کرتے ہیں۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے۔ مگر اس کے لیئے بھی ہم اتنا ہی کہیں گے آئی ایم سوری

میاں وقار الاسلام

عوامی شاعر کہاں گئے

تحریر : میاں وقار الاسلام

اردو ادب سے وابستہ لوگوں سے سوال بھی ہے اور ایک پیغام بھی، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ عوامی شاعر کہاں گئے

جب ایوب خان کا دور آیا

تیرا پاکستان ہے نہ میرا پاکستان ہے

یہ اس کا پاکستان ہے جو صدرِ پاکستان ہے

اقتدار ایوب خان سے جنرل یحییٰ خان کو منتقل ہوا تو حبیب جالب نے اُن کو بھی اسی لب و لہجے سے مخاطب کیا کہ

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا

اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

"حبیب جالب کا بھٹو کو "خراج تحسین

میں قائد عوام ہوں

جتنے میرے وزیر ہیں سارے ہی بے ضمیر ہیں

میں انکا بھی امام ہوں میں قائد عوام ہوں

جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو حبیب جالب نے نئے آمر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

ظلمت کو ضیاء صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا

آمریت کے بعد جب پیپلز پارٹی کا پہلا دور حکومت آیا اور عوام کے حالات کچھ نہ بدلے تو جالب صاحب کو کہنا پڑا

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھریں ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

بے نظیر کے بعد نواز شریف کا دور شروع ہوا اور اُنہوں نے عوام کے لئے اپنے بلند بانگ دعوے شروع کئے تو عوامی شاعر بیماریوں کی پوٹ بن گئے تھے مگر اُن سے رہا نہ گیا۔ میاں نواز شریف نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں عوام کے لئے اپنی جان قربان کرنے کا مشہور بیان دیا تھا جس پر جالب نے کہا کہ

نہ جاں دے دو، نہ دل دے دو
بس اپنی ایک مل دے دو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا
تم اس کا بل دے دو

حبیب جالب

ظلم کے خلاف لکھنے کی روایات کم ہوتی جارہی ہیں، سسکیاں لیتی ہوئی عوام کا کوئی پرسانِ حال نہیں، اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عنوان : ادب اور ادیب

تحریر : میاں وقار الاسلام

مسئلہ ادب اور ادیب کا نہیں ہے، مسئلہ انسان اور انسانیت کا ہے۔ وقت اچھائی اور برائی کو الگ کرکے رہتا ہے، ہو سکتا ہے اچھائی اور برائی کا راستہ قریب قریب رہا ہو مگر منزل یکسر مختلف ہوتی ہے۔ بڑے بڑے شاطر، چلاک اور مفاد پرست لوگ دیکھے تھے اپنے وقت کے باکمال اور باصلاحیت، مگر کچھ کو آسمان کھا گیا اور کچھ کو زمین نگل گئی۔

ایک طرف ادب یہ سکھاتا ہے کہ اپنی تعریف ایسے کرنی ہے کہ اس میں انکساری کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ دوسری طرف ادب یہ بھی سکھاتا ہے کہ دوسرے کی تعریف ایسے کرنی ہے کہ اسے پلکوں پر بیٹھا لینا ہے۔ کچھ لوگ ادب کو بڑائی مارنے اور دوسروں کو چھوٹا ثابت کرنے کے لیئے بھی استعمال کرتے ہیں، بڑا ادیب بننے کے چکر میں بیچارے چھوٹا انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔

حضرتِ انسان بہت سی باکمال صلاحیتوں کا مالک ہے، اللہ نے انسان کی تخلیق ہی ایسی کی ہے کہ وہ کائنات کو حیرت میں ڈال سکتا ہے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اپنے فن اور اپنے کمال کو اپنی بہتری اور فلاح کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے اور اپنی تباہی کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے۔

انسان کو یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ عاجزی اور انکساری کا رستہ اختیار کرے اور اپنے رب کو بھی راضی کرے اور اس کی مخلوق کو بھی راضی ہے۔ انسان کو یہ بھی اختیار ہے کو وہ غرور اور تکبر کا راستہ اختیار کرے اور اپنے لیے بربادی اور تباہی کا سامان پیدا کرتا رہے۔ اللہ نے غرور کرنے والوں کے غرور کو مٹی میں ملایا ہے، اور غرور کرنے والوں کو عبرت کا نشان بنایا ہے اور غرور کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امن اور سلامتی کا ایک سیدھا راستہ مقرر فرمایا ہے اور جو لوگ امن اور سلامتی کے ضامن ہوتے ہیں وہ اپنے راستے سے نہیں بھٹکتے۔

معاشرے میں تباہی پھیرنے کے لیے انسان کو ایٹمی دھماکے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بس تھوڑی سی خود غرضی ہی کافی ہوتی ہے۔ ادب صرف ادیب پر ہی واجب نہیں ہے، بلکہ ہر انسان پر واجب ہے جو معاشرے میں امن اور سلامتی چاہتا ہے۔

ادب وہ نہیں ہے، جسے ہم کتابوں میں چُن دیتے ہیں، بلکہ ادب وہ ہے جو ہمیں ہماری ادبی یا غیر ادبی محفلوں میں نظر آتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ غیر ادبی محفلوں میں ادب زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے تو شاید یہ بات کچھ زیادہ غلط بھی نہ ہو۔

ادب کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ادب و آداب سیکھیں، اپنی زندگی میں بھی نمایاں بہتری لائیں اور معاشرے پر بھی ادب کے ذریعے اچھے اثرات مرتب کریں۔ ادب تو ہوتا ہی اچھا ہے، مگر آج ہم ایسے مقام پر ہیں، کہ شاید ہمیں بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ اچھا ادب کیا ہوتا ہے، اور برا ادب کیا ہوتا ہے۔

شاید آج بڑا ہونا بہتر ہونے سے زیادہ اہم ہو گیا ہے، مگر تربوز جتنا بھی بڑا ہو، اگر وہ میٹھا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ایسی بہت سی فیلڈز ہیں جن میں لوگ بڑے پروفیشنلز کو بننا چاہتے ہیں مگر بہتر پروفیشنلز نہیں بننا چاہتے۔ ظاہری چمک دمک بہت سے لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے، مگر اندر خلوص نام کی چیز نہ ہو تو باہر کا بناؤ سنگھار بے سود ہی رہتا ہے۔

آج کل کتابیں گنی جاتی ہیں کہ فلاں ادیب کی 100 کتابیں ہیں اور فلاں کی 1000 کتابیں ہیں۔ بہت زیادہ کتابیں بڑا قلمکار ہونے کی نشانی تو ہو سکتی ہیں، مگر بہتر قلمکار بہت کم کتابوں والا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی بھی ادبی شخصیت سے اس کا مقام چھیننا ممکن نہیں، مگر دوسروں کا مقام چھیننے والے اپنے آپ کو دھوکا تو دیتے رہیں گے۔

اگر کسی کے پاس اختیار ہے، پیسہ ہے، طاقت ہے تو وہ شہرت تو پا سکتا ہے، مگر وقار ہمیشہ خلوص دے کر ہی حاصل کیا جاتا ہے۔

رسمی تعریف

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہم ادبی لوگ، ہم مہذب، ہم تہذیب والے، ہم قلمکار، ہم ادیب، ہم شاعر، ہم افسانہ نگار، ہم پُر امید، ہم امن پسند، ہم نڈر، ہم بہادر، ہم نرم مزاج، ہم حساس، ہم ایمان دار ہم مخلص، ہم انسانیت پسند، ہم محبِ وطن، ہم وفادار۔ ہم خوب لکھتے ہیں، ہم کمال لکھتے ہیں، ہم سچ لکھتے ہیں، ہم صاف لکھتے ہیں، ہم سوچ لکھتے ہیں، ہم خواب لکھتے ہیں، ہم تعبیر لکھتے ہیں، ہم جذب لکھتے ہیں، ہم احساس لکھتے ہیں، ہم خوشی لکھتے ہیں، ہم غم لکھتے ہیں، ہم خیال لکھتے ہیں، ہم امید لکھتے ہیں، ہم سوال لکھتے ہیں، ہم جواب لکھتے ہیں۔

جب ہم بولتے ہیں تو ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے، ہم میٹھے الفاظ بولتے ہیں، ہم نمکین لفظ بولتے ہیں، ہم کڑوے کسیلے لفظ پی جاتے ہیں، ہم ادب بولتے ہیں، ہم آداب بولتے ہیں، اور اگر کوئی سوگوار ہوتا ہے، جو ہم ہمت لکھتے ہیں، ہم حوصلہ لکھتے ہیں، ہم صبر لکھتے ہیں تو اس غمگیں انسان کا دل بہل جاتا ہے۔ ہم خزاؤں میں بھی بہار لکھتے ہیں، ہم غموں میں بھی عید لکھتے ہیں، ہم ہجر میں بھی وصال لکھتے ہیں، ہم فساد میں بھی امن لکھتے ہیں، ہم دشوار راستوں پر بھی آسانی لکھتے ہیں لکھتے ہیں، ہم منزل لکھتے ہیں، ہم اندھیروں میں بھی کرن لکھتے ہیں۔

جب ہم کسی کی تعریف لکھتے ہیں ہیں، تو آفرین لکھتے ہیں، واہ واہ لکھتے ہیں، بہت خوب لکھتے ہیں، شاندار لکھتے ہیں تو لکھنے والے کا حوصلہ بڑھتا ہے، لکھنے والے کا اعتماد اور اس کا خود پر یقین بڑھتا ہے۔ جب ہم کسی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں تو ہم کسی بھی شخصیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں، اس کی عزت بڑھاتے ہیں، اس کی شان بڑھاتے ہیں، اور اس کا اپنے قلمکاروں پر مان بڑھاتے ہیں۔ ہم عزت دیتے ہیں، ہم عزت پاتے ہیں۔ ہم اپنے قلمکاروں کا وقار بڑھاتے ہیں۔

جب ہم کسی کے استاد ہوتے ہیں، تو اپنے شاگرد کی رہنمائی کرتے ہیں، اسے پڑھاتے ہیں، اسے سمجھاتے ہیں، اسے زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی دیتے ہیں، اسے راستہ دیکھاتے ہیں، ہم محبت کرتے ہیں، ہم فرض نبھاتے ہیں، جب ہم کسی کے شاگرد ہوتے ہیں، تو اپنے استاد کی تعظیم کرتے ہیں، کسی کو پگڑی پہناتے ہیں، کسی کی انگلی پکڑتے ہیں، کسی کے قدموں پر چلتے ہیں، کسی کا حکم مانتے ہیں کسی کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں، ہم ادب کرتے ہیں، ہم فرض نبھاتے ہیں۔ ہم اپنے قلمکاروں کا احترام کرتے ہیں، ہم کسی کو تحفے میں چادر دیتے ہیں، کسی کو تحفے میں قلم دیتے ہیں، کسی کو تحفے میں کتاب دیتے ہیں، کسی کو نام دیتے ہیں، تو کسی کو اعزاز دیتے ہیں۔ ہم عزت دیتے ہیں، ہم پیار دیتے ہیں ہم مان دیتے ہیں ہم وقار دیتے ہیں۔ ہم احسان کرتے تو جتاتے نہیں، اور کوئی ہم پر احسان کرتا ہے تو ہم اسے کبھی بھولتے نہیں۔

ادب وآداب میں اگر یہ توازن قائم رہے تو ادب کی دنیا ادب کی جنت ہی نہ بن جائے۔ ادب کی دنیا میں بہت سی چیز بہت بہتر بھی نظر آتی ہیں، مگر بہت سی جگہ پر یہ صورتِ حال یکسر مختلف بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تعریف ہمیشہ تعریف ہی نہیں رہتی بلکہ یہ رسمِ تعریف میں بھی بدل جاتی ہے۔ رسمِ تعریف، رسمِ تعریف، رسمِ تعریف کب رسمِ خوشامد میں تبدیل ہو جاتی ہے، شاید ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ پھر تعریف کرنے والا اور جس کی تعریف ہو رہی ہوتی ہے دونوں ہی حقیقی دنیا سے دور، کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مگر تکلیف دہ پہلو ایک اور بھی ہوتا ہے، جب تعریف کسی کے اثر ورسوخ اور طاقت کو دیکھ کر ہی ملنے لگے، یا پھر جو مال و دولت رکھتا ہو وہ تعریف کو کسی مادی چیز کی خرید کر زیبِ تن کر لے، یا اپنے مہمان خانے میں سجالے۔ اور حالت یہ ہو کہ عزت والے بے نشان ہو جائیں یا پھر منہ چھپاتے پھریں۔ تو پھر تعریف صرف رسمِ تعریف ہی بن کر رہ جاتی ہے اور اس کے معانی جاتے رہتے ہیں۔

ادب وآداب کو سمجھنے والے استاد بھی کمال تھے، اور ادب وآداب کو سمجھنے والے شاگرد بھی کمال تھے۔ مگر رسمِ تعریف نے ہمارا تعارف ہی کچھ اور پیش کیا ہے۔ بڑے بڑے الفاظ کھوکھلے لگتے ہیں، کسی سے تعریف سنتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، کسی کی تعریف کرتے ہوئے بھی گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ معروف سے مشہور اہم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور لوگوں کے دل بھی بہت تنگ سے تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم کسی کی تعریف سنتے ہیں تو دل میں جلن ہوتی ہے اور کسی پر تنقید کرتے ہیں تو کلیجے میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وقت نے لوگوں کے مزاج پر عجیب رنگ چڑھا دیا ہے جو شاید زنگ سے بھی زیادہ آلودہ ہے۔ جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں، اور جو ہوتا ہے وہ نظر ہی نہیں آتا۔

جب کوئی نئی کتاب آتی ہے تو اس پر تعارفی اور تعریفی مضامین پیش کئے جاتے ہیں، بہت سے مضامین حقیقت پر بھی مبنی ہوتے ہیں مگر بہت سے مضامین حقیقت سے بہت دور بھی ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ چھوٹے قلم کار کی حوصلہ افزائی کے نام پر اتنی تعریف کر دی جاتی ہے کہ ایسے لگتا ہے کہ دورِ حاضر میں اس سے بڑا کوئی قلمکار ہی نہیں ہے۔ اور بعض دفعہ بڑے قلم کار کو ایک ایسا مقام دے دیا جاتا ہے جہاں سے کوئی آنے جانے والا اسے دیکھ ہی نہیں پاتا۔ تو یہاں صرف ایک ناانصافی سی ہی نہیں ٹھہرتی بلکہ بہت بڑا ظلم ہو گزرتا ہے مگر کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ ادبی محفلوں میں رسمی تعریف ایک رسم بن چکی ہے اسی لے ہر تعریف کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور پھر بہت سے لوگوں کے قلم ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی چلتے ہیں، اور رسمی راہ کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

میں جب پہلی بات اعتکاف میں بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ باہر جو بھی ہو رہا تھا، بہت غلط ہو رہا تھا، پھر میں نے اپنے آپ سے کئی وعدے کئے جیسے کہ اب کوئی غلط کام نہیں کرنا، اب فلاں فلاں نیکی کرنی ہے، اب فلاں فلاں چیز سے بچنا ہے، مگر جیسے ہی دس دن کے اعتکاف کے بعد باہر قدم نکالا تو بہت سے کام ویسے ہی چلنے لگے جیسے پہلے چل رہے تھے۔ انسان اپنے رب سے ہزار بار وعدے کرتا ہے اور پھر ہزار بار توڑ بھی دیتا ہے۔ شاید اسی لیے ہم انسان ہیں، فرشتے نہیں ہیں، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ بہت بڑا رکھا ہے کہ ہم بار بار اس میں سے گزرتے رہتے ہیں اور اپنے کاموں کی معافی مانگتے رہتے ہیں، شاید اسی لی توبہ کو بند گلی نہیں بنایا گیا۔ جو رسموں کے طور پر چل رہا ہوتا ہے وہ

سب ٹھیک نہیں ہوتا، ہمیں اپنے اندر مزید جھانکنے کی ضرورت ہے، ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا اندر کیا کہتا ہے اور ہم باہر کیا کرتے ہیں۔ ہمیں خود سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیے کہ کیا ہماری رسمی سوچ کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر ظلم تو نہیں ہو رہا۔

ایسا لگتا ہے جیسے ایک دھوبی گھاٹ ہے اور ہم بہت جلد اپنے کپڑے میلے کر لیتے ہیں اور پھر دھوبی گھاٹ کا رخ کرتے ہیں پھر سے اپنے اعمال کا لباس دھوتے ہیں اور پھر سے اپنے لباس کو دوبارہ آلودہ کرنے نکل پڑتے ہیں۔ ہم انسان ہیں، ہم رسمی تعریف بھی کرتے ہیں، ہم رسمی تنقید بھی کر جاتے ہیں اور ہم اپنے اعمال پر واپس غور بھی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو تبدیل بھی کرتے رہتے ہیں۔ انسان کے مزاج میں، انسان کے انداز میں، انسان کی سوچ اور فکر میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے اور انسان اپنے آپ کو پہلے سے بہتر کرنے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہے۔

کچھ لوگ رسمی تنقید کے عادی ہوتے ہیں، وہ کبھی کسی کی تعریف نہیں کرتے بلکہ یہ تلاش کرتے رہتے ہیں کب کوئی غلطی کرے اور وہ اسے آ دبوچیں۔ آپ نے کسی کی ضرورت سے زیادہ تعریف کر دی، کسی کی ضرورت سے کم تعریف کر دی، یا آپ کے ادب و آداب میں کہیں کوئی کمی بیشی رہ گئی تو یہ رسمی تنقید کرنے والے آپ کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ انہیں تنقید کے لیے کسی کی ایک عدد غلطی ہی چاہیے تھی اور وہ انہیں بس مل جاتی ہے۔ اور پھر ایک جنگ کی سی صورتِ حال بن جاتی ہے۔ اور پھر تنقید کرنے والوں کی بھی اپنی ہی دنیا ہے جب وہ تنقید کرنے پر آتے ہیں اور حقیقت کی دنیا سے بہت دور نکل جاتے ہیں، اُس دنیا میں جس کا اِس دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

تنقید کرنے والوں کے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی ہوتا ہے، رسمی تعریف ان کو بھی چاہیے ہوتی ہے، مگر انہیں واپس تنقید بالکل بھی نہیں چاہیے ہوتی۔ واپس تنقید برداشت کرنا ان کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی۔ اگر ان سے کہیں کوئی غلطی ہو جائے تو پھر یہ پوری طرح سے جلال میں آ جاتے ہیں۔ کیوں کہ تنقید کرنا تو صرف انہیں کا حق تھا، تو پھر کوئی ان کی واپس تنقید کیسے کر سکتا ہے۔ رسمی تعریف کرنے والوں کی ایک الگ دنیا ہے، اور رسمی تنقید کرنے والوں کی بھی ایک الگ دنیا ہے اور یہ دونوں طرح کے لوگ آپس میں توازن بھی کھو رہے ہیں۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جس کی تعریف کی جانی چاہیے اس کی تنقید ہوتی رہتی ہے اور جس کی تنقید ہونی چاہیے اس کی تعریف ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ باقاعدہ اثر و رسوخ استعمال کر کے یا مال و دولت کا سہارا لے کر اچھے قلمکاروں کی ادبی میدان سے بے دخلی کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح کئی سچ لکھنے والے گھر بیٹھ جاتے ہیں اور سچ لکھنے کی سزا پاتے رہتے ہیں اور کئی جھوٹ لکھنے والے بڑے بڑے عہدوں کی زینت بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے عہدے بھی رسمی عہدے لگتے ہیں، یقین ہی نہیں آتا کہ بڑا عہدہ رکھنے والا بڑا قلمکار بھی ہو سکتا ہے یا پھر معمولی سا قلمکار جس نے رسمی تعریفوں کے سارے قافلے ہی خرید لیے ہوں۔

نہ تعریف اتنی بری چیز ہے اور نہ ہی تنقید اتنی بری چیز ہے، مگر تعریف اور تنقید کا نظریہ ضرورت کے تحت توازن بگاڑ دیا جاتا ہے۔ کسی کی بڑھ بڑھ کر تعریف ہونے لگتی ہے اور کسی کی بڑھ بڑھ کر تنقید ہونے لگتی ہے، نہ ہی رسمی تعریف کا حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی رسمی تنقید کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں لوگ پھر اپنی من پسند شخصیت کو ہی سب کچھ مانتے ہیں اور اپنی ناپسندیدہ شخصیت کو کچھ بھی نہیں مانتے تو ایسے میں ادب و آداب دونوں ہی، ادبی دنیا کو خدا حافظ کہہ کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اگر ہم تعریف اور تنقید کا توازن قائم رکھیں تو شاید معاشرے میں کچھ بہتری ہو پائے۔ نہ کسی کی تعریف ایسی ہو کہ سیدھی سیدھی خوشامد میں بدل جائے، اور نہ ہی کسی کی تنقید ایسے ہو کہ سیدھی سیدھی بھڑاس نکالنے سے مثال ہو۔

سوچنے میں، لکھنے میں، بولنے میں اور کہنے میں یہ دونوں باتیں بہت اچھی لگتی ہیں، اور لگتا ہے کہ شاید اب کی بار انصاف ہو پائے گا، مگر ایسا کبھی ہوتا نہیں۔ انصاف قائم کرنا، کسی بھی معاشرے کی تشکیل نو جیسا ہی ہے۔ جیسے ہی انصاف کی بات کی جاتی ہے تو ظالم لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں اور مظلوم لوگ دوسری طرف اور پھر اگر کسی معاشرے کی بنیادیں ہی کھوکھلی ہوں تو ہار انصاف کا ہی مقدر ہوتی ہے۔ مطلب پرست طبقہ کبھی اپنے مطلب سے پیچھے نہیں ہٹتا جب تک اس پر آہنی ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ اور جب تک آہنی ہاتھ نہیں پڑتا مفاد پرستوں کے مفادات ہمیشہ ہی پورے ہوتے رہتے ہیں۔

ہر انسان کی اپنی الگ سوچ ہے، الگ زاویہ ہے، الگ نظریہ بھی ہے اور ہمارے احساسات اور جذبات بھی مختلف ہوتے ہیں، عام طور پر انسان غلط نہیں ہوتے اور اپنے اندر جھانک بھی سکتے ہیں اور اپنی اندر چھپی برائیوں کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں اور اپنے لیے بہتر معاشرہ بھی قائم کر سکتے ہیں، مگر افسوس ناک صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ بکریوں کو بھیڑیوں سے مشاورت کرنی پڑتی ہے۔ اسی لیے مثبت اور فلاحی سوچ رکھنے والے افراد ان بھیڑیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، یا پھر اپنے بچاؤ کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

طاقتور طبقے نے تو جو کرنا ہے سو کرنا ہے، مگر ہم نے بھی اپنی انفرادی یا اجتماعی سطح پر کچھ کرنا ہے۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو آپس میں تقسیم نہ کریں، اور آپس میں ایک ہوں، باہمی اتفاق رکھیں اور مضبوط ہوں اور جہاں تک ہو سکتے اپنی حصے کی نیکی ضرور کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری چھوٹی چھوٹی کاوشوں سے شہر بھر میں روشنی نہ ہو مگر ہم اپنے حصے کا دیا تو جلا سکتے ہیں۔

اگر ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کو لوگوں میں مختلف انداز سے تقسیم کیا ہوا ہے، اور یہ کوئی دوسرا اہم سے اچھا بھی سوچ سکتا ہے اور ہم سے اچھی رائے بھی رکھ سکتا ہے، اور یہ کہ جس طرح ہمارے احساسات اور جذبات ہیں اس طرح دوسرے کے بھی احساسات اور جذبات ہیں تو صورتِ حال یکسر مختلف ہو سکتی ہے۔ ہم گنہگار بھی ہیں، ہم کمزور بھی ہیں، ہم قصوروار بھی ہیں، ہم خطاوار بھی

ہیں۔ بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کے بعد بھی ہم سے بہت غلطیاں ہوتی ہیں، اور زیادہ سیکھنے سمجھنے والوں سے تو شاید اور بھی زیادہ غلطیاں ہو جاتی ہیں کیوں کہ وہ خود کو باقیوں سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں اور یہیں انسان پھنس جاتا ہے جہاں وہ خود کو غلط سمجھنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔

بڑائی مارنے والے اور مغرور لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت مثالیں بیان کی ہے اور ساتھ یہ بھی مثال دی ہے کہ یہ غور کیوں نہیں کرتے کہ انہیں کس طرح پیدا کیا ہے، اُچھلتے ہوئے پانی سے، جو ان کے کپڑوں کو لگ جائے تو یہ اسے پہننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ پھر انسان بڑی بڑی باتیں کرنے والا ہوتا ہی کون ہے۔ خدا جانے ہم میں کون سی ایسی چیز ہے جو ہم میں اتنی ہوا بھر دیتی ہے کہ ہم اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں یا پھر ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور پھر ہم پھٹ بھی جاتے ہیں، یا پھٹ پڑتے ہیں، یا پھاڑ دیے جاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اللہ ہمیں سیکھاتا ہے کہ انتہائی بری باتوں کا جواب بھی انتہائی اچھے انداز میں دو، ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پیارے رسول کی تعلیمات کیا تھیں، ہم سب جانتے ہیں، ہم بہت کچھ جانتے ہیں مگر جب عمل کی باری آتی ہے تو ہم بہت کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اللہ ہماری رہنمائی فرمائے، اور ہمارے دلوں کو مضبوط اور مستحکم بنائے۔

چھوٹی سے چھوٹی کوشش بھی بہتر ہے ایک جھوٹی کوشش سے، قلم ایک ہتھیار ہے، اہل قلم ہونا اللہ کی ایک خاص نعمت ہے اور اس نعمت کا قرض فرض سمجھ کر پوری سچائی کے ساتھ اتارنا چاہیے، نہ ہمارے لفظوں سے کسی کی رسمی خوشامد ہوتی رہے اور نہ ہی ہم اپنے لفظوں سے کسی پر تنقید کے بے جا تیر چلائیں، قلم کے ذریعے جو قوموں پر ظلم ہوتے ہیں وہ کسی بھی مہلک ہتھیار سے کم ظلم نہیں ہوتے، اللہ ہماری حفاظ فرمائے، دعا گو، میاں وقار الاسلام

قابلِ تعریف، قابل توہین

تحریر: میاں وقار الاسلام

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی انسان کی محبت میں پوری دنیا کو بھول جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی انسان کی دشمنی میں پوری دنیا کو بھول جاتا ہے۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ صرف اللہ کی ذات ہی قابل تعریف ہے۔ مگر ہم اللہ کی ہی بنائی ہوئی چیزوں کی تعریف میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم اپنے خالق کی بنائی ہوئی چیزوں میں کھو جاتے ہیں، ہم اپنے خالق کی بنائی ہوئی چیزوں سے بہت جلد متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور بہت جلد معمولی باتوں کی وجہ سے اُکتا بھی جاتے ہیں۔

جو رشتے چلتے چلتے ہمارے لیے بے معانی ہونے لگتے ہیں، ہم بھول جاتے ہیں کہ انہیں رشتوں پر چل کر ہم آگے بڑھے ہوتے ہیں۔ ہم بہت سی بہتر سے بہتر چیزوں کے لیے بہت بہتر چیزیں چھوڑتے جاتے ہیں۔ ہر شخص خواب دیکھتا ہے، خواب دیکھنا اچھی بات ہے، مگر خوابوں کی دنیا میں اکثر انسان اپنی حقیقت سے دور ہونے لگتا ہے۔

دنیا عجب کھیل تماشا ہے، جس نے کھیل اچھے سے کھیلا وہ بھی ہار گیا اور جیسے کھیل نہیں آیا وہ بھی ہار گیا۔ محنتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو فائدہ دیں اور دوسری وہ جو بالکل فائدہ نہ دیں بلکہ گھاٹے کا سودا ثابت ہوں۔ بے سود محنتوں کا حساب ایسے ہی ہے جیسے گنتی کا نمبر 1 ہو اور اس کی الٹی جانب صفروں کا اضافہ کیا جاتا رہے اور وہ بہت محنت کے بعد بھی 1 ہی رہے۔ بے عمل محنتیں دیکھنے میں تو بے شمار لگتی ہیں مگر جب شمار کیا جاتا ہے تو اس کا حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔

معاشرے کے لیے ایک باپردہ اور باحیا عورت قابل تعریف نہیں ہے، شاید معاشرے کی روش ہے کہ اسے چمکتے دمکتے بے پردہ چہرے اچھے لگے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی جھوٹی تعریفیں عورتوں کے حق میں فائدہ مند بھی ثابت ہوں گی یا نہیں۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا جھوٹی تعریف کرنے والے مردوں کی پکڑ نہیں ہو گی۔

ہم جب قلم اُٹھاتے ہیں اور عورتوں کے حسن پر لکھتے چلے جاتے اور اپنی سوچوں کو جس طرح کے گمانوں سے معطر کرتے ہیں تو کیا ایسے گمانوں کا حساب نہیں ہوگا۔ ہمارے گمانوں میں جس کا ذکر ہونا چاہیے تھا وہ خالق تو ہمارے ذہن و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارا گمان آسمانوں کی طرف اُٹھتا بھی ہے تو پھر واپس اُسی معاشرے میں آ گرتا ہے جہاں سے اُٹھا ہوتا ہے۔

ایک شخص بت بناتا ہے، اور اپنے شاندار فن کا مظاہرہ کرتا ہے، لوگ اس کی تعریف کئے نہیں تھکتے، تو جس نے اس فن کار پیدا کیا، اُس نے کبھی خود اپنا احاطہ نہیں کیا کہ اُس کے بنانے والے نے اُسے کس طرح بنایا ہے۔ ہم شاید بت نہیں بناتے مگر جو کچھ بھی ہم بناتے ہیں کیا ہم خود اپنے فن کی پرستش کرنے کے گناہ گار نہیں ہیں۔

بڑے بڑے نام بے نام ہو گئے، جو بڑی بڑی چیز تھے اب کوئی چیز نہیں تو ہم کیا چیز ہیں۔ انسان مرتا ہے تو مر جائے اس سے ذرا بھی فرق نہیں پڑتا مگر انسانیت زندہ رہنی چاہیئے۔ وہ کمائی کمائی نہیں ہے جو دنیا میں رہ جانی ہے، وہ کمائی کمائی ہے جو انسان اپنے ساتھ لے جائے گا۔

ایسی تعریف جو آخرت میں توہین کا سبب بنے وہ تعریف نہیں ہے اور وہ توہین جو آخرت میں تعریف کا سبب بنے وہ توہین نہیں ہے۔

انسان کو اپنی فلاح کے لیے معاشرے کی روائتی روش سے بہت اوپر رہ کر سوچنا پڑے گا، دعا گو ہوں کہ ہمیں ہماری محنتوں کا ثمر ایسا ملے جس سے ہمیں آخرت میں رسوانہ ہونا پڑے۔ آمین

بھاری الفاظ، ہلکا انسان

تحریر: میاں وقار الاسلام

حضرتِ انسان، یہ بڑی حضرت چیز ہے

ایک مثال بیان کی جاتی ہے، کہ ایک اعلیٰ حضرت انسان تھا، انتہائی پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے، لمبا قد، خوبصورت شکل، بہترین لباس زیبِ تن، ہاتھ میں مہنگا ترین موبائل اور جدید ترین لیپ ٹاپ بھی، اس کا گزر ایک گاؤں سے ہوا، تو اس نے دیکھا کہ ایک حقیر حضرت انسان اپنے بہت سے مویشیوں کے ساتھ اس کے قریب سے گزرا۔ تو اعلیٰ حضرت انسان نے اُس غریب حضرت انسان کو روکا اور اس سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ نے کبھی اپنے مویشیوں کو شمار بھی کیا ہے کہ یہ تعداد میں کتنے ہیں۔

تو اُس حقیر حضرت انسان نے جواب دیا کہ کبھی ضرورت بھی نہیں پڑی، وقت بھی نہیں ملا اور میں اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں، تو اعلیٰ حضرت انسان نے جواب دیا کہ اگر میں یہ 2 منٹ میں گن کر بتادوں کہ یہ کتنی ہیں تو، اس پر حقیر حضرت انسان بہت حیران ہوا اور جواب دیا کہ اتنے مویشیوں کو اتنی جلدی گننا تو ناممکن ہے۔ اعلیٰ حضرت انسان نے کہا کہ اگر میں گن دوں تو پھر میرا انعام۔

حقیر حضرت انسان نے جواب دیا کہ اگر تم یہ کر سکتے ہو تو پھر تم بطور انعام اپنے پسند کا کوئی ایک مویشی لے سکتے ہو۔ پھر اعلی حضرت انسان نے اپنی لیپ ٹاپ کو آن کیا اسے سیٹلائٹ فون سے منسلک کیا اور اُس کے مویشیوں کی سکیننگ کی اور بتادیا کہ یہ 200 مویشی ہیں۔

حقیر حضرت انسان بہت حیران ہوا کہ ٹیکنالوجی کتنی ترقی کر گئی ہے اور اس اعلیٰ حضرت انسان سے متاثر بھی خوب ہوا اور اُسے خوشی خوشی کہا کہ اب وعدے کے مطابق اسے جو جانور پسند ہے وہ لے سکتا ہے۔

جب وہ اعلیٰ حضرت انسان اپنی پسند کا جانور اُٹھا کر جانے لگا تو حقیر حضرت انسان نے پیچھے سے آواز دی، اعلیٰ حضرت ایک منٹ بات سنئے۔ تو اعلی حضرت پیچھے مڑے اور پوچھا فرمائے، تو حقیر حضرت انسان نے پوچھا کہ کیا آپ کا تعلق کسی این جی او سے ہے۔

اس پر اعلی حضرت انسان کو حیرانی ہوئی کہ اس حقیر حضرت انسان نے اُسے کیسے پہچانا، ایک تو وہ اسے کبھی ملا نہیں اور دوسرا اس کے پاس کوئی ایسی ٹیکنالوجی بھی نہیں تو اعلیٰ حضرت انسان نے بڑی حیرانی سے پوچھا، حضرت آپ مجھے کیسے جانتے ہیں۔

تو حقیر حضرت انسان نے جواب دیا کہ جب آپ نے مجھے سے بات کی تو آپ بہت پڑھے لکھے اور سمجھدار معلوم ہوئے، پھر آپ دیکھنے میں بھی ایک شاندار شخصیت کے مالک ہیں اور آپ کو ٹیکنالوجی پر بھی عبور ہے جس کا عملی نمونہ بھی آپ نے ابھی ابھی پیش کیا تو میں آپ سے بے حد متاثر ہوا۔

پھر اس حقیر آدمی نے کہا کہ جب آپ نے میرے 199 مویشی چھوڑ کر میری روسی نسل کی کتیا کو اُٹھایا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ اس انسان کا تعلق کسی نہ کسی این جی او سے ہی ہو گا۔

آج کا انسان بہت تعلیم یافتہ ہے، بہت زیادہ ٹیکنالوجی کو سمجھتا بھی ہے، اُس کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ملنا ملانا، اور اس کا رہن سہن بھی بہت متاثر کن ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس ساری ترقی سے اپنی دنیا اور آخرت کے لیے کیا اکھٹا کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے اعمال نامے میں ایک گھٹیا نسل کی کتیا شامل کر رہے جو دیکھنے میں تو پیاری ہو مگر فائدے کے حساب سے صرف کتیا ہی ہو۔

کاش ہم یہ سمجھ سکیں کہ دنیا اور آخرت کے لیے کون سی چیز ہمارے حق میں بہتر ہے اور کون سی چیز ہمارے حق میں بربادی ہے۔

ہم کتنا اچھا بولتے ہیں، کتنے خوبصورت لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں، کیسی کیسی عمدہ مثالیں دیتے ہیں، لوگ ہم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، مگر یہ سب ہماری باہر کی حقیقت ہے، کیا ہمارے اندر کی حقیقت بھی ایسی ہے کہ لوگ اسے جاننے کے بعد متاثر ہو سکیں، یا ہم اپنے آپ کو دھوکا ہی دیتے رہیں گے۔

کچھ لوگ کبھی محبت کا اظہار نہیں کرتے مگر جب وقت آتا ہے تو جان بھی دے دیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ محبتوں کے لاکھوں دعوے کرتے ہیں مگر جب ضرورت پڑتی ہے تو منہ موڑ کے چل دیتے ہیں۔ یہ محبت نہیں منافقت تھی جسے ہم محبت بنا کر پیش کرتے رہے تو ایسی محبت نے نہ ہمیں کچھ فائدہ دیا اور نہ ہی اُس کو کوئی فائدہ دیا جس سے ہم محبت کے دعوے کرتے تھے بلکہ اس نے اسے مایوس ہی کر دیا۔

دعا گو ہوں کہ ہمارے بھاری الفاظ ہمیں ہلکا انسان نہ ثابت کریں، اور یہ بھی کہ دنیا اور آخرت میں ہماری محبتیں ہمیں مایوس نہ کریں۔ آمین۔

میری لائن چوری ہو گئی

تحریر : میاں وقار الاسلام

کسی کی لائن، کسی کا سٹیٹس، کسی کے اقوال، کسی کے مضمون، کسی کے فسانے، کسی کی غزل کسی کے شعر کسی کی نظم چوری ہو جانا کوئی نئ بات نہیں۔ تاریخ لکھنے والوں نے بہت سی حقیقتوں کو غلط کر دیا یہاں تک کے کتابِ الٰہی تک بھی تبدیل کر دی جاتی رہی اور اس حد تک بدل دی جاتی رہی کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کی رہنمائی کے لیے پھر سے ایک نئ کتاب نازل فرمانی پڑی۔

پھر قرانِ مجید کو انسانوں کے دلوں میں محفوظ کر دیا گیا تاکہ اس میں تبدیلی ممکن ہی نہ ہو سکے۔ آج بھی قرانِ مجید پر براہ راست حملے جاری ہیں مگر جس کتاب کو اللہ محفوظ رکھنا چاہے اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے۔

قلم کار جب کوئی بات تخلیق کرتا ہے تو اس کے ذہن میں بہت سی چیزیں چلتی ہیں، ہر انسان کے اپنے اپنے تجربات ہوتے ہیں، اور اپنا اپنا مشاہدہ ہوتا ہے، اور صحیح اور غلط بات کو سمجھ اور پرکھنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اور پھر ہر شخص کے حالات اور واقعات بھی مختلف ہوتے ہیں، تعلیم اور شعور کی سطح بھی مختلف ہوتی ہے۔ اور اس طرح ہر قلم کار کچھ نہ کچھ تخلیق کر کے سامنے لے آتا ہے۔

ایک ہی طرح کی تحریر مختلف انداز میں پیش کی جاتی ہے، اور صرف اندازِ بیاں کی وجہ سے ایک قلم کا مشہور ہو جاتا ہے اور دوسرا پیچھے رہ جاتا ہے۔ بعض دفعہ ٹوٹی پھوٹی تحریر بھی مضبوط تحریر پر سبقت لے جاتی ہے اور بعض دفعہ مضبوط ترین تحریر بھی وہ جگہ حاصل نہیں کر پاتی جو اس کا حق ہوتا ہے۔ تیر سارے ہی اچھے ہوتے ہیں مگر لازمی نہیں کہ ہر تیر نشانے پر لگے۔ بہت کم لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ لوگ ان کی ہر بات کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں، اور وہ جو بھی بات کرتے ہیں وہ دلوں پر اثر کرتی چلی جاتی ہے۔ اور ایسے لوگ سالوں تک دلوں پر راج کرتے ہیں شاید یہ نصیب کی بات زیادہ ہے اور محنت کی بات کم ہے کیوں کہ محنت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر کم ہی لوگوں کو خاص مقام کے لیے چنا جاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو خاص مقام کے لیے چن لیا جاتا ہے ان سے ان کا مقام کوئی نہیں چھین سکتا۔

بہت سے لوگ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ دوسرے لکھنے والوں کی عبارتیں چوری کر کر کے اپنے نام سے لگاتے چلے جائیں اور لوگوں میں مشہور ہو جائیں اور وہ کسی حد تک مشہور ہو بھی جاتے ہیں۔ ایک ایسا حلقہء موجود ہے جو کھلم کھلا ایسا کام کرتا ہے اور کبھی پکڑا بھی نہیں جاتا۔ نہ پکڑا جانا بھی ایک صلاحیت ہے جسے کچھ لوگ بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔

بہت سے لوگ اس خوف میں جیتے ہیں کہ ان کی لکھی ہوئی عبارتیں کہیں چوری نہ ہو جائیں، اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کسی نے چوری کر لی ہے تو آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ سالوں ان کی ٹینشن ہی نہیں جاتی، کئی کئی دن لمبی لمبی بحث، ان کا بس چلے تو ایسے لوگوں کو آگ ہی لگا دیں یا پھر بم دھماکے میں اُڑا دیں۔ کسی نے کسی کا شعر پڑھ دیا، کسی نے کسی کی نظم یا غزل پڑھ دی، یا اپنے نام سے منسوب کر کے سوشل میڈیا پر لگا دی۔ بس پھر ایک طوفان شروع ہوتا ہے اور پھر رکنے کا نام نہیں لیتا۔

ایسے قلم کار جو اس معاملے میں حساس ہوتے ہیں، وہ بھی اپنی جگہ پر غلط نہیں ہیں، ظاہر ہے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کا کلام کسی دوسرے کے نام سے نظر آئے۔ مگر دوسری طرف ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاپی کرنے والے ابھی ذہنی پختگی تک نہیں پہنچے ہوتے اور شارٹ کٹ کے چکر میں ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور پھر ان کو منہ کی کھانی بھی پڑ جاتی ہے۔ مگر یہاں ایک غلطی اور بھی ہوتی ہے۔ کہ ہم کسی نئے لکھنے والے کی غلطی کو اتنا اچھال دیتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر ایک جنگ جیسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ درجنوں فیک اکاؤنٹس سے مختلف ناموں سے ایک ہی قسم کی شاعری پوسٹ ہونے لگتی ہے۔ دونوں طرف سے جھوٹے الزام لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ماحول اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ ایک انار سو بیمار والی بات ہو جاتی ہے۔

جب میں فیس بک پر سرچ کرتا ہوں تو مجھے اپنا بہت سا مواد میرا نام کاٹ کر نامعلوم یا بے نامی پوسٹ کی شکل میں ملتا ہے۔ سبھی چور نہیں ہوتے، کچھ لوگ ایسا محبت میں بھی کرتے ہیں۔ انہیں کوئی لائن اچھی لگی اور انہوں نے اسے اپنے انداز میں لگا کر کچھ دنوں تک انجوائے کر لیا۔ تو اس پر میرا چھوٹے دل کا مظاہرہ کرنا نہیں بنتا۔ بلکہ میں خوش ہوتا ہوں کہ کسی کو ذہن کو میرے الفاظ نے چھوا اور اس نے ان کو عزت دی اور مان رکھا۔ تو کیا فرق پڑتا ہے کہ لکھا کس نے، اگر اسے انجوائے بہت سے لوگ کر رہے ہیں تو میرے لیے تو یہ بات کافی ہو جاتی ہے۔ مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ میری تحریر یا میری شاعری کوئی کاپی کر لے اور اپنے نام سے منسوب کر لے، جب اللہ نے مجھے دوبارہ لکھنے کی صلاحیت دی ہے تو میں اور لکھتا چلا جاؤں گا، کسی کے کاپی کر لینے سے میرا قلم رکنے والا تو نہیں۔ بلکہ مجھے تو محبت کرنے والا ایک ایسا کارواں مل رہا ہے جن کو میں بھی نہیں جانتا اور جو مجھ کو بھی نہیں جانتے۔

میرا یہ ماننا اس لیے بھی الگ ہے کیوں کہ میں اپنی پہچان بطور شاعر کبھی نہیں چاہتا، اور ویسے بھی شاعری میرا سب سے آخری شوق ہے جب دور دور تک کچھ اور کرنے کے لیے نہیں ہوتا تو تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتا ہوں۔ میرے لیے سب سے اہم کام میری پروفیشنل لائف ہے جس نے مجھے وہ سب کچھ دیا جس کی مجھے شاید امید بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف ایسے لکھنے والے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا صرف اور صرف ادب ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کیا ہوتا ہے۔ یقیناً ان کی تکلیف کی شدت بھی اسی طرح ہی ہو گی۔

میرا ماننا ہے کہ آپ نے اگر ایک آم کا درخت لگایا ہے اور اس سے کوئی آم توڑ لیتا ہے تو آپ کو بہت سے اور درخت لگانے چاہیں بجائے آپ ایک آم کو روتے رہیں۔ بڑے دل کا مظاہر کرتے رہنا چاہیے ، بڑے دل والوں پر ہی اللہ کی نعمتیں برستی ہیں، جب کہ چھوٹے دل والوں پر اکثر نعمتیں کم کر دی جاتی ہیں۔ فضل اور برکت کے مالک ہم نہیں ہیں، اللہ ہی مالک ہے اور وہ دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ اگر آپ اچھا لکھ رہے ہیں تو بے خوف لکھیں، آپ کا کلام چوری کر کے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، ہاں اپنے دل کو ہلکان کرتے رہنے سے آپ کا نقصان ضرور ہوتا رہے گا۔ اپنے دل کو بڑا رکھیں، آپ کے دشمن بھی آپ کے دوست بن سکتے ہیں۔ اور دل چھوٹا رکھنے سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے دوست آپ کے دوست ہی نہ رہیں۔

جتنے بھی بڑے بڑے شاعر ہیں تقریباً سب کی شاعری بہت سے شاعروں نے یا تو چوری کی یا غلط ناموں سے منسوب کی مگر کسی بڑے شاعر کی صحت پر ذرا بھی فرق نہیں پڑا، یہاں تک کہ علامہ اقبال اور غالب کی شاعری اور بہت سے نامور شاعروں کی شاعری ابھی بھی چوری ہوتی ہے۔ مگر جو نام انہوں نے بنا لیے سو بنا لیے۔ اب ان کی صحت پر بھی کوئی فرق نہیں پڑنا۔ دراصل کسی کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جس نے نام پیدا کرنا ہے، یا جس کے نصیب میں جو مقام ہے وہ اس کو ضرور مل کر رہتا ہے۔

گندم کے کھیت سے ہزاراوں چیڑیوں کا بھی رزق جڑا ہوتا ہے، مگر اس سے کسان کے رزق میں کمی نہیں آتی، یہ صرف بڑی سوچ اور چھوٹی سوچ کا فرق ہے۔

ادب کے گلشن میں پھولوں کو اہمیت دیں، گو یا کانٹے بھی ساتھ ہوتے ہیں مگر انہیں اہمیت دینے سے کیا فائدہ، پھول تو پھول ہی رہے گا، لوگ جب بھی مانگتے ہیں پھول کہ کر ہی مانگتے ہیں جبکہ پھولوں کی ٹہنیوں پر بہت سے کانٹے بھی ہوتے ہیں مگر ان کا ذکر ہی کب ہوتا ہے۔ پھولوں کی طرح لکھتے رہیں، پھولوں کی طرح ہنستے اور مسکراتے رہیں اور اپنی پہنچان پھولوں جیسی بنائیں اسی سے ہی ادب کا گلشن مہکے گا۔

اللہ نے آپ کو لکھنے کی صلاحیت دی ہے، اس صلاحیت کو انجوائے کریں اور اس صلاحیت کی قدر کریں، اور اس صلاحیت سے لوگوں کو تقسیم نہ کریں۔ پانی کی طرح بہتے رہیں، ایسا ادبی جوہڑ نہ بنیں، یقنا اس سے بدبو پھیلتی ہے۔ اپنے لوگوں پر ابرِ رحمت کی طرح برسیں آپ پر ابرِ رحمت ضرور ہو گی، آمین۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

عشقِ سخن

تحریر: میاں وقار الاسلام

عشقِ سخن کے کئی باب ہیں، کچھ لوگوں کو ادب کی مختلف اصناف کو پڑھنے کا شوق ہوتا ہے تو کچھ کو لکھنے کا، کچھ کو بولنے کا شوق ہوتا ہے تو کچھ کو سننے کا اور آج کل تو میڈیا کا دور ہے تو لوگ پرفارم بھی ویڈیو میں کرنا چاہتے ہیں اور دیکھنا بھی ویڈیو میں پسند کرتے ہیں یہ الگ بات کہ کچھ لوگوں کو ابھی بھی کتاب اپنے سرہانے رکھ کر سونے کی عادت ہے۔

عشقِ سخن کے حوالے سے پہلے پڑھنے کا شوق رکھنے والوں کے احوال پر نظر دوڑاتے ہیں، سکول اور کالج کے زمانے سے ہی رنگ برنگی کاپیاں بنانا، ان میں اپنی محبوب تحریریں جمع کرنا، یہ باتیں شاید اب پرانی ہو گئی ہیں، اب موبائل میں تصاویر، ویڈیوز یا پھر آڈیوز کی شکل میں یا پھر ای بک یا ویب سائیٹس کے لنک وغیرہ محفوظ کر لیے جاتے ہیں اور حسبِ ضرورت انہیں اپنی تسکین یا پھر اپنے دوستوں کی تسکین کے لیے شئیر کیا جاتا ہے تاکہ وہ بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

عشقِ سخن کا اگر موازنہ کیا جائے تو کل کی نسبت آج کے بچوں کے پاس بہت زیادہ انتخابات محفوظ ہیں اور اگر ایک دوسرے کو بھیجنے کی بات ہو تو وہ بھی کل کی نسبت آج بہت تیزی سے ایک دوسرے تک پہنچ جاتے ہیں۔ آبادی کا بڑھنا اور ٹیکنالوجی کا فروغ تو سونے پر سہاگے والی بات ہے۔ آج کے زمانے کے لوگ پڑھتے پڑھتے سینکڑوں سال پرانی تحریروں تک بھی پہنچ جاتے ہیں اور تلاش کرتے کرتے آج کل کے نئے لکھنے والوں سے بھی روشناس ہو جاتے ہیں۔

عشقِ سخن کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو آج کے بچے کل کے بچوں سے بہت زیادہ متحرک نظر آتے ہیں اور کل کی نسبت آج اپنے جذبات کا اظہار زیادہ کھل کر کر سکتے ہیں۔ اور اس بڑھتی ہوئی شدت کے اگر مثبت اثرات ضرورت سے زیادہ ہیں تو منفی اثرات بھی ضرورت سے زیادہ ہیں۔ آج کا انسان کل کے انسان سے بہت زیادہ مصروف نظر آتا ہے اور اسی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے دور کا انسان قریب اور قریب کا انسان دور بھی ہو رہا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں خرابیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔

عشقِ سخن میں دوسری طرف لکھنے کا شوق رکھنے والے افراد ہیں۔ وہ دور گیا جب بچپن کی یادیں ڈائیریوں میں محفوظ کی جاتی تھیں اور پھر ڈائیری غائب ہو جاتی تھی، آج کل موبائل کا زمانہ ہے، معمولی سے معمولی بات بھی نہیں بھولتی اگر بھول جائے تو گوگل ڈھونڈ لاتا ہے۔ تعلیم بھی بچپن سے مخلوط ہے اور شہروں کی چہل پہل بھی پہلے سے زیادہ ہے، رابطے بھی پہلے سے آسان ہیں اور شخصی آزادی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ جو

بات ہزار پردوں میں بھی نہیں کہی جا سکتی تھی آج کھلم کھلا کہی جا رہی ہے۔ شاید اسی بے باکی کی وجہ سے آنے والی جینریشن منٹو جیسے خیالات کی طرف زیادہ راغب نظر آتی ہے۔

عشقِ سخن تو پہلے سے تھا مگر وقت نے اس پر اپنے رنگ بھی نچھاور کر دیئے ہیں۔ لاکھوں تصویریں، آرٹ ورک، محرک تصاویر اور ویڈیوز اور آڈیو ٹونز نے جو جیسے سخن کو چار چاند ہی لگا دیے ہیں۔ شاعری ہو یا پھر عشقیہ کلمات ہوں، شہ سرخیاں ہوں یا پھر اسلامی تحریریں ہی کیں نہ ہوں ٹیکنالوجی ہر طرح کے مواد کو خاطر خواہ سپوٹ کر رہی ہے۔ جو ہم سوچتے ہیں یا لکھتے ہیں وہ رنگ برنگی تصاویر کے ساتھ یا پھر ویڈیو اور آڈیو افیکٹس کے ساتھ چند ہی دنوں میں ہزاروں پڑھنے والوں کے موبائل یا لیپ ٹاپ کی سکرین کی زینت ہوتا ہے۔ اور ہزاروں پڑھنے والوں کے لائکس اور کمنٹس بھی آنے لگتے ہیں۔

ٹیکنالوجی نے جہاں تک پڑھنے اور لکھنے والوں کو سہولیات دی ہیں، وہیں ایسے لوگوں کی دل آزاری بھی بہت کی ہے جن بیچاروں کو ٹیکنالوجی کا استعمال نہیں آتا، وہ لکھتے تو بہت اچھا ہیں مگر ٹیکنالوجی کی سہولت سے فائدہ نہیں اُٹھا پاتے۔ جنہیں ٹیکنالوجی پر عبور ہے وہ اپنی ہلکی پھلکی شاعری، تحریر، یا مضامین وغیرہ بہت سے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں اور بہت سے لوگ انہیں پسند بھی کرتے ہیں اور ان کو فالو بھی کرتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کے وہ لکھتے بہت اچھا ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ نظر بہت زیادہ آتے ہیں۔ تو ٹیکنالوجی کچھ لوگوں کو مایوس ضرور کر رہی ہے جنہوں نے ٹیکنالوجی کو سیکھا نہیں۔ تو ایسے لوگ روز دل برداشتہ ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کو برا بھلا بھی کہتے ہیں اور اس کا استعمال سیکھنا بھی چاہتے ہیں۔

عشقِ سخن لوگوں میں رواں ہے اور بھرپور طریقے سے رواں ہے، اس میں اچھا لکھنے والے لوگ بھی ہیں، اوسط درجے کا لکھنے والے لوگ بھی ہیں اور انتہائی برا لکھنے والے لوگ بھی ہیں مگر وقت سب کی تسکین کرتا چلا جا رہا ہے۔

مگر ضرورت سے زیادہ تسکین نشہ کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ عشقِ سخن اپنی جگہ، لکھنا لکھانا اپنی جگہ پڑھنا اور پڑھانا اپنی جگہ مگر ٹیکنالوجی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو نقصانات بھی ہو رہے ہیں۔ جہاں دوستیاں بڑھ رہی ہیں وہیں رنجشیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ایسے ایسے لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں جنہوں نے زندگی میں کبھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے بھی نہیں آنا۔

کسی کے اشعار اپنے نام سے منسوب کر لینا، کسی کی تحریر چرا لینا، کسی کو فیک اکاؤنٹ سے تنگ کرنا، یا کسی کے اکاؤنٹ کو ہیک کرنا یا کسی کے اکاؤنٹ کی کاپی بنا کر اس کے دوستوں کے فالو کرنا اور پھر بلیک میل کرنا اور کسی اور طرح سے تنگ کرنا۔ ایسی بہت سی برائیاں بھی یہ ٹیکنالوجی لے کر آئی ہے۔ جو لوگ تھوڑے سے سادہ ہیں یا کم عقل کہ لیجئے ان کے ساتھ تو آئے دن ہاتھ ہی ہوتے رہتے ہیں۔

عشقِ سخن چاہے لکھنے کا ہو، چاہے پڑھنے کا ہو دونوں میں کوئی برائی نہیں، مگر اس عشق سے ایک اور چیز بھی متاثر ہو رہی ہے اور وہ ہے لوگوں کی کاروباری اور نجی زندگی۔ بہت زیادہ پڑھنے والے بھی خود کو بہت اکیلا کر لیتے ہیں اور بہت زیادہ لکھنے والے بھی خود کو بہت اکیلا کر لیتے ہیں۔ زندگی میں توازن نہ ہو تو پھر ہر چیز بے کار ہو جاتی ہے۔

شاید کل کے انسان کے پاس وقت بہت زیادہ تھا اور ضروریاتِ زندگی بہت کم تھیں، آج کے انسان کے پاس وقت بہت کم ہے اور ضروریاتِ زندگی بہت زیادہ ہیں۔ کل کا انسان توازن بگاڑنے کے بعد بھی اچھی زندگی گزار لیتا تھا۔ مگر آج کا انسان اگر توازن کھو بیٹھے تو معاشرہ اسے قبول ہی نہیں کرتا۔ وقت کے ساتھ چلنے کے لیے وقت کا ہم خیال ہونا پڑتا ہے۔

ہماری ضروریات چاہے کم ہوں یا زیادہ، مگر ہمارے بچے جو ملک اور قوم کا مستقبل ہیں ان کی ضروریات اب پہلے جیسے نہیں۔ انہیں بہت کچھ چاہیے، نہ صرف وقت اور وسائل چاہیں بلکہ توجہ اور محبت بھی پہلے سے بہت زیادہ چاہیے۔ آج کے بچوں میں تجسّس اور بے چینی بہت زیادہ ہے۔ بہت زیادہ جذباتی بھی ہیں اور بہت زیادہ لگن بھی رکھتے ہیں۔

آج کی جنریشن لوہے کی طرح گرم تو ہے مگر انہیں کندن بنانے کے لیے توجہ بھی اسی طرح کی چاہیے ورنہ ان کے اندر بگاڑ کی صورت بھی اتنی ہی تیزی سے پیدا ہو جاتی ہے۔

جن لوگوں کے والدین بہت بزی رہتے ہیں اور اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں نکال سکتے، وقت بہت جلد ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اور پھر ان کے پاس وقت آ بھی جائے بچے ہاتھ نہیں آتے۔

ایک ستارہ جو آسمان خالی کر گیا

تحریر : میاں وقار الاسلام

جناب راحت اندوری، بھارت کے نامور شاعر، ادیب اور ہندی فلموں کے نغمہ نگار تھے۔ ادب کی دنیا میں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور دیکھا جاتا رہے گا۔ اپنے منفرد انداز اور منفرد کلام کی وجہ سے انہیں پوری دنیا میں پہچانا جاتا ہے اور ادب سے لگاؤ رکھنے والے تقریباً ہر عمر کے لوگ انہیں انتہائی دلچسپی سے سنتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔

جناب راحت اندوری یکم جنوری 1950 میں پیدا ہوئے اور کرونا وائرس پازٹیو ہونے کے بعد مورخہ 11 اگست 2020 کو حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔ ادب کے فلک کا ایک روشن ستارہ اب نہیں رہا، اور سخن کے آسمان میں ان کا خالی پن ہمیشہ رہے گا۔

راحت اندوری، دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور میں اردو ادب کے پروفیسر بھی رہے۔ وہ کئی بھارتی ٹیلی ویژن شوز کا بھی حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے کئی گلوکاری کے رئیلیٹی شوز میں بہ طور جج بھی حصہ لیا ہے۔

راحت کی پیدائش اندور میں یکم جنوری، 1950ء کو ہوئی۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل کے ملازم رفعت اللہ قریشی اور مقبول النساء بیگم کے یہاں پیدا ہوئے، وہ ان کی چوتھی اولاد ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم نوتن اسکول اندور میں ہوئی۔

انہوں نے اسلامیہ کریمیہ کالج اندور سے 1973ء میں اپنی بیچلر کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد وہ 1975ء میں راحت اندوری نے برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔

اعلیٰ ترین تعلیمی سند کے لیے 1985ء میں انہوں نے مدھیہ پردیش کے مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

وہ ایک اچھے شاعر اور گیت کار ثابت ہوئے۔ انہوں نے کئی بالی وڈ فلموں کے لیے نغمے لکھے ہیں جو مقبول اور زبان زد عام بھی ہوئے ہیں۔ انہیں کراچی کے عالمی مشاعرے میں شرکت کرنے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ ان کی اہم تصانیف کے نام یہ ہیں: ''دھوپ، دھوپ''، ''میرے بعد''، ''پانچواں درویش''، ''رت بدل گئی''، ''ناراض''، ''موجود''۔ بحوالہ: پیمانۂ غزل (جلد دوم)۔ انہیں بہت سے قومی اور بین القوامی اعزات سے نوازا گیا۔

: نمونہء کلام

اس کی یاد آئی ہے سانسو ذرا آہستہ چلو
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا
دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے

شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے

آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو

بہت غرور ہے دریا کو اپنے ہونے پر

جو میری پیاس سے الجھے تو دھجیاں اڑ جائیں

نئے کردار آتے جا رہے ہیں
مگر ناٹک پرانا چل رہا ہے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے
روز تاروں کو نمائش میں خلل پڑتا ہے
چاند پاگل ہے اندھیرے میں نکل پڑتا ہے

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

بیمار کو مرض کی دوا دینی چاہئے
میں پینا چاہتا ہوں پلا دینی چاہئے

یہ ضروری ہے کہ آنکھوں کا بھرم قائم رہے
نیند رکھو یا نہ رکھو خواب معیاری رکھو

گھر کے باہر ڈھونڈھتا رہتا ہوں دنیا
گھر کے اندر دنیاداری رہتی ہے

مری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
مرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

بوتلیں کھول کر تو پی برسوں
آج دل کھول کر بھی پی جائے

میں آخر کون سا موسم تمہارے نام کر دیتا
یہاں ہر ایک موسم کو گزر جانے کی جلدی تھی

اب تو ہر ہاتھ کا پتھر ہمیں پہچانتا ہے
عمر گزری ہے ترے شہر میں آتے جاتے

یہ ہوائیں اڑ نہ جائیں لے کے کاغذ کا بدن
دوستو مجھ پر کوئی پتھر ذرا بھاری رکھو

میں نے اپنی خشک آنکھوں سے لہو چھلکا دیا
اک سمندر کہہ رہا تھا مجھ کو پانی چاہئے

ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو

سورج ستارے چاند مرے ساتھ میں رہے
جب تک تمہارے ہاتھ مرے ہاتھ میں رہے

مزہ چکھا کے ہی مانا ہوں میں بھی دنیا کو
سمجھ رہی تھی کہ ایسے ہی چھوڑ دوں گا اسے
میں آ کر دشمنوں میں بس گیا ہوں
یہاں ہمدرد ہیں دو چار میرے

روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

خیال تھا کہ یہ پتھراؤ روک دیں چل کر
جو ہوش آیا تو دیکھا لہو لہو ہم تھے

شہر کیا دیکھیں کہ ہر منظر میں جالے پڑ گئے
ایسی گرمی ہے کہ پیلے پھول کالے پڑ گئے
کالج کے سب بچے چپ ہیں کاغذ کی اک ناؤ لیے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی بیکاری ہے

اک ملاقات کا جادو کہ اترتا ہی نہیں
تری خوشبو مری چادر سے نہیں جاتی ہے

جناب راحت اندوری
اناللہ وانا الیہ راجعون

رشکِ ادب

تحریر: میاں وقار الاسلام

میں نے کہیں ایک بات پڑھی تھی کہ ایک شخص کا اللہ پر یقین نہیں تھا، ایک دفعہ وہ پاکستان آیا، یہاں کی عدالتیں، یہاں کی سیاست، یہاں پر ہونے والی کرپشن، لوگوں کی بے حسی اور بے رحمی، عورتوں اور بچوں پر ہونے والے مظالم اور دیگر مسائل کو دیکھنے کے بعد وہ شخص کہنے لگا کہ اگر ایسے بھی ملک چل سکتا ہے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ ہے۔

بر حال یہ بات تو ایک تراشی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔ جذوی طور پر ہم مان بھی لیتے ہیں کہ کسی حد تک معاملات ایسے ہی ہیں۔ مگر بہت سی چیزیں اس کے بر عکس بھی ہیں۔ میں بھی یقین سے ایک بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہمارا ملک سلامت ہے تو اس کے پیچھے اس ملک سے محبت کرنے والے اور اس ملک پر جان نچاور کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ اور ہر فیلڈ میں موجود ہیں اور بہت کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ برائیاں ہر معاشرے میں ہوتی ہیں اسی طرح اچھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر برائیاں حد سے بڑھ جائیں اور ساری اچھائیوں کو نگل جائیں تو یقینا کوئی بھی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی معاشرہ قائم ہے تو یقنا اس کے پیچھے ایسے لوگ ضرور موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے نظام چلتا رہتا ہے۔

یہاں میں بات ادب کی طرف موڑنا چاہوں گا، ادب حلقوں میں بہت سے پیچیدگیاں ہے، بہت سے مسائل ہیں، بہت سی برائیاں بھی ہیں۔ جیسے کسی بھی حلقے میں ممکن ہیں۔ اسی طرح ادبی حلقوں میں بہت سی اچھائیاں بھی پائی جاتی ہیں جس طرح کہ کسی بھی حلقے میں ممکن ہیں۔ تو ہم برائیوں کی بجائے ذرا اچھائیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اچھے برے تجربات سب کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں ایسے بہت سے دوست ہیں، بہت سے استاد ہیں، اور بہت سے مہربان ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ہر قلم کار کرتا ہے، اور ان کی خدمات کی وجہ سے انہیں ہر سطح پر پزیرائی بھی ملتی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو باوجود اس کے کہ انہیں وہ نہیں ملا جو کہ ان کی حق تھا، مگر وہ ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اور ان کا کام ان کے لیے ہر سطح پر بولتا نظر آتا ہے۔

اللہ کسی کی بھی محنت ضائع نہیں کرتا، جس کی تھوڑی محنت ہے اسے بھی اس کا صلہ ملتا ہے اور جس کی زیادہ محنت ہے اسے بھی اس کا صلہ ملتا ہے۔ وقت کے اتار چڑھاؤ ہر کسی نے دیکھے ہوں گے مگر وقت ہی اتار چڑھاؤ کے تمام زخم بھر دیتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ لوگوں کے گلے شکوے جاتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ برکت ایسی چیز ہے کہ اگر آپ کی زندگی میں پڑ جائے تو دو یا تین سال میں آپ اتنا کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو آپ پوری زندگی میں حاصل نہیں کر سکتے۔ اللہ کے ہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، محنتوں کے صلے جلدی یا پھر دیر سے مل کر ضرور رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ کسی بھی فیلڈ میں محنت اور لگن سے اپنا کام کئے جاتے ہیں وہ اپنے نیچے ایک وسیع کارواں بنا لیتے ہیں محبت کا کارواں، عزت اور احترام کا کارواں اور یہی اصل کمائی ہے۔

بہت سے اعتراضات اور بہت سی نااتفاقیوں کے باوجود بھی اگر ادبی حلقوں کی مقامی، ملکی، غیر ملکی سطح پر بھرپور رونقیں قائم ہیں تو یقیناً اس سیکٹر میں بھی بہت سے اچھے لوگوں کی شمولیت ہے، محنت اور لگن ہے جس کی وجہ سے باوجود کچھ اندھیروں کے ہمیں بہت سی روشنیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

کچھ باتیں ہم سب کو سیکھنے کی بہت ضرورت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کرتا ہے ایک تو یہ کہ انتہائی بری باتوں کا جواب بھی اچھی باتوں سے دیں۔ صبر اور شکر کرتے رہیں، ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے ایک جماعت دوسری جماعت سے بہتر ہو۔ ہمیں عزتیں اچھالنے سے روکا گیا ہے، اور بہت سے ادب و آداب بھی سیکھائے گئے ہیں جو شاید ہی دینِ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب میں دیکھنے کو ملتے ہوں۔

ان شفیق استادوں، ان محترم محسنوں کو سلام ہے جنہوں نے اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کیا، بہت سے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کی، قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور انہیں بہتر مقام تک پہنچنے میں ان کے معاون ثابت ہوئے۔ یقیناً ایسے استادوں پر ادب بھی رشک کرتا ہے۔ وقت بھی رشک کرتا ہے اور ہم بھی رشک کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سر آنکھوں پر بیٹھانے کی ضرورت ہے، انہیں کی وجہ سے ادبی دنیا کی رونقیں برقرار ہیں، ان کا وجود گھر میں بیٹھے بزرگوں کی طرح ہے، بظاہر یہ اتنے محرک معلوم نہ بھی ہوتے ہیں مگر بہت سے سلسلے ان کی محبت کی وجہ سے قائم ہوتے ہیں اور ان کے جاتے ہی آنگن سونے ہو جاتے ہیں۔ یقیناً ان کا وجود ایک چھت کی مانند ہے، یقین یہ ایک گھنے سایہ دار درخت کی مانند سایہ کئے رہتے ہیں۔

دعا گو ہوں، اللہ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اپنے ادبی محسنوں اور ادبی استادوں کی اتنی عزت ضرور کریں جتنی عزت ان کا حق ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جتنا ان کا حق ہے اس سے بھی زیادہ ان کی عزت کی جائے۔ شام ڈھلتے دیر نہیں لگتی، وقت نے اگر آج ان پر شام کر دی ہے تو کل یہ شام باقی سب پر بھی آنی ہے۔ تو جس طرح کا آج ہم تشکیل کریں گے اسی طرح کا کل ہمارا استقبال کرے گا۔

ہم یہ تو چاہتے ہیں کہ ہمارے نیچے جو بچے پروان چڑھیں وہ بہت اچھے ہوں، مگر ہم ان کے لیے اچھے بچوں کی مثال نہیں بننا چاہتے جو ہم سے اوپر ہیں۔ اگر آج ہم کسی کے لیے اچھی مثال بنیں گے تو ہی ہم امید کر سکتے ہیں کہ کل کوئی ہمارے لیے بھی اچھی مثال بنے گا۔ ادب میں حصہ ڈالنا ہے تو پھر ایسے ڈالیں کہ ادب بھی آپ پر رشک کرے نہ کہ خود بھی رسوا ہوں اور ادب کو بھی رسوا کریں۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

شوقِ داد

تحریر : میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں زمین گول ہے، مگر زمین اتنی بھی گول نہیں جتنا گول اسے ہم سمجھتے ہیں۔ زمین کی اصل شکل آپ کے سامنے اس تصویر میں نمایاں ہے۔

داد کی دنیا بھی اسی طرح دیکھنے میں اور سننے میں گول معلوم ہوتی ہے مگر اس کی حقیقت زمین کی اصل شکل سے بھی زیادہ ٹیڑی میڑی ہے۔ اور اس کا ہر کونا ایک الگ ہی منظر پیش کرتا ہے۔

داد کا اصل مطلب تو تعریف کرنا ہے، مگر حقیقت میں داد کے کئی پہلو ہیں، جس نے شاید ادبی حلقوں کا کلچر ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

جب نئے لکھنے والے ادبی حلقوں میں قدم رکھتے ہیں، تنقید کی ایک پُر زور ہوا چلتی ہے جو ان کے قدم اکھیڑ کر انہیں ادبی دنیا سے باہر کر دینا چاہتی ہے۔ جو جس قدر اچھی حوصلہ شکنی کرنے کا ماہر ہوتا ہے اسے اتنا ہی اچھا استاد مانا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے اپنے آپ کو منوانے کے لیے چھریاں تیز رکھی جاتی ہیں۔

شوقِ داد کی سب سے زیادہ ضرورت نئے لکھنے والوں کو ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور ان کے لکھتے رہنے کا عزم پختہ ہوتا ہے۔ عظیم ہیں وہ ادب شناس استاد جو نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کے قدموں کے اُکھڑنے نہیں دیتے۔ اور ادبی دنیا کی تپتی ہوئی دھوپ میں ایک شجرِ سایہ دار کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ جو قلم کار الفاظ کے استعمال کے بنیادی اصولوں سے بھی واقفیت نہیں رکھتا، آنے والا کل اس کے لیے کس قدر عظیم منصب کا منتظر ہے۔ تنقید کرنے والے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور تنقید برداشت کرنے والے کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

ابلیس نے بھی تو یہی کہا تھا کہ میں اس نئے انسان سے بہتر ہوں، مگر فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ انسان فرشتوں سے بھی زیادہ افضل مقام کے حصول کی بھرپور طاقتوں سے مالا مال ہے۔انسانوں سے محبت کرنے والے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے والے انسانوں پر اللہ کے فرشتے بھی آفرین کہتے ہیں۔

بعض دفعہ شدتِ شوقِ داد اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ قلم کاروں کی خود پرستی انتہا پسندی کو چھونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ کچھ قلم کار پہلے نہ بلائے جانے پر، یا پھر باقاعدہ داد نہ ملنے پر لاتعلّقی اپنانے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کرتے۔ بعض ادبی لوگوں کے سخت رویے ہی ادب و آداب کا جنازہ نکالنے کے لیے کافی ہیں۔زبان جتنی بھی لطیف ہو، الفاظ جیتنے بھی میٹھے ہوں دلوں کا زہر سب.برباد کر دیتا ہے۔

وقار کا ایک ہی اصول ہے کہ وقار بانٹنے سے ملتا ہے، عزت صرف عزت دے کر کمائی جا سکتی ہے، دلوں پر یوں ہی راج نہیں کیا جاتا، محبتوں پر ڈاکے نہیں مارے جا سکتے۔بڑا قلم کار ہونا اہم نہیں،.بڑا فنکار ہونا بھی اہم نہیں، کسی سپر پاور کا صدر بن جانا بھی اہم نہیں، اہم ہے.بڑا انسان بننا۔

شوقِ داد بری چیز نہیں، کوئی بھی ہنر اگر تعریف کا حقدار ہے تو اسے تعریف ملنی چاہیے، کم سے کم یہ حوصلہ شکنی کرنے سے تو بہت بہتر ہے۔ مگر شوقِ داد اگر آپ کو یہ احساس دلانے لگے کہ صرف آپ ہی افضل ہیں، اور باقی تمام لوگ آپ سے کم تر ہیں تو اس طرح کی روش آپ کو کم تر ہی کرے گی چاہے آپ جتنے بھی افضل اور محترم ہوں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ خود پرستی ایک دن آپ کو بالکل تنہا اور اکیلا کر دیتی ہے۔ آپ کے لہجے اور آپ کی زبان سے لگائے ہوئے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں، وقت نے ایسا کوئی مرہم ایجاد نہیں کیا جو آپ کے لہجوں کے زخم بھر سکے۔

ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے، لوگوں میں خامیاں تلاش کی جاتی ہیں، اور اگر کوئی خامی ہاتھ آ جائے تو پھر کسی کی پگڑی، کسی کی عزت، کسی کا وقار اس سے اس طرح کھیلا جاتا ہے جیسے کوئی فٹ بال کے ساتھ کھیلتا ہے۔ قانون جنگل کے ہیں مگر انسانوں میں سرائیت کر چکے ہیں، اگر کوئی شیر جتنی طاقت رکھتا ہے تو ہرن کا شکار ضرور کرے گا۔بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھائے گی جیسا کہ انسان کا حیوان بننا انسان کے لیے فضیلت ہو۔

قران میں متکبر انسانوں پر بہت لکھا ہے، کاش کوئی سوچے سمجھے۔ اللہ نے انسان کو عزت دی کہ اسے انسان بنایا انسان نے خود کو ذلیل کیا کیوں کہ جانوروں کی روش اپنائی۔ اگر خود نمائی کے لیے دوسروں کو ذلیل کرنا ضروری ہے تو لعنت ہو ایسی تعریف پر اور لعنت ہو ایسی داد پر جس کی بنیاد صرف جھوٹ پر رکھی جاتی ہے۔

لوگ اپنی ذات میں غبارے کی طرح ہوا بھرتے رہتے ہیں اور جب ضرورت سے زیادہ بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر ہر نوک دار چیز سے دور بھاگتے ہیں کیوں کہ اب ان کا پھٹنا طے ہوتا ہے۔ آپ قلم کار ہیں یا فنکار ہے یا جو بھی ہیں، اتنامت دوڑیں کہ منہ کے بل آ گرنے کا خطرہ ہو۔ داد مانگی نہیں جاتی، تعریف چھینی نہیں جاتی، عزت کا حصول کسی کو ذلیل کرنے میں نہیں ہے۔ کرائے کی داد نے تو آپ سے الگ ہونا ہی ہے۔

پیپر بک اور ڈیجیٹل بک

تحریر : میاں وقار الاسلام

قلم اور کاغذ کا رشتہ بہت پرانا ہے، شروع شروع میں اخبارات، بینرز، پلے کارڈز، کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ جیسے جیسے ٹیکنالوجی نے ترقی کی قلم اور سیاہی ایک طرف رہ گئی اور پیپر پر ڈیجیٹل انک نے اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ آج شاید ہی کوئی اخبار اور کتاب ہو جو بغیر ڈیجیٹل پرنٹنگ کے مارکیٹ میں آتی ہے۔

دراصل جسے ہم ہارڈ نیوز پیپر یا ہارڈ پیپر بک کہتے ہیں اسے بھی سب سے پہلے ڈیجیٹل تیار کیا جاتا ہے اور تب ہی یہ ممکن ہو پاتا ہے کہ اسے پرنٹ کرکے مارکیٹ میں لایا جاسکے۔

ایک طرف قلم اور سیاہی کا رشتہ آج تاریخ کا حصہ ہے، دوسری طرف ڈیجیٹل بکس ترقی کرتے ہوئے ہماری سوچ سے کہیں آگے نکل چکی ہے۔ آج کی ڈیجیٹل بک صرف ڈیجیٹل بک ہی نہیں ہے بلکہ معلومات کا ایک وسیع سمندر ہے۔

آج ٹیکنالوجی نے ڈیجیٹل بک کو ایک نئی پہچان دے دی ہے، نہ صرف ڈیجیٹل بک کو موبائل، لیپ ٹاپ، ٹیب، یا پھر کمپیوٹر سکرین پر پڑھا جا سکتا ہے بلکہ سنا بھی جاسکتا ہے، اور نہ صرف سنا جاسکتا ہے بلکہ کسی بھی مضمون سے متعلقہ ویڈیوز، اور حوالہ جات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کسی بھی لفظ کے معانی اور اس کے وضاحتی نوٹس بھی ساتھ ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔

تحقیق کرنے والے لوگوں کے لیے ڈیجیٹل بکس کی افادیت کے اتنا بڑھا دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی متعلقہ مضمون کی 2 ڈی اور 3 ڈی بھی دیکھ سکتے ہیں، ورچیول ٹوور بھی کر سکتے ہیں، زوم ان اور زوم آوٹ کرکے بہت ہائی کوالیٹی میں کسی بھی تصویر، پراڈکٹ یا آبجیکٹ کو مزید گہرائی میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ بات صرف یہاں تک نہیں رکتی بلکہ وہ ان معلومات کو بک مارک کر سکتے ہیں، کاپی کٹ اور پیسٹ کر سکتے ہیں اور مستقبل میں استعمال کرنے کے لیے محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔

بات صرف ڈیجیٹل بک تک محدود نہیں رہی، بلکہ کہیں آگے نکل چکی ہے، دنیا کے بڑے بڑے میوزیمز، اور لائبریرز کو ڈیجیٹل کیا جا چکا ہے۔ اور ڈیجیٹل بھی اس طرح سے کیا جا چکا ہے کہ آپ کہ آپ گھر بیٹھے تمام معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح کے جیسے آپ خود وہاں گھوم پھر رہے ہیں۔

یعنی آپ میوزیم کو موبائل یا کسی بھی انٹرنیٹ ڈیوائیس سے ایکسس کریں اور میوزیم کے مختلف حصوں تک رسائی حاصل کریں پھر کسی بھی حصے میں موجود تصاویرز یا ماڈلز وغیرہ کو فوکس کر کے دیکھ لیں، بات صرف دیکھنے تک محدود نہیں، آپ کسی بھی چیز کی مذید تفصیل حاصل کرنے کے لیے آڈیو، وڈیو اور دیگر حوالہ جات بھی لے سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح آپ گھر بیٹھے پبلک لائبریری کو بھی ایکسس کر سکتے ہیں اس میں موجود کتابوں کو دیکھ سکتے ہیں اور مطلوبہ کتاب کو آن لائن پڑھ سکتے ہیں یا ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔

اسی طرح تعلیمی ادارے بھی اپنے طلبہ اور طالبات کے لیے اپنی اپنی لائبریریوں کو ڈیجیٹل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پاکستان میں بھی بہت سے ادارے یہ کام کر چکے ہیں، حکومت نے بھی بہت کچھ کیا ہے اور بہت کچھ ہو بھی رہا ہے۔ لمز یونیورسٹی، پنجاب یونیوسٹی، پنجاب ایجوکیشن بورڈ، ورچیول یونیورسٹی یا اس طرح کے درجنوں اور ادارے، یا پھر لیڈنگ سکول سسٹمز یہ سب بہت عرصے سے اپنی اپنی لائبریریوں کو ڈیجیٹل کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں اور ان کے طالبہ اور طالبات اپنی تعلیم کے حصول کے لیے ڈیجیٹل ریسورسس کا سہارا لیتے آ رہے ہیں۔ آج کے دور میں طلبہ اور طالبات کے لیے ڈیجیٹل بکس اور متعلقہ معلومات کو کمپوٹرائیز کئے بغیر کسی بھی تعلمی ادارے کا مزید سروائیو کرنا تقریبا ناممکن ہے۔

دنیا آج ڈیجٹل لائبریری پارکس جیسے منصوبوں پر کام کر رہی ہے، یعنی آپ کو سرسبز و شاداب پارکس میں چلتے پھرتے، ڈیجیٹل بکس کھڑی نظر آئیں گی، اور اپنی سکرین پر چلتے ہوئے الرٹس سے یہ بتا رہی ہوں گی کہ ان میں کس طرح کی اہم معلومات موجود ہیں اور آپ کو انہیں کیوں پڑھنا چاہیے۔ وہیں راستے میں کھڑے کھڑے آپ کتاب کے تبصرے پڑھ سکتے ہیں، اور پڑھنے والوں کے کمنٹس بھی دیکھ سکتے ہیں، اور بوتھ بکس پر لگے ہوئے کیوآر کوڈ کے ذریعے اپ ان کتابوں کو اپنے موبائل میں کھول سکتے ہیں اور، پبلک پرنٹنگ بوتھ سے آپ کسی بھی معلومات کا پرنٹ بھی حاصل کر سکتے ہیں، یا پھر مطلوبہ مواد اپنے موبائل میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔

جدید ترین ڈیجیٹل سکرین، فیوچر کی بات نہیں ہے بلکہ آپ بہت سے پبلک پارکس، شاپنگ مالز، اور روڈز کے کناروں یا مارکیٹس میں یہ سکرینیں بہت پہلے سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اور بہت سے لوگ تو گذشتہ کئی سال سے انہیں پاکستان میں بھی مینوفیکچر کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ابھی بھی کچھ مہنگی ہیں مگر بڑے اور درمیانے درجے کے اداروں کی قوتِ خرید سے دور نہیں۔

آپ کے ہاتھ میں جو موبائل ہے وہ صرف موبائیل ہی نہیں ہے بلکہ دنیا جہاں کی کتابوں اور معلومات کا مجموعہ بھی ہے، نہ صرف آپ کتابیں پڑھ سکتے ہیں، بلکہ جس طرح کا مواد آپ کو پسند ہو یا جس مصنف کو آپ پڑھنا چاہیں، بغیر کسی خاص محنت کے یہ آپ کے لیے ممکن ہے، اپنے پسندیدہ مصنف کے پیجز، گروپس ویب سائیٹس، ویڈیو چینلز بھی دیکھ سکتے ہیں، اور نہ صرف انہیں براہ راست پیغام بھیج سکتے ہیں بلکہ ان کے پروگرامز کا حصہ بھی بن سکتے ہیں۔

پیپر بک آپ کو کیا دے سکتی ہے اور ڈیجیٹل بک آپ کو کیا دے سکتی ہے اس کا موازنہ کرنا آج کے دور میں بنتا ہی نہیں۔

ہم قران مجید کی ہی مثال لیتے ہیں، جو لوگ قران پڑھنا چاہتے ہیں، انہیں ڈیجٹل قران نے بہت کچھ فراہم کیا ہے، بہت سے سافٹ ویئرز موجود ہیں، خاص کر کے ایزی قران و حدیث جسے میں بہت عرصے پہلے استعمال کر چکا ہیں، مگر اس سے بھی بہتر ریسورسس موجود ہیں۔ یعنی آپ قران مجید کے 10 سے زیادہ تراجم اردو میں دیکھ سکتے ہیں اور انگریزی میں بھی، اس کے علاوہ احدیث کی تمام اہم کتابیں بھی ترجمے کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ پھر قران و احدیث کو مضامین کے حساب سے الگ الگ کیا ہوا ہے تو آپ کسی بھی مضمون کا انتخاب کریں اور متعقلہ آیات یا احدیث پڑھتے چلے ہیں۔ مزید یہ کہ آپ کسی بھی آیت اور حدیث کو مطلوبہ ترجمے اور مطلوبہ تفسیر کے ساتھ کاپی کر کے نوٹس بھی بنا سکتے ہیں۔ اور مزید یہ بھی کہ آپ کسی بھی ترجمے کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ اس کی تلاوت اور ترجمہ سن بھی سکتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ اپ عربی یا اردو یا انگریزی لفظ سے سرچ بھی کر سکتے ہیں۔

اس قدر آزادی، پیپر بک آپ کو فراہم کر پائے یہ بالکل ہی ناممکن سی بات ہے۔

پیپر بک تو دور کی بات، سب سے قیمتی پیپر کسی بھی ملک کی کرنسی ہے، اور آج پیپر کرنسی کو ختم کرنے کی بات موضوع بحث ہے اور چین تو ایک ہی سال میں کئی ٹریلین ڈالرز کی ٹرانزیکشن بغیر پیپر کرنسی کے کر چکا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ بہت جلد وہاں پیپر کرنسی کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہو جائے گا۔

اب لوگ پیپر بک کو یاد کر کرکے روتے ہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے، حقیقت یہی ہے کہ آج پیپر بک کے بغیر تو معاشرہ چلایا جا سکتا ہے مگر ڈیجٹل بکس کے بغیر معاشرہ نہیں چلایا جا سکتا ہے۔ دنیا جس دوڑ میں ہم سے بہت آگے نکل چکی ہے. بر حال ہمیں اسی دوڑ کا حصہ بننا ہے اب ہم کچھوے کی سپیڈ سے آہستہ آہستہ چلتے ہیں یا خرگوش کی سپیڈ سے دوڑتے ہوئے دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں یہ ہم پر ہی منحصر ہے۔

محبت میری نظر میں؟

تحریر: میاں وقار الاسلام

میری نظر میں محبت ایک قرض ہے اور اس قرض کی پوری قدر کرنی چاہیے۔ جہاں سے محبت نصیب ہو وہاں اسے کم از کم اس کی قدر کے مطابق واپس بھی لوٹانا چاہیے، حالانکہ محبتوں کے قرض پوری طرح اتارے نہیں جا سکتے۔ انسان کے پیدا ہونے سے پہلے محبت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ جس جوڑے سے محبت کرتا ہے اُسے اُن کی محبت کا اور اپنی محبت کا عظیم تحفہ عطا کرتا ہے۔ بچے دنیا میں آنے سے پہلے ہی ماں باپ کی آنکھوں کے تارے بن جاتے ہیں اور جانے کیا کیا خواب والدین ان بچوں کے لیے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر وہ ان خوابوں کی تکمیل کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں کون ہے جو رب کا احسان اتار سکے اور اپنے ماں باپ کا قرض اتار سکے۔ اسی طرح ہمارے اساتذہ اور ہمارے دوستوں کی محبت کا بھی ہم پر قرض رہتا ہے جو ہماری زندگی کو خوبصورت بھی بناتے ہیں اور با مقصد بھی۔ محبت کا قرض محبت سے ہی اتارا جا سکتا ہے، جیسی ہمیں جس جس سے محبت ملی ویسی ہی محبت ہمیں ان سب کو واپس بھی دینی چاہیے اور جو محبت معاشرے نے ہمیں دی وہی محبت ہمیں واپس اسی معاشرے کو بھی دینی چاہیے۔ اور اگر اللہ کا فضل ہمارے ساتھ نہ ہو تو ہمیں کچھ بھی نصیب نہ ہو، اللہ اپنے بندوں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے تو ہم سب سے زیادہ مقروض اس ہستی کے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا سو ہمیں اپنے خالق کی محبت کا قرض اس سے اور اس کے لوگوں سے محبت کر کے اتارنا چاہیے۔

مضمون : پختہ رنگوں کی کہانیاں

تحریر : میاں وقار الاسلام

محترمہ فاخرہ پروین صاحب کی مضامین پر مبنی کتاب " جینے کا یہی طریقہ ہے" سے انتساب

زندگی چاہے کئی سو سال کی ہو، سو سال کی ہو، ستر سال کی ہو ساٹھ سال کی ہو یا پھر اس سے کم لگتا تو ایسے ہی ہے کہ جیسے پل بھر میں گزر گئی۔

انسان اپنی زندگی پر مختصر لکھنے بیٹھے تو چند ہی لائنوں میں قصہ تمام کیا جا سکتا ہے اور اگر تفصیل سے لکھنے بیٹھے تو بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی نظر میں اتنا لمبا افسانہ بن جاتے ہے کہ ختم کرتے کرتے عمر کم پڑ جاتی ہے۔

انسان ماں کی محبت میں لکھتا ہے تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، باپ کی محبت میں لکھتا ہے تو الفاظ ہی نہیں ملتے جو ایسی بے پناہ محبتوں کے عکاس بن سکیں مگر پھر بھی لکھا جاتا ہے اور بہت لکھا جاتا ہے اور جتنا بھی لکھا جاتا ہے کم پڑ جاتا ہے۔

اسی طرح دوستوں اور رشتہ داروں اور قرابت والوں پر لکھا جاتا ہے، استادوں پر لکھا جاتا ہے، نئی اور پرانی نسلوں پر لکھا جاتا ہے۔ اور یہ سفر بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان اگر نظر دوڑائے تو پرندوں کی کہانیاں ختم نہیں ہوتیں جانوروں کے قصے ختم نہیں ہوتے، کیا جھیل کیا وادیاں، کیا دریا کیا سمندر کیا قدرتی نظارے، کیا زمین اور کیا آسمان نظر جہاں جہاں پڑھتی ہے کچھ نہ کچھ نکال لاتی ہے۔

اور اگر نظر کہیں نا بھی پڑے تو تخیل کی ایک وسیع دنیا پڑی ہے۔ انسان سوچوں میں کھو جائے تو اتنا دور نکلا جاتا ہے کہ پھر کسی کی آواز بھی اس تک نہیں پہنچی۔ سوچ ہی سوچ میں انسان آسمانوں کی حدوں سے نکل جاتا ہے، سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور قلم کار ایسی ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں کہ اگر ان کی باتیں سونے کے قلم سے بھی لکھی جائیں تو بھی ان کی قیمت کا تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ انسان کا نہیں بلکہ رحمٰن کا ہی کمال ہے جس نے ایک ذرے کو اتنی اہمیت دے دی کہ وہ اشرف المخلوقات ہے گیا۔ خالق نے اس مخلوق کو ایسا بنایا ہے کہ یہ بہت کچھ تخلیق کرنے کی صلاحیوں سے مالا مال ہے۔

مگر یہ صلاحیوں سے مالا مال انسان اپنی وقت تب کھو دیتا ہے جب یہ اپنی ٹھیک ٹھیک پہچان نہیں کر پاتا، اتنی سی پہچان نہیں کر پاتا کہ اسے پیدا کیوں کیا گیا، اور اسے کس نے پیدا کیا، اس نے کرنا کیا ہے اور اس کا ہونا کیا ہے۔ دنیا سے جو زادِ راہ اکھٹا ہوگا اس کا کیا معاملہ ہوگا اور یہ کہ آخر کار اسے اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہونا ہے۔

کہانی ایک ہو یا ہزاروں، انجام اچھا ہو یا برا، لوگ تعریف کریں یا نہ کریں شاید فرق صرف ایک ہی چیز سے پڑھے گا کہ ہزاروں کہانیاں رکھنے والا یہ انسان اپنی زندگی کے اصلی کہانی کیسے لکھ کر آیا ہے۔ کیا اس کی زندگی کی اصلی کہانی اتنی دلچسپ اور حسین ہے کہ اس کی مغفرت کروا سکے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں جو رنگ بھرتے ہیں، ان رنگوں کی حقیقت اللہ کے ہاں کیا حیثیت رکھتی ہے ایسا نہ ہو کہ بے بہا رنگوں سے سجی سجائی زندگی جب اپنا حساب دینے پر آئے تو اس کے سارے رنگ ہی اُڑ جائیں۔

اپنی زندگی کو خوبصورت بنائیں، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی مگر اسے پختہ رنگوں سے سجائیں تاکہ ان کا نکھار دنیا میں بھی رہے، آپ کے دنیا سے جانے کے بعد بھی رہے اور آپ ان رنگوں کے حساب کے دن بھی دیکھ کر خوش ہوتے رہیں۔

اللہ ہمیں توفیق دے، ہم اللہ کی دی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو سکیں اور اپنی زندگیوں کی کہانیاں ایسے پختہ رنگوں سے لکھیں کہ یہ ہمارے لیے زادِ راہ اور آخرت میں مغفرت کا سامان پیدا کر سکیں۔

محترمہ فاخرہ پروین صاحبہ نے اپنے مضامین کے ذریعے پختہ رنگوں کی بہار لانے کا خواب دیکھا ہے، اور قلم کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ فاخرہ پروین اپنے مضامین کے ذریعے اپنے احساسات اور جذبات کو کس قدر کھل کر سامنے لانے میں کامیاب ہوئی ہیں یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ان کی کتاب کو پڑھنے کے بعد ہی کر پائیں گے۔

محترمہ فاخرہ پروین صاحبہ کے ادبی سفر کے لیے بھرپور دعائیں اور نیک خواہشات، ان کا ادبی شوق، لگن، جذبہ، محنت اور محبت اس بات کی طرف واضع اشارہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنا، اپنے والدین کا اور اپنے ملک کا نام روشن کرنے والی ہیں۔

دعا گو میاں وقار الاسلام،

پرنسپل کنسلٹینٹ ماروِل سسٹم،

فاؤنڈر وقارِ پاکستان

افسانوی نظروں کا فسانہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

لکھنے والوں نے یوں تو قدرت کے شاید ہی کسی پہلو پر نہ لکھا ہو، چاہے وہ سورج کا طلوع ہونا ہو، یا پھر چاند کا نکلنا۔ سردیوں کے دھند لکے ہوں یا پھر گرمیوں کی لو کے تھپیڑے۔ بدلتے موسموں کی رنگین بہاریں ہوں یا پت جھڑ کا زرد موسم۔ ڈھلتی ہوئی شام ہو یا پھر پچھلی رات کے رت جگے۔ ساحلِ سمندر سے ٹکراتی لہریں ہوں یا پھر دریاؤں کے بھنور۔ بہتی ہوئی ندیاں ہوں یا پھر پہاڑوں سے پھوٹتے ہوئے چشمے۔ سرسبز پہاڑ ہوں وادیاں ہوں، جنگل ہوں سحرا ہوں یا پھر پھیلے ہوئے میدان۔ انسان کی نظر جہاں جہاں پڑتی ہے لکھنے والوں کو لکھنے پر مجبور کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر لکھنے والا اپنے اپنے انداز سے اپنی اپنی سوچ کے سمندر میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور پھر قدرت کے خزانے باہر نکال لاتا ہے اور پھر اپنے لفظوں میں قید کرتا چلا جاتا ہے۔

ایک طرف تو یہ کل کائنات ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جانے ہے اور دوسری طرف انسان خود ہے۔ نہ کائنات کے حسن کی کوئی حد ہے اور نہ ہی انسان کے حسن کی کوئی حد ہے۔ جتنا انسان قدرت سے متاثر ہوتا ہے اتنا ہی اپنے آپ سے یا پھر اپنے جیسے کسی دوسرے انسان سے متاثر ہوتا ہے۔ دیکھنے میں تو تمام انسان ایک جیسے ہی ہیں۔ مگر جذبات، احساسات، تعلق، رشتے اور لگاؤ انسان کی ایک دوسرے کے لیے اہمیت کو بڑھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ پھر ایک انسان کے اندر چھپے ہوئے قدرت کے اتنے حسین نظارے ہیں جن کی حدود کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔

کوئی کسی کے گیسوں کا اسیر ہو جاتا ہے، تو کوئی کسی کے ہونٹوں کا، کوئی کسی کی آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے تو کوئی کسی کے چہرے پر ایک چھوٹے سے تل کو نہیں بھلا پاتا۔ کوئی کسی کے گالوں پر بنتے ہوئے ڈمپل دیکھتا رہتا ہے تو کسی کو کسی کی مسکراہٹ لے بیٹھتی ہے۔ کسی پر کسی کی خاموشی طاری ہو جاتی ہے تو کسی کو کسی کی باتیں مخمور کرنے لگتی ہیں۔ کسی کا اُٹھنا، بیٹھنا، مڑ کر دیکھنا کئی کئی فسانے بنا دیتا ہے۔

انسان خود ایک چلتی پھرتی کتاب محسوس ہوتا ہے۔ ہر ادا کی اہمیت اپنی جگہ مگر لکھنے والوں نے آنکھوں پر جو لکھا ہے اس کی اپنی ہی ایک اہمیت ہے۔ نظریں جھک جائیں تو ایک کہانی، نظریں مل جائیں تو دوسرا فسانہ، نظریں ٹکرا جائیں تو ایک لمبی داستان۔ نظر بھر کر دیکھنے کی ایک اور بات، نظر پھر لینا کا ایک اور مطلب، نظروں کا تعاقب میں رہنا ایک اور فلسفہ۔ نظریں آسمان کی طرف بھی اُٹھتی ہیں اور انسان نظروں سے گر بھی جاتا ہے۔ کچھ نظریں قہر کی نظریں ہوتی ہیں اور کچھ نظریں انتہائی معصوم نظریں ہوتی ہیں اور کچھ نظریں لگ بھی جاتی ہیں۔

افسانوی نظریں

افسانوی نظروں کا
فسانہ بھی عجیب ہے
افسانوی نظریں
میرے دل کی طرف
جب بھی دیکھتی ہیں
دل کے صفحہ ء قرطاس پر
کوئی نا کوئی نیا فسانہ
لکھتی ہی چلی جاتی ہیں

افسانوی نظریں
جب بھی پلٹ کر آتی ہیں
اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی
نیا فسانہ لے کر آتی ہیں
افسانوی نظریں
جن کے کناوں پر
سرمئی باڑ ہوتی ہے
افسانوں نظریں
جن کی گہرائی
سمندر سے گہری ہوتی ہے

افسانونی نظریں

جن کا تاثر

دل و دماغ پر

چھا جاتا ہے

افسانوی نظریں

جن کی کہانیاں

ابھی باقی ہیں

افسانوی نظریں

جن کے فسانے

ابھی جاری ہیں

افسانوی نظریں

شاعر : میاں وقار الاسلام

ہر نظر کے اپنے اپنے افسانے ہوتے ہیں، کچھ لوگ نظریں گاڑھے رکھتے ہیں، کچھ لوگ نظریں چراتے ہیں مگر کچھ نظریں خود ہی افسانوی ہوتی ہیں۔ نظر کے بارے میں سب کا اپنا اپنا نظریہ ہو سکتا ہے۔ نظریں کھو بھی سکتی ہیں، نظریں خواب بن سکتی ہیں نظروں کے خواب بکھر بھی سکتے ہیں۔ ہر نظر کی اپنی الگ پہچان ہوتی ہے، نظریں مشہور کر سکتی ہیں تو نظریں بدنام بھی کر سکتی ہیں۔

ویلیو کریشن

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان دو طرح سے کامیاب ہو سکتا ہے، ایک اس طرح کہ وہ اپنی زندگی کے اصول بنائے اور پھر ان اصولوں پر مشکل سے مشکل حالات میں بھی سمجھوتا نہ کرے اور زندگی کا سفر جاری رکھے۔ ایک وقت آتا ہے کہ یہی اصول اس کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اور لوگوں کا اس پر یقین پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسرا راستہ قدرے آسان ہے، اس میں کوئی اصول بنانے کی ضرورت نہیں بس اپنی راہ میں آنے والے تمام اصولوں کو توڑتے چلے جاؤ، جو جس طرح سے بھی حاصل ہوتا ہے کرتے چلے جاؤ۔ ایسے لوگوں کا اصل مقصد وقتی فائدہ ہوتا ہے اور اصول جائیں بھاڑ میں۔

ایسے لوگ اصول پرست لوگوں کو آؤٹ ڈیٹیڈ یا پرانے خیالات کا مانتے ہیں، اور بہت سی بازیاں یہ بہت جلد مار لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں مگر لوگوں کا ان پر یقین کبھی بھی پختہ نہیں ہوتا۔

ویلیو کریشن یا اپنی اقدار کو بنانا، منوانا اور ان کا تحفظ کرنا بڑی محنت کا کام ہے، اس کے لیے صبر، ہمت اور حوصلہ چاہیے۔ بہت دفعہ بہت سے مفادات چھوڑنے پڑتے ہیں مگر اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا جاتا، بہت سے نقصان اُٹھائے جاتے ہیں مگر اپنی قدریں خراب نہیں کی جاتیں۔

آپ نے بہت سے ٹیچرز دیکھے ہوں گے جو بے لوث محنت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے طلبہ اور طالبات زندگی کے میدان میں بہت آگے جائیں۔ تو جس طرح کی آبیاری ٹیچرز کرتے ہیں وقت ان کی بے لوث خدمت کو عظیم انسان کی شکل میں لکھ لیتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے ٹیچرز، زندگی کے میدان میں پیچھے رہ جاتے ہوں مگر ان کے طلبہ اور طالبات دنیا میں اپنے آپ کو منوا کر رہتے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیچھے چٹان جیسے ٹیچرز ہوتے ہیں۔

اسی طرح کاروباری اور سماجی زندگی میں یا پھر نجی زندگی میں بھی آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو آپ کی رہنمائی کرتے ہیں اور آپ کی سمت درست کر دیتے ہیں جن کی وجہ سے آپ کو ایک بامقصد زندگی ملتی ہے۔

بے مقصد زندگی تو جانور بھی جی لیتے ہیں، انسان کا کمال ہی یہی ہے کہ وہ ایک بامقصد زندگی جیتا ہے اور اپنے آپ کو ایک عظیم انسان کی شکل میں منواتا ہے۔

اسلام بھی ہمیں اسی بات کا درس دیتا ہے، کہ ہم اپنے آپ کے معاشرے کی برائیوں سے بالکل الگ کر لیں اور اپنی پہچان ایک سلجھے ہوئے باکردار انسان کے طور پر کروائیں۔ جب ہمارا کہیں ذکر ہو تو ہمیں ہمارے نام کی بجائے ہماری قدروں اور ہمارے اصولوں کی وجہ سے پہچانا جائے اور ہم ایسی ویلیوز کریٹ کر کے جائیں کہ لوگ ہمیں اچھے لفظوں میں یاد کریں۔

درخت تو کیکر کا بھی بہت بڑا ہوتا ہے، مگر کیا فائدہ اتنا بڑا ہونے کا کہ آپ کے وجود سے لوگوں کو صرف چبھن ہی ہو۔

حسنِ نظر

تحریر: میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ اندر کا موسم ٹھیک ہو تو باہر کا کوئی بھی موسم ہو بھلا لگتا ہے، اور اگر اندر کا موسم خراب ہو تو باہر کا سہانا موسم بے معانی سا ہو جاتا ہے۔آپ جتنی بھی اچھی مہمان نوازی کر لیں، آپ کے چہرے کا تاثر ہر چیز سے اہم ہوتا ہے۔اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خوبصورتی تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے، جو خوبصورت چیز کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔انسان کے پاس دیکھانے کے لیے سب سے قیمتی چیز اس کا دل ہوتا ہے مگر کچھ ظالم وہ بھی توڑتے ہوئے دیر نہیں لگاتے۔

نفیس انسانوں کی سب سے اچھی بات ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی کا دل نہیں توڑتے۔ کسی کے جذبات کو مجروح نہیں کرتے۔انسانیت ہے ہی یہی کہ آپ کڑوی کسیلی باتیں پی جائیں اور اگر تنقید بھی کریں تو اتنے خوبصورت انداز سے کہ اگلے کو برا نہ لگے۔اسلام بھی ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ انتہائی بری باتوں کا جواب بھی انتہائی اچھے انداز میں دیں۔

دنوں کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، اور موسموں کا بدلنا بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔موسموں کے تبدیل ہونے میں اللہ کے فضل کی نشانیاں ہیں اور تھوڑی سی مشکلوں کے ساتھ بہت سی آسانیاں اتاری جاتی ہیں۔

گرمیوں پر رونے والے یہ نہیں دیکھتے کہ اسی گرمی سے اناج پکتا ہے۔اور سردیوں پر رونے والے یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے اللہ کی کیا کیا نعمتیں اترتی ہیں۔شکر کرنے والے ہر حال میں شکر ادا کرتے ہیں اور اللہ انہیں جس حال میں بھی رکھے اس پر خوش رہتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکرانی نہیں کرتے۔

اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ تم میں کامیاب شخص ہو ہے جو پُر سکون ہے۔اور پر سکون وہی ہوتا ہے جو صبر اور شکر پر قائم رہتا ہے۔جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، ان کے اندر کا موسم ہمیشہ پُر بہار رہتا ہے اور وہ زندگی کے ہر موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جو شخص اللہ کی نعمتوں کا منکر ہو، اس کی زبان پر شکوے اور آنکھوں میں ناامیدی اور دل میں بے چینی ہمیشہ نظر آتی ہے۔ جب انسان کو ایک طرح سے آزمایا جاتا ہے کہ اسے کچھ نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور جب دوسری طرح سے آزمایا جاتا ہے کہ اس سے کچھ لے لیا جاتا ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔

بھلا جو رب انسان کو ایک دفعہ اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے تو اس میں کیا شک ہے کہ وہ دوبارہ انسان کو نہیں نوازے گا۔ یقنا اللہ بڑے فضل کا مالک ہے مگر ہم کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ دل میں ایمان مضبوط ہو تو انسان ثابت قدم رہتا ہے، صبر بھی کرتا ہے اور ناامیدی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ انسان سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنی نظر آسمانوں میں دوڑاؤ، تو کیا تم اس میں کوئی شگاف دیکھتے ہو۔ تمارى نظر ہر بار تھک کر واپس آ جائے گی۔ اللہ اس دنیا کو بنانے میں کوئی کمی نہیں رکھی، بہت کچھ ہونے اور بہت کچھ پا لینے کے بعد بھی ہم ناشکرانی کرتے ہیں تو یہ صرف ہماری آنکھوں کے فریب ہیں، ہمارے دلوں کے مرض ہیں، ہمارے ایمان کی کمی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

دیکھنے والی آنکھ حسنِ نظر رکھتی ہے اور نہ دیکھنے والی بظاہر مکمل مگر اندر سے اندھی اور ادھوری آنکھ اس دنیا کے حسن کو دیکھنے اور سمجھنے سے معذور رہتی ہے۔

اظہارِ رائے یا اظہارِ حرام زدگی

تحریر: میاں وقار الاسلام

اظہارِ رائے کی جس قدر اسلام اجازت دیتا ہے شاید ہی کوئی مذہب اس قدر اجازت دیتا ہے۔ اسلام نہ صرف اظہارِ رائے کی اجازت دیتا ہے بلکہ خاموش بیٹھے رہنے والوں پر بولنے والوں کو سبقت دیتا ہے۔ مگر بولنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ کچھ بھی بولے۔

بولنے کی بھی حدود مقرر کی گئی ہیں۔ ایک انسان کو اجازت نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کرے جس سے کسی دوسرے کی دل آزاری ہو۔ سب سے بری آواز کی مثال گدھے کی آواز سے دی جاتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سب سے برا آواز گدھے کی ہے۔ اور اس سے بھی بری آواز اس شخص کی ہے جس سے کسی دوسرے شخص کی دل آزاری ہو۔

ایک جماعت کو دوسری جماعت پر ہنسنے سے بھی منع کیا ہے، اختلافِ رائے کے باوجود کسی کو رسوا کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہا گیا کہ اگر ہم چاہتے تو سب کو نیک کر دیتے، اور یہ بھی کہا گیا کہ ہم نے بہت سے انسانوں اور بہت سے جنوں کو پیدا ہی دوزخ کے لیے کیا ہے۔

ہدایت کا معاملہ بھی واضع طور پر بیان کر دیا گیا کہ جسے اللہ ہدایت نہ دے، جس کے دل پر اللہ مہر لگا دے، جس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں کان سننے سے محروم ہو جائیں دل مردہ ہو جائیں ایسے لوگوں کو کوئی سیدھے راستے پر لانے والا نہیں مگر جسے اللہ چاہے۔

عزت، حرمت اور غیرت کے معاملات کو جتنی باریکی سے اسلام دیکھتا ہے اتنی باریکی سے کوئی مذہب دیکھ ہی نہیں سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ ہے واحد اور یکتا ذات ہے جسے ہر چیز کا علم ہے اور جو علم انسانوں کو دیا گیا ہے وہ انتہائی محدود ہے اور جو اللہ کے راستے سے دور جا پڑا اسے ہدایت دینے والا دوسرا کوئی بھی نہیں۔

یہ بھی کہا گیا کہ سننے والا اور نہ سننے والا برابر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی بولنے اور نہ بولنے والا برابر ہو سکتا ہے اور نہ ہی اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتا ہے اور نہ مردہ دل اور زندہ دل برابر ہو سکتے ہیں۔

راہِ راست سے بھٹکی ہوئی قوموں کے احوال کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں، جو قومیں راستہ بھٹک چکی ہیں ان سے کسی بھی سطح کی برائی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایسی قوموں کے دلوں میں جو کینے اور تعصب ہے کو کسی دور میں بھی ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ یہاں تک کہا گیا کہ اگر یہ دسترس رکھیں تو تم پر حملہ کر دیں۔

اسی لیے کہا گیا کہ اپنے آپ کو مضبوط رکھیں، تعلیم حاصل کریں اس دنیا کو مسخر کریں تاکہ آپ کی ترقی سے آپ کا رعب اور دبدبا دشمن قوموں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ کمزور لوگوں کا مذاق ہمیشہ اُڑایا جاتا ہے۔ جب کہ مضبوط لوگوں کی طرف کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پوری دنیا میں اگر مسلمانوں کو دیوار سے لگایا جا رہا ہے، اور اظہارِ رائے کی مد میں ہر سطح کی حرام زدگیاں سامنے لائے جا رہی ہیں تو یہ سب کچھ یونہی نہیں ہو رہا۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری کمزوری ہے۔

ہمیں ہر سطح پر متحد ہونے اور مضبوط ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم طاقت میں ہوں گے تو کئی جماعتوں کا اتحاد مل کر بھی ہمارے احساسات اور جذبات سے نہیں کھیل سکے گا اور اگر ہم کمزور ہوں گے تو ہمیں بہت سی حرام زدگیاں دیکھنے اور سننے کو ملتی رہیں گی، کیوں کے جو دلوں کے نفاق ہیں وہ ہم پر کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں۔

اسلام دشمنوں کی روزِ اول سے ایک ہی خواہش ہے کہ اسلام کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، مگر باطل قوتیں ہمیشہ ناکام رہیں ہیں اور قیامت تک ناکام ہی رہیں گی یہ اور بات کہ حق و باطل کر ٹکراؤ بھی قیامت تک رہنا ہے۔ اور پھر فیصلے کہ دن ان کا فیصلہ بھی کر دیا جائے گا کہ یہ لوگ دنیا میں کس طرح شر پھیلانے میں سرگرم رہے۔

اسلام دشمنوں کی یہ خواہش ہے کہ ایک امن پسند قوم کی عزت اور غیرت پر حملے کیے جائیں اور پھر جب وہ اس پر اپنا اظہار رائے ظاہر کریں تو پھر کالے کرتوتوں کے غلاف میں یہ اسلام دشمن اپنا چہرا چھپا کر بیٹھ جائیں۔ اور دوسری طرف یہ سازشیں کریں کے غیرت مند قوم کی حق کے لیے اٹھتی ہوئی آواز کو دہشت گردی کا نام دے کر پھر ان پر چڑھ دوڑیں۔

اللہ تو اسلام دشمنوں کی چالیں خود اسلام دشمنوں پر ہی پلٹنے والا ہے، اور ہمیشہ حق کو ہی غلبہ دینے والا ہے، مگر جو مسلمان ڈر گئے اور ثابت قدم نہ رہے انہوں نے وہی نقصان اُٹھانے ہیں جو وہ پہلے بھی اُٹھاتے رہیں ہیں۔ اسلام ہمیں اس چیز کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اپنے دشمنوں کے

خلاف صف آراء نہ رہیں اور ہر محاذ پر مات کھاتے ہیں۔ اللہ قادر ہے کہ وہ کمزور جماعت کو ایک مضبوط جماعت سے بدل دے اور پھر وہ ہمارے جیسی نہ ہو۔ اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہمارے قدم مضبوط کرے آمین۔

زخم ایک جیسے ہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

آپ کا تعلق جس بھی سیاسی جماعت سے ہے، آپ کا حلقہ یا شہر کوئی بھی ہے، عام پاکستانیوں کے مسئلے تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ نہ زرداری کے علاقے کے لوگ زرداری سے خوش ہیں نہ نواز شریف کے علاقے کے لوگ نواز شریف سے خوش ہیں نہ ہی عمران خان اپنے علاقے کے لوگوں کو خوش کر پایا ہے۔ الطاف کا تو پوچھئے ہی مت۔

خیر یہ تو رہے بڑے بڑے لیڈرز، آپ اپنے چھوٹے چھوٹے علاقوں کا جائزہ لیں، شاید ہی کوئی حلقہ ہو جس کے لوگوں کے حالات بدلے ہیں، یا پھر وہ اپنے لیڈروں سے خوش ہوں۔ بدحالی کا جو صدا بہار موسم ہے اس کا تعلق کسی علاقے یا شہر سے نہیں بدحالی کی فضا نے پورے ملک کا موسم ہی خراب کر کے رکھا تھا اور رکھا ہے، اور شاید آگے بھی رکھے۔

سیاست کو ایک طرف رکھتے ہیں ذرا محکموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ عدالتوں کو عزت دو کی بات ہوتی ہے مگر انہیں عدالتوں میں عوام ذلیل و خوار ہوتی ہی نظر آتی ہے۔ عدالتوں کو بھی چھوڑ دیں، پولیس کی طرف چلے جائیں، کوئی عزت دار بندہ پولیس کے دروازے کے اندر جانا تو کیا، پولیس کے دروازے کے پاس سے بھی گزرنا نہیں چاہتا۔ لوگ ناانصافیاں برداشت کر لیتے ہیں مگر پولیس والوں سے اپنے احوال شئیر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

پولیس اور عدالت کو بھی چھوڑ دیتے ہیں ابھی ان سے بھی بڑے غم موجود ہیں۔ یہ جو پٹواری ہیں یہ نون لیگ والے پٹواریوں کے بھی باپ ہیں۔ ماہر شیطانیات میں تو شاید شیطان بھی بہت پیچھے رہ گیا ہو جس قسم کے شیطان یہ پٹوری ہیں۔

پٹواریوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں، مولویوں کو لے لیتے ہیں، نہیں نہیں مولویوں کو نہیں لیتے یہ لگتے معصوم سے ہیں مگر انہیں چھیڑنا سب سے خطرناک کام ہے۔ غرض یہ کے کہ معاشرے میں جس کو جتنا اثر و رسوخ دیا گیا ہے وہ اتنا ہی طاقت ور ہے اس کی ساری طاقت کمزور لوگوں پر ہی نکلتی ہے۔ آپ ایک ریڑھی اور رکشے والے کو نہیں ہلا سکتے، کیوں کے ایک کو ہاتھ لگائیں گے تو ہزاروں آپ کے خلاف نکل کھڑے ہوں گے پھر آپ کو نہ تو عدالتیں بچا سکتی ہیں اور نہ ہی پولیس والے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ نہ ہی جج کام آئیں گے نہ ہی وکیل کام آئیں گے۔ کیوں کے سب نے پیسے کھانے ہیں اور آپ کا کام مشکل تو کیا ناممکن کر دینا ہے۔ اور پھر آپ نے اپنے آپ کو ہی کوسنا ہے کہ کہاں خود کو پھنسا بیٹھے ہیں۔

کہنے سننے اور لکھنے میں یہ باتیں کتنی اچھی لگتی ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں ایک طبقہ ہے جو طاقت رکھتا ہے اور ایک طبقہ ہے جو کمزور ہے مگر ہم کمزور کے لیے کبھی کھڑے نہیں ہوں گے چاہے وہ حق پر بھی ہو، اور اپنے طبقے کے لیے ضرور کھڑے ہوں گے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ تمام طرح کی بد تمیزیوں اور بد تہذیبیوں کا حق صرف طاقتور کے پاس ہے اور کمزور کے حقوق تو سرے سے ہیں ہی نہیں پھر وہ کمزور چاہے کسی بھی علاقے کا ہو، کسی بھی پارٹی کا ہو یا کسی بھی رنگ نسل کا ہو، کمزور کا سب سے بڑا گناہ ہی یہی ہے کہ وہ کمزور ہے۔

ہم اندر سے چھلنی ہیں اور ایسے چھلنی ہیں کہ دیکھا بھی نہیں سکتے، باہر سے کوئی خود کو پنجابی کہتا ہے، کوئی سرائیکی کہتا ہے کوئی پشتو کہتا ہے کوئی سندھی کہتا ہے اور کوئی اردو بولنے والا کہتا ہے یہ کوئی کچھ بھی کہتا ہے اگر اندر سے دیکھا جائے تو بیچارے زخمی لوگوں کی ایک کی قومیت ہے ایک ہی رنگ ہے، ایک ہی نسل ہے اور ایک ہی فرقہ ہے کیوں کہ اندر سے ہم سب کے زخم ایک جیسے ہیں۔

وقت سے بڑا کہانی باز کوئی نہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

قصے ، فسانے اور کہانیاں، شاید ہمیں یہ لگتا ہے کہ ہم جو لکھتے ہیں وہ ہم ہی لکھتے ہیں۔ قلم تو ہمارے ہاتھ میں ہے اور شاید ہمارے قابو میں بھی ہے مگر خیالات، یقینا خیالات ہمارے قابو سے باہر ہوتے ہیں۔ پھر دل، دل پر بھی ہمارا اختیار کب ہوتا ہے۔ مگر ایک چیز شاید ہمارے اختیار میں ہے، اور وہ ہے نفس۔ ہم نفس کو بے قابو چھوڑتے ہیں تو پھر یہ دل کو پتھر کر دیتا ہے یا پھر اس سے بھی سخت، اور اگر ہم نفس پر قابو رکھتے ہیں تو پھر یہ ہمارا دل نرم کر دیتا ہے اور شاید موم سے بھی نرم۔

قلم دو طرح کے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، ایک ان کے ہاتھ میں بھی جن کے دل نرم ہوتے ہیں، اور دوسرا ان کے ہاتھ میں بھی جن کے دل سخت ہوتے ہیں۔ پھر وقت ان دونوں طرح کے قلم کاروں کو یکساں مواقع دیتا رہتا ہے۔ ہمارے سامنے تیزی سے گزرتا ہوا وقت کیا کیا مناظر نہیں رونما نہیں کرتا۔ ہر منظر کئی کئی قصے اور کئی کئی کہانیوں کو جنم دیتا رہتا ہے۔ بہت سے افسانے بنتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ اور انہیں بکھرے ہوئے فسانوں کو قلم کار چنتے ہیں اور ان کی حالت درست کرتے ہیں اور سادہ کاغذ پر اتار لیتے ہیں۔

داستانیں طرح طرح سے مرتب ہوتی ہیں، کوئی نظم لکھتا ہے، کوئی غزل لکھتا ہے، کوئی کہانی لکھتا ہے کوئی فسانے لکھتا ہے، کوئی مہارت رکھتا ہے تو اس کی رنگ برنگی مصوری تشکیل دے لیتا ہے۔ اور کسی کے سامنے ساری زندگی گذر جاتی ہے مگر اسے اپنے زندہ ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ایسے بہت سے کردار ہیں جن کے پہلوں سے انمول داستانیں جنم لیتی ہیں اور لوگوں کے ذہن و گمان پر چھا جاتی ہیں، مگر جن کے پہلوں سے یہ داستانیں جنم لیتی ہیں انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کس قلم کار نے اس کے کس پہلو سے کیا اخذ کیا اور اسے کون سی صورت میں ڈھالا اور اس سے قلم کار کو کیا کیا پزیرائی ملی۔

ہم نے بھوک اور مفلسی پر بہت لکھا ہوگا، رنج والم پر بھی بہت لکھا ہوگا، بے قصور لُٹ جانے والوں اور مارے جانے والوں پر بھی بہت لکھا ہوگا، دربدر ہو جانے والوں پر بھی بہت کچھ لکھا ہوگا۔ مگر ان لاچار لوگوں کو کیا معلوم کہ ان کے چاروں طرف درد پر لکھنے والے لاکھوں لوگ موجود تھے مگر شاید یہ اندھی نگری تھی ان کے درد کو محسوس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

حسن اور جمال پر بھی ہم بہت لکھتے ہیں، کسی کے تل پر مارے جاتے ہیں تو کسی کی آنکھوں پر دل ہار دیتے ہیں، کسی کی صورت بھلی لگتی ہے تو کسی کے آنچل سے لپٹ جانے کو دل کرتا ہے، ہم سب کچھ لٹا دینے کی بات کرتے ہیں یہاں تک کے جان بھی دینے کی بھی بات کر جاتے ہیں۔ اور پھر وفاؤں کے ایسے ایسے دعوے کرتے ہیں کہ خود وفا بھی شرما جائے۔ مگر شاید ہم اپنی منافقت لکھتے ہیں، ہم مانیں یا نہ مانیں مگر حقیقت یہی ہے۔ ہم ایک افسانوی دنیا میں رہتے ہیں جو شاید لفظوں اور خیالوں کی عکاس ہے، ہمیں یہ ایک عجیب طرح کی جنت محسوس ہوتی ہے، اور شاید ہمیں ہوش رُبا لفظوں کی جنت میں رہنا اچھا لگتا ہے۔

ایک ایسا دل جو ہزاروں پر مرمٹتا ہو، لاکھوں پر جان چھڑکتا ہو، مگر حقیقی زندگی میں کسی ایک بھی شخص کو عزت اور اہمیت دینے سے معذور ہو، ایسے دلوں کی بھی نمائش قصوں اور کہانیوں میں ہو جاتی ہے۔ بہت ہی آسان ہے ایک ہزار وعدوں کا کرنا اور بہت ہی مشکل ہے کسی ایک وعدے کو نبھا کر چلے جانا۔ زندگی میں فلسفے کی بڑی اہمیت ہے، مگر خود زندگی یہ فلسفے سے کئی گنا زیادہ اہم ہے۔

وقت نے قلم کاروں کو بہت کچھ دیا ہے، جتنا آج تک لکھا گیا ہے اس کا شاید ایک یا دو فیصد ہی کاغذوں پر محفوظ ہو، باقی یہاں کون کون سی قومیں آئیں، اور انہوں نے کیا کیا لکھا اور کیا کیا محفوظ کیا ہم اس کے بارے میں بہت کم علم رکھتے ہیں۔ پھر جو آج تک محفوظ ہو چکا ہے اور کاغذوں پر کتابی شکل میں موجود بھی ہے شاید اس کا بھی علم والے ایک سے دو فیصد ہی جان پاتے ہیں کیوں کہ زندگی اس قدر طویل نہیں اور جو علم والے نہیں انہیں تو علم ہی نہیں۔ اور اگر ہم میں سے کسی کو توفیق ہو اور وہ لکھنے کی طاقت بھی رکھتا ہو اور وہ ایک ہزار کتابیں بھی لکھ جائے اور اسے پوری دنیا میں بہت زیادہ پزیرائی بھی ملے تو بھی اس کا حصہ تاریخ کے صفحوں میں اتنا کم ہو گا کہ شاید ہی اس کا شمار کہیں نظر آئے۔

وقت گزرتا جائے گا، ہر روز لاکھوں نئے لکھنے والے جنم لیں گے، اور ایسے ایسے معاملات پر لکھیں گے جن پر کبھی کسی نے پہلے نہ لکھا ہو، اور پھر وہ بھی ایک بند الماری میں پڑا رہ جائے گا جس طرح بہت سے علوم الماریوں میں بند پڑے ہیں۔ نیا وقت اپنے ساتھ بہت نئے علوم لاتا ہے، منظر یکسر بدل جاتے ہیں۔ آج کی دنیا ویسی ہر گز نہیں ہے جیسی ہم نے بچپن میں دیکھی تھی، اور آنے والی دنیا بھی ویسی نہیں ہو گی جیسی ہم آج دیکھتے ہیں۔ وقت اپنے انداز بدلتا چلا جاتے ہے اور ہم اپنے دور میں پرانے ہونے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی کل کی بات ایسے لگتی ہے جسے صدیوں پرانی بات ہو، ہمارے سامنے رونما ہونے والی نئی نئی چیزوں کو اب کوئی جانتا بھی نہیں۔

وقت ہے ہی ایسی چیز، بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتی ہی چلی جا رہی، وقت کے بے لگام گھوڑے پر بیٹھے ہوئے کئی شاہ سوار اپنا نام و نشان کھو چکے ہیں۔ مگر وقت ایک ایسی کہانی بھی لکھتا ہے جو کبھی مٹنے والی نہیں، یہ کہانی ہمارے نامہ ء اعمال کی ہے، یہ کہانی ہم نہیں لکھتے بلکہ یہ کہانی اللہ کے مقرر کئے ہوئے فرشتے لکھتے چلے جاتے ہیں اور اپنے لکھنے میں کوئی غلطی بھی نہیں کرتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری کہانی میں کیا کیا موجود ہے۔ ہم اپنی کہانی کا جائزہ اس طرح سے نہیں لیتے جس طرح ہم دوسروں کی زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ شاید سب سے زیادہ نقص ہمارے

فسانے میں ہی ہو، مگر ہمیں سب سے کم دلچسپی اپنے ہی فسانے سے ہے۔ ہمارے ارد گرد بہت سے معصوم لوگ ہیں جن سے چھوٹی چھوٹی خطائیں ہوتی ہیں مگر ہم ان کے فسانوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ کیوں کہ ہم قلم کار ہیں ہم چیونٹی کو ہاتھی بنانے کا فن بھی جانتے ہیں اور یہ فن بھی جانتے ہیں کہ اپنی زندگی کے افسانوی ہاتھی کو چیونٹی کیسے بنانا ہے۔ مگر اپنی ذات سے دھوکے کا یہ فن آخرت میں ہماری پریشانی اور پشیمانی بڑھا سکتا ہے، یہاں جس فن سے ہمیں عزت اور وقار ملتا ہے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل ہمیں اسی فن کی وجہ سے ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

اللہ اس دن سے ہماری مغفرت فرمائے جس دن ہمیں ہمارے چیونٹی جتنے نظر آنے والے گناہ، ہاتھیوں سے بھی بڑے معلوم ہوں اور وہاں ہمارے قلم کی فنکاری بھی ہمارے کام نہیں آئے گی۔ دعا ہے کہ اللہ ہم پر رحم فرمائے، اور جو زادِ راہ ہم اپنے لیے اکھٹا کریں وہ کل کو ہماری بخشش کی وجہ بنے، نہ کہ یہ وبالِ جان ہو۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

احساسات اور جذبات

تحریر: میاں وقار الاسلام

احساسات اور جذبات تو جانوروں کے بھی ہوتے ہیں پھر کون سا ایسا انسان ہوگا جس میں احساسات اور جذبات نہیں ہوں گے۔ عزتِ نفس جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے پھر کون سا انسان ہوگا جو اپنی بے توقیری پر ذلت محسوس نہ کرتا ہو۔ احساسات اور جذبات صرف دنیا کے کمزور اور لاچار لوگوں میں ہی نہیں ہوتے بلکہ دنیا کے انتہائی کامیاب انسانوں میں بھی برابر ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ اندر سے بہت حساس ہوتے ہیں، مگر باہر سے ان جیسا ثابت قدم کوئی نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اندر سے بہت مضبوط ہوتے ہیں مگر باہر سے حساس ہونے کا ڈرامہ خوب کرتے ہیں۔ کچھ لوگ بہت بڑے کھلاڑی ہوتے ہیں وہ احساسات اور جذبات سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لیے دوسروں کے احساسات اور جذبات کو روند آگے بڑھ جانا معمولی سی بات ہوتی ہے۔

کچھ لوگ احساسات اور جذبات کو اپنی کمزوری نہیں بناتے بلکہ اپنے احساسات اور جذبات کو اپنی کامیابی کے لیے اکھٹا کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے احساسات اور جذبات کو اپنی کمزوری بناتے ہیں اور زندگی کے کسی امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے۔ احساسات اور جذبات کا تعلق جنس سے نہیں ہے، بلکہ انسان سے ہے مرد اور عورت دونوں اپنے احساسات اور جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے ایک کامیاب انسان کے روپ میں دنیا کے سامنے آ سکتے ہیں، یا پھر دوسری طرح ایک ناکام انسان کے روپ میں۔

محبت صرف انسانوں سے یا انسانوں کو پیدا کرنے والے سے نہیں ہوتی، بلکہ لوگ اپنے کام اور اپنے فن سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اپنے کام سے محبت رکھنے والے لوگ باوجود بہت زیادہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہوئے بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ باصلاحیت لوگوں کے ناکام ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کا توازن کھو دیتے ہیں۔

ناکام لوگوں سے اللہ تعالیٰ ایک سوال کرتا ہے کہ کیا تم نے میری زمین کو فراغ نہیں پایا تھا، جو لوگ اپنی صلاحیتوں کے ساتھ اپنی قبر میں ناکام دفن ہوں گے انہیں ضرور سوچنا چاہیے۔

لوگ ناکامیوں کا رونا تو روتے رہتے ہیں، مگر اپنے ارد گرد موجود بہت سی نعمتوں کی طرف نظر نہیں دوڑاتے۔ کچھ لوگوں کے احساسات اور جذبات انہیں اپنی ذات کی قید سے باہر ہی نہیں آنے دیتے۔ اور کچھ لوگ ناکامی کے ڈر سے اپنے احساسات اور جذبات کو دوسرے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

دنیا دو طرح کے انسانوں میں تقسیم ہے، ایک کام چور اور ناکام لوگ جو ہمیشہ حالات اور واقعات کا رونا ہی روتے رہتے ہیں اور کبھی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اور دوسرے کامیاب اور محنتی لوگ جو برے حالات اور واقعات میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں اور محنت کرتے رہتے ہیں اور قسمت کا رونا نہیں روتے۔

میں بہت زیادہ قابل لوگوں کی صحبت سے دور بھاگتا ہوں جنہیں زندگی نے سوائے ناکامیوں کے کچھ نہیں دیا۔ میں درمیانے درجے کے قابل لوگوں کو دوست رکھتا ہوں جنہوں نے زندگی سے سیکھا اور پھر کامیابی کی مثال بنے۔

اللہ تعالیٰ ایک مثال دیتا ہے کہ جب ہم انسان کو ایک طرح سے آزماتے ہیں کے اسے اپنے فضل سے کچھ نواز دیتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتا ہے، اور جب دوسرے طرح سے نوازتے ہیں کہ اس سے کچھ واپس لے لیتے ہیں تو مایوس ہو جاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہہ کی دوبارہ دینے پر قادر نہیں، یا ہم ایک دفعہ دے کر تھک گئے ہیں۔ انسان ہے ہی ایسا، بہت جلد مایوس ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو اپنی مدد آپ نہیں کرتے، یا کوشش نہیں کرتے اللہ بھی ایسے لوگوں کو گمرہ رہنے دیتا ہے۔ یقنا لوگ اپنے رب کی ویسی قدر نہیں کرتے جیسی قدر انہیں کرنی چاہیے۔

اپنے احساسات اور جذبات کو اپنی کمزوری اور ناکامی کی مثال نہ بنائیں، بلکہ خود پر اور اپنے احساسات اور جذبات پر قابو رکھیں اور انہیں مثبت سمت میں استعمال کریں تاکہ آپ کی دنیا بھی بہتر ہو اور آپ کے آخرت بھی خراب نہ ہو۔

دعا گو، میاں وقار الاسلام

جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے

تحریر : میاں وقار الاسلام

یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا

جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے

حبیب جالب

ہر قوم کی طرف ایسے لوگوں کو بھیجا گیا، جو ان قوموں میں رہتے بستے تھے، اور اپنے عمدہ اعمال کی وجہ سے ان قوموں میں اپنی الگ پہچان چھوڑ گئے، کیوں کہ یہ لوگ سچے تھے، حق بات کرتے تھے، یہ لوگ جھوٹوں پر سخت تھے، اور یہ سچے لوگوں پر نرم تھے، اور یہ لوگ اللہ سے ڈرتے تھے، اور آخرت پر یقین رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کا ذکر قران میں بار بار کیا ہے اور ان کے احوال کھول کھول کر بیان کئے ہیں، تاکہ بعد میں آنے والے لوگ ان کے احوال کو پڑھیں اور اپنے لیے سیدھے راستے کا انتخاب کریں۔

مُّحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ تَرٰىہُمۡ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضۡوَانًا ۫ سِیۡمَاہُمۡ فِیۡ وُجُوۡہِہِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِکَ مَثَلُہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ ۚ وَ مَثَلُہُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِہٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیۡظَ بِہِمُ الۡکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا (الفتح 29)

ترجمہ : محمد ﷺ خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں اور آپس میں رحم دل، (اے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ (کثرت) سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں۔ اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔ (وہ) گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر موٹی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔ جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے خدا نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

موسموں کی سردی اور گرمی، دن اور رات کا آگے پیچھے آنا جانا، سورج، چاند اور ستاروں کا ایک محور کے گرد گھومنا اور تاریخِ انسانی اور روز مرہ کے مشاہدات انسان کو بہت کچھ سیکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جن کے دل مردہ نہیں ہوتے، جن کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور جن کے کان سننے کی طاقت رکھتے ہیں، ایسے لوگ حق بات سے بے خبر نہیں رہتے۔

جو لوگ حق بات کو جان لیتے ہیں، وہ اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں، ایسے لوگ خوفِ خدا بھی رکھتے ہیں اور روز حساب پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ پھر سچی باتوں کا ان کی زبان سے رواں ہونا ایک فطری سی بات ہوتی ہے۔

سچے لوگوں کی باتیں دلوں میں گھر کرنے لگتی ہیں اور زندگیوں میں نمائیاں تبدیلیاں لانے لگتی ہیں۔ سچے لوگ، چراغ کی مانند ہوتے ہیں، خود بھی چراغ کی طرح روشنیاں بکھیرتے رہتے ہیں اور جو لوگ ان کے پاس ہوتے ہیں، وہ بھی ان سے اپنے دلوں کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ صرف ایسے لوگوں پر روشنیاں اثر نہیں کرتیں جن کے دل مردہ ہوتے ہیں۔

زندگی بہت مختصر سی ہے، بہت سے لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ باتوں کا سلسلہ لوگوں کے زندہ رہنے تک جاری رہتا ہے، اور پھر سچی داستانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب تک ہم زندہ رہتے ہیں، یہ سچی داستانیں، سنہری یادیں بن کر ہمارے ساتھ زندہ رہتی ہیں۔ جو لوگ کسی سے فیض لیتے ہیں انہیں ہی یہ نعمت ملتی ہے کہ وہ حاصل کئے گئے فیض میں سے کچھ آگے بانٹ سکیں۔

کچھ لوگ جھوٹ سیکھتے ہیں، اور جھوٹی باتیں کرتے ہیں، نہ صرف وہ اپنا نقصان کرتے رہتے ہیں، بلکہ ان کے ساتھ جڑے ہوئے لوگ بھی گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یا تو بھلا دیا جاتا ہے، یا پھر ایسے یاد رکھا جاتا ہے کہ اس سے یاد نہ ہی رکھا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص جھوٹ کو اپنا ساتھی بنائے اور وہ اسے کسی قسم کا فائدہ دے۔ جھوٹ تو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ اور ایسے لوگ اگر کوئی داستان چھوڑ بھی جاتے ہیں تو وہ بھی ذلت اور رسوائی کی داستان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہم انسان ہیں، ہم فرشتے نہیں ہیں، غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، مگر کچھ لوگ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہوتے ہیں، اپنے رب سے مغفرت مانگتے ہیں، اپنی حالت درست کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، یقنا اللہ ان کی حالت پر رحم کرے گا اور انہیں سیدھا راستہ بھی دیکھائے گا۔ مگر کچھ لوگ اپنی غلطیوں کو اتراتے ہیں، غرور اور تکبر سے اکڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی اپنی حالت درست کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اللہ انہیں مہلت دیے جاتا ہے اور پھر آخرت میں اللہ کے ہاں ان کے لیے جہنم کی آگ تیار ہے۔

جو لوگ اپنے قلم کے ساتھ وفا کرتے ہیں، ایک دن ان کا قلم بھی ان کے ساتھ وفا کرتا ہے۔ سچے الفاظ خوبصورت تحفوں کی طرح ہوتے ہیں، یہ کبھی نہیں بھولتے، یہ ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ یہ دور جانے والوں کا بھی احساس دلاتے ہیں۔

بہت سے لوگ غیر محسوس طریقے سے ہماری زندگیاں بدل جاتے ہیں۔ جب وہ ہم میں ہوتے ہیں تو شاید ہمیں اس بات کا احساس بہت ہی کم ہوتا ہے، مگر جب وہ ہنستے مسکراتے ایک دم سے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تو ان کی ایک ایک بات ہمیں یاد آتی ہے۔

محسوس کرنے والے ہی جانتے ہیں کہ احساس دلانے والے لوگ کیا تھے۔ سچائی کے رستے پر چلنے والوں کا سچے لوگوں سے ایک روحانی تعلق ہوتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ سچائی کا سفر شاید ایک ہی داستان ہے جو مختلف انداز میں لوگوں پر اپنے عکس چھوڑتی جاتی ہے۔ مگر یہ عکس جھوٹے لوگوں کو کبھی نظر نہیں آتے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قصور معاف کرے اور ہمیں اپنے سچے اور نیک بندوں میں شامل کرے، نہ کہ جھوٹے اور بدکار لوگوں میں۔ آمین

کیا پھول زخمی کرتے ہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

پھول کو نزاکت سے مثال کیا جاتا ہے مگر کچھ لوگ پھولوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ اتنے نفیس ہوتے ہیں کہ لگتا ہے زیادہ دیر دیکھنے سے ہی میلے ہو جائیں گے۔

کچھ لوگ چھوئی موئی کہ طرح حساس ہوتے ان سے کوئی محبت کا اظہار بھی کر دے تو اسی سے مرجھا جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو ناراضگی کا اظہار بھی ٹھیک سے نہیں کرنا آتا، بس بیٹھے بیٹھے مرنے والے ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگ محبت کا اظہار بھی کچا کھا جانے والی نظروں سے کرتے ہیں بندہ پریشان ہی ہو جاتا ہے کہ کیسی عجیب مخلوق ہے کیسی عجیب تخلیق ہے۔

کبھی آپ نے تتلیوں کو دیکھا ہے، کتنی شوخ، کتنی رنگ برنگی، کتنی چنچل، کتنی شوخ۔۔۔۔ مگر تتلیوں کی یہ ساری ادائیں ہاتھ میں آتے ہی رنگ چھوڑنے لگتی ہیں

کچھ شوخیاں لاحاصل ہوتی ہیں، کچھ رنگ ہوا میں ٹھہرنے کے لیئے ہوتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتے ہیں۔

یادوں کے موسم بھی عجیب ہوتے ہیں، یادوں کے جھونکے بیٹھے بیٹھے چاند رات جیسا ماحول بنا دیتے ہیں ہر طرف عید کے آنے کی نوید سنائی دیتی ہے اور یادوں کے کچھ جھونکے ایسے ہوتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے غمگیں کر جاتے ہیں اور آنکھیں دیر تک بھیگی رہتی ہیں۔

کچھ لوگوں کامزاج بھی بدلتے موسموں کی طرح نرالا ہوتا ہے، کب کون سی ہوا چلے گی اور ان کے مزاج کو کیا سے کیا کر جائے گی خود ان کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔

انسان کیسی عجیب مخلوق ہے سخت جان اتنی کہ مشکل وقت میں کانٹوں پر بھی ہنسی خوشی چل لے گی اور نرم مزاج اتنی کہ پھولوں سے بھی زخمی ہو جائے گی۔

انسانوں پر گولیاں برسالیں، بم مار دیں، مزائل سے اڑادیں، زندہ جلادیں ہار نہیں مانے گا تو سالوں لڑنے اقر نقصان اٹھانے کے باوجود بھی ہار نہیں مانے گا، اور ہارنے پر آئے گا تو ہونٹوں کی ایک معمول سی جنبش سے ہار جائے گا اور بہلنے پر آئے گا اور ایک معمولی سے خار دار پھول سے ہار جائے گا اور اس کے کانٹوں کی چبھن سے بھی لطف اندوز ہو گا۔

انسان بہت پیاری مخلوق ہے، اسے پیار سے جیتنے کی کوشش کریں، پھول کی پتی میں اتنی جان ہے کہ ہیرے کا جگر کاٹ سکتی ہے۔

محبت ہار کر بھی جیت جاتی ہے نفرت جیت کر بھی ہار جاتی ہے۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

قدر دان اللہ کی رحمت

تحریر : میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ ہیرے کی پہچان تو جوہری کو ہوتی ہے۔ ہر فیلڈ شاید کوئلے کی کان کی طرح ہوتی ہے، اس میں اندھیرے پر اندھیرے چھائے ہوتے ہیں اور ان اندھیروں میں چمکتے ہوئے ستارے، موتی یا ہیرے اپنی حقیقی قدر سے ناواقف ہوتے ہیں۔ جب تک ایسے لوگوں تک ان کے قدر دانوں کی رسائی نہیں ہوتی یہ باوجود اس کے کہ ہیروں جیسی اہمیت اور قدر رکھتے ہیں مگر انہیں نہ ہی اہمیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی قدر کوئی کر سکتا ہے۔ جس دن یہ ہیرے اپنی اصل جگہ پر پہنچ جاتے ہیں یہ دنیا میں اپنا وہی مقام بنا لیتے ہیں جو مقام ان کا ہونا چاہیے۔

جیسے زمین کے نیچے اللہ کے خزانے موجود ہیں مگر کھوجنے والے ہی ان خزانوں کو نکال کر لاتے ہیں اور انہیں ان کی اصل قیمت ادا کرواتے ہیں۔ بالکل اسی طرح زمین کے اوپر بھی خاص صلاحیت کے مالک افراد اللہ کے خزانوں کی طرح موجود ہیں۔ مگر ایسے افراد کو بھی ان کا مقام نہیں مل پاتا اور نہ ہی وہ خود اپنی اہمیت کو سمجھ پاتے ہیں۔ جس دن کوئی قدر دان ان کو کھوج لیتا ہے انہیں دنیا میں ایک خاص مقام ملتے دیر نہیں لگتی۔

انتہائی قابل افراد اپنا اصل مقام اس لیے بھی حاصل نہیں کر پاتے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی قدر و قیمت کھوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اپنے قدر دانوں کی قدر ویسی نہیں کرتے جیسی کرنی چاہیے اور باوجود انتہائی قابل ہونے کے ان کے سروں سے وقت کی دھول ہی نہیں ہٹتی۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ باادب بانصیب، ایسے لوگ بھی بد نصیب ہوتے ہیں جو اپنے مہربانوں کی قدر نہیں کرتے اور ایسے فن کار بھی بد نصیب ہوتے ہیں جو اپنے قدر دانوں کی قدر نہیں کرتے۔ جیسے مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اسی طرح قدر دان بھی اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور اپ کے لیے اللہ کے فضل کے راستے کھولتے ہیں۔ ہمیں جو بھی صلاحیت دی جاتی ہے اس میں اگر اللہ کا فضل ہی شامل نہ ہو تو اچھی سے اچھی صلاحیت بھی بے کار ہو جاتی ہے۔

صاحبِ کردار ہونا ایک الگ سے صلاحیت ہے، مگر یہ اتنی اہم ہے کہ اگر کردار نہ ہو تو کوئی صلاحیت ہی نہیں رہتی اور اگر ہو بھی تو شرمندگی کا باعث بنتی رہتی ہے۔

آپ کے ارد گرد جو لوگ ہیں ان سے محبت ، شفقت اور عزت واحترام کے رشتے کو برقرار رکھنے کا کہا گیا ہے، اور جو لوگ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ معیاری تعلق نہیں رکھ پاتے ایک دن ایسا ضرور آتا ہے کہ ان کے سارے تعلق بے معانی اور بے وقعت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

غرور اور تکبر آتا ہی تب ہے جب انسان یہ سمجھنے لگ جائے کہ اسے جو ملا ہے وہ صرف اپنے ہی بل بوتے پر ملا ہے تو ایسا انسان سب سے پہلے اپنے رب سے کٹ جاتا ہے، پھر لوگوں سے کٹ جاتا ہے اور تنہائی کی موت مرتا ہے۔ جب کہ عاجزی نہ صرف اللہ کے قریب کرتی ہے بلکہ لوگوں کے بھی قریب کرتی ہے، ایسے لوگ نہ صرف اللہ کے بندوں کو پسند ہوتے ہیں بلکہ اللہ بھی ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اللہ کے بندوں کو دوست رکھتے ہیں اور ان پر ظلم اور ناانصافی نہیں کرتے۔

برکت ایسی چیز ہے کہ اگر زندگی میں آ جائے تو انسان بہت تھوڑے وقت میں ایسے ایسے کام کر جاتا ہے انہیں ان کے جانے کے بعد بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ بدنصیب ہوتے ہیں ایسے لوگ جنہیں اللہ بہت سی نعمتوں سے نوازتا ہے مگر وہ تعلق داریوں کا پاس رکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اور بانصیب ہے ایسے لوگ نہیں اللہ کی نعمتیں تو دوسروں کے مقابلے کم ملتی ہیں مگر وہ انسانیت کے خیر خواہ ہوتے ہیں اور اپنی تعلق داریوں کے قائم رکھتے۔

لوگوں کے اپنے اوپر احسانات کو یاد رکھیں ، اللہ کے اپنے اوپر احسانات کو یاد رکھیں ، اللہ شکر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

دعا گو، میاں وقار الاسلام

تلخ لہجے، میٹھی باتیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

لکھنے والے کیسی کیسی باتیں لکھ لیتے ہیں، بولنے والے کیسی کیسی باتیں بول لیتے ہیں، پڑھنے والے کیسی کیسی باتیں پڑھ لیتے ہیں، سننے والے کیسی کیسی باتیں سن لیتے ہیں، ستم کرنے والے کیسے کیسے ستم کر جاتے ہیں، سہنے والے بھی کیسے کیسے غم سہہ جاتے ہیں۔

کچھ لوگ قلم کی شان ہوتے ہیں، ان کا قلم زخموں کو رفو کرنا جانتا ہے، ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ زخموں پر مرہم کی طرح کام کرتا ہے۔ خوش قسمت ہیں ایسے قلم کار جن کے قلم سے زخم بھر جائیں اور لوگوں میں دکھوں اور تکلیفوں کا احساس کم ہو جائے۔

کچھ لوگ قلم کے لیے شرمندگی کا باعث بنتے ہیں، ان کا قلم زخموں کو کریدتا جلاتا جاتا ہے، اور زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ زخموں پر نمک کی طرح کام کرتا ہے۔ بدقسمت ہیں ایسے قلم کار جن کے قلم سے زخم پھر ہرے ہو جائیں اور لوگوں میں دکھوں اور تکلیفوں کا احساس اور زیادہ ہو جائے۔

ہم اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہیں کہ ہر کوئی کچھ نہ کچھ لکھ رہا ہے، ہمیں روزانہ بہت کچھ سننے دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایسا نہیں کہ لکھنے پڑھنے والے کم ہو رہے ہیں بلکہ ان کی تعداد روز بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر ایسا کیا ہے کہ ہم اتنا لکھا جانے کے باوجود اور اتنا پڑھا جانے کے باوجود درست سمت میں نہیں جا رہے اور قلم معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے میں مفلوج نظر آتا ہے۔

جب الفاظ مفاد پر اور خود غرض ہو جائے تو پھر انہیں چاہے سونے کے قلم سے یا چاندی کی روشنائی سے سے ہیروں جیسا تراش خراش کر بھی لکھا جائے ان کا اثر جاتا رہتا ہے۔ ہمیں لفظوں میں روح پھونکنے کی ضرورت ہے ورنہ لفظوں کے لاشے اٹھانے سے معاشرے پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔

کچھ لوگوں کا مزاج سخت ہوتا ہے اور لوگ نرم مزاج رکھتے ہیں، اس سے فرق نہیں پڑتا، فرق اس سے پڑتا ہے کہ اپنے مزاج کو لوگوں کی فلاح کے لیئے استعمال کیا جاتا ہے یا پھر اپنی ذات کی پرستش کے لیئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ تلخ باتیں بھی کرتے ہیں جو شروع شروع میں بہت بری لگتی ہیں مگر جب راز کھلتے ہیں اور دلوں کے بھید سامنے آتے ہیں تو اخلاص کا راز کھل ہی جاتا ہے۔

لوگ میٹھی باتیں بھی کرتے ہیں جو شروع شروع میں بہت اچھی بھی لگتی ہیں مگر جب راز کھلتے ہیں اور دلوں کے بھید سامنے آتے ہیں تو اخلاص کا راز کھل ہی جاتا ہے۔ اگر قلم اندر کی خود غرضی اور خود پرستی کو نہیں مار سکتا تو پھر ایسے قلم کا سر ہی قلم ہونا چاہیئے کیوں کی ایسا قلم گمرائی کے سوا کچھ نہیں پھلائے گا۔

بھلائی پھیلانے کے لیئے اپنی غرض کو مارنا پڑتا ہے، آپ تلخ لکھیں یا میٹھا لکھیں آپ کا لہجہ سخت ہو یا نرم، آپ باتوں کی شیرینی چاہے شہد جیسی میٹھی ہو یا کریلے جیسی کڑوی فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ آپ کی غرض کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، نیت ایک دن سامنے آ ہی جاتی ہے۔ اور نیتوں کا بھی حساب ہوگا، دل میں میل اور کینہ رکھنے والے، دوسروں کے لیے حسد اور جلن رکھنے والے، اوپر سے ایسے سادہ جیسے اللہ میاں کی گائے، اندر سے سانپ سے بھی زیادہ زہریلے کہ ڈسنے کا موقعہ نہ جانے دیں۔ ایسے دہرے چہرے والے لوگوں کا ٹھکانہ اچھا نہیں، نہ ہی دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔

بہت سے لوگوں کو اپنے اندازِ بیاں پر بڑا غرور ہوتا ہے، وہ اس کے استعمال سے جسے چاہتے ہیں اپنا گرویدہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ مگر جس دن ان کے دلوں کا بھید سامنے آتا ہے ان کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ تو ایسی کہانیاں نفع نہیں دیتیں جن کے انجام برے ہوں۔ بری چال چلنے والوں کا انجام برا ہی ہوتا ہے چاہے وہ جتنے بھی خراماں خراماں چلیں۔

بے لوث محبت

تحریر : میاں وقار الاسلام

اس نے محبت کی تمام تلخیاں پی لی تھیں، پھر اس کے لہجے میں مٹھاس کیوں نہیں ہو گی، اس کے لہجے میں ابھی تک تلخیاں باقی ہیں، اس نے محبت نہیں کی ہو گی۔

ایک انسان ہزار رشتوں سے جڑا ہوتا ہے اور ہر رشتہ اس کی شخصیت پر اپنا رنگ چڑھاتا ہے، رشتوں اور تعلق داریوں سے کٹا ہوا شخص ایک ایسی ڈکشنری کی مانند ہوتا ہے جس میں محبت کا لفظ نہیں ہوتا۔

بے لوث محبت کا مطلب اللہ کی محبت کو سمجھے بغیر بالکل نا ممکن ہے، انسان کی شخصیت میں حقیقی نکھار تب تک نا ممکن ہے جب تک وہ اللہ کا دیا ہوا رنگ یعنی رنگِ ابراہیمی نہیں پہن لیتے۔

سورہ البقرہ آیۃ ۱۳۸

صِبۡغَةَ اللّٰهِ‌ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً‌ ۖ وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ

"کہو: "اللہ کا رنگ اختیار کرو اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں

اللہ تعالیٰ کی انسان سے محبت کسی بھی قسم کی غرض سے پاک ہے، اللہ قادر ہے، مالک ہے، بے نیاز ہے اور ایک ایسا بادشاہ ہے جو صرف دینا جانتا ہے اور دیتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کی نعمتیں بارشوں کی طرح برستی رہتی ہیں۔

اللہ کو نہ تو انسان کی عبادات کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے صدقہ اور خیرات کی۔ اللہ کی ذات اس طرح کی خواہشات سے پاک ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ نماز، روزہ، حج زکواۃ یہ سب اس لیے ہیں کہ انسان پر رحم کیا جائے۔ کہ نماز، روزہ، حج زکواۃ کی ضرورت انسان کو ہے تاکہ اس پر رحم کیا جائے۔

پھر اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ چاہے سارے انسان نیکوکار ہو جائیں اور چاہے سارے انسان منکر ہو جائیں اس سے اللہ کی باشاہی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اللہ کی محبت ایک حقیقی اور بے لوث محبت ہے، جو صرف اور صرف دینا ہی جانتی ہے، اللہ کی فرمانبرداری اس لیے ضروری ہے کہ زمین کا امن قائم رہے اور انسان ایک دوسرے پر شب خون نہ ماریں۔

جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں، ان کی محبت بھی انسانوں کے لیے بے لوث ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی پرستش کرتے ہوئے کسی دوسرے کا حق نہیں مارتے۔

اور جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے رستے پر نہیں چلتے وہ شیاطین کے دوست ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ دوسرے لوگوں کا حق مارتے ہیں اور معاشرے میں انصاف کو پسند نہیں کرتے۔

اپنی خواہشات کے پجاری لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی شریک رکھتے ہیں تو پھر یہ کسی اور سے محبت کیا کریں گے۔ ان کی محبت بھی خود غرض ہوتی ہے اور ان کے جذبات بھی مصنوعی ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ان کی ذات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

بے لوث محبت کے لیے اللہ سے لگاؤ ضروری ہے، آخرت پر ایمان ضروری ہے، اور اس سیدھے راستے کا انتخاب بہت ضروری ہے جس کی انسان کو قران میں تلقین کی جاتی ہے۔ جو سیدھے راستے سے ہٹ گیا وہ دور جا پڑھا۔

جو لوگ اندھے ہیں گونگے ہیں اور قوتِ سماعت سے بھی معذور ہیں ایسے لوگوں سے حقیقی محبت کی امید لگانا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ معاشرہ اللہ سے دور ہو اور بے راہ روی کا شکار نہ ہو۔ معاشرے کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر ہی لانا ہوگا۔ سیدھے راستے کے علاوہ باقی تمام راستے تو شیاطین کی پیروی کی طرف ہی لے جاتے ہیں۔

گھروں کی بے سکونی، رشتوں کی بداعتمادی، بازاروں میں لین دین کے معاملات، دوستوں میں نااتفاقی، معاہدوں کا وفانہ ہونا، نگاہوں کا بے باک اور بے شرم ہونا، بے حیائی کا عام ہونا، حرام کو حلال کے ساتھ ملا کر مزے سے کھاتے رہنا، سود اور رشوت کا عام ہونا اور ان جیسی بہت سی برائیوں کا محور ایک ہی ہے وہ یہ کہ ہمارا راستہ سیدھے راستے سے الگ ہوتا جارہا ہے۔ اور ہم اپنے آپ میں خود غرض ہوتے چلے جارہے ہیں۔

ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ ہمیں اپنے تمام حقوق ملیں اور ہمارے ساتھ ناانصافی نہ ہو، مگر دوسری طرف ہم خود اپنے معاشرے کے دوسرے افراد کے لیے یہ نہیں چاہتے کہ ہم اپنا فرض ادا کریں اور لوگوں کے ساتھ انصاف کے ساتھ پیش آئیں۔

اللہ سے ڈرنے والے اور حد سے تجاوز نہ کرنے والے اور صبر کرنے والے شخص کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اور جھوٹ بولنے والے، دھوکہ کرنے والے، اور اپنی حد سے تجاوز کرنے والے انسان کو سمارٹ اور عقلمند شخص تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہی معاشرے کا بگاڑ ہے۔

اللہ ہم سے بے لوث محبت کرتا ہے، اور ہم سے یہی چاہتا ہے کہ ہم معاشرے میں بے لوث محبت بانٹیں نہ کہ اپنی خواہشوں کی پیروی کریں اور سیدھے راستے سے دور جا گریں۔ اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔ اور ہمیں اپنی خواہشوں کی پیروی کی بجائے اللہ کے احکامات کی پیروی کرنا نصیب ہو۔ آمین، دعا گو میاں وقار الاسلام

شعور اور بلوغت

تحریر : میاں وقار الاسلام

اگر ہم لوگوں سے یہ پوچھیں کہ کیا شعور کا تعلق بلوغت کے ساتھ ہے تو ان میں سے اکثر یہی کہیں گے کہ نہیں۔

شعور کا تعلق عمر کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تعلیم اور تربیت دونوں کے ساتھ ہے۔ بعض دفعہ تو شعور کا تعلق تعلیم کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔

بہت زیادہ پڑھ لکھ جانے کے بعد بھی اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ شعور کا حصول نہ ہو۔

سنگین حالات میں معاشرے کے جذوی یا کلی شعور کا بھید کھل جاتا ہے۔ جب تعلیم سے جہالت اور تربیت سے علم کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

ایک مزدور جو رزق حلال کماتا ہے اور کسی کے حق پر ہاتھ نہیں ڈالتا وہ کسی بھی رشوت خور، حرام خور یا عوام کے حقوق پر ہاتھ صاف کرنے والے پی ایچ ڈی سکالر سے زیادہ باشعور ہے۔

نگاہیں نیچی رکھنے والے باحیا دیہاتی، گنوار افراد یقینا شہروں کے پڑھے لکھے بد تہذیب اور عورتوں گندی نظریں گاڑھے رکھنے والے افراد سے بہتر ہیں۔

زمانہ جہالت جیسے بناؤ سنگار کرنے والی بے حیائی کی کھلے عام مرتکب عورتیں سے یقینا باحیا، سلجھی ہوئی جاہل گنوار عورتیں بہتر ہیں۔

مرد ہو یا عورت اس کی شخصیت کی تکمیل ہی تب ہوتی ہے جب اس کی تعلیم اور تربیت دونوں مکمل ہوں۔ ایسے افراد معاشرے کا اثاثہ ہوتے ہیں اور انہیں سے بہتری کی امید لگائی جا سکتی ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں تعلیم کا جتنا رجحان ہے اتنا تربیت کا رجحان نہیں ہے۔ ہنگامہ اتنا بڑا نہیں ہوتا جتنا بڑا اسے ہم اپنی جہالت سے خود بنا دیتے ہیں۔

نجی زندگی میں اگر کوئی سانحہ پیش آ جائے، جیسے کسی کا شوہر، یا کسی کی بیوی، یا گھر کا کوئی سربراہ وفات پا جائے تو ایک عجیب سی صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔

دوست احباب بجائے اس کے کہ غم کی کیفیت میں دکھ درد بانٹیں ہر شخص اپنے دکھ نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ اور سب چاہتے ہیں کے گرتی دیوار کو ایک دھکا اور دے دیا جائے۔

ہم محبت بھی اندھی کرتے ہیں اور دشمنی بھی اندھی کرتے ہیں۔ اسی کے محبت اور دشمنی دونوں ہی ہماری تباہی کا باعث بنتی ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں یا فیملی میں یا پھر ادارے میں یا پھر حلقہ احباب میں اقدار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اگر اقدار کو ہٹا دیا جائے تو پھر کیا پڑھا لکھا معاشرہ اور کیا جاہل معاشرہ، منظر ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اِصول پسند ہوتے ہیں اور اپنی اقدار کی حفاظت کرتے ہیں، ایسے لوگوں کا ہر سطح پر ایک اہم مقام ہوتا ہے۔

ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں نہیں اِصول اور اقدار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، ان کے لیے کام کا کسی طرح سے بھی ان کے حق میں ہو جانا کامیابی ہی تصور کیا جاتا ہے۔

اللہ قران میں کامیاب لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم میں کامیاب لوگ وہ ہیں جو پر سکون ہیں۔

اصول و اقدار کا سمجھوتا کرنے والے حقیقی کامیابی سے ناواقف ہوتے ہیں، یہ دنیا میں لوگوں کی زندگی دوزخ بناتے ہیں اور نہیں جانتے کہ آخرت میں ان کی زندگی بھی اسی طرح جہنم ہو گی۔

جو لوگ اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں یقیناً اندھے ہیں، گونگے ہیں اور سماعت سے محروم ہیں اور ان کے دل بھی مردہ ہو چکے ہیں۔

مردہ دل لوگوں کی عمریں 100 برس کی بھی ہو جائیں، اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں، اور یہ دنیا جہان کی کامیابیاں بھی سمیٹ لیں، پھر بھی شعور ان سے دور ہی رہتا ہے۔

اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرے اور ہمیں معاشرے کا ایک باشعور فرد بنائے۔ امین دعا گو میاں وقار الاسلام۔

بلوچ صاحب۔۔۔۔۔اللہ دی مرضی

تحریر: میاں وقار الاسلام

بی کام پارٹ ٹو کا آغاز تھا، بی کام پارٹ میں دو ہی آپشنل مضامین تھے ایک مارکیٹنگ اور دوسرا اکاؤنٹس تو ہم نے مارکیٹنگ کے گروپ کا انتخاب کیا۔

کل 18 طلبہ وطالبات کا سیکشن تھا جس میں 2 طالبات تھیں اور 16 طلبہ تھے۔

مارکیٹنگ گروپ کے دو مضامین تھے مارکیٹنگ اور سیلز پروموشن اور دونوں کی کلاسیز اکٹھی ہوتی تھیں۔

چند دن بعد ہمارے ٹیچر نے گروپ بندی کا اعلان کیا جس کے تحت پراجیکٹس اور اسائین منٹس ملنی تھیں۔

ہمارے گروپ کا ایک اہم کردار ایک بلوچ صاحب تھے، ان کا قد چھوٹا تھا زلفوں کو خوب تیل لگتے تھے اور مونچھوں اور داڑھی کو بھی تیل لگا کر رکھتے تھے، ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی ہمیشہ سرمے سے بھری رہتی تھیں۔ مہینہ وار نہانا بھی وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یا تو عید کے عید نہاتے تھی یا پھر جب کبھی بارش آ جائے۔ ان کا اپنا ہی ایک سٹائل تھا۔

خیر بد قسمتی ہی کہ لیجئے کہ جس دن گروپ بندی ہوئی اس دن بلوچ صاحب کلاس میں تشریف نہیں لائے اس لیئے گروپ بندی کر دی گئی۔

چھٹی کے بعد ہاسٹل میں سب اکٹھے ہوئے تو گروپ بندی پر تبصرہ جاری تھا۔ بلوچ صاحب یہ جاننا چاہتے تھے کہ ان لڑکیوں کا کیا معاملہ ہوا، ان کا گروپ کن کے ساتھ بنا۔

بس بلوچ صاحب کا سوال انہیں کو لے بیٹھا، دوستوں نے جواب دیا کہ بلوچ صاحب آپ ہی تو وہ اکیلے خوش قسمت انسان ہیں جن کا گروپ لڑکیوں کے ساتھ بنا ہے یعنی ایک اکلوتے بلوچ صاحب اور گروپ کی کل دو ہی لڑکیاں اور دونوں بلوچ صاحب کے گروپ میں۔

بلوچ صاحب کی آنکھوں میں شدید چمک تھی اور خوشی گویا سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی وہ خوش بھی بہت تھے مگر ان کا یقین بھی آتا جاتا نظر آ رہا تھا۔

دوستوں نے بلوچ صاحب کی خوش فہمی بھرپور ڈرامائی شکل دے دی اور بلوچ صاحب اپنی ہی خوش فہمی میں ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔

ایک طرف تو بلوچ صاحب بہت خوش تھے دوسری طرف ایک ایک فرد کے کنفرم بھی کر رہے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ ڈرامہ تو نہیں ہو رہا۔

بلوچ صاحب ملک صاحب سے پوچھتے ہیں یار ملک تم میرے بہت اچھے دوست ہو سچ سچ بتاو یہ سب ٹھیک کہہ رہے ہیں، کیونکہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل چکے تھے تو ملک صاحب نے ہاں میں ہی سر ہلانا تھا۔

پھر بلوچ صاحب چوہدری صاحب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ہیں اور کہتے ہیں چوہدری صاحب آپ تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے آپ بتائیں اس سے کے پیچھے کوئی کہانی تو نہیں۔ چوہدری صاحب کیا کہتے۔۔۔ وہی جو سب کی آنکھوں میں تھا۔

خیر بلوچ صاحب اپنی تسلی کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر یہ بات جھوٹ ثابت ہوئی تو میں کلاشن لے آوں گا اور کسی کو چھوڑوں گا نہیں اور ساتھ مسکرا بھی رہے تھے۔

اب بلوچ صاحب کے سامنے منظر کشی پیش کی جاتی ہے تاکہ ان کے فطری جذبات کو ابھارا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ بلوچ صاحب زرا سوچیں پورا سال آپ اور آپ کی دو ساتھ فی میل ممبرز، کمبائین سٹڈی، کمبائین فیلڈ وزٹس، کمبائین پراجیکٹس اور تو اور کمبائین پریزینٹیشن، کلاس میں بھی اکھٹے لائبریری میں بھی اکٹھے ۔۔۔۔۔ واہ کیا قسمت ہے آپ کی۔۔۔ اور آپ کے سب دوست اکیلے اکیلے سارا سال بور اور آپ سے جیلس ۔۔۔۔۔ آپ جیسا خوش قسمت تو شاید ہی کوئی ہو۔۔۔

بس پھر کیا تھا بلوچ صاحب کی خوشی کو کیش کروانے کا وقت آ گیا۔

سب سے پہلے چائے، ساتھ میٹھا نہ ہو تو چائے کا کیا فائدہ اور چائے کے بعد سموسے اور پکوڑے نہ ہوں تو چائے تو مکمل نہ ہوئی۔ گویا 15 سے 20 لوگوں نے اپنی اچھی خاصی خاطر تواضع کروالی۔ مگر پیٹ تو نہیں بھرا ناں۔

ری فریشمنٹ کے چلتے چلتے ہی شام ہو گئی اور کھانے کا وقت ہو گیا سو کھانا بھی بلوچ صاحب کو کھلانا پڑا کیوں کہ یہ ان کا ایک بڑا دن تھا۔

تقریبا رات نو بجے تمام دوست کھانا کھا کر فری ہوئے اور بلوچ صاحب کو آزاد کر دیا۔ آزادی ملتے ہی بلوچ صاحب وہی ہوٹل سے ہی غائب ہو گئے۔

رات 12 یا ایک بجے تک شاپنگ ہی کرتے رہے، پھر شاید ہی رات بھی سوئے ہوں۔

صبح صبح سب سے پہلے تیار بیٹھے تھے، نیا سفید کاٹن والا سوٹ، نئ پشاوری کالے رنگ کی جوتی، آج نہائے بھی تھے، پہلی دفعہ شیمپو کر کے تیل وغیرہ لگایا، خوشبو بھی شاید پہلی دفعہ لگائی اور جتنا تیار ہوا جا سکتا تھا اتنا تیار ہو کر بیٹھے تھے۔ اس دن اس خیال اے کہ کہیں سوٹ میلا نہ ہو جائے کس دوسری کلاس میں تشریف نہیں لے گئے بس انتظار ہی کرتے رہے کہ کب مارکیٹنگ کی کلاس شروع ہو اور وہ تشریف لائیں۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئی مارکیٹنگ کی کلاس شروع ہوئی، دوستوں نے لڑکیوں کے قریب والی کرسی بلوچ صاحب کے لیئے چھوڑ دی۔ بلوچ صاحب اپنے خیالوں میں گم تھے ہر طرف مسکرا کر دیکھتے جا رہے تھے۔

کلاس کا آغاز ہوا، تلاوت کے بعد ہمارے ٹیچر نے گروپ بندی کا اعلان دوبارہ کرنے کو کہا تا کہ جو لوگ موجود نہیں تھے انہیں بھی گروپ بندی کا علم ہو جائے۔

تمام لڑکوں کے نام بتا دیئے گئے، کلاس کے دو سب سے لمبے قد کے لڑکے جن کا تعلق بھی سٹوڈینٹ یونینز سے تھا انہیں دو کو بلوچ صاحب کے ساتھ گروپ میں شامل کیا گیا اور لڑکیوں کا گروپ ہی الگ تھا۔

بس پھر کیا تھا بلوچ صاحب کلاس ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے اور سب کو غضب ناک نظروں سے دیکھ رہے تھے، بلوچ صاحب نے دوسری کلاس بھی نہیں لی اور پہلی کلاس ختم ہوتے ہی غائب ہو گئے۔

تقریباً ایک ہفتہ بلوچ صاحب کی کہیں کوئی خبر نہیں ملی پھر ایک ہفتے کے بعد شام کے وقت بلوچ صاحب اسی سفید سوٹ جو اب تک کالا ہو چکا تھا اسی سوٹ میں ملبوس نمودار ہوتے ہیں۔

کافی دل برداشتہ نظر آتے تھے، سب سے یہی کہتے نظر آئے کہ یار ملک، یار چوہدری یار فلاں یار مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ اور تمام دوست یہ کہتے نظر آئے۔۔۔۔

بلوچ صاحب۔۔۔۔۔ اللہ دی مرضی

چوہدری صاحب، کتی نال۔۔۔۔

تحریر: میاں وقار الاسلام

ویسے تو سو دوستوں کے قصے ہیں مگر دو دوستوں کا قصہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا چھٹیاں قریب تھیں ہمارے ایک دوست جنہیں ہم ملک صاحب بلاتے تھے اور دوسرے جنہیں ہم چوہدری صاحب بلاتے تھے ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ ہے جو ہمارے بیچ میٹس میں شاید ہی کسی کو یاد نہ ہو، تو واقعہ کچھ یوں ہے۔

دن کا وقت تھا ملک صاحب نہا کر باہر آ رہے تھے انہوں نے صرف شارٹ پہنی تھی کاندھے پر ٹاول تھا، ایک ہاتھ میں صابن اور دوسرے ہاتھ میں شاید ٹیوب برش وغیرہ تھے، جیسے ہی وہ باتھ روم سے باہر گیلری میں آئے تو ایک رشین کتی گیلری میں ٹہل رہی تھی۔

ساتھ ہی چوہدری صاحب کا کمرہ تھا جو گرمی اور بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اور شاید بد قسمتی سے کھلا تھا۔ کمرے میں چوہدری صاحب صرف دھوتی میں ملبوس تھے اور کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے میں مصروف تھے۔

خدا جانے ملک صاحب کے ذہن میں کیا آیا، یا پھر شاید انہوں نے سیلف ڈیفینس میں کتی کو پر زور کیک رسید کر دی۔ کیک اتنی پر زور تھی کہ رشین کتی اوڑتے ہوئے کمرے کے آخری کونے میں جا گری۔

جیسے ہی رشین کتی کمرے کے آخری کونے میں گری ویسے ہیں چوہدری صاحب ڈر کے مارے باہر کی طرف دوڑے مگر اتنی دیر میں ملک صاحب باہر سے دروازہ بھی بند کر چکے تھے۔

دروازہ بند ہوتے ہی کھیل شروع ہو گیا چوہدری صاحب اپنے آپ کو بچانے میں لگے تھے اور رشین کتی اپنے آپ کو بچانے میں مصرف تھی۔ اور چند ہی لمحوں میں کمرہ چوہدری صاحب کی چیخوں اور رشین کتی کی آوازوں سے گونج اٹھا اور باہر طلبہ کے جمع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جو طلبہ شور کی وجہ سے نہیں آ پائے وہ ملک صاحب کے واویلے کی وجہ سے باہر آ گئے۔ ملک صاحب ساتھی طلبہ سے فرما رہے تھے کہ چوہدری صاحب رشین کتی کے ساتھ کمرے میں موجود ہیں اور باقی حال اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

پھر کیا تھا مجمعے کے تمام لوگ اپنی اپنی باری کے انتظار میں تھے کہ انہیں بھی فلم کا کچھ نہ کچھ سین دیکھنے کو مل جائے۔

ہاسٹل کے کمروں میں کیوں کہ بڑی کھڑکیاں اور روشن دان بھی ہوتے ہیں اور دروازوں کے اوپر نیچے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے تو فلم کی رونمائی قدرے آسان تھی۔

جس کو جہاں جہاں سے چانس ملا اس نے وہاں آنکھ لگائی، جسے آنکھ لگانے کا چانس نہ ملا اس نے کان لگا لیے گویا کمرہ چاروں طرف سے کڑی نظروں سے گھرا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر میں چوہدری صاحب اور رشین کتی کی حالت غیر ہو گئی اور دونوں ایک دوسرے کو گھورتے گھورتے الگ الگ کونے میں بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں کچھ ظالموں کو ان مظلوموں پر ترس بھی آ گیا اور دروازہ کھول دیا گیا، دروزہ کھلتے ہی رشین کتی غائب ہو گئی اور چوہدری صاحب کی ساری چوہدراہٹ بھی۔

معاملہ رفع دفعہ ہو گیا سب اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے، شام کو میس روم میں سب اکھٹے ہوئے تو سب کی نظریں گویا چوہدری صاحب کی طرف ہی تھیں اور چوہدری صاحب سب سے نظریں چرا کر نیچے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ جو بھی کوئی چوہدری صاحب سے بات کرتا تو صرف اتنا ہی سوال کرتا۔۔۔

چوہدری صاحب

کتی نال۔۔۔۔

چوہدری صاحب

کتی نال۔۔۔۔

چوہدری صاحب کے پاس سوائے خاموش رہنے کے کوئی آپشن موجود نہ تھا۔
کیوں کہ چھٹیاں قریب تھیں، چوہدری صاحب کی جان بھی جلد چھوٹ گئی سب کے سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

کہانی ابھی باقی ہے میرے دوست۔۔۔۔۔

ادھر چھٹیاں ختم ہوئی ادھر تمام طلبہ ہاسٹل آنا شروع ہوئے۔۔۔

شام کا وقت تھا ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، چوہدری صاحب آگے آگے تھے اور چند دوست ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ ہاسٹل میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف پیپل کا ایک درخت تھا جس کے نیچے وہی رشین کتی اپنے دو بچوں کے ساتھ یاد ماضی تازہ کرنے کے لیے موجود تھی۔

چوہدری صاحب کے پیچھے ان کے دوستوں نے موقعے کا پورا فائدہ اٹھایا اور سرگوشیاں شروع کر دیں یہ سرگوشیاں دھیمی آواز والی سرگوشیاں نہیں تھیں بلکہ چوہدری صاحب پر ایک پورا اٹیک تھا۔

ایک دوست دوسرے سے کہتا ہے کہ یار یہ چھوٹے منڈے کی آنکھیں بالکل چوہدری صاحب پر گئی ہیں

وہیں دوسرا دوست بھی اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ یار یہ بڑے منڈے کا تو ناک بھی چوہدری صاحب سے ملتا ہے

بس پھر کیا تھا ایک نئی بحث شروع ہو گئی

چوہدری صاحب اپنے کمرے میں پہنچے تو بات وہاں تک بھی پہنچ گئی، جو بھی ملنے آتا چوہدری صاحب کو کوئی نہ کوئی نئی بات کر جاتا۔

کچھ دوستوں نے کہا کہ چوہدری صاحب موسم بہت خراب ہے بھابھی کو اندر لے آئیں، کچھ نے کہا کہ وارڈن صاحب کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا سو جتنے منہ پھر اتنی باتیں۔

ہاسٹل لائف کون بھول سکتا ہے۔۔۔

اقبال کا شاہین

تحریر : میاں وقار الاسلام

بیسویں صدی کے سب سے بڑے ادیب، شاعر محقق، مفکر اسلام، ترجمان حقیقت، سکالر فلاسفر تو حکیم امت حضرتِ علّامہ محمّد اقبالؒ صاحب، اگر یہ یورپ میں پیدا ہوتے تو ان پر لاکھوں لوگ پی ایچ ڈیز کر چکے ہوتے، ان کے نام سے معروف یونیورسٹیاں ہوتیں اور ان سے منسوب تحقیقی ادارے ہوتے، مگر یہاں صرف ایک مسکین سی اقبال اکیڈمی ہی رہ گئی ہے۔

یہاں یا تو لوگ گھروں کے نام اقبال منزل وغیرہ رکھ دیتے ہیں یا پھر اپنے بچوں کے نام اقبال سے منسوب کر دیتے ہیں۔ نہ شاہین نام رکھنے سے کوئی اونچا اڑنے لگتا ہے، نہ ہی شیر نام رکھنے سے کوئی جنگل کا بادشاہ بن جاتا ہے۔

اقبال کے نام کے مشاعرے کر لینے سے یا پھر اقبال ڈے منا لینے سے اقبال کا خواب پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح تو اس عظیم شخصیت کے خوابوں کا مزاق اڑایا جاتا ہے اور اس کے خواب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔

جیسے دنیا کا ہر عظیم لیڈر یہ خواہش کرتا ہے کہ اس کی قوم ہر نوجوان شیر بنے، ایسے ہی حکیم امت قوم کا درد رکھنے والے، قوم کے عظیم رہبر بھی یہی چاہتے تھے کہ اس کی قوم کے نوجوان باصلاحیت ہوں، اپنے آپ کو منوائیں اور شاہین بنیں، مگر بد قسمتی سے ہم نے ایسے چوزے پیدا کئے ہیں جو اپنے وزن پر بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔

یقیناً آپ کے ذہن میں یہ بات آ رہی ہو گی کہ نہیں نہیں ہم نے چوزے کہاں پیدا کیے ہیں۔ دیکھنے میں تو نوجوان ہی ہیں، اور اپنے پاوں پر بھی کھڑے ہیں۔ اب ایسا بھی نہیں کہ اپنا وزن نہ اٹھا سکتے ہوں۔ بھلے چنگے تو ہیں۔

تو آپ کے ذہن میں جو بات آ رہی ہے تو سو فیصد ٹھیک ہے۔ دراصل ہمیں کچھ رونے کی زیادہ ہی بیماری ہے۔ ہر قوم میں کچھ لوگ نکمّے اور ہڈ حرام ہوتے ہیں، انہیں سب کے سب نالائق اور سست ہی نظر آتے ہیں۔ یہ کبھی اچھا گمان نہیں کرتے۔ نہ صبر کرتے ہیں نہ شکر کرتے ہیں بس شکوے ہی کرتے رہتے ہیں۔

کچھ لوگ سب کو الزام دیتے رہتے ہیں اور اگر ان سے پوچھیں کہ تم نے ملک کے لیئے کیا کیا تو کہیں گے کہ ٹک ٹاک پر ویڈیوز بناتے رہے یا پھر پب جی کھیلتے رہے۔ ان کے سکول یا کالج کی نمایاں سرگرمیاں دیکھ لی جائیں تو یہ وہ سنہرا دور کسی نہ کسی سنہری بالوں والی، یا پھر کالی آنکھوں والی شاہینہ کے چکر میں برباد کر آئے ہوتے ہیں۔

نالائق لوگ بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں، سارے انجینئر چور ہیں اور سارے ڈاکٹر ڈاکو ہیں۔ ایسے لوگ دراصل بڑی مشکل سے نقلیں مار مار کر پاس ہوتے ہیں اور پھر انہیں جوتیاں گھسا گھسا کر بھی کوئی نوکری نہیں ملتی اور اگر نوکری ملتی ہے تو ایسی تھکی ہوئی نوکری ملتی ہے کہ اس کی خالہ رشتہ دینے سے انکار کر دیتی ہے اور اس نکمّے کی منگیتر خاندان کے کسی شاہین سے بیاہ دی جاتی ہے تو اس بے چارے کو اپنے دکھ پھر لکھنے پڑتے ہیں کہ شاہین ایک ظالم پرندہ ہے اور اس کی شاہینہ کو لے اڑا۔

تو ایسے نکمّوں کی باتوں پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں جنہوں نے خود اپنے اوپر کبھی غور نہیں کیا ہم ان کے اوپر اتنا غور کیوں کریں۔

ایک چیز کی ان نکمّوں کو داد دینی بنتی ہے، کیوں کہ یہ تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اس لیئے یہ ایسے لیڈروں کو ووٹ دیتے ہیں جن کا مستقبل یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیڈر کرپشن میں دھنسے ہوتے ہیں، ان کے لیڈروں کو سزائیں ہوتی ہیں اور نالائقی کی وجہ سے ان کے لیڈروں کا استقبال گندے انڈوں، ٹماٹروں اور جوتوں سے کیا جاتا ہے۔ مگر ان کا جزبہ دیکھیں یہ ابھی بھی نالائقوں کو ہی ووٹ دیں گے خود بھی جوتے کھائیں گے اور ان کے لیڈروں کو بھی جوتے پڑیں گے۔ نہ یہ خود کچھ کرتے ہیں نہ ان کے لیڈر کچھ کریں گے، بس ان کی خیالی باتیں سن لیں اور ان کے لیڈروں کے سبز باغ دیکھ لیں۔

تمام نالائقوں اور ان کی نالائقیوں کو دفعہ کریں اور دیکھیں کہ یہ ملک نکمّے لوگ نہیں چلا رہے، بلکہ ہر فیلڈ اچھے اور ماہر لوگ چلا رہے ہیں۔ ایک ماہر انجینئر ہزار نالائق انجینئرز پر بھاری ہے، ایک ماہر ڈاکٹر ہزار نالائق ڈاکٹروں پر بھاری ہے۔ آج کا نوجوان کل کے ہزار نالائق نوجوانوں سے بہتر ہے۔ آج کے نوجوان کے پاس صرف انجینئرنگ اور ڈاکٹری کی ڈگری نہیں ہے بلکہ بہت سی مختلف فیلڈز کی سپیشلائیزڈ ڈگریاں ہیں۔ نہ صرف آج کا نوجوان اپنے لیئے مواقع پیدا کر رہا ہے بلکہ باقی نوجوانوں کے لیئے بھی مواقع پیدا کر رہا ہے۔

شاعرِ مشرق عظیم شاعر حضرت علّامہ اقبال صاحب کے منتخب اشعار بطورِ خراج عقیدت

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا، سراپا ذوقِ اِستفسار تھا

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

حضرتِ علّامہ محمّد اقبالؒ صاحب

آج کی نوجوان نسل کل کی پرانی نوجوان نسل سے زیادہ بیدار ہے اس میں شاید ہی دو رائے ہوں۔ ہماری ایک پرانی نسل اپنی تمام تر نالائقیوں کے بہت سے قرض اتار چکی ہے۔ اب بر حال نئی نسل نے اوپر آنا ہے۔ ہم اپنی غلطیوں سے سیکھے بیٹھے ہیں، نقصان بھی اُٹھائے

بیٹھے ہیں، اور زخم بھی گھائے بیٹھے ہیں۔ اور ہم جہاں جہاں غلط تھے وہ آج کی نوجوان نسل دیکھ بیٹھی ہے یقینا یہ پرانوں سے بہت بہتر کام کر رہی ہے اور آگے بھی بہتر کام کرے گی۔

خود بھی محنت کریں اور اپنے ارد گرد محنتی لوگوں کی قدر کریں، اور نکمّے، ناکارہ اور مفلوج لوگوں کی فکر نہ کریں جو لوگ اپنے لیے کچھ نہیں کر پائے وہ قوم کے لیے کیا کریں گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں، اللہ نے کسی محنت کرنے والے کو کبھی مایوس نہیں کیا، پوری دنیا میں حالات خراب ہیں مگر محنتی لوگ آج بھی پورت ہمت سے کام کر رہے ہیں اور ثابت قدم ہیں، اللہ ایسے لوگوں کو مایوس کیسے کر سکتا ہے۔

اقبال کے شاہینوں کے لیئے دعا گو
میاں وقار الاسلام

فہرست مضامین

	سیاسی اور حکومتی	
1	ماڈل بیسڈ گورننس	556
2	عمران خان ایک مسلسل جدوجہد اور محنت کا نام	559
3	عوام سے زیادہ باشعور کوئی نہیں	566
4	کرتارپور راہداری ایک تاریخی دن	568
5	آرمی آفیسر ہمارے سر کے تاج ہیں	570
6	چمن میں پھول بھی ہیں	573
7	میں کسی کی سیاہ کاریوں کا وکیل نہیں	574
8	سبز ہلالی پرچم ہماری جان ہے، ہماری شان ہے اور ہماری پہچان ہے	577
9	تبدیلی کا سورج اب ڈوبنے والا نہیں	581
10	اور رہنما پھنس گئے	585
11	سیاسی چونا	587
12	پاور پالیٹیکس	589
13	فورتھ جینریشن کرپشن	591
14	ڈڈو سکالرز	592
15	باندر کلا	594
16	ناجائز تجاوزات اور زمینوں پر ناحق قبضے	596
17	پاکستان میں جمہوریت کے وارثین	600
18	ایک زرداری سب پر بھاری	502
19	ایک طرف کرپشن ایک طرف نااہلی	504
20	شیخ صاحب کی شیخیاں	507
21	بونوں کی شرارتیں	510

ماڈل بیسڈ گورننس

Model Based Governance

ہمارا مسئلہ جذوی نہیں کلی ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

مختلف فورمز پر پاکستان کے مسائل کے حوالے سے بات ہوتی رہتی ہے اور بہت سے لوگوں کا نقطہ ء نظر دیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہمارا تعلیمی نظام ٹھیک نہیں، ہمارا ماحولیاتی نظام ٹھیک نہیں، ہمارا ٹریفک کا سسٹم ٹھیک نہیں، اداروں میں کرپشن ہے، پولیس اور عدلیہ ٹھیک نہیں اسی طرح ایک ایک کرکے ہر ادارے کے بارے میں یہی بات کی جاتی ہے کہ ہر جگہ سسٹمیٹک ایشیوز ہیں۔

جس طرح کے جزوی مسائل ہم سنتے ہیں اور ان پر بحث کرتے ہیں یا پھر ان پر اپنی رائے دیتے ہیں دراصل ہمارا مسئلہ سرے سے اس چیز کا نہیں ہے۔ ہماری کل عمارت جن بنیادوں پر کھڑی ہے وہ بنیادیں ہی ٹیڑھی ہیں اس لیے ہمیں عمارت کا ہر کمرہ ہر کونہ ٹیڑھا ہی نظر آئے گا اگر ہم عمارت کی بنیاد کو ٹھیک نہیں کریں گے ہمارے مسائل جوں کے توں ہی رہیں گے۔ ہم ایک ایسے درخت کی مانند ہیں جس کا تنا کمزور ہو چکا ہے اور اب کسی شاخ پر پھول اور پھل نہیں لگتے اور اگر ہم سب مل کر اپنے اس درخت کے تنے کو مضبوط نہیں کریں گے ہماری شاخوں پر کبھی پھول اور پھل نہیں لگیں گے۔

ہمارا نظام اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس میں رہتے ہوئے کوئی ادارہ بہتر پرفارم کرسکے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کوئی ادارہ اپنے پیٹی بھائی کو عبرت کا نشان نہیں بنائے گا بلکہ اس کا تحفظ کرے گا۔ جس سے ہر کرپٹ بندے کو پوری پوری تقویت ملے گی اور اگر کوئی ٹھیک بھی ہونا چاہیے گا تو اس طرح کے لوگ اسے واپس اپنے جیسا کرلیں گے۔ یہ ماننا کہ موجودہ سسٹم میں رہتے ہوئے اس نظام کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے یہ بات ایک دیوانے کا خواب تو ہو سکتی ہے مگر اس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

گن سے زیادہ وہ شخص اہم ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں گن ہوتی ہے۔ ہم ایک دہشت گرد کے ہاتھ میں گن پکڑا کر یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں یہ کبھی امن بھی لا سکتا ہے۔ ہم ایک کرپٹ شخص کے ہاتھ میں اختیار دے کر یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ کرپشن کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ پولیس والوں کو کیا ڈر ہے کہ اگر وہ غلط کریں گے تو پکڑے بھی جائیں گے۔ یا عدلتیں جو فیصلے کرتی ہے وہ منوا تو لیے جاتے ہیں کیا واقعی ان کی ہجت

عوام کے دلوں میں بیٹھتی ہے کیا عوام واقعی پولیس اور عدلیہ کی کارکردگی سے راضی ہے۔ کیا آج بھی پولیس اور عدلیہ انہیں کے لیے فعال نہیں جن کے پاس پیسہ اور طاقت ہے۔

غریبوں کے حقوق کی بات کی جاتی تو کیا ہم سمجھتے کہ غریب کش انسانوں کے ہاتھوں میں اختیار دے کر غریب لوگوں کی محرومیوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے دودھ کی رکھوالی کے لیے بلوں کی فوج رکھی ہوئی ہے جو ہر روز سارا دودھ چٹ کر جاتے ہیں، بلے موٹے سے موٹے ہوتے جا رہے ہیں اور عوام اور ملک کی حالت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خیر میں مسائل پر زیادہ بات کرنے کا قائل نہیں ہوں، ہمارے بچے بچے کو پتا ہے کہ ہمارے کیا مسائل ہے اور سیاست دانوں سے بہتری کا سن سن کر ہمارے کان پک گئے ہیں اور بہتری کا خواب ایک بیہودہ نعرہ بن کر ہی رہ گیا ہے۔ تبدیلی نہ ہمارے بڑوں نے دیکھی نہ ہم نے دیکھی اور نہ ہی یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے بچے دیکھیں گے۔ کیوں کہ ابھی بھی ہم نے اپنی بنیادوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

ہم ایک جذباتی قوم ہیں اور بنیادی طور پر شخصیت پسند ہیں۔ ہم لوگوں سے اپنی توقعات جوڑ جوڑ کر انہیں دیوتا بنا دیتے ہیں اور جب ہماری خواہشات کا دیوتا ہمیں کچھ دینے سے قاصر رہتا ہے تو ہم اس سے ناامید ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بس اب یہ عبرت کا نشان بھی اور نیست و نابود ہو جائے اور ہمیں کوئی اور مسیحا ملے جس کی پوجا کر کے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

کاروباری دنیا میں اگر کوئی ادارہ ترقی کرتا ہے تو وہ ادارہ ترقی کرتا ہے جو اپنی بنیادیں بہتر کرتا ہے اور اپنے کاروبار کا ایک ماڈل بناتا ہے۔ اور پھر دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے کسی شخص کو اجازت ہی نہیں ہوتی کہ وہ ادارے کے بنیادی ماڈل سے ہٹ کر کچھ کر سکے، سسٹم یا ماڈل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو یا تو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے یا پھر پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ٹھیک کام کرنے والے کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہوتی ہیں اور غلط کام کرنے والوں کے لے مشکلات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ وہ دوبارہ سے غلط کام کرنے کا نہیں سوچتا۔ مگر بیسک ماڈل ہی غلط ہو تو سب الٹا ہوتا ہے ہر غلط کام کرنے والے کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہوتی ہیں اور ہر درست کام کرنے والے کے لیے پریشانیاں ہی پریشانیاں ہوتی ہے کیوں کہ جب سمت ہی غلط ہو تو پھر جتنا بھی لمبا صفر کیوں نہ کر لیں منزل کبھی نہیں آتی۔

ہمیں ایک بہترین ریفائن نیشنل ماڈل کی ضرورت ہے جسے تمام ادارے کو لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑے اور اگر کوئی ادارہ یا فرد اس کے کسی بھی اصول کی خلاف ورزی کرے تو پھر اس کا جینا مشکل کر دیا جائے یہاں تک کہ اسے اپنی حالت درست کر کے واپس اسی ادارے میں آنا پڑے اور اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ ہو۔

پوری دنیا میں جہاں جہاں گڈ گورننس نظر آتی ہے اس کے پیچھے بنیادی سٹرکچر یہی ہوتا ہے کہ قومیں اپنے اصول وضع کرتی ہیں اور پھر جو کچھ بھی ہو جائے اپنے اصولوں پر سودا نہیں کرتیں اور اگر کوئی اصولوں پر سودا کرنے کی کوشش بھی کرتے تو اس کی ہر کوشش رائیگاں جاتی ہے کیوں کہ سسٹم میں اس کی اجازت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح جن ملکوں میں ماڈل بیس ڈیویلوپمنٹس نہیں ہوتیں وہاں کا ہر بندہ ماڈل ہوتا ہے اور اس کی اپنی الگ ہی فلاسفی ہوتی ہے۔ یہ لوگ حب الوطنی کے نام پر اپنے دماغوں میں جو خلائی پلاو پکاتے رہتے ہیں اس کا نہ تو ان کو کوئی فائیدہ ہوتا اور نہ ہی کسی اور کو کوئی فائیدہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ بجائے اس کے کہ انفرادی سطح پر ہی ملک کی یا اپنی کوئی خدمت کر پائیں صرف نظام کا رونا ہی روتے رہتے ہیں۔ ان کی قسمت رونے سے شروع ہوتی ہے اور رونے پر ہی ختم ہوتی ہے نہ کوئی جینے کا مقصد نہ ہی کوئی مرنے کا مقصد بس راستے ہی بدلتے رہتے ہیں جب کہ منزل کا تعین کبھی بھی نہیں کر پاتے۔

ماڈل بیس اکانومیز میں راستے بھی واضع ہوتے ہیں اور منزل بھی صاف ہوتی اس لیے ہر شخص باآسانی اس میں اپنا حصہ ڈالتا رہتا ہے اور ملک ترقی کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ نہ دیوانے کا خواب ہے اور نہ ہی فینٹسی ورلڈ ہے۔ قوموں نے ایسے ہی ترقی کی ہے اور ایسے ہی ترقی کر رہی ہیں اور ایسے ہی ترقی کرتی رہیں گی۔ اور منہ دیکھنے والے منہ ہی دیکھتے رہیں گے نہ انہوں نے کچھ کیا ہے، نہ کر رہے ہیں اور نہ ہی کر سکیں گے جب تک کہ یہ خود اپنی حالت ٹھیک نہیں کر لیتے اور اپنی منزل اور راستے ایک نہیں کر لیتے۔

عمران خان ایک مسلسل جدوجہد اور محنت کا نام

تحریر : میاں وقار الاسلام

اگر منزل ہی باطل ہو ڈگر سیدھی نہیں ہوتی

مسافت راہِ حق پر ہو تو پامالی نہیں ہوتی

عمران خان نیازی 25 نومبر، 1952 کو میاں والی میں محترمہ شوکت خانم اور اکرام اللہ خان نیازی کے گھر میں میں پیدا ہوئے۔ عمران خان نے والدین کا واحد بیٹا ہوتے ہوئے چار بہنوں کے ساتھ پرورش پائی، عمران خان کے والد کا تعلق پشتون اور نیازی قبیلے کے شرمنخیل خاندان سے ہے، عمران خان نے ایچی سن کالج اور کیتھڈرال سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، کیبلی کالج آکسفورڈ سے اپنی معاشیات کی انڈر گریجویٹ ڈگری سے قبل رائل گرائمر سکول ورکسٹر میں داخل ہوئے، 1974 میں یونیورسٹی کے دوران عمران خان آکسفورڈ یونیورسٹی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے۔

عمران خان اعلیٰ پائے کے آل راونڈرز اور سب سے بڑے فاسٹ بولرز میں سے ہیں جو دنیائے کرکٹ نے دیکھے۔ عمران خان نے 1971 سے 1992 کے درمیان پاکستان کیلئے ٹیسٹ کرکٹ کھیلی اور جب کرکٹ ٹیم نے پاکستان کی جانب سے واحد ورلڈ کپ جیتا تو اس وقت ٹیم کے کپتان تھے، کرکٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد عمران خان نے لاہور میں شوکت خانم کینسر ہسپتال اور ریسرچ سنٹر کا آغاز کیا. پھر 1997 میں پاکستان تحریک انصاف کے نام سے ایک سیاسی پارٹی کا آغاز کیا۔ عمران خان کے سیاسی آئیڈیل ڈاکٹر اور فلاسفر علامہ محمد اقبال ہیں۔ عمران خان 2002 میں میاں والی سے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور سال 2018 میں پاکستان تحریک انصاف ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن کر اُبھری ہے

عمران خان میں وہ صلاحیت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے

ایسا احساس دلاتا ہے بشر

سب فرشتوں سے بڑا ہو جیسے

ہمارا قومی کھیل تو ہاکی ہے مگر ہمارے ہاں کرکٹ کے کھیل کو جو اہمیت حاصل ہے وہ شاید کسی دوسرے کھیل کو حاصل نہیں۔ اگر میں اپنے بچپن کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے وہ تمام دوست یاد آتے ہیں جن سے میرا تعلق کرکٹ کی وجہ سے بنا چاہے وہ سکول ہو، چاہے کالج ہو، چاہے یونیورسٹی ہے، چاہے اپنے گھر کے قریبی میدان ہوں یا پھر اسٹیڈیم ہوں، ذہن میں کرکٹ کا ایک وسیع میدان نظر آتا ہے۔ اور یہ تمام رونقیں جس شخص کی وجہ سے ہمیں ملی وہ عمران خان کے علاوہ کوئی اور نہیں

سوچ کی وسعتوں میں جہاں تک کرکٹ نظر آتی ہے وہیں عمران خان بھی نظر آتا ہے، میرے بچپن کی جتنی یادیں کرکٹ سے وابستہ ہیں اس سے کہیں زیادہ عمران خان سے وابستہ ہیں۔ جب پاکستان کا کسی بھی ملک کے ساتھ میچ ہوتا تھا ایک عجیب سا گرما دینے والا ماحول دیکھنے کو ملتا تھا، چاہے گھر میں فیملی کے ساتھ ہوں یا پھر ہاسٹل میں ایک جنون اور جذبے کی کیفیت ہر چہرے پر پائی جاتی تھی۔ ہم نے بہت سے دوستوں کو عمران خان کی طرح بولتے عمران خان کی طرح بال رکھتے اور عمران خان کے کرکٹ کے سٹائل کو کاپی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور حیران کن بات یہ ہے کہ یہ جذبہ اور جنوں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

عمران خان کی ڈیکشنری میں ناممکن کا لفظ نہیں ہے

یہاں نظرِ جہاں دیدہ بہت مسرور ہوتی ہے
بدل ڈالے اگر دل سمت ہریالی نہیں ہوتی

یوں تو پاکستان کی کرکٹ میں بہت سے اچھے پلیئر آتے رہے ہیں مگر عمران خان کی شخصیت میں جو کشش تھی ویسی پھر کرکٹر میں دیکھنے کو نہیں ملی۔ اور ولڈ کپ جیتنے کے بعد تو اس جنوں میں اور اضافہ ہو گیا، جہاں یہ کامیابی پاکستان کے لیے فخر کا باعث تھی وہی یہ کروڑوں بچوں کے لیے بھی باعث مسرت تھی جو عمران خان سے پیار کرتے تھے۔ عمران خان کے نام کی یا تصویر کی شرٹس، کاپیاں، یہاں تک کے ہاسٹل کی دیواریں یا پھر اپنے بیڈ روم کی سجاوٹ لوگوں نے عمران خان کی پزیرائی اور محبت کے اظہار میں کبھی کوئی کمی نہیں کی۔

خوش قسمت ہوتی ہے وہ قوم جیسے عمران خان جیسے لیڈر نصیب ہوتے ہیں

حاکموں کے بارے میں کہتے ہیں فرشتے ہیں

پھر بھی قسمتیں یارب کیوں نہیں سنورتی ہیں

اس کے بعد ہم نے دوسرا دور بھی دیکھا جب عمران خان نے شوکت خانم کی بنیاد رکھی اور کالجوں اور سکولوں میں فنڈ ریزنگ کی اور ملک کے باہر بھی فنڈ ریزنگ کا سلسلہ جاری رہا، بہت سے شاپ کیپرز جنہوں نے شاید کبھی مسجد کے نام پر چندے کا بکس اپنی دکانوں میں نہ رکھا ہو مگر عمران خان کے لیے انہوں کے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کیا، شاپنگ مالز اور شاپس پر اکثر شوکت خانم کے بکس دیکھنے کو ملتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے عمران خان نے کرکٹ سے ہٹ کر ایک سماجی ورکر کے طور پر بھی اپنے آپ کو منوالیا۔

یہ ایک دیوانے کا خواب تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حقیقت میں بدل دیا۔ کینسر کی بیماری کیا ہوتی اور اس کا متاثرہ خاندان پر کیا اثر ہوتا ہے اس کا احساس مجھے تب ہوا جب اللہ تعالیٰ نے میرے والد کو اس امتحان میں ڈالا، پھر اللہ تعالی نے انہیں تندرستی بھی عطا کر دی مگر جو تکلیف دہ مراحل نظر سے گزرے وہ لفظوں میں بیان نہیں کیے جا سکتے۔ عمران خان نے بہت سے مایوس چہروں پر امید کی خوشیاں لکھ دیں اور بہت سے لوگوں کو موت کے منہ سے باہر نکال لانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور ابھی بھی اس سلسلے کو جاری رکھا ہوا ہے۔

عمران خان وہ خوش نصیب شخص ہے جسے ہر دوسرے میدان میں پہلے سے زیادہ پزیرائی ملی ہے

سن رہے ہیں خوش حالی ملک بھر میں پھیلی ہے
کتنی بستیاں یاں پر رزق کو ترستی ہیں

اب سیاست کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، کرکٹ کے متوالوں کی جان، اور کینسر سے متاثرہ لاکھوں لوگوں کا محسن ایک نئی پہچان کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ سیاست جو کہ کرپشن کے سفر پر چلتے چلتے اپنے سیاہ ترین دور میں داخل ہو چکی تھی اس میں کوئی شخص آ کر دیا بھی جلائے گا اس کی بھی امید تقریبا نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور ہم عملی طور پر کرپشن کے کلچر کو اپنا چکے تھے۔ تو بہت سے لوگوں کو عمران خان کی باتیں عجیب معلوم ہوئیں کیوں کہ ہم اس تصور سے بھی دور جا چکے تھے کہ ہمارا معاشرہ کبھی کرپشن سے پاک بھی ہو سکتا ہے یا پھر کرپشن سے پاک ہونے کا خواب بھی دیکھ سکتا ہے۔

کرپٹ معاشرہ ہوتا کیا ہے، کرپٹ معاشرے میں ایماندار لوگوں کی بلی دی جاتی ہے اور بے ایمان لوگوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ میں نے تقریباً ہر محکمے میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو ایمان دار بننا چاہتے تھے مگر سسٹم نے انہیں ذلیل اور رسوا کرکے باہر نکال دیا کیوں کہ وہ پاک بننا چاہتے تھے۔ وہیں میں نے بہت سے لوگوں کو ترقی کرتے ہوئے بھی دیکھا جنہوں نے کرپشن کا رستہ اختیار کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں مالا مال ہو گئے۔

پے فون انڈسٹری میں میری پہلی جاب تھی، میرے سامنے سپیڈ منی کی ایک درخواست آئی تو میں نے یہ کہہ کر پے منٹ روک دی کہ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں دوزخی ہوتے ہیں۔ پے منٹ نہ دینے کی وجہ سے لائن مین نے ایک غریب کا پی سی او بند کر دیا، تیسرے دن شاپ والا اپنے پے فون سیٹ کے ساتھ ہمارے آفس آگیا اور کہا کہ رشوت نہ دینے کی وجہ سے اس کا چھوٹا سا کل کاروبار بند ہے۔ ہمارے ایک سینئر تھے مرحوم سلیم صاحب انہوں نے مجھے پاس بیٹھایا اور سمجھایا کہ اس غریب شخص نے اپنی بیٹی کے جہیز کا زیور گروی رکھ کر یہ پی سی او لگوایا اور یہی کاروبار اس کا کل وسیلہ ہے اور تین دن سے اس کی روزی بند ہے اب بتاؤ کہ کون سا گناہ زیادہ بڑا ہے کسی کی روزی روٹی بند کرنا یا کہ رشوت دے کر اس کے کاروبار کو جاری رکھنا۔ کرپشن کتنی بڑی لعنت ہے اس کا احساس مجھے اپنی پہلی جاب کے پہلے واقعے سے اچھی طرح ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے چڑھاوے کو حرام ٹھہرایا ہے اور سب سے بڑھا چڑھاوا تو ہم اپنی حکومتوں کی طرف چڑھاتے ہیں اور پھر اپنے اوپر ایک نہ ختم ہونے والا فرعونی اور ابلیسی نظام مسلط کر لیتے ہیں اور پھر اس نظام کی پوجا کرتے رہتے ہیں کہ ہم اسی مکڑی کے جال کی وجہ سے زندہ ہیں حالانکہ کہ زندگی کا جال نہیں ہے بلکہ بدترین موت کا جال ہے ایک ایسا جال جو انسان کو جیتے جی مار دیتا ہے۔

عمران خان جب نئے نئے سیاست میں آئے تو ان کا ایک پروگرام میلسی بار کورٹ میں بھی رکھا گیا، ان دنوں میرے والد صاحب میاں عبدالسلام پریزیڈنٹ بار تھے تو عمران خان سے ملنے اور ان کو تفصیل سے سننے کا موقع مجھے بھی مل گیا۔ خان صاحب اس وقت جو منشور پیش کر رہے تھے وہ روایتی سیاست سے بالکل الگ تھا، وہ ایک ایسی سوچ بیدار کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کا وجود ہماری سیاہ سیاست میں کہیں نہیں تھا۔ شاید اس لیے لوگوں کی ان کی باتیں عجیب معلوم ہوتی ہوں۔ مگر خان صاحب نے آذان دے دی اور اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ یہ تقریباً 20 سال پرانی بات ہے۔

ہم نے ہمیشہ فیوڈرل کلاس سے بڑے بڑے دیوتا سیاست میں اترتے دیکھے تھے، عام انسان تو لوکل سطح پر بھی سیاست میں نہیں آسکتا تھا اور وہیں عمران خان ایک بڑے سفر کا سامان باندھ چکے تھے۔ مگر اس وقت نہ انہیں خود سیاست دانوں نے سیریز لیا اور نہ ہی عوام نے انہیں کوئی خاطر خواہ پزیرائی دی۔ مگر یہ سفر جاری رہا۔

جب مشروف کے دور میں نواز شریف کے ایم این اے اور ایم پی اے جگہ جگہ چھپتے پھر رہے تھے تو ان ہی دنوں کچھ سیاسی لوگوں سے میرا بھی رابطہ رہا۔ ماحول کچھ ایسا ہوتا تھا کہ ہر سیاسی کارکن کے ساتھ گن مین، باورچی، مالشیا اور سیکریٹری وغیرہ ساتھ ہوتے تھے اور سارے کے سارے لمبے چوڑے بڑے قد کے، لمبی لمبی موچیں اور لمبے لمبے بال اور شکل سے کم ہی پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے تو ایک سیاست دان سے میں نے سوال کیا کہ سر آپ اپنے ارد گرد پڑھے لکھے لوگ بھی تو رکھ سکتے ہیں تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، بیٹا پھر ہم تو گھر ہی بیٹھ جائیں نا

عمران خان کی شخصیت میں ایک میگنیٹک فورس ہے، وہ جس بھی کردار میں ہوں لوگ ان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

میری آنکھیں تو بھیگ جاتی ہیں

پھر سے تیرے حسیں خیال کے بعد

اس کے بعد مشرف کا دور بھی چلا گیا اور پھر پی پی پی کا دور آیا اور وہ بھی چلا گیا اور اس کے بعد نون لیگ کا دور آیا اور وہ بھی چلا گیا۔ جو پڑھے لکھے لوگ گھر بیٹھے تھے اور جو کم پڑھے لکھے ان کی جگہ پر منسٹرز بنتے چلے آ رہے تھے۔ اور ایک طرف عمران خان صاحب تھے جو اس بساط کو ہی پلٹنا چاہتے تھے۔ اس دیوانے کا یہ تیسرا خواب تھا جسے اللہ تعالیٰ نے پھر تعبیر دے دی۔ اور اب ہم ایک ایسے موڑ پر ہیں جب پی ٹی آئی ایک بڑی جماعت بن کر نہ صرف اپنے آپ کو منوا چکی ہے بلکہ اپنی حکومت بھی تشکیل کرنے جا رہی ہے۔

سیاست ایک ایسا موضوع تھا جس میں پڑھے لکھے افراد نے کبھی دلچسپی نہیں لی اور نہ ہی کم پڑھے لکھے مسلط افراد نے پڑھے لکھے لوگوں کو اس میدان میں قدم رکھنے کی جگہ دی۔ عمران خان صاحب وہ پہلے شخص کے نہیں نے سیاہ سیاست کی بساط کو لپیٹا اور روشن سیاست کا نیا باب رقم کیا۔ مگر یہ تبدیلی ابھی بہت سے لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہی کیوں کہ ہم نے سیاہ سیاست کے اتنے بروسٹ کھائے ہیں کہ ہمارا پورا نظامِ انہضام تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ناقابلِ علاج لوگوں میں بہت سے لوگوں کا علاج ہو چکا ہے اور بہت سے لوگوں کا علاج انقریب ہو ہی جائے گا۔ جب سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتی ہے تو اندھیرا دم توڑنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سچائی کا سورج رات کے اندھیرے کو نگل جاتا ہے۔

عمران خان کی زندگی مثالی ہے، ایسے لوگ صدیوں تک اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں

یہاں زندہ دلوں پر ہی تو خوشیاں راج کرتی ہیں

اگر چھائی ہو مایوسی تو خوشحالی نہیں ہوتی

ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ عمران خان صاحب جو کہ رہے ہیں وہ کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ یہ ان مایوس لوگوں کا سوال ہوتا ہے جو تبدیلی کے خواب سے بھی ڈرتے ہیں۔ اگر سیاسی طور پر ایک کمزور ترین انسان ایک وزیر اعظم بن کر ابھر سکتا ہے تو ایسا پر اسرار شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ جھوٹ سچائی کا راستہ روک پائے گا ذرا اپنے دل سے پوچھئے کبھی جھوٹ جس کا اپنا کوئی راستہ نہیں ہوتا کیا اس میں اتنا دم ہوتا ہے کہ وہ سچائی کا مقابلہ کر سکے یا اس کا راستہ روک سکے۔

(18) سورۃ الأنبیاء (21) آیات

بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ‌ؕ وَلَـكُمُ الۡوَيۡلُ مِمَّا تَصِفُوۡنَ (۱۸)

بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر پھینک مارتے ہیں پس سچ جھوٹ کا سر توڑ دیتا ہے اور وہ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے، تم جو باتیں بناتے ہو وہ تمہارے لئے باعث خرابی ہیں۔

عمران خان نے صرف سچ کی آواز اُٹھائی تھی پھر اللہ نے اس میں اتنی طاقت بھر دی کے وہ تمام سیاسی آقاؤں کے سر لے گئی۔ سچ کی یہی طاقت کے سچ یہی کرتا ہے اور سچ یہی کرتا رہے گا ناامیدی جھوٹوں کا مقدر ہوتی ہے۔

علی زیدی کے الفاظ کو سنہری حروف کے ساتھ لکھنا چاہیے

میں دعا کرتا ہوں میرا بچہ میرے لیڈر عمران خان کی طرح بن جائے آپ دعا کرو آپکے بچے الطاف حسین اور نواز شریف بن جائیں

میں مٹانے کے لئے آیا تھا شریاں پہ وقار

شر پسندوں کے گنہ سب میرے سر پر پڑ گئے

اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے اور خان صاحب کی نیت اور جذبہ کسی کے ڈھکا چھپا نہیں۔ اللہ کی ذات اگر خان صاحب کو یہاں تک پہنچا سکتی ہے تو اس سے آگے بھی وہی لے کر جائے گی۔ عمران خان کے نئے سفر کا آغاز ہے۔ دعا ہے اللہ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور جس خیر خواہی کا خواب انہوں نے اپنی قوم اور ملک کے لیے دیکھا ہے وہ اپنی حقیقت تک پہنچے۔

عوام سے زیادہ باشعور کوئی نہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

ایک وقت تھا نوکیا کے علاوہ لوگوں کے پاس موبائل کی آپشنز کم تھی جب نوکیا نے وقت کے ساتھ خود کو اپ ڈیٹ نہیں کیا تو کسی نے اس اور یہ کنگ ہمیشہ ٹھیک فیصلہ کرتا ہے جو چیز اُس کے معیار پر client is the king موبائل کر طرف مڑ کر نہیں دیکھا، انگریزی میں کہا جاتا ہے نہیں اترتی کمپنی جو مرضی کرلے عوام کا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔

سیاست بھی اس سے مختلف نہیں ہے، بھٹو کو کوئی نہیں جانتا تھا، اس نے اپنے آپ کو عوام میں متعارف کروایا اور اپنی مقبولیت قائم کی (کچھ لوگ اگر جزوی مقبولیت سمجھتے ہیں اور کچ کلی، خیر مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا) اور پھر اس ملک میں بھٹو کی حکومت کا بھی قیام ہوا۔ اسی طرح نواز شریف نے سیاست میں قدم رکھا جیٹ پیک ظاہر ہے سب کو آرمی سے ہی ملتے رہے تو اس بات کو تھوڑی دیر کے لیے الگ رکھتے ہیں) ں واز شریف اور شہباز شریف نے بھی اپنے آپ کو متعارف کروایا اور اپنی مقبولیت بڑھاتے گئے انہوں نے بھی اپنا ووٹ بینک بنایا (کچھ لوگ اگر جزوی مقبولیت سمجھتے ہیں اور کچھ کلی، خیر مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا) یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے عروج دیکھ چکی ہے ایک نے اپنی ساکھ مکمل طور پر کھودی اور دوسری جماعت اپنی ساکھ کو بچانے کے چکروں میں وجہ یہی ہے کہ عوام جس ووٹ کو استعمال کرتے ہوئے ان جماعتوں کے مقبول بنا سکتی ہیں وہی انہیں غیر مقبول بھی بنا سکتی ہیں جیسا کہ واضع طور پر پی پی پی کے ساتھ ہوا اور کسی حد تک نون لیگ کے ساتھ ہوتا نظر آرہا ہے۔

مشرف نے ایک کیو لیگ بھی بنائی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کسی کو پتہ ہے کہ سیاسی جماعتوں سے بھی لمبا عرصلہ مسلسل حکومت میں رہنے والی کیو لیگ کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ یہ عوام سوئی ہوئی نہیں تھی نہ ہی جاہل تھی وہ ان تمام حالات کو قریب سے دیکھ رہی تھی اور اس نے مشرف کی سوکالڈ مقبولیت کا جنازہ نکال دیا۔

اب رہے خان صاحب جی عمران خان نیازی صاحب میری ان کے بارے میں بڑی عجیب سی فیلنگز ہیں جو شاید کسی کو سیاست دان کے بارے میں کبھی نہیں ملی، میں ان کی باتوں پہ ہنستا بھی ہوں، مجھے بعض دفعہ غصہ بھی بڑا آتا ہے، اور بعض دفعہ پیار بھی بہت آتا ہے اور بعض دفعہ تو یقین کریں رونا بھی آجاتا ہے۔

یہ اکثر کہتے ہیں کہ عوام جاہل ہے، عوام سوئی ہوئی ہے عوام یہ ہے اور عوام وہ ہے، اسی عوام نے آپ کو کے پی کے میں حکومت دی تو کیا صرف کے پی کے کی عوام پڑھی لکھی ہے، اور جاگی ہوئی بھی ہے اور جاہل بھی نہیں ہے اور باقی سارا پاکستان جاہل۔ خدا کے لیے ایسی سوچ سے باہر نکلیں۔

آپ نے لاہور میں بہت اچھا پرفارم کیا مجھے 60 اور 40 کا مارجن لگ رہا تھا مگر پی ٹی آئی توقعات سے کہیں بہتر کھیلی جس کی خوشی ہے، اب جتنے مارجن سے پی ٹی آئی ہاری ہے اسے اس پر فوکس کرکے مزید محنت کرنی چاہیے بجائے یہ کہ اپنی تھکی ہوئی فلاسفی پیش کر کرکے اپنے ہی ووٹ ضائع کرنے کی۔

کوئی انسان کامل نہیں ہوتا ہر کسی میں خامیاں ہوتی ہے، اور اپنی خامیوں کا احاطہ نہ کرنے والے نقصان اُٹھاتے ہیں، اور یہی وہ مارجن ہے جو پی ٹی آئی کھو بیٹھتی ہے۔

خان صاحب کو کرکٹ کی ہی مثال دیتے ہیں، ہر بال پر چکھانہ ماریں جہاں سنگ ڈبل سکور کی ضرورت ہو وہاں سنگ ڈبل بھی لے لینے چاہیں۔ مگر پیچ میں رونا آتا ہے آپ کی صف میں کچھ چھکے ایسے ہیں جو آپ کو کبھی سنگل ڈبل نہیں لینے دیتے ہمیشہ بڑی شاٹ مرواتے ہیں اور آپ کی وکٹ اُڑوا دیتے ہیں۔

عوام چاہے آپ کو ووٹ دیتی ہے یا نہیں دیتی آپ کی عزت دل سے کرتی ہے بطور سیاست دان بھی اور بطور کرکٹ چیمپین اور سماجی اور فلاحی کارکن کے بھی۔ عوام کو جاہل کہ کر ان کے جذبات کا جنازہ نہ نکالا کریں۔

عوام کی جہالت کا چھوڑیں اپنی جماعت کے اندر کی جہالت کا خاتمہ کریں جو آپ کو ایک سطح سے اوپر نہیں آنے دے رہی۔

پاکستان زندہ باد، پاکستانی عوام زندہ باد

دعا گو، میاں وقار الاسلام

کرتارپور راہداری ایک تاریخی دن

تحریر: میاں وقارالاسلام

برائی کو کبھی برائی سے ہرایا نہیں جاسکتا، صرف حق میں ہی طاقت ہوتی ہے کہ وہ باطل کو ہرا سکے۔

اسلام ہمیں ہدایت کرتا ہے کہ بری باتوں کا جواب بھی انتہائی اچھے انداز میں دو۔

ایک طرف بابری مسجد کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف دوسری طرف کشمیر پر نت نئے مظالم کا سلسلہ اور تیسری طرف ہندتوا کی آڑ میں بغل میں چھری اور منہ میں تلوار سے بھی تیز زبان اور جانے کیا کیا۔

ونگ کمانڈر نندن کے جہاز کے ونگز توڑ کر اور نندن ونگز باندھ کر بھارت کو اس کا ملبہ سہی سلامت سونپ دیا گیا۔ منہ توڑ جواب کے ساتھ خیر سگالی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔

پاکستان کی طرف سے خیر سگالی کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور جواب کے طور پر کشمیر میں کرفیو لگا دیا گیا اور انسانیت سوز تاریخ رقم کی گئی۔

ایک طرف بھارت کشمیر میں کشمیر اور بھارت کے درمیان ایک خلیج بنانے میں مصروف تھا اور دوسری طرف پاکستان سکھ برادری کے لیے کوریڈور بنانے میں مصرف تھا۔ ایک طرف رات کی تاریکی بڑھتی جارہی تھی دوسری طرف ایک صبح روشن سکھ برادری کا انتظار کر رہی تھی اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ حق نے اپنا رستہ نکالا اور ایک ان مٹ تاریخ رقم کر دی۔

ابھی حق کی تاریخ رقم کی ہی جارہی تھی کہ باطل نے بھی سر اٹھایا اور ایک اور یوم سیاہ کی بنیاد رکھ دی مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہ بابری مسجد کو مندر بنانے اور مسلمانوں کو متبادل جگہ دینے کا فیصلہ لکھ دیا گیا۔

خیر سگالی کا جواب ایک بار پھر ویسے ہی دیا گیا جیسا کہ دیا جاتا رہا ہے۔

بڑے کام بڑے لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں اور چھوٹے کام چھوٹے لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ دنیا کے سارے لوگ اندھے نہیں ہیں دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں اور نظر رکھنے والے نظر رکھے ہوئے ہیں سننے والے سن رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں جھٹلانے والے جھٹلاتے رہیں گے مگر سچ نہ کبھی دبا ہے نہ کبھی دبے گا۔

مودی کی پراگرس یہ ہے کہ اس کی کوئی پراگرس نہیں سوائے اپنے حصے میں مزید رسوائی سمیٹنے کے خیر ہمیں برائے سے کچھ اچھا ہونے کی امید بھی نہیں چھوٹے انسان کا چھوٹا پن چھپائے نہیں چھپتا۔

سکھ برادری نے محبت کا پیغام جس محبت سے واپس لوٹایا ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک مثال ہے ابھی تو راستے کھلے ہیں انشاءاللہ یہ راستے نئی منزلوں تک پہنچیں گے اور پاکستان اور سکھ برادری اس کے ثمرات دیکھے گی اور جلنے والے جلتے رہیں گے اور انہیں سوائے رسوائی کے کچھ حاصل نہیں ہونا۔

دعا ہے کہ جیسے سکھوں کے لیئے اچھے دنوں کا آغاز ہوا ہے ویسے ہی کشمیریوں کے لیئے بھی اچھے دنوں کا آغاز ہو، جیسے خیر سگالی کا قدم پاکستان نے بڑھایا ہے ایسی ہی خیر سگالی کا قدم بھارت سے بھی اٹھنا چاہیئے۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

آرمی آفیسر ہمارے سر کے تاج ہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

اعتراض برائے اعتراض میں ہم کچھ سوچے سمجھے بغیر کسی کی لگائی کے پیچھے لگ کر کچھ بھی بولتے جاتے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ایسی باتوں کے پیچھے کتنے سازشی ہاتھ ہوتے ہیں جن کا مقصد بے بنیاد باتوں کو بنیاد بنا کر قوم کو گمراہ کرنا اور تقسیم در تقسیم کرنا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

پہلے بھی فوج پر بے بنیاد گند اچھالنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور نواز شریف کے باہر جاتے ہی یہ گھٹیا کارڈ پھر کھیلا جائے گا اس کی سو فیصد امید کی جا سکتی تھی۔

سوشل میڈیا پر ایک لسٹ شئیر کی جا رہی ہے کہ بہت سے محکموں میں آرمی کے ریٹائرڈ افسران کی بھرتی کی جا رہی ہے اور سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا سولینز میں اتنے قابل لوگ نہیں تھے کہ آرمی آفیسرز جو کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپلائی کرتے ہیں اور انٹرویوز کے پراسس سے گزرتے ہیں اور پھر متعلقہ اداروں کو جوائین کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ بہت سے سویلینز آرمی کے اداروں کو سروسس دے رہے ہیں اور بہت سے آرمی کے ریٹائرڈ آفیسرز سویلین گورنمنٹ یا پرائیویٹ سیکٹرز میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ تو کیا جو سویلین آرمی کے ساتھ کام کر رہے ہیں تو کیا آرمی کے پاس کوالیفائڈ لوگ نہیں ہیں کہ وہ اپنے ادارے میں سولینز کو لگاتے ہیں۔

بات ہوتی ہے ہر ادارے کی متعلقہ جاب کی ضروریات جس کے لیئے یہ فیصلہ لیا جاتا ہے کہ کہاں کون ملازمت کرے گا اور کہاں کون بہتر کام کر سکتا ہے۔ تو کوئی ادارہ اگر اپنے حق میں بہتر فیصلہ کرتا ہے تو اس کا قانونی حق ہے اور جاب کے لیئے اپلائی کرنے والوں پر بھی کوئی پابندی نہیں اگر کوئی کہیں سوٹ کرتا ہے تو وہ اپلائی کر سکتا ہے۔

پاکستان کی سب سے بڑی سیکیورٹی کمپنی جس کے 22000 سے زیادہ گارڈز ہیں اور زیادہ تر آرمی کے ریٹائرڈ فوجی ہیں اور ان کی مینیجمنٹ کے لیئے بھی اعلی آفیسرز آرمی سے ہی ریٹائرڈ ہیں کیوں کہ وہ اس کام کے لیئے فٹ ہیں اس لیئے انہیں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پاکستان آرمی کے ریٹائرڈ لوگ سیول سیکٹر میں کام کر رہے ہیں اس کو ایشو بنا کر بات کرنا سرے سے ایک احمقانہ بات ہے۔

پرائیویٹ سیکٹرز میں 20 سال سے زیادہ میرا اپنا تجربہ ہے آرمی کے ریٹائرڈ آفیسرز کے ساتھ کام کرنے کا۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بیسٹ ہیں اس لیئے متعلقہ جابز پر ہیں۔۔۔۔ دوسروں کے تجربے برے ہوں تو میں کچھ کہ نہیں سکتا۔

آرمی آفسرز خود بھی بہت ڈسپلن رکھتے ہیں اور اپنے نیچے ٹیم کو ان آرڈر بھی کمال کا رکھتے ہیں دوسرے لوگوں میں یہ بہت ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے اسی لیئے جو کام انہیں سونپے جاتے ہیں اداروں کے ڈائیریکٹرز بہت سوچ سمجھ کے فیصلے لیتے ہیں۔

سرکاری اداروں کے علاوہ پرائیویٹ سیکٹرز میں بھی بہت سے ریٹائرڈ آرمی آفیسرز کام کرتے ہیں وہاں انہیں کون لگواتا ہے۔

ذرا سوچیئے کہ ایک آرمی آفیسر جس نے پوری جاب میں کوئی کرپشن نہیں کی اور نیک نیتی سے اپنی سروس پوری کی اس کے بعد پوری عزت سے ریٹائیر ہوا اور اس کے بعد اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے کوئی بزنس کیا یا پرائیویٹ جاب کی یا پھر گورنمنٹ جاب کی اور کہیں بھی کوئی کرپشن نہیں کی اور امانت داری سے اور پوری محنت سے اپنا کام کر رہا ہے جب وہ اس طرح کے خرافات بھرے اور بے بنیاد الزامات سنتا ہو گا تو اس کی دل آزاری کتنی ہوتی ہو گی۔

ہمیں کس نے اختیار دیا ہے کہ ہم جو منہ میں آئے کہتے چلے جائیں اور وہ بھی ان لوگوں کے بارے میں جن کی دیانتداری کے لوگ مثالیں دیتے ہیں۔ یونہی منہ اٹھا کر کسی کے بارے میں کچھ بھی کہہ دینا باشعور اور پڑھے لکھے لوگوں کو تو سوٹ نہیں کرتا۔

عقل نہیں تو پھر موجاں ای موجاں جو مرضی کہتے اور لکھتے چلے جائیں۔

اللہ نے اگر عقل دی ہے تو اس کا استعمال بھی کر لیا کریں اور بے بنیاد اور لگی لگائی باتوں کی پیروی کر کے شیطاتین کے ساتھی نہ بنیں۔ آرمی آفیسر ہمارے سر کے تاج ہیں، اور جو قربانیاں وہ اپنی قوم کے لیئے دے رہے ہیں شاید ہی دنیا کی کوئی فوج اپنی عوام کے لیئے اتنی قربانیاں دیتی ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کے سارے آرمی آفیسرز فرشتے ہیں ان میں غلط لوگ بھی ہوں گے ان کا احاطہ بھی ضروری ہیں مگر براہ راست اداروں کو نشانہ بنانے سے پہلے ہزار دفعہ سوچنا چاہیئے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم دشمنوں کے آلہ کار بن کر اپنے ہی فوج کے خلاف مہم جوئی میں لگے ہیں۔

چمن میں پھول بھی ہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

ستمبر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یومِ دفاعِ پاکستان 6

مانا کہ ہمارے ملک میں ہر سطح پر غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی چلی آئی ہیں، خواہ وہ مذہبی غلطیاں ہوں، سماجی ہوں، سیاسی ہوں، عسکری ہوں، انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں مگر ہمیں صرف غلطیاں ہی دکھائی جاتی ہیں ہمیں صرف کانٹے ہی دکھائے جاتے ہیں مگر بہت سے ایسے کام بھی اللہ تعالی نے اسی ملک کے نصیب میں لکھے ہیں جن کی وجہ سے پاکستان پوری دنیا میں ایک خاص اہمیت اور طاقت سے ساتھ ابھرا ہے، ہم بہت کچھ حاصل نہیں کر سکے مگر پھر بھی اللہ نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ بہت سارے ملکوں کے نصیب میں نہیں آیا، اور بہت سی چیزیں تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے صبر کی وجہ سے بھی عطا کی ہیں جن کے لیے ہمیں بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی

ہر چمن میں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور پھول بھی، صرف کانٹوں کی وجہ سے چمن پر انگلیاں اُٹھائے جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جب کہ اگر پھولوں کی تعداد کو دیکھا جائے تو سلوٹ مارنے کو دل کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالی نے گلشنِ پاکستان کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہی ہماری دھرتی کو نرم بھی کیا ہے اور ذرخیز بھی اس پر بارش بھی برسائی ہے دھوپ بھی بکھیری ہے اور ترقی کا مناسب موسم بھی عطا کیا ہے، بہار دور نہیں گلوں کے کھلنے کا موسم بہت قریب ہے۔

شکریہ ربِ کریم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شکریہ پاکستان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شکریہ گلشنِ پاکستان

میاں وقار الاسلام

میں کسی کی سیاہ کاریوں کا وکیل نہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

زندگی بہت عجیب چیز ہے، دیکھتے ہی دیکھتے رنگ بدل جاتی ہے، جو آج جیسا ہے وہ کل ویسا نہیں رہتا، یہاں لوگ دین ایمان بھی بدل لیتے ہیں، پھر رویوں کا بدلنا، اور چال چلن تو دور کی بات ہے۔ سیاست دانوں کو دولہا بنا کر لایا جاتا ہے اور جب ان کی سیاسی ٹرم ختم ہونے لگتی ہے تو ان کی بارات نکال دی جاتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے مذہبی رہنما اپنی قوموں سے غداری کے مرتکب ہوئے ہیں، سیاست تو پھر سیاست ہے۔

میں اپنے دل اور دماغ سے لکھتا ہوں، نہ میں کسی سیاسی جماعت کا وکیل ہوں، نہ میرا کسی مذہبی فرقے سے تعلق ہے۔ میرے حلقہ احباب میں ہر سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے بہترین دوست بھی ہیں، اور تقریباہر اہم مسلک سے تعلق رکھنے والے دوست بھی ہیں۔ میں نے صرف پاکستانیوں کے ساتھ کام نہیں کیا بلکہ بہت سے ممالک ہیں جن کے لوگوں کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا ہے۔

ملکی سطح پر میں نے ہر صوبے کے لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے اور بین القوامی سطح پر بھی میں نے ہندوؤں، بنگالیوں، امریکیوں،، برطانیوں، کینیڈیوں، چاپانیوں، چینیوں، عربیوں، مصریوں اور دیگر کے ساتھ کام کیا ہے اور بہت سی قوموں کے لوگ میرے باس یا پارٹنرز بھی رہ چکے ہیں۔ میں نے ان سب کے ساتھ کام کیا ہے، بلکہ ان سے سیکھا بھی بہت کچھ ہے، تو ایک طرح سے یہ میرے استاد بھی رہے ہیں۔ اور میں نے یہ بھی سمجھا ہے کہ عمومی طور پر زیادہ تر لوگ، جنونی یا دماغی مریض نہیں ہوتے، بلکہ انتہائی نفیس اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں، تبھی تو وہ ترقی کرتے ہیں اور زندگی میں اپنا اہم مقام بنا پاتے ہیں۔

جب میں کسی سیاسی جماعت یا کسی سیاسی اور سماجی رہنما کے بارے میں اپنے رائے رکھتا ہوں تو وہ دوست جو مجھ سے اتفاق نہیں کرتے، وہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور بعض دفعہ سخت انداز میں بھی اظہار کرتے ہیں، بحث بھی کرتے ہیں اور رہنمائی بھی کرتے ہیں مگر ہم تمام دوست ایک ہی پیج پر رہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے خیالات یکسر مختلف ہیں ہماری آپس میں کبھی نااتفاقی نہیں ہوئی۔ قلمی اتفاق ہو یا نہ ہو آپسی نااتفاقی نہیں ہونی چاہیے۔ میرے دوست میری باتیں سنتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں اور میں ان کی باتیں سنتا ہوں اور برداشت کرتا ہوں۔

مگر کچھ لوگوں کے دل بہت تنگ ہوتے ہیں، ایک تو وہ دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کرتے اور صرف اپنی ہانکتے رہتے ہیں، اور کسی کی سطحی بات کو اتنی گہرائی تک لے جاتے ہیں کہ اس میں کیڑے نکال لاتے ہیں، یا پھر اتنی انچائی تک لے جاتے ہیں اور پھر وہاں سے پٹخ دیتے ہیں۔

ایسے لوگ جو مجھے سمجھتے ہی نہیں ہیں، ان سے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ میں کسی کی سیاہ کاریوں کا وکیل نہیں ہوں۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں ہماری رائے بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں، ہم اپنی ہی کرکٹ ٹیم کو گالیاں بھی نکالتے رہتے ہیں اور پھر اپنی ٹیم کے جیت جانے پر ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ جب ہماری ٹیم ہار جاتی ہے تو ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے کرپشن کی ہونی ہے یا پھر تمام بھرتیاں سفارشی ہونی ہیں۔ ہم اٹکل کے تیر چلاتے رہتے ہیں جو بعض دفعہ ٹھیک تو بعض دفعہ غلط بھی ہوتے ہیں۔ قلمکار اگر برائی پر تنقید کرتا ہے تو اچھا پر حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے اور وقت کے ساتھ سیکھنے کے مراحل سے بھی گزرتا رہتا ہے۔

ایک وقت تھا ہماری عوام امریکہ کے ساتھ تھی، ہمارے سیاست دان بھی امریکہ کے ساتھ تھے، ہمارے مذہبی گروپ بھی امریکہ کے ساتھ تھے، اور ہماری فوج بھی امریکہ کے ساتھ تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت ہمارے ملک کے مفاد میں تھا۔ اس وقت کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ امریکہ ایک دوست کی شکل میں دشمن سے بھی زیادہ نقصان پہنچائے گا۔ مگر جو ہوا سو ہوا۔

آج ایک وقت ہے، ہماری عوام چین کے ساتھ ہے، سیاست دان بھی چین کے ساتھ ہیں، اور فوج بھی چین کے ساتھ ہے۔ کیوں کہ آج چین کے ساتھ ہونا ہمارے ملکی مفاد میں ہے۔ چین کے ساتھ دوستی نہ صرف ہمارے دفاعی مفاد میں ہے بلکہ معاشی مفاد میں بھی ہے۔ پاک چین دوستی ہمارے آج کے لیے بھی بہترین ہے اور ہمارے بہترین مستقبل کی بھی ضامن ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کے نقشے پر جس جگہ موجود ہیں وہ انتہائی اہم ہے اور پاکستان کو اہمیت دیے بغیر چین کا سب سے بڑا منصوبہ ون بیلٹ ون روڈ کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ یہ منصوبہ 5 سے 8 ٹریلین ڈالر کا ہے اور اس پراجیکٹ میں دنیا کی بیرونی سرمایہ کاری کئی گنا زیادہ ہو گی اور یہ خطہ ایک نیا یورپ بن کر ابھرے گا۔ یہ صرف خواب نہیں بلکہ اس کی تعبیر بھی ہوتی نظر آ رہی ہے کیوں کہ دنیا کے 140 سے زیادہ ممالک اس میں اپنی رضامندی کا اظہار کر چکے ہیں۔

خواب تو ہم نے امریکہ کے ساتھ بھی بہت دیکھے تھے مگر امریکہ اپنی منفی سوچ کی وجہ سے نہ صرف خود برباد ہوا بلکہ اپنے ساتھ جڑے ہوئے بہت سے ملکوں کو بھی برباد کر گیا۔ مگر یہ میری تحقیق اور ریسرچ ہو سکتی ہے، جن کو میں پڑھتا ہوں وہ یہ کہتے ہیں، جنہیں میں سنتا ہوں وہ یہ کہتے ہیں، مگر انڈیا، اسرائیل اور امریکہ سے لکھنے والے بہت سے قلمکار اس سارے معاملے کو اور طرح سے بھی دیکھتے ہیں۔ تو یہ ان کی رائے ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ چین کے خلاف بھی لکھتے ہیں یہ کل کی ایسٹ انڈیا ہو سکتی ہے، یا پھر اور بہت کچھ۔ ہو سکتا ہے ایسا لکھنے والے ٹھیک ثابت ہوں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا کبھی کچھ بھی نہ ہو۔ ہر طرح کی رائے کا سامنے آنا، اور خدشات کو مد نظر رکھنا یہ بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا ہم اپنے مفاد کی وجہ سے کسی کے بارے میں اچھا اور مثبت لکھتے ہیں۔ سب اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے حصے کی کوشش کر رہے ہیں میں بھی اپنے حصے کی کوشش کرتا ہوں میں کسی سے تنخواہ وصول کر کے اس کا نقطہ نظر پیش نہیں کرتا۔

ایسا نہیں ہو گا کہ آج کا سبز خواب پیش کرنے والا، کل کو بری طرح سے ایکسپوز ہو جائے اور اس کا بھانڈا پھوٹ جائے اور میں پھر بھی اس کا ساتھ دیتا رہوں، انشاء اللہ اگر کوئی پاکستان کے ساتھ برا کرے گا، تو جو بطور قلمکار میرا فرض بنتا ہے میں اپنا حصہ ضرور ڈالوں گیا مگر کسی کی خواہش پر اپنا قلم نہیں بیچوں گا۔

میرے بہت سے دوست ہیں جن کا تعلق نون لیگ سے ہے مگر وہ پٹواری نہیں، بہت سے ایسے دوست بھی ہیں جن کا تعلق پی ٹی آئی سے ہے مگر وہ یوتھیے نہیں، اور بہت سے لوگوں کا تعلق ایم کیو ایم سے ہے مگر وہ زندہ لاشیں نہیں، اور بہت سے لوگوں کا تعلق پی پی پی سے ہے مگر وہ پیپلیئے نہیں۔ اور بہت سے لوگوں کا تعلق مذہبی جماعتوں سے ہے مگر وہ انتہا پسند نہیں۔ میں ایک عام سا بندہ ہوں اور وہ عام سے دوست ہیں مگر ہم ایک دوسرے کے لیے خاص ہیں۔ فرق نہیں پڑتا کون سی حکومت آتی ہے اور کون سی چلی جاتی ہے اور اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کون کس طرح کا نظریہ رکھتا ہے، ہم اپنے ملک سے، اپنی فوج سے، اپنے رب سے اور اپنے رسول سے محبت کرنے والے لوگ ہیں، سیاست میں ہماری دلچسپی ہو سکتی ہے مگر سیاست ہمارا ایمان نہیں۔ اور ہم ملک کے مفاد کے خلاف کبھی نہیں جائیں گے۔ کیوں کہ ہم بطور قوم بھی کسی کی سیاہ کاریوں کے وکیل نہیں ہو سکتے اور بطور مسلمان بھی کسی کی سیاہ کاریوں کے وکیل نہیں ہو سکتے، اور بطور انسان بھی انسانیت کے خلاف کسی کے ظلم و جبر وکیل نہیں ہو سکتے۔

اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمارے ملک کو امن اور سلامتی کا گہوارا بنائے، آمین، دعا گو، میاں وقار الاسلام

سبز ہلالی پرچم ہماری جان ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

سبز ہلالی پرچم ہماری جان ہے، ہماری شان ہے اور ہماری پہچان ہے۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنے والے تو سونے اور چاندی کے گھروں میں بھی خوش نہیں رہتے۔ اور اللہ کا شکر ادا کرنے والے مٹی کے کچے مکان میں بھی خوش رہتے ہیں۔

کبھی اس پرندے کو دیکھیں جس کا گھونسلہ تیز ہواؤں کی نظر ہو گیا ہو کبھی اس بے گھر کی طرف دیکھیں جس کا گھر سیلاب میں بہہ گیا ہو۔ ماں باپ بھی محفوظ پناہ گاہ کا کام کرتے ہیں کبھی انہیں دیکھیں جن کے ماں باپ ان سے بچھڑ گئے ہوں۔ اور پھر یہ دیکھیں کہ وہ کتنے غیر محفوظ نظر آتے ہیں۔

کبھی ان لوگوں کو دیکھیں جو کئی نسلوں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہوں، کبھی ان کو دیکھیں جن کی عزتیں ان کے سامنے تار تار ہو جاتی ہوں۔ کبھی ان کو دیکھیں جن کے گھروں میں روز صف ماتم بچھتا ہو۔ کبھی ان کو دیکھیں جنہوں نے زندگی کوئی شام محفوظ نہ دیکھی ہو۔ کبھی ان لوگوں کو دیکھیں جو رات میں سوتے بھی خوف سے ہوں اور دن میں چلتے پھرتے بھی خوف سے ہوں۔ کبھی ان لوگوں کو دیکھیں جنہوں نے آزاد زندگی کا صرف خواب دیکھا ہو اور جس کی تعبیر سے پہلے وہ اپنی سانسوں کے بندھن سے آزاد ہو جاتے ہوں۔

جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم دنیا میں بہت سے لوگوں کو آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ جن پر ظالموں کے ظلم کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ ان کی تکلیف سے زمین بھی کانپتی ہے اور آسمان بھی لرزتے ہیں۔ مگر ظالموں کے دل پتھر کر دیئے گئے ہیں کہ وہ نہ تو سن سکتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں

بہت سے آزاد ملکوں کی آزادی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہاتھوں سے چھن گئی، ان میں کچھ نے تو شاید اپنی آزادی کی قدر جیسی کرنی چاہیے تھی نہیں کی اور کچھ کو ویسے ہی آزمائشوں نے آ لیا اور وہ ایک نہ ختم ہونے والے امتحان کی دلدل میں جا پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں ہنستے بستے گھر برباد ہو گئے اور وہاں کے باسیوں سے ان کی شناخت بھی کھو گئی ذرا ان سے پوچھیں جو اپنی شناخت واپس پانے کے لیے اپنی جانوں کو ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں مگر انہیں ان کی شناخت واپس نہیں مل رہی

جب سے پاکستان آزاد ہوا ہے دشمنوں کی میلی نظریں ہمیشہ ہمارے تعاقب میں رہیں ہیں کہ کب ہم غلطی کریں اور کب ہمیں نقصان پہنچایا جائے۔ ہماری آزادی ایک دودھ کا پیالہ ہے اور ہمارا دشمن بد حواس اور بھوکا بھی ہے اور بلی کی طرح نظریں گاڑھ کر بیٹھا ہے کب ہم ذرا سی کوتاہی کریں اور وہ آزادی کا سارا دودھ چٹ کر جائے۔ اللہ کا ہم پر کرم ہے اور پاک فوج کو سلام ہے جو 24 گھنٹے ہمارے ملک کی حفاظ کر رہے ہیں اور دشمن قوتوں کے عزائم کو ناکام بناتے چلے آ رہے ہیں۔

14 اگست ہماری آزادی کا دن ہے۔ یہ دن ہمارے لیے جس قدر خوشی لے کر آتے ہے اسی قدر یہ ہمارے دشمنوں کا دل بھی جلاتا ہے جنہوں نے ہمیں کبھی آزاد مملکت تسلیم نہیں کیا۔ ہمیں اس دن کی قدر ویسے ہی کرنی چاہیے جیسی کہ کرنے کا حق ہے۔

پاکستان نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے، ہماری قرابتوں کے رشتے بھی اسی لیے محفوظ ہیں کیوں کہ ہم ایک آزاد فضا میں رہتے ہیں۔ والدین ہماری بہتر پرورش بھی اس لیے کر پاتے ہیں کہ انہیں ایک آزاد ماحول ملتا ہے۔ پھر ہم سکول اور کالج یہاں تک کہ یونیورسٹی بھی اسی لیے جا پاتے ہیں کہ ہم ہر جگہ آزاد ہیں اور جو چاہتے ہیں بننے کی کوشش کرتے ہیں اور بن کر دیکھاتے ہیں۔ پھر ہماری پروفیشنل لائف چاہے جاب ہو یا پھر اپنا ذاتی کاروبار وہ بھی اسی وجہ سے پروان چڑھتا ہے کیوں کہ ہم مغلوب نہیں۔ پھر ہم اپنے خاندان اور اپنی نسل کو بڑھاتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ ہمارا مستقبل غیر محفوظ نہیں۔

ہمیں یہ سب کچھ اللہ طرف سے پاکستان کی صورت میں عطا ہوا جس کی جتنی قدر کی جائے اتنی ہی کم ہے۔ سبز ہلالی پرچم ہماری جان ہے، ہماری شان ہے اور ہماری پہچان ہے اور ہم اپنی پہچان کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ اللہ ہم پر آزادی کی چھت قائم رکھے اور ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل بھی روشن ہو، آمین

ماہ آزادی کے نام ایک نظم

"اپنا حصہ ڈالیں"

اپنا حصہ ڈالیں

عجب ہو کا عالم ہے

بدحالی ہی بدحالی ہے

وقت ظلمت کا پروانہ ہے

کوئی آس کی بات کریں

اپنا حصہ ڈالیں

رنج والم کا موسم ہے

ہر شخص ہی دکھی ہے

اپنے حصے کا غم بانٹیں

اپنے حصے کی خوشی تقسیم کریں

اپنا حصہ ڈالیں

زمینیں بنجر ہو گئی ہیں

بلا کی خوشک سالی ہے

اپنے حصے کا پانی ڈالیں

اپنے حصے کی فصل بوئیں

اپنا حصہ ڈالیں

اندھیرا ہی اندھیرا ہے

کوئی امید کی کرن نہیں

اپنے حصے کا دیا جلائیں

اپنے حصے کی روشنی کریں

اپنا حصہ ڈالیں

اگست آزادی کا مہینہ ہے

ہم خود سے بھی آزاد نہیں

اپنے حصے کے قفل توڑیں

ہم خود کو تو آزاد کریں

اپنا حصہ ڈالیں

ہمیں شکوے ہزاروں ہیں

ہمیں ہزاروں گلے ہیں

یہ آزادی ہمارا حصہ ہے

کیوں ہم شکر گزار نہیں

شاعر: میاں وقار الاسلام

تبدیلی کا سورج اب ڈوبنے والا نہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

پاکستان نے اپنے تاریخ میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں، سیاسی رہنماؤں کے بے بسی بھی دیکھی ہے اور سیاسی رہنماؤں کی بے حسی بھی دیکھی ہے۔ جرنیلوں کے جلوے بھی دیکھے ہیں، فوجیوں کی قربانیاں بھی دیکھی ہیں، معشیت کی تباہ حالی بھی دیکھی ہے اور خود کو اٹامک پاور بن کر ابھرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ امریکہ کے ساتھ سمجھوتے بھی کئے ہیں اور امریکہ کے عزائم کو مٹی میں بھی ملایا ہے، روس جیسی عالمی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے بھی کیے ہیں اور خود کو دولخت ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

قصور کس کا تھا، غلطی کس تھی، گناہ گار کون تھا، سہولت کار کون تھا، کون میر جعفر بنا رہا، کس نے گھر کا بھیدی بن کر لنکا ڈھائی اور کس نے کس کس طرح سے پاک دھرتی پر شب خون مارا۔ اس دھرتی نے بہت کچھ سہا ہے اور بہت کچھ دیکھا ہے اور اس کے سینے میں بہت سے راز ہیں۔ اللہ نے اسے آزمایا بھی بہت ہے اور اللہ نے اسے نواز بھی بہت ہے۔

پاکستان نے اپنی تاریخ میں کمزور سے کمزور وقت بھی دیکھا ہے اور مضبوط سے مضبوط وقت بھی دیکھا ہے، جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے شہدا بھی دیکھے ہیں اور دونوں ہاتھوں لوٹنے والے غدارِ وطن خاندان بھی دیکھے ہیں۔ ہوس کے پجاریوں کو بھی دیکھا ہے اور اپنا سب کچھ لٹا دینے والے سخیوں کو بھی دیکھا ہے۔

اللہ نے ہمیں ایسے خطے سے نوازا ہے جس کے نیچے تہہ بہ تہہ خزانے موجود ہیں، اور ایسے ظالموں سے بھی نوازا ہے جو کرپشن میں ڈوبے ہوئے ہیں چاہے وہ ایک سادہ ریہڑی والا یا پھیری والا ہو جا پھر صاحب اختیار ہو یا پھر صاحب اقتدار جس کا جہاں ہاتھ پڑھا اس نے بے دردی سے لوٹا اور لوٹا ہی چلا گیا، کئی بار طوفان آئے، آندھیاں اور زلزلے آئے زمین کانپی، آسمان لرزا مگر چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنے ہاتھ نہیں روکے اور پھر اللہ بھی انہیں مہلت دیتا گیا کہ وہ اپنی آخرت کا سامان کرتے جائیں اور اپنے پیٹ میں مذید آگ بھرتے جائیں۔

اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، بے خبری میں ایسے پے در پے پڑتی ہے کہ روح کانپ اُٹھتی ہے اور ذلت اور رسوائی مجرموں کے ساتھ چمٹا دی جاتی ہے۔ کچھ لوگ ڈیٹھائی کے بھی بے تاج بادشاہ ہوتے ہیں، مرتے مر جائیں گے مگر ذلت کا طوق عزت کا تمغہ سمجھ کر گلے میں سجائے پھرتے رہیں گے۔

الطاف جو صرف ریڈیو پر بولتا تھا تو پورا کراچی ایسے خاموش ہو جاتا تھا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، پورے شہر پر جیسے آسیب کا سایہ تھا، بوری بند لاشیں، اغوا برائے تاوان، بھتے اور ہفتے کراچی شہر کے ساتھ کیا کیا نہیں ہوتا رہا اور تکبر بھرے مغرور لہجے کہ جیسے انہیں کوئی کبھی چھو بھی نہیں سکتا کیا ہوا ان ناپاک ہستیوں کیا جو آج یا تو دربدر منہ چھپاتی پھر رہی ہیں یا پھر جیلوں میں اپنے اعمال کا صلہ حاصل کرنے کے لیئے پڑی ہوئی ہیں۔ جو عذاب ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہونا ہے وہ تو الگ ہے۔

دوسری ہستی زرداری جو خود کو سب پر بھاری کہتا تھا، خود کو جوڑ توڑ کا ماہر کہتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کی نیب کیا یا کسی کی بھی کیا مجال کے اُسے ہاتھ بھی لگائے، اور جو سندھ کارڈ کھیلنے کی بات کرتا ہے ذلت اور رسوائی کا طوق آج اس کے گلے میں ہے، اس کی پارٹی لاوارثوں کی طرح ایک من مچلے کے پیچھے خراب ہو رہی ہے اور اس کا نام نہاد آقا جیل میں پڑا ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ کرپشن کے چارجز کو اس کے متوالے سیاست کے تمغات سمجھ کر دل بہلا رہے ہیں اور ذلت کو عزت سمجھ کر مسکرا بھی رہے ہیں اور مٹھائیں بانٹ بانٹ کر کھا بھی رہے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کو شرم کون دلا سکتا ہے جنہوں نے بے شرمی کی قسمیں کھائی ہوں۔

تیسری ہستی نواز شریف، نام شریف اور کام ایسے کہ کوئی بدمعاش بھی نہ کر سکے، خود کو کاروباری اور سیاسی تیس مار خان سمجھنے والے دنیا میں جگہ جگہ اپنے اثاثے بنانے والے اور بیٹوں کو پاکستانی شہری نہ کہنے والے، خود کو شاہی خاندان سے مثال دینے والے، پنجاب کا سارا بجٹ لاہور میں لگانے والے، کسانوں کی خودکشی کی وجہ بننے والے اور ان کے معاشی قتل کرنے والے، انڈیا کے ساتھ پینگیں بڑھانے والے اور پاکستان کے سیکورٹی معاملات میں ہمیشہ سے ٹانگ اڑانے والے، آج بھیکاریوں کی شکل بنائے سلاخوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان پر گویا ظلم کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ نہیں جناب ان کا برا وقت شروع ہو چکا ہے۔

یہ کیسے ظالم لوگ تھے ان میں سے ایک تو ہمیشہ اس بات کا ووٹ مانگتے رہے کہ ہمارے مخالفین کرپٹ ہیں اور ہم ان سے بدلا لیں گے اور عوام کا پیسہ ملک میں واپس لائیں گے، پھر دوسرے بھی اسی بات کا ووٹ مانگتے تھے کہ نہیں نہیں ہم کرپٹ نہیں تھے بلکہ ہمیں کرپٹ کہنے والے کرپٹ تھے اور ہم ان سے قوم کا پیسہ نکالیں گے اور انہیں سڑکوں پر گھسیٹیں گے اور ان کے پیٹ پھاڑیں گے یہ سب سنتے سنتے عوام کے کان پک گئے اور بدلہ انہوں نے آپس میں کیا لینا تھا عوام سے ہی بدلہ لیا جاتا رہا۔

قرضوں پر قرضے چڑھتے رہے، اور اثاثوں پر اثاثے بنتے رہے اور جائیدادوں پر جائیدادیں بنتی رہیں اور پاکستان بین القوامی طور پر کرپشن کی وجہ سے پہچانا جانے لگا، کبھی یہ ڈر تھا کہ پاکستان ڈیفالٹ نہ کر جائے تو کبھی یہ ڈر تھا کہ پاکستان آیسولیشن میں نہ چلا جائے، قوم کی آنکھیں تو بند رہیں لیکن دنیا میں ان کے پول کھلتے چلے گئے۔ اور بالآخر ان کا برا وقت آ ہی گیا اور آج یہ سب کے سب وقت کے شکنجے میں ہیں۔

عمران خان نے تحریک انصاف کے نام سے جس مہم کا آغاز کیا، شہباز شریف نے اس ریسپی کو چوری کرنے کی بہت کوشش کی اور زرداری نے بھی اس کی کاپی کرنے کی بہت کوشش کی مگر چوروں کا یقین کون کرے جی، بس یوں کہیے دال نہیں گلی اور اللہ نے تحریک انصاف کو ہی موقع دے دیا۔ آج انصاف پیچھے پیچھے ہے اور سارے چور آگے آگے ہیں۔

میں یہ تو نہیں جانتا کہ عمران خان اپنے مقاصد میں کتنا کامیاب ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کرپشن صرف سیاسی طبقے تک محدود نہیں ہمارا قومی فیبرک کرپشن کے ماحول میں بنا ہے جیسے ٹھیک ہونے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ کسی بھی ادارے میں اگر کرپشن کو روک دیا جائے تو سب سے پہلا جو کام کیا جاتا ہے وہ یہ کہ کام ہی بند کر دیا جاتا ہے۔ ایسا ہے موجودہ حکومت کے ساتھ معاملہ ہے۔ بہت سے ادارے یا تو کام نہیں کر رہے یا پھر اتنا سلو کام کر رہے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کرپشن سیز ہے۔ اور وہ کہتے ہیں نہ کہ بغیر کھائے ہمارے دل کی بتی نہیں جلتی

کرپشن کو ختم کرنا تو ناممکنات جیسا لگتا ہے، ہر ادارے میں نااہل لوگ اہل لوگوں پر بھاری ہو رہے ہیں۔ مگر کرپشن پر ہاتھ پڑ جانا بھی چھوٹی بات نہیں ہے، تبدیلی کی ایک لہر محکموں میں دیکھی جا سکتی ہے، جس سے ایک بات تو واضع ہے کہ حکومت یا تو درست سمت میں کام کرے گی یا تو نہیں کرے گی۔ شروع شروع میں تو یہی لگ رہا ہے کہ کام نہیں کر رہی، کیوں کے لوگ کام کو ہاتھ ہی نہیں لگاتے، مگر ایسے لوگوں کو بہتر لوگوں سے تبدیل کرنے کا کام بھی جاری ہے اور محدود سطح پر بہتر تبدیلیاں بھی رونما ہو رہی ہیں۔ اگر حکومت اپنے ارادوں پر قائم رہی اور اسی تسلسل کے ساتھ چلتی ہے تو ایک پائیدار تبدیلی ممکن ہے۔

کرپشن ہمارے معاشرے میں ایک کینسر کی طرح پھیلی ہوئی ہے، جس کا علاج بھی کینسر کی طرح سلو ہے، آہستہ آہستہ صحت مند سیلوں کو بیمار سیلوں سے بدلا جائے گا اور ایک بہتری کا سفر جاری رکھا جائے گا۔ امید ہے کہ بہتری آئے گی۔ مگر یہ بھی ہے کہ اگر ہم خود بیمار رہنا چاہیں تو ہمیں کون ٹھیک کر سکتا ہے۔ ابھی بھی ہم میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو چاہتے ہیں کہ سب پہلے جیسا ہو جائے اور جس کینسر میں ہم مبتلا تھے اسی میں پھر مبتلا ہو جائیں۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے اللہ ہمیں اس ظلم کے نظام سے لڑنے اور اس سے باہر آنے میں ہماری مدد کرے

میں جانتا ہوں کے بہت سے لوگ تبدیلی کے اس نعرے کو ویسے ہی جھوٹا سمجھتے ہیں جیسے آج تک ہمیں سب نے جھوٹے نعروں سے نوازا، بڑی بڑی باتیں کر کے آئے اور جاتے ہوئے بری طرح ذلیل ہو کر گئے اور پھر ہمیں انہیں کو واپس تسلیم کر لینا پڑا کیوں کہ ہمارے پاس کوئی بہتر متبادل ہی نہیں تھا۔

میں یہ تو نہیں جانتا کے پی ٹی آئی اپنے وعدوں کو کس حد تک پورا کرے گی یا کر پائے گی، مگر یہ ضرور جانتا ہوں کے عوام چاہیے جس بھی جماعت کے سپورٹ میں ہوں۔۔۔۔۔۔اب کرپشن کو سپورٹ نہیں کرے گی چاہے وہ خود پی ٹی آئی کی ہی کیوں نہ ہو۔

اور انشاءاللہ، تبدیلی کا یہ سورج اب ڈوبنے والا نہیں۔

اور رہنما پھنس گئے

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہدایت تو صرف اللہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے، مگر اللہ نے ہی ہدایت کرنے کے لیے رہنما چنے اور انہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے جس بستی کی طرف چاہا بھیج دیا اور پھر جسے چاہا اسے ہدایت بخشی اور جسے چاہا اسے گمراہ رکھا۔

ہدایت بھری کتابیں بھی بھیجیں اور پھر یہ بھی کہا کہ لوگ اسی سے ہدایت لیں گے اور اسی سے گمرائی اختیار کریں گے۔

پھر اللہ کے بھیجے ہوئے رہنماؤں کے بعد ان کے جانشین پیدا ہوتے رہے یہاں تک کہ بعد میں آنے والوں کے اللہ کی کتابوں کو پسِ پشت ڈال دیا اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے چلے گئے۔

ان لوگوں کا ظاہر تو ویسا ہی رہا جیسا رہنماؤں کا ہوتا ہے مگر ان کا باطن آلودہ ہوتا چلا گیا اور جو حقیقی سچ بھیجا گیا تھا اس پر باطل کی گرد آ کر بیٹھ گئی۔

یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا، بہت سی قومیں اس سے پہلے بھی برباد کر دی گئیں اور پھر ان کے بعد آنے والوں قوموں کا بھی حال برا ہی ہے کیوں گے بعد میں آنے والے بھی اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے چلے گئے۔

مگر اللہ بڑا بادشاہ ہے، ہدایت کا مالک ہے اور سبب الاسباب بھی ہے، اپنے بندوں کو ہدایت دینے کے لیے طرح طرح کے بہانے اور آزمائشیں بھیجتا رہتا ہے اور اس سے جنہیں چاہتا ہے ہدایت پر لے آتا ہے اور جسے چاہتا ہے پھر گمراہی کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔

حقیقی رہنمائی تو کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے، دنیاوی رہنمائی کے احوال قوموں پر اس سے بھی برے ہیں۔ چاہے امریکہ ہو، چاہے انڈیا ہے چاہے پاکستان ہو یا پھر دنیا کا کوئی کونہ، لوگ ہر میدان میں اپنے لیے رہنما چنتے ہیں اور پھر ان کی رہنمائی کے دھوکوں میں رسوا ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دنیا عجب کھیل کہانی ہے، ایک انار اور سو بیمار والی داستان ہے۔ ایک رہنما اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگو مجھے اپنا رہنما چن لو میں آپ کے سارے درد سمجھتا ہوں اور میں آپ کی ساری تکلیفیں دور کر دوں گا۔ اور پھر اس کی چکنی چپڑی باتیں سن کر لوگ اس کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

ہاتھ جوڑ جوڑ کر ووٹ مانگنے والا، اقتدار میں آتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے، یا پھر یوں کہیے کہ وہ چہرا جو ووٹ مانگنے کے لیے اوپر لگایا گیا تھا وہ چہرہ اقتدار میں آتے ہی اتر جاتا ہے اور اصلی چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔ اور والہانہ محبت، والہانہ نفرت میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

یہ سلسلہ یہاں رکتا نہیں ہے، کیوں کہ لوگوں کی محبت سے بھی فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور لوگوں کی نفرت سے بھی کمائی کی جاتی ہے۔ یہ نفرت لوگوں کے دلوں میں سبز باغ اگانے کے لیے نئی زمین تیار کرتی ہے اور پھر ایک اور چہرا وہاں کھیتی باڑی کرنے آ جاتا ہے۔

لوگوں کے دل بنجر ہو جاتے ہیں اور ظالموں کے سبز باغ لہلہاتے رہتے ہیں۔

ایسے رہنما بھی برے اور ایسی رہنمائی بھی بری مگر سب سے برے وہ لوگ بنتے ہیں جو ایسی رہنمائی کی پوجا کرتے ہیں۔ اور ان کی پوجا میں بلی عوام کی چڑھائی جاتی ہے۔

عوام ایک دفعہ پھر بلی کا بکرا بنی ہے، اللہ کرے اس دفعہ اسے اس کی قربانیوں کا کچھ صلہ مل جائے، ورنہ رہنما تو پہلے بھی پھنستے رہے ہیں اور ان کا بوجھ دستور کے مطابق عوام کو ہی اُٹھانا پڑتا رہا ہے۔

تبدیلی کے لیے دعا گو، عوام کے لیے پریشان، میاں وقار الاسلام

سیاسی چونا

تحریر: میاں وقار الاسلام

ہمارے ہاں چونا لگانے سے بڑا شاید ہی کوئی بزنس ہو۔ کیوں کہ ہر کوئی کسی نہ کسی انداز میں چونا لگانے میں مصروف ہے۔

ڈاکٹر اپنے مریضوں کو چونا لگا رہے ہیں، وکیل اپنے موکلوں کو چونا لگا رہے ہیں۔ کاروباری طبقہ اپنے گاہکوں کو چونا لگا رہا ہے۔ پیر اپنے اپنے چیلوں کو چونا لگا رہے۔ اور سیاست دان ہم سب کو چونا لگا رہے ہیں۔

جب نون لیگ اور پی پی پی کو ادھی ادھی حکومت ملی تو انہوں نے ادھا ادھا چونا لگایا اور جب انہیں پوری پوری حکومت ملی تو انہوں نے پورا پورا چونا لگایا اور جاتے جاتے اگلی حکومت کا بھی چونا خود لگا گئے۔

اب نئی حکومت ایک طرف تو رو رہی ہے کہ اسے چونا لگا دیا گیا اور دوسری طرف انہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ چونا کیسے لگانا ہے کیوں کہ اس کے بغیر تو گورنمنٹ چلے گی ہی نہیں۔ سو چونا لگانے کے نئے نئے طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔

ایک وہ بھی چونا تھا جس کے کئی کئی کوٹ کر کے یہ حکومت وجود میں آئی اور ایک یہ بھی چونا ہے جو اپنے لگائے ہوئے چونے کو چھپانے کے لیئے لگایا جا رہا ہے کہ کہیں لوگوں سے کیئے ہوئے وعدے یاد نہ آ جائیں۔

خوشامدیوں سے زبردست چونے باز کوئی نہیں ہوتا جو دن کو رات اور رات کو دن بنانے میں مصروف ہیں ان کے ہاں بھی کوا کالا ہوتا ہے مگر یہ اسے بھی چونا لگا کر سفید پیش کرتے ہیں اور کووں کو کبوتروں کے ساتھ اڑاتے نظر آتے ہیں۔

کوئی بھی حکومت جب معرض وجود میں آتی ہے تو پہلے ہی سال ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ چونا لگ گیا۔ ساتھ ہی نئے نئے چونا لگانے والے اپنی اپنی باری کے انتظار میں کھڑے نظر آتے ہیں اور وعدہ کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ ہمارا چونا سالوں سال چلے گا۔۔۔ مگر اللہ جھوٹ نہ بلاوائے کسی کا بھی چونا پہلی بارش نہیں نکالتا اور ساری کارکردگی صاف نظر آنے لگتی ہے۔

کوئی بھی چونا لگانے والا باوجود اس کے کہ اس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہوتا ہے کبھی ہار نہیں مانتا بلکہ چونے کا نام بدل کر پھر لائن میں کھڑا ہو جاتا ہے کہ اسے پھر ایک اور موقع دیا جائے۔

عوام بڑے کھلے دل کا مظاہرہ کرتی ہے عوام کو معلوم ہے کہ کسی کا چونا نہیں ٹھہرنے والا مگر پھر بھی آخر کسی نہ کسی کو تو باری دینی ہے۔ سو باری باری کے چکر میں بار بار چونا لگوانا پڑتا ہے۔

اللہ کرے کہ چونا لگانے والوں پر بھی کوئی چونا لگانے والا آئے اور قوم کی ان چونا لگانے والوں سے جان چھوٹے

آخر کب تک چونا لگایا جا سکتا ہے ایک دن تو سب چونا لگانے والوں نے پکڑے جانا ہے پھر یہ کس کو چونا لگائیں گے

اللہ ہمیں ایسے لوگوں کے وبال سے بچائے۔ آمین

دعا گو میاں وقار الاسلام

پاور پالیٹیکس

تحریر: میاں وقار الاسلام

پاور پالیٹیکس ملکی سیاست کا ایک اہم جزو رہا ہے اور بد قسمتی سے اب تک پاور پالیٹیکس اپنے عروج پر ہے۔ سیاسی جماعتیں سفارشی لوگوں مختلف اداروں میں بھرتی بھی کرواتی رہی ہیں اور انہیں پروموٹ بھی کرواتی رہی ہیں۔ اور انہیں لوگوں کو بعد میں کرپشن کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور انہیں لوگوں کو مکروہ سیاسی عزائم کے لیے استعمال کرکے تخریب کاری کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

پاور پولیٹکس اور وائیٹ کالر کرائم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی لیے کرپشن کو پکڑنے کے لیے کبھی ثبوت نہیں ملتے سوائے اس کے کہ وعدہ معاف گواہ بنا لیے جائیں اور کسی کرپٹ ٹولے کو اپنے انجام تک پہنچا دیا جائے۔ اگر وقت پر فیصلے نہ ہو پائیں تو وعدہ معاف گواہوں کا کوئی دین اور ایمان تو ہوتا نہیں، پریشر کم ہوتے ہی وعدہ معاف گواہ اپنے گاڈ فادرز کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی نے تو دوسرا ہاتھ ضرور دیا ہوتا ہے۔ چنگاری اپنے آپ دم توڑ بھی سکتی ہے، مگر چاروں طرف سے پھونکیں مارنے والے اس میں بھی اپنا مفاد تلاش کر لیتے ہیں۔

پاور پولیٹیکس، وکلا تنظیموں میں تو پہلے سے ہی تھی بد قسمتی سے اب ڈاکٹروں میں بھی پاور پولیٹیکس سرائیت کر رہی ہے۔ برائی برائی کی ہی عکاس ہوتی ہے نہ برا ڈاکٹر تمام ڈاکٹروں کا عکاس ہے نہ ہی برا وکیل تمام وکیلوں کا عکاس ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک گندی مچھلی پورے تلاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے تلابوں میں گندی مچھلیوں کی جگہ گندے مگر مچھ ڈالے گئے ہیں اور انہیں باقاعدہ خوراک بھی مل رہی ہے۔ اور آج عوام ان مگر مچھوں کے جبڑوں میں ہے۔

ہمیں اداروں کو پاور پالیٹیکس سے پاک کرنے کی ضرورت ہے اور اداروں کی باقاعدہ قانون سازی کی بھی ضرورت ہے تاکہ کوئی ادارہ حد سے تجاوز نہ کر سکے۔ سیاسی بھرتیوں اور سیاسی سرپرستی کی وجہ سے بہت سے اہم ادارے سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اداروں کو اپنے حقوق کے لیے پاور پالیٹیکس کا سہارا لینا پڑتا ہے، جو ادارہ اپنی آواز بلند نہیں کرتا اسے اپنے حقوق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ بالادستی قانون کی ہونی چاہیے نہ کہ پاور پلے کی کہ جس کا جتنا زور ہے اتنے حقوق اپنے نام کر لے۔

بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہاں اندھے گونگے اور بہرے لوگوں نے بھی احتجاج کیا ہے اور اپنے حقوق کے لیے دھکے کھائے ہیں۔ اگر انصاف بلا تفریق نہیں ہوگا تو پھر محکموں کی پاور پالیٹیکس کو کبھی نہیں روکا جا سکتا۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اداروں کے اندر بھی جو لوگ پاور پالیٹیکس کا حصہ بنتے ہیں صرف انہیں کو تمام حقوق دیے جاتے ہیں اور اداروں کے باقی تمام لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پھر انہیں پاور پالیٹیکس کا حصہ بننے والے لوگوں کی سرپرستی کی جاتی ہے انہیں مضبوط کیا جاتا ہے اور انہیں مکروہ مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور پھر اگر انہیں کے مکروہ اقدامات کی وجہ سے پورے محکمے کو شرمسار ہونا پڑے تو ان لوگوں کو بھی برابر شرمسار ہونا پڑتا ہے جو اس پاور پالیٹیکس کا حصہ نہیں ہوتے۔

ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ ڈاکٹروں اور وکیلوں کے معاملات میں کہیں پاور پالیٹیکس نہیں تھی۔ مگر ایک طوفان ہے جو اب کھڑا ہو چکا ہے۔ اور اگر اب اس میں پاور پالیٹیکس شروع ہو جائے تو پھر اسے کہاں تک روکا جا سکتا ہے۔ شر پسند عناصر تو ہر طرف موجود ہیں اور ہمیشہ سے ایسے واقعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انہیں تو بس موقع ملنا چاہیے اور پھر گیم شروع۔

یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ وقت کے ساتھ یہ زخم بھی بھر جائیں گے اور دونوں محکمے چیختے چلاتے آخر کار کسی نہ کسی پوائنٹ پر خاموش ہو جائیں گے۔ مگر جو نقصان عوام کو برداشت کرنا پڑا یا کرنا پڑے گا اس کا ذمہ دار کون ٹھہرے گا۔ سب اپنے اپنے مقدمے لڑتے رہیں گے، مگر عوام کا مقدمہ کون لڑے گا۔

پاور پالیٹیکس سے جس کا بھی فائیدہ ہو عوام کا تو صرف نقصان ہی ہوتا رہا ہے۔ اللہ ہمارے حاکموں کو ہدایت دے تاکہ کوئی عوام کا بھی پرسانِ حال ہو امین، دعا گو میاں وقار الاسلام

فور تھ جینریشن کرپشن

تحریر: میاں وقار الاسلام

لوگ کہتے ہیں کہ نواز شریف اور شہباز شریف کرپشن میں ملوث ہیں۔آج کے دور میں اگر کوئی یہ بات کرتا ہے تو اسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسے سیاست کی سمجھ بوجھ ہی نہیں ہے۔ کرپٹ تو زرداری تھا، یا پھر مشرف تھا، یہ تو ان سے تھوڑا کرپٹ ہے، سو اسی پہ گزارا کرو، اس سے اچھا نہیں ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کبھی کوئی ایسا سیاست دان دیکھا ہی نہیں ہے جو کرپٹ نہ ہو۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو کرپشن کے خلاف لڑتے ہوئے بھی دیکھا، جیلوں میں جاتے ہوئے بھی دیکھا، مار کھاتے ہوئے بھی دیکھا اور پھانسیوں پر لٹکتے ہوئے بھی دیکھا، مگر تبدیلی نہیں آئی اور فرعونیت کا نظام اپنے عروج پر پہنچ گیا۔اب ایک تو ہم نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لی ہیں اور کوئی پوچھے تو کہتے ہیں سب اچھا ہے۔

اور دوسری طرف جب حکمرانوں کو کرپٹ کہا جاتا ہے تو وہ بھی محسوس نہیں کرتے، کیوں کے عوام جتنی بھی بکواس کر لے ان کی قسمت میں آخر کار خاموش ہونا ہی تو ہے۔ پھر عوام یہ بھی سوچتی ہے کہ ہمارے بڑوں نے کیا اُکھاڑ لیا تھا جو ہم اُکھاڑ لیں گے۔ عمران خان کو پتہ ہے کہ جتنے بھی ثبوت اکٹھے کر لیے جائیں عدالتوں کے ذریعے کرپٹ کو کرپٹ ثابت نہیں کیا جاتا کیوں کہ عدالتیں وہ سارے چور راستے مہیا کرتی ہیں جو چوروں کو اپنے بچاؤ کے لیے چاہیں۔

دوسری طرف نواز شریف صاحب کہتے ہیں عمران بیٹا سسٹم میں آ جاتا کہ میں تیرا کچومر بنا دوں، بگاڑ تو کچھ سکو گے نہیں۔ کیوں کہ ہم فور تھ جینریشن کرپشن میں داخل ہو چکے ہیں۔ فور تھ جینریشن کرپشن کا دور بڑا ظالم ہے، یہ ایک ایسا اندھیرا ہے کہ اگر اس میں کوئی دیا جلانے کی کوشش کرے گا تو سالوں سے سوئی ہوئی عوام کی نیند حرام کرنے کے مترادف ہے، پہلے تو کوئی اُٹھے گا ہی نہیں اور اگر اُٹھ بھی گیا تو دیا جلانے والے کو ہی برا بھلا کہے گا، قدرت رکھتا ہوا تو اسے ایک دو چپیڑیں بھی رسید کر دے گا، اور پھر دیا بجھائے گا اور سو جائے گا۔ کچھ لوگ ابھی بھی جاگ رہے ہیں، میرا ان کے لیے پیغام ہے، جاگتے رہنا بھائیو۔

ڈڈو سکالرز

تحریر: میاں وقار الاسلام

عجیب زمانہ ہے عجیب صحافت ہے اور سب سے عجیب ہیں آج کے ڈڈو سکالرز۔

ڈڈو سکالرز یعنی پیسہ کمانے کے لیئے صرف ٹرٹر ٹر کرتے رہتے ہیں اور اپنے فن کا خوب معاوضہ لیتے ہیں۔

بد قسمتی سے ہمارے نیوز چینلز حالات حاضرہ کی خبریں دینے کی بجائے صرف گھٹیا سطح کی انٹرٹینمنٹ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ان کے پے رول پر چند معروف ڈڈو سکالرز موجود ہیں جو من گھڑت افسانچے بنا کر لے آتے اور اپنی اندھی بصیرت بیچتے رہتے ہیں۔

نیوز چینلز کا باہمی مقابلہ بھی صحت مندانہ ہوتا یعنی کس کا ڈڈو سکالرز یادہ صحت مند ہے یعنی کون زیادہ ٹرٹر ٹر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

کانٹینٹ چاہے اچھا ہو یا نہ ہو اگر ٹرٹر ٹر کی آواز تسلی بخش نہیں تو پھر کوئی سکوپ نہیں۔

ویسے اگر دیکھا جائے تو ڈڈو زیادہ تر خاصے مہذب اور امن پسند سمجھے جاتے ہیں۔مگر یہ ڈڈو انتہائی خطرناک قسم کے ہیں یہ منہ پر جوتے بھی کھا لیتے ہیں، ایک دوسرے پر سیاہی بھی پھینک دیتے ہیں اور زبان تو تیر سے بھی زیادہ تیز چلاتے ہیں۔یہ ایک طرح کے انتہا پسند ڈڈو ہیں۔

کنوئیں کے ڈڈو والی بات تو آپ نے سنی ہی ہو گی یہ ایک خصلت ان میں بھی پائی جاتی ہے یہ جس نیوز چینل کے کنوئیں میں رہتے ہیں پھر اس کے باہر نہیں دیکھتے بس اسی چینل کے حق میں غلط یا صحیح ٹرٹر ٹر کرتے رہتے ہیں۔اگر انہیں دوسرے چینل کے کنوئیں میں ڈال دیا جائے تو ایک منٹ میں اپنا ایمان بیچ کر۔۔۔اوہ۔۔۔ایمان تو ان کا ہوتا نہیں۔۔۔یوں کہیئے دوسرے چینل کے کنوئیں کی زبان بولنے لگتے ہیں۔

جب سے ہماری نیوز انڈسٹری انٹرٹینمنٹ میں بدلی ہے، غیر گھریلو سٹیج ڈراموں کے گندے سکریپ لکھنے والے رائیٹرز بھی اپنی خدمات نیوز چینلز کو فراہم کرتے نظر آ رہے ہیں یعنی کے سونے پہ سہاگا اور ڈڈو سکالرز مفت کے ہیروز۔

خدا جانے ہم اپنی صحافت کو ان ڈڈو سکالرز سے پاک کر پائیں گے یا نہیں۔ آج کل کے صحافیوں کو چاہیئے کہ سٹیج ڈراموں میں جا کر اپنا کتھک ڈانس پرفارم کیا کریں شاید زیادہ کمائی ہو۔ اور خبروں کے چینلز کو خبروں کا چینل ہی رہنے دیں۔

سمجھدار لوگوں نے تو ویسے بھی ڈڈو سکالرز پر یقین کرنا ختم کر دیا ہے کیوں کہ ان کی خبریں تو ہماری دنیا سے اب میل بھی نہیں کھاتیں۔ عام عوام نے بھی نیوز چینلز کافی حد تک دیکھنے کم کر دیئے ہیں۔ پھر یقین نہیں آتا ان ڈڈو سکالرز کو ریٹنگ کہاں سے مل جاتی ہے۔

اللہ ہمیں ان جھوٹوں کے شر سے محفوظ رکھے، کیا ہی اچھا ہو کہ ایک ڈڈو کھانے والی قوم انہیں بھی کھا جائے اور ہمیں سکھ کا سانس ملے۔

نہیں کوئی چیز نکمّی زمانے میں۔۔۔۔۔ شاید یہ انہیں ڈڈو سکالرز کے بارے میں کہا گیا ہے کیوں کہ اگر یہ چل سکتے ہیں تو پھر کوئی بھی چل سکتا ہے۔

"باندر کلا"

تحریر: میاں وقار الاسلام

یہ ایک کھیل ہے اس میں چند بچے شامل ہوتے ہیں۔ میدان میں ایک لکڑی کا چھوٹا سا نوکدار ٹکڑا گاڑ دیا جاتا ہے جس کو "کِلا" کہتے ہیں۔ اس کلے کے ساتھ تقریباً دو گز کی رسی باندھ دی جاتی ہے۔ رسی کا دوسرا سرا کسی ایک بچے کو تھما دیا جاتا ہے جسے "باندر" کہتے ہیں۔ سب بچے اپنی چپلیں، جوتیاں اور شوز وغیرہ اتار کر اس "کلے" کے ارد گرد رکھ دیتے ہیں۔

لو جی کھیل شروع ہوا چاہتا ہے۔

سب بچوں نے ملکر جوتیاں اٹھانی ہیں مگر باندر سے بچ کر کہ وہ کسی بچے کو ہاتھ نہ لگا دے ورنہ اس بچے کو باندر بننا پڑتا ہے۔ باندر کو رسی پکڑے ہوئے ہی کسی بچے کو ہاتھ لگانا ہوتا ہے۔ پہلی جوتی کو اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ جونہی کسی طریقہ سے پہلی جوتی کو اٹھایا جاتا ہے باندر کا رنگ بدلنا شروع ہو جاتا ہے یعنی اس کو اپنی شامت قریب دکھائی دینا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر اس دوران باندر رسی چھوڑ دے یا اس سے چھوٹ جائے تو بچوں کے ہاتھوں میں موجود اٹھائی ہوئی جوتیاں اس باندر کو زور زور سے پڑنا شروع ہوتی ہیں ورنہ کھیل جاری رہتا ہے۔ بچے دھوکہ دے کر جوتیاں اٹھاتے جاتے ہیں یعنی ایک بچہ بھاگ کر آتا ہے تو اس کو ہاتھ لگانے کے لیے باندر رسی کو پکڑے ہوئے اس کی جانب بڑھتا ہے مگر وہ دھوکہ دے کر دائیں بائیں ہو جاتا ہے اور اسی دوران دوسری سمت سے آنے والا بچہ قریب آ کر دو تین جوتیاں اٹھا کر دور چلا جاتا ہے۔

جب تمام جوتیاں اٹھالی جاتی ہیں تو ایک مقررہ جگہ "پینڈا" کی طرف باندر نے بھاگ کر اپنی جان بچانا ہوتی ہے ورنہ اس پر جوتیوں کی مسلسل بارش ہوتی ہے اور اس زور سے جوتیاں اس بچارے کو پڑتی ہیں کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں کیونکہ جوتیوں میں بعض اوقات پشاوری چپل تک ہوتے ہیں۔

کچھ بچے باندر کی تواضع کرنے کے لیے "پینڈا" کے راستے میں ہی خود کو تعینات کر لیتے ہیں۔ جونہی باندر ان کی رینج میں آتا ہے اسکی خوب خاطر و مدارت کرتے ہیں۔

اتنا پر تشدد کھیل نجانے بچے کیوں کھیلتے ہیں؟

پاکستانی سیاست کا حال بھی ایسا ہی ہے، میاں صاحب رسی چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں اور عدالت کی جوتیاں انہیں زور زور سے پڑ رہی ہیں۔ اب میاں صاحب پوری کوشش کریں گے کہ کسی طرح "پینڈا" کی طرف بھاگ کر اپنی جان بچالی جائے؟

ناجائز تجاوزات اور زمینوں پر ناحق قبضے

تحریر: میاں وقار الاسلام

سرکاری مال سیاست دان عرصہ دراز سے اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں اور سالوں سے جب بھی کوئی حکومت آتی ہے اس کا پہلا کام یہی ہوتا ہے کہ ایسی سرکاری زمین جس پر پچھلی حکومتوں کی نظر نہ پڑی ہے اس کے نیلامی اپنے لوگوں میں کر دیتے ہیں یا چھوٹے چھوٹے قبضہ مافیا کے ساتھ مل کر ہتھیا لیتے ہیں۔ ملک کا کوئی کونہ نہیں بچا جہاں ناجائز تجاوزات نظر نہ آتی ہوں، ایسے پلاٹس ہزاروں لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں اربوں میں ہیں جن پر ہاوزنگ سکیمز بن چکی ہیں، مارکیٹس یا پلازے بن چکے ہیں جن کی لیز کو بھی گزرے ہوئے 15 سے 20 سال یا اس سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں مگر نہ ایسے پلاٹس واپس لیے گئے نہ ان کا سالانہ کرایہ لیا گیا نہ ہی ان کی لیز کو آگے بڑھایا گیا۔ جب ان پہ ہاتھ ڈالا جاتا تو فوری سٹے مل جاتا یا پھر سیاسی پارٹیاں ان ناجائز قبضوں کی سپوٹ میں لڑنے مرنے کے لیے سامنے آ جاتیں۔ پاکستان میں آپ لانگ ڈرائیو پر نکلیں آپ کو چھوٹے بڑے شہروں میں شاید ہی چند کلومیٹر کی کوئی ایسی پاکٹ مل جائے جہاں سالوں سے قبضہ مافیا کا راج نہ ہو

قبضہ مافیا ایک ایسی بریڈ ہے جسے کبھی ٹچ نہیں کیا جا سکتا، چاہے یہ ایک عام ریڑھی والا ہو، کھوکھے والا ہو یا پھر دوکان والا ہو یا پلازے والا ہو، یا پھر کمرشل یا ریزیڈینشل پراجیک والے ہوں کیوں کہ حرام کھانے میں ان کے ہم پیالہ بڑے بڑے لوگ ہیں جن کے خوف سے سارے محکمے ڈرتے تھے تو سالوں کے قبضے کس قابض کے تسلط سے نکلوائے جا سکتے تھے۔

اربوں روپے کی جائیدادیں کوڑیوں کی قیمت پر لیز کر دی گئیں اور پھر ان پر سالانہ کرائے بھی نہیں دیے گئے اور پھر مجرموں نے مظلوموں والی شکلیں بنا کر سٹے بھی لے لیے۔

پی ٹی آئی نے آتے ہی قومی مجرموں پر ہاتھ ڈالا تو ان لوگوں کی فلک شگاف چیخیں نکل رہیں ہیں جن کی حرام خوریوں کی وجہ سے شائید ان کو زمین بھی قبول نہ کرے۔ ان لوگوں کو شرم تو آنے سے رہی کیوں کہ ہزاروں سال حرام کھانے کی وجہ سے یہ لوگ حلال کھانے کی طرف پلٹنے کی بجائے مرنے کو ہی ترجیح دیں گے۔

ملک ریاض کو ہی لے لیں جو ہمیشہ درجنوں سیاست دان اپنی جیب میں رکھتا تھا اور شاید ہی کوئی بڑی سیاست شخصیت بچی ہو جس کو اس نے براہ راست نوازا نہ ہو۔ تو کوئی سوچ سکتا تھا کہ اس کے نیچے سے زمین اور سر سے چھت کھینچ لی جائے گی اور اس پر بھاری جرمانے بھی کیئے جائیں گے اور ذلیل و رسوا بھی کیا جائے گا۔

میں نے اپنی زندگی میں قبضہ مافیا کے خلاف اتنا بڑا کریک ڈاؤن کبھی نہیں دیکھا۔ اور مجھے عمران خان پر فخر ہے کہ اس نے پاکستان کے حق میں اتنا بڑی مہم کا آغاز کیا قبضہ مافیا بے حد تکلیف میں ہے ان کے مائی باپ اور ان کو تحفظ دینے والے بھی تکلیف میں ہیں مگر انہیں عوام کی تکلیف کا اندازہ کبھی نہیں ہوا جن کے وسائل انہوں نے بے دردی سے روند دیے۔ تو ان فرعونیوں کی تزلیل پر عوام خوش کیوں نہ ہو اور ہر پاکستان سے محبت رکھنے والے کو فخر کیوں نہ ہو

ابھی تو گیم شروع ہوئی ہے عمران خان کے ہر اقدام کے مقابلے میں نون لیگ سوشل میڈیا پرنٹ میڈیا اور نیوز چینلز پر اپنے حواریوں کو اکھٹا کرے گی۔ پاکستان کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ اپنے مجرم سیاست دانوں کے کالے کارناموں سے توجہ ہٹانے کے لیے۔ تو یہ کیا سمجھتے ہیں اس کی وجہ سے چوروں کی لٹی ہوئی عزت واپس آ جائے گی۔ ہر گز نہیں۔ ملک کی لوٹی ہوئی دولت ان کی لٹی ہوئی عزت سے زیادہ اہم ہے۔

عمران خان کے خلاف جس حد تک جا سکتے ہیں جائیں، عمران خان کی اگر نیت ٹھیک ہے تو ان کے باطل اقدام سے اسے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ جتنے یہ لوگ ملک کے ساتھ مخلص تھے عوام انہیں اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ ابھی تک نہیں یقین نہیں آ رہا کہ ان کی سیاست کا جنازہ نکل چکا ہے اور ان کی واپسی کے رستے بند ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اگر یہ لکیر پیٹنا چاہتے ہیں تو پیٹتے رہیں۔

ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ نہ کوئی نواز شریف کے لیے نکلا نہ ہی کوئی شہباز شریف کے لیے نکلا سوائے ان لوگوں کے جن کی فہرست نیب کے پاس ہے اور ان کا اگلا نمبر جلد لگنے والا ہے۔ انہیں چاہیے کہ روئیں۔۔۔۔۔۔ آج ان پہ آسمان بھی خوش ہے اور زمین بھی۔ کیوں کہ چور کا ساتھی صرف چور ہوتا ہے اور ڈاکو کا ساتھی صرف ڈاکو ہوتا ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک ہے، مگر اسی کا دوسرا حصہ بھی دیکھتے ہیں، اگر اس آپریشن کے سائے تلے پی ٹی آئی کے اپنے سیاست دان، اور اپنے حواری چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور انہیں سیاسی پناہ ملتی ہے تو یہ اسی طرح کا کھلواڑ ہو گا جون لیگ نے لاہور میں اپنے مخالفین کے پلازے گرا کر سرانجام دیا تھا۔ آدھا انصاف ناانصافی سے بھی برا ہوتا ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ تو پرامید ہو جاتا ہے اور لوگوں کا دوسرا گروہ ناامید ہو کر رہ جاتا ہے، ایک گروہ تو دعائیں دیتا نہیں تھکتا اور دوسرا گروہ بد دعائیں دیتا رہتا ہے۔ اس طرح کرا چھائی کسی بھی قسم کی برائی سے بدتر ہوتی ہے۔

جہاں پی ٹی آئی کے کام کو سراہنے کی ضرورت ہے وہیں پر ان کی کنسٹرکٹیو تنقید کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔ قبضہ مافیا سے زمین آزاد کرانا جتنا اچھا کام ہے اتنا بھی برا کام اس کو غلط طریقے سے مینیج کرنا بھی ہے۔ اگر زمینیں قبضہ مافیا سے چھڑوا کر پھر ایک نئے قبضہ مافیا کو دے دی جاتی ہیں تو تبدیلی کا ایسا کھلواڑ قوم کو امید کے بعد پھر ناامیدی کے اندھیروں میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔

مثال کے طور پر ریلوے کی زمین کو قبضہ مافیا کو منتقل کرنے میں اگر ریلوے کے ٹیکنو کریٹس خود ہی ملوث ہوں تو یہ قبضہ مافیا کو گود لینے والی بات ہے۔ اسی طرح دوسرے محکموں کی زمینیں ہیں جو ان محکموں کے لوگ خود ہی قبضہ مافیا کے پاس لے جاتے ہیں اور اونے پونے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کی بجائے اگر محکمہ اپنی زمینوں کو ریگولیٹ کرے اور اس کو اپنی باقاعدہ آمدنی کے طور پر استعمال کرے تو بہت سے ادارے اپنے خسارے پر قابو پا سکتے ہیں یا پھر کم از کم اپنے خسارے کو کم ہی کر سکتے ہیں۔ کہیں پڑھا تھا کہ زمین ماں ہوتی ہے تو یہ ادارے اپنی ماں بیچ دیتے ہیں۔

لینڈ ریکارڈ کو کمپیوٹرائیز ہونا چاہیے تاکہ زمینوں پر کرپشن کم سے کم ہو، اور جو غلط نقشے پاس کرائے جاتے ہیں، کہ جائز نقشہ تو پاس نہیں ہوتا اور ناجائز نقشہ پیسے لگا کر جیسے تیسے پاس ہو جاتا ہے یہ ظلم بھی بند ہونا چاہیے۔ یہ بھی ظالم کو کھلی آزادی دیتا ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے۔

قوم کو انصاف کے نام پر ہمیشہ ناانصافی بیچی گئی ہے، غریب کی زمین کاغذوں میں ہی گم ہو جاتی ہے اور اسے پتہ ہی نہیں چلتا اور امیر جیسے چاہتا ہے غریبوں کی زمینوں پر ہاتھ صاف کرتا جاتا ہے۔ کوئی گھر بیٹھے اربوں پتی ہو جاتا ہے اور کوئی گھر بیٹھے کنگال ہو جاتا ہے۔ زمینوں کا کاروبار سونے جیسا کاروبار ہے جسے کرپشن نے کوئلے کی طرح سیاہ کر دیا ہے۔ ایک ایک پلاٹ کا چار چار دفعہ چڑھاوا دینا پڑتا ہے۔ ایک ایک پلاٹ کے پیچھے لوگوں کی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں اور انہیں انصاف نہیں ملتا۔ جتنا ظلم لینڈ ریکارڈ کی وجہ سے عوام کے ساتھ ہوا ہے شاید ہی کسی دوسری مد میں ہوا ہے۔

پی ٹی آئی زمین تو خالی کروا رہی ہے جو کہ اچھی بات معلوم ہوتی ہے مگر جو گیپ کریٹ کیا جا رہا ہے عین ممکن ہے کہ یہ دوبارہ بھر جائے۔ یہ ہزاروں ریڑھی والے اور پھری والے کہاں جائیں گے اس مافیا کا کردار تو پانی کی طرح ہے جو چند دنوں میں پھر سے جگہ بنا لے گا۔

لاہور میں فوڈ سٹریٹ کے نام سے ایک پراجیکٹ ہوا اور پھر اسے کراچی، اسلام آباد اور ملتان میں بھی کاپی کیا گیا اور یہ تقریباً ہر جگہ ہی مقبول ہے ایک تو یہ کلچرل ہے اور دوسرا یہ سستا ہے اور تیسرا یہ ہر طبقے کی تفریح کے لیے بھی اچھا ہے۔ اسی طرح اگر سبزی اور گوشت سٹریٹس بھی بنا دی جائیں، اور پھل فروٹس وغیرہ کی بھی سٹریٹس بنائی جائیں یا اس طرح کی ملتی جلتی کوئی اور تجویز یا منصوبہ بھی حکومت لانچ کرے تو ریڑھی والوں کو ریگولیٹ کیا جا سکتا ہے، اگر سٹریٹس نہیں بن سکتی تو پارکس بنائے جا سکتے ہیں یا اوپن مارکیٹس بنائی جا سکتی ہیں جس سے یہ قبضہ گروپ پھر سے منظّم بھی نہ ہو اور ان کا کاروبار بھی محفوظ ہو۔ بجائے حرام کی پیش کش کرنے کے انہیں حلال کی پیش کش کی جا سکتی ہے۔ بجائے زمینوں کو ان کے قبضے میں دینے کے ان سے باقاعدہ کرائے کی شرائط طے کی جا سکتے ہیں جس سے انہیں فائدہ تو ہو لیکن سرکاری زمینوں کا تحفظ اور قابل منافع استعمال بھی ہو سکے۔ اللہ پاکستان کے حق میں بہتر کرے۔

دعا ہے کہ تیسری نسل کی سیاست ہمیں پھر اسی مقام پر نہ لے جائے جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔

پاکستان میں جمہوریت کے وارثین

تحریر : میاں وقار الاسلام

جمہوریت کے وارثین کہتے ہیں کے ہم نے پاکستان کے لئے بڑی قربانیاں دیں ہیں، ہم نے جیلیں کاٹی ہیں صحبتیں برداشت کی ہیں، جانیں دی ہیں، ماریں کھائی ہیں سو اب ہم جمہوریت کے حقدار ہیں۔

جمہوریت کے وارثو سنو

تم لوگوں کی نااہلیوں کی وجہ سے عوام بد حال ہوئی، پاکستان کی معشیت تباہ ہوئی، ملک دو ٹکڑے ہوا، پوری دنیا میں پاکستان کی جگ ہسائی اور رسوائی ہوئی، بین القوامی تعلقات اور معاملات تباہ ہوئے، ملک دہشت گردی کی جنگ میں بری طرح ملوث ہوا، تم لوگ ایک دوسرے کو چور کہتے رہے اور عوام کا پیسہ چوری کرتے رہے، تم لوگوں نے اپنی جو دنیا بنائی ہے وہ عوام کے پیسوں کو لوٹ کر اور ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کر بنائی ہے۔

تم کہتے ہو جمہورت پر تمہارا حق ہے

حق تو سارا عوام کا ہے کہ تمام جمہوری وارثوں کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر ملک کی خشک سالی کو دے دیا جائے۔ تم روزِ اول سے لاتوں کے بھوت تھے اور لاتیں کھا کھا کر مذید لاتیں کھانے کے عادی ہو گئے ہو۔ تم لوگ ذلت کی انتہا تک پہنچ کر یہ کہتے ہو کے یہ کامیابی کا مقام ہے۔ تم کرپشن در کرپشن کرتے ہوئے کرپشنوں کے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہو۔ اور اب تم کہتے ہو کہ تم سے حساب نہ لیا جائے کیوں کہ تم نے تو بہت محنت سے کام کیا ہے۔

تم کہتے ہو پاکستان کو چلنے دیا جائے۔

مطلب پاکستان چلتا رہے اور تم لوگ اپنی اپنی چوریوں میں لگے رہو تم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو، عوام کی حالت بد سے بد اور تمہاری حالت بہتر سے بہتر ہوتی جائے اور تمہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو

تم نے لاہور کو سومنات کا مندر بنا دیا۔

تم نے لاہور کو سومنات کا مندر بنا دیا، اور خود اس کے پنڈت بن گئے، کیا پاکستان صرف لاہور کی حدود میں محدود ہے، پاکستان کا ہر چھوٹا شہر تمہاری نظروں سے ایسے اوجھل ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگھ، ادھا پاکستان بیمار ہو کر علاج کے لیے لاہور پہنچتا ہے، تعلیم کے لیے خوار ہو کر بھی لاہور پہنچتا ہے اور روزگار کے لیے بھی خوار ہو کر لاہور پہنچتا ہے۔ تم نے چھوڑے شہروں کو کیا دیا سوائے ذلت اور رسوائی کے۔ ہمت ہے تو لاہور سے باہر نکلو اور دیکھو

تمہیں پاکستان کے ہر چھوٹے شہر سے گو نواز گو کی آواز سنائی نہ دے تو پھر کہنا

ایک زرداری سب پر بھاری

تحریر: میاں وقار الاسلام

ایک زرداری سب پر بھاری، سٹے بازی میں بھی اور کرپشن میں بھی۔ یہ سسٹم کرپشن کے دیوتاؤں کو پہلے بھی پوجتا رہا ہے اور بد قسمتی سے آج بھی پوج رہا ہے۔ یہاں لوگ کھلے عام قتل کرتے ہیں اور پیسہ لگا کر باعزت بری ہو کر باہر آ جاتے ہیں اور معاشرے کے باعزت شہری بھی بن جاتے ہیں، یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

نہ عمران خان نے کبھی کہا ہے کہ اس کی ٹیم میں فرشتے ہیں اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی ٹیم میں فرشتے ہیں مگر مجھے یہ یقین ہے کہ نون اور پیپلز پارٹی میں بہت سے شیاطین ہیں۔ جو کہتے تھے کہ کیا ہمارا کرپشن پر حق نہیں ہے، انہوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا کرپشن پر پورا حق ہے۔ جس سیاست میں جیت کرپٹ عناصر کی ہی ہو اس سیاست سے کسی قوم کا بھلا ہوا ہے نہ ہو گا۔

میں عمران خان کی سیٹ کے ساتھ نہیں ہوں، بلکہ میں عمران خان کی سوچ کے ساتھ ہوں۔

کیا ہمیں کرپشن کے خلاف آواز نہیں اُٹھانی چاہیے، کیا ہمیں ناانصافی کے خلاف نہیں بولنا چاہیے، کیا جو ظلم ہوتے رہے ہیں وہ اُسی طرح ہوتے رہنے چاہیں۔ یقینا کوئی پاکستانی ایسا نہیں چاہتا۔

بد قسمتی سے پیسے کا کھیل تماشہ کسی سطح پر ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ کرپشن کم ہوتے ہوئے نہیں نظر آئی۔ کرپشن پہلے کی نسبت ضرور کم ہوئی ہے، اور اگر کہیں ہوئی ہے تو یقینا اسے اور کم ہونا چاہیے۔

صرف دوسروں کو دو نمبر کہنے سے کام نہیں چلے گا، یقینا خود کو بھی ایک نمبر بن کر سامنے آنے کی ضرورت رہے گی۔ تبدیلی کا جو خواب پیش کیا گیا تھا وہ خواب ابھی ادھورا ہے۔ نئے پاکستان کی ابھی بنیادیں بھی نہیں پڑیں۔ عمران خان نے جس سمت کا تعین کیا تھا، ابھی اس سمت میں بہت دیر تک چلتے رہنے کی ضرورت ہے۔ مشکل منزلیں کے سفر کبھی آسانی سے طے نہیں ہوتے، کہنے اور کرنے کے فرق نے ابھی ختم ہونا ہے۔

ایک زرداری سب پر بھاری، ہم اس بات پر پاکستان کی سودے بازی نہیں کر سکتے، اپنے حصے کی آواز ہمیں اُٹھانی ہے، انشاء اللہ کرپشن کے ان اندھیروں کو ایک دن ضرور ختم ہونا ہے، امین۔ دعا گو، میاں وقار الاسلام

ایک طرف کرپشن ایک طرف نااہلی

تحریر : میاں وقار الاسلام

کرپشن والے چاہتے ہیں کہ۔۔۔

کرپشنِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین ہے منصفوں سے حافظہ انکا

نااہلی والے چاہتے ہیں کہ۔۔۔

عہدِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین ہے مجھے سے حافظہ میرا

جب میں کرپشن اور نااہلی کا موازنہ کرتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک پرانے گیت کا عکس بنتا ہے

کبھی فوجیوں نے مارا
کبھی لیڈروں نے لوٹا
گلہ تبدیلی سے نہیں ہے
ہمیں ہر کسی نے مارا

کہاں جائے بیچاری عوام، سب کو اپنی اپنی باری کا انتظار ہے جانے عوام کی باری کب آئے گی۔

بھائی جب آپ لوگ بیٹنگ کر رہے تھے اور اپنی اپنی اننگز پوری پوری کھیل کر گئے ہو تو پھر نائب کی بیٹنگ سے کیوں ڈرتے ہو اب اسے بھی باری لینے دو۔

سب سیاسی لیڈرز اپنا اپنا رونا رو رہے ہیں، مگر ان سب کے کرتوتوں سے جو عوام کو رونا پڑ رہا ہے وہ کسی کو دیکھائی نہیں دے گا۔

کوئی سچا نہیں کسے سچا جانیں۔۔۔۔۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

سب اپنا اپنا چورن بیچ رہے ہیں اور عوام اپنا چورن بیچ رہی ہے، بدنیتی صرف حکومت یا حکومتی اداروں میں نہیں ہے بلکہ عوام میں بھی ہر سطح پر سرائیت کر رہی ہے۔

ہم ایک گنجے درخت کے نیچے بیٹھے ہیں اور ہمیں اس سے امید شجرِ سایہ دار ہے۔ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے شاید ہمیں وہی مل رہا ہے جس کی ہم نے محنت کی ہے۔

شاید ہی کرپشن اور نااہلی سے سو فیصد پاک حکومت کبھی بن پائے، مگر کیا عوام اپنے آپ کو کرپشن اور نااہلی سے پاک کرنے کے بارے میں کبھی سنجیدہ ہو گی۔

اگر ہم نے احتیاط ہی نہیں کرنی تو ہمارے بیمار رہنے کا سارا قصور وار ڈاکٹر نہیں ہے۔ ہم سیاست دانوں پر دن رات انگلیاں تو اُٹھاتے ہیں مگر انگلیوں سے ساتھ جڑے ہوئے انگوٹھے سے کبھی نہیں پوچھتے جس کی چھاپ سے حکومت مسلط ہوتی ہے۔

ہم خود ہی نااہل اور کرپٹ سیاست دان چنتے ہیں اور پھر سارا ملبہ عدالتوں پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ ہمارے منتخب نالائقوں کو سزا کیوں نہیں دیتی۔

آئے دن مہنگائی ہماری چھترول یوں ہی تو نہیں کرتی کچھ تو ہم نے بھی انتخاب میں غلطی کی ہو گی۔ ہم ٹیکس پورا نہیں دیتے اور مہنگائی ہم سے ہماری جائز کمائی بھی لے جاتی ہے۔

کرپشن اور نااہلی کی بیماری اتنی بھی یک طرفہ نہیں جتنی یک طرفہ اسے ہم سمجھتے ہیں، جب پارٹی آف دی سیکنڈ پارٹ کچھ غلط کرے گی تو شامت پارٹ آف دی فرسٹ پارٹ کی بھی ضرور آئے گی۔

ہمیں دیانت دار امانت دار اور لائق لوگ حکومت میں چاہیں تو تھوڑا سا یہی سبق ہمیں خود بھی سیکھ لینا چاہیے۔ آخر ہم کب تک اپنی ہی منتخب نالائقیوں سے سبق سیکھتے رہیں گے۔

شیخ صاحب کی شیخیاں

تحریر: میاں وقار الاسلام

سب سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سیاست دان کسی بھی خاندان، قبیلے یا خاص زبان بولنے والوں کا نمائندہ نہیں ہوتا، وہ صرف اپنی ذات کا نمائندہ ہوتا ہے اس کے اچھے ہونے سے اس کا خاندان معتبر نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کے برے ہونے سے سارا خاندان برا ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک معروف سیاسی شیخ صاحب کی بات ہونے جا رہی ہے، میں انہیں اچھے اور برے کی تفریق میں نہیں گنتا کیوں کہ ان کی شخصیت ایک الگ ہی پہچان رکھتی ہے۔ ان کا ذکر سیاست دانوں کو تو اچھا یا برا لگ سکتا ہے شیخ صاحبان کو اس سے فرق نہیں پڑنا چاہیئے۔

تو چلتے ہیں اعلی حضرت شیخ رشید صاحب کی طرف اور نظر ڈالتے ہیں شیخ صاحب کی شوخ شوخیوں پر۔ اپنے گندے کپڑے ٹی وی چینلز پر نہ دھوئیں کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کپڑے شیخ صاحب کی ذاتی لانڈری سے دھلوائیں۔ ان کا یہ بیان ہو یا اسی طرح کا کوئی اور بیان ہو شیخ صاحب کا بولنا ان کے سننے والوں میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ سیاسی کردار ہوتے ہی ایسے ہیں کہ ان کو ان کے دشمن بھی انجوائے کرتے ہیں مثلا"۔۔۔۔۔اعلی حضرت۔۔۔۔ان جیسا شاید کوئی کوئی ہوتا ہے۔۔۔ یا شاید ان جیسا کوئی بھی نہیں ہوتا۔

شیخ صاحب سے شاید لوگ سے اتنی نفرت نہیں کرتے جتنا ان کو انجوائے کرتے ہیں۔ شیخ صاحب نے سیاست میں ایک الگ تاریخ رقم کی ہے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ سیاست صرف تین لفظوں سے چل سکتی ہے انٹرٹینمنٹ، انٹرٹینمنٹ اور انٹرٹینمنٹ۔

شیخ صاحب کو ان کی سیاسی بصیرت کی داد دینی تو بنتی ہے کیوں کہ جو شخص ان کو چپڑاسی بھی رکھنا گوارا نہیں کرتا تھا شیخ صاحب نے ان سے ریلوے کی وزارت حاصل کر لی اور اس کی تو انہوں نے شاید پیشن گوئی بھی نہیں کی تھی۔ پیشن گوئیوں سے یاد آیا کہ عید چھوٹی ہو یا بڑی شیخ صاحب کی پیشن گوئیاں چاند دیکھتے ہوئے بھی یاد آتی ہیں اور بکرے کی قربانی ہوتے ہوئے بھی، پھر وہ بکرا سیاسی بھی ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب کی کوئی پیشن گوئی درست ثابت ہو یا نہ ہو شیخ صاحب پیشن گوئیوں پر پیشن گوئیاں کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ اور کبھی اپنی کسی پیشن گوئی پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔

شیخ صاحب کی باتوں کو چاہے دل سچ نہ بھی مانے، یا پھر چاہے ذہن تسلیم نہ بھی کرے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ "چس بڑی اندی اے۔ شیخ صاحبان پر بہت سے لطیفے گردش عام ہیں مگر جب شیخ صاحب خود ارشاد کرتے ہیں تو مزہ ہی دوبالا کر دیتے ہیں۔

شیخ صاحب کی جب کسی سے بنتی ہے، تو ان کی محبت و عقیدت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شیخ صاحب جس کے رسیا ہوتے ہیں انہیں نہ صرف قوم کا آخری نجات دہندہ قرار دیتے ہیں بلکہ ان سے ساتھ سرعام چمیاں لیتے اور دیتے ہوئے بھی دیکھائی دیتے ہیں۔ اور شیخ صاحب کی جس سے نہیں بنتی اُس سے تو پھر یہ جینے کا حق بھی چھین لیتے اور اسے شیطان کا بھی باپ گردانتے ہیں۔

شیخ صاحب سیاسی ٹوٹکوں کی چلتی پھرتی کتاب ہیں، جیسے ہومیوپیتھی کے پاس کسی چیز کا علاج نہیں مگر دوا ہر مرض کی موجود ہے بالکل اسی طرح شیخ صاحب کی کوئی سیاسی حکمتِ عملی ہو یا نہ ہو سیاسی ٹوٹکے ان کے پاس ہر سیاسی مسئلے کے موجود ہوتے ہیں۔

شیخ صاحب کی قابلیت کی یوں تو بہت مثالیں دی جاتی ہیں مگر ان سے منسوب ایک مثال دیکھئے

شیخ صاحب اپنے شہ زور ٹرک پر بیٹھ کر شہر کے چوک پہ پہنچے اور لگے وہاں بیٹھے مزدوروں کو آواز لگانے۔۔ کون کون جانا چاہتا ھے میرے ساتھ مزدوری پر 22 سو روپے دیہاڑی دوں گا۔۔۔ پہلے پہل تو شیخ صاحب پر لوگ خوب ہنسے پھر اسے سمجھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوے کہ جناب والا۔۔ آج کل مزدور کی دیہاڑی پانچ سو سے کم نہیں ھے۔ کیوں آپ ظلم کرنے پر تلے ہوے ہیں۔۔ کوئی نہیں جائے گا آپ کے ساتھ نا بنوایئے اپنا مذاق۔۔۔ شیخ صاحب اپنے موقف پہ ڈٹے اور مزدوروں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے رہے۔

شور کم ہوا اور بہت سے مزدور اپنی جگہ پہ جا بیٹھے تو تین ناتواں بزرگ مزدور جن کے چہروں سے ہی تنگدستی اور مجبوری آیاں تھی، گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔۔ اور بولے چلئے شیخ صاحب ہم کرتے ہیں مزدوری اس بے روزگاری سے تو بہتر ھے۔ چلو آپ کے پاس مزدوری کر کے کچھ دال روٹی گھر والوں کے لئے بنالیں۔۔ شیخ صاحب نے ان تینوں کو یوٹیلیٹی سٹور لے جا کر بیس کلو آٹا پانچ کلو چینی پانچ کلو گھی لے کر دیا اور تینوں کی ہتھیلی پہ پانچ پانچ سو رکھے، اور کہا جائیں آپ کا بس اتنا ہی کام تھا۔۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔۔

دوسرے دن پھر شیخ صاحب اپنا شہ زور ٹرک لے کر اسی جگہ پہنچے اور آواز دی۔۔ کون کون جانا چاہتا ھے میرے ساتھ مزدوری پر ؟؟؟ مزدور تو گویا تیار ہی بیٹھے تھے ایک دوسرے سے پہلے ٹرک پہ چڑھنے کے لئے لڑتے جھگڑتے سب ٹرک پہ سوار ہو گئے۔۔

سنا ھے شیخ صاحب نے سب سے مغرب تک کام کرا کر پورے دو دو سو روپے دے کر چھٹی دی تھی۔

سنا ہے شیخ صاحب اس طرح کے جوڑ توڑ کے ماہر ہیں شاید اسی لیے انہیں مشیرِ خاص کا درجہ دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکل رہا ہو تو انگلی ٹیڑھی کر لینی چاہیے۔ شیخ صاحب شاید سیاسی کی وہی ٹیڑھی انگلی ہیں جو سیاسی گھی نکالنے کے کام آتی ہے۔

شیخ صاحب کو بہت سے اعزازی ناموں سے جانا جاتا ہے، جیسے شیدا ٹلی، عمران خان کا چپڑاسی یا راولپنڈی کا شیطان مگر سب سے مزیدار اعزازی "نام ہے شیدا" سیاسی چاٹ مسالہ

مائنس ون کی بات ہوئی تو پھر مائنس ون نہیں ہوگا مگر مائنس تھری ہوگا، کہیں ان کا یہ اشارہ سیاسی بساط پلٹنے کی طرف ہی نہ ہو۔

قوم کو پی ٹی آئی کے علاوہ کسی سے کوئی امید نہیں، باقی سارے لاوارث، کرپٹ اور سیاسی یتیم ہیں، ان کا کوئی مستقبل نہیں، جو کچھ بھی کرنا ہے وہ صرف پی ٹی آئی نے ہی کرنا ہے۔ ایسے دھواں دار بیان صرف شیخ رشید صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

بلاول کو بلورانی مشہور کرنا ہو، مولانا فضل الرحمان کے آگے کنواں پیچھے کھائی کھودنی ہو، پنجاب غیرت مندون کا علاقہ ہے، یہاں بلاول کی دال نہیں گلے گی، کل عورت مارچ کی قیادت بھی بلاول بھٹو کرے گا۔ شیخ رشید صاحب جیسی نان سٹاپ ڈیلیوریز کوئی نہیں دے سکتا۔

شیخ صاحب کی شیخیوں پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے، ان کے مزے مزے کے بیانات پر فل بن سکتی ہے یا پھر ڈرامے بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ تھوڑے سے احوال لکھ روح کی تسکین کی ہے، ویسے اس طرح کی تسکین ان سے روزانہ ہی ملتی رہتی ہے۔

شیخ صاحب کا کوئی بھی مد مقابل نہیں، سوچا کہ اتنی عظیم شخصیت پر کچھ نہ لکھا جائے تو کھلی زیادتی ہو گی۔ انجوائے کرتے رہیں، ہر بیان کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ دعا گو۔۔۔۔۔۔۔۔ میاں وقار الاسلام

بونوں کی شرارتیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

بونے اگر قد کے بونے ہوں تو اس سے معاشرے کی صحت ہر ایک فیصد بھی فرق نہیں پڑتا۔ اگر بونے چین کے محنت کش اور ذہین بونے ہوں تو وہ امریکہ جیسے مغرور لمبوتروں کو لوہے کے چنے بھی چبوا سکتے ہیں۔

خیر یہاں بات محنتی اور ذہین بونوں کی نہیں ہو رہی بلکہ ان بونوں کی ہے جن کی ذہنی نشو نما یا تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو انتہائی منفی نشو نما ہوتی ہے جس سے معاشرے کی صحت پر یقینا بہت برا اثر ہوتا ہے اور یہی لوگ کسی بھی معاشرے میں بگاڑ کی بڑی وجہ ہوتے ہیں۔

کچھ بچے پیدائشی طور پر بھی دماغ کے لحاظ سے بونے ہوتے ہیں، سکول کی سج پر بھی ان کی منفی سوچ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہتی، ان بونوں کی شراتیں زمانہء سکول سے ہی نمودار ہونے لگتی ہیں۔

کسی کے بیگ سے کچھ چرا لینا، کسی کا لنچ بکس صاف کر دینا، کسی کے کپڑوں پر سیاہی پھینک دینا، کسی کی جم کے پیٹائی کر دیں یا کسی سے اپنی حرکتوں کی وجہ سے جم کر پٹائی کروالینا، کسی کے باتھ روم کا دروازہ بند کر دینا، سکول سے بریک کے وقت بھاگ جانا، اپنی اور دوسروں کی کتابیں پھاڑ دینا، جو کہا جائے وہ ہر گز نہ کرنا اور جس چیز سے روکا جائے وہ بار بار کرنا، استادوں کا یا کلاس فیلوز کا مزاق اڑانا، گویا جس بھی طرح سے دوسروں کے ناک میں دم کیا جا سکتا ہے یہ بونے ایسا کرنے میں اپنی فتح محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ان کی بے عزتی تو کر ہی نہیں سکتا ہوں کہ عزت کا مطلب کیا ہوتا ہے یہ اس لفظ سے ناواقف ہی رہتے ہیں۔

ہر بچہ شرارتیں کرتا ہے، شرارت کرنا بچوں کا حق بھی ہے، بچے شرارتوں سے ہی تو سیکھتے ہیں مگر یہ یہ پیدائشی بونے عام بچوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ یہ شرارتوں سے اور شرارتی ہوتے ہیں اور شرارتوں سے ان کی بدمعاشیاں ہی بڑھتی ہیں ان کی اصلاح نہیں ہوتی۔

ٹھیک ہونے والے بچے تو ٹھیک ہو جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح بھی کرتے چلے جاتے ہیں، مگر بونوں کی یہ خاص قسم عمر کے ساتھ اور زیادہ شرارتی ہوتی چلی جاتی ہے، نہ یہ صرف خود شرارتی ہوتے ہیں بلکہ بڑے منظّم شرارتی ہوتے ہیں، بڑے ہونے کے ساتھ ان کی صلاحتیں بھی بڑھ جاتی ہیں کالج لائف میں داخل ہونے کے بعد یہ اکیلے اکیلے شرارتیں نہیں کرتے بلکہ اب یہ پورا گروپ بنا کر شرارتیں کرتے ہیں۔

بونوں کا گروپ آپ کو ہر کالج میں نظر آئے گا، یہ ہر وقت کسی نا کسی منفی سرگرمی کا حصہ رہتے ہیں، نئے آنے والے چھوٹی کلاس کے طلبہ کا مزاق اڑانا، ان سے پیسے لے کر کھا جانا، بے نامی فنڈز اکھٹا کر کے کھا جانا، کالج میں ہڑتالیں کروانا، روڈ بلاک کرنا، لڑکیوں کے کالج کے سامنے کھڑے رہنا اور بہت سے تو اشتہاری مجرم بھی بن جاتے ہیں۔ تعلیم ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں پاتی یہ پاس بھی ہوتے ہیں تو نقلیں مار مار کر یا پھر ذہین کلاس فیلوز کے نوٹس چرا کر یا پھر سفارشیں کروا کر۔ سیدھے طریقے سے ان سے کبھی کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔

کلاس فیلوز میں بونوں کی یہ قسم کبھی کسی کو نہیں بھولتی یہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے ساتھی کلاس فیلوز کو ہمیشہ ہی یاد رہتے ہیں۔ اور بہت سی کہانیوں کا مرکزی کردار یہ بد کردار ہوتے ہیں۔ وقت کی ٹھوکریں بڑوں بڑوں کو ٹھیک کر جاتی ہیں مگر یہ عجیب ہی قسم ہے، وقت کی ٹھوکریں انہیں ٹھیک کرنے کی بجائے اور بگاڑتی چلی جاتی ہیں۔

پیشہ ورانہ اور نجی زندگی میں بھی یہ بونے بونے ہی رہتے ہیں۔

اول تو ان کو کوئی لڑکی ہی نہیں دیتا، جہاں بھی رشتہ ہونے لگتا ہے ان کی حرکتوں کی وجہ سے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ ان میں اکثر کے رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ یا یہ کسی لڑکی کے ساتھ بھاگ جاتے ہیں یا کوئی کوئی لڑکی انہیں بھگا کر لے جاتی ہے۔ اور اگر سیدھے طریقے سے بھی ان کا رشتہ ہو جائے تو بھی یہ کسی کو عزت اور احترام دینے کے قابل نہیں ہوتے۔ شادی کے بعد یا تو بیگم ان کا کچومر سلاد بنا دیتی ہے یا پھر یہ عورتوں پر ایسے حکمرانی کرتے ہیں کہ بیچاری ایک مچلی کی طرح جال میں پھنسی رہتی ہے اور دعا کرتی رہتی ہے کہ کسی طرح اس کے چنگل سے آزاد ہو جائے۔

اول تو ان کو کوئی جاب نہیں دیتا، اور اگر جاب دے دے تو ان سے جاب ہوتی نہیں، درجنوں کمپنیاں بدلتے ہیں، کسی ایک جگہ زیادہ دیر نہیں ٹکتے اور اگر ٹکتے بھی ہیں تو کچھ غریبوں کی بلی چڑھا کر، دوسروں کی چغلیاں کرتے نہیں تھکتے، چالیس لوگوں کو نکما کرنے کے لیئے اکیلے ہی کافی ہوتی ہیں۔ اپنے کام پر ان کی توجہ کبھی نہیں ہوتی۔ ہمیشہ دوسروں کے کام پر نظر رکھتے ہیں اور دوسرے کے کاموں میں کیڑے نکالنا ان کا بنیادی مشغلہ ہوتا ہے۔

اگر یہ اپنا کاروبار بھی کرتے ہیں تو لوگوں کو دو نمبر چیزیں بیچنا اور فراڈ کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا

فہرست مضامین

	غیر ملکی اور بین القوامی	
1	HISTORY OF INDIA'S WORRIES	613
2	چوہدری کا منڈا فیل ہو گیا	619
3	بیگ سٹیک یا ڈالرز	623
4	رادھا ناچے گی؟	625
5	کاٹھ کا اُلو	628
6	امریکی اونٹ امریکہ کی طرف ہی بیٹھ گیا	630
7	ہمت ہے تو اب مارو	633
8	جھوٹ پر جھوٹ	635
9	کر بھلا سو ہو بھلا	637
10	لاتوں کے بھوت	640
11	امن اور شانتی	644
12	کشمیریوں کے غم بہت بڑے ہیں	645
13	برما سے بنگلہ دیش، موت سے موت تک کا سفر	649
14	دنیا اندھی ہے؟	651
15	کون ماضی کون مستقبل	653
16	انسانی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاج	657
17	امریکہ پرائیوٹ لمیٹڈ	659
18	بھوکا خونخوار جانور	661
19	ہمیں انڈیا سے اتنی نفرت کیوں ہے؟	663

Article: HISTORY OF INDIA'S WORRIES

Compiled by: Mian Waqar ul Islam

Series: Best Life Notes

India Worries

1950— Pakistan becomes the third non-communist country, and first Muslim one, to recognize the People's Republic of China.

India Worries

1963— Pakistan cedes the Trans-Karakoram Tract to China, ending border disputes.

India Worries

1970— Pakistan helps the U.S. arrange the 1972 Nixon visit to China.

India Worries

1978— The Karakoram Highway linking the mountainous Northern Pakistan with Western China officially opens.

India Worries

1980s— China and the U.S. provide support through Pakistan to the Afghan guerillas fighting Soviet forces.

India Worries

1986— China and Pakistan reach a comprehensive nuclear co-operation agreement.

India Worries

1996— Chinese President Jiang Zemin pays a state visit to Pakistan.

India Worries

1999 — A 300-megawatt nuclear power plant, built with Chinese help in Punjab province, is completed.

India Worries

2001 — A joint-ventured Chinese-Pakistani tank, the MBT-2000 (Al-Khalid) MBT is completed.

India Worries

2002 — The building of the Gwadar deep sea port begins, with China as the primary investor.

India Worries

2003 — Pakistan and China signed a $110 million contract for the construction of a housing project on Multan Road in Lahore.

India Worries

2006 — China and Pakistan sign a free trade agreement.

India Worries

2007 — The Sino-Pakistani joint-ventured multirole fighter aircraft — the JF-17 Thunder (FC-1 Fierce Dragon) is formally rolled out.

India Worries

2008 — Pakistan welcomes the Chinese Olympic Torch in an Islamabad sports stadium, under heavy guard amidst security concerns.

India Worries

2008 — Pakistan and China agree to build a railway through the Karakoram Highway, in order to link China's rail network to Gwadar Port.

India Worries

2008 — The F-22P frigate, comes into service with the Pakistani Navy.

India Worries

2009— The ISI arrest several suspected Uyghur terrorists seeking refuge in Pakistan.

India Worries

2010— Pakistan and China conduct a joint anti-terrorism drill.

India Worries

2010— China donates $260 million in dollars to flood-struck Pakistan and sends 4 military rescue helicopters to assist in rescue operations.

India Worries

2010— Wen Jiabao visits Pakistan. More than 30 billion dollars' worth of deals were signed.

India Worries

2011— Pakistan is expected to buy air-to-air SD 10 missiles from China for its 250 JF 17 thunder fighter fleet.

India Worries

2013— Management of Gwadar Port is handed over to state-run Chinese Overseas Port Holdings after previously being managed by Singapore's PSA International and it becomes a matter of great concern for India.

India Worries

2013— Chinese Premier Li Keqiang visits Pakistan. Trade between China and Pakistan hit a 12-month figure of $12 billion for the first time in 2012.

India Worries

2013— On 5 July 2013, Pakistan and China approved the Pak-China Economic corridor which will link Pakistan's Gwadar Port on the Arabian Sea and Kashghar in Xinjiang in northwest China. The $18 billion project will also include the construction of a 200 km-long tunnel.

India Worries

2013— On 24 December 2013, China announced a commitment $6.5 billion to finance the construction of a major nuclear power project in Karachi, the project which will have two reactors with a capacity of 1,100 megawatts each.

India Worries

2014— Chinese Premier announced investment of $31.5 billion in Pakistan mainly in countries energy, infrastructure and port expansion for Gwadar. According to The Express Tribune initially projects worth $15—20 billion will be started which include Lahore-Karachi motorway, Gwadar Port expansion and energy sector projects will be launched in Gadani and six coal projects near Thar coalfield. The newspaper further claimed that the government has also handed over to Pakistan Army the task of providing fool-proof security to Chinese officials in Balochistan, Pakistan, in a bid to address Beijing's concerns and execute the investment plan in the province, which will get 38% of the funds.

India Worries

2014— On 22 May 2014, the governments of Pakistan and China on Thursday signed an agreement to start a metro train project in Lahore, Express News reported. The 27.1 kilometers long track— named Orange Line— will be built at the cost of $1.27 billion.

India Worries

2014— On 8 November 2014, Pakistan and China signed 19 agreements particularly relating to China—Pakistan Economic Corridor, China pledged a total investment worth of $42 billion. While Pakistan pledged to help China in its fight concerning the Xinjiang conflict.

India Worries

2015— On 20 April 2015, Chinese President Xi Jinping, accompanied by the First Lady and a delegation of high-level officials and businessmen, visits Pakistan. It is the first visit to Pakistan by

a Chinese president after a gap of 9 years and the first foreign trip of Xi in 2015. 51 Memorandums of Understanding are signed, including the plan of "Pakistan China Economic Corridor".

India Worries

2015 — Pakistan began circulating the Rs. 20 coin with the Pakistan and China flags to commemorate the countries' lasting friendship.

India Worries

2016 — Pakistan and China kicked off first trade activities under the China-Pakistan Economic Corridor project (CPEC) as over a hundred Chinese containers arrived at the Sust port in Hunza, the last town in Pakistan on the Karakoram highway before the Chinese border.

India Worries

2017 —Two maritime patrol vessels, PMSS Hingol and PMSS Basol, built in China for the Pakistan Maritime Security Agency (PMSA) arrived at the Gwadar Port.

India Worries

2018 — Phase-II of the China-Pakistan Free Trade Agreement was signed, facilitating Pakistani exports.

India Worries

2018 — Groundbreaking of Rashakai Special Economic Zone.

India Worries

2018 — Pakistan launches Remote Sensing Satellite-1 (PRSS-1) from China's Jiuquan Satellite Centre, enabling Pakistan to the membership of prestigious Space Club.

India Worries

2019 — The two sides celebrate 2019 as the year of sister-city / province, China-Pakistan shares several MoUs signed as sister cities or provinces.

India Worries

2020— Visit of the President Alvi to China in March 2020. MOUs signed including MOU to established JWGs on Science & Technology and Agricultural Cooperation

India Worries

2021— 20 China-Pakistan Economic Corridor project (CPEC) projects worth $12.5 Billion have been completed

چوہدری کا منڈا فیل ہو گیا

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گاوں میں ایک چوہدری تھا انتہائی نکما چوہدری اور اس سے نکما اس کا بیٹا۔ چوہدری نے اپنے بیٹے کو دنیا کی ہر آسائیش مہیا کی، مہنگے سے مہنگے ٹیچرز رکھوا کر دیئے مہنگی سے مہنگی کتابیں دلوائیں اور اچھے سے اچھا سکول بھی فراہم کیا مگر چوہدی کا بچہ بار بار فیل۔

اب چوہدری اپنے نالائق بچے پر تو کیا غصہ نکالتا، کبھی سکول کو تنقید کا نشانہ بناتا کبھی استادوں کو برا بھلا کہتا کبھی کتاب لکھنے والوں کو برا بھلا کہتا اور کبھی کہتا کہ یہ سارا سسٹم ہی خراب ہے۔

امریکہ کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ درپیش ہے۔ چائینہ نے گذشتہ 30 سالوں میں امریکہ کو کہیں منہ دیکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جہاں بھی میدان سجتا ہے وہاں چائنہ بازی لے جاتا ہے۔

گزشتہ تیس سالوں میں چائنہ کہاں سے کہاں نکل گیا اور امریکہ آج بھی وہیں ہے۔ چائنہ جو بناتا ہے وہ مارکیٹ ہاتھوں ہاتھ لے لیتی ہے اور امریکہ جو بناتا ہے وہ اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ کہیں بکتا نہیں۔

خود امریکی کمپنیاں اپنی مصنوعات چائنہ سے بنواتی ہیں تو ان کی مصنوعات کی قیمتوں میں اتنی کمی ہوتی ہے کہ دنیا اسے خرید پاتی ہے۔ ہر سال امریکہ کی سینکڑوں کمپنیاں اپنی فیکٹریاں یا تو بند کر دیتی ہیں یا پھر چائنہ میں اپنی براہ راست فیکٹری لگا لیتی ہیں یا پھر پروڈکشن کے معاہدے کر لیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے امریکہ کمپنیوں کو سروائیول کا کچھ وقت مل جاتا ہے۔

امریکہ کی دو بڑی کمپنیاں ایپل اور سیسکو جن کی امریکی انٹیلیجینس کی براہ راست سپورٹ حاصل ہے وہ بھی گذشتہ دہائی سے یا اس سے بھی پہلے سے اپنی مینوفیکچرنگ چائنہ سے ہی کروا رہے ہیں۔

بل گیٹس تو 20 سال پہلے سے ہیں اپنی انوسٹمنٹ کا بڑا حصہ چائنہ میں منتقل کر چکا ہے اور سینکڑوں امریکی کمپنیوں کا بھی یہی حال ہے۔

اب چوہدری روتا پیٹتا بہت ہے مگر اسے پتا ہے کہ اس کا ہر میدان میں فیل ہونا طے ہے۔ جس معیار کی اور جس تیز رفتاری سے چائنہ نے دنیا میں ترقی کی ہے اور اپنے آپ کو منوایا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

چائنہ ون بیلٹ ون روڈ کے منصوبہ پر 2013 سے فارملی کام کر رہا ہے اور 138 ممالک اس پر دستخط بھی کر چکے ہیں اور آپس میں بلینز آف ڈالر کی تجارت بھی کر رہے ہیں اور چائینہ 100 بلین ڈالر سے زیادہ اس پراجیکٹ پر انوسٹمنٹ کر چکا ہے اور 1000 سے زیادہ بلین ڈالر کے معاہدے بھی ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں اٹلی اور جرمنی کا چائنہ کے مل جانا ایسے ہے جیسے امریکہ کا رل جانا۔

ون بیلٹ ون روڈ کا پراجیکٹ جب شروع ہوا تو امریکہ نے اسے اتنا سیریز نہیں لیا مگر صرف 5 سال کی کارکردگی نے امریکہ کی آنکھیں کھول کر رکھ دیں۔ شروع شروع میں تو امریکہ صرف یہ کہتا تھا کہ یہ پراجیکٹ ہو ہی نہیں سکتا، جن ممالک میں چائنہ پیسہ لگا رہا ہے اول تو اتنی انوسٹمنٹ چائنہ کر ہی نہیں سکتا اور اگر کر ہے تو پیسے واپس نہیں لے سکتا۔

جب پراجیکٹس لگنا شروع ہو گئے اور تجارت بھی شروع ہو گئی تو امریکہ نے اپنا نقطہ نظر بدل کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ چائنہ سے قرضہ لینا ڈیٹ ٹریپ ہے اور جو ملک قرضہ لے گا اور پھر واپس نہیں کر سکے گا تو چائنہ اس پر قبضہ کر لے گا۔ تو اب امریکہ اس طرح کا پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف ہے۔

امریکہ نے 2008 میں ٹی پی پی کے نام سے ایک پراجیکٹ شروع کیا تھا جس میں آسٹریلیا جاپان اور انڈیا اس کے ساتھ شامل تھے جس کا مقصد چائنہ خو کاونٹر کرنا تھا مگر 2017 میں ٹرمپ نے اس پراجیکٹ کا خاتمہ کر دیا اور یہ کہا کہ یہ پراجیکٹ اب ممکن نہیں کیوں کہ لگ بھگ 10 سالوں میں اس پر کچھ کام نہیں ہوا جس کی بنیادی وجہ انوسٹمنٹ اکھٹی نہ ہو سکنا ہی ٹھہرا۔

سال 2019 میں اسی منصوبے کو نئے نام یعنی بلیو ڈاٹ نیٹ کے نام سے دوبارہ شروع کیا جاتا ہے تاکہ ون بیلٹ ون روڈ کے پراجیکٹ کو کسی طرح متاثر کیا جا سکے۔ اس پراجیکٹ میں بھی آسٹریلیا جاپان اور انڈیا ہی امریکہ کے ساتھ ہیں اور اس میں بھی کوئی پیسہ نہیں لگا رہا اور امید کی جا رہی ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر سے پیسہ اکھٹا کیا جائے گا جو کہ پھر دیوانے چوہدری کے خواب جیسا ہی ہے۔

بلیو ڈاٹ نیٹ پر 3 طرح کے اعتراضات کیئے جا رہے ہیں۔ پہلا تو یہ کسی چائنہ کے ون بیلٹ ون روڈ پراجیکٹ پر چڑھائی اخلاقی طور پر مثبت قدم نہیں اور یہ امریکہ کی منفی سوچ کا عکاس ہے امریکہ کو چاہیئے تھا کہ کسی کے پراجیکٹ کو کاونٹر کرنے کی بجائے اپنا نیوٹرل پراجیکٹ لانچ کرتا دنیا

کسی ایسی محاذ آرائی کو سپورٹ نہیں کرے گی، دوسرا اعتراض یہ کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ امریکہ ٹی پی پی کی طرح اس پراجیکٹ سے نہیں بھاگے گا اور تیسرا یہ کہ ابھی تک بلیو ڈاٹ نیٹ پراجیکٹ کا پیپر ورک مکمل نہیں اور امریکہ دنیا کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں پایا کہ وہ اس میں کرے گا کیا اور کیسے کرے گا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ پراجیکٹ بھی صرف کاغذوں کا پیٹ بھر پائے گا اور کچھ نہیں۔

امریکہ اپنی بڑھتی ہوئی فرسٹریشن کا اظہار بالکل اسی طرح کر رہا ہے جیسے چوہدری صاحب اپنے بچے کے بار بار فیل ہونے پر کر رہے تھے۔

امریکہ کبھی یورپین یونین پر غصہ نکالتا ہے کبھی انڈیا کے ساتھ بغلیں بجاتا ہے کبھی اسلامی ملکوں پر دھاوا بولتا ہے کبھی وار آف ٹیرر ازم کا سہارا لیتا ہے اور کبھی کچھ کبھی کچھ کے نام پر بونگیاں مارتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہی بونگیاں اس کے گلے پڑ گئی ہیں۔

امریکہ کو دنیا سے اتنی تنقید کا سامنا نہیں جتنی تنقید کا سامنا اسے اپنے ہی اندر سے ہے۔ امریکی صدر کے کارٹون ہوں، مزاحقہ خیز پروگرامز ہوں یا اوپن پبلک فورمز ہوں ہر جگہ امریکہ حکومت کو شدید دباؤ کا سامنا ہے اور اپنے ایک پر ایک بلنڈرز کا جواب دینا پڑ رہا ہے۔ مزید غلطیاں کی امریکہ کے پاس گنجائش تو ہے مگر ایسے ہی کہ جتنی غلطیاں اتنا ہی بیڑا غرق۔

اپنی فیس سیونگ کے لیئے امریکہ چائنہ پر الزام لگاتا ہے کہ چائنہ نے ہمارا بیڑا غرق کیا ہے مگر چائنہ نے اس کا منہ توڑ جواب دیا کہ امریکہ ہم پر الزام نہ لگائے کہ ہم نے اسے برباد کیا ہے بلکہ امریکہ کو اس کی ٹریلینز آف ڈالرز کی وار نے برباد کیا ہے جو اس نے دنیا پر مسلط کی ہوئی ہے۔

امریکہ اپنی تمام تر نالائقیوں پر توجہ ڈالنے کی بجائے دنیا کو یہ کہتا نظر آتا ہے کہ چائنہ کی خاطر خواہ ترقی غیر اخلاقی ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ چوہدری کو آج بھی اپنا بیٹا لائق اور محنت کرنے والوں کے بچے نالائق لگتے ہیں۔

دنیا امریکہ کی حماقتوں پر گہری نظر رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی 80 فیصد آبادی چائنہ کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے اور چوہدری صاحب اکیلے

امریکہ کو اپنے بحری بیڑوں کا بڑا غرور تھا سمندری ٹریڈ روٹس آج بھی امریکہ بالادستی میں ہیں جس کی بڑی وجہ یہی بحری بیڑے اور ان کے اندر نصب جدید جنگی آلات۔ میلوں تک سمندر میں معمولی سی نقل و حرکت کو سکین کرنے کی مکمل صلاحیت رکھنے والے یہ بیڑے چائنیز ایڈوانس سب میرین کے سامنے بے بسی کی تصویر بنے رہے اور چائنہ نے ان سب کی کلوز پیکچرز شائع کر دیں یہ اسی طرح کی ایکسر سائز تھی جو پاکستان میں چائنیز سب میرین نے انڈین سب میرین کے ساتھ کی

ابھی اس طرح کے کئی ایڈونچرز کا سامنا چوہدری صاحب کو ہونا باقی ہے۔ اسی دوران چوہدری صاحب اپنی نالائقی کی مزید داستانیں رقم کریں گے۔

بیگ سٹیک یا ڈالر

تحریر : میاں وقار الاسلام

بیگ سٹیک یا ڈالر سے شروع ہونے والی امریکی سفارت کاری میں اب ڈالر تو نہیں بچے بس بیگ سٹیک ہی رہ گئی ہے۔امریکہ کہتا ہے کہ چائینہ نے اسے برباد کیا چائینہ کہتا ہے کہ امریکہ کو اس کی بلینز آف ڈالر کی سوکالڈ وار آن دی ورلڈ نے برباد کیا۔

امریکہ چاہتا ہے دنیا اس کی ترقی کی رفتا سے تیز نہ چلے اور امریکہ کے ساتھ پیچھے کھڑی رہ جائے، قدرت کا یہ اصول ہی نہیں ہے جو بہتر کنٹریبیوٹ کر سکتا ہے اسے آگے آنے سے کوئی چیز روک ہی نہیں سکتی۔انگلینڈ 5 جی کے ساتھ آگے بڑھ چکا ہے اور پرائیویسی ایشو پر امریکہ کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متفق نہیں، جرمنی امریکہ سے مہنگی گیس خریدنے کی بجائے روس سے سستی گیس خرید رہا ہے۔

جب کوئی ٹیم جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو چاہتی ہے کہ گیم کے اصول بدل دیئے جائیں امریکہ اس لیئے ہر سطح پر ان فئیر ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اب فئیر گراونڈ پر جیتنا اس کے لیئے ناممکن ہے۔دنیا میں جہاں معاملات بات چیت سے حل ہو سکتے تھے امریکہ نے وہاں دونوں طرف اسلحہ فروخت کیا اور ٹھیک اس بندر جیسا کردار ادا کیا جو دو فریقوں میں روٹی بانٹتے ہوئے ساری روٹی خود کھا جاتا ہے۔

ایسا نہیں کہ امریکی ڈپلومیسی یونہی فیل ہو گئی ہے امریکہ جان بوجھ کر اپنی ڈپلومیسی کو فیل کرتا ہے تاکہ اپنی چال بازیوں سے زیادہ سے زیادہ اسلحہ بیچ پائے۔افغان بارڈر لائن پاکستان کی سب سے زیادہ محفوظ بارڈر لائن تھی اور اسی بارڈر لائن کو سب سے زیادہ غیر محفوظ کر دیا گیا یہ کام کرنے کے لیئے امریکہ نے 20 سال محنت کی کیا پیسہ کیا بارود اور کیا ڈپلومیسی۔

گذشتہ 30 سالوں میں چائنیہ جتنی تیزی سے اوپر آیا ہے کوئی ملک ایسے اوپر نہیں آیا اور جتنی تیزی سے امریکہ نیچے گیا ہے کوئی ملک ایسے نیچے نہیں گیا ماسوائے ان ملکوں کے جو امریکی نحوست کا شکار ہوئے۔امریکہ عجیب احمقانہ پروپیگنڈے کر رہا ہے ایک تو یہ کہ کرونا وائرس 5 جی کی وجہ سے پھیل رہا ہے امریکہ یہ بتانا پسند کرے گا کہ دنیا کے کونے کونے کو بارود سے بدبودار کرنے سے کون سا وائرس پھیلا ہے۔

پوری دنیا کو تین دہائیوں سے صرف اور صرف جھوٹ کھلانے والا امریکہ نہ ٹرمپ کے پیچھے امریکی کھڑے ہیں اور نہ ہی امریکی قوم سی آئی اے اور پینٹاگان پر یقین کرتی ہے یہ ہے ان کا حقیقی چہرا۔ دنیا میں سیکوریٹی کا راگ الاپتے الاپتے امریکہ خود پوری دنیا کے لیئے سیکوریٹی رسک بن چکا ہے، امریکہ ایسا سبز قدم ہے کہ جہاں پاوں رکھتا ہے وہاں بدامنی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

جب کسی قوم سے بڑا کام لینا ہوتا ہے تو اسے کڑی آزمائش سے گزارا جاتا ہے میں کرونا وائرس کو چائنہ کی آزمائش کے طور پر دیکھتا ہوں دنیا میں کوئی قوم اتنی یکجا نہیں جتنے چائنیز ہیں۔

کچھ لوگوں کی نظر میں کوا سفید اور کبوتر کالا ہوتا ہے ایسے لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ ٹرمپ بھارت کی تعریف کرکے 3 بلین ڈالر کا چونا لگا گیا ہے اور پاکستان کی تعریف کرکے پاکستان کے خلاف تخریب کار کا بیج بو گیا ہے اندھے خوش ہیں کہ امریکہ بھارت اور پاکستان کے ساتھ مخلص ہے۔ امریکہ جب کسی ملک کی تعریف کرتا ہے تو اس کے ارادے نیک نہیں ہوتے یہ لومڑی سے بھی مکار ملک ہے۔

امریکہ کی سفید ہاتھی والی بیگ سٹیک یا ڈالرز ڈپلومیسی اب مزید نہیں چل رہی جو کبھی ڈالرز اور بیگ سٹیک کے زور پر چل جاتی تھی۔ اب امریکہ کے پاس صرف بیگ سٹیک ہی رہ گئی ہے، دیکھتے ہیں کہ یہ خالی بیگ سٹیک ڈپلومیسی بغیر ڈالرز کے کب تک چلتی ہے۔

رادھا ناچے گی؟

تحریر: میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، رادھا نے بہت ناچ لیا، مگر آج نو من تیل کی کمی ہے۔

امریکہ کا یہ دعویٰ کہ دنیا کی بہترین جنگی طاقت اس کے پاس ہے اس کا بھی جنازہ نکلنے کے قریب ہے۔ امریکہ کا دعویٰ کہ دنیا کی بہترین صحت کی سہولتیں امریکہ میں ہیں، آج دنیا دیکھ رہے ہے کہ اس دعویٰ کا جنازہ بڑھی دھوم سے نکل رہا ہے۔

امریکہ ایک ایسے موڑ پر کھڑا کے کہ لڑتا ہے تو مرتا ہے اور نہیں لڑتا تو مرتا ہے، جھوٹ کی بیساکھیوں پر کھڑا ہوا ملک سچائی سے لڑے گا۔ آج امریکہ کی ساری اکانومی وینٹیلیٹر پر پڑی ہوئی ہے اور سی آئی آے امریکہ کا بڑا آپریشن کروانے پر تلی ہے۔

آج بھی امریکہ چین کے خلاف جھوٹ بول رہا ہے مگر آج امریکہ کی آنکھوں میں بے بسی اور محتاجی ہے، آج اس کا جھوٹ چل نہیں رہا۔ ایک وقت تھا جب امریکہ نے اپنے ٹاور گرائے تھے، اس وقت اس کے جھوٹ پر دنیا خاموش تھی، کیوں کہ امریکہ کی آنکھوں میں انگارے تھے۔

امریکہ تائیوان اور فلپائین جیسے ملکوں کی پشت پناہی کر رہا ہے اور چین میں تخریب کاریاں کروا رہا ہے، اور جھوٹے پروپیگنڈے کر رہا ہے، امریکہ نے گذشتہ 20 سالوں میں سوائے پابندیاں لگانے کے کچھ نہیں کیا، حالت یہ ہے کہ کمپنیوں پر پابندیاں لگا رہا ہے کہ آگے نہ بڑھیں۔ چین دنیا میں 158 سے زیادہ ملکوں میں سرمایہ کاری کر چکا ہے اور انہیں مستحکم کرنے میں کردار ادا کر رہا ہے۔

امریکہ اپنی بے بسی عراق اور افغانستان میں دیکھ چکا ہے، دنیا نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اسے رسوا کر کے گھر بھیجا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں نے امریکہ کا جنازہ نکال دیا، کیوں کے سب امریکہ کے خلاف پوشیدہ چالوں میں مصروف ہیں۔

کمزور اسلامی ملکوں کو نشانہ بناتے بناتے امریکہ خود کمزور ہو گیا اور اس کمزوری کی حالت امریکہ کا ارادہ چین سے مار کھانے کا ہے۔ کہتے ہیں جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے، اور جب امریکہ کی موت آئے گی تو وہ چین کی طرف بھاگے گا۔

امریکہ کمزور ہو رہا تھا، مگر امریکہ کس قدر کمزور ہے اس کا پردہ کرونا نے فاش کر دیا، سپر پاور کے پاس سوائے پاگل پن کے کچھ نہیں بچا۔ آج امریکہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ اپنے ہزاروں جھوٹوں کو چھپانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔

ٹرمپ اور مودی دونوں جنونی شخصیتوں کی وجہ سے دنیا کو جو نقصان ہو رہا ہے وہ اپنی جگہ مگر یہ اپنی قوم کا بھی خاص فائدہ نہیں کر رہے۔ جھوٹ بولنے اور اسلام کے خلاف کھلا پروپیگنڈا کرنے میں مودی اور ٹرمپ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور کوئی موقعہ ضائع نہیں کرتے۔

ٹرمپ اور مودی دونوں جنگی جنون رکھتے ہیں، اور یہ جنگی جنون کیس سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ٹرمپ کی پشت پناہی سی آئی اے کر رہی ہے اور مودی کی پشت پناہی را کر رہی ہے، دونوں کا تعلق سیاست سے نہیں بلکہ انتہا پسندی سے۔ ٹرمپ اور مودی دونوں, بنیاد پرست اور نسل پرست لیڈر ہیں اور دونوں کو مسلمانوں سے شدید نفرت کے ووٹ ملتے ہیں۔

امریکہ 20 سال سے اپنی عوام کو جھوٹ کھلا رہا ہے، اور جو جینریشن جھوٹ کھا کر بڑی ہوئی ہے اسے کیا معلوم سچ کس چڑیا کا نام ہے۔

چین کا ترقی کر جانا امریکہ کے لیے ایک بھیانک خواب سے کم نہیں، اور اسی وجہ سے امریکہ کا دماغی اور معاشی توازن بگڑ گیا ہے۔ چین یہ بھی کہہ چکا ہے کہ دنیا کو امریکہ سے خطرہ ہے، کیوں کے امریکہ کسی کی ترقی برداشت کرنے کی صلاحیت سے معذور ہے۔

چین کہہ چکا ہے کہ اس کا سب سے بڑا قصور معاشی ترقی ہے، امریکہ چین کے خلاف نہیں بلکہ اس کے معاشی ترقی کے خلاف ہے۔

جو ملک قیادت کی صلاحیت کھو دیتا ہے اس سے قیادت چھین لی جاتی ہے یہ قدرت کا اصول ہے، اور یہی اصول امریکہ پر لاگو ہوگا۔

ظالم کو لگتا ہے کہ اس کا اقتدار طویل ہے، مگر ظالم کو یہ نہیں معلوم کہ ہر ظالم کے دن گنے جاتے ہیں اور پھر وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

امریکہ عراق میں گھسا کہ عربی ممالک اس کی مدد کریں گے مگر کسی ہمسایہ ملک نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ پھر امریکہ افغانستان میں گھسا کہ اس کے قریبی ملک اس کا ساتھ دیں گے مگر کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اب امریکہ یورپ میں گھسنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کے اسے وہاں سے سپوٹ مل جائے گی، اسے کہیں سے بھی سپوٹ نہیں ملنی۔

انشاءاللہ امریکی مظالم کا سورج بھی جلد غروب ہوگا۔ رادھا کے گھنگرو بھی ٹوٹیں گے اور اس کی مانگ بھی اُجڑے گی۔

کاٹھ کاالو

تحریر: میاں وقارالاسلام

زیادہ عمر والوں اور انتہائی بیماروں کو کرونا سے شدید خطرات ہیں، امریکہ عمر رسیدہ بھی ہے اور شدید بیمار بھی اسی وجہ سے کرونا نے اس کی ساری ہوا نکال دی۔ امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ مقروض ملک ہے اسی وجہ سے امریکہ کو کرونا سے سب سے زیادہ معاشی نقصان ہوگا۔

امریکہ میں 2008 سے بیرونی سرمایہ کاری شدید مشکلات کا شکار تھی، جو کمپنیاں تھوڑی بہت امید کے سہارے چل رہی تھیں ان کی امیدوں پر بھی کرونا نے پانی پھیر دیا۔ امریکہ کا فنانشل سسٹم ایک غبارے کی طرح ہے، بینک کاروبار میں براہ راست شراکت دار ہوتے ہیں، جو کمپنی 4 ماہ کا سرکل سنبھال نہیں پاتی وہ کمپنی روڈ پر آ جاتی ہے۔

امریکہ کی سینکڑوں کمپنیوں کا آج نام ونشان بھی نہیں ہے، کیوں کہ چین نے ان کی مصنوعات کے مقابلے میں ایک تہائی قیمت پر اپنی مصنوعات رکھ دیں۔ امریکہ کہ کم از کم 100 سے زیادہ فارچون کمپنیاں پہلے ہی ریڈ لائن پر تھیں، کرونا کے بعد ان میں اسے ایک بھی نظر نہیں آئے گی۔

امریکہ کی جو بھی کمپنی ڈوبی ہے وہ اتنی بری طرح سے ڈوبی ہے کہ دوبارہ اٹھ نہیں پائی، امریکہ کی بہت ساری کمپنیوں نے اپنے آپ کو بیچنا غنیمت جانا یا پھر چین میں جا کر فیکٹریاں لگالیں۔ "ڈنڈا یا ڈالر" امریکہ کی اس بے ہودہ ڈاکٹرائین نے اس کا ڈنڈا بھی ٹوٹ گیا اور ڈالرز بھی ختم کر ہو گئے مگر اس کا غرور اور تکبر نہیں گیا، اور دنیا مغرور ملک میں سرمایہ کار چھوڑ چکی ہے۔

امریکہ نے ہر ملک کے لیئے مشکل کھڑی کی ہے یہ امریکہ کی تاریخ ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ اب امریکہ کی مشکل گھڑی میں کوئی اسے دوبارہ دودھ پلائے۔ ہمارے ہاں سرائیکی میں ایک کہاوت ہے "موئی نئیں تے آکڑی پیئی اے" بس امریکہ بھی ایسا چوہدری ہے جس کے پاس چودراہٹ کے نام پر بھیک مانگنے والی جھولی ہی بچی ہے۔

چین سپر پاور نہیں ہے مگر پوری دنیا کو ہیلتھ سے متعلقہ سامان بھیجنے میں مصروف ہیں، امریکہ سپر پاور ہے مگر پوری دنیا کا منہ دیکھ رہا ہے کہ کوئی تو اس کی مدد کرے۔ امریکہ اپنا جھنڈا تک چین سے بنواتا ہے اور اس میں ڈنڈا بھی چین دیتا ہے، پھر اکڑ کس بات کی۔

کہتے ہیں کہ کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی، 11/9 ایک کاٹھ کی ہنڈیا تھی جو امریکہ نے جیسے تیسے چڑھالی، عراق بھی کاٹھ کی ہنڈیا تھی چوراہے پر پھوٹی، اب کاٹھ کاالو کیا چڑھائے گا۔ 11/9 ایسے ہی تھا کہ امریکہ نے اپنا منہ لال کرکے رونا شروع کر دیا کہ مجھے کسی نے مارا، کرونا کا ڈرامہ بھی کچھ ملتا جلتا ہے، کرونا کم ہے رونا زیادہ ہے۔

امریکہ کے حالات اتنے برے نہیں تھے کہ کرونا کو سنبھالا نہ جا سکتا مگر امریکہ نے کرونا کی مدد سے چین کو بدنام کرنے کا موقع کیش کروانے میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی، لگتا نہیں کہ اس دفعہ کاٹھ کی ہنڈیا چڑھے گی۔ پچھلے 20 سال میں چین میں معاشی طور پر جتنا عروج دیکھا ہے امریکہ نے اتنا ہی زوال دیکھا ہے، یعنی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

سائوتھ چائینا سی جہاں امریکہ چین کو کاونٹر کرنے کی تیاری کر رہا ہے، یہ جارہیت امریکہ کو بہت مہنگی پڑ سکتی ہے، چین کس حد تک اپنی بحری طاقت کر بڑھا چکا ہے اس پر خود امریکہ کو بھی تشویش ہے۔ امریکہ اپنے اتحادیوں کو ڈبل کراس کرتا آیا ہے، اتحادی بھروسے کے لائق ہوں بھی تو امریکہ کا کوئی بھروسہ نہیں کرتا، اس لیئے قوی امکانات ہیں کہ گیم بہت جلد الٹی پڑنے والی ہے۔

امریکہ اپنی صفوں میں ایسے لوگ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے جو چین کے ہاتھوں فروخت ہو گئے، جب کہ چین ان کی قیمت بڑھا رہا ہے۔ امریکہ کے ہاتھ بہت سے بے گناہوں کے لہو سے رنگے ہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شہیدوں کا لہو رنگ نہ لائے۔

اسلام کو بدنام کرنے کی سزا امریکہ کو ہماری آنکھوں کے سامنے مل رہی ہے، اسلام کو کوئی بھی خطرہ نہیں خود امریکہ کو اپنی سلامتی خطرے میں نظر آ رہی ہے۔

امریکہ کے ہر بیان میں بوکھلاہٹ اور کمزوری ہے جب کہ چین کے ہر بیان میں مضبوطی اور خود اعتمادی ہے، دنیا امریکہ کے کسی موقف کو گھاس نہیں ڈال رہی، انٹرنیشل میڈیا روز امریکہ کو لاجواب کر دیتا ہے۔

امریکی اونٹ امریکہ کی طرف ہی بیٹھ گیا

تحریر: میاں وقار الاسلام

عینی شاہدین نے آفیسر کو کہا کہ وہ اپنا گھٹنا شخص کی گردن سے ہٹالیں کیونکہ وہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ ایک نے کہا 'اس کے ناک سے خون آ رہا ہے' جبکہ ایک اور نے التجا کی کہ 'اس کی گردن چھوڑ دو۔' سٹریچر اور پھر ایمبولینس میں ڈالنے سے پہلے وہ شخص بے حس و حرکت نظر آتا ہے۔

اس واقعے کی ویڈیو میں دیکھا جا سکتا ہے کہ 46 برس کے جارج فلوئیڈ گھٹی ہوئی آواز میں کہہ رہے ہیں کہ انھیں سانس نہیں آ رہی جب کہ ایک پولیس اہلکار ان کی گردن کو گھٹنے سے دبا رہا ہے۔ اب اس ویڈیو کو یوٹیوب اور سوشل میڈیا پر شئیر کرتے ہی امریکی پالیسی کے تحت ڈیلیٹ کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اظہارِ رائے کو براہ راست قتل کیا جا رہا ہے۔

چار پولیس اہکاروں کو نوکریوں سے برطرف کی دیا گیا ہے جبکہ شہر کے میئر کا کہنا ہے کہ سیاہ فام ہونے کا مطلب موت کی سزا نہیں ہونا چاہیے۔ امریکی شہر مینیپولیس میں ایک سیاہ فام شخص کی پولیس کی تحویل میں ہلاکت کے بعد احتجاجی مظاہروں میں پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم کے واقعات پیش آ رہے ہیں۔

مظاہروں کی آڑ میں شاپنگ مال کو لوٹا جا رہا ہے، شاپس کے مالکوں کو بے دردی سے مارا جا رہا ہے، نجی اور سرکاری املاک کو جلایا اور توڑا پھوڑا جا رہا ہے۔ پولیس کی طرف سے ربر بلٹ اور آنسو گیس کا استعمال کیا جا رہا ہے، عوام کی طرف سے بھی جو پولیس والا ہاتھ لگ جائے اس کی دھلائی کی جا رہی ہے اور بہت سی پولیس کی گاڑیوں کو بھی جلایا جا چکا ہے۔

شیکاگو میں نائکی کا ایک سٹور مکمل طور پر لوٹ لیا گیا اور اس کے بعد اس میں آگ لگا دی گئی، اور اس کے مالک کو مار مار کر لہو لہان کر دیا گیا۔ جس کی حالت تشویش ناک بتائی جا رہی ہے۔

پوری دنیا میں بدامنی پھیلانے کے بعد امریکہ کا اپنا امن شدید خطرے میں ہے۔ پوری دنیا میں سازشیں کرنے والے بے لگام گھوڑے کو لگام کون ڈال رہا ہے؟ پوری دنیا کو تماشا بنانے والا ظالم امریکہ آج پوری دنیا کی مظلوم نظروں میں تماشا بنا ہوا ہے۔ کون سی ٹیڑھی کھیر امریکہ کے

گلے میں پھنس چکی ہے، اور یہ کھیر امریکہ کو کھلائی کس نے، جسے نہ وہ نگل سکتا ہے نہ ہی اگل سکتا ہے؟ امریکی پولیس اور امریکی عوام آمنے سامنے، امریکی فوج کی ممکنہ مداخلت۔

اظہارِ رائے کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے والا ملک امریکہ خود اپنی عوام کو اظہار رائے کا حق نہیں دے رہا صدر ٹرمپ نے مظاہرین کے لیے لفظ "تھگ" استعمال کیا ہے۔ یعنی اظہارِ رائے کا قانونی حق استعمال کرنے والے امریکی ہیں یعنی چور، لٹیرے یا پھر ڈاکو ہیں۔ "THUGS باشندے"

امریکی فنڈنگ سے جس طرح کے پلے کارڈز ہانگ کانگ کے مظاہرین نے اٹھا رکھے تھے اسی طرح کے پلے کارڈز امریکہ کی سڑکوں پر کالوں کے ہاتھ میں دیکھائی دے رہے ہیں۔ امریکہ ان میں سے اکثر کو امریکہ شہری ہی نہیں مانتا، امریکہ کہ کہنا ہے کہ یہ دہشت گرد ہیں جو مظاہرین کی شکل میں باہر نکل آئے ہیں۔

30 سال سے امریکی قوم کو طرح طرح کے خوف میں مبتلا رکھا جا رہا تھا، کبھی جرمنوں، جاپانیوں، روسیوں کا خوف، کبھی عربیوں، ایرانیوں، عراقیوں اور افغانیوں کا خوف اور اب چینیوں کا خوف۔

30 سالوں میں امریکی عوام کو شیشے میں اتارنے کا شاید ہی کوئی ڈرامہ ہو جو رچایا نہ گیا ہے، لگتا ہے امریکہ کے پاس اب مزید ڈرامے ختم ہو چکے ہیں۔

امریکہ کی بہترین ملٹی نیشنل کمپنیاں جن کے سامنے دنیا کی کوئی کمپنی ٹھہر نہیں سکتی تھی ان میں سے کئی دوالیہ ہو چکی ہیں، کئی دوالیہ ہونے والی ہیں اور کئی دوالیہ ہو جائیں گی۔

عالمی وباوں کی روک تھام میں امریکی امداد ایک کلیدی کردار ادا کرتی تھی، موجودہ کرونا کی وبا میں امریکی کردار سوائے جھوٹی پروپیگنڈہ گیم کے اور کچھ نہیں۔ امریکہ اپنی ہی عوام کو صحت کی بنیادی سہولیات فراہم کرنے میں ناکام نظر آیا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں کرونا کے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے افراد امریکہ کے ہی ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس اونٹ کو بڑی محنت سے دنیا کی اور بیٹھایا گیا تھا اب وہ کروٹ لے رہا ہے اور اس کا وزن اب امریکہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نہ امریکہ اتنا بے وقوف ہے نہ امریکہ عوام اتنی بے وقوف ہے مگر درمیان میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو ان دونوں سے زیادہ سیانے ہے۔

کاروباری میدان میں بھی امریکہ بہت پیچھے رہ گیا چین اور یورپ کے بعد امریکہ تیسرے نمبر پر ہے، آئی ٹی سیکٹر اور دفاعی سیکٹر اور اے آئی سیکٹر میں بھی امریکہ کو خاصی پریشانی لاحق ہے۔

امریکی ڈالر کی اجارہ داری کو بھی شدید خطرات لاحق ہیں، دنیا کا انحصار ہمیشہ سے امریکی ڈالرز پر نہیں تھا، عالمی جنگ دوئم سے پہلے مختلف حکومتیں سونے کو ہی بطور کیش ریزور استعمال کرتی تھیں، مگر 1944 میں بریٹن ووڈ معاہدے کے تحت (جو کہ ورلڈ بین اور آئی ایم ایف نے تیار کیا تھا) امریکی ڈالر کو بطور کیش ریزو متعارف کروایا۔

آئی ایم ایف کے مطابق آج پوری دنیا میں تقریبا 61 فیصد کیش ریزورز ڈالرز کی صورت میں موجود ہیں۔ امریکی فنانشل سسٹم پر دنیا کے انحصار کی وجہ سے بین القوامی تجارت میں 80 فیصد ٹرانزیکشنز صرف ڈالرز میں ہوتی ہیں جب کہ 20 فیصد ٹرانزیکشنز یورو میں ہوتی ہیں۔

دنیا پر امریکہ سیاسی غلبہ جیسے جیسے کم ہو رہا ہے، دنیا کے مختلف ممالک کا چین اور یورپ پر انحصار بڑھ رہا ہے۔

میں چین نے علی بابا، ٹینسینٹ، اور بیڈو کے ای کامرس پلیٹ فارمز کی کامیابی کے بعد اپنی ورچیول کرنسی متعارف کروائی۔ سال 2014 2019 میں چین کی ورچیول کرنسی کا استعمال 49 ٹریلین ڈالر سے بھی تجاوز کر گیا۔ چین ہر پانچ میں سے چار ٹرانزیکشنز موبائل بنکنگ کے زریعے ہوتی ہیں اور چین اس سمت بڑھ رہا ہے کہ پیپر کرنسی کو سرے سے ہی ختم کر دیا جائے۔

دنیا کے بہت سے ممالک ورچیول کرنسیز کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو براہ راست ڈالر کے غلبے کو توڑنے میں معاون وہ سکتے ہیں۔ حالات اسی طرح رہے تو بہت جلد امریکہ کو یہ جھٹکا بھی لگ سکتا ہے، جس کے بعد امریکی اونٹ پورے کا پورا اپنی کی معشیت پر بیٹھ جائے گا۔

ہمت ہے تو اب مارو

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایک صاحب کو چند لوگ گھیر لیتے ہیں اور کسی وجہ سے اس کی خوب پٹائی کرتے ہیں، جب مار مار کے تھک جاتے ہیں تو وہ صاحب بڑی مشکل سے کھڑے ہو کر کہتے ہیں ہمت ہے تو اکیلے اکیلے مارو، اور پھر سب لوگ اسے اکیلے اکیلے مارتے ہیں۔

مسلمانوں کی حالت اس سے بلکل بھی مختلف نہیں، مسلمانوں کے بڑے بڑے ممالک کو مار مار کر چھوٹا کیا گیا، پھر جس جس ملک نے تھوڑی تھوڑی ہمت دیکھائی اسے پھر اکیلے اکیلے بھی مار پڑتی رہی ہے یا پڑ رہی ہے، کسی کو دفاعی طور پر مار پڑ رہی ہے، کسی کو معاشی طور پر، کسی کو خارجی سطح پر تو کسی کو داخلی سطح پر، کسی کے بیرونی مسائل بڑھائے جا رہے ہیں تو کسی ہے اندرونی، کسی کی آبادی مارا، کاٹا اور دھکیلا جا رہا ہے تو کسی ہے علاقوں پر قبضے کئے جا رہے ہیں۔

جو ممالک محفوظ ہیں وہ بھی غیر محفوظ ہونے کے ڈر سے زندگی گزار رہے ہیں کہ کہیں یہ مصیبت ان پر نہ آ جائے۔

میں اکثر کہتا ہوں کہ جس چیز کا ڈر پیدا ہو جائے وہ ہو کر رہتی ہے، جن ملکوں کو اپنے برے حالات کا خوف تھا آج وہ برے حالات سے گزر رہے ہیں۔ اور جن کو خوف ہے ان کا نمبر بھی دور نہیں۔

خواب غفلت میں سونے اور جیتے جی مر جانے میں کوئی فرق نہیں۔

مسلمانوں کو تو خدا کے سوا کسی چیز کا ڈر نہیں ہوتا پھر یہ کس سے ڈرتے یا ڈرائے جاتے ہیں۔ قران میں غزوات کے حوالے سے بہت کچھ بتایا گیا ہے خاص کر کہ یہ کے جب تمہارا رعب ختم ہوتا ہے تو تمہاری ہوا اکھیڑ دی جاتی ہے۔۔۔ یا پھر یہ کہ اپنے گھوڑے تیار رکھے اللہ جلد ہی دشمنوں کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دے گا۔ ہمارا رعب تو رہا نہیں الٹا ہوا اکھیڑ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ ہماری اپنی جمعیت میں نا اتفاقی، اللہ پر بے یقینی اور کافروں کا رعب بڑی وجہ ہے۔ مسلمانوں نے باجماعت ہو کر کون سے بین القوامی فیصلے کئے ہیں کہ ان کا کسی کو ڈر بھی ہو۔ جو جہاں سے چاہتا ہے امت کو نقصان پہنچاتا چلا جاتا ہے۔

مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اگر کافروں کے پراڈکٹس کا ہی بائیکاٹ کر دیں تو دنوں میں ان کی بڑی بڑی کمپنیوں کے قد آدھے رہ جائیں۔ مگر یہ اتنے اتنے معمولی فیصلے لینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں الٹا انہیں پر ائے دن سینکشنز پر سینکشنز لگتی رہتی ہیں۔

ہر وقت رحم اور مدد کی بھیک مانگنے والی جماعت کبھی آنکھیں بھی دیکھا پائے گی، ایسا بالکل نہیں لگتا، کیوں کہ جب دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہے تب بھی آواز نہیں اٹھتی، مسلم ممالک کو توڑا جاتا ہے تب بھی بھی کوئی بات نہیں ہوتی مسلمانوں کے وسائل پر قبضہ کر لیا جاتا ہے تب بھی بات نہیں کی جاتی۔

بہت سے ملکوں میں مسلمانوں نے اپنے ہی ملکوں پر قبضہ کیا ہوا ہے اور کفار کو ہر ممکن مدد فراہم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی ملکوں میں پالیسیز غیر ملکی چلتی آ رہی ہیں۔

مسلم ممالک کو ڈر ہے کہ ان کی اکانومی تباہ نہ ہو جائے اور کافروں کو ڈر ہے کہ مسلمان اکھٹے ہو کر ان کی اکانومی تباہ نہ کر دیں۔

ہماری تقسیم نے کافروں کو اکھٹا کر رکھا ہے جب کہ اللہ تعالی کہتا ہے تم سمجھتے ہو یہ آپس میں ایک ہیں حالانکہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں۔

جھوٹ پر جھوٹ

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان کی تاریخ میں شاید ہی کسی ملک نے اس قدر جھوٹ بولے ہیں جس قدر جھوٹ امریکہ نے بولے ہیں۔ امریکہ نے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اپنی ہی قوم سے جھوٹ بولا۔ خود ہی اپنے ٹاورز اور اپنے ہی جہاز تباہ کیے اور اس میں اسلام کی ملوث کرکے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ عراق میں جنگ شروع کر دی، مقصد تیل پر قبضہ کرنا اور افغانستان پر حملہ کر دیا اور مقصد چائنہ کو کاؤنٹر کرنا اور ان سب حرکتوں کو اسلام کے خلاف دہشت گردی کا نام دیا۔

اس وقت دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے دو راستے رکھے گئے ایک یا امریکہ کے جھوٹ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں یا پھر امریکہ جنگ کا سامنا کریں۔ پورے ایک سو فیصد جھوٹ سے شروع ہونے والی اس جنگ میں امریکہ کی نہ صرف کمر ٹوٹ گئی بلکہ جو بدنامی ہونی تھی وہ الگ سے۔ دنیا نے امریکہ کے جھوٹ کا کیا اعتبار کرنا تھا خود امریکہ کے 80 فیصد سے زیادہ لوگوں نے اسے مکمل بکواس کا نام دیا۔

ٹریلین ڈالر کی جنگ ہارنے اور پوری دنیا میں بدنام ہونے کے بعد امریکہ کی ذہنی کیفیت کا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ ایک 13 طرف تو یہ ساری جنگ چل رہی تھی اور دوسری طرف امریکہ کا جھوٹی کنسپائیری تھیوری چل رہی تھی۔ امریکہ نے چائنہ اور روس کے خلاف ہزاروں ویب سائیٹس بنوائیں، اسلام اور اسلامی ممالک کے خلاف بھی ہزاروں جھوٹی ویب سائیٹس بنوائیں اور انہیں پروموٹ کرنے میں لگا رہا۔ ان سب کے علاوہ ہزاروں فیک ڈاکومینٹریز بھی بنائی گئیں جس کے ذریعے امریکہ نے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی اور اپنی قوم کو چائنہ اور روس کی طرف سے امریکہ کے خلاف کاروائیوں کی جھوٹی ڈاکومنٹریز بھی بنا بنا کر دیکھاتا رہا۔

یہاں تک کہ ٹرمپ نے جو الیکشن جیتے اس کی جیت اور ہار کے پیچھے بھی بیرونی ممالک یعنی روس اور چائنہ کے ملوث ہونے یا کسی طرح سے اثر انداز ہونے کی فیک ویڈیوز اور نیوز دیکھائی گئیں۔ بی بی سی اور سی این این کی جتنی بھی خبریں اوپر بتائے گئے تمام معاملات کے بارے میں تھیں سب کی سب جھوٹی اور بے بنیاد۔

پوری دنیا میں اسلام نے نام پر بننے والے دہشت گرد تنظیموں کی پس پردہ پشت پناہی امریکہ کی تھی ایک طرف پاکستان کو کہتا رہا کہ ڈو مور اور دوسری طرف اپنے ہی تیار کردہ دہشت گرد گروپوں کو بھی یہ کہتا رہا کہ اپنی کاروائیاں جاری رکھیں۔ پاکستان امریکہ کی تمام مکاریوں سے

باخوبی آگاہ تھااور اپنی کاروایوں میں احتیاط سے کام لیتا رہاورنہ امریکہ کا تو براہ راست یہ پروگرام تھا کہ بلوچستان کو پاکستان سے الگ کر دیتااور اس کی پوری کوشش رہی کہ یہ کر پائے۔

پاکستانی ایجنسیوں کے ہاتھ لگنے والے تمام شواہد میں امریکہ کی سیاہ کاریاں ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔جب پاکستان نے امریکہ کو آئنہ دیکھایا تو امریکہ کہتا رہا ہے پاکستان ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔جب کہ پوری دنیا کو ڈبل کراس کرنا امریکہ کی اپنی پالیسی رہی ہے۔اور آپ جب اسے چائنہ کراس کر رہا ہے تو اس کی نیندیں حرام ہو رہی ہیں۔

آج اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ امریکہ کی ایک یا دو فیصد باتیں سچی ہیں تو اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے امریکہ ایک فیصد بھی سچا نہیں۔دنیا میں کیا ہونے جارہا ہے اگر آپ سچ جاننا چاہتے ہیں تو امریکہ کو سننا چھوڑ دیں یہ مکمل طور پر ایک جھوٹا ملک ہے۔

امریکہ اپنی قوم سے جھوٹ بولنا والا دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔دنیا میں کسی ملک نے اتنی جھوٹی خبریں نہیں پھلائیں جتنی امریکہ نے پھلائی ہیں۔پوری دنیا سے آئیڈیاز چوری کرنے والا ملک امریکہ خود ہی اپنے آئیڈیاز چوری کرکے باہر بیچتا رہا ہے۔دنیا کے سب سے بڑے ہیکرز امریکہ میں ہیں، دنیا میں کسی ملک نے اپنی قوم کو اتنا نہیں لوٹا جتنا خود امریکہ نے امیر کن کو لوٹا ہے۔

امریکہ فیس بک ٹیوٹر وٹس ایپ اور گوگل جیسی ایپلیکیشن کی وجہ سے پوری دنیا میں پرائیویسی کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔چائنہ جس بھی ملک میں ڈویلپمنٹ کے پراجیکٹس کرتا ہے امریکہ اسی ملک میں دہشت گردی کرواتا ہے اور وہاں کے کرپٹ لوگوں کو سپوٹ کرتا ہے۔امریکہ پوری دنیا میں سیاہ کاریوں کی وجہ سے بری طرح ایکسپوز ہو رہا ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں میں امریکہ نے اتنے جھوٹ بولے ہیں کہ چند ملکوں کے سوا امریکہ کو کوئی دوست نہیں رہا۔آج امریکہ کے ہاتھ میں اسٹریلیا، جاپان اور انڈیا اور چند ایک اور ملکوں کے علاوہ کوئی نہیں اور یہ بھی کتنا عرصہ ساتھ رہتے ہیں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

یہ ہے انجام اس ملک کا جس نے اسلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کیا اور آج پوری دنیا میں اپنی صفائیاں دیتا پھر رہا ہے اور کوئی بھی اس کا یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔اور جھوٹوں کا یقین کون کرتا ہے۔

کر بھلا سو ہو بھلا

تحریر : میاں وقار الاسلام

آرٹیفیشل انٹیلیجینس 20 سال سے جس مستقبل کا خواب دیکھ رہی ہے فائیو جی اسے حقیقت میں بدل سکتی ہے، ٹیکنالوجی کب سے تیار ہے 5 جی کے بغیر چینلائیز نہیں ہو گی۔ چین، امریکہ، انگلینڈ، جرمنی، روس، اسرائیل ان سب کی تمام بڑی کمپنیوں اور تمام بڑے بلینئرز اور تمام بڑی خفیہ ایجنسیز کے سٹیک براہ راست آرٹیفیشیل انٹیلیجینس میں ہیں۔

آرٹیفیشل انٹیلیجینس صرف ٹیکنالوجی ہی نہیں بلکہ ملٹی ٹریلین ڈالر ملٹی لیئر انڈسٹری ہے، اگلی سپر پاور کی جان اسی چڑیا میں ہے۔ چین دنیا کا واحد ملک ہے جس نے پہلی مرتبہ بڑے پیمانے پر اپڈیمک کے تمام چیلنجز کا مقابلہ آرٹیفیشل انٹیلیجینس کے بھرپور استعمال سے کیا ہے۔

جہاں ایپڈیمک میں چین اپنی تمام جدید ٹیکنالوجیز کا بار بار مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے وہیں امریکہ کی ہر سطح پر ناکامیاں نظر آ رہی ہے امریکہ کے پاس بہت کچھ ہے مگر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ چین کی تمام بڑی کمپنیاں گلوبل ایپڈیمک کمپین میں کھل کر پیسہ لگا رہی ہیں نہ صرف دنیا کی سپلائی اور سپورٹ بہتر ہو رہی ہے بلکہ یہ کمپنیاں بھی تیزی سے اوپر آ رہی ہیں۔

امریکہ کی بڑی کمپنیاں امریکہ میں اس طرح ایک اکھٹی نہیں ہو رہیں، بلکہ بری طرح سے تقسیم ہیں، اتنی بری صورت حال امریکہ میں کبھی بھی نہیں ہوئی، آخر وہ کمپنیاں کہاں غائب ہو گئیں۔ امریکہ کی سینکڑوں بڑی کمپنیوں کے پروڈکشن ہاوس چین میں ہیں، چین انہیں امریکہ سے زیادہ کما کر دیتا ہے وہ باجود اس کے کہ امریکی کمپنیاں ہیں مگر گیم ساری چین کے کارڈ پر ہو رہی ہے۔

امریکہ میں بیٹھی ہوئی کمپنی جس کی پاس صلاحیت اور ٹیکنالوجی اور وسائل موجود ہیں وہ بھی امریکہ میں 100 روپے کی لاگت سے کچھ بنانے کی بجائے چین سے وہی چیز 10 روپے کی بنوائے گی۔ لاکھوں امریکہ تاجر اس وقت چین میں بیٹھے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز چین میں بن رہی ہے نہ صرف چین کے لیئے مگر پوری دنیا کے لیئے۔

یہ جو امیر ترین کاروباری شخصیات ہوتی ہیں یہ بلا کر نظر رکھتی ہیں یہ جہاں لوگ آفات سے گھبراتے ہیں وہاں ان کی چاندی ہو جاتی ہے اور وہ اس میں کاروبار ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ٹرمپ نے اپنے ہوٹل اور جوئے خانے بند کر دیئے ہیں، بل گیٹس نے مائیکروسوفٹ کا عہدہ چھوڑ دیا ہے، چین کی بڑی کمپنیاں میڈکل میں آ گئی ہیں، ٹینک بنانے والے ماسک بنا رہے ہیں، یہ ہے کاروباری دنیا۔

ٹرمپ نے جان بوجھ کر بلنڈر مارے ہیں، کرونا کو سنجیدگی سے نہ لینا، اقدامات نہ کرنا، لاک ڈاون تک نہ کرنا، بلیم گیم کا حصہ بنے رہنا، دو درجن فارمیسیز کا دم چھلا بننا اور ورلڈ ہیتھ آرگنائزیشن کو دبانا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ امریکہ کے بلینئرز امریکہ کو بیچنے میں لگے ہیں، اور ان کے تمام تر مفادات کا بہترین ٹائم ہے۔

آج بھی چین میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ براہ راست امریکہ کو تباہ کر سکے، اور امریکہ چاہے تو چین کو تباہ کر سکتا ہے، مگر یہاں ایک تیسری "چیز ہے "ان سائیڈ جاب

امریکہ چین کے خلاف پروپیگنڈا وار کا آغاز کر چکا ہے جس کے پیچھے اس کی عوام اسی طرح اکٹھی ہو جائے گی جیسے وار آن ٹیرر کے خلاف اکٹھی ہو گئی تھی۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ وار آن ٹیرر سے امریکہ کو بہت فائدہ ہو گا مگر پس آئینہ امریکہ کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

اوپر سے چین کے خلاف پروپیگنڈا ہو گا اور نیچے سے امریکہ کے سارے بلینئرز چین شیفٹ ہو جائیں گے، آدھے وار آن ٹیرر کے بعد چین چلے گئے تھے اور آدھے اب چلے جائیں گے انکل سیم وائیٹ ہاوس میں تالیاں بجائے گا۔

امریکہ کو چین سے زیادہ اپنے سپر گریڈی بلینئرز سے خطرہ ہے جن کا دین ایمان امریکہ نہیں بلکہ پیسہ ہے۔ ٹریڈ وار میں جب ٹرمپ نے چین پر اضافی ٹیرف لگایا تو امریکہ کی 1000 کمپنیاں چیخ پڑیں اور تحریری درخواست کی کہ اس طرح تو وہ خود مر جائیں گے۔

ٹرمپ نے کہا تھا کہ چین ہمارا لنچ کھا جاتا ہے، پھر ٹرمپ نے بڑی محنت کی اور چین کو بریک فاسٹ اور ڈنر بھی دے دیا اب مانگ کر کھاتا ہے۔ ٹرمپ نے کہا تھا کہ ہم چین کے امریکہ سے زیادتی نہیں کرنے دیں گے، اور اب ٹرمپ اور اس کے حواری ملک کر امریکہ سے زیادتی کر رہے ہیں۔

ٹرمپ نے کہا تھا کہ چین سے جابز واپس لائیں گے، اور ٹرمپ نے امریکہ کی رہی سہی جابز بھی ختم کر دیں۔ امریکہ اپنے ہر اتحادی سے کہتا آیا ہے کہ وہ اسے ڈبل کراس کر رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خود ی امریکہ سیاست دان اور امریکہ بزنس کیمیونٹی خود امریکہ کو ڈبل کراس رہے ہیں۔

امریکہ نے دنیا کے ساتھ جو گندی گیم کھیلتا رہا ہے وہی گندی گیم اس کے اپنے لوگ اس کے ساتھ کھیل رہے ہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ دوسروں کے ساتھ برا کریں اور آپ کے ساتھ اچھا ہی ہوتا رہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ امریکہ کی گندی گیم کے وبال سے باقی دنیا کو محفوظ رکھے۔ امیں

لاتوں کے بھوت

تحریر: میاں وقار الاسلام

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، بھارت کا کاونٹ ڈاون شروع ہو چکا ہے اب بھارت کو اندر اور باہر سے صرف لاتیں ہی پڑیں گی۔
بھارت کے ترقی کے خوابوں کی حقیقت شیخ چلی کے خوابوں سے زیادہ کچھ نہیں، تاریک ذہنیت سے دیکھے گئے خوابوں کی تعبیر روشن نہیں ہوتی۔

جانکیا ذہنیت پاگل پن کی سٹیج ہے، بتاتی ہے کھلم کھلا دہشت گردی کرنا، مگر مچھ کے آنسو بہانا، دھاڑ کر رونا جیسے تمہارے سارے مر گئے۔
بھارت لومڑی کی طرح چال چلتا ہے اور پھر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے مسائل یوں ہی حل ہو جائیں گے۔

بھارت قدرتی وسائل کے لحاظ سے چین سے 10 ٹائمز زیادہ زرخیز ہے مگر سوچ کے لحاظ سے بھارت چین سے 10 ٹائمز زیادہ بنجر ہے۔ بھارت نے ترقی کے نام پر اپنے لیئے سوائے کنوئیں اور کھائیاں کھودنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ بھارت نے اپنے ملک میں ریاستی دہشت گردی کی، اپنے ہمسایہ ممالک میں دہشت گردی کی آر ایس ایس خطے کی ایک باقاعدہ دہشت گرد تنظیم ہے

بھارت براہ راست بنگلہ دیش میں گھسا اور اس کا اعتراف بھی کیا، پاکستان کے پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ آج بھارت کا مکروہ چہرہ پوری دنیا کے سامنے ہے مگر حقیقت میں بھارت کا کردار اس سے کہیں زیادہ مکروہ ہے۔

بھارت کی انتہا پسندی نے بھارت سے دوست چھین لیئے تو بھارت دشمن سے کیا لڑے گا، بھارت اپنی گھٹیا سوچ کی وجہ سے تباہی کے دھانے پر ہے۔ انڈیا کا میڈیا کہتا ہے کہ عمران خان کی ساری تقریر نفرت پر مبنی تھی۔ بھارت اپنے گریبان میں جھانکے کہ اتنا قابل نفرت کیوں ہے۔

انڈین میڈیا کو ویسے ہی رونے کا بڑا شوق ہے اور انڈین میڈیا کے اس شوق کی تسکین کے لیئے خان صاحب نے ایک ہزار پوائنٹس دے دیئے ہیں۔

: عمران خان کے تاریخی الفاظ

نبی ہمارے دل میں رہتے ہیں اور دل کا درد جسم کی درد سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

سویت یونین کے مجاہدین امریکہ سے اپنی زمین کے لیے لڑتے دہشت گرد کیسے بن گئے۔

کچھ ملکوں میں کپڑے اتارنے کی تو اجازت ہے لیکن پہننے کی نہیں۔

دنیا میں کوئی ریڈیکل اسلام نہیں، اسلامی دہشت گردی نام کی کوئی چیز نہیں، صرف ایک اسلام ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

نائن الیون سے قبل اکثر خود کش حملوں کا تعلق تامل ٹائیگرز کرتے تھے لیکن کسی نے اس کو ہندوئوں سے نہیں جوڑا۔

بھارت میں آر ایس ایس کی حکمرانی ہے جو ہٹلر کے نظریے کی حامی ہے اور مودی کی وزارت اعلیٰ کے نیچے گجرات میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا. انہوں نے کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں جب کرفیو ہٹالیا جائے گا اور لوگ باہر آئیں گے جہاں 9 لاکھ فوجی تعینات ہیں اس صورت میں خون ریزی کا خطرہ ہے، مقبوضہ کشمیر میں سیکڑوں سیاسی رہنماؤں اور نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور کشمیر میں لوگوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔

میں خود کو مثال بناتا ہوں، میں کشمیر میں ہوں اور مجھے 55 روز سے محصور کیا گیا ہے، میں سنتا ہوں ریپ کے حوالے سے، بھارتی فوج گھروں میں گھس رہی ہے تو کیا میں اس ذلت میں رہنا چاہوں گا، کیا میں اس طرح رہنا چاہوں گا، میں ہتھیار اٹھاؤں گا، آپ لوگوں کو اگر آپ انسانوں کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں تو درحقیقت آپ ' انتہا پسندی کے لیے مجبور کر رہے ہیں، جب لوگ امید کھو دیتے ہیں. ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو انتہا پسند بنا رہے ہیں۔

میرا ایمان ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، آخری دم تک لڑیں گے۔ اقوام متحدہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اپنی ذمہ داری ادا کرے۔

خان صاحب آپ نے آج دل جیت لیئے، پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے اسے آپ جیسا لیڈر عطا کیا۔ نواز شریف سو دفعہ بھی مر کر پیدا ہو عمران خان کی طرح کشمیر کی سفارت کاری نہیں کر سکتا۔

محترمہ عنبرین حسیب عنبر کے

"خوبصورت تخیل" تم بھی ناں

سے انتہائی نا معقول درندے

مودی" کے نام"

یو این میں آ کر بیٹھ گئے ہو، تم بھی ناں

مجھے مسلسل کوس رہے ہو، تم بھی ناں

جب سے ستم گر اقتدار میں آئے ہو

میری منجی ٹھوک رہے ہو، تم بھی ناں

میرے دوستوں کو بھی توڑا ہے تم نے

دشمنوں سے بھی ملتے ہو، تم بھی ناں

میں نے تو صرف پانی ہی روکا تھا

دانا پانی روک دیتے ہو، تم بھی ناں

خود ہی کہو اب کیسے بچ سکتی ہے ماں

قیمہ کر کے کھا جاتے ہو، تم بھی ناں

بن کر آواز تم مخالف لبوں پر رہتے ہو
اشکوں میں بھی تم بہتے ہو، تم بھی ناں

طیارے گراتے ہو پائیلٹ پکڑ لیتے ہو
چلو ہٹو، تم بہت برے ہو، تم بھی ناں

میرے خفیہ عزائم بھی تم جان لیتے ہو
مجھ کو اتنا جان چکے ہو، تم بھی ناں

مارتے ہو مزائل بھی تم باتوں سے
اٹامک بم لئے بیٹھے ہو، تم بھی ناں

امن اور شانتی

تحریر: میاں وقارالاسلام

ہمارا امن تمہاری شانتی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے مگر تمہاری شانتی کے گن اچھے نہیں۔ پھر بھی خطے کی بھلائی کے لیے امن اپنا کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ امن اور شانتی کے چکر میں کشمیر کے بچے رل گئے، شانتی اپنا الو ٹ انگ کھا گئی مگر امید کی جاسکتی ہے کہ امن آئے گا کیوں کہ اگر شانتی اکیلی رہی تو شانتی نہیں رہے گی، بالآخر شانتی کو امن کے پاس ہی آنا ہے۔

ایک طرف پاکستان کا امن ہے اور دوسری طرف بھارت کی شانتی ہے۔ امن نے بڑی کوشش کی کہ شانتی مان جائے مگر شانتی مذاکرات کے لیے نہیں مانی اور اب شانتی تیار ہے مگر امن نہیں مان رہا۔ امن کے نہ ماننے کی وجہ یہ ہے کہ شانتی کی نیت ہمیشہ سے مشکوک رہی ہے۔ ذات پات میں گھری ہوئی شانتی کرے بھی تو کیا کرے۔ جب ہم مودی صاحب سے کہتے ہیں ہم جنگ نہیں چاہتے ہیں شانتی چاہتے ہیں تو اس کا غلط مطلب لیا جاتا ہے۔

ہمارے بڑے یوں ہی نہیں کہہ گئے تھے کہ بغل میں چھری منہ میں رام رام، کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے کہ بغل میں شانتی اور منہ میں رام رام۔ اس طرح تو شانتی کبھی بسے گی ہی نہیں اور نا جانے ذات پات کے نام پہ کتنے گھر اجاڑ دے۔ شانتی وفا کرے گی تو امن دھوکا کیوں دے گا۔ مودی سرکار کو چاہئے کہ خون سے ہاتھ رنگنے کی بجائے شانتی کے ہاتھ پیلے کر دے، امن آجائے گا۔

امن اور شانتی کے درمیان ایک تاریخی معاہدے تھا جس کی وجہ سے جوڑے میں ان بن تو تھی مگر مذکرات کی ایک امید باقی تھی مگر مودی سرکار نے تنسیخِ معاہدہ کر کے حالات کو بند گلی کی طرف دھکیل دیا اور پورے خطے کی شانتی کو داؤ پر لگا دیا۔

اب امن کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا ہے کہ شانتی کو اُٹھا کر لے آئے مگر اس سے پہلے دنیا کوشش کر رہی ہے کہ امن اور شانتی کو قریب لایا جائے اور مزید حالات خراب نہ کیے جائیں۔ دعا ہے کے امن اور شانتی ایک ہو جائیں اور خطہ سکھ کا سانس لے۔

دعا گو میاں وقارالاسلام

کشمیریوں کے غم بہت بڑے ہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

مدت ہوئی کشمیر میں صرف ایک ہی موسم ہے، غم کا موسم، ماتم کا موسم، سوگ کا موسم، شہادتوں کا موسم، صبر کا موسم اور گہری سیاہ راتیں۔ دن کیسے ہوتے ہیں یہ تو شاید کشمیر کے بوڑھے بزرگوں کو بھی اب یاد نہیں۔

کشمیر کے ہر گھر سے، ہر گلی سے، ہر کوچے سے، ہر مسجد سے، ہر چوراہے سے، غموں کی نئی نئی داستانیں نکلتی ہیں، کہیں کسی بہن کی عزت تار تار ہوئی، کہیں ماں کی کوکھ اجڑی، کہیں کسی کا باپ گیا، کہیں کسی کی ماں گئی، کہیں کسی کا بھائی گیا اور کہیں پورے کا پورا خاندان ختم ہو گیا۔

کشمیریوں کے غم بہت بڑے ہیں، اور ہمارے دل کشمیروں سے جڑے ہوئے ہیں، ہم بھی ان کے غموں میں اسی طرح شریک ہیں جس طرح وہ خود شریک ہیں۔ جس طرح کی نفرت کشمیروں کو بھارتی ظالموں سے ہے، اسی طرح کی نفرت ہمارے سینے میں بھی پلتی ہے۔ کشمیر سے ہمارا رشتہ کلمہء حق کا رشتہ ہے اور رشتہ خون کے رشتوں سے بھی گہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا بچہ بچہ ہندستان سے نفرت کرتا ہے۔

ہم تو معمولی سے میچ کو بھی اس نظر سے دیکھتے ہیں، کہ اس کے ذریعے ہمارا دشمن رسوا ہو ورنہ دنیا میں ہزاروں کھیل تماشے ہیں ہمیں کسی میں کوئی دلچسپی نہیں، اور دنیا کے کسی ملک سے بھی جیتیں ہمیں اتنی خوشی محسوس نہیں ہوتی جتنی ہمیں انڈیا سے جیتنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔

جہاں بات کشمیروں کی آتی ہے، ہمیں انڈیا کی کسی بھی چیز سے کوئی ہمدردی نہیں، میں سوچتا ہوں کہ جب کشمیری اس طرح کی خبریں سنتے ہوں گے کہ بھارتی اداکاروں کے مرنے پر پاکستانی میڈیا سوگوار بیٹھا ہے تو انہیں کس قدر تکلیف ہوتی ہو گی۔ کیا یہ میڈیا والے ہمارے جذبات کے عکاس ہیں یا پھر انڈیا کی کھلی دلالی کرنے میں مصروف ہیں۔

عوام میڈیا مالکان کی طرح بے غیرت اور بے حس نہیں ہے، پاکستان عوام غیرت مند عوام ہے اور ہر مشکل میں اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ چاہے سارے میڈیا والے بھارتی اداکاروں کے مرنے پر ہلکان ہوتے جائیں اور مڑی کر کبھی کشمیر کا ذکر بھی نہ کریں، کیوں کے

کشمیریوں کے غموں کو اجاگر کرکے انہیں کب پیسے مل جانے ہیں، اور کب اس سے ان کے پیٹھ کی آگ بھرنی ہے۔ یہ اپنی لالچ پوری کرتے ہیں، یہ اپنی لالچ میں بے حس اور بے غیرت ہو سکتے ہیں، مگر عوام نہ ہی بے حس ہے اور نہ ہی بے غیرت ہے۔

کشمیریوں کا غم و غصہ دنیا کو نظر آتا ہے بھارت کے خون سے رنگے ہو ہاتھ دنیا کو نظر آتے صرف اس دنیا کو جس نے آنکھوں پر اپنے مفادات کی سیاہ پٹی باندھی ہوئی ہے۔ بھارتی اداکار تو عمریں پوری کرکے مرے ہیں اس کشمیری بچے کا کیا قصور تھا جسے ماں کی کوکھ میں ہی مار دیا گیا یا جس بچے نے ابھی چلنا ہی شروع نہیں کیا اور اس کے باپ کو اسے کندھا دینا پڑا۔

ہمیں کشمیر کا ایک بے گناہ معصوم شہری، بھارت کے تمام اداکاروں سے زیادہ عزیز ہے۔ آج کشمیر کی وادی دنیا کی کسی بھی سوگوار وادی سے زیادہ سوگوار ہے۔ 5 اگست سے کشمیر میں لاک ڈاؤن کی صورتِ حال ہے، ہر طرح کی پابندیوں کا کشمیریوں کو سامنا ہے۔ کشمیر میں لاک ڈاؤں کا ایک ہی مقصد ہے کہ بھارت اپنی سیاہ کارنامے چھپاسکے اور ظلم کے جو آسمان کشمیر پر توڑ سکتا ہے توڑتا چلا جائے۔ یقیناً کشمیر کے حق میں نہ بولنے والی زبانیں لعنت کی مستحق ہیں۔

خون کی جو ہولی بھارت کشمیر میں کھلتا چلا آرہا ہے، اس کا قرض تو اسے بر حال اتارنا ہی ہوگا۔ آج نہیں تو کل، اس ظلم نے اپنے انجام تک پہنچنا ہی ہے۔

وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، ظالم نے ایک دن اپنے انجام کو پہنچنا ہے۔ کشمیریوں کے ساتھ ہم بھی بھارت کے اس انجام کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہیں جو بھارت کے مظالم کی وجہ سے اس کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ انشاء اللہ ہمارا رب کسی بھی کشمیری کے لہو کو ہر گز رائیگاں نہیں جانے دے گا۔

ایک قصہ اور سنوگے

یہ قصہ ہے کشمیر کا

جہاں جی جی کر لوگ مرتے ہیں

جہاں مر مر کر لوگ زندہ ہیں

جہاں خون میں ڈوبی سڑکیں ہیں

جہاں انساں کے سر پر درندے ہیں

یہ قصہ ہے کشمیر کا

ایک قصہ اور سنوگے

یہ قصہ ہے کشمیر کا

جہاں باپ نے بیٹے کھوئے ہیں

جہاں ماں نے بیٹیاں کھوئی ہیں

جہاں بہن نے بھائی کھوئے ہیں

جہاں بھائی نے بہنیں کھوئی ہیں

جہاں جیون ساتھی کھوئے ہیں

جہاں دودھ پیتے بچے کھوئے ہیں

یہ قصہ ہے کشمیر کا

ایک قصہ اور سنوگے

یہ قصہ ہے کشمیر کا

جہاں آج بھی فرعونی زندہ ہیں

جہاں آج بھی فرعونیت زندہ ہے

جہاں اہل باطل کا یہ عقیدہ ہے

یہاں وہ اہل حق کو مٹادیں گے

جھوٹ تو خود ایک دھوکا ہے

یہ اُسی دھوکے میں زندہ ہیں

یہ قصہ ہے کشمیر کا

ایک قصہ اور سنوگے

یہ قصہ ہے کشمیر کا

اب غزوہء ہند بھی ضروری ہے

اب غزوہء اسرائیل بھی لازم ہے

جب صدیوں کی مستی ضروری تھی

تو پھر صدیوں کا ظلم بھی لازم تھا

یہ قصہ ہے کشمیر کا

شاعر : میاں وقار الاسلام

کشمیریوں کے لیے ہر پاکستانی دل دھڑکتا ہے اور ہر زبان دعا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کشمیریوں کا حامی و ناصر ہو اور انہیں بھارت کی وحشیانہ درندگی سے نجات دلائے۔ امین، دعا گو میاں وقار الاسلام

برما سے بنگلہ دیش، موت سے موت تک کا سفر

تحریر : میاں وقار الاسلام

برما کے وحشت ناک مناظر جنہیں دیکھتے ہوئے آنکھوں کی بینائی جواب دینے لگتی ہے، سنتے ہوئے کانوں کی سماعت جواب دینے لگتی ہے، بولتے ہوئے قوتِ گویائی جواب دینے لگتی ہے، لکھتے ہوئے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور سوچتے ہوئے سمجھ بوجھ جانے لگتی ہے کہ زمین پر ایک جہنم کھودی جارہی ہے جہاں معصوم مسلمانوں کو ایسے کاٹ کاٹ کر پھینکا جارہا ہے جیسے کہ ان کے جسم میں لہو ہی نہیں بہتا، یا پھر یہ کہ یہ لوگ سانس ہی نہیں لیتے۔

یہاں مثال کے طور پر صرف ایک تصویر شئیر کی ہے جو کہ ایک برمی مسلمان بچے کی ہے جس کے ماں باپ چلنے سے معذور ہیں اور ایک چھوٹا سا بچا انہیں اپنے کندھوں پر ایک ہفتہ اُٹھائے پھرتا رہا ہے اور یوں بنگلہ دیش پہنچ کر ان کی جان بچانے میں کامیاب ہوا، یہ سفر موت کے لمبے سائے میں کٹا ہوگا جس کا تصور ہماری سوچ بچھ ختم کرنے کے لیے کافی ہے، مگر وہیں برمی مسلمانوں پر صبر کے دھانے کھولے گئے ہیں کہ وہ ایسے دردناک حالات میں بھی اپنے پیاروں کے لیے جانیں دیتے جارہے ہیں کہ شاید وہ ذہنی اور جسمانی طور پر مرے ہوئے رشتہ دوروں کو زندگی دے پائیں۔ایسی درجنوں کہانیاں ہیں جو ہر نئے سیکنڈ میں جنم لیتی جارہی ہیں ایک ایک تاریخ لکھتی جارہی ہیں۔

شائید ہم جیسے پڑھے لکھے معزز لوگ ان واقعات پر تھوڑے سے غمگیں ہوں گے، تھوڑے سے افسردہ ہوں گے اور پھر اپنی زندگی میں واپس لوٹ جائیں گے۔

تاریخ ہماری بے حسی کو بھی لکھے گی، تاریخ یہ بھی لکھے گی کہ برما کی چیخیں ہمارے کانوں میں اس قدر زور سے سنائی دیتی تھیں کہ ہمیں سنائی دینا بند ہوگیا مگر ہمیں فرق نہیں پڑا، تاریخ یہ بھی لکھے گی کہ بینائی اچک لینے والے مناظر ہمارے سامنے سے گذر گئے مگر ہم اندھے ہی بنے رہے، تاریخ یہ بھی لکھے گی قلم کاروں کی سیاہی سچ نہیں اگل سکی، تاریخ یہ بھی لکھے گی کہ سچ کو خون کے ساتھ تاریخ کے پنوں پر ہمیشہ کے لیے لکھ دیا گیا۔

کیا ہمارا بطور مسلمان برما کے لوگوں سے کوئی رشتہ ہے بھی یا نہیں۔یقینا نہیں، کیوں کہ رشتے تو احساس کے ہوتے ہیں اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ہم خود کو مسلمان کہتے ہیں جس کی نشانی یہ ہے کہ امت کے ایک حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرا حصہ محسوس کرتا ہے مگر ہمارے تو سارے حصے ہی الگ الگ ہو چکے ہیں۔

اسلام سے دور ہوتے ہوتے شاید ہم انسانیت سے بھی دور ہو گئے ہیں، اتنے ظلم پر تو حیوانیت بھی بول پڑتی ہے جانے ہم پر کیسی شیطانیت سوار ہے جس نے ہمیں اتنا کمزور کر دیا ہے کہ ہمیں درد ہوتا ہے تو ہم آہ بھی نہیں کر سکتے۔

لوگ اپنی اپنی سطح پر افسردہ ہیں اور ان کے منہ سے آخری بات یہ نکلتی ہے کہ ہم بے بس ہیں، یہ بے بسی آخر ہے کیا، یہ بے بسی اس لیے ہے کہ ہم بٹے ہوئے ہیں اور ہمارے دل پھٹے ہوئے ہیں، نہ ہم نے کندھے سے کندھا ملانا سیکھا ہے، نہ ہم یک زبان ہوتے ہیں، نا ہم قدم سے قدم ملاتے ہیں، نہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں نہ ہی ہم ایک دوسرے کو سچا مانتے ہیں۔ ہم ہر کسی کو مطلبی کہتے ہیں کیا ایسی سوچ خود مطلبی نہیں ہے۔ ہر بندے نے اپنی اپنی خواہشوں کو معبود بنایا ہوا ہے، ہماری قوم کی کوئی مشترکہ خواہش ہی نہیں بچی تو پھر ہم بچا کیا پائیں گے۔

جب یک جہیتی نہیں رہتی تو صرف بے بسی بچتی ہے

بے بسی کے بعد بے یقینی کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے جس میں انسان کا اللہ سے یقین ہی اُٹھ جاتا ہے، وہ کہتا تو ہے کہ اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے، مگر سچے دل سے اللہ سے دعا بھی نہیں مانگتا کہ یا اللہ ہمیں یکجا کر، ہم میں فاصلے مٹا دے، ہم سے ہماری کمزوریاں دور کر دے، ہمارا جن پر بھروسہ ہے وہ صرف دشمنوں کی چالیں ہیں، ہمارا بھروسہ خود پر نہیں رہا کیوں کہ ہمارا بھروسہ تجھ پر نہیں رہا، یا اللہ ہم سے ہماری پہچان کھو گئی ہے، ہمیں خود سے روشناس کر، یہ لہو برما کے مسلمانوں کا لہو نہیں ہے یہ امت مسلمہ کا لہو ہے، ہمیں ہمارے لہو کی پہچان عطا فرما، جو قوم کسی سے نہیں ڈرتی تھی اب وہ سب سے ڈرتی ہے کیوں کہ یہ اپنی آخرت کو اور یومِ حساب کو بھلا بیٹھی ہے، پیغمبروں کی شان تھی کہ وہ آخرت کا خوف رکھنے والے تھے یا اللہ ہم میں بھی وہی شان پھر سے پیدا کر دے، ہمارے سر جب سے زمانے کے آگے جھکے ہیں کٹتے ہی چلے آ رہے ہیں، اور جہاں ہمارے سروں کو جھکنا چاہیے وہاں یہ جھکتے نہیں ہیں۔ یا اللہ ہمارے دلوں پر بہت سیاہی ہے ہماری راتیں بھی کالی ہیں ہمارے دن بھی کالے ہیں، یا اللہ ہمیں اندھیروں سے نکال کر روشنیوں کی طرف لے آ، ہم پر ہماری حقیقتیں کھول دے، ہم پر رحم فرما، صرف تو ہی ہمارا مددگار ہے۔

دعا گو، میاں وقار الاسلام

دنیا اندھی ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

امریکہ نے کھلے عام اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو تبدیل کرکے روس کے خلاف استعمال کیا اور روس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ پھر یہ بھی اعتراف کیا کہ ہم ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے جہادی تنظیموں کے تربیت دی، اور ہر طرح کی امداد دی، پھر یہی جہادی مسلمان جب امریکہ کا مقصد پورا ہو گیا تو امریکہ کے دشمن بنا دئے گئے حالانکہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ تھے مگر ایک کو چاند بنا دیا گیا اور دوسرے کو بت بنا کر ٹھوک دیا گیا۔

دہشت گردی کی جنگ میں دنیا کو جو نقصان ہوا سو ہوا خود امریکہ کو یہ جنگ 13 بلین ڈالر سے زیادہ کی پڑی تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کو اس کی کتنی لاگت ادا کرنی پڑی ہو گی۔ دنیا کو مسلمانوں کے ایک ایسے رُخ سے متعارف کروایا گیا جو دنیا نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر داڑھی والے کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا جب کہ دنیا کے بہت سے مسلمان داڑھی نہیں بھی رکھتے۔ بس ایک خاکہ کھینچا گیا اور اس میں مسلمانوں کی شباہت چسپاں کر دی گئی۔

امریکہ کو لڑنے کے لیے ایک دشمن چاہیے تھا، سو امریکہ نے راتوں رات اپنے لیے ایک دشمن تیار کیا اور پوری دنیا کو اپنے ڈرامے کا حصہ بنایا اور ایک پاگل سانڈھ کی طرح اپنے ہی لگائے ہوئے نشان کے پیچھے 20 سال تک بھاگتا رہا۔ اور جب تھک ہار کر بیٹھا گیا تو بجائے شرمندہ ہونے کے اسے ایک نئی شرارت سوجھی جس کا نام کرونا ہے۔

چائنہ امریکہ ٹریڈ وار ہو یا پھر فائیو جی ہو، یا پھر دنیا کا خاص کرکے یورپ کا چائنہ کی طرف جھکاؤ ہو یہ سب کچھ ہضم کرنا امریکہ کے لیے آسان نہیں تھا۔ امریکہ براہ راست یہ بات کہتا رہا کہ چائنہ نے ہمیں برباد کیا ہے، اور چائنہ یہ جواب دیتا رہا کہ اس نے امریکہ کو برباد نہیں کیا بلکہ خود امریکہ نے اپنے آپ کو 13 بلین ڈالر کی جنگ جو اس نے دنیا پر مسلط کی ہے اس نے برباد کیا ہے۔ مگر بڑے چوہدریوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی کسی قیمت پر بھی اپنے گریبان میں جھانکنا پسند نہیں کرتے کیوں کہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ ان کے گریبان میں سوائے ان کے کالے کرتوتوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

تقریبا ایک سال سے امریکہ چائنہ کو گھیرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، یہاں تک کہ امریکہ سے قرض لینا جائز اور چائنہ سے قرض لینا ناجائز، امریکہ سے مہنگی گیس لینا جائز اور کسی اور ملک سے سستی گیس لینا ناجائز اور جانے کیا کیا خرافات۔ ہر سطح پر بری طرح ناکام ہونے کے بعد امریکہ نے اپنے رونا، کرونا میں بدل دیا اور دنیا کو پھر بیوقوف بنانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا۔

کرونا وائرس کی آڑ میں تمام چائنیز یعنی دنیا کی 22 فیصد آبادی کو اچھوت بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی اور یہی امریکہ چاہتا تھا۔ دہشتگردی کی جنگ میں مسلمانوں کا ایک فیصد بھی قصور نہیں تھا مگر انہیں ہر سطح پر ٹارگیٹ کیا گیا اور داڑھی والوں کو دہشت گرد تسلیم کر لیا گیا۔

اپنی حماقتوں سے اپنا منہ لال کر کے امریکہ کہتا ہے کہ چائنہ نے اس کے گال لال کیے، اللہ ہمیں ایسی فتنہ پرست قوم کے عذاب سے بچائے۔
پوری دنیا کو کرونا سے نقصان ہو رہا ہے ویسے ہی جیسے دنیا کو دہشتگردی کی جنگ سے دنیا کو نقصان ہوا اور امریکہ نے اس میں اپنے فائدے ڈھونڈے اور اب بھی یہی کر رہا ہے۔

گذشتہ سال کے شروع میں چائینہ نے خبردار کیا تھا کہ دنیا کو امریکہ سے خطرہ ہے اور اس سال دنیا نے کرونا سے ہونے والی تباہی دیکھ لی۔
امریکہ تین دہائیوں سے دنیا کو بیوقوف بنا کر اپنی چودراہٹ قائم کیے ہوئے ہے، کرونا وائرس بھی دنیا کو بیوقوف بنانے کا نیا ہتھیار ہے۔

کرونا عذاب الہی نہیں یہ اسی طرح کا عذاب امریکا ہے جس طرح کا عذاب امریکا وار آن ٹیرر کے نام سے دنیا پر مسلط کیا گیا اس عذاب کو اپڈیمک ٹیرر کا نام دیا گیا ہے۔

جرمنی کی ایک فرم نے کرونا کی ویکسین دریافت کرنے کا دعوی کیا تو ٹرمپٹ نے اس ویکسین کے قانونی حقوق خریدنے کی خواہش ظاہر کر دی جس پر جرمنی نے سختی سے جواب دیا کہ جرمن برائے فروخت نہیں ہیں۔

امریکہ نے ایک بار پھر ثابت کیا ہے کہ دنیا کا امن برائے فروخت ہے۔ یقین سے یہ بات تو کہی جا سکتی ہے کہ وہ دن اب زیادہ دور نہیں رہا جب دنیا کو کرونا سے نجات مل جائے گی، مگر یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ امریکہ ابھی دنیا کو اور کتنا بیوقوف بنا سکتا ہے۔

کیا دنیا واقعی اندھی ہے جو امریکہ کی ہر سازش میں آسانی سے پھنس جاتی ہے، دنیا اندھی نہیں ہے بلکہ امریکہ نے دنیا کو اندھا کیا ہوا ہے اور امریکہ کی سازشیں دنیا پر جلد ہاوی ہو جاتی ہیں۔ ہم پہ اللہ کے خوف کی بجائے امریکہ کا خوف طاری ہے، چاہے یہ خوف دہشت گردی کے خلاف جنگ کی شکل میں تھا یا پھر آج امریکہ کی نئ چال اپڈ یمک ٹیرر کی شکل میں۔

اللہ ہمیں عقل علیم کی بجائے عقل سلیم دے۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

کون ماضی کون مستقبل

تحریر: میاں وقار الاسلام

جب کشمیر معاملے پر پاکستان بھارت کو بلاتا تھا تو وہ انکار کرتا تھا کہ پاکستان سے ڈائیلاگ نہیں ہو سکتے۔اب لداخ معاملے پر بھارت چین کو ڈائیلاگ پر بلاتا ہے تو چین کہتا ہے کہ بھارت سے ڈائیلاگ نہیں ہو سکتے۔

جب بھارت نے پاکستان کا پانی روکا تو اس نے پاکستانی موقف سننا بھی گوارا نہیں کیا اور پانی پر قابض ہو گیا، آج چین بھارت کے 43 فیصد پانی پر قابض ہے اب اسے بھی بھارت کے موقف سے سروکار نہیں۔

چین نے امریکہ کے 2050 کے خواب کاپی کر لیے ہیں، جو ٹیکنالوجیز امریکہ 2050 لانچ کرنے کے خواب دیکھتا تھا وہ چین 2025 تک مکمل کرنے والا ہے۔

امریکہ اور مغربی ممالک سے یہ برداشت نہیں ہو رہا کہ کوئی ملک ان سے آگے بھی سوچ سکتا اور وہ بھی 25 سال آگے حقیت میں چین نے ان کے سروں سے آسمان اور پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ چکا ہے۔

امریکہ اور مغربی ممالک 20 سال کی انتھک محنت کے باوجود چین کو قابو کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اب سمجھتے ہیں کہ بھارت جیسا گدھا چین کو روک پائے گا۔

امریکہ اور مغربی ممالک بھارت پر سرمایہ کاری کر رہے ہیں تاکہ چین کو کاونٹر کیا جاسکے مگر بھارت امریکہ اور مغربی ممالک کی بچی ہوئی جمع پونجی بھی برباد کر دے گا۔

امریکی سینکشنز کو چین نے ہوا میں اڑا دیا ہے چین کہتا ہے ہمیں امریکہ کی ضرورت نہیں ہم اس کے بغیر پہلے سے بہتر کھیل سکتے ہیں، 2025 تک شاید 100 سے زائد امریکی فارچون کمپنیوں کا نام بھی نہ رہے۔

جب تک امریکہ اس قابل ہوگا کہ وہ 5 جی لانچ کرسکے، تب تک دنیا میں چین 6 جی بھی متعارف کروا چکا ہوگا، امریکہ دور دور تک چین سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں، صرف باتیں ہی کر سکتا ہے۔

امریکہ نے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں کیا تیر مارے ہیں گذشتہ 20 سال کی امریکی ناکامیاں سب کچھ بتا رہی ہیں، سینکڑوں امریکی کمپنیاں چین سے مقابلہ کرتے کرتے اپنی فیکٹریاں بند کر بیٹھی ہیں۔

اگلے پانچ سال میں دنیا امریکہ کی سرفہرست آئی ٹی کمپنیوں کو تباہ ہوتے دیکھے گی کیوں کہ جو بھی وہ نیا بنائیں گی اس سے بہتر اور تقریبا ادھی قیمت میں چین سامنے لائے گا۔

ملٹری ٹیکنالوجی میں چین خاموش ہے مگر امریکہ جو بھی نیا متعارف کرواتا ہے چین کہتا ہے ہم اسے 10 سال پہلے اور امریکہ سے بہتر بنا چکے ہیں، چین کی یہی خاموشیاں امریکہ کو بوکھلاہٹ کا شکار کیے ہوئے ہیں۔

چین اور امریکہ کی کمپنیوں میں معاہدے رہے ہیں جن کے مطابق بہت سی مصنوعات کے کچھ پارٹس چین بناتا تھا اور کچھ امریکہ اس لیے دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار رہا ہے۔

آج امریکہ اور چین کی سرد تجارتی جنگ جو اتنی بھی سرد نہیں جتنی نظر آتی ہے اس کے تحت ڈی کپلنگ، یعنی ہر چیز الگ الگ ہونے جا رہی ہے یعنی چین امریکی کمپنیوں پر انحصار ختم کرنے جا رہا ہے۔

امریکہ کی جو مصنوعات چین کی سستی سپلائیز کی وجہ سے دنیا کو ایکسپورٹ ہوتی تھی وہ بھی مہنگی ہو جائیں گی، چین کی مصنوعات جو امریکی سپلائیز کی وجہ سے مہنگی تھی وہ بھی سستی ہو جائیں گی۔

ملٹری ٹیکنالوجیز میں آرٹیفیشل انٹیلیجس ٹیکنالوجی کی دوڑ آج کی نہیں بلکہ 20 سال سے چین اور امریکہ اس میں مد مقابل رہے ہیں چین نے گذشتہ چند سالوں میں آرٹیفیشل انٹیلیجس میں بہت ترقی کی ہے۔

پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ امریکہ کے اندرونی معاملات میں کسی نے مداخلت کی ہے اس سے پہلے پوری دنیا کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے کی اجارہ داری صرف امریکہ کے پاس تھی۔

دنیا پر مختلف پابندیاں لگاتے لگاتے امریکہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھا ہے، امریکی میں یہ صلاحیت ہی نہ ہونے کے برابر ہے کہ وہ بغیر بیرونی امداد کے اب کچھ بھی بنا سکے۔

کسی نے کیا خوب لکھا ہے کہ امریکہ اپنے شاندار ماضی کو دیکھ کر خوش رہتا ہے جب کہ چین اپنا شاندار مستقبل دیکھ رہا ہے۔

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاج

تحریر : میاں وقار الاسلام

جی ہاں، انسانی تاریخ کا سب سے بڑا احتجاج، بھارت میں تقریبا12000 کسانوں نے مودی سرکار کی پالیسیوں سے تنگ آ کر خود کشی کر لی، تباہ کن حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے کروڑوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے، پوری دنیا سے بھارت کے کسانوں کے حق میں آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی ہیں۔

پورے پنجاب سے کسانوں کی بڑی تعداد 500 کلومیٹر کا سفر طے کر کے اکھٹی ہوئی، کسانوں نے ٹریکٹرز، بسوں، کاروں، موٹر سیکلوں، سیکلوں اور پیدل احتجاج کے لیے سفر کیا۔ پولیس اور حکومتی عملے کی شدید مذاہمت اور رکاوٹوں کا سامنا کیا۔ مگر احتجاج میں شامل ہوئے۔ کسانوں پر لاٹھی جارج ہوا، واٹر کینن اور آنسو گیس کا سامنا کیا، بہت سے گرفتار بھی ہوئے مگر احتجاج کے شرکاء میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پولیس اور حکومتی عملے کے ان اقدامات کی ویڈیوز پوری دنیا میں وائیرل ہو رہی ہیں اور حکومت کے لیے منہ چھپانا مشکل ہو چکا ہے۔

مودی کی زرعی پالیسیاں جو کہ پہلے ہی 12000 سے زیادہ کسانوں کے لیے جان لیوا ہو چکی ہیں، ان پالیسیوں کو زرعی دہشت گردی کے نام سے جانا جا رہا ہے۔ بھوکے پیاسے کسان، جن کی آمدنی اس وقت تقریبا صفر ہو چکی ہے، اور وہ حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کی جنگ لڑ رہے ہیں، بین القوامی تنظمیں اس معاملے کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہیں اور کسانوں کی مدد کے لیے بین القوامی تنظیمیں متحرک ہو چکی ہیں۔

پوری دنیا کے نیوز چینلز اور تجزیہ نگار اس ایشو پر خصوصی پروگرامز کر رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ نہ اب کسان پیچھے ہٹنے والے ہیں اور نہ ہی یہ احتجاج آسانی سے ختم ہونے والا ہے۔ حکومت کسانوں کو تقسیم کرنے کے لیے بہت سے اوچھے ہتھ کنڈے بھی اپنا کر دیکھ چکی ہے مگر کسانوں کو تقسیم کرنا اب تقریبا ناممکن ہو چکا ہے۔

بدنامِ زمانہ آر ایس ایس، بری طرح ایکسپوز ہو چکی ہے، کشمیروں، مسلمانوں اور سکھوں پر ہونے والے مظالم کسی سے ڈھکے چھپے نہیں، اور اب آر ایس ایس کا نشانہ ہیں معصوم کسان۔ آر ایس ایس کے اس کسان مکاؤ ٹریپ نے ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور عام اقلیتوں کو اکھٹا کر دیا ہے۔

کسانوں کا کہنا ہے کہ مودی حکومت نے بڑے بڑے وعدے کیے تھے مگر کیا کچھ بھی نہیں، دو سال سے اجناس کے پیسے ہی نہیں دئے گئے، اور ابھی تک انہیں فصلوں کی قیمت کا بھی نہیں معلوم۔ کسانوں کا کہنا ہے کہ انہیں دو دو ہزار کا لولی پاپ دیا جا رہا ہے۔ جب کہ انہیں ان کی محنت کا صلہ نہیں مل رہا۔

حکومت نے کسانوں سے نئی منڈیوں کا وعدہ کرکے بھی ہوا میں اُڑا دیا، بہت سے شہروں کے لوگوں کو دور دراز منڈیوں میں جانا پڑتا ہے۔ کسانوں کے لیے ایک اور آزمائش یہ ہے کہ مودی سرکار نے بجائے منڈیاں بنانے کے کمپنیوں کے کسانوں پر مسلط کر دیا ہے جس سے یہ کمپنیاں کسانوں کا مزید خون چوسیں گی۔

بہت سے کسان بھارت میں پہلے ہی کاشت کاری چھوڑ چکے ہیں، کسانوں کا کہنا ہے کہ ایک کسان کاشت کاری سے زیادہ چوکیدار کی ملازمت کرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اگر کسان کو اس کی لاگت کے بدلے منافع تو دور کی بات صرف نقصان اور ذلالت ہی ملے گی تو کاشت کاری کیوں کرے گا۔

تشویش ناک بات یہ ہے کہ کسانوں نے اس سال کاشت کاری بہت کم کی ہے اور چند ہی ماہ میں یہ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ بھارت میں خوراک کی کمی واقع ہونے والی ہے۔ کسانوں نے عالمی برادری سے درخواست کی ہے کہ بھارت میں امن فوج بھیجی جائے اور کسانوں کو موت کے منہ سے نکالا جائے۔

کسانوں نے اپنی مدد آپ کے تحت لاکھوں لوگوں کا روز کھانا پکا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جب تک ان کو ان کے بنیادی حقوق نہیں ملتے اب وہ اس دھرنے سے پیچھے ہٹنے والے نہیں چاہے انہوں سال بھر ہی سڑکوں پر کیوں نہ پھرنا پڑے۔

داستان بہت بڑی ہے، سب کچھ لکھا نہیں جا سکتا، بھارت کے کسانوں کے حالات بہت سنگین ہیں، مگر پاکستان میں بھی کسانوں کو کبھی درجہ اول کا شہری نہیں سمجھا گیا، کوئی بھی حکومت ہو، چاہے زرداری، چاہے نواز شریف، چاہے مارشلا یا پھر اب کی تبدیلی سرکار کسانوں کا کہیں کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کاش حکومتیں کسانوں پر رحم کریں۔

امریکہ پرائیوٹ لمیٹڈ

تحریر : میاں وقار الاسلام

گذشتہ 20 سالوں میں چین امریکہ کا وہ سب کچھ خرید چکا ہے جو برائے فروخت تھا، 20 سال پہلے دنیا کے 3 سر فہرست کاروبار 1۔ جنگی سامان، 2۔ آئیل اور گیس 3۔ فارماسوٹیکلز میں امریکہ سرِ فہرست تھا، چین کہیں نہیں تھا۔

ٹرمپ کے سابقہ چیف سٹریٹیجسٹ سینن کا کہنا ہے کہ مغربی ممالک کا نظام چین کے نظام سے ہم آہنگ نہیں ایک جیتے گا دوسرے کو ہارنا پڑے گا۔

چین نے امریکہ کی مدر فرمز کو خریدا اور پھر اس سے بچے پیدا کر لیے، دلچسپ بات یہ ہے کہ مدر فرمز کو خود امریکہ سربراہوں نے فروخت کیا۔ جن کمپنیوں کی حیثیت امریکہ میں معاشی ستونوں کی ہے، حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر پرائیوٹ ہیں جن میں چین کے بھاری شیئرز ہیں۔

نئے سال پر امریکی اور چینی حکمرانوں کے پیغامات میں ایک بات صاف تھی امریکہ اپنے حالات پر رویا اور چین نے دنیا کے معاملات پر بات کی۔

دنیا کے دو بڑے جھوٹے جو اپنے آپ کو سب سے بڑا سچا کہتے ہیں مگر کوئی مانتا نہیں، ایک ٹرمپ دوسرا مودی۔ ایک طرف ٹرم کہتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا سچا ہے اور دوسری طرف ٹرمپ کے 2000 بڑے سرکاری جھوٹے بیانوں پر ڈاکومنٹری بنتی ہے۔ ٹرانسپیرینسی انٹرنیشنل بھارت کو دنیا کی سب سے کرپٹ نیشن کا اعزاز دیتی ہے دوسری طرف مودی خود کو دنیا کا بہترین لیڈر سمجھتا ہے۔

ٹرمپ نہ یہ کہہ کر حکومت بنائی تھی کہ چین امریکہ کا ڈنر کھا جاتا ہے، اور جاتے جاتے اپنا بریک فاسٹ اور لنچ بھی چین کو دے گیا۔ امریکہ کی گذشتہ تین حکومتوں نے مل کر امریکہ کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا صرف صدر ٹرمپ نے پہنچایا ہے۔

آج کل گوری بھیڑیں اپنے اندر ان کالی بھیڑوں کو تلاش کر رہی ہیں جنہوں نے امریکہ کو بیچنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ بد قسمتی سے یہ کالی بھیڑیں رنگت کی گوری ہے۔

امریکہ میں تقریباسب کچھ ہی پرائیویٹ ہے، یہاں تک کہ بڑی بندرگاہیں بھی پرائیویٹ ہیں، اور وہاں کا سٹیٹ بنک بھی پرائیوٹ ہے، اور تیل کی بڑی کمپنیاں بھی پرائیویٹ ہیں اور جنگی سامان بنانے والی بہت سی کمپنیاں بھی پرائیویٹ ہیں۔

اب تو یہ بھی خبریں گرم ہیں کہ کہیں امریکہ کے حکمران بھی تو پرائیویٹ نہیں، کسی کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس کے پیچھے روس ہے اور کسی کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس کے پیچھے چین ہے۔

بھوکا خونخوار جانور

تحریر : میاں وقار الاسلام

بھوکے خونخوار جانور کو عراق اور افغانستان کے بعد اب دو چھوٹے ملک اور چاہیں۔ مگر دنیا میں فتنہ اور فساد برپا کرکے جھوٹ کی بنیادوں پر کھڑی ہوئی عمارت اب لڑکھڑانے لگی ہے۔ اور اسے تعمیر کرنے والوں کی بوکھلاہٹ ان کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔

بے وقوف اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھتا ہے جبکہ پاگل اپنی ٹانگیں ہی کٹوا بیٹھتا ہے، بے جا مداخلت کی پالیسی امریکہ اور بھارت کا معاشی جنازہ نکال چکی ہے، مگر ابھی بل نہیں گئے۔

ٹرمپ کی طرح بائیڈن بھی امریکیوں کو سبز باغ دیکھا رہا ہے، اندر سے بائیڈن ٹرمپ سے 10 ہاتھ زیادہ جنونی ہے، امریکہ دنیا کے امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

ڈی کپلنگ سے گھناؤنا مزاق امریکیوں کے ساتھ اور کوئی نہیں ہو سکتا، پہلے چین میں فیکٹریاں لگا کر پیسہ ضائع کیا اور اب ڈی کپلنگ سے پیسہ ضائع ہوگا اور رہی سہی کثر امریکی جنگی جنون سے پوری ہو جائے گی۔

امریکہ کی صرف ایک پالیسی رہی ہے دوسروں کو لڑواتے رہو اور اپنا گھر چلاتے رہو، دنیا امریکہ پاگل پن کو اچھی طرح سمجھ چکی ہے، امریکہ کاٹھ کی ہنڈیا چڑھانے کی کوشش کر رہا ہے جو کبھی چڑھے گی نہیں۔

اس وقت دنیا جس تیزی سے ترقی کر رہی ہے، امریکہ کا کردار اس میں ایک راہزن کا ہے جو کسی بھی قیمت پر ہر ممکن ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے۔

چین کو گھیرنے کے لیے بھارت آگے بڑھا تو اسے لینے کے دینے پڑ گئے، افغانستان میں اسی طرح کا نقصان اٹھا کر پاکستان امریکہ کی گندی گیم سے پیچھے ہٹا۔

ہانگ کانگ میں امریکہ کھلی دہشتگردی کرواتا رہا یہاں تک کہ بری طرح ناکام ہوا، اب امریکہ تائیوان کو اکسانے میں لگا ہے اور پیچھے امریکہ کے اپنے حالات بے قابو ہو رہے ہیں۔

امریکہ کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے آج یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ کسی سطح پر بھی یونائیٹڈ نہیں، اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جنگی جنون بھی سر پر سوار رہے اور امن بھی قائم رہے۔

امریکہ کو لگتا تھا، جرمنی، جاپان، روس، عراق، افغانستان جیسے ممالک دنیا کے امن کے لیئے خطرہ تھے اور اب اسے لگتا ہے چین دنیا کے امن کے لیے خطرہ ہے۔ امریکہ اسلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کرتا رہا اور آخر کار خود ہی بدنام ہوا اور خود اپنی تباہی کا بھی سبب بنا۔

اسلام کو نشانہ بنانے کے بعد اب امریکہ کی اگلی پروپیگنڈہ وار چین کے خلاف ہے جو کب کی شروع ہو چکی ہے، براہ راست چین سے جیتنے میں امریکہ بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ امریکہ کی چین کے خلاف ہر پالیسی اس کے اپنی گلے پڑ رہی ہے۔ امریکہ کا مرض اور بڑھے گا جوں جوں امریکہ اپنا علاج کرے گا۔ امریکہ ابھی تک یہی سمجھتا ہے کہ ساری دنیا غلط ہے اور صرف وہ ٹھیک ہے اور اسی کو ثابت کرنے کے لیے اس کا جنگی جنون بڑھتا ہی چلا گیا، گذشتہ 20 سالوں میں امریکہ نے ثابت کیا ہے کہ وہ ہر سطح پر غلط ہے اور اسے اپنے ایک جھوٹ کو بچانے کے لیے ہزاروں جھوٹ اور بولنے پڑتے ہیں۔

ٹرمپ کی حکومت جھوٹ سے شروع ہوئی اور جھوٹ پر چلی اور جھوٹ پر ہی ختم ہوئی، بائیڈن بھی ٹرمپ کے نقشے قدم پر اپنا حکومت سفر کا آغاز کر چکا ہے، یہ ٹرمپ سے زیادہ جنونی ہے، ٹرمپ سے زیادہ جھوٹ بولے گا، اور جھوٹ سے ہی اپنی حکومت چلائے گا اور جھوٹ پر ہی اس کا خاتمہ ہونا ہے۔ امریکہ دنیا میں اپنی اہمیت کھو چکا ہے، دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے امریکہ کو دنیا میں مزید تباہی چاہیے، اور جھوٹ بولنے میں تو امریکہ پہلے ہی دنیا میں نمبر ون ہے۔

اللہ دنیا پر رحم کرے اور خاص کر کے امریکہ عوام پر رحم کرے کیوں کہ امریکہ جنگی جنون میں 3 ٹریلین ڈالر برباد کر چکا ہے اور تقریبا 6 ٹریلین ڈالر مزید برباد کرے گا چاہے اسے اپنے باقی فارچون کمپنیاں ہی کیوں نہ فروخت کرنی پڑیں۔ امریکہ اپنی غلطیوں پر نظر ثانی نہیں کرے گا، بلکہ خود بلنڈر مارتا جائے گا اور الزام یہ لگاتا رہے گا کہ سب کچھ چین کر رہا ہے۔

ہمیں انڈیا سے اتنی نفرت کیوں ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

پہلی بات تو یہ کہ ہمیں انڈیا سے نفرت ہے نہ کہ انڈینز سے بھارت سے نفرت ہے نہ کہ بھارتیوں سے۔

بہت سے شاعر، ادیب، گلوکار، فنکار، سپورٹس مین یہاں بھی کھلے دل سے پسند کیئے جاتے ہیں جیسے پاکستان کے وہاں پسند کیئے جاتے ہیں۔ امن کی آشا جیسے بہت سے بھارت کے لوگ چاہتے ہیں ویسے ہیں پاکستان کے لوگ چاہتے ہیں۔ جیسے عام عوام بھارت میں جنگ کے خلاف ہیں اسی طرح پاکستانی عوام بھی جنگ کے خلاف ہے۔

مجھے کچھ بھارت کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا، میں نے انہیں اسی طرح کا بہترین انسان پایا جیسا کہ پاکستانی دوستوں کو پایا۔ وہ بھی اسی طرح امن اور دوستی چاہتے ہیں جیسے ہم چاہتے ہیں۔

پوری دنیا میں جہاں جہاں پاکستان اور انڈین اکٹھے رہتے ہیں اکثر آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور یہ ایک فطری سی بات ہے۔ عام عوام معاشی میدان میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہے اور عام لوگ میدان جنگ میں نہیں۔

اب دوسری طرف آتے ہیں، کچھ نفرتوں کی وجوہات تاریخی ہیں، کچھ نفرتیں سیاسی ہیں، اور کچھ نفرتیں جغرافیائی ہیں۔ اور کچھ نفرتوں کا تعلق سیکورٹی سے بھی تعلق رکھتا ہے اور کچھ نفرتیں خارجہ یا پھر بین الاقوامی بھی ہیں۔

دنیا کی ہر قوم اپنے ملک سے محبت رکھتی ہے، اپنے ملک کو اپنی پہچان اور اپنی شان سمجھتی ہے اور اپنے ملک کے لئے جان بھی دینے کے لیئے تیار رہتی ہے یہ بھی ایک فطری عمل ہے۔ پاکستان اور انڈیا دونوں کی عوام میں اسی جذبے کا پایا جانا بھی فطری عمل کا حصہ ہے۔

تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو بھارت اکھنڈ بھارت کی بات کرتا ہے یعنی بھارت سے الگ ہونے والے ممالک کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ بھارت میں تقسیم ہند کو سیاہ باب کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

تقسیم ہند بھارت میں اس وجہ سے سیاہ باب ہے کیوں کہ بھارت تقسیم ہوااور پاکستان میں اس وجہ سے سیاہ باب ہو کیوں کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل نہیں کیئے گیئے اور پاکستان کا وسائل کی تقسیم پر جو حق تھا وہ بھی اسے نہیں دیا گیا۔

عام عوام شاید دونوں طرف تمام حقائق سے آگاہ نہیں اور اگر ہے بھی تو محدود حد تک۔ مگر یہی چیزیں سفارتی تعلقات کی بنیاد ہوتی ہیں۔

بڑی مچلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو کھا جانا چاہتی ہے شاید اسی لیئے بھارت نے بنگلہ دیش میں مداخلت کی اور پاکستان کو ایک نا قابل تلافی نقصان پہنچایا جس کا اعتراف بھی مودی سرکار خود بنگلہ دیش میں اپنی تقریر کے دوران کر چکی ہے۔

مگر سارا قصور بھارت کا بھی نہیں، اندرونی طور پر بھی ہم کمزور تھے اور ایک چھوٹے اور کمزور ملک کا فائدہ جیسے بھارت نے کشمیر میں لا قانونیت سے اٹھایا اسی طرح بنگلہ دیش میں بھی لا قانونیت سے انٹر نیشنل بانڈری کو پھلانگ پھر سے وہی تاریخ دوہرائی۔

بھارت صرف بنگلہ دیش تک ہی نہیں رکا، بلوچستان میں بھارت 20 سال سے صرف ایک ہی منصوبہ رکھتا ہے کہ کسی طرح بلوچستان کو پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیئے بھارت سے جو بن پڑتا ہے وہ کرتا چلا آ رہا ہے۔

سی پیک کی وجہ سے چین کے مفادات بھی بلوچستان میں شامل ہیں اور چین براہ راست بھارت کو وارن کرتا رہا ہے کہ بھارت اپنے آپ کو بلوچستان کے معاملات سے الگ رکھے مگر بھارت نے ایسا نہیں کیا اور بالآخر چین نے لداخ میں اسی ایشو پر جوابی کاروائی کی۔

انڈیا خطے میں مزید تباہی کی طرف گامزن ہے چین کا خطے میں بڑھتا ہوا اثر ورسوخ بھارت کو کسی طرح ہضم نہیں ہو رہا۔ اور اسی وجہ سے بھارت کو جہاں موقع ملتا ہے وہاں کاروائی ضرور کرتا ہے چاہے سکول کے بچوں کو ٹارگیٹ کرنا ہو، گوادر کے پی س ہوٹل یا فوجی چوکیوں کو نشانہ بنانا ہو یہی بھارت کے کھلے عزائم ہیں۔

اب جو لوگ گوادر اور سی پیک سے منسلک ہیں انہیں ایک ایک لمحے اور ایک ایک سانحے کا باخوبی علم ہے کہ بھارت نے کب کب کہاں کہاں کیا کیا اور اسی وجہ سے ان کی نفرت بھی فطری ہے۔ اور اسی طرح جو سیکیورٹی کے ادارے اور چین کی ایجنسیاں جو سی پیک اور گوادر پر دن رات کام کر رہے ہیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں وہ ہر گز ہر گز بھارتی عزائم سے غافل نہیں۔

پاکستان جب سے بنا ہے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اور بھارت جب سے بنا ہے تب سے تخریب کاری کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کر رہا۔ ظلم کی ایک وسیع داستان ہے جو بھارت نے خطے میں رقم کی ہے اور ابھی اس کے عزائم اور بھی خطرناک ہیں۔

بھارت پورے خطے کے امن کے لیئے خطرہ رہا ہے، خطرہ ہے اور خطرہ رہے گا۔

مگر کیا فائدہ خطے کے لئے خطرہ بننے کا کہ آپ خود اپنے لیئے ہی سنگین خطرہ بن جائیں۔

بھارت کی اکھنڈ بھارت پالیسی اور ہندتوا انتہا پسند نظریات کی وجہ سے بھارت کا اپنا وجود خطرے میں ہے، نہ اس سے کشمیری قابو ہوں گے نہ سکھ قابو ہو رہے ہیں نا مسلمان اور نہ ہی دیگر اقلیتیں۔

بدامنی کے کھلے نظریات نے روس کو ڈھیر کر دیا تھا، ایسے ہی نظریات امریکہ کو ڈھیر کر چکے ہیں اور بھارت تو ان بڑی طاقتوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

بھارت نے اپنے ارد گرد آگ لگائے رکھی ہے اور آج اسی آگ میں خود جھلس رہا ہے۔ امن کے لیئے دیے جلائے جاتے ہیں جنگل میں آگ نہیں لگائی جاتی۔

کمزور سے کمزور شخص بھی اپنے گھر کو بچانے کے لیئے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ ہم 74 سالوں سے جانوں کے نذرانے دیتے ہوئے نہیں تھکے اور نہ ہی کشمیری تھکے ہیں اور نہ ہی سکھ تھکیں گے۔ ظالم تھک سکتا ہے، مظلوم کبھی نہیں تھکتا اور نہ ہی فلسطینی تھکے ہیں ہمیشہ ظالم ہی تھکتا ہے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

بھارت کو یا تو خطے میں دہشت گردی کی دوکان بند کرنی پڑے گی یا پھر نئی تقسیم کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔

امریکہ کی عوام بھی چیختی رہی کہ وار آن ٹیرر کا تماشہ ختم کیا جائے مگر امریکہ نے اپنی تباہی کو گلے لگا لیا مگر اپنے اندھے نظریات ترک نہیں کیے۔ بھارت میں بھی آوازیں اٹھتی رہیں کہ ظلم اور جبر سے کام نہ لیا جائے مگر بھارت نے کسی کی نہیں سنی اور اس کا نقصان لداخ سے شروع ہو چکا ہے۔

مزید ظلم مزید تباہی۔

دعا گو ہوں کہ اللہ خطے کو امن کا گہوارہ بنائے اور ظالموں کو عقل کے ناخون دے۔ آمین میاں وقار الاسلام

فہرست مضامین

	ذہنی اور نفسیاتی	
1	کوئی ولی تھا	669
2	بیٹیاں بیٹیاں نہیں ہوتیں	675
3	ماں کے حوالے سے	679
4	فیملی مین	684
5	لاحاصل مہربان	686
6	سچ سکون، جھوٹ بے چینی	690
7	عکس بر عکس	691
8	اندھی نفرت	695
9	ماہی گیری رویہ	698
10	نیک گمان اور بد گمان	700
11	زندگی کے دو پلڑے	702
12	آخر یہ باتھ روم فلاسفی کیا ہے	704
13	کیا ہم اپنا قتل خود کر رہے ہیں	706
14	اپنا گریبان	710
15	اوور پیمپر	714
16	مجھے لگا	716
17	رسمِ گناہ	717
18	مقدس گائے	720
19	نفسیاتی جنگ اور سوشل میڈیا	722
20	مثبت پہلو، منفی پہلو	725
21	ضرورت سے بہترین موٹیویشن کوئی نہیں	728
22	خوف جان لیوا بیماری	731
23	بڑا دماغ، چھوٹی سوچ	734
24	آدھی ادھوری عیدیں	736

25	گھگھو گھوڑے	739
26	ذہنی کمزوری	742
27	اچھے، برے اور میسنے لوگ	744
28	اندھے کو راستہ	746
29	بند گلیاں	748
30	میرا کتا، کتا تمہارا کتا ٹومی	750
31	ایک کی ٹوپی دوسرے کے سر	753
32	بدگمانی شیطان کی کھلی پیروی ہے	755
33	دماغی لاک ڈاؤن	757
34	تلخ ہے مگر حقیقت ہے	759
35	نمائندہ تصویریں	761
36	پھٹ پڑنا	763
37	مائینڈ یور پوسٹ	765
38	چھوٹی سوچ	768
39	مشورہ	769
40	کس کس بات کو روئیں	771
41	عظیم لوگ	774
42	معلوماتی آلودگی	776

کوئی ولی تھا

تحریر : میاں وقار الاسلام

زندگی کتنی تیزی سے گزر جاتی ہے،

ہم کتنے قیمتی لوگ کھو دیتے ہیں۔

جب وہ پاس ہوتے ہیں تو ان کی قیمت کا اندازہ نہیں لگا پاتے

اور جب دور چلے جاتے ہیں تو ہم گزرے وقت کو سوچتے ہیں

کہ کاش ان کے ساتھ تھوڑا اور وقت گزارا ہوتا،

ان کی اور باتیں سنی ہوتیں انہیں اور محسوس کیا ہوتا۔

مگر وقت اپنا صفحہ بدل چکا ہوتا ہے اور زندگی کی کہانی اور موڑ لے لیتی ہے۔

کتنے ہی موڑ ہماری زندگی میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں،

اور پھر ایک وقت آتا ہے،

جب ہم زندگی کے آخری موڑ پر کھڑے ہوتے ہیں۔

ہم عجیب ہیں،

ہم اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں

جن سے ہماری زندگی کا خوشگوار پہلو منسلک ہی نہیں ہوتا،

ہم دشمنوں کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں،

ہم تکلیف دہ پہلوں کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔

ہم ایسے راستے اور ایسے لوگوں کا تعین نہیں کرتے
جن راستوں پر چل کر یا جن لوگوں کے ساتھ وقت گزار کر
ہماری زندگی زیادہ بامعانی اور زیادہ پر مسرت ہو سکتی ہے۔

زندگی اتنی تکلیف دہ نہیں،
جتنا تکلیف دہ اسے ہم خود بناتے ہیں

ہم کانٹے چنتے ہیں،
ہم زخم کریدتے ہیں،
ہم پھول کی طرف نہیں دیکھتے
ہم مرہم نہیں بنتے۔

ہم دکھ نہیں بانٹتے، ہم غم گسار نہیں بنتے،
ہم اس دنیا میں مصنوعی چیزیں ڈھونڈتے ہیں،
ہم اس دنیا کی حقیقت کو نہیں سمجھتے،
ہم نعمتوں کا شمار نہیں کرتے،
ہم نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے،
ہمیں جو ملتا ہے ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔

ہم خوشگوار زندگی گزارنے کے لیئے بہت محنت کرتے ہیں،

اتنی محنت کہ ہم اپنے کل کے لیئے اپنے آج کا سودا کرتے ہیں،

اور یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑتا ہے،

کل کبھی نہیں آتا اور ہم اپنا آج بھی کھو دیتے ہیں۔

اچھے کل کے لیئے ہمیں اپنا آج بہتر کرنا ہے،

جیسا ہمارا آج ہوگا ویسا ہی کل ہمارا استقبال کرے گا،

اور اگر ہم آج کی فکر نہیں کریں گے

تو ہمارا کل بھی ہماری فکر نہیں کرے گا۔

جو ہمارے پاس آنا ہے ہمیں اس کی اتنی قدر ہے،

کہ ہم اپنا آج بھی گروی رکھ دیتے ہیں،

اور جو ہمارے پاس ہے،

اس کی قدر ہم کتنی کرتے ہیں۔

زندگی کا ہر دن قیمتی ہے،

بچپن قیمتی ہے، جوانی قیمتی ہے

بڑھاپا قیمتی ہے، زندگی کے ہر دور قیمتی ہے،

صحت قیمتی ہے، دوست قیمتی ہیں،

رشتہ دار اور قرابت والے قیمتی ہیں

اور سب سے بڑھ کر وقت قیمتی ہے

اور وقت پر کر لیئے جانے والے کام قیمتی ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ ایک دوست تھا،

ایک سچا دوست، ہمیشہ کام آنے والا،

ہمیشہ ساتھ دینے والا اور شاید سب سے قیمتی سہارا

۔۔۔۔۔ جیسے کوئی مخلص ولی تھا

نہ آندھی آئی، نہ طوفان آیا،

نہ دل دھڑکا، نہ آنکھ جھپکی

بس اچانک سے زندگی نے اسے لاپتہ کر دیا۔

موت ایسی ہی ظالم چیز ہے،

بے خبری میں آ جاتی ہے

اور آنکھوں کے سامنے

منظر غائب ہو جاتے ہیں

اور ایسے لگتا ہے جیسے پوری دنیا لٹ گئی ہو۔

زندگی کے بہترین سے بہترین تعلق

ایسے لاتعلق ہوتے ہیں کہ

سالوں تک یقین نہیں آتا

ایسا لگتا ہے کہ ہماری روح کا وزن

کسی نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا

اور اچانک سے اپنے وجود کی لاش

دوگنے وزن کے ساتھ

اپنی ہی روح پر آ گرتی ہے

اور پھر سنبھالے نہیں سنبھلتی

سائے پیچھے ہٹنے لگتے ہیں

اور سورج سر پر چمکنے لگتا ہے

پھر دھوپ ہی دھوپ

اور ایسے ولی پھر نہیں ملتے

جو سر پر سایہ کیئے رکھیں

اس سے پہلے کہ ہنستی مسکراتی زندگی

بے سہارا ہو اور اپنے ولیوں کو ترستی پھرے

اپنے ارد گرد اپنے بہترین دوستوں کی قدر کریں

ان سے رشتے مضبوط کریں

اور زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ

ضائع ہونے سے بچائیں،

اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں،

خود بھی خوش رہیں

اور دوسروں کی خوشی کی وجہ بنیں

یقین مانیں یہ دنیا خوبصورت چمن ہے

اس سے پھول چنیں

اور کانٹوں کو نظر انداز کر دیں

کانٹے سمیٹنے سے دامن چھلنی ہوتے ہیں،

جبکہ پھول سمیٹنے سے آپ کا دامن خوشبو سے بھر جاتا ہے،

اپنی تلخیاں بھی کم کرنے کی کوشش کریں

اور اپنے ارد گرد کے لوگوں میں بھی تلخیاں کم کریں۔

ہم سب نے بہت دوست کھوئے ہوں گے،

مگر جو ہیں ان کی قدر کریں

دعا گو، میاں وقار الاسلام

بیٹیاں بیٹیاں نہیں ہوتیں

بیٹیاں تو جان ہوتی ہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

اولاد اللہ تعالیٰ کا سب سے خوبصورت تحفہ ہے اور اس تحفے کی اہمیت کا اندازہ انسان کو تب تک نہیں ہوتا جب تک یہ انمول تحفہ اس کے ہاتھ میں نہیں دے دیا جاتا۔ اولاد بیٹا ہو یا بیٹی دونوں سے محبت والہانہ ہی ہوتی ہے۔ معاشرے کے بنائیے ہوئے اصولوں اور رویات کی وجہ سے یا کسی بھی دباؤ کی وجہ سے انسان اپنی سوچ کو کسی کے لیے تنگ یا کسی کے لیے کشادہ کر لے یہ ایک الگ بات ہے۔ مگر فطری تو پر اولاد تو اولاد ہی ہوتی ہے۔ پھر اولاد چاہے انسان کی ہو یا جانور کی فطری محبت ہمیں ہر جاندار جن کے جذبات سمجھنے کی ہم قدرت رکھتے ہیں ہم سمجھ سکتے ہیں۔

اب کسے بیٹیاں زیادہ پیاری ہیں اور کسے بیٹے اور اس کی کیا کیا وجوہات ہیں اس پر تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اپنے کچھ تجربات ضرور شئیر کر سکتا ہوں۔

شادی کے پانچ سال بعد جب مجھے اللہ نے بیٹا عطا کیا، تو اس وقفے کی وجہ سے اور پہلی اولاد کی وجہ سے محبت میں ایک فطری شدت تو تھی ہی مگر ایک ہی سال بعد جب بیٹی پیدا ہوئی تو محبت کی شدت نے اپنی نوعیت بدل لی۔ شاید غیر فطری طور پر جس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب مارکیٹ جاتے ہوئے میرے بیٹے نے کچھ خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ پاپا یہ چیز لے لیتے ہیں یہ مریم کو بہت پسند ہے۔

میں نے حیرانی سے پوچھا کیوں کیا تمہیں یہ پسند نہیں۔ تو میرا بیٹا جس کا نام اسماعیل ہے وہ مجھ سے کہتا ہے کہ نہیں پسند تو مجھے بھی ہے۔ پھر میں نے مزید پوچھا کہ پھر تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ مجھے پسند ہے اور لے لیں۔ تو اسماعیل نے جواب دیا کہ جو مریم کو پسند ہوتا ہے وہ آپ ضرور لے لیتے ہیں۔

اُس وقت مریم کی عمر 4 سال تھی اور اسماعیل کی عمر 5 سال تھی اور اس نے اتنی چھوٹی عمر میں یہ محسوس کر لیا کہ میری محبت بیٹی کر طرف زیادہ ہے، شاید اس بات کا مجھے سرے سے اندازہ نہیں تھا مگر بچے بہت کچھ محسوس کرتے ہیں۔ اور بچے جھوٹ بھی نہیں بولتے۔

بیٹیاں ہوتی ہی ایسی ہے، کب محبت کا کتنا حصہ لے جاتی ہیں انسان سمجھ بھی نہیں پاتا۔ شاید ایسا بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ اللہ نے بیٹیوں کے لیے ہر انسان کے دل میں ایک الگ مقام رکھا ہے اور وہ چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اب ہم غیر فطری طور پر اپنے آپ کو مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں یہ اور بات ہے۔

بیٹوں کی محبت بھی باپ سے کم نہیں ہوتی، مگر جو گرم جوشی اور ولولہ بیٹیوں کے دلوں میں ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں سے اور ان کے کام کاج سے چھلکتا ہے وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، میں جب گھر واپس آتا ہوں تو جتنے تپاک سے بیٹی کو آ کر ملتے ہوئے دیکھتا ہوں یا پھر جو خوشی بیٹی کے چہرے پر باپ کے لیے کام کرکے محسوس ہوتی نظر آتی ہے وہ بیٹوں کے چہروں پر اتنی شدت سے نظر نہیں آتی، ایسا نہیں کے بیٹے باپ سے پیار نہیں کرتے مگر بیٹیوں کے دل شاید کچھ زیادہ ہی جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

بیٹیاں بہت جلد اپنے باپ پر ڈومینیٹ کر جاتی ہیں، اپنا حق بہت جلد تسلیم کروالیتی ہیں اور بیٹوں سے ایک قدم آگے رہتی ہیں۔ سب کا تو مجھے نہیں پتا مگر میری بیٹی کو تو یہ خوب آتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب میں سعودی عرب گیا اور وہاں میرا سٹے کچھ لمبا تھا تو ایک ماہ تک تو مریم نے برداشت کر لیا کیوں کہ وہ عادی ہو چکی تھی ایک ماہ تک انتظار کرنے کی کیوں کہ کام کے سلسلے میں اتنا وقت مجھے پہلے بھی باہر لگ جاتا تھا۔ مگر جب ایک ماہ سے زیادہ وقت گزرا تو اس نے مجھ سے فون پر بات کرنا چھوڑ دیا، کیوں کہ یہ اس کی برداشت کا آخری پڑاؤ تھا اور مجھے کہتی ہے کہ بات کرنی ہے تو گھر واپس آ کر کریں۔ اتنا ہی وقت اسماعیل کو بھی ہو چکا تھا مگر دونوں کی محبت کی شدت کا فرق بہت محسوس ہوا بیٹیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے اس کے لیے کچھ تحفے وغیرہ بھجوائے اور اسے راضی کرکے پھر بات کرنا شروع کی۔

بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتیں ہیں جہاں آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ بیٹیوں کے دل میں آپ کی جان بسی ہوتی ہے۔ مریم کو تو اکثر بخار بھی ہو جاتا تھا، کھانا بھی چھوڑ دیتی تھی، فطری تڑپ تو بیٹا اور بیٹی دونوں میں ہی ہوتی ہے مگر بیٹیوں کا لگاؤ بیٹوں کی نسبت کتنا زیادہ ہوتا ہے یہ ہمیشہ باآسانی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حیرانی ہوتی ہے جب اتنے خوبصورت رشتوں کو ہم بدلے میں ناانصافی دیتے ہیں۔ یہ ناانصافی چاہے شادیوں کے معاملے میں ہو، تعلیم کے معاملے میں وراثت میں حصے کے معاملے میں ہو یا پھر لب و لہجے کے بارے میں ہو۔ یا پھر اس پھول کے بارے میں ہو جسے کھلنے سے پہلے مسل دیا جاتا ہے۔ یا پھر ان بھوکی نظروں کے بارے میں ہو جو عورت کو اپنی مستی کے سامان کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔

ہم عجیب ہیں، جو بیٹی باپ کے گھر کو جنت بنا کر رکھتی ہے، اسے جب پرائے گھر میں دبا دیا جاتا ہے تو پھر اس گھر کو کبھی بھی جنت نظیر نہیں بنایا جاسکتا۔ پھولوں کی چاشنی پھولوں کی آبیاری کرنے سے ہوتی ہے جب کہ پھولوں کے لیے ہوا، روشنی، پانی اور نرم مٹی فراہم نہ کی جائے تو پھول مرجھا جاتے ہیں اور سرسبز اور شاداب باغ بنجر بیابان کی عکاسی کرنے لگے ہیں۔

معاشرہ ہمیشہ عورت کے جسمانی خدوخال کی وجہ سے اسے کمزور یا کمتر سمجھتا ہے یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ شعور اور آگہی کی بنیاد پر عورت کو کبھی ہرایا ہی نہیں جاسکتا۔ ایک تربیت یافتہ عورت ہزار مردوں پر بھاری ہو سکتی ہے۔ بہت سی خواتین ہیں جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی یا اپنی پسند کی فیلڈ میں کوئی بھی مہارت حاصل کی تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہزاروں بچوں کو تیار کر رہی ہوتی ہے یا پھر ہزاروں مردوں کی رہنما ہوتی ہے اور اداروں کو آگے لے کر چلتی ہے۔

اگر کسی مرد کو تعلیم اور مہارت کے حصول سے دور رکھ کر جاہل ہی رہنے دیا جائے تو اس سے بھی وہی نتائج حاصل ہوں گے جو نتائج ہم عورت کو تعلیم اور مہارت کے حصول سے دور رکھ کر حاصل کرتے ہیں۔

ایک کوالیفائیڈ لیڈی ڈاکٹر ہزاروں جعلی ڈاکٹروں سے بہتر خدمات سرانجام دیتی ہے اور معاشرے اپنا مقام بھی ہزاروں جعلی ڈاکٹروں سے بہتر رکھتی ہے۔ تو جسے ہم مسئلہ بناتے ہیں یا سمجھتے ہیں وہ مرد اور عورت کا ہر گز نہیں ہے مسئلہ تو ہے ہی علم اور آگہی کا اور شعور کا جو جتنا چاہے حاصل کرلے۔ جیسے کہ اللہ تعالی کہتا ہے کہ اندھا اور آنکھ والا برابر ہیں ہو سکتے، یقینا بالکل اسی طرح۔

کمزور اور لاچار انسان ہر میدان میں نشانہ بنتا ہے دہاتیوں کو شہریوں میں کوئی نہیں پوچھتا اور شہریوں کو بڑے شہروں میں کوئی نہیں پوچھتا مگر جو خود اعتمادی حاصل کرلے علم اور شعور حاصل کرلے اس کے لیے مشکلیں آسان سے آسان ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے چاہے دنیا کا کوئی بھی حصہ ہو دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر بکرا ہو یا بکری وہ تو پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ موقع پا کر حلال کر دیئے جائیں۔

یہ ضروری ہے کہ عورتوں کے پاؤں بھی ویسے ہی مضبوط کیے جائیں جیسے کہ ہم مردوں کے پاؤں مضبوط کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ عورتوں کی بھی ویسے ہی حوصلہ افزائی کی جائے جیسے ہم مردوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ تعلیم اور تربیت کے جو مواقع مرد کو ملتے ہیں وہی عورت کو بھی دیئے جائیں اور پیچھے اگر فرق کسی چیز کا رہ جائے تو وہ قابلیت، مہارت اور تعلیم کم سے کم یہ انسان کا بنیادی حق کے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔

آج بھی معاشرے میں عورت کو ذمہ داری اور مرد کو ایسٹ سمجھا جاتا ہے۔ مگر بہت سی عورتوں نے مشکل حالات میں ثابت کیا ہے کہ وہ خاندان کا ایسٹ بن سکتی ہے۔ جب ہم شروع سے ہی عورت کو ذمہ داری سمجھ کر اسے تعلیم اور آگہی دیں گے تو آگے چل اس نے معاشرے کا ایسٹ کیسے بننا ہے یا پھر گھر کا ہی ایسٹ، ہم عورت کو ذمہ داری بنا کر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ظلم یہ کہ اکثر یہ ذمہ داری مشکل حالات میں عورت کے ہی سر ڈال دی جاتی ہے۔ پہلے بھی ظلم اور اس کے بعد بھی ظلم اور اس کے بعد نشانہ بھی اسے بنایا جاتا ہے کہ اگر یہ عورت ٹھیک ہوتی تو بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔

اگر مرد کو سوچ ٹھیک ہو جائے تو عورت مسائل نہیں وسائل پیدا کر سکتی ہے جیسے کہ دنیا میں عورتیں ہر میدان میں اپنے آپ کو منوا رہی ہیں اور بہترین انٹلیکچول وسائل کا متبادل ہیں۔

معاشرے میں روایات کا جو تسلسل ہے وہ اکیلے مرد کا بنایا ہوا نہیں ہے عورتیں بھی اس کی برابر حصے دار ہیں جس کے وجہ سے نہ مرد بدل سکتا ہے نہ عورت بدل سکتی ہے اور دونوں ہی معاشرے کی چکی میں پستے رہتے ہیں، ہمیں بہت سے ڈر ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بہت زیادہ ٹوٹ جانے کے بعد جب کوئی رستہ ہی باقی نہیں رہتا تب کہیں جا کر رواج کا سامنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تب کچھ حاصل نہیں ہوتا اور مشکلیں اتنی بڑی ہو کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں کے ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

ہم صرف ایک چیز کر سکتے ہیں، ماحول پیدا کریں، ماں کے لیے ماحول پیدا کریں، بیٹی کے لیے ماحول پیدا کریں، بہن کے لیے ماحول پیدا کریں بیوی کے لیے ماحول پیدا کریں اور خاندان کی عورتوں کے لیے ماحول پیدا کریں کہ تھوڑا ہو یا زیادہ جتنا ہو سکے علم حاصل کریں اور جتنا ہو سکے اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں۔ اور مردوں کو چاہیے کہ اپنی آخرت خراب نہ کریں اور نہ ہی اپنی دنیا خراب کریں جہاں جہاں جتنا جتنا عورت کا حق ہے اگر اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تو جتنا ہو سکتا ہے اتنا اسے حق ضرور دیں۔

آخرت میں جس طرح نماز کا، روزے کا، ایمان کا اور باقی چیزوں کا حساب ہونا ہے بالکل اسی طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی پوچھا جائیے گا۔ پھر بھی اگر کچھ نہیں دے سکتے تو کم سے کم اُسے وہ عزت تو دیں جس کی وہ حقدار ہے۔

اگر روش بدلی جائے تو یقیناً معاشرے کی شکل وہ نہیں ہو گی جو ہم آج دیکھتے ہیں اللہ سے ہدایت مانگیں کہ ہم ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکیں جس میں ہمارے انفرادی سلوک کی وجہ سے عورت کو اپنے کمتر ہونے کا احساس نہ ہو، دعا گو میاں وقار الاسلام

ماں کے حوالے سے اتنی خوبصورت تحریر کم ہی پڑھنے کو ملتی ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

==========

باقر بلال حسین صاحب کی تحریر۔۔۔۔۔شکریہ کے ساتھ

==========

اپنے تمام دوستوں سے اپنی بچپن کی وہ تقریر شئیر کر رہا ہوں جس کے ایک ایک لفظ کا معنی آج پتہ چلا جب سَر سے سائیبان اُٹھ گیا۔ "لفظ ماں"
"جِس سے محبت کا پیمانہ اللہ تعالیٰ کو بھی استعار اًلینا پڑا۔

جب بھی کشتی میری سیلاب میں آجاتی ہے
ماں دعا کرتی ہوئی میرے خواب میں آجاتی ہے

۔میری اَن پڑھ ماں میری یونیورسٹی تھی
۔میری غریب ماں میری جاگیر تھی
۔میری گُمنام ماں میرا نام ونشان تھی
۔وہ ایٹی کیٹس کے لفظ سے آشنا نہیں تھی لیکن حسنِ خُلق کا مُجسمہ تھی
۔وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی لیکن درسِ شفقت خوب اَزبَر تھا
۔میں نے اکثر اُس کے تَن پہ پیوند لگا کپڑا دیکھا لیکن اُس کا رشتہ مُحبت بے گراں تھا
۔اُس کی گرد آلود جُوتی کی قدر و قیمت آج معلوم ہوئی جَب سے فرمارواؤں کے تاج دیکھنے کا موقع مِلا
اُس کا جُھریوں بھرا چہرہ آج بے اِختیار یاد آتا ہے جَب سے زمانے کا مکروہ چہرہ دیکھا

تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں گے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

سر سید مرحوم سے کسی نے کہا تھا کہ آپ اپنا حاصلِ حیات بیان کریں تو اُنہوں نے فرمایا تھا کہ

طفلی و دامان مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم و سر گرداں شدیم۔۔۔

ترجمہ۔

بچپن کی عمر اور ماں کی گود ہی حقیقی بہشت تھی ورنہ جب سے اپنے پاؤں سے گھومنا پھرنا سیکھا ہے تب سے سر چکرا رہا ہوں

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

کنول کا پھول بہت شفاف ہے مگر ماں کا آئینہ دِل اِس سے کہیں زیادہ شفاف ہے

چاند کی چاندنی بڑی خُنک ہے ماں کی گود کہیں زیادہ پُر سکون ہے

اور نسیمِ سحر کا پُر لُطف جھونکا اپنی جگہ ماں کے دامن کی ہوا کا مقابلہ ممکن ہی نہیں۔

اس طرح میرے گناہوں کو وہ دھو دیتی تھی

ماں بہت غصے میں ہوتی تھی تو رو دیتی تھی

ماں کا دل اُداس ہو تو جنت کے شگوفے مُرجھانے لگتے ہیں۔""

ماں دامن پھیلا دے تو خدا دُنیا کی ساری نعمتیں اِس میں اُنڈیل دیتا ہے

ماں بچے پر اپنا میلا آنچل ڈال دے تو رحمتِ خداوندی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے

اور اگر اِسی ماں کی نِگاہیں قہر آلود ہو تو عَرشِ اِلٰہی تھر تھر کانپنے لگتا ہے

ماں کے بَدلے اے ارض و سمٰوات کے مالک

دے تُو ساری خُدائی تو بھی میں لے نہیں سکتا

مِل سکتی ہے ہر چیز تیرے دَر سے لیکن

اِک ماں کا بَدل تو بھی مُجھے دے نہیں سکتا

==========

دعا کرتا ہوں کہ

اللہ انہیں صبر جمیل عطا کرے

اور ان کی والدہ کی مغفرت کرے

اور ان کے کے درجات بلند کرے

==========

اتنے خوبصورت نوٹ کے بعد کچھ لکھنے کی

گنجائش تو نہیں رہتی پھر بھی

کچھ ضرور کہنا چاہوں گا

جو ماں اپنی سانسوں سے
ہماری زندگی لکھ دیتی ہے
آخر اس ہستی کے بارے میں
کیا لکھا جا سکتا ہے۔

ماں کے بارے میں
جتنا بھی لکھا جائے
کمی رہ جاتی ہے

یاقوت جیسے الفاظ تلاش کئے جائیں
پھر کہیں سے چاندی جیسا قلم لایا جائے
پھر سونے جیسے کاغذ پر سب لکھا جائے
تب بھی بہت ماں کی تعریف میں
کمی رہ جاتی ہے۔

مائیں جان سے بڑھ کر عزیز ہوتی ہیں
انہیں صرف جان لکھنے سے بھی
کمی رہ جاتی ہے۔

مائیں کل کائینات سے بڑھ کر ہوتیں ہیں
انہیں صرف کائینات لکھنے سے بھی

کمی رہ جاتی ہے۔

جب کے پاس مائیں موجود ہیں
وہ ماں کی قیمت سمجھ نہیں سکتے

اور جن کے پاس مائیں نہیں ہیں
وہ اس کی قیمت سمجھا نہیں پاتے

جب ماں کا ذکر ہوتا ہے تو ہمیں اپنے دل میں موجود اس کی محبت کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے یہ وسعت اس نے ہمارے دل میں اپنی پوری زندگی اپنا بے انتہا پیار نچھاور کرتے ہوئے پیدا کی ہوتی ہے۔

ہمارے دل میں محبت کی یہ وسعت ماں کی زندگی کا نچوڑ ہے، ماں کا درس ہے اور شاید ماں کا حکم بھی ہے۔ ہمیں اسی محبت کو باہر لانا ہے اور معاشرے میں بانٹنا ہے۔

ہمیں جو ماں سے محبت ملتی ہے وہ اس کی عبادت ہے اور اسی کی امانت ہے یہ محبت اسے واپس بھی ملنی چاہیے جو اس کا حق ہے اور یہ محبت آگے تقسیم بھی ہونی چاہیے جو اس کا سبق ہے اور جو اس کا حکم بھی ہے۔

ماں جیسا کوئی بھی نہیں ہوتا، ماں جیسا کوئی بھی نہیں بن سکتا، مگر ہماری شخصیت اس بات کا اظہار ضرور کرتی نظر آئے کہ ہمارے سروں پر ماں کا سایہ رہا اور ہماری رگوں میں ماں کی تعلیم دوڑتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محبت کی تعلیم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور محبت سے بڑی تعلیم کیا ہو سکتی ہے

دنیا بھر کی ماؤں کی عظمت کو سلام، ان کے لیے نہ ختم ہونے والی محبت کو سلام، میاں وقار الاسلام

فیملی مین

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہماری بد قسمتی ہے شاید کہ ہمارے فیملی سسٹمز کو یا تو دیمک چاٹ چکی ہے یا دیمک لگ چکی ہے۔انسان کی ترقی اسے سہولیات سے آراستہ تو کرتی جارہی مگر اپنے اندر ہی اندر ہر شخص کو اکیلا بھی کرتی جارہی ہے۔ خاندان کے بڑے خاندان کا ایک مکمل کمیونیکیشن سسٹم ہوا کرتے تھے۔انہیں اپنے خاندان کے گھروں کے علاوہ اپنے علاقے کے لوگوں بھی مکمل علم ہوا کرتا تھا۔آج انسان کے پاس دنیا جہاں کی معلومات ہے مگر وہ اپنے خاندان تو کیا اپنے گھر کے افراد کا بھی مکمل علم نہیں رکھتا، ہمسائیوں کے تو شاید اسے نام بھی نہ معلوم ہوں۔

خاندان کچھ خاص لوگوں کی وجہ سے خاندان رہتا ہے، یہ لوگ خاندان کے ستونوں کی طرح کام کرتے ہیں اور خاندان کا بوجھ اُٹھائے رکھتے ہیں۔ ایسے محسنوں کی وجہ سے خاندان کا رعب اور دبدبہ قائم رہتا ہے۔ایک تو ایسے لوگ بہت کم رہ گئے اور جو رہ گئے ہیں انہیں وہ عزت نہیں دی جاتی جو عزت انہیں دی جانی چاہیے تھی۔

آج جو لوگ خاندان کا وزن اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور بے غرض کوشش کرتے ہیں انہیں بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ حالانکہ انہیں کی وجہ سے خاندان آپس میں جڑا ہوتا ہے۔اگر خاندان کے لوگ کسی کو عزت دیتے ہیں تو ایک طرف تمام منافق اکھٹے ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف ان سے جڑے ہوئے بے کس اور لاچار لوگ۔ کیوں کہ ایسے لوگ بے کسوں کا سہارا بننے کی کوشش کرتے ہیں اسی لیے انہیں بے آسرا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ایسے لوگ جب اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تو خاندان یتیم ہو جاتا ہے۔

عزت ایسی چیز نہیں ہے کہ کسی جگہ پڑی ہو اور کوئی اسے اُٹھا کر اپنے گلے میں پہن لے اور عزت دار بن جائے۔انسان کو بہت سے امتحانات سے گزرانا پڑتا ہے، کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں تلخ لہجے برداشت کرنے پڑتے ہیں دل بڑا کرنا پڑتا ہے لوگوں کو وقت اور محبت دینی پڑتی ہے پھر جا کر اسے کوئی مقام حاصل ہوتا ہے۔

ایسے لوگ جو چھوٹے دلوں کے مالک ہوتے ہیں، اپنی دنیا میں مگن ہوتے ہیں، کسی کی خوشی غمی کا حصہ نہیں بنتے، اکثر لاتعلق رہتے ہیں ان کے نصیب میں صرف رونا، جلنا اور شکائیتں کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ نصیب بنانے پڑتے ہیں نصیب چھینے نہیں جاتے۔ کچھ لوگ اتنے بد نصیب ہوتے ہیں کہ ساری زندگی اپنے نصیب پر روتے رہتے ہیں اور پھر رونا ہے ان کے نصیب میں آتا ہے۔

اللہ نے کچھ لوگوں کو کچھ خاص کام کے لیے چنا ہوتا ہے، یہ بھی بڑے نصیب کی بات ہے، بہت کم لوگوں پر اس طرح کے فضل ہوتے ہیں کہ اللہ ان کے سینے لوگوں کے لیے کھول دیتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے محبت رکھ دیتا ہے ان کے دلوں میں لوگوں کے لیے محبت رکھ دیتا ہے۔ دیکھنے میں یہ لوگ عام لوگوں کی طرح ہی ہوتے ہیں مگر یہ لوگ اپنی شکل میں ایک پورا کارواں رکھتے ہیں ان لوگوں کے جانے سے ایسے لگتا ہے کہ جیسے کوئی ایک شخص نہیں گیا بلکہ پورا قافلہ ہے غائب ہو گیا ہو۔

آپ کے خاندان میں ایسے خوش نصیب لوگ ضرور ہوں گے، اور آپ نے ایسے لوگ کھوئے بھی ضرور ہوں گے، ایسے لوگوں کی قدر کریں ان لوگوں کی وزن پہاڑ کی طرح ہوتا ہے جو خاندان کی زمین کو مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں ایسے لوگوں کے جانے سے خاندانوں کا توازن بگڑ جاتا ہے اور پھر سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

ایسے لوگ جو خاندان کا ستون ہے اپن پر تنقید کرنے کی بجائے یا انہیں بے سہارا کرنے کی بجائے ان کے قدم مضبوط کریں ان جیسا بن نہیں سکتے تو ان کی مدد کرنے کی کوشش کریں اور اگر قدرت رکھیں تو ان جیسا بننے کی کوشش کریں۔ ایسی شمع بننے کا کیا فائدہ جس کی روشنی صرف اسی کے وجود کو روشن کرے اور اس کے اطراف میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ ایسی شمع بنیں جس کی روشنی دور دور تک محسوس ہو۔

اپنے لیے تو جانور بھی جی لیتے ہیں، دوسروں کے لیے جینے کی کوشش کریں، انسان کی زندگی سے انسانیت نکل جائے تو پھر حیوانت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ اور شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ سب اکیلے اکیلے مریں

دعا گو میاں وقار الاسلام

لاحاصل مہربان

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان جب پیدا ہوتا ہے، تو اس کے لیے سب سے مہربان ہستی اس کی ماں ہوتی ہے، پھر اسے جب اپنے باپ کی پہچان ہوتی ہے تو اسے اس میں بھی اپنا مہربان نظر آتا ہے، پھر اس کے بہن بھائی رشتے دار، آس پاس کے لوگ، یہاں تک کہ وہ گھر کے نوکروں سے بھی مانوس ہو جاتا ہے اور اسے اپنے بچن میں ہی ایک چھوٹی سی مہربان دنیا مل جاتی ہے۔

پھر انسان کو شعور آنے لگتا ہے اور اسے لوگوں کی زیادہ پہچان ہونا شروع ہوتی ہے، انسان کو سمجھایا جاتا ہے کہ ہر پیار کرنے والا مہربان نہیں ہوتا، انسان کچھ لوگوں سے کم قریب ہوتا ہے اور کچھ لوگوں سے زیادہ قریب ہوتا اور یوں اس کے مہربان بانٹ دیے جاتے ہیں۔ پھر انسان کو سکول بھیج دیا جاتا ہے، وہاں اسے مہربان اساتذہ ملتے ہیں، مہربان دوست ملتے ہیں اور اسے ایک اور چھوٹی سی دنیا مل جاتی ہے، بہت سے اساتذہ اور بہت سے دوستوں کے درمیان بھی انسان کو بہت جلد یہ فرق محسوس ہونے لگتا ہے کہ کون اس پر زیادہ مہربان ہے اور کون اس پر کم مہربان ہے۔

وقت گزرتا چلا جاتا ہے انسان میں مذید شعور بیدار ہوتا ہے تو انسان اپنے فیصلوں پر غور کرتا ہے، کہ جو اسے زیادہ ڈانٹتے تھے وہ اس کے زیادہ مہربان تھے اور جو اسے کم ڈانٹتے تھے یا غلط ترغیب دیتے تھے، یا اکساتے تھے وہ اس کے کم مہربان تھے بلکہ ان میں سے تو کچھ اس کے دشمن بھی تھے جنہیں وہ ہمیشہ مہربان سمجھتا رہا۔ یوں تقسیم کا مزید سلسلہ جاری رہتا ہے اور انسان کے مہربان محدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پھر انسان اپنی تعلیم مکمل کرتا ہے اور اپنے لیے روزگار تلاش کرنے نکلتا ہے، یا نوکری کرتا ہے، یا پھر اپنا کوئی کاروبار کرتا ہے، یہاں بھی اسے اپنا پہلا مالک، یا کاروبار میں معاون شروع شروع کے لوگ اپنے محسن نظر آتے ہیں اور وہ انہیں اپنا مہربان سمجھنے لگتا ہے۔ مگر بہت جلد اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ لوگ مہربان کم ہی ہوتے ہیں اور اپنے مفاد کو سب سے پہلے ترجیح دیتے ہیں۔ بہت سے انسان جن پر دنیا کا رنگ چڑھنے لگتا ہے اسی طرح وہ بھی اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان اپنے رشتوں اور اپنے دوستوں کو مفاد پر تولنے لگتا ہے، ان لوگوں کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جن سے اسے مالی فائدہ ہو اور ان لوگوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے جن سے اسے کچھ خاص فائدہ نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس کے پاس ماں باپ اور بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کے لیے بھی وقت کی کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔

مہربان وقت بھی ہمیشہ مہربان نہیں رہتا، یہ بہت سے مہربانوں کو ہم سے دور کر دیتا ہے، انسان جن ہاتھوں میں پرورش پاتا ہے جن کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتا ہے، جو اسے بولنا سیکھاتے ہیں، یا جو اساتذہ اسے پڑھنا سیکھاتے ہیں، یا جو انسان کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے رہنما رہے ہوتے ہیں، وہ ایک ایک کرکے جانے لگتے ہیں، انسان جو غموں سے آشنا نہیں تھا اس کی غموں سے آشنائی شروع ہو جاتی ہے، بہت سے قریبی رشتہ دار اس کی زندگی سے غائب ہو جاتے ہیں، بہت سے دوست جیتے جی اس سے دور ہو جاتے ہیں، اور بہت سے چاہنے والے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ تو انسان کے اندر ایک اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس کا کوئی مہربان ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

انسان جب اپنے بہت ہی قریبی لوگوں سے لاتعلق ہوتا ہے، یا پھر انہیں کھو دیتا ہے، یا پھر انہیں پا نہیں سکتا تو دکھوں اور غموں کا ایک سلسلہ اس کے اندر جنم لیتا ہے، کوئی اپنے حبیب کو یاد کرکے روتا ہے، کوئی اس کی جدائی میں شاعری کرتا ہے، کوئی اس کی تصویریں بناتا ہے، کوئی اس کے لیے تاج محل بناتا ہے اور کوئی خود غم کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک سے ایک غم کا پہاڑ انسان کے سر پر ٹوٹتا ہے، کسی کی ماں چلی جاتی ہے، کسی کا باپ چلا جاتا ہے، کسی کے بھائی اور بہن اس کے ساتھ نہیں رہتے اور کسی کے رشتے ناتے جیتے جی بے وفا ہو جاتے ہیں یا پھر بے نام ہو جاتے ہیں۔

انسان جنہیں مہربان سمجھتا تھا، وہ تمام مہربان یا تو وفات پا گئے، یا بے وفائی کر گئے، یا اپنا مطلب پورا ہوتے ہی الگ ہو گئے، یا انسان کی اپنی مطلب پرستی نے انہیں کھا لیا، اور یوں انسان اکیلا ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر تنہائی اسے کھانے لگتی ہے۔ اور وہ اپنے مہربانوں کو یاد کرکے روتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس سے اس کا اکیلا پن بانٹا جائے۔ اور انسان اپنی تنہائی سے ڈرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کے اس کے ارد گرد بہت سے لوگ ہوتے ہیں، بڑی شان و شوکت ہوتی ہے مگر انسان کو اب اپنی مطلبی رفاقتوں سے الجھن ہونے لگتی ہے، اب اسے مطلبی لوگ نہیں چاہیں، اسے اپنے بچپن کے دوستوں کی طرح بے لوث دوست چاہیں، اپنے بچپن کے رشتہ داروں کی طرح ڈانٹنے والے چاہیں، اسے مہربان رشتے چاہیں، انسان بہت مضبوط ہونے کے بعد بہت کمزور ہونے لگتا ہے۔ انسان کے سامنے اس کے اپنے بچے بڑے ہو رہے ہوتے ہیں، وہ بچے جنہیں اس نے اپنے ہاتھوں میں پالا پوسا بڑا کیا ان کی چھوٹی چھوٹی ہر ضرورت کا خیال رکھا، مگر جیسے ہی وہ بڑے ہوئے وہ اپنے آپ میں مصروف ہو گئے، جن بچوں کو والدین نے مہربان بن کر دیکھا یا، ان پر شفقت کا سایہ کئے رکھا انہیں بچوں میں والدین اپنا مہربان تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بچے اچھے بھی ہوتے ہیں فرمابردار بھی ہوتے ہیں مگر جس طرح کی شفقت انہیں ماں باپ دیتے ہیں بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ اسی طرح کی شفقت اور مہربانی انہیں اپنے بچوں سے مل جائے۔ ایک طرف انسان کو اس کا بڑھاپا کھائے جا رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے اس کے کے بچوں کی خود سر جوانی کھائے جا رہی ہوتی ہے۔

جن بزرگوں کی وجہ سے گھروں میں چہل پہل تھی، میلوں کا سماں رہتا تھا، وہ اپنی کمزوری اور بڑھاپے کی وجہ سے بہت محدود ہو جاتے ہیں۔ گھروں میں پہلے جیسی چہل پہل نہیں ہوتی، جو مہربان اور دوست آتے ہیں وہ بچوں کے مہربان اور دوست ہوتے ہیں، اور بزرگوں کے جاننے

والے پہلے تو کم ہی زندہ رہ گئے ہوتے ہیں اور اگر کہیں کوئی زندہ بھی ہوتے ہیں تو وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں ویسے ہی محدود ہو جاتے ہیں جیسے وہ خود محدود ہو گئے ہوتے ہیں۔

انسان سوچتا ہے کے اسکے بہت سے رشتہ دار تھے، بہت سے تعلق دار تھے، بہت سے دوست تھے بہت سے قرابت والے تھے سب کے سب کیا ہوئے، وہ مطلب پرست کہاں گئے، کوئی مطلب پرست ہی آ جاتا، مگر نہیں، انسان جیتے جی کتنا تنہا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو ایک غیر ضروری چیز سمجھنے لگتا ہے۔

کچھ لوگ زندگی کو ایسے نہیں جیتے، جس طرح کی منظر کشی میں نے اوپر کی ہے، بلکہ کچھ لوگ شروع سے ہی ایمان لے آتے ہیں کہ ان کا مہربان لاحاصل نہیں، دنیاوی نہیں، خون کے رشتوں سے بندھا ہوا نہیں اور وقتی نہیں، ان کا مہربان صرف ایک ہی ہے، جسے کوئی مطلب نہیں، جسے کوئی غرض نہیں اور جو کسی بھی حال میں ان کا ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔ نہ ہی وہ دنیا میں انہیں اکیلا کرے گا اور نہ ہی انہیں آخرت میں اکیلا کرے گا۔

جو لوگ اپنے مالک سے، اپنے رب سے، اپنے خدا سے جڑے ہوتے ہیں، وہ دنیا میں کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ صبر اور شکر سے کام لیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا مہربان انہیں چھوڑ کر جانے والا نہیں، خود غرض نہیں، کمزور نہیں، مطلب پرست نہیں، بلکہ ان کا مہربان ہمیشہ رہنے والا ہے اور موت اور بیماری سے پاک ہے، وہ رشتہ داریوں اور تعلق داریوں سے پاک ہے، وہ مجبور نہیں، وہ محتاج نہیں، اس کی بادشاہی کبھی ختم ہونے والی نہیں، اس کا فضل اور اس کی مہربانی کبھی کم ہونے والی نہیں، ان کا مہربان ہمیشہ سننے والا ہے، ہمیشہ دیکھنے والا ہے، ہمیشہ سنبھالنے والا ہے۔

کمزور مہربانوں کے سہارے انسان نہ زیادہ دیر کھڑا رہ سکتا ہے نہ زیادہ دور تک چل سکتا ہے۔ اور اگر مہربان کمزور ہو تو انسان کا سہارا بھی کمزور ہوتا ہے، جب مہربان ٹوٹتے ہیں تو انسان بھی ٹوٹ جاتا ہے، جب مہربان مرتے ہیں تو ادھا انسان بھی مر جاتا ہے۔ تو ساتھ کس کا بہتر ہے اور سہارا کس کا اچھا ہے۔ انسان جتنا جلد اپنی اس حقیقت کو سمجھ لے اور اپنے رب کی طرف رجوع کر لے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے اور اتنا ہی اس کے لیے دنیا اور آخرت میں فائدہ مند ہے۔ باطل سہارے اور باطل مہربان انسان کو توڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کے پاس سوائے مایوسیوں کے اور کچھ نہیں بچتا، تو سہارا تو اسی کا لینا چاہیے جو لائق حمد و ثنا ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، رب کے سوا تمام مہربان لاحاصل ہیں، ہم نے اکیلے اکیلے مرنا ہے اور اکیلے اکیلے ہی اپنی قبروں سے اُٹھنا ہے اور ہم اپنے حقیقی مہربان کے سامنے اکیلے اکیلے ہی پیش ہوں گے۔ سہارا اسی کا لینا چاہیے جو آخرت میں ہمارا سہارا بن سکے۔

اے اللہ، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد مانگتے ہیں، اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹ کر آنا ہے، دعا گو میاں وقار الاسلام

سچ سکون، جھوٹ بے چینی

تحریر: میاں وقار الاسلام

پاکستان کا نام ہی بھارت کی بے چینی اور بے سکونی کے لیے کافی ہے اللہ کے ذکر سے دل سکون پاتے ہیں اور مشرک بے سکون ہی رہتا ہے۔ بھارت اپنے ہی منہ پر چپیڑیں مار کر اپنا منہ لال کر لیتا ہے اور پھر خود ہی مظلوم بن کر چپیڑوں کا الزام پاکستان پر لگا دیتا ہے۔ بھارت کی طرح اسرائیل بھی مسلمانوں پر ظلم کرتا آ رہا ہے، ممکن نہیں دو بے چین روحیں مل کر سکون پا لیں بلکہ ان کی بے چینی اور بڑھے گی۔

سچ کبھی بکواس نہیں ہوتا چاہے جتنا بھی تیکھا ہو، جھوٹ کبھی مہذب نہیں ہوتا چاہے جتنا بھی میٹھا ہو، ظلم کی بیج بونے سے امن کی فصل پیدا نہیں ہوتی بھارت اور اسرائیل جو بو رہے ہیں انشاء اللہ وہی کاٹیں گے۔ جھوٹ کو لمبا عرصہ پالنا پڑتا ہے جبکہ سچ خود پرورش پاتا ہے۔ ناپاک خون معلوم ہے کس کا ہوتا ہے جو ظالم کی رگوں میں بہتا ہے، پاک خون معلوم ہے کس کا ہوتا ہے جو ظلم کے خلاف لڑتے شہید کا ہوتا ہے۔

اگر آپ کا مال خالص ہے تو آپ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں اور اگر آپ کا مال خالص نہیں تو بغیر جھوٹ کے کبھی نہیں بکے گا۔ سچ ہی ہماری طاقت ہے اور انشاء اللہ سچ ہی غالب آئے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہمیشہ سچ بولیں چاہے ہمارے اپنے لوگوں کو برا ہی کیوں نہ لگے، کبھی جھوٹ نہ بولیں چاہے ہماری جتنی بھی پزیرائی ہو۔

اسلام کسی مذہب کے آڑے نہیں آتا، انسان کو مکمل آزادی ہے جہنم یا جنت کا رستہ اختیار کرے، باطل لاعلم ہے کہ حق دبانے سے مزید پھیلتا ہے۔ انڈیا کھوتے کو باپ بنائے یا گائے ماتا، گوبر سے بھوجن کرے یا موت سے شنان اور علاج، ہمیں بال برابر فرق نہیں پڑتا مگر اپنی حد میں رہے۔ بیل خونخوار جانور نہیں ہے مگر سیلف ڈیفینس میں وہ بھی شیر کا پیٹ پھاڑ دیتا ہے۔

نفرت پھلانا اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ایسے ہی غلط ملط کیا جاتا ہے جیسے دہشت گردی اور آزادی کی مہم کو غلط ملط کیا جاتا ہے۔ انڈیا پاکستان کے خلاف ہزاروں فلمیں بنا لے، جتنا چاہے اپنی عوام اور دنیا کو گمراہ کر لے اگر انڈیا کی یہی روش رہی کہ وہ خود بھی گمراہ رہا اور دنیا کو بھی گمراہ کرتا رہا تو پھر انشاء اللہ ایک دن پاکستان بھی ایک فلم بنائے گا جس کا نام ہوگا، غزوہء ہند، مگر یہاں فرق یہ ہوگا کہ اس فلم کی تمام فوٹیج حقیقت پر مبنی ہو گی۔

عکس بر عکس

تحریر : میاں وقار الاسلام

دنیا بھر کے میڈیا پر پیسہ لگتا ہے، ایک ایک لفظ برائے فروخت ہوتا ہے، وہی کہلوایا، سنایا اور دیکھایا جاتا ہے جس پر پیسہ لگا ہوتا ہے۔ لازمی نہیں جو زیادہ دیکھایا جارہا ہو صرف وہی سچ ہو یا جو نہیں دیکھایا جارہا وہی صرف وہی جھوٹ ہو، عکس بر عکس بھی ہو سکتا ہے۔

تیل کی جنگ کو دہشتگردی کی جنگ بنادیا گیا، اپنے لوگ مروا ہمدردی لے لی گئی، پوری دنیا کو یقین آ گیا پھر آدھی دنیا متاثر ہوئی۔ دہشتگردی کی دم پکڑ کر گھومتے رہے جس ملک کو چاہا مرغا بنا کر کھڑا کر دیا گیا اور مرغے کے پر بھی کاٹ دیے گئے اور زبان بھی کاٹ دی گئی۔

ظالم نے خود کو مظلوم ثابت کیا اور مظلوم کو ظالم ٹھہرا کر بدنام بھی کر دیا گیا اور دنیا ہاتھ باندھے تماشہ دیکھتی اور تماشہ بنتی رہی، سچ بولنے والے در در پر زلیل ہوئے، سچ بولنے والوں نے سچ بولنے کی سزائیں پائیں، جھوٹ بولنے والوں نے در در سے عزت پائی اور نوازے گئے۔ دھوکے کی شراب تھی جس کا نشہ سب پر تھا، پھر بدقسمتی کا ایک رقص تھا جس پر ساری دنیا جھومتی رہی جبکہ پاؤں تلے بے گناہوں کے لاشے تھے۔

دنیا آج بھی بے گناہوں کے لاشے اُٹھا رہی ہے اور دنیا آج بھی محصور ہے، خدا جانے یہ خاموشی کی سزا ہے، آزمائش ہے یا پھر ایک اور چال۔ دہشت گردی کو دہشت گردی ثابت کرنے کے لیے تمام وسائل استعمال کیئے گئے اور دلائل پیدا کر لیے گئے اور کوئی جھوٹ کو جھوٹ نہیں کہہ سکا۔

بعد میں جب دیکھا گیا کہ وسیع تر مفادات کس کے تھے تو سچ نے جھوٹ کے سر پر ہتھوڑا مار دیا، بولا تو کوئی نہیں پر بھولا بھی کوئی نہیں۔

امریکہ کسی بھی بڑی گیم کے لیئے اپنے 20 تیس ہزار بندے مروا سکتا ہے اس کے لیے یہ بڑی بات نہیں 11/9 دنیا نہیں بھولی، جسے دنیا ان سائیڈ جاب کے نام سے جانتی ہے۔ امریکہ نے 13 بلین ڈالر کی وار سے کچھ نہیں سیکھا، آج امریکہ کی بوکھلاہٹ 11/9 کی بوکھلاہٹ سے 10 ہاتھ زیادہ ہے اس بات کا اشارہ چائنہ کے صدر شی نے پہلے ہی کر دیا تھا کہ دنیا کو امریکہ سے خطرہ ہے۔

امریکہ کی چائنہ کو بدنام کرنے کی چال تو کامیاب نہیں ہوئی مگر چائنہ نے ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں اپنی قوم کے لیے 30 ہزار سے زیادہ وینٹیلیٹرز بنائے اور اپنے لوگوں کے کرونا کے خوفناک نقصان سے بچایا۔ چائنہ کی تمام وینٹیلیٹر بنانے والی کمپنی ایک ماہ سے 24 گھنٹے اپنی پوری کپیسٹی سے ہزاروں وینٹیلیٹرز بنا رہی ہیں نہ صرف یورپ اور دیگر ممالک کے لیئے بلکہ خود امریکہ کے لیے بھی۔ اٹلی نے چائنہ کا شکریہ ادا کی ہے کہ وہ وہاں پر 1000 وینٹیلیٹرز، اور ٹنوں کے حساب سے میڈیکل کا سامان بھیج رہا ہے اور امریکہ پولینڈ میں اپنی تاریخ کا سب سے بڑا ملٹری کا سٹاک اکھٹا کر رہا ہے۔

نیٹو کی ڈیفینڈر یورپ 2020 نامی بین الاقوامی فوجی مشقوں کا نشانہ جرمنی ہے جسے امریکہ کو جرمنی کے چائنہ سے 5 جی اور روس سے گیس کے معاہدے ہضم نہیں ہو رہے۔ یورپ دنیا کے کل جی ڈی پی کا 70 فیصد کماتا ہے اور ایشیا لگ بھگ دنیا کے جی ڈی پی کا 30 فیصد بھی نہیں کماتا، ایشیا کا امریکہ کے ہاتھ سے نکل جانا معانی نہیں رکھتا، یورپ سے فرق پڑتا ہے۔ روس براہ راست امریکہ کو وارننگ دے چکا تھا کہ اگر امریکہ نے یورپ میں میزائیل سسٹم انسٹال کیئے تو روس اس کا منہ توڑ جواب دے گا۔

امریکہ ایک دفعہ دنیا کے سامنے مظلوم بن کر دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا ہے اور یہی کرونا چاہتا ہے تاکہ امریکہ کو اس کی بڑی گیم کا رستہ مل جائے۔ امریکہ اپنی بے بسی کا ڈرامہ اس لیے بھی کرے گا تاکہ کرونا کے پیچھے اس کا چھپا ہوا ڈرامہ فاش نہ ہو۔

بظاہر تو یہ بات بھی نہیں مانی جا سکتی کہ کوئی اپنے ہی ملک کے ٹاورز کیوں گرائے گا، اپنا نقصان کیوں کرے گا اور اپنے ہی لوگوں کو کیوں مروائے گا، مگر مفادات کی گیم بڑی طاقتوں سے کچھ بھی کروالیتی اور اور لالچ اور حرص کی کوئی حد نہیں ہے۔ انڈیا بھی تو بہت سے ڈرامے کر چکا ہے اور اس کے ہر ڈرامے کا مرکزی کردار پاکستان کو ٹھہرایا جاتا ہے تاکہ دنیا میں پاکستان کو بدنام کر سکتے۔ اور انڈیا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ انڈیا کا بس چلے تو کرونا کا ملبہ بھی پاکستان پر ڈال دے۔ چائنہ پر کرونا کا ملبہ تو امریکہ اور انڈیا پہلے سے ہی ڈالنا چاہتے ہیں۔ جس کے بارے میں ٹرمپ اور مودی دونوں بات کر چکے ہیں۔ کرونا کو چائنیز وائرس اور کانگ فلو کا نام بھی دیا گیا ہے اور ابھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔

جو الزام چین پر لگائے گئے تھے چین ان سب کی نفی کر چکا ہے، نہ یہ وائرس چمگادڑ سے نکلا ہے نہ ہی جانوروں کی مارکیٹ سے اور نہ ہی لیب سے لیک ہوا ہے بلکہ یہ وہان میں امریکہ فوجیوں کی گیمز کے دوران وہاں لانچ کیا گیا اور امریکیوں کے وہاں سے نکلتے ہی پھیل گیا۔ یہ تو ہے چین کا موقف۔ اسی طرح امریکہ کا بھی ایک موقف ہے، کچھ لوگ اسے کینیڈا سے جوڑتے ہیں، کچھ انگلینڈ سے جوڑتے ہیں کچھ اسرائیل کا اس میں ہاتھ ہے یہ بھی کہتے ہیں۔ اس طرح کی ایک ہزار کہانیاں آپ کو سننے میں ملیں گی۔

دوسری طرف جرمنی کے لوگوں نے امریکہ مشقوں کے خلاف شدید احتجاج بھی کیا ہے اور مظاہرے بھی کئے ہیں اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ امریکہ کرونا کے ذریعے پہلے ہمیں کمزور کرنا چاہتا ہے اور جب ہم کمزور ہو جائیں تو پھر ہم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کا ٹارگٹ آسان ہو جائے۔

.برعکس شاید اور بہت ساری چیزیں ہوں اور بعد میں ظاہر ہوتی رہیں، لیکن کچھ چیزیں جو عکس پر ہیں وہ حوصلہ افزاء ہر گز نہیں۔

.بڑے بڑے ملک تباہی کے دہانے پر ہیں پھر ہم تو ہر لحاظ سے محدود طاقت اور محدود وسائل رکھتے ہیں، لامحدود طاقت صرف اللہ کی ہے۔ اپنے رب کو منانے کی کوشش کریں، جو جس طرح سے بھی اپنے رب کو منا رہا ہے منانے دیں اور خود بھی رب کو منائیں، وہ دلوں کے حال بہتر جانتا ہے، شاید وہ آپ کی سن لے اور ہم پر رحم کرے۔

جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی، انسانیت کو بچائیں جہاں تک ممکن ہو گھر رہیں محفوظ رہیں تاکہ دوسرے بھی محفوظ رہیں۔

کیسے سب کچھ اچھا کہہ دوں

کچھ تو یہاں پر اچھا ہو

چہرے سب کے اُجلے اُجلے

من بھی کسی کا اُجلا ہو

جھوٹ عیاں ہے ہر چہرے سے

کوئی یہاں پر سچا ہو

سوزِ محشر یوں لگتا ہے

جیسے قصہ پچھلا ہو

یہ بھی ہو سکتا ہے سورج
کل مغرب سے نکلا ہو

شاعر: میاں وقار الاسلام

تصنیف: سوز محشر

دعا گو، میاں وقار الاسلام

اندھی نفرت : اندھا پیار

تحریر : میاں وقار الاسلام

اندھی نفرت بھی انسان کو بند گلی میں جا کر چھوڑ دیتی ہے اور اسی طرح اندھا پیار بھی انسان کو بند گلی میں جا کر چھوڑ دیتا ہے۔

ہم بہت سے سیاست دانوں سے ضرورت سے زیادہ نفرت کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں صرف ان کی برائیاں ہی نظر آتی ہیں جب کہ ان کی کوئی بھی اچھائی ہمیں دیکھائی نہیں دیتی۔

ہم بہت سے سیاست دانوں سے ضرورت سے زیادہ محبت کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں صرف ان کی اچھایاں ہی نظر آتی ہیں جب کہ ان کی کوئی بھی برائی ہمیں دیکھائی نہیں دیتی۔

اگر ایسے سیاست جن سے ہم ضرورت سے زیادہ محبت کرتے ہیں اگر ان کو پھانسی پر بھی لٹکا دیئے جائیں یا پھر قیدِ مسلسل میں بھی ڈال دیے جائیں تو بھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ان سے ان کی اچھائیوں کا بدلہ لیا جا رہا ہے اور ہم کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کی پکڑ ہوئی ہے۔

اگر ایسے سیاست جن سے ہم ضرورت سے زیادہ نفرت کرتے ہیں اگر انہیں بین القوامی سطح پر شہرت ملے یا ان کے کام کو دنیا بھر میں سراہا بھی جائے تب بھی ہمیں یہی لگتا ہے ان کے پیچھے کوئی تیسری قوت کارفرما ہے یا پھر یہ کہ انہیں مصنوعی طور پر سراہا جا رہا ہے۔ یا کہ انہیں اس لیے سپوٹ کیا جا رہا ہے کہ یہ ملک دشمن ہیں یا ملک دشمن ایجنڈے پر عمل کر رہے ہیں۔

ہم طے کر لیتے ہیں کہ جن سے ہم نفرت کرتے ہیں وہ صرف نفرت کے قابل ہیں اور جن سے ہم محبت کرتے ہیں وہ محبت کے قابل ہیں۔

پھر وقت گزرتا چلا جاتا ہے، ایک تاریخ رقم ہو چکی ہوتی ہے ہماری غیر ذمہ دارانہ سوچ کی وجہ سے ملک اور قوم نے جو نقصان اٹھانے ہوتے ہیں وہ اُٹھا جا چکے ہوتے ہیں اور ہماری نوجوان نسل اپنی ادھیڑ عمری کو پہنچ چکی ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہوتے کہ ہمارے ہیرو ہمارے زیرو تھے یا پھر جن کو ہم زیرو سمجھے رہے انہیں ہیرو ماننا پڑے گا۔

ہماری رہنمائی کے لیے اداروں کا فال ہونا بہت ضروری ہے۔ کون مجرم تھا اور کس سے سیاسی انتقام لیا گیا اگر ہماری عدالتیں اپنے پلڑے ہی سیدھے نہیں رکھ پائیں گی تو پھر یہ فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن کو پکڑا جاتا ہے وہ مجرم ہیں یا پھر سیاسی انتقام کے مظلوم۔

فیصلہ چاہے جتنا بھی مضبوط اور اور چاہے جتنی بھی اصولی بنیادوں پر کیا جائے اگر اس فیصلے کی ہجت قائم نہیں کی جاتی تو ایسے فیصلے معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

جتنا حق ہمیں لوگوں سے محبت کا ہے اتنا ہی حق ہمیں لوگوں سے نفرت کا بھی ہے مگر اس کی بنیاد اصولی ہونی چاہیے۔

ذرا سوچیں کہ ہم ایسے لوگوں سے نفرت کریں جو ہمارے ملک کے مستقبل کے لیے بہتر ہوں یا پھر ایسے لوگوں سے محبت کریں جو ہمارے ملک کے مستقبل کے لیے بہتر نہ ہوں دونوں ہی صورتوں میں ہم اپنے ملک کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ ہی تو کر رہے ہیں۔

مگر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ ہم اچھے اور برے کا فیصلہ کر بھی کیسے سکتے ہیں، جن لوگوں کے بڑے مان سمان کے ساتھ لایا جاتا ہے اور ان کی خاطر خواہ آہو بھگت کی جاتی ہے انہیں ہر قسم کے پروٹوکول سے نواز جاتا ہے اور جن کے بارے میں یہ رائے بن چکی ہوتی ہے کہ یہی ہیں جنہوں نے ملک کو بہت آتے لے کر جانا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یکسر کایا ہی پلٹ دی جاتی ہے، کون سے محب وطن پر کب ملک سے دشمنی کا ٹیگ لگ جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

جب ہمارے محب وطن ہماری محبت کو کھولے عام فروخت کر رہے ہوتے ہیں ٹھیک اسی وقت ادارے حرکت میں کیوں نہیں آتے۔ کیوں سسٹم انہیں کھلی چھوٹ دیتا ہے کہ یہ اپنی من مانی کرتے جائیں اور جب سب کچھ برباد کر چکے ہوں تو پھر ان کی گرفت کی جائے۔ آخر ان کی گرفت کیوں نہ کی جاتے جنہوں نے انہیں موقع دیا انہیں سپیس دی اور ان کے سہولت کار بنے اور ساری بربادی کی بڑی وجہ بھی بنے۔

سب سے بڑے مجرم وہ سہولت کار ہیں جن کی وجہ سے ملک دشمنی ممکن ہو جاتی ہے۔ لاکھ حکومتیں بدلیں، چاہے فرشتوں کو لا کر بیٹھا دیں جب تک ادارے خود جرائم کے سہولت کار بنتے رہیں گے یہ سسٹم آگے چلنے والا نہیں۔

ایک خاندان تھا جسے چند لٹیروں نے لوٹ لیا اور اسے در در بھٹکنے کے لیے سڑکوں پر لا کھڑا کیا اور خود اسمبلیوں میں بیٹھ گئے۔ اُس خاندان نے پوری زندگی بے بسی اور لاچاری میں گزار دی کہ وقت گزرے گا اور انہیں انصاف ملے گا۔ پھر اس خاندان نے اپنے حصے کی زندگی جی لی اور اس کی ایک نسل ختم ہو گئی اور دوسری طرف چند لٹیرے تھے جن کے خاندان نے راج کیا اور انہوں نے ایک شاہانہ زندگی جی لے اس کے بعد اگر دونوں مر بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے ایسے انصاف نے جو منصفی کرنی تھی وہ تو کر لی اور جو سیاہ تاریخ رقم کی اسے وقت نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا۔ ہماری تاریخ ایسے سیاہ بابوں سے بھری پڑی ہے۔

ہم نے محبت کرنے والوں سے نفرت کر کے بھی دیکھ لی اور نفرت کرنے والوں سے محبت کر کے بھی دیکھ لی، ہماری محبت نے بھی باریاں بدلیں اور ہماری نفرت نے بھی باریاں بدلیں، کبھی ہم قریب والوں سے دور ہوئے کبھی ہم دور والوں سے قریب ہوئے مگر اس ادلے بدلے میں بدلہ کچھ بھی نہیں۔

محبت اور نفرت کا بھی ترازو ہونا چاہیے یہ اپنی جگہ پر بہت ضروری ہے، مگر انصاف کے ترازو کو برابر کیے بغیر یہ توازن برقرار رکھنا ممکن نہیں۔

دعا ہے کہ انصاف ممکن ہو تاکہ ہم اسی سے محبت کریں جو محبت کے لائق ہے اور اسی سے نفرت کریں جو نفرت کے لائق ہے اور اپنے ملک کے حق میں بہتر رائے قائم سکیں بجائے اس کے کہ محبت کی شک کی بنیادوں پر ہو اور نفرت بھی شک کر بنیادوں پر ہو اور سونے پر سہاگے والی بات یہ ہو کہ محبت بھی اندھی ہو اور نفرت بھی اندھی ہو

دعا گو، میاں وقار الاسلام

ماہی گیری رویہ

Fishing Attitude

تحریر: میاں وقار الاسلام

ماہی گیری ویسے تو بڑا باعزت پیشہ ہے مگر جب ماہی گیری پیشے کی بجائے لوگوں کے رویوں میں اس طرح سے شامل ہو جائے کہ لوگ سمندر کی طرح نظر آئیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں مچھلیاں معلوم ہوں تو ایسے رویوں میں جو بدبو پیدا ہوتی ہے وہ شاید دنیا کی کسی مچھلی منڈی میں بھی نہ ہوتی ہو۔

جس طرح ضرورت سے زیادہ پیار انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے اسی طرح ضرورت سے زیادہ تنقید بھی انسان کی شخصیت کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ تنقید کرنا جب رویوں میں شامل ہو جاتا ہے تو تباہ کن ثابت ہوتا ہے، نہ ہی ضرورت سے زیادہ تنقید کرنے والا شخص خود سکون سے رہ پاتا ہے اور نہ اس کے ارد گرد لوگ کبھی چین حاصل کر پاتے ہیں۔

پروفیشنل یا پھر نجی زندگی میں لوگ حالات کے اپنے حق میں کرنے کے لیے دوسروں کو بلاوجہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ اس طرح سب کچھ ان کے قابو میں رہے گا مگر وہ بہت جلد لوگوں پر اپنا وزن کھو دیتے ہیں اور جو کامیابیاں انہیں جلدی جلدی میں مل گئی ہوتی ہیں وہ بھی زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں۔

بہت سارے لوگ اپنے تنقیدی رویوں کے باوجود بھی بہت سی کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں، لوگوں پر حاوی بھی رہتے ہیں مگر لوگوں کے دلوں کو جیتنے میں بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ ان کی حقیقت ایسے چراغ کی طرح ہوتی ہے جو خود تو بہت روشن ہوتا ہے مگر اس کے نیچے بہت اندھیرا ہوتا ہے۔

زندگی میں کسی اچھے ساتھی یا رہبر کامل جانا کسی نعمت سے کم نہیں، ورنہ کئی اندھیرے کاٹنے کے بعد ہی رستے نظر آتے ہیں۔ اگر انسان کو تنقیدی رویوں کے درمیان پروان چڑھنا پڑے تو اسے ہر دوسرا کام اپنا من مار کر کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی بے دلی سے۔

ہم بحثیت قوم بھی بہت سے تنقیدی رویوں کا شکار ہیں جن کی ہمیں یقینا بالکل ضرورت نہیں، ہم یہ سب اس لیے کرتے ہیں کو کہ سب کرتے ہیں۔ آخر ہم سب لوگوں جیسا بننا ہی کیوں چاہتے ہیں کیا سارے لوگ اچھے ہوتے ہیں، ہر گز نہیں یا پھر ہم اچھا بننا ہی نہیں چاہتے۔

تنقید اور اصلاح میں بہت فرق ہوتا ہے تنقید دور سے کی جا سکتی ہے اصلاح کے لیے لوگوں کو قریب لانا ضروری ہے۔ ہم اصلاح کے نام پر لوگوں پر تنقید کرتے جاتے ہیں اور اپنے آپ کو لوگوں میں تنہا کر لیتے ہیں۔

پروفیشنل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لوگوں سے بہت سخت رویے سے پیش آئیں، بلکہ پروفیشنل ہونے کا مطلب ہے کہ آپ کا سلوک لوگوں کے ساتھ مثالی ہو۔ ڈاکٹر صاحبان سے مجھے اکثر ایک شکائیت رہتی ہے کہ وہ مسکرا کر بہت کم بات کرتے ہیں۔ میں اکثر اپنے ڈاکٹر دوستوں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے مریضوں سے 500 زیادہ لے لیا کریں مگر ان سے ہنس کر بات کیا کریں۔ بہت سے لوگ بد احتیاطی سے نہیں بلکہ پریشانیوں سے بیمار ہوتے ہیں ڈاکٹروں کو چاہیے کہ ان کی پریشانیوں کا بھی خیال کریں۔

نئے لکھنے والوں کو بھی بڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تنقید کرنے والے بہت سے نئے لکھنے والوں کو تو اپنے لہجوں سے مار دیتے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو نئے لکھنے والوں کو بے حد پیار دیتے ہیں توجہ دیتے ہیں، عزت دیتے ہیں اور ان کی زندگیاں سنوار دیتے ہیں۔ جنہیں بالکل لکھنا نہیں آتا وہ کچھ لوگوں کی توجہ سے بہت بڑے قلم کار بن کر ابھرتے ہیں اور اپنے آپ کو منواتے ہیں۔ بہت سے اچھے لکھنے والے بے جا تنقید کا شکار ہو جاتے ہیں، ان میں ایک بڑا قلم کار بننے کی صلاحت موجود ہوتی ہیں مگر وہ سرے سے قلم کار ہی نہیں بن پاتے۔

لوگوں کا مقدر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کسی کی تقدیر سے کھیلیں۔ اپنی منفی رویوں سے لوگوں کی زندگیوں کو تار تار مت کریں۔

اللہ کا فضل ہو تو پھر لوگوں کی محنت یوں رنگ لاتی ہے کہ ایک بے نشان کو وہ مقام عطا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے ایسے مقام کو ترستے ہیں۔

نیک گمان اور بد گمان

تحریر : میاں وقار الاسلام

اگر ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ تمہارا مسئلہ تمہارا مسئلہ ہے اور میرا مسئلہ میرا مسئلہ ہے تو دنیا آدھے مسائل یوں ہی حل ہو جائیں۔

ہم ایک دوسرے کا تجسّس کرتے ہیں اور وہ بات جاننے کی کوشش کرتے جو بات اگلا ہم سے چھپانا چاہتا ہے یا شئیر ہی نہیں کرنا چاہتا۔

پھر ہم جیسا کسی کے بارے میں گمان رکھتے ہیں اچھا یا برا ہم اسے اپنے گمان کے مطابق ہی پاتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے گمان کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔

گمان اگر نیک ہو تو برے سے برے لوگوں میں بھی ہم بہت سی ایسی نیکیاں ڈھونڈ سکتے ہیں جس کی وجہ سے ہم ایک بہتر تعلق میں رہ سکتے ہیں۔

گمان اگر بد ہو تو اچھے سے اچھے لوگوں میں بھی ہم بہت سی ایسی برائیاں ڈھونڈ سکتے ہیں جس کی وجہ سے ہم ایک بہتر تعلق ضائع کر سکتے ہیں۔

اسلام ہمیں بد گمانی سے بچانے کے لیئے بہت سی مثالیں اور حوالے دیتا ہے۔

جیسا کہ جب کوئی خبر ملے تو اس کی تحقیق ضرور کر لیا کرو ایسا ہو کہ تم اپنی نا سمجھی کی وجہ سے ایک جماعت کو نقصان پہنچا دو۔

یا پھر یہ کہ بہت زیادہ گمان نہ کیا کرو بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

پھر یہ کہ جب کسی کام کا ارادہ کرو تو انشاء اللہ کہ دیا کرو یعنی اگر اللہ نے چاہا تو کر دوں گا۔

اور ایسی بے شمار باتیں اور یہ کہ بات سیدھی اور صاف کیا کرو دلائل کے ساتھ کیا کرو اور جب وعدہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور اس کے گواہ کر لیا کرو۔

بدگمانی ایک ایسا گھوڑا ہے جس کی کوئی منزل نہیں یہ جس کے خلاف بھی دوڑتا ہے پھر دوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔

نیک گمانی صبر سکھاتی ہے اور صبر کی حدیں عبور کرتی جاتی ہے راستے جتنے بھی دھندلے ہوں نیک گمانی کی منزل بھی نیک ہی ہوتی ہے۔

زندگی کے دو پلڑے

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایک خوشیوں کا دامن

ایک غموں کی آغوش

انسان عجب مخلوق ہے، جب ایک طرح سے آزمایا جاتا ہے کہ اس پر نعمتوں کی بارش کی جاتی ہے تو خوش ہو جاتا ہے اور دوسری طرح سے آزمایا جاتا ہے کہ اس سے کچھ واپس لے لیا جاتا ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔

اللہ اپنی حکمت کے مطابق ہم پر اپنی نعمتیں اتارتا ہے جسے ہم مٹی سمجھتے رہتے ہیں وہ جب چاہے اسے سونے میں بدل دیتا ہے اور ہمیں مالا مال کر دیتا ہے اور جسے ہم سونا سمجھتے ہیں وہ اسے جب چاہے مٹی میں بدل دیتا ہے اور مالا مال لوگ کنگال ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

وقت کا بہت تیزی سے گھومتا ہے چھوٹے چھوٹے بچے نظروں کے سامنے بڑے ہو جاتے ہیں اور ہمارے بڑے دیکھتے ہی دیکھتے ضعیفی کے آخری حصے میں پہنچ جاتے ہیں۔

جان سے پیاری ماں اور جان سے پیارا باپ جن کے بغیر ہم نے کبھی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا ہوتا دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں کے سامنے یا ہماری نظروں سے دور ہمارے ہاتھوں میں یا ہمارے چند ہاتھ کے فاصلے پر ہم سے اتنے دور چلے جاتے ہیں کہ نہ ہم انہیں دوبارہ دیکھنے سننے کے قابل رہتے اور نہ ہی انہیں چھو سکتے ہیں۔ زندگی کے اہم ترین باب ہم پر بند کر دیئے جاتے ہیں۔

ہم بے بسی کے اتھ گہری تکلیف میں ڈوبے جاتے ہیں ہمارے اوپر آسمان توڑ دیئے جاتے ہیں اور زمین کھینچ لی جاتی ہے۔ ایسے بوجھ بھی ہم پر ڈال دیئے جاتے ہیں جن کے اٹھانے کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کرتے۔

زندگی اس سے بھی زیادہ ظالم ہے یہ نہ صرف بچوں سے ان کے والدین چھین سکتی ہے بلکہ والدین سے ان کے بچے بھی چھین سکتی ہے یہ بھائی بھی چھین سکتی ہے یہ بہن بھی چھین سکتے ہے یہ ایک ایک بھی چھین سکتی ہے یہ دو دو چار چار یا آٹھ آٹھ بھی چھین سکتی اور ایسے نقصانات کا سامنا کبھی بھی کہیں بھی اٹھانا پڑ سکتا ہے۔

انسان نے پانی کو پھاڑ پا کر اس کے اندر آبدوزیں چلادیں اور ہواؤں پر قابو پا کر اس میں بھی جہاز بھی آڑا دیئے، زمین میں پہاڑوں جیسی عمارتیں گاڑھ دیں اور پہاڑوں کو پیس کی مٹی مٹی کر دیا۔ فضائی سفر پر نکلا تو حد نظر سے بھی آگے چلا گیا اتنا طاقت ور انسان مگر ناتواں، لاغر اور کمزور وجود کا برائے نام مالک جس کا اختیار نہ اس کی اگلی سانس پر ہے نہ اس کی اگلی دھڑکن پر۔

اسی انسان کے سامنے زندگی ایک رنگین اور دلکش پراہن اوڑھ کر بھی آتی ہے جب اسے شگفتہ کلیوں کی طرح کھلتے ہوئے خوبصورت بچوں سے نوازا جاتا ہے دیکھتے ہی دیکھتے سونے اور ویران صحن پھولوں اور کلیوں سے بھر دیا جاتا ہے اور ہر طرف رشتوں کی بہار ہی بہار کر دی جاتی ہے۔ یہ بھی میرے رب کی قدرت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بے پناہ نعمتوں سے نوازتا ہے۔

جس طرح زندگی ایک حکم ہے اسی طرح موت بھی ایک حکم ہے اور کوئی چیز اس کے مقرر کیئے گئے اندازوں سے باہر نہیں۔

ہمیں خوشیوں اور غموں کے درمیان ایک چھوٹی سی زندگی دی جاتی پھر کڑے سے کڑے امتحان سے گزارا جاتا ہے۔

ہمیں ہر وقت تیار رہنا چاہیئے کیا پتا زندگی کب کس طرح کا امتحان لے لے۔

دعا گو ہوں کہ جب ہم پر عنایتیں کی جائیں تو ہم اترائیں ناں اور جب آزمائش ہو تو ہم ثابت قدم رہیں اور لڑکھڑائیں ناں آمین

آخر یہ باتھ روم فلاسفی کیا ہے

تحریر: میاں وقار الاسلام

کچھ لوگوں کو باتھ روم میں جاتے ہی ایک خوبصورت ڈریم ورلڈ کا احساس ہوتا ہے، انہیں لگتا ہے کہ باہر کی دنیا میں تو سوائے گندکے اور کچھ نہیں۔

کچھ لوگ باتھ روم میں جاتے ہی گنگنانے لگتے ہیں، کچھ شاعری کرنے لگتے ہیں، کچھ آئینے کے سامنے خود سے باتیں کرنے لگتے ہیں، کچھ کا ڈانس کرنے کو دل کرتا ہے، کچھ اپنی نئی تصنیف یا نئے مضمون کا عنوان ڈھونڈتے رہتے ہیں کچھ تو اپنی پسند دیدہ کتاب یا پھر اخبار یا میگزین بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔

جوں جوں ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے کچھ لوگ تو اپنا انتہائی قیمتی موبائل، ٹیب یا پھر لیپ ٹاپ بھی باتھ روم میں لے جانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

مارکیٹ میں واٹر ڈیمج کے کلیم یا پھر ریپئرینگ کے لیئے آنے والے اکثر موبائل فونز کا تعلق باتھ کے کسی واش بیسن یا پھر واٹر ٹب یا پھر کسی کموڈ میں موبائل کے سویمنگ کرنے سے ہی ہوتا ہے۔

یہ شوق عجیب و غریب ہونے کے ساتھ ساتھ وسائل رکھنے والوں کے لیے انتہائی مہنگا بھی ہے۔ مہنگا صرف نقصان ہونے کی ہی وجہ سے نہیں بلکہ جدید ترین لگژریز کی وجہ سے بھی ہے۔

جو لوگ باتھ روم کو ایک ڈریم ورلڈ سمجھتے تھے کاروباری لوگوں نے ان کے جذبات کی تسکین کے لیے اپنی معاونت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی شاید انہوں ان کے وہ خواہشات بھی پوری کر دی ہیں جو کہ انہوں نے کبھی سوچی بھی نہ ہوں۔

اسی وجہ سے آج جب گھر بنوانے لگتے ہیں تو جس قدر باتھ روم مہنگا پڑتا اس میں تو 10 بیڈ روم ہی بن جائیں۔ مثال کے طور پر سونے کا کموڈ 10 سونے کے بیڈز سے بھی مہنگا ہے بس شوق کی بات ہے

آج کل باتھ رومز میں اے سی ہونا تو معمولی بات ہے، پھر اسی باتھ روم میں غسل اور حاجت پوری کرنے کے علاوہ مکمل ڈریسنگ اور میک اپ کی سہولت بھی شامل کر دی گئی ہے۔ پانی کے گرم اور ٹھنڈا ہونے کی سہولت تو اپنی جگہ اب واٹر ٹب اور کموڈ بھی ٹیمپریچر کنٹرول آ رہے ہیں کموڈ یا ٹب میں بیٹھتے وقت کسی سردیوں میں نیم گرمی کا احساس ہو اور گرمیوں میں نیم سردی کا۔ اب تو لوگ ایل سیڈیز اور سوڈنگ لائیٹس کا انتخاب بھی باتھ روم کے لیے کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی ڈریم ورلڈ انہیں پر مسرت ماحول دیتی رہے۔

کچھ لوگ جب باتھ روم جاتے تھے تو گھنٹوں واپس نہیں آتے تھے، اب تو شائید پورا دن ہی باتھ روم میں گزر جائے۔ اسی لیئے اب ہر بیڈ روم کے ساتھ الگ الگ باتھ رومز بنتے ہیں تاکہ کسی کی مصروفیت میں خلل نہ پڑے۔ کیوں کہ کسی بھی مصروفیت میں خلل پڑنے سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی باتھ روم کے باہر کسی کی دستک سے ہوتی ہے۔ اب بندہ پتا نہیں اپنے خیالوں کی جنت میں کہاں کہاں تک جا چکا ہو، پھر باہر سے دستک سارے خواب چکنا چور کر دینے کے مترادف ہی ہوئی نا۔

بہت سے لوگوں کے لیے باتھ روم سے کریٹیو کوئی جگہ نہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ ایک اور ایشو بھی ہوتا ہے یہ جب اپنی ڈریم باتھ روم کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی حاجت اپنے باتھ روم کے علاوہ کہیں پوری بھی نہیں ہوتی۔ پھر یہ جہاں سے بھی واپس آتے ہیں گھر آتے ہی ان کی پہلی آرام گاہ بیڈ روم کی بجائے باتھ روم ہی ہوتی ہے۔ یہ گھر آتے ہی آرام سے باتھ روم جاتے ہیں اور گھنٹوں واپس نہیں آتے جب تک ان کی روح کی پوری تسکین نہ ہو جائے۔ پھر کہیں جا کر انہیں اپنے بیڈ پر سکون کی نیند آتی ہے۔

انسان بھی ناں، سکون کی تلاش میں کیا کیا نہیں کرتا مسئلہ یہ نہیں کہ انسان کو کیا پسند ہے اور کیا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی خواہشات سے اور اس کی اپنے آپ سے نزدیکی اسے دوسرے لوگوں سے کتنا دور کر دیتی ہے۔ یا پھر اس کے وقت اور پیسے کا غلط جگہ صرف ہونا اس کی ذمہ داریوں کو کس قدر نقصان پہنچاتا ہے یا پھر یہ کہ انسان کی اس طرح کی لگژریز جو اسے حقیقت کی دنیا سے دور لے جاتی ہیں جس کا عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا

ویسے باتھ رومز نے ہمیں کچھ مایہ ناز سکالر، فلاسفرز، سیاست دان، اور سائنس دان بھی فراہم کئے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے مگر جو اعلیٰ ترین نفسیاتی مرض دیے ہیں ان کا ہم کیا کریں جیسا کہ برونائی کا سلطان جس کا کموڈ ہی 24 کیرڈ گولڈ کا ہے

کیا ہم اپنا قتل خود کر رہے ہیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

رشوت دینے اور لینے والے دونوں دوزخی ہیں تو کیا ملاوٹ کرنے والے اور ملاوٹ زدہ چیزیں کھانے والے دونوں قصور وار نہیں۔ اپنی صحت کو بچانے کے لیئے جن چیزوں کا استعمال کم یا ترک کر رہے ہیں ہمارے بچوں کو بھی ان چیزوں سے اتنا ہی خطرہ ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی خطرہ نہیں ابھی بچے ہیں۔ زیادہ شیلف لائف والی اکثر چیزیں براہ راست ہماری لائف سے کھیل رہی ہیں۔

، وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ

ترجمہ : اور تمہیں جو بھی مصیبت پہنچے تو وہ تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے، [حالانکہ] اللہ بہت سے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔

[الشوری:30]

ہسپتالوں میں اگر انسیڈیٹرز نہیں لگا سکتے تو کم از کم شہروں کی آبادی سے ہی دور کر دیں کون احمق غیر محفوظ ہسپتالوں کو شہر کے بیچ بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ جتنا زہر فیکٹریاں پھیلاتی ہیں اس سے کہیں زیادہ زہر خود ہسپتال پھیلاتے ہیں کیوں کہ یہ عین شہر کے وسط میں ہوتے ہیں اس لیے ہسپتالوں کے قریب کی آبادی زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے ہوا پانی خوراک سب گندا کر دیا ہے ماحول زہریلا ہو گیا مگر ماہر ماحولیات کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے اور ڈاکٹر پیدا کریں اور ہسپتال بنائیں مریض تو ہم نے سب کو بنا دیا ہے۔

درختوں کا دم گھٹتا ہے

ابر رحمت ہاتھ میں لینے

گرد شہر کی اٹھتی ہے

ہوا کا زہریلا مادہ بھی تو

مقدس پانی میں ملتا ہے

ایک طرف تو نظریں ہیں

سورج چاند ستاروں پر

دوسری طرف یہ انسان

دیکھتا ہے نہ سنتا ہے

کمزور بچپن لاغر جوانی

قبل از وقت محتاج بڑھاپا

انسان بھی کیسا احمق ہے

حماقت پر سر دھنتا ہے

انسان نے خود تخلیق کیا

ناپاک آلودہ فضاوں کو

مرتے ہیں معصوم پرندے

درختوں کا دم گھٹتا ہے

شاعر: میاں وقار الاسلام

ہم نے اپنے لائف سٹائل برباد کر دیئے ہیں اور ہم جانتے بھی ہیں مگر ہم بجائے جم یا پارک میں جانے کے پھر وہی کرتے ہیں کہ پھر ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ کتنی بد قسمتی ہے کہ ہم غذا میں کمی ہو یا غذا میں زیادتی ہم ڈاکٹر کے پاس کی جاتے ہیں ماہر غذائیات کے پاس نہیں۔

میڈیکل سائنس دنیا کی تیسری بڑی انڈسٹری ہے، پہلے نمبر پر اسلحہ دوسرے نمبر پر تیل اور تیسرے نمبر پر میڈیسن۔ دنیا خوراک سے زیادہ دوائیاں کیوں کھاتی ہے۔ کوئی تو ہے جو کھلانا چاہتا ہے۔ لگتا ہے میڈیکل سائنس نے اتنے علاج دریافت نہیں کیئے جتنی بیماریاں دریافت کی ہیں۔

سینتھیٹک ڈرگز کی 200 سے زیادہ اقسام ہیں جو ہیروئین اور کوکین یا اسی طرح کی اور درجنوں نشہ آور ادویات میں شامل کرکے یا انہیں کے نام سے بیچی جاتی ہیں۔ سینتھیٹک ڈرگز کو انسانوں نے غیر قانونی ڈرگ لیب میں نہ صرف پیدا کیا بلکہ پوری دنیا میں باقاعدہ بزنس کے طور پر ری پروڈیوس بھی کیا۔

سینتھیٹک ڈرگز کا اثر انسان کے ذہن اور رویوں پر ہوتا ہے اور ان کا علاج بھی انتہائی مشکل ہے اور پھر آخری منزل قوما یا پھر موت۔
سینتھیٹک ڈرگز آئٹم بمب سے زیادہ تباہ کن ادویات ہیں جنہیں انسان نے اپنے ہی ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔

وائیرالوجی میڈکل سائنس کی ایک برانچ ہے جو وائیرل ہونے والی بیماریوں پر کام کرتی ہے، ایسی بیماریوں کی نہ صرف پہچان کرتی ہے بلکہ ان کے علاج بھی دریافت کرتی ہے۔

سینتھیٹک وائیرالوجی، ایک ملٹی ڈسیپلنری فیلڈ ہے جس میں نہ صرف ایسے وائیرس بنائے جاتے ہیں جو وائیرل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ان کا علاج بھی دریافت کیا جاتا ہے، یعنی خود سے مصنوعی بیماری بنانا اور پھر اس کا علاج بھی فراہم کرنا۔

ایسی تمام وائیرال بیماریاں جن کا نام بھی کبھی نہیں سنا گیا تھا، جنہیں ہر 5 سے 10 سال کے عرصے میں انسانوں پر قدرتی آفت کے طور پھر نازل کر دیا جاتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ قدرتی ہوں مگر یہ بھی عین ممکن ہے کہ انہیں کسی نہ کسی سینتھیٹک وائیرالوجی لیب سے جانی بوجھی سازش کے تحت خارج کیا گیا ہو۔

حقیقت ہے یا پھر فسانہ کنسپائیریسی تھیوری کی ایک پوری دنیا ہے جو سینتھیٹک وائیرالوجی کی لیب کو مشکوک بناتی چلی جا رہی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہونی چاہیے کہ دنیا میں اس کا سب سے بڑا منافع کمانے والا ملک کون سا ہو سکتا ہے۔ جی ہاں وہی ملک جو اپنی درجنوں فلمیں سینتھیٹک وائیرالوجی کے باقاعدہ پریکٹکل مظاہرے کرتا چلا آ رہا ہے۔

انسان جب گرتا ہے تو اس کی کوئی بھی حد نہیں، اللہ نے قران میں درست بیان کیا ہے، گویا گدھے ہیں بدک جاتے ہیں، گویا کتے ہیں ہر وقت زبان نکالے رکھتے ہیں تم انہیں کچھ دے دو تب بھی زبان نکالے رکھیں اور کچھ نہ دو تو بھی زبان نکالے رہیں، اور گویا یہ جانداروں میں سب سے بدترین مخلوق ہے۔

نیچر نے انسان کو بہت کچھ دیا ہے مگر انسان کی نیچر ایسی ہے کہ یہ نیچر کو ہی تباہ کر رہا ہے، اور نیچر میں پلنے والے جانداروں کو بھی انسانوں کی نیچر سے شدید خطرات لاحق ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی بیماری جانوروں سے انسانوں میں آتی ہے بلکہ انسان ہے ہی اتنا گندہ کہ اس کی بیماریاں جانوروں کو بھی لگ رہی ہیں۔

جانوروں نے انسان کے ڈی این اے یا جینیٹک ٹیبلز کو ڈسٹرب نہیں کیا بلکہ انسان ہے فطرت کے ساتھ بری طرح پیش آ رہا ہے۔ انسان اپنے ساتھ ہی بہت بری طرح پیش آ رہا ہے، کائنات کی باقی چیزیں تو اس کی اپنی ذات کے بعد آتی ہیں۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

جانے دردِ دل کہاں گیا، اب تو صرف دل کا درد رہ گیا ہے۔

دعا گو ہوں اللہ انسان کو واپس انسان بنا دے، یہ تو حیوانوں کو بھی پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔

اپنا گریبان

تحریر: میاں وقار الاسلام

دنیا کا سب سے آسان کام ہے دوسروں پر تنقید کرنا، اور سب سے مشکل کام ہے اپنی ذات کو کٹہرے میں لانا۔ شاید بچپن سے ہی ہم باتوں کو گول گول گمانے کے عادی ہوتے ہیں، شاید ہمیں معاشرے میں کچھ اسی طرح کا ماحول پہلے سے دستیاب ہوتا ہے۔ ایک عام سی بات کو بھی گھما کر ایسے پیش کیا جاتا ہے کہ اچھا خاصا الجبرے کا سوال بن جاتا ہے۔

جوں جوں ہم بڑے ہوتے ہیں، یا کسی میدان میں مہارت حاصل کرتے ہیں باتوں کو گھومانے کی صلاحیت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر ہم کسی کی پکڑ میں نہیں آتے۔

دکانوں پر جاتے ہیں تو دکان کا مالک جو کہ اپنی باتوں میں ماہر ہوتا ہے ہمیں گھوما پھرا کر وہی بیچنا چاہتا ہے جو ہم خریدنا نہیں چاہتے اور وہ بیچنا چاہتا ہے کیوں کہ اس جس چیز کو بیچنے میں زیادہ فائدہ ہوگا وہ وہی بیچے گا اور اسی کے بارے میں بڑی مہارت سے سارے دلائل دے گا اور بالآخر ہم پھنس جائیں گے۔

ڈاکٹر کے پاس جائیں تو وہ بھی ہمیں گھوماتا رہے گا۔ جس بیماری کا علاج اس کے بس کی بات نہیں اس پر بھی وہ آخری دم کر تجربہ کرے گا اور ناکامی کی آخری سٹیج پر آپ کو کسی متعلقہ ڈاکٹر کے پاس بھیجے گا۔ یا پھر چھوٹی سی بیماری کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا کہ آپ زیادہ دوائیں اور زیادہ ٹیسٹ اور زیادہ فیس دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

کسی وکیل کے پاس چلے جائیں تو وہ آپ کے کیس کو سلجھانے کی بجائے الجھانے میں زیادہ دلچسپی لیتا نظر آئے گا اور معمولی سا کیس بھی آپ کی آدھی زندگی عدالتوں کے چکر میں ضائع کر جائے گا۔ انصاف ملنا تو دور کی بات آپ ایک دلدل میں پھنس جائیں گے اور اسی میں وکیلوں کا فائدہ ہے۔

تھرک تھرک کر کوکنگ آئل بیچنے کے پیچھے کیا مقاصد ہو سکتے ہیں یہ شاید بتانے کی ضرورت نہیں۔ اور جو دودھ آپ کو صحت کے اصولوں کے عین مطابق کہہ کر بیچا جاتا ہے اس میں اصول تو دور کی بات سرے سے دودھ ہی نہیں ہوتا۔ غذا کے نام پر صرف کیمیائی فارمولے بیچے جاتے ہیں اور ہم کیمیائی فارمولوں کی بھاری قیمیت ادا کرتے ہیں بدقسمتی سے صحت کی صورت میں بھی۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ باتوں کو گھومانے میں صرف ہم ہی ماہر ہیں۔ نہیں جناب، جتنا ہم لوگوں کو گھمارہے ہیں اتنا ہی لوگ ہمیں گھمارہے ہیں اور اس سے زیادہ ہمارے سیاست دان ہمیں گھمارہے ہیں۔ اور پوری قوم ایک عجیب گھماؤ قوم بن چکی ہے۔

گورنمنٹ نے بجلی چوروں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا تو دیکھئے ہماری گھماؤ قوم کیا کیا کرتی نظر آتی ہے۔

ایک صاحب نے اپنا میٹر پول پر بہت اونچا کر کے لگایا اور اس کے نیچے ایک سیڑھی بھی لگادی، اور جب لین مین آتا تو اسے اسی سیڑھی اسے اوپر چڑھنے کو کہا جاتا اور جیسے ہی لین مین سیڑھی پر پاؤں رکھتا تو میٹر چل پڑتا اور جیسے ہی نیچے اترتا میٹر پھر سے بند بہت عرصے تک یہ سائنس کامیاب رہی مگر آخر بکرے کی ماں نے ایک دن پکڑے ہی جانا تھا۔

ایسے ہزاروں کام ہیں جن میں ہماری قوم کا دماغ بہت چلتا ہے، ہر محکمے میں کام چور بیٹھے ہیں، اور کام چوری میں انکا جو دماغ چلتا ہے خدا کی پناہ۔ شاید چاند پر جانے والوں کا دماغ بھی اتنا نہیں چلتا ہوگا جتنا دماغ روز نئے نئے چاند چڑھانے والوں کا دماغ چلتا ہے۔

ہمارے ہاں پیری فقیری بھی سائنسدانوں کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ دنیا جہان کی بیماریوں کے علاج ان کے پاس موجود ہیں مگر ان جیسی بیماریوں کا علاج ابھی تک سائنس بھی دریافت نہیں کر سکی اور گھماؤ قوم جتنا یقین ان فراڈیوں پر کرتی ہے اتنا کسی ڈاکٹر یا پروفیسر پر بھی نہیں کرتی۔ کیونکہ ڈاکٹروں اور پروفیسروں کو سب کچھ آتا ہے مگر ان جیسا گھومانا تو نہیں آتا۔

ہر محکمے میں دو طرح کے لوگوں کی بھرتیاں ہوتی ہیں، ایک بے چارے ہونہار اور دیانتدار اور دوسرے ان سے بھی زیادہ بچارے شاطر اور بے ایمان۔ اب ان دونوں طبقوں کے درمیان ہمیشہ جنگ رہتی ہے۔ ہونہار ہمیشہ شاطر لوگوں پر نظر رکھتے ہیں اور شاطر لوگ ہمیشہ ہونہار لوگوں پر نظر رکھتے ہیں۔

ہونہار لوگ اگر شاطر لوگوں کے خلاف سارے ثبوت اکھٹے کر بھی لیں پھر یہ شاطر لوگوں کو پھنسا نہیں سکتے بلکہ خود ہی پھنس جاتے ہیں کیوں کے جن لوگوں کے یہ سارے ثبوت پیش کئے جاتے ہیں وہ خود شاطر ہوتے ہیں اس لیے کسی ہونہار کو کبھی اوپر نہیں آنے دیتے۔

دوسری طرف شاطر لوگوں جو کہ ہونہار لوگوں پر نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں انہیں ہونہار لوگوں کی پھنسانے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی بس اتنا ہی بتانا پڑتا ہے کہ اس ہونہار سے ہمیں خطرہ ہو سکتا ہے اور بس سارے شاطر لوگ اکھٹے ہو جاتے ہیں اور ہونہار بچارہ بے وقوفوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ صدر یا وزیراعظم سیدھی بات کیوں نہیں کرتے، ہم کہتے ہیں کہ سیاست دان اور بیوروکریٹس سیدھی باتیں کیوں نہیں کرتے اور ہم کہتے ہیں کہ محکموں کے آفیسر سیدھی باتیں کیوں نہیں کرتے یا پھر ڈاکٹر، وکیل اور کاروباری طبقہ ہم سے سیدھی بات کیوں نہیں کرتا۔ مگر ہم کبھی اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے کہ ہم اپنے آپ سے بھی کبھی سیدھی بات کرتے ہیں یا نہیں۔

رشتہ داروں میں جن سے ہم سب سے زیادہ پیار سے بات کرتے ہیں ان سے ہمیں سب سے زیادہ نفرت ہوتی ہے۔ بچوں کو اور بچوں کے جذبات کو بھی ہم اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، ہم خود عورتوں کے ذریعے فیملی کی سیاست چلاتے ہیں اور جب عورتیں باغی ہو جاتی ہیں یا پھر بچے باقی ہو جاتے ہیں تو ہم خود ہی چلاتے ہیں کہ عورتیں ٹھیک نہیں یا بچے ہاتھ میں نہیں۔

ویسے یہ کسی کو ہاتھ میں یا بس میں کرنے کا کیا مقصد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جائز مقصد جو نہیں ہوگا۔ مگر ہم ہر ناجائز کام کو بڑی عقیدت سے کرتے ہیں۔ دیکھاوے کے کاموں میں ہمیں بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ ہم کسی کی مدد بھی کرتے ہیں اور لوگوں کو دیکھا کر جب کہ اول درجے کی نیکی تو ظاہری دیکھاوے کے لیے نہیں ہوتی۔

خاندان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ کمزور کو بھی اس کے حقوق ملیں اور ظلم کو ظلم کرنے سے روکا جا سکتے۔ مگر یہاں کیا ہوتا ہے۔ سب طاقتور ایک طرف ہو جاتے ہیں اور کمزور ایک طرف ایک ایک سرد جنگ۔ ہر کوئی اپنی مفاد کی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ طاقتور فیملی طاقتور فیملی سے رشتہ کرنا چاہتی ہے اور کمزور بہت سے وارثوں میں بھی لاوارث ہو جاتے ہیں۔ طاقتور کی غلطیاں غلطیاں تصور نہیں ہوتیں اور کمزور کی غلطیوں پر اسے ہمیشہ پکڑا جاتا ہے۔ جب کوئی کمزور طاقتور ہونے لگتا ہے تو دوسرے طاقتور اس کی مدد نہیں کرتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ کمزور ہی رہے۔ پھر اس طرح کے رویوں سے خاندان میں محبت کیسے فروغ پا سکتی ہے۔ ایسے رویوں سے جن میں ناانصافی اور ظلم ہو وہاں نفرتوں کے خاندان بنتے ہیں۔ رشتے خون کے نہیں بلکہ مفادات کے رہ جاتے ہیں۔

بات صرف خاندانوں کی نہیں، اگر وکیلوں اور ڈاکٹروں اور تاجروں کی یونینز کو بھی دیکھیں تو اس میں بھی اسی طرح کے دو طبقات ہیں ایک مضبوط اور ایک کمزور اور ان کے درمیاں جو باہمی ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ صرف اپنے مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے نہ کہ کسی مظلوم کی مدد کرنے کے لیے یا کسی ظالم کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے۔

ظالم کبھی اپنے گریبان میں نہیں جھانکے گا مگر مظلوم تو ظلم سہہ رہا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں قران میں ایک جگہ بیان ہوتا ہے کہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا اور اور وعدہ کرتا ہے کہ میں دشمنوں کے دلوں میں تمہارا رعب اور دبدبہ بیٹھا دوں گا۔

آج ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے، ہم اپنی سطح پر خاندانوں میں اتنے مضبوط نہیں کہ ہمارا رعب اور دبدبہ کیسی پر قائم ہو سکے کیوں کہ ذاتی مفاد کی وجہ سے ہمارے دل پھٹے ہوئے ہیں کیوں کہ ہم کیس مظلوم کی مدد نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود کو مضبوط کر کے مضبوط اور ظالم گروہ کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں، وکیلوں اور تاجروں اور مولویوں کی جماعتوں میں بھی رعب اور دبدبہ نہیں ہے جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان جماعتوں کے دل صاف نہیں یہ آپس میں اپنے اپنے مفادات کے لیے جڑے ہوئے ہیں ان کے ذاتی مفادات ان کی جمعیت کے مفادات سے زیادہ افضل ہے اس کی ان کی ہوا اکھیڑ دی جاتی ہے۔

اس بات کا نقصان ہمیں بڑی سطح پر بھی اُٹھانا پڑتا ہے، باوجود اس کے کہ ہم تعداد میں بہت زیادہ ہیں مگر ہمارے فیصلوں کی یا ہماری خواہشوں کی بین القوامی سطح پر کوئی وقعت نہیں، جیسا چاہا جاتا ہے ہمارے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ کیوں کی ہم آپس میں جو سلوک کرتے ہیں وہی ہمارے دشمنوں کے حوصلے بلند کرتا ہے اور پھر وہ بھی جو چاہتے ہیں ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔

ہمیں خود اپنے اپنے گریبان میں ضرور جھانکنا چاہیے، کہیں ہم ظالم تو نہیں، کہیں ہم ظالموں کا ساتھ تو نہیں دے رہے، کہیں ہماری وجہ سے کسی کو گول گول گھمایا تو نہیں جا رہا۔ ہم سے ایک ایک کر کے ہمارا حساب ہونا ہے، یہ عذر کے سب چور تھے یا سب گناہ گار تھے ہم پر ہمارا حساب ہلکا نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے راستے کے کانٹے خود صاف کرنا ہوں گے، اپنے حصے کی نیکی خود کرنی ہوگی، اپنے گریبان میں خود جھانکنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل اور شعور عطا کرے۔ اور جو زادِ راہ ہم آگے بھیجیں ہمیں اس پر شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

OVER PAMPER

اوور پیمپر

ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار

تحریر : میاں وقار الاسلام

فرض کریں آپ کے دو بچے ہیں، ایک بچے کو آپ دنیا جہاں کی سہولیات فراہم کریں اور دوسرے بچے کو ضروریات کے مطابق سہولیات فراہم کریں۔ اور اس طرح دونوں کی پرورش ہوتی رہے۔ ایک کی آپ ہر طرح سے خدمت کریں اور اسے واپس خدمت کرنا نہ سکھائیں اور دوسرے اپنے کام بھی خود کرنے پڑیں اور حسب ضرورت آپ کے کام بھی کرنا پڑیں اور یوں زندگی کا سفر جاری رہے۔

اب اللہ نہ کرے کہ آپ پر کوئی مشکل وقت آئے۔ پر اگر ایسا ہو تو کون آپ کہ بہتر مدد کر پائے گا وہ جسے آپ نے اوور پیمپر کیا یا وہ جسے آپ نے کم پیمپر کیا آپ میں سے اکثر یہی کہیں گے کہ جسے کم پیمپر کیا گیا وہ زیادہ مدد کرے گا مگر ایسا کیوں ہوتا ہے جسے ہم نے اوور پیمپر کیا مدد تو اس کو کرنی چاہیئے تھی۔

ہوتا یوں ہے کہ اوور پیمپر کرنے کی وجہ سے ہم نے ایک بچے کو بالکل ہی مفلوج کر دیا اب اسے کام لینا تو آتا ہے مگر کام کرنا نہیں آتا۔

ہمارے معاشرے کی اپر کلاس میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اوور پیمپر ہیں چاہیئے وہ سرکاری اداروں میں ہوں یا پھر نجی اداروں میں یا پھر وہ ہمارے انتہائی اعلی تعلیمی اداروں کے بچے ہوں اوور پیمپرینگ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اور ہمارے قومی اداروں کو ایسی بہت سی زندہ لاشیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔

ہم نے ضرورت سے زیادہ اوور پیمپر وائیٹ کالرز تو پیدا کر دیئے ہیں مگر حسب ضرورت بھی بلو کالرز پیدا نہیں کیئے۔ ہمارے ہر گریجویٹ کر بڑی ٹیبل، بڑی کار اور بڑا گھر تو چاہیئے مگر کام کرنے کی کپیسٹی تقریبا نہ ہونے کے برابر ہے۔

چائنہ کے ٹاپ کوالیفائیڈ انجینئرز یا ایگزیکیٹو ملٹی ٹاپ کام کرنے میں بالکل نہیں ہچکچاتے جبکہ ہمارے عام سے گریجویٹس میں بڑی سطح پر کام نہ کرنے کا فقدان پایا جاتا ہے۔

بہت سی کارپوریٹ ٹریننگز لائف سکیلز یا کپیسٹی بلڈنگ کے حوالے سے کروائی جاتی ہیں جن کا مقصد صرف کام کے حوالے سے رویوں کی تبدیلی اور موٹیویشن ہی ہوتا ہے۔

منفی رویئے اور موٹیویشن کا فقدان ہمارے کلچر میں موجود ہے اور ہم میں ایک دوسرے سے سرائیت کر جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سست جمع سست برابر سست

ویسے ایک اور قوم کی سستی دیکھ کر میں اپنی قوم کی سستی بھول گیا اور وہ ہے دنیا کی سب سے اوور پیمپر قوم جو بڑا عرصہ بلیک گولڈ سے نہلاتی رہی اور آج کل بلیک دور سے گذر رہی ہے اور اپنی سستیوں کے ختم کرنے کے لیئے بہت زیادہ جستیاں دیکھا رہی ہے۔

شہزادوں کا مزاج تو چلیں سمجھ میں آتا ہے مگر ہم اپنا 200 سالہ پرانا نوابی اور راجہ مہاراجہ یا پھر مغلوں والا مزاج کب بدلیں گے

مجھے لگا "بدگمانی کی پہلی سیڑھی"

تحریر: میاں وقار الاسلام

مجھے لگا " یہ ایک بڑی ہی عجیب فلاسفی ہے، بعض دفعہ لوگ اپنے اندر ایک بھیانک سی دنیا آباد کر لیتے ہیں اور عرصہ دراز خود کو اس " سے ڈراتے رہتے ہیں کہ دنیا بہت ہی خوفناک ہے۔ جب کہ یہ مصنوعی دنیا صرف ان کے اندر ہی بستی ہے اور اس کا باہر کی حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ فلاسفی لوگوں کو خود بھی پریشان رکھتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی خاصی اذیت کا باعث بنتی ہے۔

ایک ہی طرح کے حالات و واقعات کو کچھ لوگ انتہائی مثبت انداز میں لیتے ہیں کیوں کہ ان کا سارا فوکس مثبت پہلوؤں پر ہوتا ہے، جب کہ کچھ لوگ انہیں حالات و واقعات کو دوسری طرح یعنی انتہائی منفی انداز سے دیکھتے ہیں کیوں کہ ان کا سارا فوکس منفی پہلوؤں پر ہوتا ہے۔

اور کچھ اور نایاب قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر مثبت اور منفی کوئی طاقت اثر نہیں کرتی۔

بر حال " مجھے لگا " لگتا صرف اسی کو ہے جو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مثبت سوچ رکھنے والے منفی حالات میں بھی مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ منفی سوچ رکھنے والے مثبت حالات میں بھی منفی کردار ادا کرتے ہیں۔

منفی سوچ کبھی بھی مثبت شخصیت کو جنم نہیں دیتی۔ مثبت انسان بننے کے لیے سب سے پہلا قدم منفی سوچ کو دفن کرنا ہے۔

منفی سوچ ہمیشہ بدگمانی کو جنم دیتی ہے

بدگمانی ایسی بیماری ہے جو انسان کی ذاتی زندگی سے لے کر معاشرے کی اجتماعی زندگی تک بگاڑ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ بدگمانی سے مراد ایسی بات دل میں لانا ہے جس کا نہ یقین ہو اور نہ ہی اس کے متعلق دو عادل گواہ ہوں۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: ترجمہ "اے ایمان والو زیادہ تر گمانوں سے بچا کرو، بے شک بعض گمان (ایسے) گناہ ہوتے ہیں (جن پر اُخروی سزا واجب ہوتی ہے)۔" الحجرات، ۲۱: ۹۴

حضور نبی اکرم ﷺ نے درج ذیل احادیث مبارکہ میں بدگمانی کرنے کی مذمت اور ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "بدگمانی کرنے سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، ایک دوسرے کے ظاہری اور باطنی عیب "مت تلاش کرو۔

(مسلم، الصحیح، ۵۸۹۱: ۴، رقم: ۳۶۵۲)

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے خون، اس کی عزت اور اس کے متعلق بدگمانی کو حرام کر دیا ہے۔" حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے اپنے بھائی کے متعلق بدگمانی کی اس نے اپنے رب کے متعلق بدگمانی کی۔

رسم گناہ

تحریر : میاں وقار الاسلام

قرآن میں جن قوموں کی تباہی کے احوال بیان کیے گئے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح سے رسم گناہ میں شریک تھیں.. یہ گناہ اس لیے نہیں کرتی تھیں کہ گناہ ان سے ہو جاتے تھے بلکہ یہ گناہ اس لیے کرتے تھے کہ گناہ کا ان میں رواج پڑ جاتا ہے تھا. پھر انہیں گناہ کرنے سے موت نہیں پڑتی بھی بلکہ گناہ نہ کرنے سے موت پڑتی تھی باآخر یہ قومیں اتنی سرکش ہو گئیں کہ ان پر عذاب لازم ہو گیا وہی عذاب جس کے آنے سے یہ منکر تھے وہی عذاب جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے وہ عذاب جس نے انہیں نشان عبرت بنا کر چھوڑ دیا وہی عذاب جس سے ہم سب بھی غافل ہیں وہی عذاب جس کا آنا ہم پر بھی لازم ہے .

آج ہم سود اس لیے نہیں کھاتے کہ ہم سود کھانا چاہتے ہیں بلکہ ہمیں سود اس لیے کھانا پڑتا ہے کہ سود رسم گناہ بن چکا ہے اور ہم کسی نہ کسی طرح اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں .

آج ہم جھوٹ اس لیے نہیں بولتے کہ ہم جھوٹ بولنا چاہتے ہیں بلکہ ہمیں جھوٹ اس لیے بولنا پڑتا ہے کہ جھوٹ رسم گناہ بن چکا ہے اور ہم کسی نہ کسی طرح اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں .

آج ہم ملاوٹ اس لیے نہیں کرتے کہ ہم ملاوٹ کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہمیں ملاوٹ اس لیے کرنی پڑتا ہے کہ ملاوٹ رسم گناہ بن چکی ہے اور ہم کسی نہ کسی طرح اس کا حصہ بنے ہوئے ہیں .

اندھیر نگری کی اس سے بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ کرپشن بھی رسم گناہ بن چکی ہے اور کرپٹ انسان کو کرپٹ نہیں بلکہ معاشرے کا معزز ترین شخص سمجھا جاتا ہے .

تھوڑے ہوں یا زیادہ لوگوں سے ادھار لینا اور پھر مڑ کر ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرنا بد کردار کی نہیں بلکہ سمارٹ نیس کی نشانی بن گئی ہے. اور کسی پر اعتبار کر لینا اعلی کردار کی نشانی نہیں بلکہ بے وقوفی کی علامت سمجھی جاتی ہے .

جس معاشرے میں 100 روپے کا بیلنس کروانے کے لیے ایمان کی دھجیاں اڑادی جاتی ہوں اور اس طرح کے چھوٹے موٹے جھوٹ کو اس لیے استعمال کیا جائے کہ کسی کو بے وقوف بنانے یا مزاق کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہو اور اسے گناہ نہیں بلکہ انٹرٹینمنٹ سمجھا جاتا ہے تو پھر گناہ اور ثواب تو آپس میں ہی غلط ملط ہو جاتے ہیں.

ہم اپنے چہروں پر کتنے چہرے سجاتے ہیں ہم عظیم نظر آنا چاہتے ہیں مگر عظیم بننا نہیں چاہتے. کاش ہم یہ سمجھ پائیں کہ فریبی چہرے عظیم نہیں ہوتے

اللہ ہمیں اس لیے مضبوط کرتا ہے کہ ہم کمزور لوگوں کے کام آئیں مگر ہم جیسے ہی مضبوط ہوتے ہیں اپنا زور دیکھنے لگتے ہیں اور اپنے نیچے کمزور لوگوں کو اور کمزور کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان لوگوں پر ہماری مضبوطی ثابت ہو جائے پھر اللہ ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ہم کتنے کمزور ہیں مگر جب تک یہ بات ثابت ہوتی ہے ہم رسم گناہ کے شریک ہو چکے ہوتے ہیں.

یہ کیسا معاشرہ ہے جو کسی کے سر سے چادر کھینچنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتا اور کسی کے سر پر چادر ڈالنے کے لیے اتنا سوچتا ہے کہ اس کے سر پر چاندی کی چادر آ جائے. کسی کی بیٹی گھر بیٹھی رہ جائے اور بیوہ کی کوئی کفالت کرنے والا نہ ہو اور اس پر باتیں کرنے والے خاندان کا ایک قافلہ ہو تو ایسے قافلے کو لوٹنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ایک لٹا لٹایا قافلہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں یہ سب رسم گناہ کے شریک ہیں.

اگر بے کسوں کی بے کسی سے خوشحالوں کی خوشحالی بات نہیں کر سکتی تو لعنت ہے ایسے خوش حالوں کی خوشحالی پر جو انہیں دوزخ میں جا کر اتارے گی. اور ایسے بے کسوں کا اللہ ہی وارث ہے اور ایسے خوشحالوں کا شیطان وارث ہے.

ہمیں دنیا کے جس بھی ٹکڑے میں پھینکا جاتا ہے وہاں کسی نہ کسی طرح سے رسم گناہ کی دھند ضرور ہوتی ہے اور اگر یہ دھند نہ ہوتی تو ہماری طرف ہدایت کرنے والے نہ بھیجے جاتے. ہدایت کرنے والوں کو وہ نور بنا کر بھیجا گیا جو ہمیں روشنی اور آشنائی دے سکے کہ حقیقت کیا ہے جب تک وہی روشنی ہمارے دلوں کو منور نہیں کرتی ہم اسی طرح اندھے گونگے اور بہرے ہوتے ہیں جس طرح کوئی اندھا گونگا اور بہرا ہوتا ہے. جب تک یہ روشنی ہمارے دلوں تک نہیں پہنچتی ہم رسم گناہ میں شامل رہتے ہیں اور سچ کیا ہے یہ سمجھنے سے پہلے ہمیں موت آ جاتی ہے.

پھر جب پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تھا تو ہم یہی کہیں گے کہ ہم تک ہدایت بھری کتاب پہنچی تھی مگر ہم اسے پڑھنے سے پہلے ہی وفات پا گئے اور ہم لاعلم تھے کہ ہمارا رب ہم سے کیا کہنا چاہتا ہے اور لاعلمی کی سزا دوزخ ہے.

لاعلمی کی موت سے بچیں، اللہ کی دی ہوئی کتاب اور نور ہدایت سے اپنے دلوں سے لگالیں رسم گناہ کے مجرم نہ بنیں لاعلمی کا اندھیرا جہنم کا اندھیرا ہے کاش لاعلموں کو یہ علم ہوتا۔ اللہ ہمیں لاعلمی کی موت سے بچائے اور رسم گناہ کا خاموش مجرم بننے سے بھی۔

دعا گو: میاں وقار الاسلام

مقدس گائے

تحریر: میاں وقار الاسلام

بہت سی قومیں آئیں، بہت سی قوموں کی طرف امن کا پیغام بھیجا گیا، پھر انہوں نے امن کے پیغام کو پشت پیچھے ڈال دیا، اپنی عقل کا خدا بنا بیٹھے ۔

یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں مگر یہ خدا کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے تھے۔ پھر انہیں عبرت کا نشان بنا کر چھوڑ دیا گیا۔

کون کون سا عذاب ہے، جو ظالم قوموں نے نہیں دیکھا۔ یہ لوگ اتنے پتھر دل ہو جاتے تھے کہ پیغمبروں تک کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ لوگ ہدایت سے اتنے دور چلے جاتے تھے کہ ان میں بہتری کی گنجائش بھی باقی نہ رہتی تھی۔

پھر ان کی طرف عذابِ الہیٰ کی کھلی نشانیاں بھیجی جاتیں، اور یہ لوگ اس قدر ظالم تھے کہ پیغمبروں سے کہتے تھے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے وہ عذاب ہم پر لے آؤ۔

مقدس گائیں صرف مذاہب میں نہیں پائی جاتیں، بلکہ یہ ایک خاص سوچ ہے جو ہر معاشرے کے بیمار گروہ میں پائی جاتی ہے۔ بہت سے ڈاکٹر ایسے ہیں جن کا دین ایمان صرف پیسہ ہے، ان کے لیے انسان صرف پیسہ کمانے کی چیز ہے ورنہ یہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے، بہت سے وکیل اور جج ایسے ہیں جن کے ہاتھوں ناانصافی پروان چڑھتی ہے اور انسانیت روز مرتی ہے۔

پیشہ خراب نہیں ہوتا، بلکہ کسی بھی پیشے سے کمایا گیا حرام مال خراب ہوتا ہے پھر چاہے وہ ایمان کو بیچ کر یا ضمیر بیچ کر ہی کیوں نہ کمایا جائے۔ جھوٹ کا لباس کالا ہے اور سچ کا لباس سفید ہے مگر منافقت کو پہچاننے میں انسان ہمیشہ غلطی کرتا ہے کیوں کہ یہ باہر سے سچ کی طرح سفید اور اندر سے جھوٹ کی طرح کالی ہوتی ہے۔

منافق انسان ہزاروں جھوٹے انسانوں سے بدتر ہے، جھوٹا جانتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے اس لیے وہ راہِ راست پر آ سکتا ہے، منافق سمجھتا ہے کہ وہ سچا ہے، اس لیے ایسے لوگ کم ہی فلاح پاتے ہیں۔ شاید اسی لیے منافق لوگ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

جو معاشرے ایسے چلتے ہیں، کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، تو وہاں مقدس گائیں ہی بھگوان بنتی ہیں اور ان کی باقاعدہ پوجا کی جاتی ہے۔ کسی معاشرے میں جب گائے مقدس ٹھہر جائے تو پھر اس کا پیشاب بھی پاک اور اس کے گوبر میں بھی شفا۔

انسان مرتے ہیں تو مر جائیں، انسانیت رسوا ہوتی ہے تو رسوا ہوتی رہے مگر مقدس گائے کو آنچ نہیں آنی چاہیے۔

سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کبھی اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا منافقت کو سچ اور جھوٹ سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ حق کا نام لے کر باطل کی چوکھٹ پر مر جاتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ شہید لکھواتے ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ مرے کیوں تھے۔

قران پڑھیں قران پڑھیں قران پڑھیں، کسی کی رسی پکڑنے سے بہتر ہے کہ اللہ کی رسی کو پکڑیں۔ لوٹ آئیں اللہ کی طرف اور اللہ سے ہدایت کا سیدھا راستہ مانگیں۔ اے اللہ ہمیں پر امن قوم بنا، اور ہمیں ہر قسم کے فتنے اور فساد سے محفوظ فرما۔ آمین

نفسیاتی جنگ اور سوشل میڈیا

تحریر: میاں وقار الاسلام

ایک قصہ سنانا چاہوں گا، ایک کسان تھا، اس نے اپنے بچے کو پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا، بچہ کئی سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد جوان ہو چکا تھا اور اپنے گاؤں واپس گیا۔ کسان بھی اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ کسان کا بیٹا ایک دن اپنے بوڑھے کسان باپ کو بتا رہا تھا کہ ابا جی کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک مکھی کی کل کتنی آنکھیں ہوتی ہیں۔ باپ نے کہا نہیں بیٹا مجھے تو نہیں معلوم کہ مکھی کی کتنی آنکھیں ہوتی ہیں تم ہی بتا دو۔ تو بیٹے نے جواب دیا کہ مکھی کی 86 آنکھیں ہوتی ہیں۔ باپ مسکرایا اور جواب دیا بیٹا کیا فائدہ 86 آنکھوں کا وہ بیٹھتی تو پھر بھی گندگی پر ہی ہے۔

سوشل میڈیا بھی بالکل اسی طرح ہے اس کی بھی شاید 86 آنکھیں ہیں، سوشل میڈیا کی نظر وہاں تک ہے جہاں تک بڑے بڑے ٹی وی چینلز بھی نہیں جا سکتے۔ بلکہ بڑے بڑے ٹی وی چینلز کی معلومات کا بڑا حصہ سوشل میڈیا سے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر کیا فائدہ اتنے بڑے شیطانی چرخے کا جس نے ہمیشہ تخریب کاری اور بدامنی کو ہی فروغ دینا ہے۔

سب سے پہلے تو ہم دنیا کا جائزہ لیتے ہیں کہ دنیا میں کیا چل رہا ہے، ایک طرف امریکہ ہے جو چین اور روس پر الزام لگا رہا ہے کہ یہ دونوں ممالک ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے امریکیوں کی رائے تبدیل کرنے میں اثر انداز ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے امریکہ میں حقیقی قیادت سامنے نہیں آ پاتی اور انتخابات کے نتائج کچھ اور آ جاتے ہیں اور دوسری طرف امریکی عوام اور امریکی حکومت کے تعلقات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں امریکہ نے اسی معاملے کا نوٹس لیتے ہوئے روس پر پابندیاں بھی لگائی ہیں اور روسی باشندوں کو امریکہ سے نکالنے کی بھی دھمکی دی ہے۔ دوسری طرف روس نے بھی جوابی کاروائی کرنے کی دھمکی دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ جیسے کو تیسا۔ یاد رہے کہ تمام بڑی سوشل میڈیا سائیٹس امریکہ کی ہے اور ان سائیٹس کو روسی ہیکرز نے ہیک کر کے امریکہ کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔

جیسے کو تیسا، اس کا یہ مطلب ہے کہ امریکہ یہی سب کچھ ٹیکنالوجی کا سہارا لیتے ہوئے پہلے چین اور روس کے خلاف کرتا رہا ہے۔ چین کے کئی بار وارننگ دینے کے بعد جب امریکہ اپنی حرکتوں سے پیچھے نہیں ہٹا تو چین نے امریکہ کی سوشل میڈیا سائٹس پر پابندی لگا دی جس کی وجہ صرف یہی تھی کہ یہ سوشل میڈیا سائٹس چین کی سالمیت کے خلاف کام کرتی تھیں۔ اور پروپیگنڈا اوار کا حصہ تھیں۔

اب آتے ہیں اپنے خطے کی طرف اور دیکھتے ہیں یہاں کیا چل رہا ہے۔ حال ہی میں انڈیا ایکسپوز ہوا ہے جس میں اس کی 100 سے زیادہ ویب سائیٹ جو بھارتی حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہی تھیں ان کا بھانڈا پھوڑ دیا گیا۔ ان ویب سائیٹس کے علاوہ لاکھوں سوشل میڈیا اکاؤنٹس کو

پاکستان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے، جس میں پاکستان میں ہونے والے مذہبی اور سیاسی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ پوری دنیا میں یہ تاثر جائے کہ پاکستان کے حالات خراب ہیں، یہاں انتہا پسندی بہت زیادہ ہے، اور یہاں کے لوگ جہالت کی انتہا پر ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے مرنے پر آ جاتے ہیں۔ انڈیا کے ٹی وی چینلز سارا دن انہیں باتوں پر مرچ مسالہ لگا کر جلتی پر آگ کا کام کرتے رہتے ہیں۔

موجودہ حالات و واقعات کے حوالے سے بھارت کا کردار دیکھ لیتے ہیں۔ بھارت نے اپنے ہی شہریوں کو پاکستانی فوجیوں کا لباس پہنایا اور اپنی فیک سائٹس اور فیک ٹی وی چینلز سے ویڈیوز ریکارڈ کیں جس میں یہ کہا گیا کہ " میرا تعلق پاک آرمی سے ہے اور میں حکومت کے اس فیصلے کی مخالفت کرتا ہوں اور پاک آرمی سے استعفیٰ دیتا ہوں"۔ پھر اس طرح کی ویڈیوز اور تصاویر کو ایڈٹ کر کے اپنے ہی لوگوں سے ہزاروں کی تعداد میں کمنٹس کروائے جاتے ہیں اور یہ نقشہ تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ خدانخواستہ پاکستان میں خانہ جنگی کی سی صورتِ حال ہے
۔

اب دیکھتے ہیں کہ آخر بھارت کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ بھارت کے اندر بہت سی تحریکیں اپنے عروج پر ہیں، بھارت کئی سالوں سے ان تحریکوں کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے، بھارتی انتہا پسندی اپنے عروج پر ہے، چاہے وہ کشمیریوں کے خلاف ہو، مسلمانوں کے خلاف ہو، سکھوں کے خلاف ہو یا پھر کسانوں کے خلاف ہو یا پھر دیگر تحریکیں ہوں، بھارت ہر طرف سے اپنے اندرونی معاملات میں پھنسا ہوا ہے اور اپنے ہی لاکھوں شہریوں کو قتل کر چکا ہے۔ اپنی تمام ناکامیاں اور اپنے کالے کارنامے چھپانے کا اس کے پاس واحد حل یہ ہے کہ پاکستان پر الزام لگاتے چلے جائیں اور اپنی عوام کو بے وقوف بناتے چلے جائیں۔

حال ہی میں لداخ میں چین کے ہاتھوں ہونے والی رسوائی اور ماضی قریب میں انڈیا کے جنگی جہازوں کا گرنا اور جنگی قیدی کی سرکاری چائے سے مہمان نوازی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تو بھارت سے یہ ذلت بھی برداشت نہیں ہو رہی۔ اور دوسری طرف کسانوں کی تحریک نے تو جیسے انڈیا کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔ اور پھر حکومتِ پاکستان نے اور چین نے جس طرح سے بھارت کے عزائم کا جس طرح سے پوری دنیا میں پردہ فاش کیا ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ حال ہی میں بھارت نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پاکستان اور چین نفسیاتی جنگ میں بھارت پر سبقت لے گئے ہیں اور ہماری 30 سالوں کی محنت کو پانی میں ملا چکے ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ اب بھارت کو اپنی عوام کا اعتماد بحال کرنے میں کئی سال لگیں گے۔

بھارت کا اپنی عوام کے اعتماد کو بحال کرنے کا یہ سنہری موقع ہے کہ وہ پاکستان میں سول وار کی سی صورتِ حال کا نقشہ پیش کرے اور اپنے منہ پر لگی ہوئی کالک کو کچھ کم کرنے کی کوشش کرے۔ انشاءاللہ پاکستان کے معاملات بہت جلد بہتر ہو جائیں گے اور بھارت کا منہ کالے کا کالا ہی رہے گا۔ بلکہ مزید کالا ہو گا کیوں کے مزید کالی حرکتیں اب بھارت کو فائدہ نہیں دینے والیں۔

سوشل میڈیا اپنا گندا کھیل کھیلتا رہے گا، کیوں کے اس کا کنٹرول ہمارے پاس نہیں، جو لوگ سوشل میڈیا سائٹس کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں وہ خود براہ راست پوری دنیا میں ایک گندا کھیل کھیلنے میں ملوث ہیں۔ ان کے پاس ہر ملک کے فیک اکاؤنٹس ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کون سی باتیں اور کون سا مواد حکومتوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور کون سا مواد عوام میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کون سا ملک کس ملک کے خلاف ہے اور ان کے بارے میں کیا سوچ رکھتا ہے۔ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برا سوچیں اور آپس میں بدامنی کی فضا کو قائم رکھیں یہ بہت سی قوتوں کے مفاد میں جاتا ہے۔

اللہ نے بہت پہلے کافروں کی ذہنی کیفت بیان کر دی تھی، کہ یہ لوگ کبھی سامنے سے حملہ نہیں کریں گے، بلکہ یہ لوگ چھپ کر حملہ کرتے رہیں گے۔ سوشل میڈیا مکمل طور پر ایک نفسیاتی جنگ کا سامان مہیا کرتا چلا آ رہا ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے لوگوں کے معمولی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور معمولی سا واقعہ بھی ایک بری بدامنی کی صورتِ حال پیش کرنے لگتا ہے۔ اور جس معاشرے میں تعلیم کی کمی اور اور جہالت اپنے عروج پر ہو تو ان لوگوں کے لیے یہ سونے پر سہاگے والی بات ہوتی ہے۔

جو لوگ سوشل میڈیا پر کم وقت گزارتے ہیں یقنا وہ لوگ سوشل میڈیا پر زیادہ وقت گزارنے والے لوگوں سے بہت بہتر اور متوازن شخصیت کے مالک ہیں۔ باقی آپ لوگ سب بہت سمجھ دار ہیں۔ اللہ ہماری رہنمائی فرمائے اور ہمیں دشمنوں کیا چالوں اور ان کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھے۔ آمین

مثبت پہلو، منفی پہلو

تحریر: میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ ہر بات کی تہہ میں ایک بات ہوتی ہے اور وہی ساری بات ہوتی ہے۔ مگر ہم سطحی باتوں کو بحث میں لاتے ہیں اور پھر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔

شیاطین کے بارے میں ایک بات مشہور ہے کہ وہ بات کا تھوڑا سا حصہ لیتے ہیں اور پھر اسے دوسروں کے کانوں میں ڈال دیتے ہیں تاکہ نااتفاقی اور بدامنی پھیلے، تاکہ لڑائیاں ہوں اور بات خون خرابے تک پہنچ جائے۔

آج کا انسان کیا کر رہا ہے۔ کیا یہ شیاطین کی کھلی پیروی نہیں کہ ہم بات کا تھوڑا حصہ لیتے ہیں اور پھر اس کا ڈنکا بجاتے نہیں تھکتے۔ خاص کر کے میڈیا تو کھلم کھلا شیاطین کی پیروی کر رہا ہے۔ ہر وقت انہیں تلاش ہوتی ہے کہ کہیں نہ کہیں سے کوئی چھوٹی سی بات مل جائے جس کا وہ پورا ہفتہ بتنگڑ ہی بناتے رہیں۔

اور پھر جیسا میڈیا ویسے ہی ناظرین، انہیں بھی پورا پورا شوق ہوتا ہے کہ کوئی شوشا ان کے کانوں میں پڑے اور وہ اسے اپنی تقریر و تحریر کا موضوع بنائیں، یا پھر سوشل میڈیا پر اپنی ٹائم لائن کا حصہ بنائیں اور پھر وہ کام کر دیا جائے جو شیطان ہم سے کروانا چاہتا ہے۔

ہم اس چیز پر تو بحث کرتے ہیں جس کا ہمیں تھوڑا بہت علم ہوتا ہے، مگر ہم ان چیزوں پر بہت زیادہ بحث کرتے ہیں جن کا ہمیں بالکل بھی علم نہیں ہوتا۔ اور پھر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب تک ایک ایک دل کی بھڑاس نکل کر باہر نہیں آتی، اندر کا لاوا باہر کر طرف آتا ہی رہتا ہے۔

سب کے سب بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ یہ گنگا میلی بھی ہے اور بدبودار بھی۔ بدبودار گنگا میں ہاتھ دھونے سے نہ تو ہاتھ صاف ہوں گے اور نہ ہی اس کی بدبو کبھی جائے گی، مگر ہمیں وہی کرنا ہے جو سب کرتے ہیں۔ یعنی ہمیں دنیا کے رنگ میں رنگنا ہے۔ یاد رہے کہ بطور مسلمان ہمیں دنیا کے رنگ میں رنگے جانے سے ہی روکا گیا ہے۔

بدگمانی، غیبت، الزام تراشی، جھوٹ اور بہتان یہ سب بڑے گناہوں میں سے ہیں مگر ہم اسے ہنستے کھیلتے ہوئے کرتے ہیں، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری باتوں میں صرف منفی پہلو ہی رہ جاتے ہیں۔ اور مثبت پہلو ہمیں نظر آنا بند ہو جاتا ہے ہیں گویا دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور شاید اس وجہ سے ہم جس راستے پر نکل پڑتے ہیں اس سے واپسی کا ہمیں نشان ہی نہیں ملتا۔

بہت سے مولویوں کے درمیان کوئی ہدایت کی بات کر دی جائے تو وہ مل کر اس کا مثبت پہلو نہیں نکالیں گے بلکہ منفی پہلو نکالیں گے کیوں کے سب کے مسلک الگ الگ ہیں اور سب کی کوشش یہی ہے کہ کسی طرح دوسرا جھوٹا ثابت ہو جائے اور وہ سچے ثابت ہو جائیں۔ تمام مولوی ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے، چند مولویوں کی غلط روش سب مولویوں کو بدنام کرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

سیاست کا پہلو بھی ایسے ہی ہے، کسی کی تعریف کر دو تو الگ بحث اور کسی کی تنقید کر دو تو الگ بحث، مثبت پہلو سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ کسی کو اُٹھاتے جائیں گے تو پھر اسے دیوتا بنا کر پوجنے لگیں گے اور جب کسی کو گرانا چاہیں گے تو پھر اسے راونڑ بنا کر اس پر پتھراؤ شروع کر دیں گے، کہ مرتا ہے تو مر جائے اور جان چھوٹے۔

ادب کا معاملہ بھی نرالا ہے۔ ادبی لوگ ہر وقت تنقیدی نظریں گاڑھے رہتے ہیں، وہاں بھی تنقید کرتے ہیں جہاں تنقید نہیں بنتی اور وہاں بھی تعریف کرتے ہیں جہاں تعریف نہیں بنتی۔ بس بات ہاتھا پائی تک نہیں پہنچتی باقی سارے کام ہو جاتے ہیں۔ شاید سارے ادبی لوگ ایسے نہیں ہیں۔ مگر کچھ لوگوں کا ضرورت سے زیادہ منفی رویہ تمام ادبی لوگوں کو بدنام کرنے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر اور وکیل دونوں ہی پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ان میں اچھے لوگ بھی بہت ہیں، مگر چند لوگوں کی وجہ سے سب بدنام ہوتے ہیں ہمارا ہی معزز معاشرہ انہیں پڑھے لکھے ڈاکٹروں کو ڈاکو بھی کہتا ہے اور وکیلوں کو جیب کترا بھی کہتا ہے۔ ٹھیک کہتا ہے یا نہیں یہ تو الگ بات ہے۔ مگر غلط بھی نہیں کہتا کیوں کے کچھ ڈاکٹر واقعی ڈاکوؤں جیسا کام کرتے ہیں اور کچھ وکیل تو جیب کتروں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ تو کچھ لوگوں کی برائی کی وجہ سے بہت اچھے نیک اور صالح افراد کی بھی دل آزاری ہوتی ہے۔

تنقید اپنی جگہ ٹھیک ہے، مگر تنقید کے مثبت طریقے سے لینا معاشرے کے بڑے پن پر منحصر ہے۔ سماجی اقدار بلند ہوں تو تنقید کو مثبت انداز میں لیا جا سکتا ہے اور اگر معاشرے میں گراوٹ کا عنصر پایا جاتا ہو تو تنقید زہر قاتل کا کام کرتی ہے۔ بس آپ کسی پر تنقید کر دیں اور پھر دیکھیں وہ آپ کی قبر تک آپ کا پیچھا کرتا ہے۔

جہاں ہمیں منفی پہلوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے، وہاں ہمیں مثبت پہلوں کو اجاگر کرنے کی بھی بہت ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم منفی پہلوں پر بات کرتے کرتے اتنے آگے نکل جائیں کے معاشرے میں مثبت پہلوں کے لیے جگہ ہی ختم ہو جائے۔

ہر شخص منفی پہلو تراشنے میں لگا ہے۔ تو کیا ہمارے معاشرے میں اچھائی نہیں پائی جاتی، کیا لوگ قربانیاں نہیں دیتے، کیا لوگ نیکیاں نہیں کرتے، کیا لوگوں میں دردِ دل نہیں پایا جاتا، کیا لوگ خدا سے بے خوف ہیں۔ اور کیا لوگ اس سے بھی بے خوف ہیں کہ اُٹھائے بھی جائیں گے۔ ایسا ہر گز نہیں ہے بہت سے لوگ ہیں جنہیں اپنی عاقبت عزیز ہے، بہت سے لوگ ہیں جو نہ ہی دنیا میں رسوا ہونا چاہتے ہیں اور نہ ہی آخرت میں رسوا ہونہ چاہتے ہیں۔

جو عزت چاہتا ہے اللہ اسے عزت دیتا ہے، اور جو ذلت چاہتا ہے اللہ اسے ذلت دیتا ہے، اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اپنے لیے کس چیز کا انتخاب کرتے ہیں۔ جو شخص منفی سوچ رکھتا ہے اس کے سامنے منفی چیزیں زیادہ آنے لگتی ہیں اور اسے بہت سی اچھائیاں سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتیں۔ اور جو شخص مثبت سوچ رکھتا ہے اس کے سامنے بہت سی مثبت چیزیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور اس کی امید اس کی ناامیدی پر حاوی ہونے لگتی ہے۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایک شخص منفی سوچ رکھتا ہو اور وہ زندگی میں کبھی کامیاب بھی ہوا ہو، ایسے لوگ ہمیشہ بے چین ہی رہتے ہیں۔ اور جو شخص مثبت سوچ رکھتا ہے وہ کبھی ناکام ہو ہی نہیں سکتا ایسے لوگ ہمیشہ سکون میں ہی رہتے ہیں اور یہی اصل کامیابی ہے۔

اللہ ہمیں ہدایت دے ہم اپنی سوچ کو بدل سکیں، ہم مثبت سوچیں اور اپنے ارد گرد ناامیدی اور مایوسی کی فضا ختم کر سکتیں۔ ہم خود بھی چین سے رہیں اور ہمارے ارد گرد بھی امن ہو۔ دعا گو۔ میاں وقار الاسلام

ضرورت سے بہترین موٹیویشن کوئی نہیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ غریبوں کے بچے محنتی اور امیروں کے بچے ہڈ حرام کیوں ہوتے ہیں۔

سکول کالجز اور یونیورسٹیوں میں غریبوں کے بچوں کی کارکردگی محدود وسائل کے باوجود بھی بہت نمایاں ہوتی ہے، جب کہ امیروں کے بچے باوجود تمام سہولیات کے نمایاں کارکردگی کم ہی دیکھا پاتے ہیں۔

پروفیشنل زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی ہے، ضروریات غریب کے بچوں کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لیئے موٹیویٹ کرتی رہتی ہیں جبکہ امیروں کے بچے موٹیویشن کے لیئے موٹیویشن کلاسز لیتے ہیں۔

جب ضرورت پڑتی ہے تو انسان کو اپنے ارد گرد چھوٹے چھوٹے لوگوں کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوتا اور اگر ضرورت نہ پڑے تو انسان بڑے بڑے لوگوں کو بھی بھول جاتا ہے۔ اسی لیئے کہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنایا جاسکتا ہے اور اگر ضرورت نہ رہے تو حقیقی باپ کو بھی گدھا بنا دیا جاتا ہے۔

ضروت پڑ جائے تو انسان پل پل اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور اس سے مدد مانگتا ہے فرض نمازیں تو کیا نفلی نمازیں بھی قضا نہیں کرتا اور اپنے رب سے خوب مدد طلب کرتا ہے اور جب ضرورت نہ رہے تو اپنے رب کو بھی بھولنے میں دیر نہیں لگاتا۔

خواہشات اگر پوری نہ ہوں تو انسان اس طرح سے بے چین نہیں ہوتا جس طرح سے ضروریات پوری نہ ہوں تو بے چین ہوتا ہے اور یہی بے چینی انسان کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔

کسی کی ضروریات کم ہوتی ہیں کسی کی ضروریات زیادہ ہوتی ہیں اور کچھ لوگ اپنے آپ کو ضروریات زندگی کے لیئے تیار کرتے ہیں۔ نہیں صرف اپنی ضروریات کے لیئے بلکہ بہت سے لوگوں کی ضروریات کے لیئے خود کو تیار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کے کام تو آتے ہی ہیں اور ساتھ ساتھ اپنی کپیسٹی کو بھی کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔

لوگوں کی ضروریات کا آپ سے جڑ جانا یہ اللہ کی خاص نعمت ہے اور یہ آپ کو معاشرے کا ایک بہترین اور کارآمد انسان بننے میں معاون ہوتی ہے۔

کمپنیوں یا پھر آپ کی زندگی میں ہزاروں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ تعلق ایسے لوگوں کا ٹھہر جاتا ہے جو ایک دوسرے کی ضرورت بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیئے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

سیلفیش اور سیلف لیس لوگوں میں یہی فرق ہوتا ہے سیلفیش لوگ ایک دن اکیلے رہ جاتے ہیں، جب کہ سیلف لیس لوگ بہت سے لوگوں سے جڑ جاتے ہیں اور ایک کارواں کی صورت آگے بڑھتے ہیں۔

سماجی، کاروباری، سیاسی شخصیات جن میں لیڈر شپ کی صلاحیت موجود ہوتی ہے ان کا خاصہ ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے بڑھ کر سوچتے ہیں لوگوں کے لیئے آگے آتے ہیں اور ایسے ایسے کام کر جاتے ہیں جو بہت سے لوگ مل کر نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ خود موٹیویشن کی مثال ہوتے ہیں انہیں موٹیویشن کی کلاسز نہیں لینی پڑتیں۔

بڑا انسان بننے کے لیئے آپ کے مقاصد بڑے ہونے چاہیں، تن آسانی انسان کو لے ڈوبتی ہے، ہڈ حرام لوگ موٹیویشن کی کلاسز تو کیا موٹیویشن میں پی ایچ ڈی بھی کر لیں تو ہڈ حرام ہی رہتے ہیں۔

جب تک سوچ نہیں بدلتی، تب تک کچھ بھی نہیں بدلتا۔ دنیا میں جن قوموں نے ترقی کی ہے وہ اپنی ذات کی قید سے آزاد ہوئے ہیں، اپنے لوگوں یا اپنی جماعت کے لیئے آگے آئے ہیں، لوگوں کی قیادت سنبھالی ہے اور دنیا کے رخ بدل دیئے ہیں۔ بہت سے لوگ تو اپنی سمت درست نہیں کر پاتے وہ کسی کا رخ کیا بدلیں گے۔

شاید ہم اسی انتظار میں ہیں کہ ہم پر مشکل آپڑے اور پھر ہم خود کو بدلیں۔ ہم چاہیں تو یہ کر سکتے ہیں کہ زندگی میں مقاصد بڑے رکھیں اپنی ضرورت تو کیا آنے والی نسلوں کی ضروریات کا بھی بندوبست کر یا پھر ہم یہ بھر کر سکتے ہیں کہ اپنی ضروریات بھی پوری نہ کریں اور روتے ہی رہے اور آنے والوں کو بھی ایک روتا ہوا لاغر اور لاچار معاشرہ دے کر چلے جائیں۔

جب آدھا ملک کاٹ کر الگ ہو گیا تو ہمیں خیال آیا کہ ہمیں اٹامک پاور بھی ہونا چاہیئے۔ خدا جانے ہم کس مصیبت کے انتظار میں ہیں جس کے بعد ہم معاشی طاقت بھی بن سکیں۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

خوف جان لیوا بیماری

تحریر : میاں وقار الاسلام

کرونا پر بہت لکھا جا چکا، بہت بحث اور مباحثے چلے، چل بھی رہے ہیں اور شاید چلتے بھی رہیں گے۔ جو کرونا سے متاثر ہوئے سو ہوئے مگر جن لوگوں کو کرونا نہیں ہوا وہ بھی بری طرح سے کرونا کے شکنجے میں پھنسے دیکھائی دیتے ہیں۔

معاشی طور پر تو تقریباہر کوئی کسی نہ کسی طرح سے کرونا سے متاثر ہوا ہی ہے مگر ایک خاص پریشانی اور بھی ہے جس کی طرف اشارہ کرنا شاید بہت ضروری ہے۔

بہت دعوے کئے جاتے ہیں کہ ہیلتھ سیکٹر کے لیے یہ کیا جا رہا ہے اور وہ کیا جا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہیلتھ سسٹم بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

شاید یہ صرف پاکستان میں ہی ایسے نہیں، بلکہ جیسے دنیا میں بہترین ہیلتھ سسٹم بھی الٹ چکے ہیں اسی طرح کا نقشہ پاکستان میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

خوف کی ایک عجیب کیفیت ہے جس نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جن لوگوں کا موجودہ حالات میں ہسپتالوں سے واسطہ پڑا ہے وہ باخوبی جانتے ہیں کہ وہ کس خوف کی شدید لہروں سے گزرے ہیں۔

موجودہ حالات میں اگر کوئی مریض چاہے اسے کسی جرنل تھراپی یا سرجری کی اشد ضرورت ہو اسے طبعی سہولیات کے حصول کے لیئے شدید مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ عام مریضوں کی حالت کرونا کے مریضوں سے بھی زیادہ سنگین اور خطرناک صورت حال اختیار کر چکی ہے۔ خدا کرے کہ اس دوران کسی کو طبعی سہولیات کی ضرورت نہ ہی پڑے۔

جب کسی مریض کو ہسپتال میں لایا جاتا ہے، تو سب سے پہلے تو اسے کرونا کی عینک لگا کر ہی چیک کیا جاتا ہے۔ معمولی سی بھی کرونا کی علامات نظر آئیں تو احتیاطی طور پر اسے کرونا کا مشکوک مریض ہی تصور کیا جاتا ہے۔ اس مریض کے کرونا ٹیسٹ تو کروائے ہی جاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ اسے تب تک ہاتھ نہیں لگایا جاتا جب تک ٹیسٹ نہ آ جائے کہ اسے کرونا نہیں ہے۔

عام حالات میں دو سے 3 دن کی طبعی سہولت اب 10 سے 15 دن لے جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ مریض جو یہ مشکل کی گھڑیاں گزار پاتے ہیں اور بالآخر انہیں طبعی سہولت کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے بہت سے مریض ہیں جنہیں کرونا نہیں تھا مگر کرونا کے خوف کی صورت حال کی وجہ سے انہیں مناسب طبعی سہولیات نہ مل سکیں اور وہ اسی خوف کے حالات میں وفات پا گئے۔

قصور شاید حکومت کا بھی نہیں، ڈاکٹروں کا بھی نہیں، ہیلتھ سسٹم جہاں جتنے کمزور ہیں وہاں اسی تناسب سے نقصانات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

دنوں میں شاید ہیلتھ سسٹم ٹھیک نہ ہو پائیں، مگر جہاں تک ممکن ہو سکے حکومت کو اس معاملے میں مزید سنجیدگی دیکھانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹرز جن کی حالت شاید سب سے زیادہ پریشان کن ہے اور وہ اپنی کپیسٹی میں بھرپور کام بھی کر رہے ہیں اور اس مشکل صورت حال کو سب سے بہتر سمجھتے بھی ہیں انہیں بھی کچھ مزید کی بنیاد پر حصہ ڈالنا چاہیئے۔

اسی طرح سول سوسائیٹی اور خود مریضوں کے لواحقین کو بھی اس معاملے کو مزید سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ باہر سے صورت حال جتنی سنگین نظر آتی ہے اندر سے اس سے کہیں زیادہ سنگین صورت حال ہے۔

ایمرجنسی صورت حال میں توازن برقرار رکھنا سب سے اہم بات ہے۔ شاید اپنی اپنی کپیسٹی میں سب وہ کر رہے ہیں جو انہیں کرنا چاہیئے۔ مگر ابھی بھی بہت کچھ ایسا ہے جو ہو سکتا ہے اور جو ہونا چاہیئے تاکہ ایسے لوگ جنہیں کرونا کی وجہ سے دیگر طبعی سہولیات نہیں مل رہیں ان کے لیے آسانی ہو سکے۔

اللہ کہتا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، ہمیں اس مشکل میں وہی آسانی مل کر تلاش کرنی چاہیے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہمیں اپنی محنتوں اور نیک نیت پر رسوا نہیں کرے گا اور ہمیں ہماری محنت کا صلہ ضرور ملے گا۔ ہر سطح پر صبر و تحمل کی اشد ضرورت ہے۔

ایسے حالات میں جو لوگ ایک دوسرے پر بلاوجہ پریشر ڈال رہے ہیں، ادویادت کی ذخیرہ اندوزی کر رہے ہیں، دو دو تین تین یا چار چار گناہ فیسیں زیادہ لے رہے ہیں ہڑتالیں کر رہے ہیں سیاسی اور کاروباری مفادات کی غرض سے مزید تباہی کی صورت حال پیدا کر رہے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آزمائش انہیں دنیا اور آخرت میں رسوا کرنے والی ہے۔

ایسے حالات میں جو لوگ ایک دوسرے کی بے لوث مدد یا خدمت کر رہے ہیں، ادویادت کی ترسیل آسان کر رہے ہیں، دو دو تین تین یا چار چار گناہ فیسیں کم لے رہے ہیں۔ سیاسی اور کاروباری مفادات کو لوگوں کی زندگیوں پر فوقیت نہیں دے رہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آزمائش انہیں دنیا اور آخرت میں اس کا اچھا صلہ دینے والی ہے۔

مشکل وقت بھی گزر ہی جائے گا مگر تاریخ وقت کے بدترین کرداروں کو بھی لکھ لے گی اور بہترین کرداروں کو بھی قلم بند کر لے گی۔ اس مشکل صورت حال میں ہم اپنا حصہ کیسے ڈال رہے ہیں ہمیں ضرور سوچنا چاہیئے۔

اللہ ہماری مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل کر دے، آمین، دعا گو: میاں وقار الاسلام

بڑا دماغ، چھوٹی سوچ

تحریر: میاں وقار الاسلام

لازمی نہیں کہ بہت زیادہ مال دار انسان سخی بھی ہو۔ ضروری نہیں کہ بہت زیادہ پڑھے لکھے انسان کی سوچ بھی وسیع ہو۔ بڑی سفارش بڑے دماغوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تو کر سکتی ہے مگر چھوٹی سوچ انہیں کبھی بڑا نہیں ہونے دیتی۔

حیرانی ہوتی ہے جب انتہائی باکمال لوگوں کی قسمت کا فیصلہ انتہائی نالائق لوگ کرتے ہیں۔ شاید تکبر ایک ایسی چیز ہے جو بڑے بڑے باکمال لوگوں کی ساری صلاحیت کھا جاتا ہے۔ انسان کو صندل کے درخت کی طرح ہونا چاہیے، بوڑھا ہو کر گر بھی جائے تو اس میں سے خوشبو آتی رہے۔

اُونچے مقام اور اعلیٰ مقام میں بہت فرق ہوتا ہے، اعلیٰ مقام سے کوئی نہیں گرتا، اُونچے مقام سے بہت سے لوگ گر جاتے ہیں۔ شاید یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اُونچے مقام کے خواب ہر کوئی دیکھتا ہے مگر اعلیٰ مقام کی خواہش بہت کم ہی لوگ رکھتے ہیں۔

بہت سے لوگ اپنی بدقسمتی پر روتے ہیں کہ باوجود بہت زیادہ قابل ہونے کے انہیں لال بتی والا پروٹوکول نہیں مل سکا۔ اکثر نالائق لوگوں کو بھی لال بتی والا پروٹوکول مل جاتا ہے اور یہی ناانصافی والا پروٹوکول لائق لوگوں کی جلن کو اور بڑھا دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اللہ تعالیٰ لائق لوگوں کو لال بتی والے پروٹوکول سے بچانا چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے پیٹ میں آگ نہ بھریں تو کیا ہی اچھا فیصلہ ہے۔

سیدھے لوگوں کا یہ بھی مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ لاکھ خواہش رکھیں کبھی ٹیڑھے رستے پر چل ہی نہیں سکتے۔ تو ایسی کامیابیوں کا کیا حاصل جن کی منزل ہی جہنم ہو۔ تو بہت ساری خواہشیں اس لیے بھی پوری نہیں کی جاتیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر مہربانی ہے اور ان کے معاملے میں سختی نہیں چاہتا۔

ٹیڑھے لوگوں کے سارے کام تیزی سے ہو جاتے ہیں اور انہیں یہ آسان کر کے دیکھا دیا جاتا ہے پھر ان سے سیدھی طرح کام ہی نہیں ہوتا۔ جو لوگ ساری زندگی نقلیں مار کر پاس ہوتیں ہیں، ان کی پروفیشنل لائف بھی نقلیں اتارتے اور فنکاریاں کرتے گزر جاتی ہے۔

نالائق لوگوں کے پاس ایک فن ہوتا ہے کہ وہ لائق لوگوں کے فن کو استعمال کر سکتے ہیں، شاید اسی وجہ سے ان کی دال ہمیشہ گل جاتی ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو شارٹ کٹ مارتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں اور دنیا ایسے لوگوں کی مثالیں دیتی رہتی ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ دنیا نالائق لوگ اور شارٹ کٹ مارنے والوں لوگوں کی وجہ سے نہیں چل رہی۔ دنیا کو بہترین اور قابل ترین لوگ ہی چلا رہے ہیں۔ تقریباً تمام فیلڈز میں ہم دیکھتے ہیں کہ قابل سے قابل ڈاکٹرز، انجینئیرز، سکالرز، آرکیٹیکٹس اور مختلف ماہرین اپنا لوہا منوا رہے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ناانصافیاں بھی ہوتی ہیں، حقوق بھی مارے جاتے ہیں مگر علم اپنے آپ کو منوانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور علم کی طاقت اپنے جھنڈے گاڑھتی چلی آ رہی ہے۔

یقناً آپ کو بڑے بڑے دماغوں سے لڑنا ہے، مگر اپنی سوچ بڑی رکھنی ہے اپنا حوصلہ بلند رکھنا ہے اور علم کی طاقت سے اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کرنی ہے۔ اگر شاہین ہو اقبال کو تو وہ کرگس کی موت کبھی نہیں مرے گا۔

دعا گو میاں وقار الاسلام

آدھی ادھوری عیدیں

تحریر: میاں وقار الاسلام

عید خوشی کا تہوار تو ہے، مگر یہ غم کی شدت بھی بڑھا دیتا ہے۔ بہت سے زخموں کو تازہ کر دیتا ہے۔ لگتا ہے جیسے کوئی چیز زخموں کو کریدتی ہی چلی جا رہی ہو۔

زندگی آنی جانی ہے، یہ دنیا کب لافانی ہے، کسی نے دوست اور رشتہ دار کھوئے ہوں گے، کسی نے بھائی بہن کھوئے ہوں کے کسی کا لخت جگر دور ہو گیا ہو گا کی کی ماں اور کسی کا باپ خالق حقیقی سے جاملا ہو گا۔ کسی کا شوہر نہیں رہا کسی کی بیوی نہیں رہی یا پھر کسی کا کوئی اور قربت والا ہمیشہ کے لیے اکیلا کر گیا ہو گا۔

جب عید آتی ہے تو بچھڑنے والے چاہے بہت پہلے بچھڑے ہوں یا پھر ماضی قریب میں ان کی غیر موجودگی دل کے آنگن کی ویرانی کو باہر لے آتی ہے۔ باوجود بہت سے تعلق داریوں اور رشتہ داریوں کے ان کی کمی اپنی جگہ مکمل طور پر قائم رہتی ہے۔

بہت سے مسکراتے ہوئے چہرے، رنگ برنگے پیراہن، اور عید کی مبارکبادیں گویا غموں کی شدت کو ساتویں آسمان تک لے جاتی ہیں، نہ بندہ پھوٹ کر رو سکتا ہے نہ کھل کر دل کی کیفیت بیان کر سکتا ہے بس جدائی کا غم پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

جب کوئی عید مبارک کہتا ہے تو یوں لگتا ہے کسی نے غموں کے تار چھیڑ دیئے ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے آنکھوں پر مصنوعی خوشی کا احساس رکھنا اور دل کے نہ رکنے والے آنسوں کو صاف کرتے رہنا۔ اور اسی عجیب سی کشمکش میں عید ہلکان کرتے کرتے گزر جاتی ہے۔

عید کی خوشیاں بہت سے لوگوں سے جڑی ہوتی ہیں، گویا موتیوں کی ایک لڑی ہوتی ہے، جب یہ لڑی ٹوٹنے لگتی ہے تو پھر خوشیوں کے موتی بھی بکھرنے لگتے ہیں، ایسا نہیں کہ ارد گرد محبت کرنے والے کم ہوتے ہیں، جسم چاہے پورا سلامت ہو ذہن اسی طرف ہی جاتا ہے جس جگہ چوٹ لگی ہوتی ہے۔ بس ایسا ہی کچھ احساس کہ زخموں کے مہانے اپنے ہونے کا شدید احساس دلانے لگتے ہیں۔

دل صبر اور شکر کا مطلب سمجھ چکا ہوتا ہے، لوگوں کے دلاسے بھی کام کر جاتے ہیں انسان اوپر اوپر سے پتھر بھی ہو چکا ہوتا ہے۔ مگر عید کے آتے ہی پتھر پھوٹ پڑتے ہیں اور ان میں نہ نظر آنے والے آنسوؤں کے کئی چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

عجیب غم ہیں جو کبھی نہیں جاتے، گئے دنوں کی یادیں کبھی نہیں بھولتیں، جدا ہونے والے کبھی الگ نہیں ہوتے۔

عیدیں شاید بچھڑنے والے سے ملانے چلی آتی ہیں، ایک ایک یاد تازہ ہونے لگتی ہے، بچھڑنے والا کیسے ملنے آتا تھا، کیسے بلاتا تھا کیسے بات کرتا تھا، کیسے غمگساری کرتا تھا، کسے دل بہلاتا تھا، اس کا ہونا کس قدر اہم تھا اور اس کا نہ ہونا کس قدر تکلیف دہ ہے، کاش وہ اب بھی ساتھ ہوتا، کچھ دن اور کچھ پل اور اتنا جلدی نہیں جانا چاہیئے تھا اس کے بغیر کسی چیز کا لطف نہیں عجیب سا خالی پن عجیب سے آدھی ادھوری عیدیں۔

شاید زندگی ہے ہی آدھی ادھوری، ہمیں اسے بہت سے قیمتی لوگوں کے بغیر جینا پڑتا ہے، ان کی یاد میں تڑپنا پڑتا ہے اپنے دل کو بہلانہ پڑتا ہے اور جینے کے بہانے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہی زندگی کا بنیادی فلسفہ ہے۔

ہمیں بہت کم میں خوش رہنا ہے، ہمیں بہت تھوڑے پر گزارا کرنا ہے۔ اسی پر ہمیں صبر اور شکر کرنا ہے۔ ہم ایسے ایسے رشتوں میں کھو جاتے ہیں اور دل ایسے ایسے تعلقات سے مانوس ہو جاتا ہے کہ زندگی کا تصور بھی ان کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے مگر اللہ ہماری خواہشات کے مخالف اس دنیا کو چلاتا ہے۔

جو ہو نہیں سکتا وہ ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک غم جو ہم سے برداشت نہیں ہوتا ایسے کئی غم ہمارے سروں سے گزر جاتے ہیں۔ جس آسمان میں کئی ستارے ہوتے ہیں ان میں سے چند آگے پیچھے ہو جائیں تو آسمان خالی ہو جاتا ہے چاہے اسے پھر اتنے ہیں ستاروں سے بھر دیا جائے۔

آج ہم کسی کے لیئے رو رہے ہیں کل کوئی ہمارے لیئے رو رہا ہوگا اور یہ دنیا ایسے ہی چلتی چلی جائے گی۔ ہمیں جانے والوں کی قدر و قیمت کا احساس تو ہوتا رہے گا، مگر جو لوگ ہم میں موجود ہیں انہیں ہم شاید بے وقت کرتے رہیں گے۔

جو چلے گئے وہ بھی بہت قیمتی تھے اور جو موجود ہیں وہ بھی بہت قیمتی ہیں بعد میں رونے سے آج کا خوش رہنا اہم ہے، خوش رہیئے خدا جانے ہمیں زندگی نے اور کتنا آزمانا ہے کیا معلوم ہمیں کون کون سے دکھ اٹھانے ہیں۔ مگر زندگی نے نہیں رکنا، زندگی کو چلنا سیکھایا گیا ہے اس نے چلتے ہی رہنا ہے نئے لوگوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہنا ہے اور بچھڑنے والوں نے بچھڑ ہی جانا ہے۔

اے اللہ ہمیں صبر کرنے والوں میں شامل رکھنا۔۔۔آمین

گھگھو گھوڑے

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایک وقت تھا، گاؤں کے ساتھ ساتھ شہروں میں بھی کہیں کہیں گھگھو گھوڑے بیچنے والے یا بیچنے نظر آتے تھے۔ گھگھو گھوڑوں کی ایک خاص بات تھی کہ یہ دیکھنے میں رنگ برنگے اور خوبصورتے ہوتے تھے مگر وزن میں ہلکے ہوتے تھے، انہیں جہاں رکھ دیا جاتا تھا یہ بڑے آرام سے وہیں پڑے رہتے تھے۔ اور انہیں ڈور سے کھینچ کر جس طرف چاہیں لے جائیں یہ نہ بھی نہیں کرتے تھے۔

ان کی ایک اور خاص بات بھی تھی، کہ اگر ان کا کان مروڑ دیا جائے تو یہ روتے نہیں تھے، اور اگر ان کی ٹانگ بھی توڑ دی جاتی تو بھی کوئی شکائت نہیں، اور آخر میں انہیں چیر پھاڑ کر الگ بھی کر دیا جاتا تو بھی فکر کی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ یہ احساس اور جذبات سے خالی ہوتے تھے۔

ہاں گھگھو گھوڑوں کی ایک اور خاصیت بھی تھی کہ انہیں بنانے والے کو چار پیسے مل جاتے تھے اور ان سے کھلنے والوں کو بھی چار دن کی خوشی مل جاتی تھی، نہ انہیں بنانے والوں سے کوئی فائدہ ہوتا اور نہ ہی ان سے کھیلنے والوں سے ان کو کوئی فائدہ ہوتا۔ یہ نہ اپنی خوشی آتے تھے اور نہ ہی اپنی خوشی جاتے تھے۔

کچھ اسی طرح کی فطرت انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ اس دنیا میں گھگھو گھوڑوں کی طرح آتے ہیں، اس دنیا میں گھگھو گھوڑوں کی طرح رہتے ہیں اور پھر اس دنیا سے گھگھو گھوڑوں کی طرح ہی چلے جائیں گے۔

کچھ لوگ خدا کے سامنے تو نہیں گڑگڑاتے، مگر دنیا میں ہر شخص کی منتیں کرتے کرتے زندگی گزار دیں گے، لوگ ان کے جذبات سے کھیلتے رہیں گے، ان کی توہین ہوتی رہے گی، ان سے فائدہ اُٹھایا جائے گا اور آخر میں انہیں توڑ پھوڑ کر بدحالی کی کیفیت میں پھینک دیا جائے گا، یہ اپنی قسمت کو روتے روتے مر جائیں گے اور پھر انہیں جیسے اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ مگر گھگھو گھوڑوں کی یہ جماعت اپنی حالت درست نہیں کرے گی۔ اپنی عقل اور فہم کو استعمال نہیں کرے گی، اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرے گی، اور اپنی زندگی میں تبدیلی نہیں لائے گی، یہ ہیں شعور سے خالی، اپنی ذات کے خول میں بند گھگھو گھوڑے۔

جذبات اور احساسات کو اپنی طاقت بنائیں، اپنی کمزوری نہیں، فطری طور پر ہر بندہ جذباتی ہوتا ہے، مگر یہ احساسات دیکھانے کے نہیں بلکہ چھپانے کے ہوتے ہیں۔ کمزور وہ نہیں ہوتا جو کہ کمزور ہوتا ہے، بلکہ کمزور وہ ہوتا ہے جو کمزور نظر آتا ہے، اور اگر آپ کمزور نظر آتے ہیں تو دنیا آپ کو کھا جائے گی۔ صرف اپنے رب کے سامنے کمزور پڑیں کھل کر روئیں اور گڑگڑائیں صرف اسی کے در پر رونا فائدہ دیتا ہے۔

دنیا کمزور لوگوں کی پسند نہیں کرتی، بہترین دوست اور بہترین رشتے بھی کمزور لوگوں سے الگ ہو جاتے ہیں جبکہ مضبوط انسان اگر اکیلا بھی ہو تو اس کے ساتھ دنیا جڑ جاتی ہے۔

کمزور لڑکیوں کو مرد دھوکہ دے کر چھوڑ دیتے ہیں، اور مضبوط لڑکیاں کمزور لڑکیوں کے شوہر بھی لے جاتی ہیں۔ زندگی کا سفر بہت لمبا چاہے نہیں ہے مگر لوگوں کو اپنا ساتھ مضبوط ہی چاہیے ہوتا ہے۔ پھر چاہے ہو مرد ہو چاہے عورت، اگر آپ اپنی ذات میں مضبوط نہیں ہیں اور بار بار کمزور پڑ جاتے ہیں تو مضبوط سے مضبوط تعلق بھی کمزور پڑ سکتا ہے۔

اگر ماں، یا باپ کے اعصاب مضبوط نہیں تو بچوں کے اعصاب مضبوط کیسے ہوں گے، اور اگر بچوں کے اعصاب مضبوط نہیں ہوں گے وہ دنیا کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے یا پھر بڑی ذمہ داریاں کیسے اُٹھا سکیں گے۔

بہت سے اداروں میں ایک لڑکی پوری ٹیم کو لیڈ کر رہی ہوتی ہے، اپنے بھرپور اعتماد کی وجہ سے۔ اور کچھ اداروں میں بہت سے مرد ایسے ہیں جن کو انگلی پکڑ کر چلایا جاتا ہے ورنہ ان کی حالت گھگھو گھوڑوں سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔

آپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں رکھیں، موم کی ناک نہ بنیں کہ آپ کو کوئی بھی موڑتا توڑتا اور پھر چلتا بنے۔ اپنی ذات کو سمجھیں، اپنا کنٹرول کسی کے ہاتھ میں نہ دیں، بعد میں رونے دھونے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے والے کو کوستے ہوئے زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ اپنی ذات پر کسی کو کھیلنے کی اجازت مت دیں۔

جس نے آپ کو دھوکا دینا ہے، وہ آپ کا ہمدرد اور ساتھ ہی بن کر آئے گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے شیطان خطرناک چالیں چلتا ہے اور ہمیں ہدایت کے راستے سے دور جا پھینکتا ہے اور پھر ہم سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ شیاطین کا داؤ صرف گھگھو گھوڑوں پر ہی چلتا ہے۔ کیوں کہ شیطان دور سے اشارہ کرتا ہے اور یہ اوندھے منہ اسی طرف گر پڑتے ہیں۔

ترقی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا، آپ جس بھی فیلڈ میں ہیں سیدھی سیدھی محنت کریں، اور محنت بھی سمارٹ ہونی چاہیئے، گدھا بھی محنت کرتا ہے مگر اس طرح کی محبت بہت کم لوگوں کو چاہیئے۔ دنیا میں سب کو سب کو شیر یا جنگی گھوڑے چاہیں جن کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکلیں اور جو اپنی سمت جانتے ہوں، نہ کہ۔۔۔۔ بگھو گھوڑے۔

سب سے محبت کریں، نفرتوں میں اپنا ہی وقت اور انرجی ضائع ہوتی ہے۔ اتنا نقصان دشمن کا نہیں ہوتا، جتنا اپنا ہی نقصان ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگ صلاحتوں سے بھرپور ہوتے ہیں مگر خود کو غلط مشوروں سے تبدیل کرتے جاتے ہیں اور اپنی صلاحتوں کا بیڑا غرق کر لیتے ہیں۔

خود کو اوور سمارٹ سمجھنے والے لوگ بہت جلد سائیڈ پر لگا دیئے جاتے ہیں۔۔۔ دائیں بائیں کسی کی نہ سنیں اپنے اندر کی سنیں اور اپنے راستے پر رہیں بہت جلد منزل واضع ہو جائے گی۔ زیادہ دائیں بائیں دیکھنے والے راستے میں رہ جاتے ہیں۔ اللہ نے ہمیں سیدھا راستہ دیکھایا ہے دائیں بائیں سے تو شیاطین آتے ہیں۔ اگر آپ کچھ اچھا بھی کرنا چاہتے ہیں تو دائیں بائیں والے آپ کو روکتے ہی رہیں گے اور جب آپ وہ کام کر گزریں تو سب سے زیادہ تالیاں بھی وہی بجائیں گے۔

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ ہمارے ملک کو گھگھو گھوڑے نہیں چاہیں، جو اپنے کسی کام کا نہیں وہ ملک و قوم کے کس کام کا ہوگا۔

اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہمیں شر پسندوں سے محفوظ رکھے اور ہمیں ان لوگوں کے رستے پر چلائے جن سے وہ راضی ہوا نہ کہ ان لوگوں کے رستے جن پر وہ غضب ناک ہوتا رہا۔ آمین۔

ذہنی کمزوری

تحریر: میاں وقار الاسلام

کسی پر بہتان لگانا، کسی کی کردار کُشی کرنا، کسی پر الزام لگانا اور وہ بھی بے بنیاد، یا پھر کسی کے لگائے ہوئے الزمات اور بہتانوں کو بغیر تحقیق کے قبول کر لینا یہ امر کسی بھی معاشرے کے لوگوں کی انفرادی یا کلی ذہنی کمزوری کی عکاسی کرتا ہے۔

اسلام واضع طور پر منع کرتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے وہ اس سے بہتر ہو، اسی طرح اسلام یہ بھی حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی بری باتوں کا جواب بھی اچھے انداز سے دیا کرو۔ اور بھی کہ جب تم تک کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تصدیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھوں سے کسی بے گناہ پر ظلم ہو۔ اور یہ بھی کہ بہت زیادہ گمان نہ کیا کرو، بہت سے گمان گناہ ہوتے ہیں، اور یہ بھی کہ کسی کو ٹو میں نہ لگے رہا کرو اور پھر یہ بھی کہ کسی کی غیبت نہ کرو یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اور یقینا تم اس بات کو ناپسند کرو گے۔

مگر ہم شاید بہت زیادہ بہک چکے ہیں، ایسا نہیں کہ ہمیں علم ہی نہیں کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ بلکہ ہم علم رکھتے ہوئے وہ سارے کام کرتے ہیں جس سے اسلام ہمیں منع کرتا ہے۔ نہ صرف ہم یہ سارے عمل دہراتے ہیں بلکہ ہم ان سارے گناہوں کو مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ کیا ہم بے خوف ہیں کہ اُٹھائے بھی جائیں گے۔ دنیا میں تو شاید ہم کسی نہ کسی طرح سے بچ جائیں کیوں کہ اللہ ہمیں مہلت دیتا رہتا ہے۔ مگر اس دن کیا ہو گا جس دن کسی کو مہلت نہیں دی جائے گی اور سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا صلہ دیا جائے گا۔

ایک عجیب سی منافقت ہمارے معاشروں میں سرائیت کر چکی ہے۔ ہم لکھتے بہت اچھا ہیں بولتے بہت اچھا ہیں، اور ظاہری بناوٹ، بناؤ، سنگھار اور پراہن میں تو ہم سب سے آگے ہیں، مگر ہمارے اندر کا انسان ابھی نشو نما نہیں پا سکا۔ ہمارے باطن بہت میلے ہیں۔ ہمارے من کی چکی ہمیں پیس کر اتنا باریک اور نفیس نہیں کر پا رہی جتنا نفیس ہمیں ہونا چاہیے۔ ہم اپنے موٹے موٹے گناہوں کو نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں، جب کہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہم کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنی ذات کا احاطہ بہت باریکی سے کرتے اور لوگوں کی موٹی موٹی غلطیاں چھپاتے۔ مگر سب الٹا ہو گیا۔ معاشرہ بگڑ گیا اور اب ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اور اسی معاشرے کی چکی میں شریف انسان بھی پس رہیں ہیں۔ جو خود کو اچھے لوگوں میں شمار بھی کرتے ہیں اور برائیوں کا کوئی موقع بھی نہیں جانے دیتے۔ ایک نہ نظر آنے والی پٹی ہے جو شاید ہم نے اپنی آنکھوں پر باندھ لی ہے۔

کیا ہم تمام لوگ ذہنی کمزور کا شکار ہیں، کیا ہم سوچتے نہیں جو ہم کرتے ہیں، ہم ہی سود کھاتے ہیں، اور ہم ہی سود کے خلاف سب سے زیادہ بولتے ہیں، ہم ہی ملاوٹ کرتے ہیں اور ہم ہی ملاوٹ کے خلاف سب سے زیادہ بولتے ہیں، ہم ہی ناانصافی کرتے ہیں اور ہم ناانصافی کے خلاف میں سب سے زیادہ بولتے ہیں۔ ہم ہی اپنے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ہم ہی صلہ رحمی کی بات کرتے ہیں۔ ہم ہی عورتوں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور ہم خود ہی عورت کے حقوق کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ ہم ہی اسلام کے نام پر قائم ہوئے تھے اور ہم ہی اسلام کے نام پر سب سے زیادہ تقسیم ہیں۔ ہم ہی نے دو قومی نظریے کی بنیاد رکھی اور ہم ہی ذات پات اور فرقہ واریت میں بٹے ہوئے ہیں۔ جب تک ہمارا ظاہر اور باطن ایک جیسا نہیں ہوتا ہمیں کوئی کامیابی کیسے مل سکتی ہے۔

اس شیر سے تو گیدڑ اچھا جو ہرن کو کھا کر یا بکری کو ہضم کرکے خود کو شیر سمجھتا ہے۔ ہمارے ساتھ جو ظلم ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ہماری کی شامتِ اعمال ہوتی ہے۔ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کریں، اپنی عورتوں کو حقوق دیں، اپنے لین دین کے معاملات کو ٹھیک کریں، لوگوں کی عزت کرنا سیکھیں، ذہنی پسماندگی یا ذہنی کمزوری کا مظاہرہ نہ کریں۔ اسلام کو قران وسنت کی روشنی میں خود سے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں، آپ کا زندگی گزارنے کا نظریہ بالکل بدل جائے گا۔ جو زندگی آپ لوگوں کے اشارہ پر گزار رہے ہیں، یا معاشرے کی بھیڑ چال کو دیکھتے ہوئے جس لکیر کے فقیر سب بنے ہوئے ہیں، اسلام میں زندگی کا نظریہ اس سب سے یکسر مختلف ہے۔ آخرت میں ہمارا حساب اس معاشرے نے نہیں لینا بلکہ واحد اور یکتا مالکِ حقیقی نے ہی لینا ہے۔ اگر ہم نے زندگی میں ذہنی بلوغت نہ پائی تو اس میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ ہمارے وجود دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

اس دن ہم کیا کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی پیغام پہنچانے والا نہیں آیا تھا، یا ہم یہ کہیں گے کہ ہم نے جس جماعت کا ساتھ دیا وہ شیاطین کی پیروکار تھی۔ تو کہاں جائیں گے ہمارے محبت کے جھوٹے دعوے جو ہم بہترین اُمتی ہونے اور دین کے سب سے بڑے ٹھیکے دار ہونے کے کرتے ہیں۔ اُس دن ایسی ہی ٹھیکے داری پر سوال ہوں گے اور ہمارے ہاتھ میں سوائے رسوائی کے کچھ نہیں ہوگا۔

اے اللہ ہمارے سینوں کو کھول دے، ہمارے دلوں کو روشن کر دے، ہماری آنکھوں کو بینائی دے، ہمارے کانوں کو سننے والا بنا اور ہماری زبانوں کو قوتِ گویائی دے، ہمیں ان راستوں پر چلا جن راستوں پر ہمیں تیرا فضل کرم ملتا رہے۔ آمین

دعا گو میاں وقار الاسلام

اچھے، برے اور میسنے لوگ

تحریر: میاں وقار الاسلام

لوگ صرف اچھے اور برے نہیں ہوتے بلکہ میسنے بھی ہوتے ہیں۔ لوگ بڑی محنت کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو سفید اور مذید سفید کرتے چلے جاتے ہیں۔ جب کہ ان کا اندر سیاہ اور مذید سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لوگ اپنی ظاہری سفیدی جب وہ لوگوں کو بھانے لگتی ہے تو اس پر بہت اترانے لگتے ہیں اور ان کی شخصیت میں ایک غرور اور تکبر کی کیفیت صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ ساتھ ہی یہ لوگ اپنے اندر کی سیاہی سے ڈرتے اور گھبراتے بھی رہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اندر کی سیاہی باہر آ کر ان کی ظاہر سفیدی کو بھی سیاہ کر دے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنی فنکاریوں میں اتنے پکے ہو چکے ہوتے ہیں کہ ان کا سارہ ڈر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے دونوں رُخوں کی اچھی طرح حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی باہر کی بارعب شخصیت ان کے اندر کی ڈری ہوئی شخصیت پر غلبہ پا لیتی ہے۔ اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو وہ کر رہے ہیں یہی بہترین ہے اور انہیں ایسا ہی رہنا چاہے۔

ظاہری بناؤٹ کا نقاب اوڑھ کر کتنے ہی گناہ گار لوگ ہیں جن کے لاکھوں فالوورز ہیں، لوگ ان کے لیے پلکیں بچھاتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں، ان کی عزت کرتے ہیں اور انہیں خاص مقام عطا کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کاٹھ کی ہنڈیا چوراہے پر ہی پھوٹتی ہے۔ جھوٹ زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکتا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ کوئی دیکھے نہ دیکھے شبیر تو دیکھے گا۔ اندر کی سیاہی ایک دن باہر آ کر ہی رہتی ہے۔ تو پھر لوگ حیران ہوتے ہیں، کہ اتنا اچھا انسان جس کے بارے میں انہوں نے کبھی کوئی بدگمانی نہیں کی وہ شخص اتنا برا بھی ہو سکتا ہے۔

در حقیقت شیطان ہمارے ساتھ ایک چال چلتا ہے۔ شیطان ہمیں ہمارے عقیدے ٹھیک کر کے دیکھا دیتا ہے۔ ہم علم تو حاصل کر لیتے ہیں اور شیطان اس سے ہمیں کم روک پاتا ہے، مگر عمل پر شیطان کا وار زیادہ ہوتا ہے۔ زیادہ علم حاصل کر لینے والے انسان کو اکثر شیطان بے عمل کر دیتا ہے۔ باوجود بہت سا علم ہونے کے اچھا خاصا انسان بے عمل ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بہت زیادہ پیسے والا انسان کنجوس اور بخیل ہو جاتا ہے۔ سب ایسے نہیں ہوتے مگر جو انسان دوُرخی شخصیت رکھتا ہے وہ اکثر اسی طرح تقسیم ہوتا ہے۔

لوگ جس طرح علم کا دیکھاوا کرتے ہیں، اسی طرح پیسے کا بھی دیکھاوا کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر بڑے مال دار اور بڑے علم والے اور اندرونی طور پر بہت بڑے بخیل اور بالکل ہی بے عمل۔ بہت لوگ ایسے لوگوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، انہیں اپنا پیر یا مسیحا یا لیڈر بنا لیتے ہیں اور

ان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں، اکثر لوگوں کی تو آنکھیں کی کبھی نہیں کھلتیں اور بہت سے لوگوں کی آنکھیں تب کھلتی ہیں جب وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہوتے ہیں۔

شاید ہمارے رستے جلیبی کی طرح سیدھے ہیں، ہم تھوڑا سا گناہ بھی اسی طرح کر لیتے ہیں جس طرح ہم تھوڑا سا ثواب کما لیتے ہیں اور اس درمیان کے رستے میں کبھی دائیں طرف لڑک جانا اور کبھی بائیں طرف لڑک جانا ہمیں سیدھا رستہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

اللہ کا بتایا ہوا رستہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ سیدھ رستہ مطلب بالکل سیدھا رستہ نہ دائیں ہاتھ کی طرف نہ بائیں ہاتھ کی طرف بلکہ بغیر کی جھول کے بالکل سیدھی سیدھی لائن پر۔ مگر ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ثابت قدم نہیں رہتے اور ڈگمگاتے رہتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ تم میں سے کون سے لوگ زیادہ سیدھے رستے پر ہیں، وہ جو چلتے چلتے گر پڑتے ہیں یا وہ جو سیدھے سیدھے چلتے جاتے ہیں۔

یقینا ہم ایسے لوگوں میں سے ہیں جو چلتے چلتے گر پڑتے ہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہدایت کا معاملہ فرمائے، اور ہمارے دلوں کو روشن کرے تاکہ ہم جان سکیں کے جو ہم آگے بھیج رہے ہیں وہ برا ہے یا اچھا ہے۔

ہم لوگوں میں بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر ہماری تنہائیاں اور ہمارا اکیلا پن، یہ تو ہم خود ہی جانتے ہیں کہ ہم کس قدر اچھے ہیں اور ہمارے اعمال کا معیار کیا ہے۔ اگر ہم اپنے ظاہر کو دیکھیں تو شاید ہمیں ہمارا کوئی گناہ نظر ہی نہ آئے اور اگر آئے بھی تو شاید ہم یہ سوچ کر اس پر توجہ نہ دیں کہ یہ تو بہت ہی معمولی گناہ ہے۔ مگر دوسری طرح ہمارا اکیلا پن ہے، ہماری تنہائی ہے اور ہمارے وہ اعمالِ بد ہیں جن کو ہمارے سوا صرف ہمارا رب ہی جانتا ہے۔ ہمارا اصل وہی ہے جو ہمارے رب کے سامنے ہے نہ کو وہ جو ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اصل چہرہ وہ نہیں جو ہم دنیا کو دیکھاتے ہیں بلکہ اصلی چہرہ وہ ہے جو ہمیں آئینے میں دیکھتے ہیں۔ کاش ہم حقیقت کے آئینے میں اچھی طرح دیکھ سکیں اور اپنے گناہوں کا احاطہ کر سکتے اور اپنی مغفرت کا سامان پیدا کر سکیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ ہمیں ہمارے میسنے پن سے اور اس کے وبال سے محفوظ رکھے اور ہمیں سیدھا اور سچا رستہ دیکھائے۔ امین

اندھے کو راستہ

تحریر: میاں وقار الاسلام

اندھے کو بھی لاٹھی پکڑادی جائے تو وہ بھی راستہ ڈھونڈ سکتا اور اپنی منزل کا تعین کر سکتا۔ مگر جس شخص کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہوں اور دل مردہ ہو چکا ہو اسے کوئی راستہ نہیں دیکھا سکتا۔

اندر کے اندھیرے باہر کی روشنیوں سے دور نہیں ہوتے، بلکہ یہ روشنیاں انسان کو اور زیادہ اندھیروں میں لے جاتی ہیں۔ اور جن کے دلوں نے روشن ہوتا ہے، وہ اندھیروں میں عالمِ تنہائی میں اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے لیے نور تلاش کرتے ہیں ۔ تو اللہ مانگنے والوں کو مایوس نہیں کرتا اور ان کے دلوں کو منور کر دیتا ہے۔

جن لوگوں کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں کبھی دیکھ نہیں پاتیں، ان کے کان کبھی سننے کے صلاحیت نہیں پاتے اور اللہ کے ذکر سے دوری ان کے دلوں کو مردہ کر دیتی ہے۔ اللہ کا ذکر ہی ان کے دلوں کی بیماریوں کا علاج ہے۔ ان کا سب سے بڑا مرض یہ ہوتا ہے کہ یہ خود کو مریض ہی نہیں سمجھتے۔

جب دل ہی اندھے ہوں، تو پھر کیا چھوٹا گناہ اور کیا بڑا گناہ انسان وہ سب کچھ کرتا ہی چلا جاتا ہے جس کی طرف شیطان انسان کو اکساتا ہے۔ لوگ بے خوف سود کھاتے ہیں، بے خوف لوگوں کا حق مارتے ہیں، نڈر ہو کر کرپشن کرتے ہیں، پیسے اور اثر و رسوخ کی وجہ سے زنا کو بھی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ ان کی نظروں میں انسان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی، کسی کے جذبات سے کھیل جانا تو معمولی سی بات ہے یہ لوگوں کی زندگیوں سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ اور بے شرمی کے کاموں کو ایسے اختیار کرتے ہیں جیسے انہوں نے دنیا فتح کر لی ہو۔ نہیں نہیں، انہوں نے دنیا فتح نہیں کی بلکہ دنیا کے امتحان کو ہار دیا ہے اور اپنے لیے دوزخ خریدی ہے، اور انہوں نے کیا ہی برا سودا کیا ہے۔

اللہ تعالی مردہ دلوں کو جان بخشنے پر قادر ہے، اللہ خود فرماتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دل سکون پاتے ہیں اور یہ بھی کہ اللہ کا ذکر دلوں کی بیماریوں کا علاج ہے۔ اور اللہ دلوں کو پھیرنے پر بھی قادر ہے۔ اللہ دلوں کی مثال ایسے دیتا ہے جیسے پتھر ہیں یا اس سے بھی سخت اور پھر یہ بھی مثال دیتا ہے کہ پتھر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اللہ کے ذکر سے پھوٹ پڑتے ہیں اور ان میں سے چشمے نکل پڑتے ہیں اور دل ایسے پتھروں کی طرح بھی ہوتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ دلوں کا مرض جیسا بھی ہو اس کا شافی علاج بھی اللہ کے ہاں موجود ہے، مگر ہم کم ہی غور کرتے ہیں۔

بد گمانی بھی دلوں کا ایک اندھا پن ہے۔ جب ہم کسی کے بارے میں بد گمان ہو جاتے ہیں تو پھر کبھی نیک گمان نہیں ہوتے۔ یہ بھی دلوں کا ایک اندھا پن ہے۔ جب ہم اللہ سے رجوع کرتے ہیں تو ہماری بہت سی بد گمانیاں نیک گمانوں میں بدل جاتی ہیں تو ہم بجائے لوگوں کو بد دعائیں دینے کے ان کے حال پر رحم کی دعا کرتے ہیں اور ان کے لیے ہدایت مانگتے ہیں۔ بد حال لوگوں کے لیے ہدایت وہی مانگ سکتا ہے جو خود ہدایت پر ہو۔ ورنہ نفرت کی آگ میں تو انسان خود کو ہی جلا بیٹھتا ہے۔

سب سے آسان کام یہی ہوتا ہے کہ ہم لوگوں پر فیصلہ سنا دیں، کہ یہ ایسا ہے اور وہ ویسا ہے۔ اور سب سے مشکل کام یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود کٹہرے میں کھڑا کریں اور اپنے آپ سے پوچھیں کہ ہم کیسے ہیں۔ کیا ہم ایسے ہیں، یا پھر ہم ویسے ہیں۔ تو ہم ایسے ویسے جیسے بھی ہیں خود سے نظریں ملانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اللہ سے رحم مانگتے ہیں اور اللہ سے اپنی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ تو جیسی دعا ہم اپنے لیے کرتے ہیں ویسے دعا ہم دوسروں کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ انسان ہیں فرشتے تو نہیں ہیں۔

اللہ قادر ہے جو ہماری ایک ایک سانس کا حساب رکھتا ہے، اور قبول کرنے پر آئے تو شاید ہماری آخری سانس کی مغفرت بھی قبول کر لے اور مغفرت قبول کرنے پر نہ آئے تو شاید ہماری ساری عبادات بھی ہمیں کچھ فائدہ نہ دے سکیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں نفاق کا مرض اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ ہمارا رجوع بھی اللہ کر طرف جذوی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ کا فضل تو ہمیشہ سے جاری ہے مگر ہماری دعاؤں میں وہ اثر نہیں کہ ہماری صحت پر کچھ اثر ہو۔ دلوں کے مرض بڑھتے ہی جاتے ہیں ہم جوں جوں دعا کرتے ہیں۔ اور ہماری دعائیں بھی ہمیں فائدہ نہیں دیتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے رب کی ویسی قدر نہیں کرتے جیسی قدر ہمیں کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ ان سے کہ دیجئے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے تو ان سے کہیں کہ قران پڑھا کریں تاکہ ان پر رحم کیا جائے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ ہمارے مردہ دلوں کو زندگی بخشے اور ہمارے اندر کے اندھیروں کو اپنے نور سے منور کرے تاکہ ہمارے جینے کا بھی مقصد پورا ہو اور مرنے کے بعد بھی ہمیں رسوانہ ہونا پڑے۔ امین

دعا گو میاں وقار الاسلام

عنوان : بند گلیاں

تحریر : میاں وقار الاسلام

شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی بند گلی میں نہ پہنچا ہو، یہ بند گلی اس کی ناتمام خواہشوں کی بند گلی ہوتی ہے۔ انسان کی تمام خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، اور انسان جب بھی ٹوٹتا ہے یا بکھرتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک بند گلی میں ہی محسوس کرتا ہے۔

انسان کی زندگی میں تبدیلیاں بند گلی سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ جب انسان کو زندگی کا ٹھیک ٹھیک مطلب معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں سب کچھ اس کی خواہشات کے مطابق نہیں ہونا۔ یہاں بہت کچھ انسان کی خواہشات کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

جب چیزیں انسان کی خواہشات کے برعکس ہونا شروع ہوتی ہیں تو انسان کے اندر ایک ٹکراؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ ٹکراؤ کی کیفیت انسان کے اندر ایک توڑ پھوڑ شروع کر دیتی ہے، انسان کی شخصیت جن ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے وہ ستون ہلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اب وہ نہیں ہونے جا رہا ہوتا جیسا انسان نے سوچا ہوتا ہے۔

بند گلیوں سے انسان یا تو بھرپوری روشنیوں کی طرف آ جاتا ہے یا پھر اندھیری گلیوں میں کھو جاتا ہے۔ جو لوگ اندھیری گلیوں میں کھو جاتے ہیں، وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی پہچان بھی کھو جاتی ہے، اور جو لوگ بند گلیوں سے روشنیوں کی طرف نکل آتے ہیں وہ اپنی ایک الگ پہچان بناتے ہیں، ان کے لیے زندگی کا مطلب یکسر بدل جاتا ہے اور پھر وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔

بہت کمزور ہوتے ہیں وہ لوگ جو چند خواہشوں کے پیچھے اپنی زندگی کو موت سے بھی بدتر بنا لیتے ہیں۔ زندگی کا مطلب ہماری خواہشوں سے بہت بلند ہے، ہم دنیا میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں آئے۔ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہزاروں، لاکھوں لوگوں سے ان کے دکھ اور درد بانٹتے ہیں اور انہیں زندگی کے اندھیروں سے باہر لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ہی غموں میں ڈوبے رہتے ہیں اور پھر اتنا ڈوب جاتے ہیں کہ اپنے غموں سے باہر ہی نہیں آ پاتے۔

غموں کا بوجھ اُٹھانا بے شک آسان نہیں ہوتا، انسان کو زندگی میں ایسے ایسے شدید صدمات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو شاید موت سے بھی کڑے ہوتے ہیں۔ مگر یہی تو زندگی کا امتحان ہے، اسی امتحان سے ہی تو انسان نے نکل کر آگے آنا ہے۔ جو لوگ کڑے امتحانوں سے باہر نکل آتے ہیں

وہی لوگ زندگی کا ٹھیک مطلب سمجھ پاتے ہیں۔ جن لوگوں کو زندگی کے کڑے امتحانوں نے ہرا دیا ہو، پھر وہ کسی سے جیتنے کا حوصلہ اکھٹا نہیں کر پاتے، اور جو لوگ زندگی کے امتحانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے آئے ہوں ایسے لوگوں کو پھر کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

جن کے دلوں میں ڈر نہیں ہوتا ہو جیت کا سراغ لگاتے رہتے ہیں، اور جن لوگوں کے دلوں میں ڈر ہوتا ہے وسوسے ان کی جان نہیں چھوڑتے۔ وسوسے شیاطین ڈالتے ہیں اور ناکام لوگ ہی شیاطین کی پیروی کرتے ہیں۔ جنہیں اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے، وہ کبھی ناامید نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور جیت انہیں کا مقدر بنتی ہے۔

ہر قوم دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک حصہ خود کو بند گلی میں کھڑا محسوس کرتا ہے جب کہ دوسرا حصہ روشنیوں کے سراغ ڈھونڈنے میں مگن ہوتا ہے۔ پُر امید لوگ، ناامید لوگوں کی بھی امید ہوتے ہیں۔ اور ناامید لوگوں کو تو خود سے بھی کوئی امید نہیں ہوتی۔

کرونا کی وجہ سے بہت سے لوگ تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں، اور بہت سے ناامید ہو رہے ہیں، مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو منوا رہے ہیں اور اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں، انہیں اپن رب پر بھروسہ ہے کہ وقت بدلے گا اور زندگی بہت جلد اپنے معمول پر آ جائے گی۔ اور یہ دنیا بھر کے محنت کرنے والوں لوگوں کی وجہ سے ہوگا نہ کہ تھک ہار کر بیٹھے ہوئے ناکام لوگوں کی وجہ سے۔ جو اپنی مدد خود نہیں کرتے اللہ ان کی مدد کیوں کرے گا۔ دنیا بھر کے جرت مند لوگوں کی جرت کو سلام جو مشکل حالات کا سامنا ہمیشہ ڈٹ کر کرتے ہیں۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کرونا کی ان بند گلیوں سے جلد باہر نکال لائے جس طرح سے وہ ہم پر ہمیشہ مہربان رہا ہے۔ امین۔

میرا کتا، کتا تمہارا کتا ٹومی

تحریر: میاں وقار الاسلام

اللہ نے حضرتِ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اس کی یہ خاصیت ہے کہ اسے جو ذہن دیا گیا ہے وہ مختلف سوچ سکتا ہے، پسند اور ناپسند میں فرق کر سکتا ہے، اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے اور اس کا انداز فکر اور اندازِ بیاں بھی دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے۔

بولنے، چلنے، ہنسنے، رونے یہاں تک کے بیٹھنے کے انداز بھی جداگانہ ہیں۔ عقائید میں بھی زمین آسمان کر فرق پایا جاتا ہے۔ اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہی سب کی اپنی اپنی ایک الگ پہنچان اور الگ مقام بھی ہے۔

کچھ لوگوں کا ہنسنا کچھ لوگوں کو زہر لگ سکتا ہے، مگر دوسری طرف کچھ لوگوں کو اسی طرح کا ہنسنا اچھا بھی لگ سکتا ہے۔ رہن سہن کے حساب سے بھی لوگوں کے انداز بدلتے رہتے ہیں، دہاتیوں کے رویے الگ ہیں، شہریوں کے رویے الگ ہیں، پڑھے لکھے لوگوں کے رویے الگ ہیں اور ان پڑھ لوگوں کے رویے الگ ہیں۔ کچھ لوگ کم جذباتی ہوتے ہیں، کچھ زیادہ، کچھ بلکل سیدھے ہوتے ہیں اور کچھ جلیبی سے بھی زیادہ ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ اور لوگ منافق بھی ہوتے ہیں، جان نچھاور کرنے والے بھی ہوتے ہیں، انتہا کے فضول خرچ بھی ہوتے ہیں اور انتہائی کنجوس بھی ہوتے ہیں۔

ہر انسان اپنے بارے میں اور لوگوں کے بارے میں ایک رائے رکھتا ہے، پھر اسی کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے لوگ اس کے دوست بنتے جاتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں نہ ملانے والے لوگ اس کے مخالف بھی ہوتے جاتے ہیں۔ عادتیں بہت مشکل سے بدلتی ہیں مگر بہت سے لوگ اپنے آپ کو یکسر بدل بھی لیتے ہیں۔ بات سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے مراحل طے کرنے کی ہے یا پھر جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ ہوتی ہے اس کو گنوانے کی بھی مراحل ہوتے ہیں۔

بہت سے انسانوں کو یہ لگتا ہے کہ جو وہ کر رہے ہیں وہی بالکل ٹھیک ہے اور جو دوسرے کر رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے، مگر کچھ لوگ سطحی سوچ نہیں رکھتے اور وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسرے کے احساسات کو بھی سمجھتے ہیں اور اس بات سے حیا محسوس کرتے ہیں ان کے بولے ہوئے الفاظ سے دوسروں کو تکلیف ہے۔ اور بنیادی طور پر یہی اسلام کا درس بھی ہے کہ ایک مسلمان کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور ایک جماعت دوسری جماعت کو تکلیف نہ دے۔

باوجود اس کے کہ ہم بہت زیادہ علم رکھتے ہیں، مگر پھر بھی ہم پر عقل و فہم سے زیادہ اپنے جذبات حاوی ہو جاتے ہیں اور ہم تلخ باتوں کو پینے کی بجائے بول جاتے ہیں اور انجانے یا جانتے بوجھتے ہوئے دوسروں کی دل آزاری کرتے چلے جاتے ہیں، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ دوسروں کی دل آزاری بھی بہت سے گناہوں کی طرح ایک گناہ ہے۔

بعض دفعہ ہم اپنے دلوں میں اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ بڑی سے بڑی بات بھی برداشت کر جاتے ہیں اور بعض دفعہ اتنے تنگ دل ہو جاتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی برداشت نہیں کر پاتے۔

شاید وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے رویے سخت ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہم اپنے سوچ اور اپنی رائے کے خلاف سننا پسند نہیں کرتے۔ کم عمر اور زیادہ عمر کے لوگ جب ایک ہی سوشل پلیٹ فارم پر ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں تو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک طرف بولنے والا 18 سال کا بھی ہو سکتا ہے اور دوسری طرف بولنے والا 60 سال کا بھی ہو سکتا ہے، یا پھر ایک بہت زیادہ علم والا ہو سکتا ہے اور دوسری طرف انتہا کا جاہل۔

کچھ باتوں کا شعور وقت کے ساتھ بھی آ جاتا ہے، اور کچھ باتوں کا شعور لوگوں کو مرتے دم تک بھی نہیں آتا۔ بر حال بہت سے انسان ایک دوسرے سے مخاطب ہوں اور اختلاف رائے نہ رکھیں یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں، مگر ایک چیز اگر ہم دل بڑا رکھیں اور اپنے آپ میں تنگ دل نہ ہو تو وہ ضرور ممکن ہے کو سامنے والے انسان کو بھی انسان سمجھیں، اور اگر آپ نے تھوڑا زیادہ پڑھ لیا ہے اور دوسرے نے تھوڑا کم پڑھ لیا ہے، یا پھر ایک گاؤں میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا شہر میں پیدا ہوا ہے، یا پھر ایک دوسرے مسلک میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا دوسرے مسلک میں پیدا ہوا ہے تو قصور کسی کا بھی ہیں ہے، شاید سب کو ایک جیسے حالات فراہم نہیں ہوتے، اور ہوں گے بھی کیوں، اس دنیا کا نظام ہی ایسا ہے کہ لوگوں کو اوپر نیچے ایک فرق کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے خدمت لے سکیں۔ تو اللہ کے بنائے ہوئے اس نظام پر نہ تکبر کریں اور نہ ہی رنجیدہ ہوں بلکہ شکر ادا کریں صبر کریں اور لوگوں کا احساس کریں۔

آپ کا پڑھ لکھ جانا، آپ کا امیر یا غریب ہونا، آپ کا اعلیٰ حسب نصب ہونا یہ آپ کا کمال نہیں ہے بلکہ اللہ کی عطا ہے۔

ہو سکتا ہے جس شخص کے بارے میں ہم انتہائی بدگمان ہوں، وہ ہم سے اچھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے بارے میں ہم نیک گمان رکھتے ہوں وہ انتہائی برا ہو۔ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔

شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بہت زیادہ گمان نہ کیا کرو بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

اپنے آپ کو گھنٹوں آئینے میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اپنے حسن اور اپنے کمال پر اترانا کون کسے منع کر سکتا ہے، مگر دوسروں کو حقیر سمجھانا انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنا، ان کی ہر سوچ کو جہالت سے مثال دینا اور اپنی سوچ کو اعلیٰ سے اعلیٰ گردانناس سب میں کچھ نہ کچھ توازن ضرور ہونا چاہیے۔ اللہ کو نہ تو کسی کا اترانا پسند ہے اور نہ ہی کسی کا غرور پسند ہے، انسان کی پہچان ہی عاجزی اور انکساری سے ہے، ورنہ بھونک تو کتے بھی بہت اچھا لیتے ہیں چاہے وہ اعلیٰ نسل کا ٹومی ہو یا پھر گلیوں میں گھومنے والا آوارہ بے نام کتا۔

ایک کی ٹوپی دوسرے کے سر

تحریر: میاں وقار الاسلام

عوام یہ سوچ کر تقسیم ہو رہی ہے کہ اُس کے ساتھ کس حکومت نے اچھا کیا اور کس حکومت نے اچھا نہیں کیا، جبکہ کسی نے بھی اچھا نہیں کیا, .بس ایک کی ٹوپی دوسرے کے سر اور دوسرے کی ٹوپی تیسرے کے سر اور پھر تیسرے کی ٹوپی چوتھے کے سر اور پھر چل سو چل

قابض لوگ قابض تھے اور مغلوب لوگ مغلوب تھے اور یہ سلسلہ بھی تھمتا نظر نہیں آتا. شاید قابض لوگ ہی قابض رہیں گے اور مغلوب .لوگوں نے مغلوب ہی رہنا ہے

.کہتے ہیں کہ جب کینسر لاعلاج ہو جاتا ہے تو پھر اس کا علاج ممکن نہیں ہوتا، ہر دوا بے اثر ہو جاتی ہے اور کوئی طریقہ کام نہیں کرتا

پرانی امتیں اس لیے تباہ نہیں کی گئی تھیں کہ اللہ انہیں تباہ کرنا چاہتا تھا مگر ان کی حالت یہاں تک خراب ہو چکی تھی کہ وہ ہمیشہ حق کے مقابلے میں باطل قوت کا ساتھ دیتی تھیں اور حق سے انہیں لگتا تھا کہ انہیں سوائے نقصان کے کچھ نہیں ملنا. اور انہیں لگتا تھا جو وہ کر رہے ہیں وہی .ٹھیک ہے اور پھر ان کی بربادیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے حق میں کیا برا تھا جو پھر ہو کر رہا

ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہم ایک جھوٹے کو چھوڑتے ہیں تو دوسرے جھوٹے کے پیچھے صف باندھ لیتے ہیں اور دوسرے جھوٹے کو چھوڑتے ہیں تو تیسرے جھوٹے کے پیچھے صف باندھ لیتے ہیں اور چوتھا جھوٹا تو خود کو خوش قسمت تصور کئے بیٹھا ہے کہ اب اگلی بار اس کی ہے. اور مجھے یقین ہے کہ سبز باغ دیکھنے والی قوم تیار بیٹھی ہے کہ اسے ایک اور لوٹنے والا سربراہ میسر آئے اور یہ اس کے پیچھے ہو لے تاکہ یہ ٹوپی بدلا بدلی کا کھیل .چلتا رہے

ہمیں بین ڈالنے والی عورتوں کی طرح بعد میں رونے کی عادت ہے جب وہ بیوہ ہو جاتی ہیں. مگر جب یہ سہاگن ہوتی ہیں تو اپنے سہاگ کی سب .سے بڑی دشمن بھی خود ہوتی ہیں

جب پی پی پی یا پھر نون لیگ لٹ رہی تھی یا لوٹ رہی تھی تو بھنگڑے ڈالنے والے بھی ان کے اپنے لوگ تھے اور بعد میں بین کرنے والے بھی ان کے اپنے لوگ تھے.

آج پی ٹی آئی کا بھی یہی حال ہے، آج بھنگڑے ڈالنے والے بھی ان کے اپنے لوگ ہیں اور بعد میں بین کرنے والے بھی ان کے اپنے لوگ ہوں گے.

اور ٹوپی..... وہ کسی اور کو پہنا دی جائے اور پھر مست رقص ہو گا.

نچانے والوں نے ادھا ملک گنوا دیا مگر آج تک اس مراثی کا سوراغ نہیں ملا وہ مراثی جو یقیناً صرف ٹوپی کا ہی نہیں بلکہ ایک عدد پگڑی کا بھی حق دار ہے. جی ہاں وہی پگڑی جو اس نے اس قوم کی مٹی میں رل گئی.

یااللہ ہم پر رحم فرما اور آستین کے سانپوں سے ہمیں محفوظ رکھ، باہر والے اژدھوں سے تو ہم لڑ سکتے مگر اندر والے شریں زبان اور سیاہ دل منافقوں کے وار زیادہ خطرناک ہوتے ہیں.

امین... دعا گو میاں وقار الاسلام

بدگمانی شیطان کی کھلی پیروی ہے

تحریر: میاں وقارالاسلام

اللہ تعالی فرماتا ہے کہ ہم لوگوں کو ان کے عقیدے صحیح کرکے دیکھا دیتے ہیں ایک اور جگہ آتا ہے کہ شیطان لوگوں کو ان کے اعمال بدآراستہ کر کے دیکھاتا رہتا ہے ایک اور جگہ فرمان ہوتا ہے کہ لوگ اپنی خواہشات کو معبود بنا لیتے ہیں۔

اگر ہم کسی انسان کے بارے میں برا گمان رکھتے ہیں تو اس شخص کی تمام اچھایاں ہم سے مخفی کر دی جاتی ہیں ہماری آنکھیں چاہتے ہوئے بھی اس کی اچھائی نہیں دیکھ پاتیں

اسی طرح اگر ہم کسی شخص کے بارے میں نیک گمان رکھتے ہیں تو اس کی غلطیاں ہمیں نظر نہیں آتیں اور ہمیں سب اچھا اچھا ہی نظر آتا ہے

یہ دونوں انتہائیں ہیں جو ہمیں حق سے دور لے جاتیں ہیں۔ایک طرف خوشامد ہے اور دوسری طرف نفرت ہے دونوں انتہائیں بدگمانی کی بڑی بڑی چٹانیں ہے۔نہ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی کو نفرت کا نشان بنائیں اور نہیں یہ چاہیئے کہ ہم کسی کو خوشامد کا نشان بنائیں دونوں انتہائیں ہمیں اتنی ہی انچائی سے گراتی ہیں جتنا بڑا رائی کا پہاڑ ہم اپنے دل میں بناتے ہیں۔

اگر ہم حقیقت کے آئینے میں دیکھتے رہیں تو نہ ہی ہماری خواہشیں رائی کا پہاڑ بنیں اور نہ ہی ہم مایوس اور ناامید ہوں۔پھر انسانوں سے لگائی ہوئی امیدیں اور بھرم اکثر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ہمیں اپنی امیدیں اپنے رب سے رکھنی چاہیں کیوں کہ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ رہنے دیتا اور جسے چاہتا ہے اندھیروں سے نکال لاتا ہے۔اور بہت سے لوگ روشنیوں سے پھر اندھیروں میں چلے ہیں اور مدد ہمیشہ اللہ کی طرف سے ہے

اے ایمان والو زیادہ تر گمانوں سے بچا کرو بیشک بعض گمان (ایسے) گناہ ہوتے ہیں (جن پر اُخروی سزا واجب ہوتی ہے) اور (کسی کے عیبوں اور رازوں کی) جستجو نہ کیا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی کیا کرو، کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے، سو تم اس سے نفرت کرتے ہو۔اور (اِن تمام معاملات میں) اللہ سے ڈرو بیشک اللہ توبہ کو بہت قبول فرمانے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔

اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کو برا نہ کہے ہو سکتا ہے وہ اس سے اچھی ہو۔

ایک جگہ اور فرمان ہوتا ہے کہ جسے تم سمجھتے ہو کہ تمارے حق میں بہتر ہے ہو سکتا ہے کہ دنیا اور آخرت کے حساب سے وہ تمہارے حق میں بہتر نہ ہو اور جسے تم سمجھتے ہو کہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت کے حساب سے تمہارے حق میں بہتر ہو

اور پھر جو مصیبتیں یا آزمائشیں ہم پر آتیں ہیں ہم نہیں جانتے کہ اس سے ہمارے حق میں اچھائی مقصود ہے یا برائی۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ ہم تم میں فاصلے نہ رکھتے رہتے تو کرہ عرض تباہ ہو جاتا۔

اللہ ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں ہر طرح کی بد گمانی سے محفوظ رکھے آمین۔

دماغی لاک ڈاؤن

تحریر: میاں وقار الاسلام

بظاہر تو لاک ڈاؤن کھل چکا ہے، مگر جو لاک ڈاؤن عام انسانوں کے دماغوں پر لگے ہوئے ہیں انہیں شاید کھولنے میں بھی کافی وقت درکار ہے۔ لوگ بظاہر تو دفاتر میں آنا شروع ہوگئے ہیں مگر ان کا موجود ہونا بھی نہ ہونے کے برابر ہی ہے۔

ایس او پیز تو بنا دیے گئے ہیں مگر ان ایس او پیز پر عمل کرنے والے لوگ تقریبا نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کمپنی کے وی آئی پیز تو شاید ہی ماسک پہنتے ہوں۔ میڈل اور لوئر کلاس تو ماسک صرف گلے میں پہنتی ہے۔ میٹنگ رومز میں بھی ماسک کو گلے میں پہننے کا فیشن عام ہے۔

کرونا کرونا کرتے کرتے سارے ہی کرونا ہوگئے ہیں۔ پہلے تو کمپنیوں میں سرے سے کام ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو وہ کرونا کی داستاں سنتے سنتا گزر جاتا ہے۔ ہر دماغ میں ایک الگ قسم کی سوچ موجود ہے اور ہر کوئی اپنی اپنی کہانی کو سچا مانتا ہے اور سب ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانیاں مرچیں اور مسالے لگا لگا کر سنانے میں مصروف ہیں۔ لوگوں کو ابھی سنجیدہ ہونے میں بہت وقت لگے گا۔

سکول تو کھول دئے گئے مگر سکولوں کی حالت شاید سب سے بری ہے۔ جس طرح ایس او پیز کا خیال کارپوریٹ سیکٹر میں نہیں رکھا جا رہا اسی طرح سکولز کی حالت بھی اس سے اچھی نہیں۔ کچھ سکولوں کو ایس او پیز کی خلاف ورزی کی وجہ سے دوبارہ بند کر دیا گیا ہے اور جانے کتنوں کو دوبارہ بند کیا جائے گا۔

لوگ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ رہے ہیں مگر دوسری طرح سیکنڈ ویو کا بھی خدشہ ہے۔ اور شاید ایک یہ بھی وجہ ہے کہ لوگ ابھی پوری طرح تیار نہیں۔ خاص کر کے ایسے کاروبار جو کرونا کی وجہ سے بری طرح تباہ ہوئے ان میں پہلے جیسی ہل چل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نہ سٹاف پہلے کی طرح تیار ہے، نہ کلائنٹس پہلے کی طرح متحرک نظر آتے ہیں اور نہ ہی کمپنیوں کے مالک کاروبار میں دوبارے سے سرمایہ کاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شاید ہم نے ماضی قریب میں اس طرح کے حالات پہلے نہیں دیکھے۔ لاک ڈاؤن اگر پھر سے نہ بھی لگا، یا پھر سے کچھ عرصہ کے لیے لگ کر پھر سے کھول دیا پھر بھی حالات بدلتے بدلتے ہی بدلیں گے۔ لوگوں کے دماغی لاک ڈاؤن کو کھولنے کی ضروت موجودہ وقت میں بھی ہے اور مستقبل قریب میں بھی رہے گی۔

مہنگائی اور سیاسی حالات اور حکومتی اقدامات اور علاقائی امن وآمان کے معاملات نے عوام کو عجیب شش وپنج میں رکھا ہوا ہے۔ لوگوں کے دماغی لاک ڈاؤن کو کھولنے کے لیے بھی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور ملکی اور غیر ملکی اداروں کو آگے آنا پڑے گا اور لوگوں کی دوبارہ سے کام میں دلچسپی بڑھانے کے لیے اقدامات کرنے پڑیں گے اور چھوٹا سرمایہ کار جو کہ پہلے سے ہی ڈوب چکا ہے اسے واپس اوپر کی طرف اُٹھانے کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت بہتر حکمتِ علمی کا مظاہرہ نہیں کرتی تو شاید لوگ کام کی طرف واپس تو آ جائیں گے مگر اس میں بہت وقت ضائع ہو چکا ہو گا۔

قدرتی آفات سے جو نقصان ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے، مگر جو قومیں تیار ہوتی ہیں وہ اس نقصان سے خود کی بچانے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے نقصانات کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور دوسری شاید ہمارے جیسی ہوتی ہیں، اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ اللہ ہم پر رحم کرے اور ہمیں قدرتی آفات کے بعد دماغی لاک ڈاؤن کی آفت سے بھی بچائے آمین۔

تلخ ہے مگر حقیقت ہے

تحریر : میاں وقار الاسلام

زندگی میں ہم بہت سے لوگوں سے یا تو بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں یا پھر بہت جلد بیزار ہو جاتے ہیں۔ یا تو ہم ان کی اچھائیاں پہچاننے سے قاصر ہوتے ہیں یا پھر ہمیں ان کی برائیاں ہی نظر نہیں آتیں۔

ایک طرف تو جانے پہچانے کرپٹ لوگ ہیں، جنہیں کچھ لوگ آج بھی کرپٹ ماننے سے انکاری ہیں، اور دوسری طرف بھی جانے پہچانے نالائق لوگ ہیں، جنہیں کچھ لوگ آج بھی نالائق ماننے سے انکاری ہیں۔

آرڈر، آرڈر، آرڈر والوں کے ہاتھ میں سوائے آرڈر کے ہتھوڑے کے اور کچھ بھی نہیں، اور جو لوگ یہ ہتھوڑا لہراتے تھے آج یہ ہتھوڑا انہیں کے سر پر زیادہ ہے، یا پھر عام عوام کے سر پر ہے۔

جب کرپٹ لوگ حکومت کر رہے تھے تو انہیں کسی نے نہیں روکا اور وہ کرپشن کرتے کرتے اپنے ادوار سے گزر گئے۔ جبکہ ہر جگہ کرپشن، کرپشن کے نعرے بھی تو فلک شگاف تھے، مگر جنہوں نے انصاف کرنا تھا وہ ان نعروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

عوام کا خون جیسے کل جل رہا تھا ویسے آج جل رہا ہے۔

اور پھر آئے نالائق ترین لوگ، جو گلا پھاڑ پھاڑ کر سب کو کرپٹ کہتے تھے اور سبز باغ دیکھاتے تھے، کل گلی گلی میں شور تھا کہ نواز شریف چور تھا، آج گلی گلی میں شور ہے کہ عمران تیری ساری گنگنا میلی ہے، تیرے سارے لوگ نااہل ہیں۔

لگتا ہے کہ اس شور سے کوئی بیٹھا لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اور مزے لے رہا ہے۔ یہ مزے عوام کو اتنے ہی مہنگے پڑنے والے ہیں، جتنے مہنگے کل کرپشن کے نعرے پڑے تھے۔

عوام کا خون جیسے کل جل رہا تھا ویسے آج جل رہا ہے۔

خدا کرے کہ جن کے ہاتھوں میں ریموٹ کنٹرول ہے وہ یہ تماشہ دیکھنا بند نہ کریں، کیوں کہ جب وہ تماشہ دیکھنا بند کرتے ہیں تو جمہوریت کاٹی وی ہی اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ پھر نیشنل ٹی وی اگلے دس سے پندرہ سال تک کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔

تلخ ہے مگر حقیقت ہے

نمائندہ تصویریں

تحریر: میاں وقار الاسلام

کہتے ہیں کہ بعض دفعہ کچھ خاموش تصویریں ہمیں چیخ چیخ کر بہت کچھ بتا رہی ہوتی ہیں مگر معاشرے کے بہت سے لوگ سننے کی صلاحت سے محروم ہوتے ہیں اور معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھتے اور پھر دیر ہو جاتی ہے۔

یہ تصویر اس وقت کی ہے جب ہیں عین میدان جنگ میں ہیں اور نہیں جانتے کہ اگلے ہی لمحے کیا ہونے جا رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنی بے وقوفیوں کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پر قدرت مہربان ہو جائے اور ہماری جہالت کی وجہ سے ہم سے کچھ نرمی ہو جائے۔

ایک طرف ایک ایسی تصویر ہے جو کہا جاتا ہے کہ سیاست دانوں کے بچوں کی تصویر ہے جو کرونا سے بچاو کی کٹس سے کھیل رہے ہیں، ہو سکتا ہے یہ بیوروکریٹس کے بچے ہوں یا ذخیرہ اندوزوں کے بچے ہوں جنہیں ان حفاظتی کٹس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔

دوسری طرف ایک ایسی تصویر ہے جو کہا جاتا ہے لیڈی ڈاکٹرز کی ہیں جو کرونا سے بچاو مہم کا حصہ ہیں وہ ایسے ڈاکٹروں اور ایسی نرسوں کی نمائندگی کر رہی ہیں جو اس وقت ملک اور قوم کے لیئے قربانی دے رہی ہیں، باوجود اس کے کہ ان کے پاس حفاظتی سامان بھی مکمل نہیں مگر انہیں ملک اور قوم کی پریشانی کا مکمل احساس ہے باوجود معلوم ہونے کے کہ کرونا سے لڑنا بغیر حفاظتی کٹس کے خطرے سے خالی نہیں پھر بھی انہیں مکمل احساس ذمہ داری ہے۔

وہ لوگ جو اس وقت بھی صرف اپنے لیے یا پھر اپنے فائدے کے لیئے سوچ رہے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ اگر یہ مشکل انہیں کے سروں پر آ گرے تو پھر یہی ڈاکٹرز ہی ہوں گے جنہوں نے ان کو اس مشکل سے باہر نکالنا ہے۔

خدا کے لیے حالات کو سنجیدگی سے لیں، کہتے ہیں کہ جان بچی تو لاکھوں پائے، ہم اس مشکل سے نکل جائیں تو پھر یہ غیر سنجیدہ لوگ حفاظتی کٹس کی پتنگیں بنا کر بھی اڑاتے رہیں تو کوئی ان سے کچھ نہیں پوچھے گا

خدا کے لیے اس وقت کو ہر گز ضائع مت کریں جن قوموں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا وقت نے انہیں پھر سنجیدہ ہونے کا موقع بھی نہیں دیا، ایسے لوگوں کی قسمت پر اب دنیا رو رہی ہے۔

خدا کے لیے نہ اپنا مذاق بنائیں اور نہ اپنے ملک اور قوم کا مذاق بنائیں، کچھ اچھا نہیں کر سکتے تو خدا کے لیئے کچھ برا بھی نہ کریں۔

اللہ ہمیں اس پریشانی اور آزمائش سے جلد نجات دلائے، اور ہمارے ان محسنوں کی حفاظت کرے جو ہر طرح سے انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں

دعا گو، میاں وقار الاسلام

یا پھٹ پڑنا Out Brust

تحریر : میاں وقار الاسلام

آوٹ برسٹ ایک کیفیت ہے جب ہم صبر کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں اور پھٹ پڑتے ہیں۔ خوشی اور غم کی طرح غصہ بھی ایک فطری کیفیت ہے جو کم یا زیادہ مقدار میں ہم سب میں پائی جاتی ہے کچھ لوگ غصہ کے بالکل پی جاتے ہیں کچھ لوگ بالکل بھی نہیں پی پاتے اور کچھ لوگ اسے وقتی طور پر دبا کر انتقام کے لیئے بعد میں استعمال بھی کرتے ہیں۔

کم غصہ کرنے والے کو ٹھنڈا، دھیما بعض دفعہ انتہائی سمجدار اور بعض دفعہ انتہائی بے وقوف بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح زیادہ غصہ کرنے والے کو بعض دفعہ بہادر، جذباتی یا پھر پاگل بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس کی جو تیسری قسم ہے جو غصہ پی تو جاتی ہے مگر بدلہ لیئے بغیر نہیں رہ سکتی اسے شاطر، چلاک، سائیکو یا پھر سر پھرا مجرمانہ ذہن بھی مانا جاتا ہے۔

کچھ لوگ غصے کو اصولوں کا پابند کر لیتے ہیں تو ان کا جنون انہیں کسی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا غصہ انہیں کسی اصول پر کھڑا ہی نہیں رہنے دیتا تو وہ ہر میدان میں سر پٹختے پھرتے ہیں اور انہیں کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اگر کچھ حاصل ہو جائے تو وہ بھی گنوا دیتے ہیں۔ وہیں کچھ لوگ غصے کو شاطرانہ استعمال کرتے ہیں وہ مالدار بھی ہو جاتے ہیں اور طاقتور بھی مگر لوگوں کے دلوں میں ان کے لیئے شدید نفرت ہوتی ہے یہ یا تو اپنے دشمنوں کو مار دیتے ہیں یا کوئی ان کا ستایا ہوا کسی دن انہیں مار دیتا ہے۔

جب کسی انسان کی خوبیوں کو گنا جاتا ہے تو اس کے غصے کی کیفیت کو اچھی طرح پرکھا جاتا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی ذہین ہو اگر وہ اپنے مزاج پر قابو نہیں پا سکتا تو کوئی بھی ادارہ اسے لمبے عرصے تک اپنے ساتھ نہیں رکھتا یہ جہاں بھی جاتے ہیں اپنا مزاج ظاہر ہوتے ہی نکال دیئے جاتے ہیں۔ پھر یہ اگر ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے بھی ہیں تو بہت جلد نیچے گر پڑتے ہی۔

کامیابی کے لیئے اپنے مزاج پر قابو رکھنا بنیادی ضرورت ہے۔ نہ صرف معاشرے میں بہتر مقام پانے کے لیئے یہ ایک ضروری عمل ہے بلکہ ذاتی زندگی میں ٹھہراو لانے کے لیئے بھی یہ بے حد ضروری ہے۔

بطور مسلم بھی ہم پر غصہ حرام کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ نیکیوں کو کھا جاتا ہے۔ عملی میدان میں غصہ آپ کی قابلیت کو کھا جاتا ہے۔

ہم مختلف مزاج کے لوگوں سے ملتے ہیں جن سے ہماری ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوتی وہاں کچھ ماحول زیادہ گرم رہتا ہے۔ اگر ہماری طبعیت میں تھوڑی گرمی پہلے سے ہی موجود ہو تو جن لوگوں سے ہماری ہم آہنگی نہیں ہوتی انہیں اس سے کھیلنے کا پورا فائدہ ملتا ہے۔ وہ ہمیں اس لیئے تنگ کرتے ہیں کیوں کہ ہم تنگ ہوتے ہیں۔ اگر ان پر ثابت کر دیا جائے کہ آپ کے مزاج میں ٹھہراؤ ہے اور آپ کو ان کی حرکتوں سے فرق نہیں پڑتا تو ایسے لوگ جلد اپنا ٹارگٹ بدل لیتے ہیں ورنہ جب تک آپ ہیں انہیں کوئی دوسرا شکار نہیں چاہیئے۔

پھر جو لوگ ہر وقت غصے کی کیفیت میں رہتے ہیں یہ ان کا مسئلہ ہے اس پر ری ایکشن دے کر ان جیسا بننا ضروری نہیں۔ انگریزی میں ایک محارہ ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اگر آپ چوہوں کی ریس میں شامل ہوتے ہیں اور جیت جاتے ہیں تو خوش ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آپ کا شمار چوہوں میں ہی ہوگا۔

اس لیئے ہر طرح کے لوگوں کے معیار پر جانے یا گرنے کی یا پھر ان کی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ معیاری زندگی کے لیئے ضروری ہے کہ اپنا ایک معیار سیٹ کریں اور پھر اپنے دشمن اور دوست بھی بنائیں تو معیاری بنائیں۔ تاکہ زندگی کا توازن برقرار رہے۔

کہتے ہیں کہ بے وقوف دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ مطلب دشمنی کا بھی معیار ضروری ہے۔ دوستی کا تو اپنی جگہ

انسان کی کمزوریاں مارکیٹ میں اس کا دام نہیں بڑھاتیں بلکہ انسان کے مضبوط پہلوؤں کی وجہ سے اس کی قیمت بنتی ہے۔ اپنی کمزوریں پر پردہ ڈالیں جنہیں اپ خود سے دور نہیں کر سکتے اور اپنی وہ خوبیاں جو دنیا سے پوشیدہ ہیں ان پر محنت کریں انہیں سامنے لائیں اور خود کو منوائیں۔

اللہ تعالی نے ہر انسان میں ایسی خوبیاں رکھی ہیں جو اسے آسمان تک لے کر جا سکتی ہیں مگر ساتھ ہیں انسان کے اندر کچھ ایسی خامیاں ہوتی ہیں جو اسے زمین سے ہی نہیں اٹھنے دیتیں۔ اس بات کا احاطہ ضرور کریں کہ کون سی چیز آپ کے مقام کو زمین سے الگ نہیں ہونے دے رہی۔ خود کو پرواز کے قابل بنائیں دیکھیں ہمارا آسمان کس قدر وسیع ہے اس وسعت کو اپنے غصے کی تنگ نظری میں بند نہ کریں اسے کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

مائینڈ یور پوسٹ
تحریر : میاں وقار الاسلام

بد قسمتی سے ہماری ضرب المثل کو تو اتنی ضربیں لگ چکی ہیں کہ کچھ ہی ضربیں مثال کے طور پر یاد دلائی جا سکتی ہیں جیسا کہ پہلے تولو پھر بولو جس کے مفہوم میں گورا کہتا ہے مائنڈ یور لینگویج اور اسلام کہتا ہے کہ اگر کوئی خبر سنو تو پہلے اس کی تصدیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تمہاری لاعلمی یا تمہارے غلط خبر پھیلانے کی وجہ کسی جماعت کا نقصان ہو جائے

اگر دیکھا جائے تو کم یا زیادہ ہم سارے ہی بغیر تصدیق کے روزانہ کچھ نہ کچھ شئیر کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، یا تو ہم اندھی خوشامد میں جانتے بوجھتے ہوئے غلط خبر کو آگے پھیلاتے ہیں یا پھر اندھی تنقید میں جو بھی خبر جسے ہم ناپسند کرتے ہیں اسے اس کے خلاف پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کسی کی خوشامد بھی گناہ کے ذمرے میں آتی ہے اور کسی پر بہتان بھی گناہ کے ذمرے میں آتا ہے۔ مگر پھر بھی ہم ایسا کرتے ہیں کیوں کہ سب ہی تو ایسا کرتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ سب جو کریں وہ ٹھیک بھی ہو

اداروں کے سربراہان ہوں جیسے سیاسی، مذہبی یا عسکری سربراہ، یا خود ادارے ہوں جنہیں ہم اچھا نہیں سمجھتے تو جو ہمارے ذہن سے میل کھاتا ہے ہم بڑھ چڑھ کر اس کی بری تشہیر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ہم اپنا ذہن بناتے ہیں اور باقی کا کام ہمارا غیر ذمہ دار میڈیا کر دیتا ہوں کیوں کہ میڈیا کو پڑھنے، سننے اور دیکھنے والے جو ملے ہیں ان میں بہت سے غیر ذمہ دار ہیں اس لیئے میڈیا کی تو جیسے پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں

اسی طرح عوام کی بھی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں جاتا ہے مگر یہاں فرق یہ ہوتا ہے کہ گھی ضرورت سے زیادہ ہی گرم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ جماعت کسی اور کا نقصان تو کیا کرے گی اپنا ہی نقصان کرتی جاتی ہے۔

انفرادی طور پر کیئے جانے والا عمل جب اجتماعی اعمال کی شکل میں سامنے آتا ہے تو یہ معاشرے کا آئینہ دار بنتا ہے اور پھر یہی ہماری پہچان بن جاتی ہے۔ پھر ہم خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ ہاں ہم جذباتی قوم ضرور ہیں مگر ہم دل کے برے نہیں ہیں۔ یقین مانیئے مجھے سب سے بڑی منافقت اسی بات میں نظر آتی ہے جب کہا جاتا ہے کہ ہم دل کے برے نہیں ہیں۔

یعنی آپ ایسے الفاظ کا چناو کریں جس سے لوگوں کے دل چھلنی ہو جائیں اور بدلے میں وہ اس سے بھی تلخ بات کریں جس سے آپ کا دل بھی چھلنی ہو جائے اور دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو کوستے ہوئے ٹاپک ہی بدل لیں۔ اور پھر یہ بھی سمجھیں کہ ہم تھوڑے سے تو لوگ

ہیں سب تو ایسے نہیں ہیں، تو یہ بھی سمجھیں کہ اگر تھوڑے سے لوگ ایسے ہیں تو ایسے ہی لوگ تھوڑے سے جھوٹے اور منافق لوگ بڑی جماعت کی نمائندگی کر جاتے ہیں اور ساری جماعت کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔

تھوڑے سے وکیل تھوڑے سے ڈاکٹر تھوڑے سے سیاست دان تھوڑے سے جرنلسٹس اور تھوڑے سے ادیب اور بس رائے بن گئی سب کے بارے میں کہ یہ ہوتے ہی بے حس ہیں کیوں کہ ہم غیر ذمہ داری سے ان کی تھوڑی سی برائی کو یا تھوڑی سی بے بنیاد خبروں کو یا پھر تھوڑے سے جھوٹ کو اتنا پروموٹ کر دیتے ہیں کہ وہ سچ نظر آنے لگتا ہے۔

ہماری طرف سے تو یہ مزاح کا پہلو رہا ہم نے بات کی اور بھول گئے جیسے میڈیا والوں نے بے شرمی سے غیر مصدقہ خبر لگائی اور پھر دانت دیکھا دیکھا کر شوخی سے معذرت کر لی اور ذمہ داری پوری کر لی مگر ذمہ داری یہاں پوری نہیں ہوتی بلکہ یہ آگے چل کر انہیں خبروں کو آگے پیچھے لگا کر اسے مزید تڑکے دے کر اچھے خاصے تمسخر کے طور پر سامنے آتی ہے اور ہماری جگ ہنسائی کا سبب بنتی ہے۔

جیسے ایک سیاسی جماعت ایک دوسرے کو کاونٹر کرنے کے لیئے جواب میں کچھ بھی بولتی جاتی ہے اور تھوڑا ہی وقت گزرتا ہے کہ وہی باتیں دوسری باتوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر بنائی جاتیں اور اچھا خاصہ جگ ہنسائی کا پیکج بن جاتا ہے تو کیا یہ صرف سیاسی جماعتوں کا پیکج بنتا ہے بالکل نہیں اسی طرح کی ہماری سطحی غیر ذمہ دار باتوں کو حوالہ بنا کر ہمارے دشمنوں کی اجنسیاں ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرتی ہیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔

گزشتہ دنوں امریکن جرنلز میں ایک بحث چل رہی تھی کہ چائینہ کو امریکہ پر ایک برتری ہے کہ ان کہ قوم ان کے لیڈر کے پیچھے کھڑی ہے جبکہ امریکہ میں ایسا بالکل بھی نہیں ہے امریکن قوم اپنے لیڈر ٹرم کے پیچھے اس طرح نہیں کھڑی جیسے چائینہ کی قوم اپنے لیڈر کے پیچھے کھڑی ہے اس لیئے اگر چائینہ کوئی پالیسی بناتا ہے جیسے امریکن پراڈکٹس کا بائیکاٹ تو یہ چائینہ میں کافی حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے جبکہ ایسا کوئی قدم امریکا اٹھائے تو اسے اسی لیول کی پزیرائی اپنے ملک میں نہیں مل سکتی۔

یہ چھوٹی بات نہیں ہے، ملکوں کی تقدیر کے فیصلے ایسی ہی باتوں پر ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ کا کلچر ہمارے ہاں اتنا فروغ پا چکا ہے کہ یقین مانیں کسی بھی پوسٹ کی پہلی چند لائین پڑھ کر ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس خبر کا مقصد کیا ہے کیوں کہ ہماری خبروں کا مقصد ہی کوئی نہیں رہ گیا سوائے اس کے کہ اندھی خوشامد یا پھر اندھی تنقید۔

اس کے علاوہ بھی زندگی میں بہت کچھ ہے، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی پر لکھیں، مذہب پر لکھیں، فیگر اینڈ فیکٹس پر لکھیں، سیاحت اور سیاست پر لکھیں، لا اینڈ جسٹس پر لکھیں خواہ کسی بھی پہلو پر لکھیں اپنے بہترین نمائندوں پر لکھیں ان کے اچھے کاموں پر لکھیں کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لیئے موضوع سے ہٹ کر صرف اور صرف کنٹروورسی میں پڑ جائیں اور ایسی باتیں کریں جس سے

سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔

کہتے ہیں کہ جب کسی انجینیئر کو کام نہیں آتا تو وہ اپنے ٹولز یا آلات کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتا ہے کہ فلاں چیز کام نہیں کر رہی فلاں چیز کام نہیں کر رہی دراصل کام اسے خود کو نہیں آتا۔

شاید ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہے جب ہمیں حقیقت کا علم نہیں ہوتا اور پھر بھی ہم کسی کی خوشامد یا تنقید کرتے ہیں تو موضوع صرف کسی موصوف کا موٹا یا پتلا ہو نا رہ جاتا ہے، اس کا اٹھنا یا بیٹھنا رہ جاتا ہے یا اس کا فطری بات کرنے کا انداز رہ جاتا ہے یا اس کی نجی زندگی کے حالات رہ جاتے ہیں جن کا باقاعدہ تعلق کسی کی اہلیت یا نااہلی سے نہیں ہوتا اور بات موضوع سے ہٹ کر دور جا پڑتی ہے۔

ہمیں معلوم بھی ہوتا ہے کہ ہم جس چیز کو زیر بحث لا رہے ہے اس سے نکلنا کچھ نہیں بس پانی میں مدھانی کی طرح ہم بھی ویسے ہی لگے رہتے ہیں جیسے کہ ہمارا میڈیا لگا رہتا ہے۔

کسی بھی نیوز چینل پر بیٹھ جائیں 6 گھنٹے میں شاید ہیں کوئی معلوماتی خبر سامنے آتی ہو، اسی طرح سوشل میڈیا پر بیٹھ جائیں تو درجنوں پوسٹ کے بعد شاید ہی کوئی ایسی خبر آتی ہو جو معلوماتی نوعیت کی یا کوالٹی پوسٹ کہی جاسکے۔

مائنڈ یور پوسٹ کا مطلب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے اب میری طرح ایک تجربہ کیجئے ایسی پوسٹس جو غلط اور بے بنیاد ہے اور جن کا آپ کی زندگی پر کوئی صحت مندانہ اثر نہیں پڑنے والا ایسی پوسٹ لگانے والے لوگوں اور ایسی پوسٹس لگانے والے گروپس اور پیجز کو ذرا ان فرینڈ کرنا شروع کریں شاید 80 فیصد لوگ آپ کی لسٹ سے ڈیلیٹ ہو جائیں۔

یقین مانیں مجھے تو ہر 10 میں سے 8 پوسٹس کو ان فالو کرنا پڑتا ہے کیوں کہ ان کا نہ سر ہوتا ہے نہ پاوں، مگر پھر بھی بہت سے لوگ میری لسٹ میں ہیں جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بہت اچھے اور نفیس انسان ہیں مگر وہ بھی غیر ذمہ دارانہ پوسٹس لگاتے رہتے ہیں بس اسی کلچر کو سپورٹ کرنے کے لیئے جو ہمارے ہاں فروغ پا رہا ہے۔

آخر میں میں صرف اتنی گزارش کروں گا کہ کچھ اچھا شئیر کیا کریں، میرے ایک دوست کا کہنا ہے الفاظ آپ کی شخصیت کا روپ دھار لیتے ہیں اور بہت جلد آپ لوگوں کو ویسے ہی لگنے لگتے ہیں جیسی کہ آپ کی پوسٹس ہوتی ہیں۔ اپنی پوسٹس کو ری وزٹ کیجیئے، میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست اچھے لگیں میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ اچھے لگیں ہم اچھے لگیں ہمارا معاشرہ اچھا لگے۔

خوب پوسٹس لگائیں مگر دلوں کو چیرنے والی اور بے بنیاد باتوں سے ہوسکے تو پرہیز کریں اس گناہ سے خود بھی بچیں اور دوستوں کی بھی بچائیں، دعا گو میاں وقار الاسلام

چھوٹی سوچ

تحریر : میاں وقار الاسلام

جب مالی درخت لگاتا ہے، تو پودے بڑے ہوتے ہوتے اس کے قد سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا جب اس کے لگائے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے اسے ڈھیروں پھل دینے لگتے ہیں۔

آپ بھی اپنے ارد گرد اپنے ماتحت لوگوں کے لیئے مالی بنیں، اس بات سے نہ ڈریں کہ اگر ان کا قد آپ سے بڑا ہو جائے گا تو آپ چھوٹے پڑ جائیں گے۔ مالی کا کام ایک بڑا کام ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ آپ پانی دیں بیج ڈالیں نگہداشت کریں اللہ سے ان کے بڑھنے اور بلند ہونے کی دعا کریں اور اس بات کا خوف جانے دیں کہ آپ کا قد چھوٹا ہو گا۔

آپ کا ہر پودا جب تک آپ سے بڑا نہیں ہو گا آپ کے لیئے پھل نہیں لائے گا۔ دل کو بڑا کریں سوچ کو کشادہ کریں، اپنے ہی پودوں کے درخت کاٹ دیں گے تو نقصان کے سوا آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں آئے گا۔

مشورہ

تحریر : میاں وقار الاسلام

سب سے آسان کام مشورہ دینا اور سب سے مشکل کام مشورے پر عمل کرنا۔ یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں۔

اگر ایک کامیاب ڈاکٹر سے پوچھا جائے کہ میڈیکل کی فیلڈ کیسی ہے تو وہ کہے گا دنیا میں اگر کوئی فیلڈ اچھی ہے تو وہ میڈیکل کی ہی فیلڈ اور اگر کچھ بننا تو ڈاکٹر ہی بننا۔ اسی طرح اگر کسی ایسے ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے جس نے ڈاکٹری صرف جیسے تیسے پاس کی ہو اور پھر نہ کوئی کام نہ کوئی دھندا اور گھر پر ہی بیٹھ گیا ہو تو اگر اس سے مشورہ لیا جائے تو وہ کہے گا دنیا کی سب سے بکواس فیلڈ میڈیکل ہی ہے جو مرضی بننا پر ڈاکٹر نہ بننا

ہمارے ہاں ایک روایت ہوا کرتی تھی کہ اگر کسی لڑکی ہو طلاق ہو جاتی یا وہ اپنے شوہر سے لڑ کر آئی ہوتی تو اسے نئی نویلی دلہن کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا تھا وہ اس لیئے کہ یہ منحوس نئی دلہن کا بھی گھر خراب کرے گی۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ منحوس ہونے والا فلسفہ تو کسی حد تک دفن ہو گیا مگر اس کے اثرات معاشرے میں اب بھی باقی ہیں۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے خوش نہیں چاہے اپنی نالائقی سے یا پھر شوہر کی ہی برائیوں کی وجہ سے تو پھر اسے لگتا ہے کے دنیا کے تمام شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ کسی کو خوش دیکھتی ہے تو اسے یہ سارا منظر مصنوعی نظر آتا ہے کیوں کہ اس نے شوہر کے اچھے ہونے کا روپ کبھی دیکھا ہی نہیں ہوتا۔

اب اگر کوئی نئی نویلی دلہن اس متاثرہ ذہنیت کی عورت سے مشورہ لینے بیٹھ جائے تو اس کا تو کام ہو گیا بالکل یہی بات ذہنی طور پر متاثرہ شوہروں اور نئے نویلے دولہوں پر بھی لاگو ہوتی ہے جنہیں کوئی نہ کوئی دل جلا دوست یا انکل غلط راستے پر لگا دیتا ہے اور مفت میں ایک مہنگا مشورہ دے بیٹھتا ہے۔

کچھ اسی طرح کا حال پرانے ملازموں اور نئے ملازموں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ جیسے ہی کوئی نیا ملازم کسی کمپنی میں آتا ہے تو سارے ہڈ حرام ملازم اپنی بھڑاس نئے نویلے ملازم پر نکال دیتے ہیں اور بیچارے ذہن میں محسن باس کو فرعون بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اب بتائیں کہ نیا نویلا ملازم کتنے دن چلے گا۔

جو لوگ مشکلات کا سامنا کرتے ہیں اور اختلافات کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے جاتے ہیں وہ بہت جلد باس کی گڈ بک میں آ جاتے ہیں انہیں عزت اور ترقی دونوں نصیب ہوتیں ہیں۔ پھر اگر باس اچھا نہ بھی ہو اچھے ملازم کی ناقدری وہ بھی نہیں کرتا اور اگر باس اچھا بھی ہو پھر تو وارے نیارے ہو گئے۔

اسی طرح گھریلو زندگی میں بھی اگر آپ یہ سوچے ہیں کہ بیویاں ہوتی ہی ایسی ہیں یا شوہر ہوتے ہی ایسے ہیں تو سمجھیں کسی نے آپ کو غلط رستے لگا دیا اور اب آپ کا کچھ بننے والا نہیں۔ دوسری طرف اگر آپ صبر سے کام لیں مشکلات کو برداشت کریں اور آئیڈیل ساتھی بن کر دیکھائیں تو ہو سکتا ہے کہ جس میں آپ کو سوائے برائی کے کچھ نظر نہیں آتا اسی میں بہت سی خوبیاں بھی نظر آنے لگیں۔

یاد رکھیں کہ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ اچھے ملازموں کو ہی اچھے باس نصیب ہوتے ہیں اور اچھی بیویوں کو اچھے شوہر اور اچھے شوہروں کو اچھی بیویاں نصیب ہوتی ہیں۔ بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر لوگ اچھے ہی ہوتے ہیں مگر ہم اپنے رویوں اور عدم برداشت کی وجہ سے بہت سی اچھی ملازمتیں، بہت سے اچھے دوست اور بہت سے اچھے ساتھی کھو دیتے ہیں۔

مشورہ ضرور دیں اور مشورہ لیں بھی ضرور اور اس پر عمل بھی ضرور کریں مگر یہ ضرور ذہن میں رکھیں کہ جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے وہ واقعی آپ کی اصلاح کر رہا ہے یا اپنے برے تجربات کا ملبہ آپ پر ڈال رہا ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں برے مشورے دینے والوں سے محفوظ رکھے اور ہم میں اتنی سمجھ ضرور پیدا کرے کہ ہم اپنے حق میں اچھے برے کی تمیز کر سکیں۔ امین

کس کس بات کو روئیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

کس کس بات کو روئیں کس کس بات کو یاد کریں، کبھی کبھی ایک فردِ واحد پوری کائنات میں اکیلا کر جاتا ہے۔ ملک مختار احمد اعوان صرف ایک شخص نہیں تھا بلکہ یہ شخص اپنے اندر ایک مکمل کائنات تھا۔ سعودی عرب میں میرا ان کے ساتھ جو ایک سال گزرا وہ میری زندگی کا ایک منفرد اور خوبصورت پہلو رہے گا۔ ملک مختار احمد اعوان سعودی عرب میں لگ بھگ چالیس سال رہے۔ سعودی عرب میں سنٹرل ایئر کنڈیشننگ سسٹمز میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ ملک صاحب شاہین گروپ آف کمپنیز کے چیئرمین تھے اور ان کی سعودی کمپنی کا نام آئیڈیل سٹینڈرڈ تھا۔

میں اکثر کہتا ہوں کہ میں نے سعودی عرب کو دیکھا تو ان کی آنکھوں سے دیکھا، سنا تو ان کے کانوں سے سنا اور اگر اس پر اپنی کوئی رائے دی تو بھی انہیں کے تجربے کی بنیاد پر۔ ملک صاحب جب پہلی دفعہ میرے آفس آئے تو انہوں نے مجھے کہا یہ عربی کسی کے نہیں ہوتے، آپ یہاں چالیس سال سے ہیں یا چار دن سے آپ کی عزت برابر ہی ہے، کب یہ آپ کو کالر سے پکڑ کر واپس بھیج دیں گے ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ تو میں نے ملک صاحب سے کہا کے میں یہاں آپ کو لینے آیا ہوں۔ بس پھر معاملات چلتے رہے اور ایک سال بعد میں اور ملک صاحب پاکستان آ چکے تھے۔

میں الدوسر گروپ میں انٹرنیشنل مارکیٹنگ منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا مگر آفس ٹائم کے بعد میرا تقریباً تمام وقت ہی ملک مختار اعوان صاحب کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ تھی کہ میری فیملی پاکستان میں تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کبھی فیملی کی کمی محسوس ہی نہیں ہونے دی۔ ملک صاحب کی رہائش میرے اپارٹمنٹ کے ساتھ ہی تھی اور ان کا آفس، لیب اور ڈیس پلے بھی قریب ہی تھا۔ شام کے وقت ان کے آفس کو ہم ڈیرے کے طور پر استعمال کرتے رہے، ملک صاحب کے جاننے والے، میرے جاننے والے اور کچھ نئے دوست، شام کے وقت ان کے آفس کی رونق کبھی کم نہیں ہوئی۔

نیازی گروپ آف کمپنیز جو کہ میری پاکستانی کمپنی تھی اور شاہین گروپ جو کہ ملک صاحب کی پاکستانی کمپنی تھی دونوں کے پراجیکٹ گوادر میں تھے اور ہماری آپس میں ذہنی ہم آہنگی کی ایک بڑی وجہ گوادر ہی تھی، ہمارا آپس میں تعارف بھی گوادر کی وجہ سے ہوا تھا اور پھر ان کے آفس میں ہمارے لمبے سیشنز بھی گوادر اور اس سے متعلقہ اپ ڈیٹس کے حوالے سے ہی ہوتے تھے۔

جدہ میں ہونے والے تمام ایونٹس، سیمنار یا ایکسپو میں بھی اکثر ملک صاحب میرے ساتھ ہی ہوتے تھے، اور اگر ساتھ نہ ہوتے تو ایگزیبیشن سے جمع ہونے والی تمام معلومات پر ہمارا سیشن ضرور ہوتا۔ یوں سیکھنے سیکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ ملک صاحب کے رواں سال کے زیادہ تر پراجیکٹس جدہ میں تھے، ان کے کلائنٹس میں زیادہ تر ہوٹلز، ہائی رائز بلڈنگز اور شادی حال وغیرہ شامل تھے اور تقریبا تمام اہم پراجیکٹس پر میں ان کے ساتھ ہی جاتا تھا، کیوں کہ ان کی زیادہ تر انسٹالیشنز رات کے وقت ہوا کرتی تھیں۔

ملک صاحب کا لوگوں سے ملنا ملانا، سٹاف کے ساتھ ڈیل کرنا، اور معاملات کا باریکی سے جائزہ لینا، مشکل حالات میں اطمینان رکھنا اور اعتماد سے ساتھ کام کرتے جانا اور پریشانی میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا اور کبھی مایوس نہ ہونا ان کے ایک بڑے انسان ہونے کی نشانی تھی۔ ان کی پراسرار شخصیت کا رعب ہر جگہ رہتا تھا، جبکہ کہ میں نے انہیں کبھی اونچی یا سخت آواز میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ملک صاحب کہا کرتے تھے کہ ایسے گناہ سے بچو، جو تمہارے ساتھ چلتے چلتے تمہیں قبر تک لے جائے۔ ہمارے بہت سے گناہ ہیں جو ہمارے ساتھ جڑے ہیں، ان گناہوں کی اس وقت سے پہلے توبہ کر لینی چاہیے جس وقت ہماری روح قبض کی جائے گی، اور ہمیں نہیں پتہ کہ وہ وقت ہمارے قریب ہے یا دور۔ ملک صاحب اللہ اور رسول سے محبت رکھنے والے تھے، اور قران اور سنت کے حوالے سے اور اپنی زندگی کے تجربات کے حوالے سے رہنمائی فرماتے رہتے تھے۔ ان کے رہنما اصولوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان کی باتیں، آج بھی آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ ابھی ان کی کال یا ان کا میسج آ جائے گا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ موت بہت ظالم چیز ہے ایک دم سے منظر بدل دیتی ہے اور دنیا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔

باوجود اس کے کہ ملک صاحب خود بہت زیادہ مہارت اور تجربہ رکھتے تھے، مگر چھوٹی چھوٹی باتوں میں مشاورت کرنا اور قریبی دوستوں کی رائے لینا ان کی طبعیت میں شامل تھا۔ جب وہ پاکستان آئے تو انہوں نے ہر بات میں مشاورت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابھی کیا کرنا چاہتے ہیں، آگے کیا کریں گے، ان کے کیا کیا خواب تھے کیا کیا خواہشات تھیں اور کیا کیا مقاصد تھے دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ یہاں ایک بات خاص یہ تھی کہ ملک صاحب اپنی ذات اور اپنے کام کے لحاظ سے ایک مکمل انسان تھے اور ان کی باتوں سے کبھی کسی ادھورے پن کی جھلک نظر نہیں آئی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے جانے کے بعد ہماری زندگیوں میں جو ادھورا پن شامل ہوا ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گا اور ان جیسی شخصیت کی نہ تو کوئی جگہ لے سکتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی متبادل ہو سکتا ہے۔

باتیں بہت ہیں اور دل پر کرید کرید کر لکھی ہوئی ہیں۔ یادیں نہ بھولنے والی ہیں نہ ہی مٹنے والی ہیں۔ بلکہ یادیں لمحہ لمحہ تازہ رہنے والی ہیں۔ کچھ لوگوں کی یادیں وجود کا حصہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ سنہری یادیں ہمارے وجود کے ہر پہلو سے جھلکتی ہیں۔ جن کے ساتھ ہم مکمل تھے ان کے

بغیر ہم ادھورے ہی رہتے ہیں۔ اپنی ذات کے بہت سے ادھورے پن ہمیں اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر چلنے پڑتے ہیں، شاید یہی زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ملک مختار احمد اعوان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کے لواحقین اور ان کے دوستوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

عظیم لوگ

تحریر : میاں وقار الاسلام

وہ لوگ عظیم نہیں ہے جو حالات سے تنگ آ کر خود کشی کر لیتے ہیں بلکہ وہ لوگ عظیم ہیں جو مشکل حالات میں ہمت، حوصلے اور صبر سے کام لیتے ہیں اور آگے بڑھ کر مثال بنتے ہیں۔ کوشش کرنے والا اگر مر جائے یا مارا جائے تو شہید کہلاتا ہے، تھک ہار کر بزدلی کی موت مرنے والا حرام موت مرتا ہے۔

بدقسمتی ہے کہ یہاں حالات سے تنگ بیمار ذہنوں کی پوجا تو کی جاتی ہے مگر محنت کشوں کو ذلت کا نشان بنایا جاتا ہے۔ مزدوروں اور محنت کشوں کو عزت دیں جو اپنا جسم توڑتے ہیں اپنی انا مارتے ہیں اور زندگی سے ہارتے نہیں، نہ کہ چوروں لٹیروں جیب کتروں اور دہاڑی بازوں کو عزت دیں۔

کہانیاں، ڈرامے، فلمیں اور افسانے جن میں معاشرے کے کمزور اور ناکارہ یا پھر منفی ذہنوں کیا عکاسی کی جاتی ہے ان کی ترویج کرنے والے بھی بیمار ذہن ہیں۔

عبدالستار ایدھی جیسے عظیم انسانوں پر فلمیں، ڈرامے اور ڈاکومنٹریز بننی چاہیں نہ کہ الطاف حسین، نواز شریف اور زرداری جیسے کرداروں پر۔ میجر عزیز بھٹی جیسے لوگ ہمارے ہیرو ہونے چاہیں نہ کہ فضل الرحمٰن جیسے مولانا ڈیزل یا پھر سوکالڈ مفتی قوی جیسے سستے مفتے۔

یہ میڈیا والے اکثر ہیں ہی گدھے، یہ ہمیشہ گدھوں کو گھوڑا بنا پر پیش کرتے ہیں، کیا گدھا بھی کبھی گھوڑا بن سکتا ہے؟ عورت مارچ والی کچھ بدکردار عورتیں جنہیں عورت کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے وہ عورتوں کی نمائندگی کریں گی تو کس عورت کا بھلا ہونا ہے۔

سفید کوٹ والے ڈاکو جنہیں ڈاکٹر کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے اگر ایسے لوگ ڈاکٹروں کی نمائندگی کریں گے تو کس ڈاکٹر کا بھلا ہوگا۔ کالے کوٹ والے بدمعاش جنہیں وکیل کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے ایسے لوگ اگر وکیلوں کی نمائندگی کریں گے تو کس وکیل کا بھلا ہوگا۔

ضمیر فروش قلمکار جنہیں قلمکار کہتے ہوئے شرم محسوس ہو ایسے لوگ جب قلمکاروں کی نمائندگی کریں گے تو کس قلمکار کا بھلا ہونا ہے۔ ارتغل غازی جیسا ایک ڈامہ ہمارے ہزاروں فضول ڈراموں پر بھاری ہے، خدا جانے ہمارے ہاں ایسی صحت مندانہ انٹرٹینمنٹ کب شروع ہو گی، ہمارے ڈرامے تو ساس بہو کے کردار سے ہی باہر نہیں آ رہے۔

جس کسی نے بھی اپنے حصے کا اچھا کام کیا، اللہ نے انہیں عزت ضرور دی، اور جس کسی نے اپنے حصے کا غلط کام کیا، وہ ذلیل و خوار ضرور ہوئے، ہونے ہو بہت کچھ ہو سکتا، مگر ہوتا نہیں ہیں، بہترین صورت حال شاید کبھی ہو یا نہ ہو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مگر کس نے کیا حصہ ڈالا یہ بھی لوگوں کے سامنے ضرور اتا رہے گا، کاش ہم اپنی اچھائی کا حصہ ڈالتے رہیں، برائی ختم تو شاید نہ ہو، مگر یقینا کم ضرور ہو گی۔

کون اچھا ہے اور کون برا کم سے کم معاشرے میں ان کی ترجیحات تو درست ہونی چاہیں۔ عظیم لوگ یہاں رسوا ہوتے ہیں اور کرپٹ عناصر کو سر کا تاج بنا دیا جاتا ہے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو اور ہمیں نورِ ہدایت سے فیض یاب کرے، آمین۔

معلوماتی آلودگی

تحریر : میاں وقار الاسلام

ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں تو ہم سب نے سنا ہے، مگر معلوماتی آلودگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ معلوماتی آلودگی بھی کوئی نئ چیز نہیں، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے آغاز سے ہی ماہرین کو پتہ تھا کہ لوگ معلوماتی آلودگی کا شکار ہو جائیں گے۔

ماحولیاتی آلودگی پھیلانے والی فیکٹریوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ ایک دن ہم لوگوں کا جینا حرام کر دیں گے، مگر فیکٹریوں کو ایک مال دار مفاد پرست طبقے نے چلنے دیا اور پھر ایک وقت آیا جب ماحولیاتی آلودگی دنیا کا سر فہرست مسئلہ بن کر ابھرا۔ آج بڑے بڑے ممالک اور بڑی بڑی کمپنیاں ماحولیاتی آلودگی پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ جیسے ایک مفاد پرست طبقہ ماحولیاتی آلودگی کو پھیلانے سے بھی اپنے مفاد کو محفوظ کر رہا تھا بالکل اسی طرح، آج بھی ایک مفاد پرست طبقہ ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے سے پیسہ بنا رہا ہے۔

معلوماتی آلودگی کی صورتِ حال بھی ماحولیاتی آلودگی کی صورتِ حال سے مختلف نہیں۔ آئی ٹی کی بڑی بڑی کمپنیاں بھی معلوماتی آلودگی پھیلانے میں وہی کردار ادا کرتی چلی آ رہی ہیں جو کردار دیگر فیکٹریوں نے ماحولیاتی آلودگی کو پھیلانے میں ادا کیا۔ گذشتہ 15 سالوں سے دنیا میں بہت سی ویب سائیٹس اور ایپلی کیشنز پر پابندی لگائی جا رہی ہے، کچھ ملکوں میں یہ پابندی مستقل طور پر لگائی جاتی ہے اور کچھ ملکوں میں عارضی طور پر لگائی جاتی ہے۔ پابندی لگانے کی بڑی وجہ یہی معلوماتی آلودگی ہی ہوتی ہے۔

دنیا میں بہت سے ممالک اور بہت سی قوموں کے مفادات آپس میں ایک جیسے نہیں۔ براہ راست لڑنے یا جنگ کرنے کی بجائے یہ ممالک یا یہ قومیں معلوماتی آلودگی کا سہارا لیتی ہیں اور غلط معلومات کو اس قدر پھیلا دیا جاتا ہے حقیقت کا علم کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ نہ صرف یہ کہ معلوماتی آلودگی کو دوسری قوموں یا دوسرے ممالک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ جہاں کرپشن زیادہ ہوتی ہے وہاں اپنے ملک اور اپنی قوم کے خلاف بھی معلوماتی آلودگی کا سہارا لیا جاتا ہے۔

میڈیا یا اخبار کسی جھوٹ کو ایک بار منظرِ عام پر لے آتا ہے تو سوشل میڈیا اس کی ہزاروں کاپیاں پوری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔ بات کی تردید بعد میں آتی ہے مگر لوگ اسے درست سمجھ کر اپنا ذہن تبدیل کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ آج جب کہ معلوماتی آلودگی اچھی طرح پھیل چکی ہے، اب کچھ نئ کمپنیاں معلوماتی آلودگی کو کم کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ جیسے فیکٹس چیک کرنے والی ویب سائیٹس یا ایپلی کیشنز

اور اس طرح کی خدمات ادا کرنے والی کمپنیاں۔ ایک طرف سرویز کرکے کمایا جاتا ہے اور دوسری طرف ان سرویز کو کراس چیک کرکے ان کے درست ہونے یا نا ہونے کی رپورٹس جاری کرنے پر کمایا جاتا ہے۔

امریکہ جو کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا بے تاج بادشاہ تصور کیا جاتا ہے، دنیا تو اس کی پھیلائی ہوئی معلوماتی آلودگی سے پہلے ہی بہت تنگ تھی، چین اور روس نے تو ان کی سینکڑوں ویب سائٹس بہت پہلے ہی مکمل طور پر بین کر دی تھیں مگر دوسرے بہت سے ممالک نے بھی اپنے ملکی مفاد میں اکثر امریکہ ویب سائیٹس کو بین رکھا اور اب بھی بین رکھتے ہیں۔ مگر یہاں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا خود امریکہ کو ہے، کہ امریکہ کی معلوماتی آلودگی کو چین اور روس مل کر امریکہ کے ہی خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اور لوگوں کی رائے ان کی اپنی حکومت کے خلاف تبدیل کر دی جاتی ہے اور امریکی عوام کی منفی ذہن سازی بھی کی جاتی ہے۔ یہ وہ ملک کہہ رہا ہے جو گذشتہ تین دہائیوں میں پوری دنیا میں معلوماتی آلودگی پھیلانے میں سر فہرست رہا ہے۔

ہم پاکستان میں معلوماتی آلودگی کو کس طرح سے دیکھتے ہیں۔ کیا ہماری ذہن سازی ایسی کی جاتی ہے کہ ہمارا آپس میں بھائی چارہ بڑھے، یا ہم اپنے ملک کے لیے زیادہ سے زیادہ مثبت سوچیں۔ یا ہم اسلام کے بارے میں ٹھیک سے جانیں۔ یا عام عوام کی فلاح کا سوچیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ہمیں بھی معلوماتی آلودگی کا اسی طرح سے خطرہ ہے جیسے کسی بھی دوسرے ملک کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ آج اگر ملکی مفاد میں فیس بک یا وٹس ایپ یا پھر یوٹیوب کو بند کر دیا جاتا ہے تو ہمارا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کیا ہم حکومت کا ساتھ دیں گے، یا اپنے ملک کا ساتھ دیں گے، یا پھر معلوماتی آلودگی میں رہنا پسند کریں گے۔

اب دوسری طرف آتے ہیں، اپنی نجی اور کاروباری زندگی کی طرف، ہمارے پاس سوشل میڈیا کے لیے بہت وقت ہے، کیا ہمارے پاس اپنے بچوں اور اپنی فیملی کے لیے بھی اتنا ہی وقت ہے۔ ہمارے پاس سوشل میڈیا کے لیے بہت وقت ہے کیا ہم اپنی جاب اور اپنے کاروبار کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے۔ ہمارے پاس سوشل میڈیا کے لیے بہت وقت ہے کیا ہم اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے دور نہیں۔ کیا سوشل میڈیا نے ہمارا سارا سوشل فیبرک خراب نہیں کر دیا۔

اپنے لیے سوشل میڈیا کی گائیڈ لائنز بنائیں، وہ مت پھیلائیں جس سے نفرت اور شر انگیزی پھیلے۔ وہ پڑھیں جس کی تصدیق کی جاسکے۔ اپنے ملک کے مفاد کو سمجھیں، جھوٹ کو پھیلا کر شیطان کے ساتھی نہ بنیں۔ خواہ مخواہ غیر لوگوں سے الجھنے کی بجائے اپنے قریبی لوگوں کو وقت دیں۔ آپ کے بزرگ سوشل میڈیا سے زیادہ بہترین معلومات کا ذخیرہ رکھتے ہیں، اپنے استادوں سے براہ راست سیکھیں۔ علم حاصل کریں ،اور علمی باتوں کو پھیلائیں، معلوماتی آلودگی کا دنیا شکار ہے، کوشش کریں کہ اس کے اثرات آپ کی شخصیت پر کم سے کم کو۔ ایک شخص جو

معلوماتی آلودگی کا شکار نہیں وہ اس شخص سے ہزار درجے بہتر ہے جو معلوماتی آلودگی میں پوری طرح سے دھنسا ہوا ہے۔ کم معلومات بہتر ہیں، لاکھوں ایسی معلومات سے جو آپ کے فائدے کی ہیں۔ چند بہترین دوست بہتر ہیں لاکھوں کے بے کار ہجوم سے۔

فہرست مضامین

	اصلاحی اور تنقیدی	
1	مسکراہٹ اور آنسو	780
2	سانجھ سویرے	781
3	اپنے وقار کی حفاظت کریں	783
4	کسی پر اپنے دروازے بند نہ کریں	785
5	زندگی کا میچ	786
6	مفید مشورے اور غیر مفید مشورے	789
7	غیروں سے شکوہ، اپنوں سے شکایت	792
8	تنقید برائے فروخت، تعریف برائے فروخت	795
9	ماحولیاتی آلودگی	798
10	انٹرنیٹ اور پرائیویسی	800
11	تھوڑی سی روشنی	803
12	حفیظ سینٹر جل گیا	805
13	شیرنی نوں بلی چُک کے لے گئی	807
14	ٹیکنالوجی کی پانچویں جینریشن اور جدید جنگ	810
15	سکول کتنے اہم ہیں؟	812
16	مثلِ محشر	814
17	سیاہ عدالتیں	816
18	آزاد صحافت	818
19	ادیب اور صحافی	820
20	فسادی خبریں	822

مسکراہٹ اور آنسو

تحریر : میاں وقار الاسلام

مسکراہٹ اور آنسو دونوں کا تعلق انسان کے احساسات سے ہوتا ہے۔ میٹھی زبان احساسات میں رس گھول سکتی ہے۔ تلخ زبان احساسات کو زخمی کر سکتی ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم کسی کے آنسو کی وجہ نہ بنیں۔ ساتھ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کسی کی مسکراہٹ کی وجہ بن سکیں۔ خاص کرکے ہمیں اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ ہماری وجہ سے کسی کی مسکراہٹ نہ دب جائے یا کوئی ہماری وجہ سے اپنے آنسو پی جائے اور ہمیں محسوس بھی نہ ہو۔

سانجھ سویرے

تحریر : میاں وقار الاسلام

سلام_ صبح امید_ خیر

آفتاب ہر روز بلا ناغہ سچ کی لاکھوں کرنیں بکھیرتے ہوئے ہم پر طلوع ہوتا ہے، پھر جوں جوں دن ڈھلتا ہے اور رات قریب ہوتی ہے سورج جھوٹ کی آلودگی اپنے ساتھ لیے اک رنجیدہ شام میں دفن ہو جاتا ہے

پھر اگلے ہی دن امید کی تازہ دم نئی اور سچی کرنیں ہمیں خواب غلفت سے جگانے کی بھرپور تیاری کرکے آتی ہیں۔ ہماری آنکھیں تو روز کھلتی ہیں اور بند بھی ہوتی ہیں مگر ہمارے شب و روز خواب غلفت میں لپٹے پڑے رہتے ہیں۔

ہم جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ دن اور رات کے آنے جانے میں ہمارے رب کی بے شمار نشانیاں پوشیدہ ہیں۔

(190) سورۃ آل عمران (3) آیات

Surat Aal-e-Imran (3) Verses (190)

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (۱۹۰)

Indeed, in the creation of the heavens and the earth and the alternation of the night and the day are signs for those of understanding.

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں

سانجھ سویرے کی کچھ کو مل کرنیں ابھی تک ہمیں گدگدانے میں مصروف ہیں تاکہ جب سویرا ہو تو ہم واقعی جاگ سکیں

"جانے کس نیند میں سوئے تھے میرے شہر کے لوگ"

"دن نکلنے پہ بھی بیدار نہیں تھا کوئی"

شاعر: سیف الرّحمان سیفی

کاش ہم بھی کسی صبح بیدار کی طرح سے بیدار ہو سکیں آمین

صبح بخیر دعا گو

میاں وقار الاسلام

اپنے وقار کی حفاظت کریں

تحریر: میاں وقار الاسلام

انسان کو معاشرے میں جو بھی مقام ملتا ہے، اس میں انسان کا ذاتی کمال کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل جو ہمیں باعزت گھرانے میں پیدا کرتا ہے، اور خاندانی حسب نسب عطا کرتا ہے۔ علم والوں سے ملواتا ہے تو تعلیم سے منور کر دیتا ہے، اہل فن سے ملواتا ہے تو ہمارے فن کو فروغ دیتا ہے۔ ہمیں نام دیتا ہے، ہمیں پہچان دیتا ہے اور ہمیں معاشرے میں مقام بخشتا ہے۔ ماں کی دعائیں اپنا کردار ادا کرتیں ہیں، باپ کی شفقت قدم مضبوط کرتی ہے، ہماری شخصیت بہت سے نامعلوم سہاروں کی بیساکھیوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ درخت جتنا بھی بڑا ہو جائے تکبر کی دیمک اسے کب کھوکھلا کر دے گی اور وہ گر کر مٹی ہو جائے گا یہ کوئی نہیں جانتا۔ درخت کی مضبوطی اور طاقت تب تک ہے جب تک اس کے مزاج کی ہریالی اسے ہرا بھرا رکھتی ہے۔ اگر اللہ نے آپ کو معاشرے میں سربلند کیا ہے، تو سایہ دار درخت بنیں، پھل دار پیڑ بنے تاکہ اللہ نے آپ کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے وہ مقصد پورا ہو۔

سڑک کے کنارے کسی گھنے سایہ دار درخت کے نیچے جب کوئی مسافر تھک ہار کے بیٹھتا ہو تو درخت اس سایہ فراہم کرتا ہے یہ درخت کا کام ہے، اور یہ اس کا فرض ہے، یہی اس کی عبادت ہے، اور اسی کا اُس سے سوال کیا جائے گا۔ درخت یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے سائے میں بیٹھنے والا مسافر، کس قبیلے سے ہے، کس حسب نسب کا ہے، کس ذات کا ہے، بولتا کیسے ہے، چلتا کیسے ہیں، اس کی تعلیم کتنی ہے، اس کی تربیت کیسی ہے، اس کا مزاج کیسا ہے، اس کا لہجہ کیسا ہے۔ درخت کا اپنا ایک معیار ہے، اپنا ایک مقام ہے، اگر وہ خود کو گرا کر مسافر کی سطح پر لے آئے گا تو وہ درخت ہی نہیں رہے گا بلکہ کٹی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر بن جائے گا۔ اسے درخت رہنے کے لیے اپنے معیار کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اور اپنے فرائض کو سمجھنا پڑتا ہے۔ سایہ دار ہونا اس کی پہچان ہے۔ وہ جانتا ہے جس دن اس کی ٹہنیاں سوکھ گئیں اور اس کا تنا کھوکھلا ہو گیا اس کی کہانی ختم ہو جائے گی۔

یہی انسان کے ساتھ ہوتا ہے، بڑے سے بڑا انسان بھی جس دن چھوٹے پن کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی شان مٹی میں مل جاتی ہے، اس کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے، اور اس کا وقار جاتا رہتا ہے۔ اگر اللہ نے آپ کو لوگوں پر فضیلت دی ہے تو اس میں اللہ کے راز ہیں کہ اس نے ایسا کیا ہے، ورنہ فضیلت تو اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کو ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر اللہ نے آپ پر فضل کیا ہے تو آپ پہ لازم ہے اُس کے فضل کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اور جو معیار اللہ تعالی نے آپ کو معاشرے میں دے دیا ہے اُس کی حفاظت کریں۔ اگر آپ معاشرے کے لیے فلاح اور نیکی کے کام کر رہے ہیں تو یہ نا سمجھے کہ یہ آپ کر رہے ہیں، یہ اللہ آپ سے کروا رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ سے نیک اعمال آگے جا رہے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو ہم سے نیک اعمال کرنے کا سارا اختیار چھین لے۔ جیسے کہ اللہ فرماتا ہے کہ یہ ہم پر احسان مت رکھیں کہ مسلمان ہوئے ہیں، بلکہ اللہ ہی ان پر احسان رکھتا

ہے کہ انہیں مسلمان کرتا ہے۔ نیکیاں لوگوں پر احسان رکھ کر مت کریں، اور نہ ہی احسان سمجھ کر کوئی نیکی کریں، ہر طرح کی نیکی ہم پر فرض ہے اور ہم صرف اپنا فرض ادا کر سکتے ہیں اور اللہ ہم پر احسان رکھتا ہے کہ ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم نیک عمل کر سکتے ہیں۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ ایمان لے آنے کے بعد والے کافر، بہت سے لوگ جنہیں معاشرے میں بہت زیادہ عزت ملتی ہے انہیں ایک معمولی سی غلطی پہ رسوا کر دیا جاتا ہے۔ انہیں نیک لوگوں سے رسوائی کا کام بھی لے لیا گیا، اللہ قادر ہے جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس بات سے ضرور ڈرنا چاہیے کہ اللہ ہمارے سامنے سے سیدھے رستے ہی نہ غائب کر دے اور ہمیں رسوائیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے چہرے بدل دیں، تو پھر یہ کہاں جائیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری عزتوں کی حفاظت کرے، ہماری کوہتائیوں کو معاف کرے، ہمارے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے، اپنے اپنے سیدھے راستے پر چلائے اور ثابت قدم بھی رکھے۔ ہمیں اپنا شکر گزار بنائے، اپنی حدود کی پاس داری کرنے کی توفیق دے۔ ہم میں عجز اور انکساری پیدا کرے اور ہر طرح کے تکبر اور بڑائی سے بچائے۔ بڑی بڑی بادشاہتیں ختم ہو گئیں، بڑے بڑے نام مٹ گئے، عزت اسی کی باقی رہی جس نے اپنی عزت کی حفاظت کی، وقار اُسی کا برقرار رکھا جس نے اپنے وقار کی حفاظت کی۔ اور جو کامیاب رہا اس پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا۔

کسی پر اپنے دروازے بند نہ کریں

تحریر: میاں وقار الاسلام

تاریخ گواہ ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا، تو باآسانی اپنے جانی دشمنوں اور بدترین حریفوں سے بدلہ لیا جا سکتا تھا، مگر رحمت العالمین نے اپنی انسان دوستی کے دروازے ان پر بھی بند نہیں کئے اور بدلے کے دن کو عام معافی کے دن میں تبدیل کر دیا۔ ہم کیسے مسلمان ہیں اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے دل میں کشائش پیدا نہیں کرتے۔ معمولی باتوں پر فاصلے بڑھاتے ہیں اور پھر فاصلوں کو کبھی کم نہیں کرتے۔ ایک طرف مکہ کے بدترین دشمن تھے دوسری طرف ہماری عزیز ترین ہستی تھی جنہوں نے ہمیں عام معافی کا درس دیا اور بہترین تاریخ رقم کی تاکہ ہم ان کے بتائے ہوئے روشن رستوں پر چل سکیں، پھر ہم کیوں اندھیروں کی چل پڑتے ہیں، کیا انسان دوستی اور عام معافی بہترین سنت نہیں ہے، یہ سنت تو غیر مسلموں اور اسلام کے بدترین دشمنوں پر بھی لاگو کی گئی تو کیا ہم اپنے مسلم بھائیوں کے لیے بغض رکھیں گے، کیا یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں۔

سنتِ نبوی تو اسلامی دشمنی میں ابھی انا کو درمیان نہیں لائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم معمولی اختلافات میں اپنی انا کو تقویت دیتے چلے جاتے ہیں۔

ہم رحمت العالمین کے پیروکار ہیں ہمیں اپنے دشمنوں کے لیے بھی رحمت کے دروازے کھولنے ہیں، ہم اپنے دوستوں پر رحمت کے دروازے کیسے بند کر سکتے ہیں۔

ہمارا اکثر یہ عذر ہوتا ہے کہ فلاں صاحب تو انتہائی فضول ہیں، سیلف سینٹرڈ ہیں اور مطلب پرست ہیں، مگر فتح مکہ میں جن کو عام معافی دی گئی ان کے احوال کی سنگینی ہمارے روزمرہ کے اختلافات سے کہیں گہری تھی مگر بڑھے پن کا مظاہرہ کیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم چھوٹے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خود کو بڑا سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہماری غرور اور تکبر حقیقت میں ہمارا چھوٹا پن ہوتا ہے اور ہماری عاجزی اور انکساری ہمارا بڑا پن ہوتی ہے۔

یا اللہ ہمارے دلوں میں جو مرض ہیں ان کا علاج عطا فرما، تو ہی ہمیں اندھیروں سے روشنوں طرف لاتا ہے

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہماری رہنمائی فرما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں ہدائیت دے۔۔۔۔۔۔ امین

میاں وقار الاسلام

زندگی کا میچ

تحریر: میاں وقار الاسلام

حالات آپ کے حق میں نہ بھی ہوں زندگی کا میچ پھر بھی آپ کو کھیلنا پڑتا ہے۔

بعض دفعہ آپ آسان بالز بھی نہیں کھیل پاتے اور بعض مشکل سے مشکل بالز بھی آسانی سے کھیل جاتے ہیں۔

بعض دفعہ ایمپائرز آپ کے ساتھ بھی ملے ہوں تو فیصلہ آپ کے حق میں نہیں آتا بعض دفعہ ایمپائرز خلاف بھی ہوں قسمت ساتھ دیتی ہے۔

بعض دفعہ تھوڑی سی وکٹوں سے بڑی اننگز کھیل لی جاتی ہے اور بعض دفعہ بہت سی وکٹوں سے چھوٹی سی اننگز پوری نہیں ہوتی۔

جیتنے والے برے سے برے حالات کا آخر تک مقابلہ کرتے ہیں اور برے حالات میں بھی جیت کر دیکھاتے ہیں۔

ہارنے والے انتہائی مناسب حالات میں بھی میچ ہار جاتی ہیں اور انتہائی آسان ٹیم سے۔

ہمارے ایک ہاتھ پر ہارنے والے لوگ ہیں جو ہارتے ہیں چلے جاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ پر جیتنے والے لوگ ہیں جو جیتتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

سال پہلے کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ چائنہ کبھی اپنے مسائل سے باہر نکل پائے گا 30 سال بعد دنیا کی 10 بڑی طاقتیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ 30

بد قسمتی سے ہم آج بھی آپس میں الجھ رہے ہیں جبکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انہیں حالات میں اپنے آپ کو بین القوامی سطح پر منوا چکے ہیں۔

پاکستان بہت سے ملکوں سے بہت اچھا ہے ہمارے لوگ بہت سے لوگوں سے بہت اچھے ہیں اسی سے کچھ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں کچھ نقصان۔ سب اچھا کہہ کر آنکھیں بند بھی نہیں کرنی چاہیں سب برا کہہ کر ہمت بھی نہیں ہارنی چاہیئے۔

امریکہ کے تو حالات سب سے اچھے تھے پھر وہ ہارا کیوں چائنہ کے حالات تو سب سے برے تھے پھر وہ جیتا کیوں۔

حالات اچھے ہوں یا برے بغیر محنت کے کبھی کسی قوم نے جیت حاصل نہیں کی۔

جرمنی جاپان روس اٹلی اور جانے کس کس ملک کو کتنی کتنی مار پڑی مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری دوبارہ اپنے پاوں پر کھڑے ہیں۔

ایک دوست نے کہا تھا کہ ہم تو منو سلوہ کھانے والی قوم ہیں پہلے امریکہ ہمیں کھلا رہا تھا اب چائنہ ہیں کھلا رہا ہے

جو اللہ کی طرف سے ہم پر نازل ہوتا ہے وہ تو منو سلوہ ہوتا ہے اور جو بغیر محنت کے دائیں بائیں سے عنائیت ہوتا ہے وہ تو بھیک ہوتی ہیں۔

دوسروں ملکوں سے قرضہ لینے میں ہرج نہیں، چائنہ اور امریکہ بھی قرض لیتے ہیں مگر حکمرانوں کا اسے باپ کا مال سمجھ کر کھا جانا غلط ہے۔

محنت سے رزق کمانے والے چاہے تھوڑا کماتے ہوں، پڑھے لکھے بے روزگاروں سے بہتر ہیں جو فیس بک پر ہمیشہ روتے رہتے ہیں مگر کرتے کچھ نہیں۔

محنت کرنے والوں کا نصیب اللہ بدل دیتا ہے اور کام چور نکمّے لوگوں کا بد نصیبی پیچھا کرتی ہے۔

انسان چاہے تو برے سے برے حالات میں وہ کر کے دیکھا سکتا ہے جو عام طور پر لوگ اچھے سے اچھے حالات میں بھی نہیں کر پاتے۔

اور اگر انسان نے کچھ نہ کرنے کی ٹھانی ہو تو پھر وہ ٹرمپ کی طرح روتا ہے جو کہتا ہے چائنہ کے لوگ ہمارا لنچ اور ڈنر کھا جاتے ہیں۔

ٹرمپ کہتا ہے کہ ہم اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دے سکتے کہ چائنہ آئے اور ہمارے عزت لوٹ کر چلا جائے اور ہم دیکھتے ہی رہیں۔

عزت محنت کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو جتنی محنت کرتا ہے اللہ اس کا اتنا مقام بلند کرتا ہے اور اسی کا دنیا میں رعب قائم ہوتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے ملک ہیں دنیا میں اپنا بہت بڑا مقام رکھتے ہیں بڑے بڑے ملک ہیں مگر ان کی ہوا اکھیڑ دی گئی ہے۔

مفید مشورے اور غیر مفید مشورے

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایک مفید مشورہ جہاں زندگی میں بہت بڑی مثبت تبدیلی لا سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک غیر مفید مشورہ زندگی میں منفی سوچ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ہم مفت مشوروں کے بازار میں رہتے ہیں جہاں ہر کوئی اپنے مشوروں کا لنڈا بازار لگا کر بیٹھا ہے۔ اور شاید ہم اتنے کھانے نہیں کھاتے جتنے ہم کھانے کے دوران مشورے کھا جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک پاکستانی سکالر اور ایک امریکی سکالر کے درمیان کچھ بات چل رہی تھی تو پاکستانی سکالر نے اپنے آئیڈیے کے بارے میں پوچھا کہ

WHAT ABOUT THE IDEA?

تو امریکی سکالر نے جواب دیا کہ

IDEA IS JUST AN EXECUTION OF THE IDEA

اگر اپ ایک ایسے ڈاکٹر سے مشورہ لیں جس نے میڈیکل میں تعلیم تو حاصل کی ہو مگر اسے بطور پروفیشن اختیار نہ کیا ہو تو وہ آپ کو شاید یہی مشورہ دے کہ دنیا کی کوئی فیلڈ اختیار کر لینا مگر ڈاکٹر نہ بننا

اور اگر آپ ایک ایسے ڈاکٹر سے مشورہ لیں جس نے اپنی فیلڈ میں قومی سطح پر یا بین القوامی سطح پر بہت سی کامیابیاں سمیٹی ہوں تو وہ آپ کو یہی مشورہ دے گا کہ دنیا کی کوئی فیلڈ اختیار نہ کرنا اور صرف ڈاکٹر ہی بننا۔

ناامید لوگوں کے مشورے کبھی امید نہیں دلا سکتے اور پُر اُمید لوگوں کے مشورے کبھی آپ کو ناامیدی کی طرف نہیں لے کر جا سکتے۔

ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم ایسی فرسودہ رسموں کی چکی میں پس رہے ہیں جہاں گزرے ہوئے وقت کی حماقتوں کو اور پرلے درجے کی جہالت کو اپنی اعلیٰ اقدار کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب جہالت، جہالت سے ملٹی پلائی ہوتی ہے تو جہالت اور بڑھتی جاتی ہے۔

نئی نویلی دلہن کام کو ہاتھ نہیں لگائے گی، ایسی بکواس رسمیں کون بناتا ہے کہ ساری زندگی مہارانی کے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے، اگر عزت دینی ہے تو پھر پوری زندگی دیں، یہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات کیوں۔

سر تاج تو سر کا تاج اور بیوی پاؤں کی جوتی، ایسی گھٹیا سوچ والے آئین سٹائین تو ایشیا میں ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جب کہ حقیقت دیکھی جائے تو عورت کو سر پر بیٹھایا جاتا ہے اور مرد کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے، اتنا اتار چڑھاؤ کیوں، عزت برابری کی بنیاد پر ہوتی ہے یہ کون سا سودا ہے جو ترازو ٹیڑھی کر کے کیا جاتا ہے۔

ایک فرسٹریشن پڑھے لکھے لوگوں کی ہے کہ ان سے کوئی بہتر نہیں اور ایک فرسٹریشن تجربہ کار لوگوں کی ہے کہ ان سے بہتر کوئی نہیں جب کہ دونوں ایک بہترین کمبی نیشن میں ایک دوسرے کی بھرپور مدد کر سکتے ہیں اور بہترین نتائج لا سکتے ہیں مگر ہمیں تو ہر چیز میں مقابلہ اور موازنہ ہی چاہیے پھر چاہے وہ بنتا ہو یا پھر نہ ہی بنتا ہو۔

اگر مشورے کوئی فیز کل چیز ہوتے تو ان کا بیچ چوراہوں پر لنڈا بازار لگتا اور سب سے زیادہ ہماری قوم نے خریدنے تھے۔ چاہے گھر میں روزانہ دال ہی بنتی ہو مگر ہمیں مشورے چکن بریانی اور اچار گوشت کے ہی لینے ہیں۔

اگر صرف سوچنے سے ہی کمپنیاں بننے لگتیں تو پھر دنیا کی ٹاپ 500 سے بھی زیادہ فارچون کمپنیاں پاکستانیوں کی ہی ہوتیں۔

اکثر ہمارے فیصلے ٹھیک ہوتے ہیں کہ جنہیں ہمارا دل کہتا ہے کہ ہم چپڑاسی بھی نہ رکھیں انہیں کو اپنا سیاسی مشیر رکھ کر اپنا ہی بیڑا غرق کر لیتے ہیں۔

لعنت ہو ایسے وکیلوں پر جن کے احمقانہ دلائل سننے کے بعد ہمیں خود ان کے حق میں وکالت کرنے کے لیے میدان میں آنا پڑے اور ان کی حماقتوں کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑے۔

اکثر لوگوں کو لمبی لمبی چھوڑنے کی عادت ہوتی ہے پھر وہ اپنے سے بھی کئی ہاتھ آگے لمبی لمبی چھوڑنے والوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

جن لوگوں کا اپنا سکریپ اکثر اُڑ جاتا ہے وہ بھی دوسروں کو پروگرام کرنے کا سوچتے رہتے ہیں۔ جب انسان کو لگتا ہے کہ وہ کچھ کر سکتا ہے تو اس کے ارد گرد سارے پاگل کہتے ہیں، تو پاگل تے نہیں، پھر وقت فیصلہ کرتا ہے کون پاگل تھا۔

منزل تب نہیں ملتی جب ہم لوگوں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ہمارا فوکس خراب ہو جاتا ہے، کم نظر آنے لگے تو عینک لگا لیں لوگوں کے مفت مشوروں پر مت جائیں۔

احمقوں سے پہلا اور آخری سوال یہی ہوگا کہ تم عقل نہیں رکھتے تھے تو وہ جواب دیں گے نہیں۔۔۔۔ کچھ لوگ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں مگر یقین کریں احمقوں کی کوئی جنت نہیں ہوتی۔۔۔

"پتا ہے کہ بدقسمتی کیا ہے "جب آپ کو سو فیصد لگے کہ آپ غلط کر رہے ہیں اور پھر بھی سوشل یا کسی بھی پریشر کے تحت آپ کو وہ کرنا پڑے

دعا گو ہوں کہ اللہ ہمیں ہدایت دے اور اپنے روشن رستے پر چلائے نہ کہ احمقوں کے راستے پر۔

غیروں سے شکوہ، اپنوں سے شکایت

تحریر: میاں وقار الاسلام

ظلم دو طرح سے ہوتا ہے، ایک وہ ظلم جو آپ کے دشمن آپ کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور دوسرا ظلم وہ جو آپ کے اپنے آپ کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اپنوں پر ظلم کرنے والے دراصل اپنے نہیں ہوتے بلکہ اپنوں کے روپ میں بدترین دشمن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو منافق کہا گیا ہے اور ایسے ہی لوگ آستین کا سانپ ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ اور جب جنگ ہی کافروں سے ہو تو پھر ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید ہم دشمنوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لیتے ہیں، مگر جو آستین کے سانپ انہیں شاید ہم آستین بھی خود ہی مہیا کرتے ہیں۔

ایک طرف تو ہم اپنے محسنوں کو رسوا کرتے ہیں اور دوسری طرف ہم اپنے منافقوں کو مہلت دیئے جاتے ہیں اور سالوں تک فیصلے ہی نہیں ہوتے جس کا نتیجہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ جن کے ہاتھوں پر خون ہوتا ہے انہیں کے ہاتھوں پر بیت کر لی جاتی ہے۔

جس چوراہے پر دادا رسوا ہوتا ہے، اسی چوراہے پر باپ کی ذلت ہوتی ہے اور پھر اسی چوراہے پر اس کے بیٹے ناک رگڑتے ہیں۔ سبز باغ دادا نے بھی دیکھے تھے، سبز باغ باپ نے بھی دیکھے تھے اور سبز باغ بیٹوں نے بھی دیکھے تھے مگر بنجر زمینوں میں ہریالی نہیں آئی۔ اقتدار ظالموں کے ہاتھ میں رہ گیا، کسان کی کمر ٹوٹ گئی، مزدور کا مان ٹوٹ گیا، قلم کار کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔

لہو سے سینچا ہوا گلشن دولخت ہو گیا، قوم اپنے دو قومی نظریے پر ایک قوم نہ بن سکی، محبتوں کے سفر کو نفرتوں کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ دشمن نے بلوچی، سندھی، پنجابی، سرائیکی، پشتو اور اردو بولنے والے مہاجروں کے نعرے لگوائے اور ہم لبیک کا مطلب بھی بھول گئے۔

دشمن نے تو کھیل کھیلنا ہی تھا، چاہے وہ پاکستان کو دولخت کرنے کا ہو، ملک میں دہشت گردی کی کاروایاں کرنے کا ہو یا پھر فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہو، دشمن کے محاذ میں تو خرافات سے بھری ہوئی تمام چیزیں روز اول سے ہیں شامل ہیں مگر ہمارے محاذ کیا ہیں، ہم نے کیا کرنا ہے اور ہم نے کہاں جانا ہے۔

دنیا کبھی بھی اتنی سیدھی نہیں تھی، جتنی سیدھی یہ ہمیں نظر آتی ہے، ہر ملک ہر قوم اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بظاہر جن سے ہمیں فائدہ ہو رہا ہوتا ہے انہیں سے ہمیں خطرات ہوتے ہیں، اور جن سے ہمیں خطرات ہوتے ہیں انہیں سے فائدہ بھی اُٹھایا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا، وقت بدلتا رہتا ہے، بین القوامی سفارت کاری بھی اسی طرح کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔

زیادہ پرانی بات نہیں ہے، جب ہم امریکہ کے ساتھ کھڑے تھے، ہمیں دنیا میں تنہا کر دیا گیا، اور ہماری امداد بھی روک دی گئی۔ امریکہ نے بھارت کی کھل کر سرپرستی کی، ہمیں ڈبل کراس کیا اور ہمارے ملک کو دہشت گردی کی آگ میں دھکیل دیا۔

ہر ملک کو اپنی دفاع کا حق ہوتا ہے، پاکستان نے بھی اپنے دفاع کے لیے وقت کی ضرورت کے مطابق فیصلے کیے، چین سے امداد لی، اور اپنے استحکام کی طرف سفر جاری کیا۔ کروٹیں بدلے مشکل دور میں ہم نے نہ صرف دوست بدلے، بلکہ دشمنوں کے دوستوں کو بھی اپنی صف میں شامل کر لیا۔

مشکلیں ابھی بھی کم نہیں ہوئیں، مگر انشاء اللہ ایک روشنی کا سفر ہے جس کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں۔ شاید دنیا پہلے جیسی نہیں رہی، جیسے حالات سے ہم گزرے ہیں ویسے حالات سے آج کل امریکہ اور انڈیا گزر رہا ہے۔ ہمارا ایک دشمن گڑھے میں ہے تو دوسرا کھائی میں ہے۔ ایک کھائی وہ بھی تھی جو امریکہ اور انڈیا نے ملک کر پاکستان کے لیے کھودی تھی، جس میں بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنا شامل تھا۔

پاکستان کے حق میں بہت ساری چیزیں بہت بری ہوئی ہیں، ہمارے اپنے لوگوں میں بہت سے منافقین تھے جنہوں نے پاکستان کو شدید نقصان پہنچایا۔ مگر محبت اور جنگ میں یہ تو ہوتا ہے۔

نہ ہمارے دشمن کم ہیں، اور نہ ہمیں امید ہے کبھی کم ہوں گے، نہ ہمیں یہ امید ہے کہ ہم میں منافقین ختم ہو جائیں گے، ہمیں اپنی صفوں میں منافق بھی ملتے رہیں گے اور نادان دوست بھی، مگر ہماری مسافت بھی جاری رہے گی۔ بہت سی نادانیوں کے باوجود بھی کچھ تو ہماری قوم میں ایسا ہے کہ ہم پر اللہ کا کرم جاری ہے۔

آج کا پاکستان کسی صورت کل کے پاکستان سے کمزور نہیں ہے، اور دنیا جو کروٹ لے رہی ہے اس میں ہمارے لیے انشاء اللہ بہت اچھے دنوں کی نوید ہے۔

تنقید برائے فروخت، تعریف برائے فروخت

تحریر: میاں وقار الاسلام

قلم کار بھی بڑی عجیب مخلوق ہیں، ایک طرف، جب یہ کسی کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو شاید ہی کوئی تعریف کا لفظ ہو جسے وہ استعمال کرنے سے گریز کر جائیں۔ اتنی عمدہ تعریف کی جاتی ہے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں۔

دوسری جانب، جب بات کسی سے اختلاف کی ہو تو ان کی تنقید بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، ایسے ایسے کلمات ایجاد کر لیتے ہیں کہ نسل انسانی نے ایسے کلمات کا اس سے پہلے تصور نہیں کیا ہوتا۔ ایسی ایسی تنقید کی جاتی ہے کہ کردار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی جاتی ہیں اور لوگ تھو تھو کرنے لگتے ہیں۔

اگر قلم کار تعلق کسی اخبار، میگزین، ٹی وی چینل یا پھر میڈیا گروپ سے ہو اور اسے تنقید یا تعریف کے بدلے پیسے بھی ملتے ہیں پھر تو سونے پر سہاگے والی بات ہے۔ جس چیز کو پکڑ لیا جاتا ہے، اسے آسمان کی بلندیوں پر لے جایا جاتا ہے یا پھر آسمان کی بلندیوں سے زمین پر گرا دیا جاتا ہے، پھر بھی چین نہ آئے تو زمین میں دھنسا دیا جاتا ہے، پھر بھی چین نہ آئے تو زمین میں دھنسانے کے بعد اوپر سے پتھر بھی مارے جاتے ہیں۔ ایسے قلم کاروں کی روحیں، بڑی بے چین روحیں ہوتی ہیں، جہاں ان کا بس چلتا ہے، یہ گڑھے مردے اکھاڑ کر، ان پر بھی بحث کرنے سے باز نہیں آتے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ ایک ہی پیشہ ورانہ قلم کار، ایک ہی قلم سے، متواتر ایک شخص کی تعریف کرتا رہتا ہے، پھر اس کی تنقید کا مرحلہ شروع ہوتا ہے، پھر بات آپس میں طے پا جاتی ہے، تو پھر تعریف شروع ہو جاتی ہے، اور اگر بات پھر بگڑ جائے تو پھر سے تنقید شروع ہو جاتی ہے، یعنی بڑی عجیب فلاسفی ہے، اتنے نشیب و فراز تو سمندر کی طوفانی لہروں میں نہیں ہوتے، جتنے نشیب فراز ماہر میڈیا اداکاروں کے قلم کے مختلف زاویوں میں ہوتے ہیں۔

پیشہ ورانہ قلم کار کے قلم کی نوک بڑی بے لگام ہوتی ہے، یہ جس طرف چاہے موڑ دی جاتی ہے، بس شرط صرف اتنی ہے کہ پیسہ لگایا جائے، پھر چاہے جھوٹی خبروں کو سنہری حروف سے لکھوایا جائے، یا پھر سچی خبروں پر کالی سیاہی پھر دی جائے۔ یعنی باقاعدہ یہ ملازمت سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

اکثر و بیشتر تمام علوم ایسے ہیں، جن کی اساس ظلم پر مبنی نہیں ہوتی، مگر جیسے ہی تعلیم مکمل کر لی جاتی ہے، اس علم کی روحانی اساس کو تعلیمی اداروں میں چھوڑ دیا جاتا ہے، اور انتہائی عزت و احترام سے ملنے والی ڈگری کو پرلے درجے کی ذلالت اور خرافات کے لیئے استعمال کیا جاتا ہے۔

بات صرف صحافت تک محدود نہیں ہے، کوئی بھی علم اس لیئے حاصل نہیں کیا جاتا کہ اس سے ظلم کیا جائے، بلکہ اس لیئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس سے مجبور اور مظلوم لوگوں کو فائدہ ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ علوم کو اپنے ذاتی فائدے کے لیئے موڑ دیا جاتا ہے، اور علوم بجائے کسی مظلوم کا سہارا بننے کے، کسی ظالم کا آسرا بن جاتے ہیں۔

ایسے عمدہ علوم جو ظالم کو مضبوط کریں اور مظلوم کو مذید کمزور کریں، یہ علم نہیں بلکہ یہ ایک جہالت ہے اور اس سے بڑی کوئی جہالت نہیں، اور شاید ایسے ہی منافقین دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

دنیاوی علوم تو پھر دنیاوی علوم ہیں، یہاں دینی علوم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کیوں بڑے بڑے عالم فاضل لوگ رسوا ہو جاتے ہیں، کیوں کہ یہ لوگ دین کو بھی کاروبار بنا لیتے ہیں اور اس سے ذاتی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دین کا مطلب امیر کے لیئے تبدیل کر دیا جاتا ہے اور غریب کے لیئے بھی تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

ایسا دین جس سے مظلوم کی آس ہی ٹوٹ جائے اور ظالم اپنے ظلم سے بے خوف ہو جائے، تو کیا یہ وہی سچا دین ہے جسے ہماری طرف بھیجا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے حق کو اپنے حساب سے تبدیل کر رکھا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہم کوئی بھی علم حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے فائدے کے لیئے بدل دیتے ہیں۔

انسان اپنے اوپر ظلم اسی طرح کرتا ہے اور اپنے پیٹ میں آگ بھی اسی طرح بھرتا ہے۔ مگر وہ اسے سمجھنے یا ماننے کے لیئے تیار نہیں کہ وہ جو کر رہا ہے وہ غلط ہے۔

جب ہم تنقید اور تعریف اپنے فائدے کے لیئے کرتے ہیں، تو یہ چیز ہمیں انصاف قائم کرنے سے دور لے جاتی ہے، ہمارا مفاد ہمارے لیئے سب کچھ ہوتا ہے، یعنی وہی کہ ہم نے خود کو اپنی خواہشات کا غلام بنا لیا ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو اپنے علم کو دیانت داری سے فلاح کے لیئے استعمال کرتے ہیں اور کسی کا نقصان نہیں کرتے۔ان کا رجوع اپنی ذات کی بجائے، اپنے خدا کی طرف ہوتا ہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے شاید فرق نہ پڑے کہ کس کا علم زیادہ ہے اور کس کا علم کم، مگر اس چیز سے ضرور فرق پڑے گا کہ کس نے اپنے علم کو انسانوں کی فلاح کے لیئے استعمال کیا، اور اپنی آخرت بچائی اور کس نے اپنے علم کے ذریعے اپنی عاقبت خراب کی، اپنی جان پر ظلم کیا، اپنے پیٹ میں آگ بھری، اور اپنے لیئے دوزخ خریدی۔

اللہ ہمارے علم میں اضافہ فرمائے، اور ہمیں ہدایت دے، تاکہ ہم اپنے علم سے واپس جہالت نہ خریدیں اور اپنے حق میں گھاٹے کا سودا نہ کریں آمین۔

دعا گو، میاں وقار الاسلام

ماحولیاتی آلودگی

تحریر: میاں وقارالاسلام

ہم میں سے اکثر نے شاید یہ بات سنی ہو گی کہ اگر کوئی گندے پانی میں پتھر مارتا ہے تو کیچڑ اس کے اپنے اور واپس آتا ہے۔

حیرانی ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے ماحول کو کس کس طرح سے زہر آلودہ کیا، طرح طرح کے جوہڑ اپنے ارد گرد بنا لیے، جو نظر آتے بھی ہیں اور نہیں بھی اور پھر ہر جوہڑ میں پتھر مارے اور آج ہمارے وجود اندر اور باہر سے ماحولیاتی آلودگی سے بری طرح خراب ہو رہے ہیں۔

ہم نے اپنا باہر اس قدر گندا کر لیا ہے کہ یہ اٹھتی ہوئی غلاظت ہمارے وجود کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ ہم نے نہ تو پانی کو پینے کے قابل چھوڑا اور نہ ہی ہوا کو سانس لینے کے قابل چھوڑا۔

سنا تھا کہ کتا بھی اپنی جگہ صاف کر کے بیٹھتا ہے مگر آج کا انسان اس بات سے معذور ہے کہ اپنے آپ کو ماحولیاتی آلودگی سے محفوظ رکھ سکے۔ انسان کی پھیلائی ہوئی غلاظت سے اس کا اپنا تو بیڑا غرق ہو ہی رہا ہے ساتھ ساتھ کئی قسم کے جانور اور پرندے یا تو نقل مکانی کر رہے ہیں یا پھر ان کی نسل ہی ختم ہو رہی ہے۔

قدرت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ اس کا قدرتی حُسن خطرے میں ہے۔ اور آج کا انسان کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر منہ سے اور ناک سے غلاظت کو اپنے اندر جمع کرتا جا رہا ہے۔

ہم نے غلطی کہاں کی

جب دیہات شہروں میں بدل رہے تھے ہم نے شہروں کو سیمنٹ کے جنگلوں میں بدل دیا۔ شہروں میں درختوں کے وجود سے شہروں کی فضا اس قابل تو ضرور تھی کہ کسی کو سانس لینے میں مشکل نہیں ہوتی تھی۔ اور پھر یوں ہوا کہ ہم نے ایسے لیڈر چنے جنہوں نے درختوں کا قتلِ عام کیا اور ہم سے صاف فضا میں سانس لینے کا حق بھی چھین لیا۔

درختوں کا دم گھٹتا ہے

ابر رحمت ہاتھ میں لینے
گرد شہر کی اٹھتی ہے
ہوا کا زہریلا مادہ بھی تو
مقدس پانی میں ملتا ہے
ایک طرف تو نظریں ہیں
سورج چاند ستاروں پر
دوسری طرف یہ انسان
دیکھتا ہے نہ سنتا ہے
کمزور بچپن لاغر جوانی
قبل از وقت محتاج بڑھاپا
انسان بھی کیسا احمق ہے
حماقت پر سر دھنتا ہے
انسان نے خود تخلیق کیا
ناپاک آلودہ فضاوں کو
مرتے ہیں معصوم پرندے
درختوں کا دم گھٹتا ہے

شاعر : میاں وقار الاسلام

انٹرنیٹ اور پرائیویسی

تحریر : میاں وقار الاسلام

پرائیویسی ہماری زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ رشتے اور تعلق پرائیویسی کی وجہ سے ہی مضبوط رہتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط تعلق بھی پرائیویسی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انسان اور رحمان کا بھی آپس میں ایک تعلق پرائیویسی کا ہے، جس میں انسان اپنے رب کو اکیلے میں منانے کی کوشش کرتا ہے، روتا ہے گڑگڑاتا ہے اور اپنی توبہ کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہمارے گناہوں پر پردہ ڈالتا رہتا ہے، اور اسی پردے کی وجہ سے ہماری عزت اور ہمارا وقار محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح کے ایک پردے کا حکم مرد کو ہے کہ اپنی نگائیں نیچی رکھیں اور اسکی طرح کا ایک حکم عورتوں کی بھی ہے کہ اپنی شرم و حیا کا خیال رکھیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کی زندگی کو بہت تیزی سے بدلا ہے۔ ہم ماڈرن ہوتے ہوتے کہاں سے کہاں آ گئے ہیں اور جانے یہاں سے کہاں تک چلے جائیں گے۔ بظاہر جو دنیا ہمیں بہت خوبصورت نظر آتی ہے، یا جس طرح کا تصور ہمارے ذہنوں میں ڈال دیا جاتا ہے حقیقت اس کے برعکس ہی ہوتی ہے۔

ہمارا کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیب یا موبائل جب انٹرنیٹ سے منسلک ہو جاتا ہے تو اس کی پرائیویسی جذوی طور پر نہیں بلکہ مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ سیکورٹی کی مختلف ایپس موجود ہیں ایک لالی پاپ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

ہماری ایک ڈیجیٹل ڈیوائیس جسے ہم ایک منفرد آئی پی ایڈریس کے ذریعے انٹرنیٹ کی دنیا سے جوڑتے ہیں تو یہ وہاں پہلے سے موجود کئی ملین ڈیجیٹل ڈیوائیسیں کی دسترس میں آ جاتی ہے۔ ہماری ایک ڈیجیٹل ڈیوائیس میں 65 ہزار 5 سو پینتیس پورٹس ہوتی ہیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم ڈیٹا بھیجتے ہیں یا پھر منگواتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ڈیجیٹل ڈیوائیس جس کا بظاہر ایک بھی دروازہ نہیں ہوتا مگر حقیقت میں اس کے 65 ہزار 5 سو پینتیس دروازے ہوتے ہیں جن سے ہماری ڈیجیٹل ڈوائیس کا کچھ بھی محفوظ رہنا تقریبا ناممکن ہی ہے۔

ناسا اور پینٹاگان جن کا بجٹ دنیا کے کسی بھی دوسرے اداروں سے بہت زیادہ ہے، خود انہیں آئے دن سیکوریٹی کے شدید خطرات کا سامنا رہتا ہے۔ امریکہ کے سپیس مشن کی حساس معلومات تک محفوظ نہیں اور ان کے ڈیپ سیکورٹی سسٹم بھی غیر محفوظ ہیں۔

پرائیویسی دنیا کے طاقت ور اداروں، اور طاقت ور ممالک کے لیے کسی بھی باقاعدہ جنگ سے کم نہیں۔ ڈیجیٹل پرائیویسی ایک ایسی جنگ ہے، جو کوئی ملک بھی جیت نہیں سکتا سب کے سب اپنے نقصانات کو کم سے کم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

آٹی دنیا کے چند بڑے بڑے کاروباروں میں سے ایک ہے، فیس بک، وٹس ایپ، لنکڈان، ٹیوٹر اور اس طرح کی تمام کمپنیاں دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں کی فہرست میں آتی ہیں۔ بظاہر تو یہ ہم سے کچھ چارج نہیں کر رہے مگر حقیقت میں ہم ان کے ملازم ہی ہیں اور ملازم بھی وہ جو تنخواہ بھی نہیں لیتے۔ یہ تمام کمپنیاں جن کے صارف بلینز میں ہیں اور یہ دنیا کے بڑے بڑے ڈیٹا سینٹرز چلاتے ہیں ان کے پاس موجود تمام معلومات برائے فروخت ہوتی ہیں۔ کون سا صارف کس پیج، تصویر یا ویڈیو پر کتنی دیر رہا، اور کتنی بار کتنی دیر رہا ان کے پاس یہ سارا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔

جی بس آنے ہی والی ہے، اس کے آتے ہی انٹرنیٹ آف تھینگز بھی ہمارے سامنے ہوں گی، جس کے ساتھ ہمارے گھر کی تمام برقی 5 مصنوعات منسلک ہوں جائیں گی۔ بہت جلد کمپنیاں یہ معلومات بھی اٹھانے والی ہیں کہ کون کتنی دیر اے سی یا ہیٹر یا دیگر آلات چلاتا ہے اور وہ بھی کتنی دیر اور کب کب۔

ہم جو بھی اپ لوڈ کرتے ہیں، یا شئیر کرتے ہیں، وہ ہمارے ڈیلیٹ کرنے کے باوجود ان کے ریکارڈ کا حصہ ہے، اور اگر وہاں سے بھی ڈیلیٹ ہو جائے تو پرانے سے پرانا ڈیٹا بھی ریکور ہو جاتا ہے۔

ایک طرف سوشل میڈیا کمپنیاں ہمارا ریکارڈ مرتب کرنے میں لگی ہیں تو دوسری طرف آئے دن ان کا ڈیٹا چوری ہوتی رہتا ہے۔ پبلک انفارمیشن یہ صرف ڈیٹا نہیں ہے بلکہ یہ ایک مال ہے جسے بیچ کر یہ کمنیاں بلینز آف ڈالر پیسہ کماتے ہیں۔

یاہو کے تین بیلنز صارفین کا ریکارڈ چوری ہو گیا، یہاں تک کے ان کے صارفین کے نام، آئی ڈی پاس ورڈز، ڈیٹ آف برتھ اور سیکورٹی کے سوال بھی۔ اپنے صارفین کا ریکارڈ چوری کروانے میں یاہو 3 بلین صارفین کے ساتھ اب تک نمبر ایک پر سبقت لے رہا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق سال 2020 مین 9 بلین کے قریب صارفین کے ریکارڈ چوری ہوں گے۔ چوری ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اکاؤنٹ بند ہو جاتے ہیں، بلکہ کمپنیاں یہ معلومات اکٹھا کرتی ہیں اور اسے مارکیٹنگ کے لیے استعمال کر کے منافع کماتی ہیں۔

یاہو کی طرح بہت سے اور بڑی کمپنیاں ہیں جیسے اڈاب، ای بے، لینکڈ ان، مائی سپیس وغیرہ جو نہ صرف پرائیویسی کی مد میں بڑے بڑے نقصان برداشت کر رہی ہیں بلکہ بھاری جرمانے بھی ادا کر رہی ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس کے باوجود ان کے منافع کم نہیں ہو رہے اور ان کا کاروبار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا کے 70 فیصد لوگوں کی اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ ان کی معلومات چوری ہو جائیں گی، اور 30 فیصد اس سلسلے میں بہت محتاط ہیں مگر پھر بھی بچ نہیں پاتے۔

ڈیٹا سینٹرز کے پاس دنیا جہاں کا ریکارڈ موجود ہے اور یہ سارا ریکارڈ ہر دو سال کے بعد دوگنا ہو جاتا ہے۔ ڈیٹا سینٹرز، کمپیوٹرز اور موبائیل کی سٹوریج کپیسٹی بھی بڑھتی جا رہی ہے یعنی ہم ایک بیگ بینگ کی طرف جا رہے ہیں۔

باوجود اس کے کہ ڈیٹا محفوظ نہیں، ہم اس کی چوری کے امکانات کم کر سکتے ہیں اور کرنے بھی چاہیں۔ انتہائی حساس معلومات، انٹرنیٹ پر شئیر نہ کریں، اہم معلومات کا بیک اپ ضرور بنائیں، فیک سائیٹس سے دور رہیں، غیر ضروری ای میل کو سپیم ضرور کریں اور پھر ڈیلیٹ بھی کر دیں، پاس ورڈز مشکل رکھیں تاکہ اکاؤنٹ محفوظ رہے۔ کچھ عرصے بعد پاس ورڈ ضرور تبدیل کریں۔ فری نیٹ استعمال کرتے ہوئے احتیاط کریں، اپنے وائی فائی نیٹ کا پاس ورڈ آسان نہ رکھیں، اینٹی وائرس ضرور استعمال کریں اور اسے اپ ڈیٹ بھی رکھیں، اہم فائلز اور فولڈرز کو پاس ورڈ لگا لیں یا آف لائن ڈرائیو پر رکھیں۔ اپنی ڈیجیٹل ڈیوائیسز کو بھی پاس ورڈ لگا کر رکھیں۔ ٹیسٹیڈ سافٹ ویئرز اور یوٹیلیٹیز استعمال کریں یا پھر رجسٹرڈ۔ فری ویئر ایپلیکیشن سے سسٹم غیر محفوظ رہے گا۔

یہ تمام گائیڈ لائن، اس بات کی گارنٹی نہیں ہیں کے آپ ہیک نہیں ہو سکتے، مگر امکانات کم کیئے جا سکتے ہیں۔

تھوڑی سی روشنی

تحریر : میاں وقار الاسلام

تھوڑی سی روشنی انسان کے بہت سے اندھیروں کے ختم کرنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

انسان اپنی سوچ کے بند کمروں سے باہر آنے میں بہت دیر کر دیتا ہے۔ خاص کر کے ان کمروں سے جو اسے جینے کا راستہ نہیں بتاتے اور آخر کار زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔

سمندر کے ساحل پر موجوں کی روانی زندگی کا پتہ دیتی ہے، صبح سویرے سورج کی کرنیں زندگی کی امید لے کر آتی ہیں، باغوں میں پرندوں کا چہچہانا زندگی کا ساز بجاتا ہے۔

رم جھم برستے بادل اداسیوں کی گرد کو ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد رونما ہونے والی تبدیلیاں وقت کے بدلنے کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

زندگی بہت تلخ چیز ہے کبھی کبھی اس سے باہر نکل کر بھی دیکھنا چاہیئے، کبھی کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے انسان کھو جائے تو نہ جانے کیا کیا ڈھونڈ کر لا سکتا ہے۔

انسان ڈھونڈنا چاہے تو شاید ایک ایسا امرت بھی ڈھونڈ کر لا سکتا ہے جو اس کی تلخیوں کو پی جائے۔ مگر انسان کم ہی کوشش کرتا ہے۔

ہم اپنی ضرورتوں سے کہیں زیادہ وزن اُٹھاتے ہیں، اتنا وزن جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت نہیں ہوتی، اور پھر اسی وزن سے ہماری کمر دوہری ہوتی چلی جاتی ہے۔

انسان اپنی خواہشات کے سامنے خود کو بیچ بیٹھتا ہے اور اس کا پور پور گروی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور بہت جلد اس پر ایسا وقت آتا ہے کہ اسے اپنی ذات کے لیے خود سے وقت خریدنا پڑتا ہے۔ وہی وقت جو نہ قارون کو مل سکا، نہ ہی ہامان کو مل سکا اور نہ ہی فرعون کو مل سکا۔

وقت ہمیں بتاتا چلا آیا ہے کہ دنیا کا سب سے طاقتور انسان بھی اتنا ہی کمزور ہے جتنا دنیا کا سب سے کمزور انسان کمزور ہے۔ مگر ہمیں پھر بھی طاقت چاہیے تاکہ ہم اپنی کمزوریوں کا مظاہر کر سکیں اور پھر بے بس ہو جائیں۔

انسانوں کی طرح زندگی گزاریں نہ کے اس مکڑی کی طرح کہ ساری زندگی جالا بنتی رہے اور اور اسی جالے کی اندھیر نگری میں دم گھٹنے سے مر جائے۔ اپنے لیے تھوڑی سی روشنی ضرور رکھیں، ایک کھڑکی ضرور کھلی رکھیں جس سے تازہ ہوا کے جھونکے آپ کی زندگی میں داخل ہوتے رہیں۔

نہ ہی زندگی کو اپنے اوپر تنگ کریں اور نہ ہی اپنے ارد گرد کے لوگوں پر زندگی کو تنگ کریں۔ اپنے لیے بھی سپیس بنائیں اور وہی سپیس لوگوں کو بھی دیں تاکہ اپ کے ماتحت کسی دباؤ میں ایک ایسی زندگی نہ گزاریں کہ جس میں ہوا روشنی اور پانی کی قلّت ہو جائے۔

ایسا نہیں ہے کہ خوش نظر آنے والے لوگ دکھی نہیں ہوتے مگر انہیں اپنے غموں کو چھپانے کا فن آتا ہے

خود اعتمادی ہماری کمزوریوں کو کم نہیں کرتی مگر ہمیں اپنی کمزوریاں چھپانا سیکھا دیتی ہے

تھوڑی سی روشنی اگر آپ کے اندھیرے ختم کر سکتے ہے تو آپ کے ارد گرد بہت سے لوگوں کے لیے بھی روشنی لا سکتی ہے۔ ایک مسلمان پر ویسے بھی لازم ہے کہ وہ روشنی کا سفیر بنے نہ کہ اندھیروں کا سوداگر۔

حفیظ سینٹر جل گیا

تحریر: میاں وقار الاسلام

حفیظ سینٹر پاکستان کی آئی ٹی مارکیٹس میں دل کی حیثیت رکھتا تھا جسے چند دن پہلے آتشِ جاں سوز نے آلیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں خاندانوں کا روزگار چھن گیا، یہاں کاروبار کرنے والوں کے زندگی بھی کی جمع پونجی لٹ گئی۔ بظاہر تو چند سو دکھانیں جل گئیں اور چند ہزار لوگوں کا کاروبار تباہ ہو گیا مگر اس مارکیٹ سے وابستہ لاکھوں لوگ اس سانحے سے لمبے عرصے تک متاثر رہیں گے۔ حفیظ سینٹر صرف ایک مارکیٹ ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسی مارکیٹ تھی جس سے ہزاروں چھوٹی چھوٹی مارکیٹس کا کاروبار جڑا تھا۔

کہنے کو ایک مارکیٹ تھی مگر یہ ایک ہول سیل مارکیٹ تھی، جس میں نہ صرف وہاں پر رہنے والوں کی سرمایہ کاری تھی بلکہ بہت سے باہر کے لوگوں کی بھی شراکت تھی۔ کرونا کی وجہ سے کاروبار پہلے ہی بند تھے۔ بہت مشکل سے کاروباری سرگرمیوں کا آغاز تو ہو گیا تھا مگر ابھی بھی مارکیٹ میں جان نہیں تھی۔ اور آئی ٹی مارکیٹ ایک ایسی مارکیٹ ہے جس میں آئی ٹی پروڈکٹس کی قیمتوں کا تعین وقت کے ساتھ طے ہوتا ہے۔ اگر آئی ٹی پروڈکٹس کچھ عرصہ سیل نہ ہوں تو وہ ویسے ہی ملبے میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کاروبار جو بڑی مشکل سے دوبارہ شروع ہوا تھا اس میں بہت زیادہ احتیاط کی جارہی تھی۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں آئی ٹی کی مصنوعات پہلے ہی سے منظرِ عام سے غائب تھی اور اگر کہیں سٹاک موجود بھی تھا تو اس کی قیمتیں بہت بڑھ چکی تھیں۔ اور پاکستان میں ڈالر جس طرح سے بڑھا ہے اس سے تو سبھی واقف ہیں۔

انتہائی مشکل حالات کے باوجود حفیظ سینٹر کے لوگوں نے جس طرح سے ممکن ہوا اپنے نئے سفر کا آغاز شروع کیا یہ شاید وہی پرانے دن واپس لوٹ آئیں۔ آئی ٹی کی نئی متعارف ہونے والی مصنوعات تو مارکیٹ میں آنا شروع ہو گئی تھی مگر پہلے جیسی چہل پہل ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی مارکیٹ میں کاروبار پہلے کی طرح بحال نہیں ہوا تھا۔ اور یہ بھی توقع کی جارہی تھی کہ کہیں کرونا کی دوسری لہر کے بعد کاروبار دوبارہ بند نہ ہو جائیں۔ انہیں حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جس طرح کے تحفظات باقی کاروباری لوگوں کو تھے کچھ اسی طرح کے توقعات حفیظ سینٹر کے لوگوں کو بھی تھے۔ مگر ان تحفظات کے باوجود جیسے باقی لوگوں نے محدود کاروبار شروع کیا اسی طرح حفیظ سینٹر کی رونقیں بھی بحال ہوتی نظر آئیں۔ مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے نہ صرف حفیظ سینٹر کو ایک بڑی مارکیٹ بنتے ہوئے دیکھا ہے، بلکہ بہت سے بہترین دوستوں کو اپنے سامنے حفیظ سینٹر سے اپنا کاروبار شروع کرتے اور پھر آسمان کی بلندیوں تک جاتے دیکھا ہے۔ 20 سال سے زیادہ براہ راست حفیظ سینٹر سے وابستگی،

سینکڑوں رفاقتیں اور تعلق داریاں، بہت سے دوست اور محسن اور ایک ایک کا انتہائی تکلیف سے گزرنا خواب تو ان کے تھے مگر شاید ٹوٹ میرے اندر رہے تھے۔

اللہ بہتر جانتا ہے کہ کوئی ان کو مدد کو پہنچے گا یہ نہیں، جو خواب ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں، انہیں کوئی سمیٹے گا یا نہیں، جو امیدیں ٹوٹی ہیں ان کا کوئی آسرا بنے گا یا نہیں۔ ایک ناقابلِ بیاں نقصان ہے، جس سے بہت سے لوگ گزر رہے ہیں۔ جیسے بہت سے چراغ تھے، ہر طرف روشنیاں بکھیر رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئے۔

اللہ کہتا ہے مشکل کے ساتھ آسانی ہے، اور اللہ ہی ہے جو مشکل کے ساتھ آسانی پیدا کرتا ہے۔ اللہ ہے سبب کا پیدا کرنے والا ہے۔ بہت پرانی بات نہیں، حفیظ سینٹر کے ساتھ پیس کی عمارت بھی جل کر راکھ ہو گئی تھی، مگر اللہ نے اسے جلد بحال کر دیا اور اس کی رونقیں بھی اب پہلے جیسی ہی ہے۔ مگر ماضی کے اس واقعے نے بھی بہت سے دلوں کو غمناک کر دیا اور بہت سے لوگ اب تک بھی غمناک ہوں گے۔ بالکل اسی طرح امید تو کی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد حفیظ سینٹر کی رونقیں بحال ہو جائیں گی۔ مگر اس طرح کے دکھ جس طرح سے غمناک کر جاتے ہیں وہ دکھ بھی کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ حکومتوں کی عقل کے ناخون دے، ہمارے سیکورٹی کے اداروں کی کپیسٹی ابھی اتنی نہیں کہ اس طرح کے واقعات میں اپنا موثر کردار ادا کر پائیں۔ اللہ نے جب ہمیں وقت اور مہلت دیتا ہے تب ہم نے اپنی تیاری نہیں کرتے اور جب مصیبت آن پڑتی ہے تو پھر ہمارے پاس سوائے گلے شکوے کرنے اور ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے اور کچھ نہیں بچتا۔ چند لوگوں کی نااہلی ہزاروں لوگوں کی زندگیاں تباہ کر جاتی ہے، آخر ہم اب نہیں سنبھلیں گے تو پھر کب سنبھلیں گیا، اور کتنے نقصانات ہم نے اُٹھانے ہیں۔ کیا ہم نااہل حکمرانوں کے منہ کی طرف دیکھتے رہیں گے کہ اللہ نہ کرے کوئی اور سانحہ ہو۔ بے شرموں کے لیے اتنا ہی کہنا چاہوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈوب مرو

شیر نی نوں بلی چُک کے لے گئی

تحریر : میاں وقار الاسلام

ہم دیکھتے ہیں کہ مارکیٹ میں بہت ٹیلنٹ ہے، لوگ پہلے سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے، پہلے سے زیادہ ٹیکنکل سکیلز بھی رکھتے ہیں، پہلے سے کہیں زیادہ پُر آسائش ماحول میں پڑھتے ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود معاشرے میں ایسے لوگوں کا وہ نمائیاں کردار دیکھنے کو نہیں ملتا جو ملنا چاہیے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مزدوروں کی تعداد بڑھ رہی ہے، شاپس بڑھ رہی ہیں، پلمبر، ڈرائیورز، کار پینٹرز، اور اس طرح کے ہزاروں مواقع بڑی تیزی سے کم پڑھے لکھے اور کم صلاحیتوں کے مالک افراد حاصل کرتے جا رہے ہیں۔

مارکیٹ میں بہت جابز ہیں اور غریب طبقے کے کم پڑھے لکھے لوگ کیوں کہ محنت کے عادی ہوتے ہیں اور کسی کام کو عار نہیں سمجھے اور کہیں نہ کہیں سے اپنے کام کا آغاز کر لیتے ہیں۔ اور کافی حد تک کامیاب بھی رہتے ہیں۔

دوسری طرف زیادہ پڑھے لکھے افراد میں مزاج اور رویوں کی گڑبڑ دیکھنے کو ملتی ہے، ہر کام میں عار محسوس کیا جاتا ہے۔ جنہیں کوئی انٹرن شپ پر بھی نہیں رکھنا چاہتا ان کا دماغ بھی ساتویں آسمان پر ہوتا ہے۔ زیادہ کتابیں پڑھ پڑھ کر انہیں باتیں تو کرنا آ جاتیں مگر کام کو ہاتھ لگاتے ان کی جان جاتی ہے۔

کارپوریٹ سیکٹر میں جاب پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں، مگر جو لوگ ثابت قدم نہیں ہوتے، مشکلات کا سامنے کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ایسے لوگ باوجود اس کے کہ ان کے پاس بہت صلاحتیں بھی ہوتی ہیں مگر وہ گھر بیٹھ جاتے ہیں۔

بہترین ڈگریاں حاصل کر کے گھر بیٹھ جانے والے افراد قوم کے مجرم ہیں۔ اور کم تعلیم اور صلاحیت کے باوجود ضرورت سے زیادہ محنت کر کے اپنا کیریئر بنانے والے لوگ قومی ہیرو ہیں۔

میں تو اس حق میں ہوں کے بغیر ہاؤس جاب کے کسی کو میٹرک کی سند بھی نہیں دینی چاہے، اور جو لوگ پانچ سال تک اپنی ڈگری کو استعمال میں نہ لائیں ان کی ڈگری ہی کینسل کر دینی چاہیے۔

غضب خدا کا، ایم بی بی ایس سے پوچھیں تو وہ ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا، ایم بی اے والے سے پوچھیں تو وہ زراعت میں یا کنسٹریشن میں جانا چاہتے ہیں، آئی ٹی کے لوگ صحافی یا کمپوزر بنے ہوئے ہیں، یعنی آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

اچھی تعلیم صرف کھاتے پیتے گھرانے کے لوگوں کو میسر ہے اور کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ جاب نہیں کرتے۔ ایسے خاندانوں کو تو جیل میں ہونا چاہیے جو کہتے ہیں بیٹی کو پڑھایا ہے، بیٹے کو پڑھایا ہے، ماشااللہ دونوں گھر بیٹھے ہیں اللہ نے بہت دیا ہے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے بیٹھ کر تو کھوتا بھی کھا لیتا ہے پھر ان کا کیا کمال ہے۔

پی ایچ ڈی بھی کر لیں ہمارے جاہلانہ رسم و رواج نہیں جانے، کرنا وہی ہے جو دادا پردادا کرتے تھے، اعلی سے اعلی تعلیم لینے کے بعد بھی رشتے باجی رشیداں کروائے گی اور خاندان مشاورت شیدے ٹلی سے کرے گا۔

اگر معاشرے نے کن ٹوٹوں اور جیب کتروں کو ہی اپنا پیر بنانا ہے تو پھر انہیں پڑھانے کا کیا فائدہ ہے۔ جاہلوں کی ایک الگ یونیورسٹی بنا دیں اور ایم اے جاہلیات اور پی ایچ ڈی جاہلیات جیسے پروگرام متعارف کروا دینے چاہیں، ویسے بھی ہم اپنی حاجات کو محنت سے کب پورا کرتے ہیں ہمیں تو پھر بھی کسی ماہر عملیات کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔

جب معاشرے کا سارا گند سیاست میں ہو اور قوم کی نمائندگی کرتا ہو، اور صبح شام قوم کو ملکی اور بین القوامی سطح پر ذلیل کرتا ہو اور پھر بھی پانچ سال بعد ویسے ہی لوگ پانی میں مدھانی مار کے نکال لیے جاتے ہوں تو پھر رونے کا کیا فائدہ، ہم نے جو جو بویا ہے وہی تو کاٹا ہے پھر شکوہ کس سے اور شکایت کس سے۔

ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی ٹھگ بیٹھا ہوا ہے اور اسکی دکان خوب چل رہی ہے، اور ہر موڑ پر آپ کو پڑھا لکھا بے روزگار بھی نظر آئے گا۔ یہ بالکل ایسا ہے ہے کہ شیرنی بلی کی قسمت پر رشک کر رہی ہے اور دعا مانگتی رہتے ہے کہ یا اللہ مجھے شیرنی کیوں بنایا مجھے بلی کیوں نہیں بنایا میں بھی لوگوں کا خون چوستی اور روز مفت کا دودھ پیتی۔ جب کہ شیرنی میں بھرپور صلاحیت ہے کہ وہ اپنا شکار خود کر سکتی ہے اور لگڑ بگڑ اور بلیوں کے لیے بھی وافر مقدار میں چھوڑ سکتی ہے۔ مگر نہیں شیرنی اتنی کمزور کے بلی اسے اپنے منہ میں اٹھا کر لیے پھرتی ہے اور جہاں چاہتی ہے پھینک دیتی ہے اور شیرنی کے آواز بلی کی میاؤں میاؤں سے بھی ہلکی ہوتی ہے۔ اقبال جنہیں شاہین بنانا چاہتا تھا معاشرے نے ان کے رنگ برنگے چوزے چوزے کر دیے۔

اللہ ہمیں ہدایت دے، ہم عقل کے ناخن لیں جانے ہم کہاں بھٹکے جاتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کی پانچویں جینریشن اور جدید جنگ

تحریر : میاں وقار الاسلام

ٹیکنالوجی کی پانچویں جینریشن صرف ٹیکنالوجی نہیں بھی یہ جدید دور کی ایک جنگ ہے۔ دورِ حاضر کی سپر پاور صرف وہی ہو گی جو ٹیکنالوجی کی جنگ میں سبقت حاصل کرے گی۔

امریکہ کی بہت ساری کمپنیوں کا نام و نشان مٹ چکا ہے اور بہت سی کمپنیوں کا نام نشان مٹنے جا رہا ہے۔ پچھلے 20 سال سے امریکہ اور چین ٹیکنالوجی کی سرد جنگ میں ایک ٹکراؤ کی صورتِ حال میں تھے۔ دنیا میں جدید ٹیکنالوجیز متعارف کروانے میں چین امریکہ پر واضع برتری حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا۔۔۔۔ امریکہ کی حالت بھی کچھ ایسی ہے۔۔۔۔۔ باوجود بہترین ٹیکنالوجیز موجود ہونے کے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ امریکہ نے اپنی غلط پالیسوں کی وجہ سے اپنا پہلے ہی بیڑہ غرق کر لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مستقبل قریب میں بھی امریکہ کو اس کی مضبوط ترین کمپنیاں کچھ زیادہ فائیدہ دینے سے قاصر نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وجہ یہ ہے کہ جو امریکہ بناتا ہے چین اس کا بہتر متبادل لے آتا ہے اور وہ بھی انتہائی کم قیمت پر۔

چین کو بنانے میں بھی خود امریکی کمپنیوں کا ہی ہاتھ ہے۔ امریکہ کی اپنی اکثر اور بیشتر کمپنیاں چائینہ کی سسٹر کمپنیاں ہیں۔ جو فائیدہ امریکی کمپنیاں خود امریکہ میں بیٹھ کر حاصل نہیں کر سکتی تھیں وہ تمام فائدے یہی کمپنیاں چین میں بیٹھ کر باآسانی حاصل کر لیتی ہیں۔

باوجود چائنیز کمپنیوں پر بین لگانے کے۔۔۔۔۔۔۔ امریکی کمپنیوں کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ چین کی کمپنیاں باوجود کرونا کی صورتِ حال کے۔۔۔۔۔۔۔ امریکی کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ بزنس کر رہی ہیں۔۔۔۔۔۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

چین چیپ مینو فیکچرنگ کی کیپسٹی نہ صرف ڈبل کر چکا ہے بلکہ اس کی لاگت میں بھی واضع فرق ڈال چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں۔۔۔۔ کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں علاج کرتے گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ امریکہ کو بالکل اسی صورتِ حال کا سامنا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور جو بائیڈن بھی یہی اشارہ کرتا نظر آتا ہے کہ چین کے ساتھ ٹیکنالوجی وار جاری رہے گی۔

ایک انگریزی کہاوت ہے

If you will always do, what you always did, you will always get what you always got.

مستقبل قریب میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا کہ امریکہ اپنی روش بدلنے کا ارادہ رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔تو جو مسلسل ناکامیاں امریکہ کے گلے پڑتی چلی آ رہی ہیں ان کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری رہے گا۔

ٹرمپ کی پالیسوں کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ٹرمپ نے ڈرائیگن کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا، ہواوے کی سیل 2019 میں 18 فیصد بڑھی، سال 2020 میں باوجود کرونا کے۔۔۔۔۔۔۔۔پہلے 9 ماہ میں 10 فیصد بڑھی۔۔۔۔۔۔۔اور چین کے صدر نے سیمی کنڈکٹر ٹیکنالوجی سیکٹر میں مذید 4-1 ٹریلین ڈالر انوسٹ کرنے کا اعلان بھی کر دیا اور یہ بھی کہ دیا کے آگلے پانچ سال میں چین دنیا کے لیے ایڈوانس سیمی کنڈکٹر ٹیکنالوجی پاور ہاؤس بن کر ابھرے گا۔

بہت سی امریکی سیمی کنڈکٹرز بنانے والی کمپنیوں کا انحصار چین پر تھا جیسا کہ کو لیکم 50 فیصد چیپس چین کو ایکسپورٹ کرتی تھی۔ امریکہ کا چینی کمپنیوں پر پابندیاں لگانا، دنیا امریکہ کی ناکامی کے طور پر دیکھ رہی ہے۔ امریکہ بری طرح تنہا ہوتا نظر آتا ہے اور دنیا چین کے ارد گرد اکٹھی ہوتی نظر آتی ہے۔

ہواوے کئی سالوں سے نیٹ ورکنگ کی مصنوعات بنا رہا ہے اور کبھی ایک کوئی ایک سپائی کیس سامنے نہیں آیا، پھر 5 جی لانچ ہونے کے بعد امریکہ نے جو الزام ہواوے پر لگائے ان الزامات کو ثابت کرنے میں بھی بری طرح ناکام رہا۔ گذشتہ کئی سالوں سے غیر ملکی کمپنیوں پر بے بنیاد الزامات لگانے کی وجہ سے امریکہ "ان فئیر ٹریڈ پریکٹیس" میں دنیا کر نمبر ون ملک بن چکا ہے۔

بین القوامی تجارت میں امریکہ کی تاریخ اتنی سیاہ ہے کہ مستقبل قریب میں امریکہ کی ہائی ٹیک کمپنیوں کا قبرستان بنتا دیکھائی دیتا ہے۔

ایک طرف ٹیکنالوجی کی پانچویں جینریشن اپنے نئے دور میں داخل ہو چکی ہے اور دوسری طرف امریکہ ٹیکنالوجی کی دوڑ سے باہر جاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

سکول کتنے اہم ہیں؟

تحریر: میاں وقار الاسلام

سکول دوبارہ کھل گئے، بچوں نے دوباری اپنی تعلیمی زندگی کی طرف آنا شروع کر دیا۔ حالات بہت تیزی سے بگڑے اور پھر بگڑتے ہی چلے گئے، کئی ماہ تعلیمی وتدریسی عمل سے دور رہنے کے بعد بچوں نے دوبارہ سے اپنے آپ کو سکول کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔

چند ہی ماہ میں بچوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ سکول کے بغیر ان کی زندگی کس قدر مشکل اور نامکمل ہے۔ والدین کو بھی یہ احساس ضرور ہوا ہو گا کہ سکول بچوں کی کس قدر ذمہ داریاں اُٹھاتے ہیں۔ اور استادوں کا بچوں کی زندگی میں کس قدر عمل دخل ہوتا ہے۔

کرونا وائرس کی وجہ سے سب کچھ تبدیل ہو کر رہ گیا، بچے کا صبح کو اُٹھنا، تیار ہونا، وین یا کار یا بائکس پر جانا، سکول میں خود کو مصروف رکھنا، استادوں سے سیکھنا، سکول کی سرگرمیوں میں حصہ لینا، ساتھی طالب علموں کے ساتھ کھیلنا، ٹیوشن اور ہوم ورک کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کے اوقات بھی یکسر بدل کر رہے گئے۔

بچوں نے سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنا ہے، سکول تو کھل گئے ہیں مگر بچے ابھی تک ذہنی طور پر پوری طرح سے تیار نہیں۔ بچوں کو پوری طرح سے تعلیمی اور تدریسی عمل میں شامل ہونے کے لے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ سکول اور استادوں نے خود بہت کچھ برداشت کیا ہے، استادوں کو یا تو تنخواہیں ادھی ملی ہیں یا سرے سے ملی ہی نہیں، سکولوں بھی اپنا سسٹم دوبارہ سے کھڑا کرنے کے لیے بہت سے مراحل سے گزرنا ہے۔ والدین کو بھی بہت سی ایسی ذمہ داریاں اُٹھانی ہیں جو نارمل حالات میں شاید اُٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

بچوں کے بکھرے ہوئے خواب پھر سے جڑنے لگے ہیں، سکول کی سرگرمیاں پھر سے اپنے معمول کی طرف آ رہی ہیں۔ بچوں کے چہروں پر عید جیسی خوشی ہے، جو بچے کبھی بیزار ہو کر سکول جاتے تھے ان کا جذبہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بچوں کو ہنسا مسکراتا اور تعلیمی وتدریسی زندگی کی طرف لوٹتا دیکھ کر والدین نے بھی سکھ کا سانس لیا ہے۔ بچوں کا تعلیمی اور تدریسی نقصان تو بہت ہوا ہے مگر یہ امید بھی ہے کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔

سب کچھ پہلے جیسا تو ہو جائے گا مگر ابھی اس میں بہت وقت لگنا ہے، بچوں نے کہاں اپنا تعلیمی سفر چھوڑا تھا شاید انہیں بھی یاد نہیں، استادوں کے ساتھ پہلے جیسے تعلق بننے میں بھی وقت لگے گا۔ شاید بچے ہوتے ہی ایسے ہیں، بہت کچھ بہت جلد سیکھ بھی لیتے ہیں اور تھوڑی سا مشکل وقت انہیں بہت بڑی مشکل میں بھی ڈال جاتا ہے۔ مگر بچے باہمت بھی ہوتے ہیں، ان کی تیاریاں اور ان کا جذبہ بتاتا ہے کہ ان کی زندگی بہت جلد پہلے جیسے ہو جائے گی۔

جن لوگوں کے پاس وسائل موجود ہیں یقیناً انہیں کرونا کی مشکلات کا اس طرح سے سامنا نہیں کرنا پڑا جس طرح کا سامنا متوسط طبقے کے لوگوں کرنا پڑا ہے۔ ایک تو غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں سے ان کا روزگار ہی چھن گیا، دوسری طرف ان کے بچے متاثر ہوئے اور تیسری طرف جب دوبارہ سکول کھلے تو انہیں بھاری فیسوں کا سامنا بھی ہے اور اپنے روزگار کے حصول کے لیے بھی دشواریوں کا سامنا ہے۔

اسی طرح سے چھوٹے اور درمیانی سطح کے سکولوں کا بھی برا حال ہے، سکول بند ہوتے ہی انہیں کرائے اور سٹاف کی تنخواہوں کی پریشانی سے گزرنا پڑا، اگر کرائے کی عمارت کو سنبھالتے ہیں تو سٹاف جاتا ہے اور سٹاف کو سنبھالتے ہیں تو عمارت جاتی ہے۔ جو تعلیمی و تدریسی ٹیم سالوں کی محنت سے تیار کی گئی تھی بہت سے چھوٹے ادارے وہ ٹیم کھو چکے ہیں، دوبارہ سے سٹاف کو تلاش کرنا اور اپنے معیار کے مطابق ان سے کام لینا یقیناً ایک مشکل مرحلہ رہے گا۔

بہت ایسے اساتذہ بھی ہیں جو مشکل حالات میں اپنے پروفیشن کو ہی چھوڑ چکے ہیں، یہ حالات ان پر اتنے مشکل رہے ہیں کہ وہ کوئی بھی دوسرا کام کرنے کے لیے تیار ہے مگر پڑھانا ہی نہیں چاہتے۔ شاید سارے اساتذہ ایسے نہ سوچتے ہیں مگر بہت سے اساتذہ ایسے ہیں جن کے حالات اتنے اچھے نہیں کہ وہ تعلیم اور تدریسی عمل کے رک جانے کے بعد اپنا معاشی سفر جاری رکھ سکتے۔ ان کی پریشانیاں اپنی جگہ اہم ہیں اور انہوں نے اپنے حق میں اور اپنی ضروریات کے مطابق شاید بہتر فیصلہ کیا ہو مگر ہم نے بہت سے قیمتی اساتذہ ہمیشہ کے لیے کھو دیے ہیں۔

دوبارہ معمول کی طرف آتے ہوتے تعلیمی اداروں کو جہاں اداروں کے کھل جانے کی خوشی ہے وہیں اپنے معیار کو پہلے جیسا بنانے اور اپنی ساکھ بحال کرنے کا چیلنج بھی ہے۔ اسی طرح بچوں اور والدین کبھی بھی کچھ اضافی کرنا ہے تاکہ جو خلا کرونا کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں آیا ہے وہ پورا ہو سکے۔ اور انشاء اللہ ہمیں امید ہے کہ ہم یہ خلا جلد پورا کر لیں گے۔ دعا گو، میاں وقار الاسلام

مثلِ محشر

تحریر: میاں وقار الاسلام

شاید کسی نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہوگا کہ زندگی مثلِ محشر ہوتی چلی جائے گی۔ پاؤں کے نیچے سے زمین سرکے گی اور سر سے آسمان اُڑ جائے گا۔ میں آج کے حالات و واقعات کو دیکھتا ہوں تو مجھے قران کی وہ منظر کشی نظر آتی ہے جس میں محشر کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔

شاید کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ محشر جیسا ہی ہے، ایک قیامت ہے جو لوگوں کے سروں پر بار بار ٹوٹ رہی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہم جان لیوا بیماریوں سے آگاہ نہیں، یا ہم نے اپنی زندگی میں حادثات رونما ہوتے نہیں دیکھے۔ ہم نے اپنی زندگیوں میں بہت سے خوفناک مناظر دیکھے ہیں، لوگوں کی زندگیوں کو تباہ ہوتے بھی دیکھا ہے اور پھر سے آباد ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ مگر یہ کرونا آزمائش باقی تمام آزمائشوں سے یکسر مختلف ہے۔

گھروں سے دو دو یا چار چار جنازے ایک ساتھ اُٹھنا، اور اس طرح سے اُٹھنا کہ ابھی ایک گھر سنبھلا نہیں اور دوسرا، تیسرا اور چوتھا گھر بھی لپیٹ میں آ جائے تو متاثرہ انسانوں کی سمجھ بوجھ جواب دے جانا حیران کن بات نہیں۔ ایک باپ کے لیے اپنے جوان بیٹوں کے جنازوں کا بوجھ اُٹھانا کوئی معمولی بات نہیں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک چلتے پھرتے صحت مند، تندرست و توانا دوست، دیکھتے ہی دیکھتے منظر سے غائب ہونے لگیں، اور یہ بات سننے کو ملے کہ بس کرونا ہوا تھا اور وہ اب دنیا میں نہیں رہے، دل کسی صورت ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا، اور پھر ابھی ایک کا غم آدھا بھی نہ ہوا ہو، اور اسی طرح کے مزید غم بھی آپ کی زندگیوں میں شامل ہوتے چلے جائیں تو انسان کا زندگی پر سے اعتبار ہی اُٹھ جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب ختم ہونے والا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی چھنگاڑ کی آواز نے آ لیا ہو، ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی حکم ہے جو صادر ہو چکا ہے۔

انسان اپنی بے بسی پر روتا بھی ہے، اور پھر کوشش بھی کرتا ہے کہ نہیں نہیں ابھی وہ وقت نہیں آیا، اور پھر قدرت انسان کو امید کی نشانیاں بھی دیکھاتی ہے۔ یہ بھی دیکھاتی ہے کہ بہت سے لوگ اس جان لیوا بیماری سے ٹھیک بھی ہو رہے ہیں اور یہ جان لیوا بیماری اب اس قدر جان لیوا بھی نہیں رہی کیوں کہ ویکسین بھی تو آ چکی ہے۔ جہاں ایک طرف بہتری کی صورتِ حال ہے وہیں دوسری طرف صورتِ حال انتہائی سنگین

بھی ہے، مثل محشر نے بہت سے گھروں میں حشر پر پا کر دیا ہے۔ ایسے گھروں میں امید کی کرن کیسے جگائی جائے جن کا ہنستا بستا آنگن مثل محشر کی نظر ہو گیا ہے۔ ایسی آنکھیں کو کیا خواب دکھائیں جن کی آنکھوں کے ہزاروں خواب ٹوٹ کر بکھر چکے ہوں۔

کیا ایسا سوچا جا سکتا تھا، کہ کبھی ایسا بھی ہوگا، کہ بھری دنیا آپ کے لیے خالی ہو جائے گی، روز ملنے والے کبھی نہیں ملیں گے، جن کے بغیر جینے کا کبھی تصور نہ کیا ہو ان کے بغیر زندگی بھر جینا پڑے گا۔ انسان خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہے گا، مگر بہت سے لوگ سمجھنے اور سمجھانے کی حالت میں نہیں ہیں۔ کیوں کہ قدرت کی اس آزمائش نے ان کی زندگیوں میں کچھ باقی ہی نہیں رہنے دیا۔

خدا جانے کون خوش قسمت ہے، وہ جو اس آزمائش میں لقمہء اجل بنے وہ، یا پھر وہ جنہیں اس آزمائش میں سے بال بال بچا کر باہر نکال لیا گیا کہ وہ اس مثل محشر کے چشم دید گواہ رہیں اور آنے والوں کو اپنے غموں کی داستاں سناتے رہیں کہ انہوں نے کیا کیا کھو دیا۔

آج پوری دنیا کی آنکھیں آسمان کی طرف ہیں، کچھ غموں میں ڈوبی ہوئی، کچھ پتھرائی ہوئی اور کچھ بے خواب کہ شاید قدرت ان پر رحم کرے اور ان کے لیے پھر سے جینے کا سبب پیدا کر دے۔ یا اللہ رحم، یا اللہ رحم، یا اللہ رحم، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جسے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ یقینا ہم بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، ہم گناہ گار ہیں، ہم نے نعمتوں کا اس طرح شکر ادا نہیں کیا جس طرح شکر ادا کرنے کا حق تھا، ہم نافرمان لوگ ہیں، ہم نے ہماری طرف بھیجی گئی ہدایت کو نہیں سمجھا، ہم نے اپنے پیٹ میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھرا، اور شاید یہی آگ آج ہمارے جسموں کو جلاتی چلی جا رہی ہے اور ہم ابھی تک بے خبر ہیں۔

یا اللہ ہم تیرے بندے ہیں اور تجھ سے مدد مانگتے ہیں، اور تیرے سوا ہمارا کوئی مددگار نہیں۔ اے اللہ ہم تجھ سے مانگ کر کبھی مایوس نہیں ہوئے، اور ہم اب بھی تجھ سے ہر گز مایوس نہیں، ہم پُر امید ہیں کہ تو ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے اور یقنا آنے والا کل آج سے بہتر ہوگا۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

سیاہ عدالتیں

تحریر : میاں وقار الاسلام

صرف ججز کے کاؤن اور وکیلوں کے کوٹ ہی کالے نہیں عدالتوں کی دیواریں بھی کالی ہو چکی ہیں۔ تبدیلی سرکار عوام کا بڑا درد لے کر آئی تھی کہ عوام کے ساتھ بڑا بھیانک سلوک ہو رہا ہے خدا جانے عوام سے جس ہمدردی کا ووٹ لیا جاتا ہے اس ہمدردی کا درد تخت شاہی پر بیٹھتے ہی کہاں غائب ہو جاتا ہے۔

گزشتہ تینوں چیف جسٹس جاتے جاتے اپنے عدالتی نظام کا رونا رو کر گئے ہیں یہ رونا نہیں تھا بلکہ ان کی عمر بھر کی فرسٹریشن تھی جس کا وہ اظہار کر کے گئے ہیں۔ عدالت کو ملک کے تمام اداروں کی ماں کا درجہ حاصل ہوتا ہے جب ماں ہی اپنے بچے کھا جاتی ہو تو پھر بھروسہ کس محکمے پر کیا جا سکتا ہے۔

عدالتوں کا کردار عوام نے ڈھیلا نہیں کیا بلکہ عدالتوں نے خود اپنے آپ کو بھروسے کے قابل نہیں بنایا، جب تک عدالتوں کی عزت نہیں ہو گی کسی بھی محکمے کی عزت نہیں ہو گی۔ لوگوں کے بنیادی مسائل حل ہوں، کرپشن کے انبار نظر نہ آئیں حکومتوں پر اعتماد ہو تو دنیا میں لوگ بھاری ٹیکس خوشی سے دیتے ہیں نہ کہ مجبوری میں کیوں کہ لوگ اپنی حکومتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

تھری سٹار، فور سٹار ہوٹل یا پھر فایو سٹار ہوٹل میں ہم پانچ سے دس گنا زیادہ بل ہنسی خوشی دے کر آتے ہیں کیونکہ ہم سہولتوں کے بدلے یہ چڑھاوا ہنسی خوشی قبول کرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہر چیز کی مد میں لوٹا جاتا ہے چاہے سودا سلف ہو چاہے ٹیکسز ہوں چاہے یوٹیلیٹی بیلز ہوں عوام یہی سمجھتی ہے کہ انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹا جا رہا ہے۔

کسٹم فری چیزیں خریدنا ہماری اول درجہ کی ترجیح کیوں ہوتی ہے، ہم تنخواہ سے بھی ٹیکس نہیں کٹوانا چاہتے اور اگر ممکن ہو تو ٹیکس لگی چیزیں بھی نہ خریدیں۔۔ آخر وجہ کیا ہے؟ گندم کا ایک ٹرک کسی بھی چوک میں کھڑا کر دیں شام تک ایک بھی دانہ نہیں بچے گا لٹے پھٹے لوگوں کو لوٹنے کا موقع ملا تو وہ ضائع نہیں کریں گے، وجہ کیا ہے؟ لوگ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بدلہ لیتے ہیں۔

جب پکڑے جانے کا خوف ہی ختم ہو چکا ہو اور ہر جرم کے بدلہ بھاری چڑھاوا ہو تو پھر جس کے پاس چڑھاوا نہیں ہوگا صرف وہی سولی پر چڑھے گا۔ جن معاشروں کی اساس انصاف پر ہوتی ہے وہاں ظلم سہنے والے ظالم سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا ظلم کرنے والے ظلم سہنے والوں سے ڈرتے ہیں۔

سو میں سے شاید ایک بھی بندہ نہ ہو جو آپ کو مشورہ دے کہ حق کے لیئے لڑو، لوگ یونہی مشورے نہیں دیتے اپنے تجربات کی بنیاد پر رہنمائی کرتے ہیں۔ انصاف کیا ناانصافی کے خلاف لڑے گا خود ناانصافی ہی انصاف کے ساتھ لڑتے لڑتے بوڑھی ہو چکی ہے۔

لوگ ذلت اور رسوائی کے سارے سمندر عبور کر کے پھر عدالت جاتے ہیں اور انہیں وہاں ایسی رسوائی ملتی ہے کہ وہ پچھلی رسوائی بھی بھول جاتے ہیں۔ لوگ ظالم کے خلاف لڑنے کی بجائے ہزار دفعہ یہ سوچتے ہیں کہ مک مکا کی کوئی گنجائش ہے کہ لے دے کر معاملہ رفع دفعہ کیا جائے۔ یہاں وکیلوں کو اپنے ذاتی کیسوں پر انصاف نہیں ملتا اور موکل وکیلوں کے پیچھے اپنی فائلیں اٹھائے پھرتے ہیں اور ذلیل ہوتے رہتے ہیں۔

پاکستان کے ہر ادارے میں ٹھیک ہونے کی تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے مگر عدالتوں کے نظام میں رتی بھر بھی بہتری کی امید نہیں یہ بیماری کرونا وائرس سے بھی بری ہے۔ عدالتوں کو اگر زمینوں کے قبضہ چھڑانے اور قبضہ دلوانے کا اختیار حاصل نہیں ہے تو سالوں تک کیسوں کے اوپر گوٹر گوں کرنے کا اختیار بھی نہیں ہونا چاہیئے۔

توہین یہ نہیں ہے کہ عدالتوں پر اعتراضات کیئے جاتے ہیں بلکہ توہین یہ ہے کہ مجرم عدالتوں کے باہر دندناتے پھرتے ہیں بھنگڑے ڈالتے ہیں اور ڈانس کرتے ہیں اور عام شہری کا مزاق اڑاتے ہیں۔

نواز شریف اور زرداری کے چہروں پر پکڑے جانے کا اتنا خوف نظر نہیں آتا جتنا عمران خان اور پی ٹی آئی کے چہروں پر ان کے چھوٹ جانے کا خوف نظر آتا ہے۔ چوروں کے پاس واردات کی جگہ سے بھاگنے کے اتنے راستے نہیں ہوتے جتنے راستے عدالتوں سے بھاگنے کی ہوتے ہیں یہ عدالتیں دودھ کی حفاظت کریں گی جن کے پیندے پھٹے ہوئے ہیں۔

اللہ کرے کہ ہم وہ سورج بھی طلوع ہوتا دیکھیں جو سیاہ عدالتوں کا نقشہ بدل دے اور ہم ان سیاہ عدالتوں سے مایوس اندھیروں کی بجائے انصاف کی کرنیں کو پھوٹتے ہوئے دیکھیں، آمین۔۔ دعا گو میاں وقار الاسلام

آزاد صحافت

تحریر : میاں وقار الاسلام

صحافت جتنی آزاد ہوتی ہے، اس سے دوگنی غیر ذمہ دار بھی ہوتی ہے۔ سی این این اور بی بی سی دنیا کے مقبول ترین نیوز چینلز بھی ہیں اور غیر ذمہ دار ترین چینلز بھی ہیں

صحافت خود اس بات کی گواہ ہے کہ وہ ہمیشہ طاقتور کے ہی نیریٹیو کو سامنے لانے میں کامیاب ہوئی ہے چاہے وہ دنیا کا سب سے جھوٹا ملک ہی کیوں نہ ہو۔ قلم کے پیچھے ذمہ دار ہاتھ نہ ہوں تو یہ کسی بھی مہلک ہتھیار سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا آج کے دور میں سب سے بڑا صحافی تو بن سکتا ہے مگر اس سے کہیں زیادہ گھٹیا انسان بن کر رہ جاتا ہے اگر کبھی وہ سوچے تو۔

جھوٹی زبان کے ساتھ پھٹ پڑنے والے صحافی اور جیکٹ پہن کر پھٹ پڑنے والے دہشت گرد میں کوئی فرق نہیں۔

قوم کو ہیجان کی کیفیت میں رکھنا اور اس کے پیسہ کمانا، مطلب دہشت کے ذریعے اپنے وحشی عزائم پورے کرنا، یہی تو دہشت گرد بھی کرتے ہیں۔

جھوٹ فیشن بن گیا ہے کتنے افسوس کا مقام ہے کہ کتنا بڑا گناہ ہم کتنی دیدہ دلیری سے کرتے ہیں اور اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔

جس معاشرے میں جھوٹ کا سامنا بھی جھوٹ سے ہوتا ہے اور سچ کہیں کونے میں منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ ایسے ہی معاشرے کو مردہ معاشرہ کہتے ہیں۔

سچی بات کو پی جانا بھی پرلے درجے کی بزدلی ہے جس کی قیمت ہماری اگلی نسل اتارنی پڑے گی، ہم اپنی نسل کے تو مقروض ہیں ہی، اگلی نسل کا بوجھ ہی ہلکا کرنے کی کوشش کریں۔

جب جھوٹ کا کلچر فروغ پا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جہالت کے جنگل میں جھوٹ آگ کی طرح پلک جھپکتے ہی پھیل جاتا ہے۔ مطلب ایک طرف جھوٹ کو پھیلانے والے تو دوسری طرف جھوٹ کو سچ مان کر ہر سطح پر پھیلانے والے، ایسے میں سچ بولنے والوں کا کردار کیا رہ جاتا ہے۔

جب بے شرم جھوٹے صحافیوں کی ایگوہرٹ ہوتی ہے تو وہ اس پر انتہائی برہمی کا اظہار کرتے ہیں، ایسے گھٹیا تماشے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرانی اس بات کی ہوتی ہے کہ کیسے لوگ اس طرح کے گھٹیا ڈراموں کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ جس سے ایسے صحافیوں کی اور زیادہ حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور پھر ہم انہیں کا وبال اٹھائے پھرتے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمیں کم ہی صحافی ذمہ دار صحافت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان کے درمیان ہماری روش کیسی ہے۔ جب ہم ہر طرف غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آئیں گے تو ہم کسی اور سے اچھائی کی کیا امید رکھ سکتے۔

ذمہ دار معاشروں کی صحافت بھی ذمہ دار ہوتی ہے کیوں کہ اس معاشرے کے لوگوں کو اچھے اور برے کی کسی حد تک تمیز بھی ہوتی ہے۔ جبکہ کہ جن معاشروں میں تعلیم اور شعور کا فقدان ہوتا ہے وہاں میڈیا کے لیئے ہر قسم کی خرافات کو پھیلانا آسان ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں صحافت آزاد نہیں بلکہ بے لگام ہو چکی ہے ہمیں چاہیئے کہ بے لگام صحافت کا بھی احاطہ کریں اور انتہائی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے غلط خبروں کو پھیلانے سے پہلے تھوڑا سا اس پر غور کر لیں۔ یقین کریں 100 میں سے 80 یا اس سے بھی زیادہ آگ کی طرح پھیلتی ہوئی خبریں جھوٹی اور بے بنیاد ہوتی ہیں۔

اللہ ہمیں ہدایت دے اور ہماری رہنمائی کرے، آمین، دعا گو میاں وقار الاسلام

ادیب اور صحافی

تحریر : میاں وقار الاسلام

ایک ہوتا ہے ادیب اور ایک ہوتا ہے صحافی ویسے اگر دونوں کام نیک نیتی سے کیے جائیں تو اگر ایک کا مقام آسمان کی طرح اونچا ہے اور دوسرے کا مقام سمندر کی طرح گہرا ہے۔

شاید ہماری بد قسمتی ہے کے جس طرح صحافیوں نے اپنے اپ کو گندہ کیا ہے اسی طرح بہت سے ادیبوں نے اپنے آپ کو بہت بدنام کیا ہے۔

ہمارے ہاں صحافت بہت عرصے سے بدنام ہے، جھوٹی خبریں پھیلانا، لوگوں کی عزتوں سے کھیلنا انہوں بلیک میل کرنا اور معاشرے میں مایوسی پھیلانا شاید یہی صحافت کی جدید تعریف ہے۔

شرافت کے میدان میں صحافت اپنے آپ کو سر سے بھی اوپر پہنچ چکی ہے، صحافت کا دین ایمان صرف پیسہ ہے اگر آپ 100 فیصد بھی جھوٹے ہیں مگر آپ کے پاس پیسہ بہت ہے تو بھی صحافت آپ کے آنگن میں جیسے آپ چاہتے ہیں ویسے ناچے گی۔

صحافت کو بہت سارے سیٹھوں نے پال رکھا ہے، اسی لیے صحافت کے مقاصد کو سمجھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔

ایسا معاشرہ جہاں صحافت مکمل طور پر بدنام ہو اور پھر ادب کو بھی اسی کی گود میں جا کر بیٹھا دیا جائے، یہ ایک شریف زادی کو کوٹھے پر بیٹھانے کے مترادف ہے۔

ادیب کا کام امید دلانا، ہمت دلانا، حالات کے لڑنا اور مشکلوں کا سامنا کرنا اور جہالت کے خلاف ڈٹ جانا ہوتا ہے نہ کہ جہالت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے جہالت ہی لکھتے جانا ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ادب بھی اسی طرح بدنام ہو جیسے صحافت بدنام ہوئی ہے اور ادیب بھی ایسے ہی خوار ہوں جیسے صحافی خوار ہوتے ہیں ادب کو اپنی پہچان بچانے کے لیے کردار ادا کرنا ہوگا اور ادیبوں کو بھی اپنی بقا کی جنگ لڑنی پڑے گی۔ صحافت اور ادب کا فرق ختم ہو گیا تو معاشرے میں قلم صرف رائج الوقت سکے کا چلے گا۔ دعا گو : میاں وقار الاسلام

فسادی خبریں

تحریر : میاں وقار الاسلام

جہاں معلومات ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہیں، ہمیں حالات حاضرہ سے آگاہ رکھتی ہیں اور ملک میں امید پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو متحد ہونے میں مدد فراہم کرتی ہیں وہیں کچھ ملک دشمن عناصر معلومات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور مثبت معلومات کو منفی رخ دے دیتے ہیں۔ یا پھر خاموشی سے ایک پروپیگنڈا وار شروع کر دی جاتی ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کا جہاں تک یہ فائدہ ہے کہ ہمیں معلومات بڑی تیزی سے مل جاتی ہیں وہیں اس کا شدید نقصان بھی ہے کہ منفی معلومات اور انتشار پیدا کرنے والی خبریں بہت جلد اپنے پنجے گاڑھ لیتی ہیں۔

کچھ ملکوں میں ڈیس انفارمیشن وار سے نمٹنے کے لیئے باقاعدہ ڈیپارٹمنٹس ہیں جو یہ کام کرتے ہیں، ہمارے ہاں بھی ضرورت پڑنے پر بہت سے معلومات کی تردید کر دی جاتی ہے، مگر بہت سی معلومات کی تردید کرنا لازمی نہیں ہوتی۔

باشعور قومیں اپنے ذمہ دار ہونے کا ثبوت دیتی ہیں اور غلط معلومات اور انتشار پھلانے والی خبروں کا نہ صرف خود دفاع کرتی ہیں بلکہ مشکل حالات میں ملک کے مضبوط بازو بننے کا ثبوت دیتی ہیں۔

جن ملکوں میں لیڈرشپ کا فقدان ہوتا ہے وہاں تخریب کاروں کو مزید سہولت میں جاتی ہے کہ وہ غلط خبریں جوڑ توڑ کر اسے کسی بھی ملک کے خلاف استعمال کر جاتے ہیں۔

بر حال ہمیں اتنا علم ضرور ہونا چاہیئے کہ کون سی معلومات ہمارے ملک کے حق میں ہیں اور کون سی معلومات ہمارے ملک کے خلاف ہیں اور اسی چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنی ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔

امریکہ پاکستان کے ساتھ کس حد تک مخلص رہا ہے یہ پوری قوم کو پتہ ہے، اتنی ہمیں امریکہ سے سپوٹ نہیں ملی جس قدر ہمارا نقصان کیا گیا اور پھر ہمیں دنیا میں بدنام بھی کر دیا اور گرے لسٹ میں بھی ڈال دیا گیا۔ پاکستان کے حالات برے سے برے ہوتے چلے گئے پھر چین نے ہمارا ساتھ دیا پاکستان میں نہ صرف سرمایہ کاری ہوئی بلکہ بجلی بنانے اور انفراسٹرکچر کے وسیع پیمانے پر منصوبے بھی شروع ہوئے، نہ صرف ہم مشکل ترین حالات سے نکلے بلکہ ملک استحکام کی طرف بھی رواں دواں ہوا۔

اس مشکل ترین صورت حال میں جہاں ایک طرف چین نے ہماری کھل کر امداد کی وہیں فوج نے صف اول کا کردار ادا کیا، دہشتگردی کی مد میں بہت سے فوجیوں کو نشانہ بنایا گیا بہت سے اغوا بھی ہوئے، عام شہریوں اور سکولوں پر حملوں کی داستان تو الگ ہے۔ جس میں ہندستان کے براہ راست ملوث ہونے اور امریکہ کی پشت پناہی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

ہندوستان کی یہ شرارتیں کبھی بھی بند نہیں ہوئیں، چائے پلانے والا واقعہ بھی ابھی تازہ ہے اور پھر کراچی کے رستے ڈوب مرنے کی داستاں بھی ابھی نئی ہے انڈیا پاکستان کی سرحدوں سے ڈوب کر بھی گیا دھول چاٹ کر بھی گیا اور اسے چائے بھی پلائی گئی۔

انڈیا اپنے زخم نہیں بھولا اور ہر وقت تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اسی وجہ سے کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔

جہاں دنیا کرونا وائرس سے لڑنے میں مصروف ہے اور خود انڈیا بھی اسی وبا سے لڑ رہا ہے ایسی حالت میں بھی وہ اپنی تخریب کاری سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ رہا۔

امریکہ کا دم چھلا بننے کے ساتھ ساتھ انڈیا نہ صرف امریکہ کی طرح جھوٹی خبریں پھلا رہا ہے بلکہ اس میں یہ ایک قدم اور آگے ہے۔ انڈیا یہ الزام لگانے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ بائیو وار ہے اور پاکستان اس میں چین کے ساتھ شامل ہے اور پاکستان کی مدد سے یہ وائرس انڈیا میں لایا جا رہا ہے جب کہ انڈیا یہ جانتا ہے کہ بیرونی ممالک سے آنے والے بھارتیوں میں کرونا وائرس کے کیسز ملے تھے مگر انڈیا نے ہمیشہ کی طرح اپنا گندا کھیل ضرور کھیلنا ہے۔

دوسری طرف یہی وہ وقت ہوتا ہے جب لوگ خبروں کو زیادہ سنجیدگی سے پڑھتے ہیں اور اپنی رائے قائم کرتے ہیں تو بھارت کا پہلا حدف پاکستان کی فوج اور دفاعی ادارے ہوتے ہیں اور پھر حکومت۔

مثال کے طور پر انڈیا کے ایک بے وقوف آرمی آفیسر نے ایک جھوٹی خبر بنائی کہ خواتین کے انڈر گارمنٹس سے چین نے ماسک بنا کر پاکستان بھیجے ہیں اور اس کا ایک ویڈیو کلپ اور ٹویٹ بھی بنا کر بھیج دیا، اس جاہل شخص کو اتنا نہیں پتا کہ انڈر گارمنٹس کا خام مال اور طریقہ کار دونوں ہی مختلف ہوتے ہیں اور اس میں استعمال ہونے والا کپڑا زیادہ مہنگا ہوتا ہے جبکہ ماسک بنانے کا طریقہ اور اس کا خام مال بالکل مختلف ہوتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ان دو مختلف طریقوں کو ایک ساتھ جوڑا جاسکے۔ تو یہ خبر واپس انہیں کے منہ پر جا پڑی۔

جیسے پہلے ہوتا رہا ہے کہ ہمیں فوج کی غلط اور بے بنیاد خبریں ملتی رہیں کہ ہر عہدے پر فوجی افسر بیٹھے ہیں یا فلاں فلاں کمپنیاں فوج کی ہیں یا فلاں فلاں پراپرٹی یا زرعی زمین فوج کی ہے اس طرح کی ساری خرافات تب عام ہوتی ہیں جب ملک کے حالات سنگین ہوتے ہیں تو یہ رٹی رٹائی پرانی خبریں جو براہ راست بھارت پھیلاتا ہے تاکہ اس کے مکروہ عزائم پورے ہوں ان خبروں کی پہلی دو لائینس پڑھ کر انداز ہو جاتا ہے یہ یہ ہوائی کس دشمن نے اڑائی ہے۔ عام حالات میں اس طرح کی خبروں کو کوئی پڑھتا بھی نہیں اس لیے اس طرح کی سنگین صورت حال میں اس طرح کی خبریں زور پکڑتی ہیں۔

چین نے ان مشکل حالات میں بھی پاکستان کی ہمیشہ کی طرح مدد کی ہے، پاکستان میں ماسک سے لے کر وینٹیلیٹرز اور امدادی ٹیم سے لے کر میڈیکل کی اعلی ٹیم، گویا جہاں تک ہو سکتا ہے چین کا امداد سامان چینی جہازوں کے ذریعے پاکستان پہنچ رہا ہے تو ظاہر سی بات ہے اس کی بھی سب سے زیادہ تکلیف بھارت کو ہی ہو گی۔

ہمیشہ کی طرح اب بھی بھارت کی کوشش رہے گی کہ کسی طرح پاکستان اور چین کے تعلقات خراب کیے جائیں جب کہ خود انڈیا چین سے نہ صرف مزید مدد مانگ رہا ہے بلکہ اچھی خاصی مدد اسے پہنچ بھی چکی ہے مگر مجال ہے کہ اس کی بے شرمی ذرا بھی کم ہو۔

پاکستانی ہونے کا ثبوت دیں اور بھارت کی طرف سے پھیلائی جانے والی جھوٹی خرافات پر لعنت بھیجیں۔ ملک کے لیئے قربانیاں دینے والے تمام لوگوں کا ساتھ دیں اور ان کا بازو بنیں اور ان کے قدم مضبوط کریں۔

اللہ نے ہمیں کبھی بھی مایوس نہیں کیا، انشاء اللہ وہ ہمیں اب بھی مایوس نہیں کرے گا، باقی مشکلوں کی طرح یہ مشکل بھی ٹل جائے گی اور انشاء اللہ جلد حالات قابو میں آ جائیں گے۔

پاک چین دوستی زندہ باد، پاک فوج اور پاک سرزمین پائندہ باد، دعا گو میاں وقار الاسلام

MARVEL SYSTEM

وقارِ پاکستان

مختصر تعارف

نام: میاں وقار الاسلام، شاعر، ادیب، کارپوریٹ ٹرینر، بزنس کنسلٹینٹ
پرنسپل کنسلٹینٹ، مارول سسٹم، فاؤنڈر، وقارِ پاکستان لیٹریری ریسرچ فورم
ڈائیریکٹر آپریشنز، نیازی گروپ آف کمپنیز، سی ای او، سوشوآن اردو سوشل نیٹ ورک
ایڈوائزر: ادب سرائے انٹرنیشنل، کنسلٹینٹ: ایکو کیئر کنسلٹینسی سروسز
تعلیم: بی کام، ایم بی اے، سرٹیفکیشنز: مائیکروسافٹ، سیسکو اینڈ کاروبیٹ سسٹم
لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈز سال 2016 اینڈ 2017
نیازی گروپ آف کمپنیز، ادب سرائے انٹرنیشنل
بزنس ایکسی لینس ایوارڈز سال 2018 اینڈ 2019
ایکو کیئر کنسلٹینسی سروسز (پاکستان)، ٹی ایس وائین (برطانیہ)
ایجوکیشنل اینڈ لیٹریری ایوارڈز سال 2019 اینڈ 2020
سائی سینس (سعودی عرب)، ہیرا فاؤنڈیشن (امریکہ)

بیسٹ لائف نوٹس، (زریں ملفوظاتِ حیات)

1 تعارفی اور اعزازی

2 اسلامی اور مذہبی

3 ثقافتی اور سماجی

4 تجارتی اور معاشی

5 علمی اور تربیتی

6 ادبی اور لسانی

7 سیاسی اور حکومتی

8 غیر ملکی اور بین القوامی

9 ذہنی اور نفسیاتی

10 اصلاحی اور تنقیدی

بیسٹ لائف نوٹس
میاں وقار الاسلام

زریں ملفوظاتِ حیات
میاں وقار الاسلام